ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

جلد (۱۶) بابت ماہ محرم و صفر ۱۳۶۸ ہجری نمبر (۱ و ۲)

ضروری گذارش

(۱) الفرقان تمام خریداروں کو پوری احتیاط سے روانہ کیا جاتا ہے۔ جن صاحب کو نہ پہنچے انھیں سمجھ لینا چاہئے کہ ڈاک سے ضائع ہوا، ایسی صورت میں اطلاع کرنے پر رسالہ بلا قیمت دوبارہ روانہ کردیا جاتا ہے۔

(۲) ہمیشہ اپنا پورا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے، اور جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے، لیکن پاکستان کے حضرات کارڈ یا ٹکٹ نہ بھیجیں وہاں کے کارڈ اور ٹکٹ یہاں بیکار ہیں۔

ناظم "الفرقان" لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلیشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

۲۵ سے ۴۰ صفحات تنویر پریس میں چھپے

چند ضروری اعلانات

(۱) کام کرنے والوں کی کمی کی وجہ سے الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے انتظام میں عرصہ سے بعض سخت کوتاہیاں ہو رہی تھیں، الفرقان کی اشاعت میں دائمی تاخیر کے علاوہ خطوط کے جوابات اور فرمائشوں کی تعمیل میں بھی بسا اوقات بہت دیر ہو جاتی تھی جس سے دوستوں اور ہمدردوں کو سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ اب گذشتہ مہینہ سے کام کرنے والوں میں ایک صاحب کا مستقل اضافہ ہو گیا ہے اور اِسوقت دفتر کا انتظام بحمد اللہ قابلِ اطمینان ہے۔ خدا کرے کہ یہ صورت مستقل رہے اور احباب مخلصین کو دفتری انتظام کی کوتاہیوں سے آئندہ اس قسم کی تکلیفیں نہ پہنچیں۔

---

(۲) الفرقان کا زیر نظر پرچہ محرم وصفر دو مہینے کا مشترک شمارہ ہے، اسکے صفحات ۴۸ صفحہ ماہانہ کے حساب سے ۹۶ ہونے چاہئے تھے لیکن جلدی کی وجہ سے اِسوقت صرف ۸۰ صفحہ کا یہ شمارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ اگلی دو اشاعتوں میں ۸-۸ صفحہ کا اضافہ کرکے یہ کمی پوری کردیجائیگی۔

---

(۳) اِسوقت مدز کوٰۃ اور مدخیر کی کچھ رقمیں دفتر الفرقان میں جمع ہیں جو حضرات الفرقان کے شائق ہوں اور پورا چندہ ادا کرنا اُن کیلئے بھاری ہو وہ صرف نصف چندہ (دو روپے) منی آرڈر سے روانہ فرمادیں اور اُسکے کوپن ہی میں لکھدیں کہ اسمیں مزید دو روپئے مدز کوٰۃ یا مدخیر سے ہمارے حساب میں شامل کرکے الفرقان سال بھر کیلئے جاری کردیا جائے۔

---

(۴) خط کتابت اور ترسیلِ زر کے وقت خیال کرکے اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے اور اگر آپ رسالہ کے خریدار ہیں تو خریداری نمبر بھی ضرور لکھئے، اور اس میں ہرگز تساہل نہ کیجئے!

ناظم "الفرقان" لکھنؤ

افتتاح جلد شانزدہم

۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصٰلحٰت

۱۳۶۷ھ کے اختتام کے ساتھ "الفرقان" کے اجرا پر پندرہ ۱۵ برس گذر گئے اور گذشتہ پرچہ پر اسکی پندرھویں جلد بفضلہٖ تعالیٰ مکمل ہوگئی۔ اللھم لک الحمد شکراً ولک المن فضلاً۔

اس طویل مدت میں کئی دفعہ حالات ایسے ہوئے کہ اسکی حیات وبقا کی طرف سے مایوسی ہو ہو گئی لیکن ہر مرتبہ حق تعالیٰ کی رحمت نے زندگی کے اسباب پیدا کر کے اس کو زندہ رکھا ——— اِس مرتبہ یعنی اَب سے صِرف دو ڈھائی مہینے پہلے تمام حالات کا جائزہ لیکر اور سارے حسابات لگا کر اس عاجز نے یہی سمجھا تھا کہ اب اس کو جاری نہیں رکھا جا سکتا اور اس سال (۱۳۶۷ھ) کا آخری پرچہ بابت ذی الحجہ نکال کر غالباً اس کو بند ہی کرنا پڑے گا۔ اور اپنے مایوس دل کو کسی طرح اسکے لئے آمادہ بھی کر لیا تھا ——— لیکن اُس حیّ وقیوم نے مردہ اور سوکھی زمین پر پھر زندگی کا پانی (آبِ حیات) برسا دیا اور جس پودے کی زندگی کی کوئی اُمید نہیں رہی تھی اُس کو پھر زندگی بخشدی گئی۔ ھُوَ الَّذِی یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِن بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَیَنشُرُ رَحْمَتَهُ وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیدُ ۝

عادۃ اللہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ جب کوئی کام کرانا چاہتے ہیں تو اپنے بعض بندوں کے دلوں میں اس کا داعیہ پیدا فرما دیتے ہیں اور اُنہی کے ذریعہ اس کی تکمیل کرا دیتے ہیں۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ الفرقان کو زندہ رکھنے کیلئے اللہ کے کچھ بندے اس قدر بیچین ہو جائینگے اور خریداروں کی فراہمی کیلئے اِس قدر بے پناہ جوش اور خلوص سے جدوجہد کرینگے ——— یہ محض اللہ مقلب القلوب کی قدرت کا کرشمہ تھا کہ بعض بندوں کے دلوں میں الفرقان کے بقار کیلئے سعی و کوشش کا وہ ولولہ اور داعیہ پیدا ہو گیا جو کسی انسانی تدبیر سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

رسالہ کے صفحات پر نام لیکر اُن مخلصین کا تذکرہ شاید اُنکے خلوص کی ناقدری ہو تاہم اللہ کے اس انعام کا

اجمالی ذکر کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہی۔

صوبۂ سرحد کے ایک مخلص محب اور نہایت غریب دینی دوست جو ایک معمولی مکتب میں معلم ہیں اُنھوں نے جب شوال و ذیقعدہ کے الفرقان میں "نگاہِ اوّلیں" اور رفیقِ محترم مولانا سیّد ابو الحسن علی کی اپیل "ناظرینِ الفرقان سے" پڑھی، تو اِس قدر متأثر ہوئے کہ کھانا پینا اُن کیلئے بے مزہ ہو گیا اور ضلع ہزارہ اور ضلع کیمبلپور کے قصبوں اور دیہاتوں کا دورہ کرکے (جس میں زیادہ تر غالباً پیدل ہی چلنا پڑا ہو گا) تیس [۳۰] خریدار کسی طرح مہیا کئے اور اُنکی فہرست بھیجی اور خط میں لکھا کہ میں تم سے اس کا کوئی صلہ اور شکریہ نہیں چاہتا بلکہ صرف اللہ سے اجر کا طالب ہوں اور تم بھی بس دعا کرو کہ اللہ میری اِس سعی کو قبول فرمائے"۔

بلاشبہ صرف اللہ ہی میں یہ قدرت ہی کہ وہ کسی بندہ کے دل میں کسی کام کا ایسا مخلصانہ داعیہ اور جذبہ پیدا فرمادے، اور اُسی کے کرم سے اُمید ہی کہ وہ ایسے مخلصوں کو بھرپور اجر سے نوازے گا۔ اِس خلوص کی قیمت بس اُسی کے خزانہ میں ہی۔

بھوپال کے احباب نے تعداد کے لحاظ سے جو اعلےٰ مثال قائم کی محض جذبۂ تشکّر کے تحت اُس کا بھی ذکر کرنے کو جی چاہتا ہی ـــــ قریباً ایک سو چالیس [۱۴۰] خریداروں کا چندہ یکمشت اور اُنکی فہرست ایک ساتھ آئی ـــــ بعض حضرات نے کچھ رقوم بھی بھیجی ہیں جن سے ایسے حضرات کی مدد کی جائیگی جن کو اپنی، معاشی تنگی کی وجہ سے رسالہ کا پورا چندہ ادا کرنا مشکل ہو[۱] ـــــ بہت سے احباب نے دو دو، چار چار، اور بعض نے دس پندرہ خریدار مہیا کرکے بھیجے، اور کتنے ہی اللہ کے بندے ہونگے جنھوں نے اخلاص سے کوشش کی ہو گی اور اتفاق سے وہ کسی کو تیار نہ کر سکے ہونگے۔ اللہ تعالےٰ ان سب ہی مخلصوں کی مساعی کو قبول فرمانے والا ہی اور اُسکے وعدوں کی بنا پر بدرجۂ یقین اُمید ہی کہ یہ سب انشاء اللہ اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۔

اِسوقت تک نئے خریداروں کی تعداد الحمد للہ چار سو کے قریب ہو چکی ہی اور الفرقان کے آمد و صرف کا توازن صحیح ہونے کیلئے اب صرف سو سوا سو کی ضرورت اور باقی ہی، اور اُمید ہی کہ اگر دوستوں کی مساعی کی رفتار یہی رہی تو انشاء اللہ ماہِ رواں کے اندر ہی اندر یہ تعداد بھی پوری ہو جائیگی۔

---

[۱] ایسے حضرات سال بھر کے لئے صرف دو [۲] روپئے یعنی (نصف چندہ) روانہ کر دیں، باقی نصف اُن کے حساب میں ان رقوم میں سے جمع کر دیا جائے گا۔

(از جناب مولانا سید ابو الحسن علی حسنی (ندوی))

ایک حدیث میں آیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ دنیا کی دولت اس کو بھی دیدیتا ہے جس سے اُس کو محبت ہوتی ہے اور اس کو بھی دیدیتا ہے جس سے اُس کو محبت نہیں ہوتی، مگر دین کی دولت اُسی کو عطا فرماتا ہے جس سے اُس کو محبت ہوتی ہے" اِس حدیث کو اگر اسکے وسیع مفہوم میں دیکھئے تو دینی سلسلہ کی ہر اعانت و توفیق اللہ تعالےٰ کے فضل خاص اور اسکی عنایت کی دلیل ہے، اور شاعر عارف نے سچ کہا ہے۔ ؎

منت منہ کہ خدمتِ سُلطاں ہمی کنم
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

ہمیشہ سے دنیا میں خیر و شر کے دو طویل و مستقل سلسلے رہے ہیں، انسانوں کی قسمت میں گویا لکھا ہوا ہے کہ وہ اِن دونوں سلسلوں میں سے کسی نہ کسی سلسلہ کی کڑی بنیں، انبیاء علیہم السلام سلسلۂ خیر کے سر حلقہ اور اُسکے بانی ہوتے ہیں اُنکے بعد ہر شخص اپنے نصیب، اپنی استعداد، اپنی ہمت و صلاحیت کے مطابق اس سلسلہ کی کڑی بنتا ہے، اس سلسلۃ الذہب کی ہر کڑی، اگلی ہو یا پچھلی مضبوط ہو یا کمزور خیر کی زنجیر کی اہم کڑی ہے اور اس طلائی زنجیر کی ہر کڑی، بڑی قیمتی، بڑی نورانی، بڑی بابرکت اور اپنی جگہ بڑی ضروری ہے، انھیں سے مل کر یہ زنجیر بنتی ہے، ہر کڑی اپنی قسمت پر نازاں ہو کہ اُس نے اس زنجیر میں جگہ پائی ہے جہاں خیر کے سوا کچھ نہیں۔ ؎

ایں سلسلہ از طلائے ناب است ایں خانہ تمام آفتاب است

"اِنَّ اللہَ طیبٌ لا یقبل اِلَّا الطیب" اللہ تعالےٰ اپنے دین کے گھر کی تعمیر کیلئے پاک و صاف اور ستھری اینٹیں ہی انتخاب کرے گا، کسی دینی دعوت اعلاء کلمۃ اللہ کی تحریک کی تائید و تقویت اور

فروغ وبقا کی کوشش میں وقت کا صرف ہو جانا، روپیہ کا خرچ ہو جانا، دل کا درد مند آنکھوں کا اشکبار ہونا، اس راستہ میں پسینہ کا بہنا، بے آرام ہونا، اس کیلئے اپنے کسی بلند مقام سے اُترنا، خلافِ عادت کام کرنا، کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا، کسی کی خوشامد کرنا، کسی کے دروازے کے پھیرے کرنا، یہ سب اللہ تعالےٰ کے فضل وقبولیت کی دلیل ہے اس پر مومن جتنا بھی اللہ کا شکر کرے کم ہے، لوگ مادی وحسی انعامات پر شکر بجالانا ضروری سمجھتے ہیں اور اس کی ضرورت میں کیا شک ہے لیکن اس معنوی دولت اور اس وراثتِ نبوت پر شکر کی ضرورت کا احساس شاید کم لوگوں کو ہو۔ اعملوا آل داؤد شکرا وقلیل من عبادی الشکور۔

دنیا میں آج اوقات کے صرف کرنے، مال کے خرچ کرنے، کسی شخص یا کسی کام کی سفارش کرنے، کسی مقصد کیلئے دوسرے کی خوشامد کرنے، کسی ضرورت کیلئے فکر مند ہونے کی کوئی کمی نہیں، اس میں سے کوئی جنس بھی اس وقت بازار میں نایاب نہیں، آج کون سی مادی دعوت وتحریک ایسی ہے جسکے سرگرم کارکن پر جوش داعی اور ایثار پیشہ اور فراخ حوصلہ مالی معاون ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں نہیں ہیں، محض کوشش واعانت اور محض وقت اور مال کا خرچ کوئی قیمت نہیں رکھتا، قیمت نسبت کی ہے، نسبت اگر بڑی ہے تو ایک کوڑی لاکھوں روپیہ پر اور پسینہ کا ایک قطرہ پسینہ نہیں بلکہ خون کے سمندر پر فوقیت رکھتا ہے۔ سے

داغ غلامیت کرد رتبہ خسرو بلند　　میر ولایت شود بندہ کہ سلطاں خرید

"الفرقان" خریداروں کی کمی اور مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو رہا تھا، اس کے ناظرین کو اس کی طرف توجہ دلائی گئی اور یہ عرض کیا گیا کہ مسلمانوں کے دینی مستقبل کیلئے یہ کچھ فالِ نیک نہیں ہے یہ خطرہ کی ایک علامت ہے، یہ مسلمانوں کے ایک دینی حلقہ کے دینی احساس کے زوال کی ایک نشانی ہے کہ محض انکی ذرا سی بے توجہی سے دین کی دعوت کا ایک ذریعہ جاتا رہے۔ ع

سالے کہ نکوست از بہارش پیدا

اس سے عوام کے دینی جذبہ اور احساس اور مستقبل کے رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ دین کے خادموں کے لئے اور دینی اداروں کے لئے یہ صورتِ حال بڑی دل شکن اور صبر آزما ہے وہ جسمانی تکالیف اُٹھا سکتے ہیں

محنت و مشقت کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کو اپنے مقدور بھر دین کی خدمت میں صرف کر سکتے ہیں، بیرونی خطرات اور مخالفتوں کا بھی مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن اپنے دوستوں کی بے مہری، اور اپنی قوم کی بے حسی اور مردہ دلی کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں، جو ان کے پاس ہو اُسکے خرچ کرنے میں اگر بخل یا عذر سے کام لیں تو لائقِ تعزیر لیکن دوست جو [illegible] سکتے ہیں اور جو ان کے امکان میں ہو اگر اسکے کرنے میں غفلت یا تغافل سے کام لیں تو لائقِ شکایت ہیں، قابلِ فریاد ہیں۔ ؎

دل عبث لب بہ شکوہ وا نہ کند   شیشہ تا نشکند صدا نہ کند

ہمارے دوست اتنا پڑھ کر بے چین ہو گئے، الفرقان کے حلقہ ہی میں نہیں دینی حلقہ میں ایک حرکت سی پیدا ہو گئی، بعض دوستوں نے تار کے ذریعہ الفرقان کے جاری رکھنے کی درخواست کی اور تار کے ذریعہ رقمیں بھیجیں، متعدد دوستوں نے اپنے حلقۂ احباب میں پوری سرگرمی اور انہماک کے ساتھ خریدار پیدا کرنے کی کوشش کی اور بڑی تعداد میں خریدار بنائے، خطوط میں بڑے اخلاص و دردمندی کے ساتھ رسالہ بند کرنے کے خیال سے باز رہنے کی تلقین کی، یہ اس بات کی صاف علامت تھی کہ دینی احساس اور جذبات کا اچھا خاصہ سرمایہ ابھی ہماری قوم میں موجود ہے اور دینی حمیت و محبت صرف تحریک کی منتظر ہے، جو حلقہ "الفرقان" کے تعطل کا روادار نہیں وہ دین کے زوال پر کس طرح راضی ہو سکتا ہے ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس کو ان خطرات کی طرف متوجہ کر دیا جائے جو سر پر منڈلا رہے ہیں اور اس کے جذبۂ اعانت کو دین کی اصولی امداد اور دینی اعانت کے وسیع میدانوں کی طرف موڑ دیا جائے اور وہ دین کے نفس بقا اور امت کی اصلاح و انقلاب کو اپنی کوشش کا ہدف بنا لیں۔

اگر آج امت کا رُخ دین کی جڑوں کی آبیاری [illegible] دین کو سربلند اور سرسبز کرنے والے ذرائع کی امداد کی طرف ہو جائے اور انفاق فی سبیل اللہ کے چند مروجہ و اصطلاحی طریقوں کے بجائے اس کا وسیع مصداق ذہن میں آجائے اور وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کی وہ تفسیر سمجھ میں آجائے جو حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے میدان جہاد میں بیان کی تھی اور کہا تھا کہ یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی تھی جب ہم انصاریوں نے اسلام کی بدنی اور مالی اعانت سے عارضی رخصت اور اپنے

ذاتی کاروبار کے دیکھنے بھالنے کی اجازت چاہی تھی تو یہ آیت نازل ہوئی کہ اسلام کی مدد سے دست کشی خودکشی کے مرادف ہے، تو آج امت کی کوئی ضرورت اٹکی نہ رہے، اور دین کی دعوت کی نشر و اشاعت، غیر مسلموں میں دین کا تعارف، دینی اداروں اور ترجمانوں کے بقاو قیام میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں جو آج پیش آرہی ہیں "ناظرین الفرقان" کی پرجوش ہمت افزائی سے صرف "الفرقان" ہی کے منتظمین کو تقویت اور اطمینان حاصل نہیں ہوا بلکہ دین کے سب خدمت گذاروں کو قلبی قوت اور تائید حاصل ہوئی ہے اور ان کو بڑھتی ہوئی افسردگی اور شکستہ دلی کے اثرات کو شکست دینے اور حوصلہ کو بلند کرنے میں ایک اخلاقی مدد اور مسلمانوں کی دینی زندگی کو ثابت کرنے کے لئے ایک دلیل ہاتھ آگئی ہے' اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس دلیل کی تصدیق فرمائے، اور "الفرقان" کی زندگی "الفرقان" کے لئے اور دینی دعوت و کوشش کے لئے مبارک کرے اور ان سب دوستوں کو دنیا اور آخرت میں اس کی پوری جزا اور اس کا صلہ عطا فرمائے جنھوں نے اس کوشش میں حصہ لیا ہے۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

گذشتہ پرچہ میں "ایک اہم دینی ضرورت" کے عنوان سے اس بدلے ہوئے زمانہ کی نئی نئی دینی ضرورتوں اور وسیع ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھ کر دین کے خادموں کی علمی و ذہنی تربیت کے ایک نئے خاکہ کی تجویز پیش کیگئی تھی یہ تجویز بہت سے تجربوں اور ضرورتوں کے احساس پر مبنی ہے اور اسکے سوا دینی خدمت کی مشکلات اور صاحب فہم و اخلاص کارکنوں کے فقدان کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔ ناظرین کرام سے درخواست ہے کہ وہ ایک بار اس کو پھر پڑھیں اور اسکی اہمیت کا احساس کریں، اور جن احباب نے اس سلسلہ میں کسی اعانت کا ارادہ فرمایا ہو وہ اپنے ارادہ سے جلد مطلع فرمائیں تاکہ اس کام کو جلد شروع کیا جاسکے۔ اِس وقت تک صرف ایک مخلص دوست کا خط اس سلسلہ میں آیا ہے اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید ہمارے اکثر ناظرین نے اس کو غور سے نہیں پڑھا یا اسکی اہمیت کو محسوس نہیں فرمایا — یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام اور اسلامی دعوت کی حفاظت و بقا کیلئے مستقبل میں جو کچھ بھی کرنا ضروری ہے اسکے لئے خاص قسم کے کارکنوں کی تیاری اور انکی علمی و ذہنی تربیت سب سے پہلا کام ہے ——— بہرحال احباب مخلصین سے گذارش ہے کہ وہ گذشتہ اشاعت کے "نگاہِ اولیں" کے صفحات پر پھر نظر ڈالیں اور فیصلہ فرمائیں کہ اس سلسلہ میں وہ کیا کرسکتے ہیں؟۔

ایک خط کا اقتباس

(جو ایک دوست نے دوسرے دینی دوست کے نام لکھا)

"اس زمانہ میں کسی بندہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت ہی بڑا انعام اور بڑا ہی فضل و کرم ہے کہ وہ اس کو دین کا کچھ درد بخش دے اور دین کی خدمت و نصرت کی توفیق عطا فرما دے —— غور تو کیجئے دنیا میں اس وقت کتنے ارب انسان ہیں جن کو اس کا نام لینے کی اور اس کے رسول اور اس کے دین پر ایمان لانے کی توفیق نہیں ملی —— اور پھر کتنے کروڑ ایسے ہیں جو کسی درجہ میں مسلمان تو ہیں، لیکن دین کے درد کا کوئی ذرہ ان بیچاروں کے دلوں کو نہیں بخشا گیا اور خدمت دین (جو نبوت کی میراث ہے) اس میں بھی ان کا کچھ حصہ نہیں رکھا گیا حالانکہ ان میں بہت سے آپ سے زیادہ ذہین، زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ "ترقی یافتہ" ہیں اور بڑے اونچے خاندانوں اور نامور گھرانوں کے بھی ہیں۔

بس حق تعالیٰ کا یہ محض کرم ہی کرم ہے کہ اس نے اسی کار عظیم کی اپنے بعض بندوں کو توفیق دے رکھی ہے اور ان کی طبیعتوں کے رخ کو ادھر پھیر دیا ہے اللّٰھم یا مقلب القلوب ثبت قلوبنا علیٰ دینک۔

بہر حال اس میں اپنا کوئی ہنر اور کمال نہیں ہے بلکہ یہ محض فضل ربی ہے اور نہ اللہ پر یا دین پر کسی کا کچھ احسان ہے بلکہ خود اللہ ہی کا احسان اور کرم ہے کہ اس نے کروڑوں اربوں بندوں میں سے کسی کو ادھر متوجہ کر دیا۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۔ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ ۔

مومن کو چاہیئے کہ جس طرح اولاد کے ہونے یا کاروبار میں اچھا نفع ہونے کی لوگوں کو خوشی

یہ لوگ اسلام لانے کا تم پر احسان رکھتے ہیں تم ان سے کہو کہ مجھ پر احسان نہ رکھو (تم نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا) بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان نصیب فرما دیا۔

ہوتی ہے اس سے بھی زیادہ خوشی اس کو اس کی ہو کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو دین و ایمان بخشا اور اسکی خدمت و نصرت کی بھی کچھ توفیق دی۔ بِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ؁۱

اللہ تعالیٰ کے اس انعام کی عظمت کو اگر ہم سمجھ لیں تو دنیا کی ساری نعمتیں اس کے سامنے حقیر ہو جائیں۔

میرے محترم دوست! دین و ایمان کی اللہ کے نزدیک جو عظمت ہے اب اسکو پیش نظر رکھ کر ہم ذرا سوچیں کہ ہماری برائے نام نصرت و خدمت اور جد و جہد کو اس سے کیا نسبت ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس راہ میں اگر ہم مر مٹیں تو بھی پورا حق ادا نہیں ہو سکتا پھر یہ کتنی بڑی کوتاہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے خاص فضل و کرم سے اپنی رضا کی اس راہ پر ہمیں لگا دیا تو ہم اسقدر سست رفتار سے چل رہے ہیں —— دنیوی مقاصد کے لئے تو ہم دن رات جان کھپاتے رہتے ہیں اور دین کی کوشش کے لئے مہینہ میں چار دن نکالنا بھی ہمارے لئے مشکل ہوتا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیئے کہ یہ اللہ کے انعام کی ناقدری ہے یا نہیں؟

میرے بھائی! اللہ کی رضا اور جنت حاصل کرنے میں اتنی سست رفتاری بڑی ہی کوتاہی ہے اس راہ میں جبتک اپنے جان و مال کو بالکل بے قیمت نہ کر دیا جائے کامیابی مشکل ہے اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ، اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ ؁۲۔

اس عاجز کے نزدیک ہمارے لئے اور ہمارے ان سب دوستوں اور رفیقوں کے لئے جن کو اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے دین کا کچھ درد و فکر بخش دیا ہے اور جنھوں نے دین کی عظمت و اہمیت کو کچھ جان لیا ہے ضروری ہے کہ دین میں ترقی اور دین کی خدمت و نصرت کو اپنی زندگی کا مقصد اپنے وجود کی غایت قرار دے لیں اور طے کر لیں کہ ہمارا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لئے ہونا چاہئے —— اور معاشی مشاغل میں ہماری مشغولیت بھی اسی مقصد کے ماتحت اور گویا اس کے ضمن میں ہو، یہی ایمان کی شان ہے۔

اور دین سے بے فکر اور بے پروا ہو کر تجارت یا محنت و مزدوری یا کسی دوسرے معاشی مشغلہ میں لگے رہنا کفر اور نفاق کی شان ہے —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تھے …… وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا، وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَخَافُكَ وَلَا يَرْحَمُنَا،

(اے اللہ تو ہمیں ایسا نہ کر کہ دنیا ہماری سب سے بڑی فکر اور ہمارے ذہن و دماغ کی پرواز کا منتہا اور ہماری رغبت و خواہش کی انتہا ہو جائے)

؁۱ یہ قرآن شریف کی آیت ہے ترجمہ یہ ہے لوگوں کو اس نعمت پر خوش ہونا چاہیے یہ دنیا کی دولت اور خزانوں سے بھی بڑھ کر ہے اور بہتر ہے ؁۲ یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے ترجمہ یہ ہے کہ "اللہ کا سودا بہت قیمتی ہے سستا نہیں ہے"۔

اسلام اور نظریۂ وحدت ادیان

(ادارہ)

کچھ دنوں سے ہندوستان میں ایک آواز اٹھ رہی ہے اور بڑی تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے چونکہ اُس کا تعلق انسانیت کے سب سے اہم اور نازک مسئلہ سے ہے اس لئے ضروری ہے کہ سنجیدگی سے اس پر غور کیا جائے اور صفائی کے ساتھ اظہار خیال کیا جائے یہ آواز ہے کہ ــــ "سب مذاہب دراصل ایک ہیں اور سب سچے ہیں"

جہانتک دوسرے ادیان و مذاہب کا تعلق ہے، ان کی طرف سے تو ہمیں بولنے کا حق نہ ہے نہ ضرورت، لیکن اسلام کا اس بارے میں جو نظریہ ہے اس کی وضاحت ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں بعض ایسے لوگوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ "وحدت ادیان" کے اس نظریہ کے حامی ہیں لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ "وحدت ادیان" سے آپ کا کیا مطلب ہے تو انھوں نے بتلایا کہ ہمارا مطلب صرف اس قدر ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور انسانیت کو اپنا اصول بنالیں اور مذہب کے نام پر جس طرح کے فساد انگیز لڑائی جھگڑے پچھلے دنوں ہوتے رہے ہیں اس غلط اور تباہ کن طریقہ کو سب چھوڑ دیں۔

ظاہر ہے کہ اس مقصد سے کسی معقول آدمی کو اختلاف نہیں ہو سکتا اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بعینہ اسلام کی تعلیم و ہدایت ہے لیکن اس مطلب کیلئے وحدت ادیان کا عنوان اختیار کرنا اور یہ کہنا کہ سب مذاہب دراصل ایک ہیں بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص اعلان کرے کہ زہر اور تریاق تندرستی اور بیماری، روشنی اور تاریکی، تلخی اور شیرینی ہدایت اور گمراہی سب ایک ہی ہیں اور سب اچھی ہیں

اور پوچھنے پر وہ کہیں کہ میرا مطلب صرف اسقدر ہے کہ یہ سب چیزیں ایک ہی خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں۔
ظاہر ہے کہ شریعت، اخلاق اور زبان و ادب کس لحاظ سے بھی یہ طریقہ درست نہیں ہے، بلکہ دین کی اصطلاح میں اس طرز کلام کا نام "تلبیس" ہے اور اس کا نتیجہ اللہ کے بندوں کی گمراہی ہے۔ "وحدت ادیان" کے لفظ کا جو ظاہری مطلب ہے اور جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ تمام مذاہب مثلاً یہودیت، مجوسیت، مسیحیت، ہندو دھرم، سکھ مت، بدھ مذہب اور اسلام سب ایک ہی ہیں ان میں باہم کوئی اصولی اور بنیادی فرق نہیں ہے، لہذا سب برحق ہیں اور انسان ان میں سے ہر ایک کی پیروی کر کے نجات حاصل کر سکتا ہے جو لوگ ہندو مذہب اور ویدانت فلسفہ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ نظریہ اسکی روح کے عین مطابق ہے اور اس لئے ہر سچے اور دھارمک (مذہبی) ہندو کا نظریہ اور عقیدہ یہی ہونا چاہئے اور واقفین کو یہ بھی معلوم ہے جس بڑی اور مشہور شخصیت نے اس دور میں اس نظریہ کو نئی زندگی بخشی اور اپنے فلسفہ کی اس کو بنیاد بنایا وہ گاندھی جی کی شخصیت تھی۔ اور ان کے بعد جس بڑی شخصیت کی خاص تائید اور سرپرستی اسی مسلک کو حاصل ہوئی ہے وہ ہندوستان کے موجودہ گورنر جنرل راجگوپال اچاریہ جی ہیں، وہ بڑے خلوص اور صفائی کے ساتھ ہمیشہ اس کا اعلان کر رہے ہیں۔ اور ان کی تقریروں میں، اس بارہ میں کوئی ابہام بھی نہیں ہے، اسی طرح گاندھی جی بھی اس موضوع پر جب اظہار خیال کرتے تھے تو صفائی اور صراحت سے کام لیتے تھے وہ صاف کہتے تھے کہ سب مذاہب دراصل ایک ہی ہیں اور سب سچے ہیں اور اس لئے نجات کسی خاص دین و مذہب کی پیروی میں منحصر نہیں ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق بالکل صحیح کہتے تھے، اور اسی طرح ہمیں اس میں بھی شک نہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اسوقت جن حالات میں ہیں اور ان کے خلاف ہندوؤں کے بعض طبقوں میں جو خطرناک تعصب اور جو غیظ و غضب پھیلا ہوا ہے، اس نظریہ کی اشاعت سے اس میں بہت کچھ تخفیف کی امید ہے اور اس لحاظ سے مسلمانوں کے ساتھ یہ ایک طرح کی بہی خواہی اور ہمدردی بھی ہے

لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہی ہمارے نزدیک زیادہ اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کا دعویٰ اور اس کی دعوت اس کے برخلاف ہے اسلام اس کا مدعی ہے کہ دنیا میں جو ادیان و مذاہب رائج ہیں ان میں سے حق صرف ایک ہے اور نجات اسی کی پیروی میں منحصر ہے لہذا تمام بنی نوع انسان کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنا دین بنائیں اور وہ وہ دین ہے جو فطرت الٰہی کا

اتارا ہوا ہے، اور وہ اصولی طور پر ہمیشہ سے ایک ہی ہے اور مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں انبیا علیہم السلام اس کی تعلیم کے لئے آتے رہے ہیں لیکن اب سے قریباً چودہ سو برس پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور اب قیامت تک کے لئے انھیں کا لایا ہوا دین اللہ کی طرف سے مستند اور "دین حق" ہے اور موت کے بعد والی زندگی میں نجات و فلاح اسی کی پیروی میں منحصر ہے اور اسی کا نام "الاسلام" ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ (اللہ کی کتاب) (قرآن مجید) میں فرمایا گیا ہے إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (یعنی مقبول دین اللہ کے نزدیک بس "الاسلام" ہے) دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور طریقہ کو اپنا دین بنانا چاہیے تو وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خاسرین میں رہے گا) چونکہ یہ ایک اصولی اور بنیادی مسئلہ ہے اور خدا کا داعی اپنے لائے ہوئے دین کی طرف لوگوں کو دعوت قوت کے ساتھ جب ہی دے سکتا ہے اور اس کی لائی ہوئی ہدایت کی ضرورت لوگوں پر جب ہی واضح ہو سکتی ہے جب کہ وہ لوگوں کو یہ بھی بتلا دے کہ تم جس دین کو اپنائے ہوئے ہو اور جسکو حق اور صحیح سمجھ رہے ہو وہ درحقیقت صحیح نہیں ہے اور اللہ اس سے ہرگز راضی نہیں ہے اس لئے قرآن مجید میں اس کو بہت صراحت اور تاکید سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی لئے مذکورۂ بالا آیت میں لَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ کے نہایت تاکیدی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور "وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ" سے اسکی مزید تاکید کی گئی ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اعلان فرمایا ہے "والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یومن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحاب النار (صحیح مسلم) (قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اس امت یعنے اس دور کے جس یہودی یا نصرانی کو میری دعوت پہونچی اور وہ اس تعلیم و ہدایت پر ایمان لائے بغیر مرگیا جو اللہ نے میرے ذریعہ بھیجی ہے اور اس نے اس کو اپنا دین نہ بنایا تو مرنے کے بعد دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگا)

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم نے) اس اعلان میں

مثلاً یہودیوں اور نصرانیوں کا ذکر کیا جن کے متعلق یہ مسلم ہے کہ ان کا دین دراصل خدا کا بھیجا ہوا دین حق تھا جو یہ اپنے وقت میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) لائے تھے لیکن چونکہ بعد میں اس میں بہت کچھ خلط ملط ہو گیا نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد پچھلی شریعتیں منسوخ ہو گئیں اس لئے اب کوئی شخص یہودیت اور نصرانیت پر قائم رہتے ہوئے نجات کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ تو جب یہودیوں اور نصرانیوں کے لئے بغیر اسلام کو اختیار کئے نجات ممکن نہیں، تو ان قوموں کا کیا ذکر جن کے دین و مذہب کے متعلق یہودیت اور نصرانیت کی طرح یقینی طور پر معلوم نہیں کہ کسی وقت وہ الٰہی اور سماوی دین تھے۔

اور ایک دوسری صحیح حدیث میں تو صفائی کے ساتھ یہاں تک فرمایا گیا ہے "لو کان موسیٰ حیا ما وسعہ الا اتباعی (یعنی اگر خدا کے سچے پیغمبر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس زمانہ میں ہوتے تو ان کے لئے بھی میری لائی ہوئی شریعت کی پیروی ضروری ہوتی اور کسی اور طریقہ پر چلنا ان کے لئے جائز نہ ہوتا)

بہر حال قرآن و حدیث کی ان شہادتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام پوری قوت کے ساتھ اس کا مدعی ہے کہ اس دور میں انسانوں کے لئے اللہ کی رضا کا حصول اور مرنے کے بعد والی زندگی میں نجات و فلاح، اسی دین کی پیروی پر منحصر ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بھیجا جس کا نام "الاسلام" ہے اور "قرآن" جس کا مرکزی ہدایت نامہ ہے۔

اور اگر دوسرے رائج الوقت ادیان و مذاہب پر چل کر بھی اللہ کی رضا اور نجات حاصل ہو سکتی تو کوئی نبی و رسول اپنے لائے ہوئے دین کی طرف لوگوں کو کیوں بلاتا۔ ہر پیغمبر نے اپنے مخاطبین کو اپنے لائے ہوئے دین کی دعوت اسی بنیاد پر دی ہے کہ تم جن راستوں پر چل رہے ہو وہ غلط ہیں اور صحیح اور سیدھا راستہ صرف وہ ہے جو میں تم کو بتلا رہا ہوں۔ سب پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں سے یہی کہا اور اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اسی واسطے بھیجا۔ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر اعلان کیا گیا ہے

"هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (یعنی وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول (محمد) کو بھیجا "ہدایت" اور "دین حق" لے کر تاکہ وہ اس کو غالب کر دے

دوسرے سب دینوں پر"

بہرحال اسلام کا دعوی یہی ہے اور اس کی دعوت کی یہی بنیاد ہے کہ بنی نوع انسان کے مختلف طبقوں نے اللہ کی طرف سے کسی سند کے بغیر جن بہت سے ادیان ومذاہب کو حق اور صحیح سمجھ کر اختیار کر رکھا ہے اور وہ اس گمان میں ہیں کہ ان مذہبوں کی پیروی سے ہم کو اللہ کی رضا اور نجات حاصل ہو سکتی ہے" وہ غیر حق ہیں، یا تو انسانوں کے بالکل من گھڑت ہیں یا چند ایسے ہیں جن کی اصل کبھی صحیح تھی لیکن بعد میں ان میں بہت سی غلطیاں شامل ہو گئیں اور اب وہ ان ہی اغلاط واوہام کا مجموعہ ہیں اور رضا کے آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ کی طرف سے ان کے منسوخ اور غیر معتبر ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور اس لئے اب وہ بھی "ناحق ہی ہیں" اور "دین حق" اب صرف وہی دین ہے جو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ آیا اور پوری طرح محفوظ اور تروتازہ ہے اور اب قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کی نجات وفلاح اسی کی پیروی میں منحصر ہے اور اب وہی "الاسلام" ہے

اسلام کے اس دعوے کی وضاحت ہم نے اس لئے ضروری سمجھی کہ —— "وحدت ادیان" کی جو آواز اس وقت بلند ہو رہی ہے چونکہ اس میں ایک طرح کی رواداری اور وسعت قلبی کی جھلک ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس میں بہی خواہی کا بھی ایک پہلو ہے (اور شاید اسی وجہ سے اسلام کے وہ ترجمان اور نمائندے اس پر خاموش ہیں جن کو خاموش نہ رہنا چاہئے تھا) بہرحال ان وجوہ سے ہمارے نزدیک اس کا بہت امکان اور خطرہ ہے کہ مسلمانوں کے وہ طبقے جو اپنے دین سے پوری واقفیت نہیں رکھتے ہیں مبادا کہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں بلکہ ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہ غلط فہمی پھیلنی شروع ہو گئی ہے اور بعض سادہ لوح مسلمان اس طرح کے بول بولنے لگے ہیں اور وہ اس کو بس "رواداری" اور "وسعت قلبی" ہی سمجھتے ہیں حالانکہ اس نظریہ کو مان لینا در اصل اسلام کے بنیادی دعویٰ سے انحراف کے مرادف اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی دعوت کی تکذیب کے ہم معنیٰ ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ جان ومال کی حفاظت سے زیادہ ضروری اہل ایمان کے ایمان کی حفاظت ہے۔

نیز پوری بصیرت کے ساتھ ہمیں یقین ہے کہ مسلمانوں کو اس ملک میں عزت ووقار کی زندگی صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے کو عملی زندگی میں سچا مسلمان بنائیں اور دوسروں کی غمخواری

جس بے روح اور بے اصول قومیت کے جاہلی تصور کو انھوں نے اپنایا تھا اس سے اور اس کے پیدا کیے ہوئے غیر اسلامی تعصبات سے یکسر تائب ہو کر ایک با اصول اور صاحب دین و دعوت امت کی طرح اس ملک میں زندگی گزاریں اسلامی زندگی اور اسلامی اخلاق ہی میں اتنی کشش اور محبوبیت ہے کہ انسانی فطرت پروانہ ہو کر اس پر گرے گی۔

الغرض اس وقت ہندی مسلمانوں کے سامنے اپنی بگڑی بنانے کے دو راستے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ وسیع المشربی اور رواداری کے نام سے الحاد و منافقت کی راہ اختیار کریں اور اپنے آپ کو قول و عمل سے ایسا ظاہر کریں کہ دوسرے لوگ ان کو اپنے میں سے یا قریب قریب اپنے میں سے سمجھنے لگیں جس کا انجام یہی ہوگا کہ اگلی نسلوں میں جا کر دوئی بالکل ختم ہو جائے اور پھر مسلم اور غیر مسلم کا کوئی سوال نہ رہے اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی موجودہ جاہلی اور غیر اسلامی زندگی چھوڑ کر اصل اسلامی زندگی اختیار کرلیں اعتقادات، عبادات، اخلاق و معاملات، گفتار و کردار غرض ہر پہلو سے سچے اور پورے مسلمان بنیں اور پھر دیکھیں کہ اس ملک کی فضا ان کے لئے کتنی خوشگوار ہوتی ہے اور اپنی ہی غیر اسلامی حرکتوں سے جن لوگوں کو دشمن جان بنالیا ہے وہی کل کس طرح عقیدت مند اور قدرداں ہو جاتے ہیں

پہلا راستہ الحاد کا ہے اور اس کا آخری انجام جہنم ہے اور دوسرا راستہ ایمان و عمل صالح کا ہے اور اس کا انجام دنیا میں عزت و وقار اور آخرت میں دائمی نجات فلاح ہے لیکن کیا عرض کیا جائے مسلمان کہلانے والی قوم کا مزاج اس وقت اس قدر فاسد ہو چکا ہے کہ غلط راہوں پر تو وہ تیزی سے دوڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن سیدھی راہ کی طرف پیش قدمی ان کو پہاڑوں کی چڑھائی سے زیادہ سخت معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کی طرف نہیں آتے گویا کہ قرآن کی یہ آیت انھیں کے حق میں ہے اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ[1]

---

[1] ترجمہ:- جب وہ صحیح راستہ دیکھتے ہیں تو اس کو اپنا راستہ نہیں بناتے اور جب غلط راستہ دیکھتے ہیں تو اس کو اپنی راہ بنالیتے ہیں۔

روشنی کا مینار

(از جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

ذرا چودہ سو برس پہلے کی دنیا پر نظر ڈالئے، اونچی اونچی عمارتوں، سونے چاندی کے ڈھیروں اور زرق برق لباسوں کو چھوڑ دیجئے، تو آپ کو پرانی تصویروں کے مرقع اور مردہ عجائب خانہ میں بھی نظر آجائیں گے، یہ دیکھئے کہ انسانیت بھی کہیں جیتی جاگتی تھی، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھر کر دیکھ لیجئے اور سانس روک کر آہٹ لیجئے، کہیں اس کی نبض چلتی ہوئی اور اس کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے؟ زندگی کے سمندر میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھائے جا رہی تھی: انسانیت کے جنگل میں شیر اور چیتے سور اور بھیڑئے بکریوں اور بھیڑوں کو پھاڑے کھا رہے تھے، بدی نیکی پر، رذالت شرافت پر، خواہشات عقل پر، پیٹ کے تقاضے روح کے تقاضوں پر غالب آچکے تھے، لیکن اس صورت حال کے خلاف اتنی لمبی چوڑی زمین پر کہیں احتجاج تھا؟ انسانیت کی چوڑی پیشانی پر غصہ کی کوئی شکن نظر آتی تھی؟ ساری دنیا نیلام کی ایک منڈی بن چکی تھی، بادشاہ و وزیر، غریب و امیر، اس منڈی میں سب کے دام لگ رہے تھے اور سب کوڑیوں میں بک رہے تھے، کوئی ایسا بھی تھا جس کا جوہر انسانیت خریداروں کے حوصلہ سے بلند ہو اور جو پکار کر کہے کہ یہ ساری فضا میری ایک اڑان کے لئے کافی نہیں، یہ ساری دنیا اور یہ پوری زندگی میرے حوصلہ سے کم تھی، اس لیے ایک دوسری ابدی زندگی میرے لئے پیدا کی گئی ہے، میں اس فانی زندگی اور اس محدود دنیا کی ایک چھوٹی سی کسر پر اپنی روح کو کس طرح فروخت کر سکتا ہوں؟ قوموں اور ملکوں کے اوراق سے گذر کر قبیلوں اور برادریوں کے اور اُن سے آگے بڑھ کر کنبوں اور گھرانوں کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بن گئے تھے اور بڑے بڑے بلند ہمت انسان جن کو اپنی سرفرازی اور سربلندی کے بڑے اونچے دعوے تھے، بالشتیوں کی طرح ان گھروندوں میں رہنے کے عادی

بن چکے تھے، کسی کو ان میں تنگی اور گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی اور کسی کو اس سے زیادہ وسیع دنیا اور اس سے وسیع تر انسانیت کا تصور باقی نہیں رہا تھا، زندگی بہاری سود و سودا اور مکر و فن بن کر رہ گئی تھی، انسانیت ایک سرد لاشہ تھا جس میں کہیں روح کی تپش، دل کا سوز اور عشق کی حرارت باقی نہیں رہی تھی، انسانیت کی سطح پر خود رو جنگل اُگ آیا تھا ہر طرف جھاڑیاں تھیں جن میں خونخوار درندے اور زہریلے کیڑے تھے یا دلدلیں تھیں جن میں جسم سے لپٹ جانے والی اور خون چوسنے والی جونکیں تھیں، اس جنگل میں ہر طرح کا خوفناک جانور ہر طرح کا شکاری پرندہ اور ان دلدلوں میں ہر قسم کی جونک پائی جاتی تھی لیکن آدم زادوں کی اس بستی میں کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا، جو تھے وہ غاروں کے اندر پہاڑوں کے اوپر اور خانقاہوں اور عبادت گاہوں کی خلوتوں میں چھپے ہوئے زندگی سے آنکھیں بند کر کے فلسفہ سے اپنا دل بہلا رہے تھے یا شاعری سے اپنا غم غلط کر رہے تھے اور زندگی کے میدان میں کوئی مرد میدان نہ تھا،

دفعتاً انسانیت کے اس سرد جسم میں گرم خون کی ایک رو دوڑی نبض میں حرکت اور جسم میں جنبش پیدا ہوئی جن پرندوں نے اس کو مردہ سمجھ کر اس کے بے حس جسم کی ساکن سطح پر بسیرا کر رکھا تھا ان کو اپنے گھر ہلتے ہوئے اور اپنے جسم لرزتے ہوئے محسوس ہوئے، قدیم سیرت نگار اس کو اپنی خاص زبان میں یوں بیان کرتے ہیں کہ کسرےٰ شاہ ایران کے محل کے کنگرے گرے اور آتش پارس ایک دم سے بجھ گئی، انسانیت کا مورخ اس کو اس طرح بیان کرے گا کہ انسانیت کی اس اندرونی حرکت سے اس کی بیرونی سطح میں اضطراب پیدا ہوا۔ اس کی اس ساکن و بے حرکت سطح پر جتنے کمزور اور بودے قلعے بنے ہوئے تھے ان میں زلزلہ آیا، مکڑی کا ہر جالہ ٹوٹتا اور تنکوں کا ہر گھونسلہ بکھرتا نظر آیا زمین کی اندرونی حرکت سے اگر سنگین عمارتیں اور آہنی برج خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ سکتے ہیں، تو پیغمبر کی آمد آمد سے کسریٰ و قیصر کے خود ساختہ نظاموں میں تزلزل کیوں نہ ہوگا زندگی کا یہ گرم خون جو انسانیت کے سرد جسم میں دوڑا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا واقعہ ہے جو متمدن دنیا کے قلب مکہ معظمہ میں پیش آیا آپ نے دنیا کو جو پیغام دیا اس کے مختصر لفظ زندگی کی تمام وسعتوں پر حاوی ہیں تاریخ گواہ ہے کہ انسانی زندگی کی جڑیں اور اس کے جھوٹے قصر زندگی کی بنیادیں کبھی اس زور سے نہیں ہلائی گئیں جیسی اس پیغام لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کے اعلان سے ہلائی گئیں اور دنیا کے بلید ذہن پر کبھی ایسی چوٹ نہیں پڑی تھی جیسے ان لفظوں سے پڑی۔ وہ غصہ سے تلملا گیا اور اس نے جھنجھلا کر کہا اجعل الآلھۃ الٰھا واحدا ان ھذا لشئ عجاب (کیا ان سب کو جن کی ہم پرستش کرتے تھے اور جن کے ہم بندے بنے ہوئے تھے اڑا کر ایک ہی معبود و مقصود رکھا ہے یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہے) اس ذہن کے نمائندوں نے فیصلہ کیا کہ یہ ہمارے نظام زندگی کے خلاف ایک گہری اور منظم سازش ہے اور ہم کو اس کا مقابلہ کرنا ہے وانطلق الملأ منھم ان امشوا واصبروا علیٰ آلھتکم ان ھذا لشئ یراد (ان کے سردار اور ذمہ دار ایک دوسرے کے پاس گئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو یہ تو کوئی ملے کی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے) یہ نعرہ زندگی اور انسانیت کے پورے تصور پر ایک کاری ضرب تھی جو ذہن کے پورے سانچہ اور زندگی کے پورے ڈھانچہ کو متاثر کرتی تھی اس کا مطلب تھا، جیسا آج تک سمجھا جاتا رہا یہ دنیا کوئی خودرو جنگل نہیں بلکہ یہ مالی کا لگایا ہوا آراستہ باغ ہے اور انسان اس باغ کا سب سے اعلیٰ پھول، یہ گل سرسبد جو ہزاروں بہاروں کا سرمایہ ہے بے مقصد نہیں کہ مل دل کر رہ جائے، انسان کے جوہر انسانیت کی اس کے خالق کے سوا کوئی قیمت نہیں لگا سکتا اس کے اندر وہ لامحدود طلب وہ بلند ہمت۔ وہ بلند پرواز روح اور وہ مضطرب دل ہے کہ یہ ساری دنیا مل کر اس کی تسکین نہیں کرسکتی۔ اور یہ سست عناصر دنیا اس کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ اس کے لئے غیر فانی زندگی اور ایک لامحدود دنیا درکار ہے جس کے سامنے یہ زندگی ایک قطرہ اور یہ دنیا بازیچۂ اطفال ہے وہاں کی راحت کے سامنے یہاں کی راحت اور وہاں کی تکلیف کے سامنے یہاں کی تکلیف کوئی حقیقت نہیں رکھتی، اس لئے انسانیت کا فطری تقاضا خدائے واحد کی عبادت اس کی خود شناسی رضائے الٰہی کی طلب اور اس کی زندگی اس کے لئے جدوجہد ہے۔ انسان کو کسی روح کسی مخفی و فرضی طاقت۔ کسی درخت اور پتھر کسی قسم کی دھات اور جمادات، کسی مال و دولت، کسی جاہ و عزت کسی طاقت و قوت اور کسی روحانیت و عظمت کے سامنے بندوں کی طرح جھکنے اور معبود کی طرح پامال ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف ایک بلندی کے سامنے سب سے زیادہ پست اور سب پستیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ بلند ہے وہ سارے عالم کا مخدوم اور ایک ذات کا خادم ہے اس کے سا۔

فرشتوں کو سجدہ کرا کر اور اس کو اللہ کے سوا ہر ایک کے سجدہ سے منع کر کے ثابت کردیا کہ کائنات کی طاقتیں جن کے فرشتے امین ہیں اس کے سامنے سرنگوں اور سربسجود ہیں اور اس کا سر اس کے جواب میں اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے

دنیا کا ذہن اتنا شل ہو چکا تھا کہ وہ مادیات و محسوسات اور جسم او ر پیٹ کے حدود سے باہر آسانی سے کام نہیں کر سکتا تھا۔ لوگوں کا ذہن اتنا اتھلا ہو چکا تھا کہ وہ کسی انسان سے متعلق گہرا اور بلند تصور قائم ہی نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے کچھ پیمانے بنا رکھے تھے ہر نئے شخص کو اسی پیمانہ سے ناپتے تھے۔ زندگی کی جو چھوٹی چھوٹی بلندیاں بن چکی تھیں ہر بلند انسان کو انھیں کے سامنے لاکر دیکھتے تھے انھوں نے بڑے غور و فکر اور ذہانت سے کام لیا اور وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کے آگے نہ سوچ سکے کہ یا تو وہ مال و دولت کے یا سرداری و بادشاہی کے یا عیش و عشرت کے طالب ہیں انصاف کیجئے تو اس وقت تک دنیا کا تجربہ اس سے زیادہ اور کیا تھا اور اس نے اپنے زمانہ کے حوصلہ مندوں اور شہبازوں کی اس سے بلند پرواز کب دیکھی تھی؟ انھوں نے آپ کی خدمت میں ایک وفد بھیجا، دراصل اس عصر کے ذہن و دماغ اور نفسیات کی بھی نمائندگی اور اس نے جو کچھ کہا وہ زمانہ کے احساسات کی صحیح ترجمانی تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا جو جواب دیا وہ نبوت کی صحیح نمائندگی اور امت مسلمہ کی حقیقت کا اصلی اظہار تھا۔ آپ نے ثابت کردیا کہ آپ ان میں سے کسی چیز کے طالب نہیں، آپ جس چیز کے داعی ہیں وہ ان کی ان بلند چیزوں سے اس سے بھی زیادہ اونچی ہے جتنا آسمان اس زمین سے۔ آپ اپنی ذاتی راحت اور ترقی کے لئے فکر مند نہیں بلکہ نوع انسانی کی نجات اور اس کی راحت کے لئے بے چین ہیں، آپ اس دنیا میں اپنے لئے کوئی مصنوعی جنت بنانے کے خواہشمند نہیں بلکہ جنت سے نکالے ہوئے انسان کو حقیقی جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل کرنا چاہتے ہیں، آپ اپنی سرداری کے لئے کوشاں نہیں بلکہ تمام انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر بادشاہ حقیقی کی غلامی میں داخل کرنا چاہتے ہیں اسی بنیاد پر یہ امت بنی اور یہی پیغام لے کر وہ تمام دنیا میں پھیل گئی، اس کے سفیروں نے جو اپنے اندر دعوت کی بھی روح اور اسلام کی صحیح زندگی رکھتے تھے کسریٰ اور قیصر کے بھرے دربار میں صاف کہہ دیا کہ "ہم کو اللہ نے اس کام کے لئے

مقرر کیا ہے کہ ہم اس کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں، دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت میں اور مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے انصاف میں داخل کریں،" ان کو جب اپنے اصولوں پر حکومت قائم کرنے اور چلانے کا موقع ملا تو وہ جو کچھ کہتے تھے اور جس کی دوسروں کو دعوت دیتے تھے اس کو جاری کر کے دکھا دیا، ان کی معیاری حکومت کے زمانہ میں کسی انسان کی بندگی نہیں ہوتی تھی بلکہ اللہ کی بندگی ہوتی تھی، کسی انسان یا جماعت کا حکم نہیں چلتا تھا بلکہ اللہ کا حکم چلتا تھا ان کا حاکم جس کو وہ خلیفہ کہتے تھے، معمولی سی انسانی تحقیر پر کہہ اٹھتا تھا کہ "لوگ ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے تم نے ان کو کب سے غلام بنا لیا" ان کا چھوٹے سے بڑا حاکم بڑی بڑی بادشاہتوں کے دار السلطنت میں اس شان سے رہتا تھا کہ لوگ اس کو مزدور سمجھ کر اس کے سر پر بوجھ رکھ دیتے تھے اور وہ اس کو ان کے گھر پہونچا آتا تھا، ان کا دولتمند سے دولتمند انسان اس طرح زندگی گزارتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس زندگی کو زندگی اور اس کی راحت کو راحت ہی نہیں سمجھتا، اس کی نظر کسی اور زندگی پر اور اس کو طلب کسی اور راحت کی ہے۔

اس امت کا وجود دنیا کے ہر گوشہ میں مادی حقیقتوں اور جسمانی لذتوں کے علاوہ ایک بالکل دوسری حقیقت کے وجود کا اعلان تھا، اس کا ہر فرد پیدا ہو کر بھی اور مر کر بھی اس حقیقت کا اعلان کرتا تھا کہ دنیا کی طاقتوں سے بڑی ایک دوسری طاقت ہے اور اس زندگی سے زیادہ حقیقی دوسری زندگی ہے وہ دنیا میں آتا تھا تو اس کے کان میں اسی حق کی اذان دی جاتی تھی مرتا تھا تو اسی شہادت و مظاہرہ کے ساتھ اس کو رخصت کیا جاتا تھا، جب اس دنیا پر بے حسی اور موت کا سکوت طاری ہو جاتا اور شہر کی ساری آبادی معاش کی جد و جہد میں سر تا پا غرق ہو جاتی اور دنیا میں مادی ضرورتوں کے علاوہ کوئی اور ضرورت اور محسوس حقیقتوں کے علاوہ کوئی اور حقیقت جیتی نظر نہ آتی۔ اس کی ایک اذان اس طلسم کو توڑ دیتی اور اس کا اعلان کرتی کہ نہیں جسم اور پیٹ سے زیادہ ایک دوسری روشن حقیقت ہے اور وہی کامیابی کی راہ ہے حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح بازار کا شور اس نعرۂ حق کے سامنے دب جاتا اور سب حقیقتیں اس حقیقت کے سامنے ماند پڑ جاتیں اور اللہ کے بندے اس آواز پر دیوانہ وار دوڑ پڑتے۔

جب رات کو پورا شہر میٹھی نیند سوتا تھا اور یہ جیتی جاگتی دنیا ایک وسیع قبرستان ہوتی دفعتاً موت کی اس بستی میں زندگی کا چشمہ اس طرح ابلتا جس طرح رات کی سیاہی میں صبح کی سپیدی نمودار ہو اور الصلوٰۃ خیر من النوم سے اونگھتی سوتی انسانیت کو تازگی اور زندگی کا نیا پیغام ملتا، جب کسی طاقت و سلطنت کا کوئی فریب خوردہ انا ربکم الاعلیٰ اور ما لکم من الٰہ غیری کا نعرہ لگاتا تو ایک غریب موذن اسی کی مملکت کی بلندیوں سے اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کر اس کے دعوائے خدائی کا تمسخر اڑاتا اور اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کہہ کر حقیقی بادشاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیتا اس طرح دنیا کا مزاج بے اعتدالی سے اور اس کا دماغ بہکنے سے محفوظ رہتا۔

مادی زندگی کا کوئی شعبہ مومن کے دم سے قائم نہیں، وہ اگر کسی ملک سے چلا جائے تو اس کی ظاہری زندگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا دنیا جس طرح کھاتی کماتی ہے کھاتی کماتی رہے گی انسان جس طرح جیتے مرتے ہیں جیتے مرتے رہیں گے، مگر یاد رہے کہ زندگی کی روح نکل جائے گی اور وہ ایک بے جان جسم ہو کر رہ جائے گی عقل کے اس ہنگامہ میں جہاں خود پرستی اور شکم پرستی کے سوا کچھ نہیں وہی ایک مجذوب ہے جس کے عشق و مستی سے اس عالم میں گرمی و ہنگامہ ہے وہ اگر نکل جائے تو دنیا صرف تجارت کی منڈی اور زندگی فقط نا و نوش ہے، زندگی کے اس "گمان آباد" میں وہی ایک صاحب یقین ہے جس کا یقین ٹوٹے ہارے دلوں کا سہارا اور ناکامی و ناامیدی کے سمندر میں ڈوبنے والوں کے لئے کنارہ ہے، خود غرضی اور خود مطلبی کے اس بازار میں وہی ایک صاحب ایثار ہے جو اپنی جان پر کھیل جاتا ہے اور اپنا سرمایہ دوسروں کے لئے لٹا دیتا ہے، بے حس انسانوں کی دنیا میں جو سینہ میں دل کی جگہ پتھر کی سل رکھتے ہیں وہی ایک صاحب محبت ہے جو سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں رکھتا ہے اور اپنے سوز سے خود ہی جلتا اور پگھلتا رہتا ہے ہر زمانہ میں فقر پر امارت کو گدائی پر بادشاہی کو، آخرت پر دنیا کو ادھار پر نقد کو، غیب پر شہود کو ایمان پر بدن کو قربان کرنے کی اسی میں سب سے زیادہ ہمت ہے،

اس پر کسی ملک کا احسان نہیں کہ اس نے اس کو مہمان بنایا اور رہنے کو جگہ دی، اس کا ہر ملک پر احسان ہے کہ اس نے اس کو توحید خالص کا پیغام سنایا، انسان دوستی اور عدل مساوات کا سبق پڑھایا، انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکالا غریب امیر اور شیخ و برہمن کو ساتھ ساتھ بیٹھنا

سکھایا، عورت کو اس کا حصہ دلایا اور اس کے ساتھ انصاف کرنا سکھایا انسانیت کا احترام کرنا بتایا، زندگی کا زیادہ بامعنی، انسانیت کا زیادہ بلند اور دنیا کا زیادہ وسیع تصور بخشا، نسل پرستی دولت پرستی شاہ پرستی سے نجات دی، ترک دنیا، تجرد، نسل کشی آدم بیزاری، لکھوکھا ہزاروں برس کے اوہام و مفروضات کا طلسم توڑا، عقل کو بندھنوں سے آزاد کیا، علم پر سے پابندیاں ہٹائیں دین پر سے نسلی و خاندانی اجارہ داری کو ختم کیا، ذاتی عمل اور کوشش کی اہمیت واضح کی، آج دنیا علم و عقل کی جس منزل پر ہے کون نہیں جانتا کہ یہ اسی کی جگر سوزی کا نتیجہ ہے جو کبھی انسانیت کا قافلہ سالار تھا، آج یورپ علم و عقل میں دنیا کا استاد بنا ہوا ہے کون نہیں جانتا کہ اہل اندلس کی نگاہ نے صدیوں اس کی تربیت کی ہے اور حیوانات کی سطح سے اس کو بلند کیا ہے؟ آج ہندوستان میں عدل و مساوات انسانیت اور عالمگیر ہمدردی کے لفظ بڑے عام ہیں کون انکار کر سکتا ہے کہ بڑی مشکل سے یہ لفظ یہاں رائج ہوئے ہیں اور ذہن ان کے مفہوم سے آشنا ہوئے ہیں،!

مسلمان کسی قوم و نسل اور اسلام کسی رسم و رواج اور کسی ترکہ و میراث کا نام نہیں وہ ایک دعوت و پیام اور ایک سیرت اور زندگی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی نظر مادیات محسوسات اور جسم و جان سے تعلق رکھنے والی محدود دنیا سے زیادہ وسیع ہو، اس کی ہمت شکم پری اور تن پوشی کی سطح سے بلند ہو، اس کا گھر ایک وطن کی چار دیواری سے زیادہ وسیع ہو اس کا دل انسانیت کے احترام سے معمور، اس کی ہمدردی قوم و نسل کے حدود اور ملک و وطن کے قیود سے آزاد ہو، اس کی تگ و دو اور پرواز موت ہی تک نہ ہو اس کا مطلب ہے کہ اس کے پاس جسم کے ساتھ قلب و روح کی تسکین کا بھی سامان ہے، اس کے پاس وہ ایمانی طاقت اور اخلاقی تعلیم ہے جو اندھیرے اُجالے، مجمع اور تنہائی فقیری اور بادشاہی بے بسی اور اختیار مطلق میں پابند قانون رکھ سکتی ہے اس کے پاس ظن و تخمین اور قیاسات و تجربات کے بجائے علم کی پختہ بنیادیں اور محکم اصول ہیں جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں جاری ہو سکتے ہیں، اس کے پاس مختلف الحال انسانوں اور مختلف زمانوں کی رہنمائی کے لئے، ایسی جامع اور مکمل ہستی کی محفوظ زندگی ہے جس کے علم و عمل کا سرچشمہ قیاس و تجربہ اور جذبات و خواہشات نہ تھے، جو ہر زمانہ کو معتدل زندگی، متوازن تمدن اور جامع انسانیت کا پیغام دے سکتی ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کو اپنی ترقی و تنزل کے ہر دور میں اور

ملک کو ہر انقلاب میں ایسی جماعت کی اعانت و رہنمائی کی ضرورت ہے اور ہر حصہ میں اس کا وجود مبارک ہے جو اس پیغام کی حامل اور ان صفات سے متصف ہو ایسی جماعت کا وجود کسی حصۂ زمین میں بھی کسی کی رعایت اور احسان نہیں بلکہ خالق کائنات کا عین منشا اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے،

جب رات کی تاریکی دن کی روشنی کو چھپا لیتی ہے جب ہوا و ہوس کا لشکر ہر طرف سے امنڈ آتا ہے جب ایک انسان اپنے پیٹ کی خاطر اپنے بھائی کا گلا کاٹنے لگتا ہے جب قومیں اپنی انانیت اور تکبر میں کمزور قوموں کو ہضم کرنے لگتی ہیں، جب دولت کا بت علانیہ پجنے لگتا ہے جب وطن اور قوم کی دیوی پر انسان بھینٹ چڑھنے لگتا ہے جب انسان اپنی قوت و دولت کے نشہ میں خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے جب ذخیرہ اندوزی اور نفع بازی کی مصیبت سے انسان دانہ دانہ کو ترسنے لگتا ہے، جب نفس کی آگ بھڑکتی ہے اور دل کی روشنی بجھتی ہے، جب موت کا خیال دل سے بالکل نکل جاتا ہے جب زندگی کے بازار میں ذی روح انسان کی قیمت گر جاتی ہے اور بے جان دھاتوں اور جمادات کی قیمت چڑھ جاتی ہے جب عریانی و بے حیائی گناہ و معصیت کا دنیا پر دور دورہ ہوتا ہے اور وہ علم و فن بن جاتے ہیں جب اغراض و خواہشات کے سوا دنیا میں کسی کی حکومت نہیں معلوم ہوتی اور تمام دنیا میں فساد پھیل جاتا ہے تو روح کائنات اس مرد خدا کو آواز دیتی ہے۔

خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

[جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی (سابق پروفیسر جامعۂ عثمانیہ دکن) نے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاحات و تجدیدات پر جو ایک مبسوط اور جامع کتاب (بنام جامع المجددین) مرتب فرمائی ہے جس کے بعض ابواب سے پہلے الفرقان اور معارف میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اُسی میں مولانا موصوف نے عنوان بالا کے تحت دین کی بتلائی ہوئی اس اہم حقیقت پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ دنیا کی زندگی کا لطف و مزہ بھی صرف اُن ہی بندگان خدا کو حاصل ہوتا ہے اور یہاں کی تکلیفوں اور پریشانیوں سے محفوظ صرف وہی اللہ والے رہتے ہیں جن کے دل اللہ سے وابستہ ہو چکے ہوں اور جن کو معرفت یقین کی دولت نصیب ہو۔ گویا باب تصوف و سلوک کی یہ ایک مستقل فصل ہے، مولانا موصوف کے شکریہ کے ساتھ ہم اس کو الفرقان میں شائع کر رہے ہیں ضرورت ہے کہ ناظرین کرام اسکی سطر سطر غور سے پڑھیں اور اس حقیقت کو اپنا حال بنانے کی فکر و سعی میں لگ جائیں ——— مدیر]

حضرت جامع المجددین کی تجدیدات تصوف سے یہ خوب اچھی طرح مبین و روشن ہو چکا ہے کہ تصوف کی حقیقت کامل و جامع دین کے درجۂ کمال و جامعیت کے سوا کچھ نہیں، جب وہ قلب و قالب صورت و معنی ظاہر و باطن کے سارے کمالات و فضائل کی جامعیت کا نام ہے تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حسنۂ آخرۃ کے ساتھ حسنۂ دنیا کا بھی جامع نہ ہو درانحالیکہ خود قرآن مجید کی نص صریح سے حسنۂ آخرت کے ساتھ ہی حسنۂ دنیا بھی مطلوب ہے کما قال اللہ تعالیٰ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً اور دوسری جگہ ایمان و عمل صالح پر (جن کا کمال و جامعیت ہی تصوف ہے) نہایت قطعیت کے ساتھ اس دنیا میں

بھی پاکیزہ و مزہ دار زندگی کا وعدہ فرمایا مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔

اصل راحت قلب کی راحت ہے

اصل میں انسان اس معاملہ میں ہمیشہ بڑے شدید دھوکا کھاتا رہا وہ یہ کہ حسنۂ دنیا" اس دنیا کی بھلائی اور آرام راحت کو، دولت و ثروت حکومت و سلطنت۔ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ خدم و حشم یا کھانے پینے اور رہنے سہنے کے اسی درجہ کے ظاہری ساز و سامان میں منحصر جانا۔ یعنی وہی اہل ظاہر کی طرح نظر صرف ظاہر پر رہی، حالانکہ ذرا سوچو تو یہ کھلا ہوا شدید مغالطہ ہے اس لئے کہ آرام و راحت فرحت و مسرت فی الواقع نفس و قلب کا ایک ادراک و وجدان ہے مگر دل کسی وجہ سے پریشان ہے تو تخت سلطنت پر بیٹھ کر تاج شاہی کے نیچے دنیا کی زندگی مٹی ہے اور اگر دل کو امن و اطمینان چین اور سکون نصیب ہے تو پھونس کی جھونپڑی میں دال دلیا کھا کر فرش و زمین پر لوٹ کر بھی قصر شاہی اور اس کے الوان نعمت سے ہزاروں درجے زیادہ لطف و مسرت اور مزہ دار زندگی حاصل ہے۔

اور یہ معلوم ہے کہ حضرات صوفیہ کے ہاں سب سے زیادہ زور اسی دل یا قلب و باطن کی صفائی ستھرائی پاکیزگی و طہارت پر ہے بلکہ اصطلاحاً تصوف نام ہی خصوصیت کے ساتھ قلب و باطن کی تطہیر و تزکیہ کا ہے۔ لہٰذا قدرتاً صوفیاء سے بڑھ کر اور کس کی دنیاوی زندگی صاف ستھری پاک و صاف "یا حیات طیبہ" ہو سکتی ہے۔ دل اگر بیمار و بے لطف ہے تو جسم کی صحت اور کھانے پینے کا بھی لطف نہیں، اسی لئے تو صوفیوں کے ہاں بار بار اس حدیث کو دہرایا جاتا ہے کہ "اگر قلب ٹھیک رہا تو سارا جسم ٹھیک ہے اگر یہ بگڑا تو سارا جسم بگڑا"۔ اب دیکھو کہ قلب کی بیماریاں یا اس کے بگاڑ کیا ہیں۔

قلب کی بیماریاں

اس کی بیماریاں وہی ہیں جس کا نام رذائل نفس ہے یعنی حب مال، حب جاہ، حقد و حسد، بخل و حرص۔ ریا و نفاق۔ کبر و عجب، جو دل ان بیماریوں میں مبتلا ہو اس کے نصیب میں غم و غصہ، حزن، و خوف رنج و مصیبت کے سوا لطف و راحت کہاں جس کو حب مال و حب جاہ کا مرض ہے اس کے معنی یہی ہیں کہ مال و جاہ کی کسی مقدار و مرتبہ پر پہنچ کر بھی راضی و مطمئن نہیں ہو سکتا تو پھر دل کا اطمینان و چین کہاں۔ وہ تو ہمیشہ اس حزن و غم ہی میں گھلتا رہے گا کہ ہائے فلاں کے پاس مجھ سے زیادہ مال ہے ہائے فلاں کو زیادہ جاہ حاصل ہے، پھر اگر ذرا بھی اس کے جاہ و مال کو خطرہ لاحق ہو تو خوف سے دم نکلنے لگتا ہے۔ یہی حال بخل و حرص کا ہے، اسی طرح بغض و

حسد کی آگ سے کون نہیں جانتا کہ انسان کا سینہ دہکتی بھٹی بنا رہتا ہے، ریاء و نفاق کا گرفتار تو دل ہی دل میں جانتا ہے کہ جو کچھ میں لوگوں کو دکھلا اور سنا رہا ہوں یا مکر و فریب سے یقین دلا رہا ہوں وہ واقع میں ہوں نہیں۔ پھر ریاء و نفاق کے کھل جانے کا خوف ذلت الگ دامن گیر، تو ریا کار و منافق کے دل میں وہ خوشی کہاں جو فی الواقع کسی فضل و کمال کے متصف کو حاصل ہوتی ہے۔ خواہ اس کو کوئی جانے یا نہ جانے۔ باقی رہا کبر و انانیت تو یہ تو ابھی اوپر معلوم ہو چکا کہ دراصل تمام قلبی و باطنی بیماریوں کی جڑ ہے اور حکومت و سلطنت جاہ و مال صنعت و تجارت، علم و فضل کون سی ایسی بڑائی ہوگی جو ایک سے بڑھ کر ایک میں نہ پائی جاتی ہو۔ اس لئے بڑائی کے طالب کا جس طرح دوسروں کی بڑائی سے قلب کڑھتا رہتا ہے اسی طرح اپنی بڑائی کی فکر و حفاظت کی مصیبت اور اس کے زوال کے حزن و خوف میں مرتا رہتا ہے

صحت قلب یا دل کی ٹھنڈک

اس کے مقابل میں اندازہ کرو کہ جو "مضغۂ قلب" کی ان بیماریوں سے پاک اور غناء قلب، تسلیم و رضا، صبر و شکر، قناعت و توکل، انکسار و تواضع کی دولت سے مالا مال اور دوسروں کے جاہ و مال سے بے پرواہ ہے۔ اس کا کلیجہ کیسا ٹھنڈا رہتا ہوگا لیکن داد دیجئے جدید تعلیم و تہذیب کے اولوالعزم حریصوں کو کہ انھوں نے جاہ و مال کی حرص و ہوس ہی کا نام اولوالعزمی و بلند ہمتی رکھ لیا ہے حتیٰ کہ حکومت و دولت .... تجارت و ثروت جاہ و منزلت نمود و نمائش ترفع و تعلی و برتری و کبریائی، اقوام و افراد سب کی ترقی کا معیار بن گیا ہے۔ اسی ترقی کے لئے جد و جہد، مسابقت و منافست انکی اصطلاح میں حرکت و حیات ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے مرتے رہنا ان کی زندگی ہے۔ باقی صبر و شکر تسلیم و رضا، توکل و قناعت۔ تواضع و مسکنت یہ سب دناءت و پست ہمتی کی باتیں بزدلی کا فلسفہ یا زیادہ سے زیادہ سلبی اخلاق ہیں۔ سبحان اللہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ سلب رذائل کا نام سلبی اخلاق اور ہمت کی سب سے بلند پرواز کا نام پست ہمتی رکھ دیا!

بلند نظری کے ساتھ پست چند دن سے بے پروائی لازم ہے

ذرا سوچئے تو سہی کہ اگر کوئی شخص جسمانی عیش و آرام اور مادی ساز و سامان میں مقابلہ و کشمکش سے کنارہ کش ہو کر کسی علم و فن، طبعیات و تاریخ وغیرہ کی تحقیقات یعنی کسی ذہنی و دماغی مقابلہ و مسابقت میں فقر و فاقہ کو گوارا کر کے

بھی مصروف و منہمک ہے اور سیٹھ ساہوکاروں یا وزراء و سلاطین کی ثروت و حکومت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا ہو تو وہ تو ان مادی ترقی و تہذیب کے فدائیوں کی نظروں میں بڑا بلند خیال و عالی حوصلہ ہوگا۔ لیکن جو ان ذہنی و دماغی مطلوبات و مقاصد سے بھی نظر کو اونچا کر کے روحانی و غیر فانی مقاصد و مطالب کی دھن میں لگا ہو وہ دون ہمت ہے بزدل ہے۔ حرکت و حیات کی لذت سے محروم اور ایجابی اخلاق کے فلسفہ سے ناآشنا ہے، حالانکہ بالکل قدرتی و معمولی بات ہے کہ جس کی نظر جتنی اعلیٰ ہوگی اتنا ہی وہ ادنیٰ چیزوں سے بے پروا اور ان کے لئے تنافس و تنازع سے دور و نفور ہوگا۔

ورنہ اعلیٰ مقاصد میں طمع عین مطلوب ہے

بس یہی حقیقت ہے اس دنیوی و مادی زندگی کے معاملات میں دینی و روحانی زندگی کی قدر و قیمت اور بلندی و رفعت کے پہچاننے والوں کی قناعت پسندی یا خوش فہموں کی نگاہ میں پست ہمتی کی۔ ورنہ انسان و انسانیت کے شایاں شان مطامح و مقامات کے لئے تو قناعت نہیں بلکہ تنافس و مسابقت ہی عین مطلوب و مامور ہے وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ اور خود حضرات صوفیہ کے نزدیک ایسی چیزوں میں قناعت جس درجہ مذموم و مبغوض ہے اور حرص و طمع محمود و محبوب ہے۔ اس کا اندازہ صوفیوں اور عارفوں کے سرتاج عارف روم کی اسی معرفت سے فرمائیں کہ

گر طمع خواہد ز من سلطان دین   خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

عافیت و اطمینان کے دشمن

خیر یہ تو درمیان میں ایک شدید غلطی و غلط فہمی کا ازالہ تھا۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ اس دنیا میں بھی راحت و آرام کی زندگی جس کا نام ہے۔ اس کا تعلق بھی جسم و ظاہر کے ساز و سامان سے زیادہ قلب و باطن کی عافیت و اطمینان سے ہے۔ اور قلب کی عافیت و اطمینان کے بڑے اور پہلے دشمن وہی بغض و حسد۔ حرص و طمع غیظ و غضب ریا و نفاق کبر و عجب حب جاہ و حب مال وغیرہ کے رذائل نفس و اخلاق ہیں۔ جن کی بدولت دنیا و ظاہری مال و متاع ساز و سامان کی کوئی بڑی سی بڑی مقدار بھی آدمی کو مطمئن و آسودہ نہیں ہونے دیتی مثلاً جو شخص اپنے سے زیادہ مال و جاہ والوں کے بغض و عداوت میں جلتا مرتا رہتا ہو۔ اس کو اپنے جاہ و مال سے کیا راحت و مسرت نصیب ہو سکتی ہے سوا اس کے کہ

از بروں چوں گور کافر پر حلل   و اندروں قہر خدائے عز و جل

تصوف وسلوک کا پہلا قدم نہیں رذائل سے قلب وباطن کا تزکیہ یا اُسکی اصلاح ومعالجہ ہے جس کے بعد آدھا پیٹ کھا کر اور فرش زمین پر لوٹ کر بھی "ھل من مزید" کی جہنم حرص وہوس میں جلنے مرنے والوں سے زیادہ مسرور ومطمئن رہ سکتا ہے یہ تو صحیح معنی میں سلبی اخلاق یا سلب رذائل کی وہ دولت ہے جو صوفی وسالک کو بالکل ابتداہی میں مل جاتی ہے باقی اس راہ کے منتہی اور ایجابی صفات وکمالات سے متحلی وآراستہ کاملین کی دنیا دی حزن وخوف سے پاک، وآزاد حیات طیبہ کا تو خود ان کے سوا اندازہ ہی کون کرسکتا ہے۔

توحید کا اثر اس اعتبار سے توحید ہی کے آثار ونتائج کو دیکھئے جو اصل دین ہے اور جس کی تکمیل تصوف ہے کہ موحد کے پاس حزن وغم خوف وہراس پھٹک نہیں سکتا۔

"اگر چاروں طرف سے اس کو تلواروں میں گھیر لیا جائے تب بھی اس کے دل پر ہراس نہیں ہوتا ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر میں تھے دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام فرمانے کے لئے اترے اتفاق سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے بھی اُس وقت کوئی قریب نہ تھا۔ آپ نے تلوار درخت میں لٹکا دی اور درخت کے نیچے سوگئے اسوقت ایک دشمن کو خبر ہوئی اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً وہاں آیا اول دبے پاؤں تلوار پر قبضہ کیا۔ نیام سے نکالا اور آپ کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ جب بالکل تیار ہوگیا تو آپ کو بیدار کیا اور پوچھا "من یمنعک منی" کہ اب آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ آپ نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ فرمائی اور فرمایا "اللہ" یعنی مجھے اللہ بچائے گا۔ بھلا کوئی ایسا کر کے تو دکھا دے۔ بدوں خدا سے تعلق کے کوئی ایسا نہیں کرسکتا

موحد چہ برپائے ریزی زرش | چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید وہراسش نباشد زکس | ہمیں است بنیاد توحید وبس

اب ذرا اپنے اثر گرامی توحیدی علم ومعرفت کے آثار کو دیکھئے کہ جب ہم الحمدللہ مومن ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق ایمان واطاعت کا ہے کفر وبغاوت کا نہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مومن ومطیع کے حق میں ان کا کوئی فعل ومعاملہ رحم وکرم سے خالی ہو۔ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا اس لئے اگر بظاہر اور طبعاً کوئی بات کلفت وناگواری کی بھی پیش آئے تو وہ بھی دراصل ہماری خیرخواہی اور دنیا وآخرت کی کسی نہ کسی بھلائی پر یقیناً مبنی ہوگی۔ ایسا آدمی جانتا ہے کہ

مصیبت کا انجام راحت | عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (کہ بارہا کوئی چیز بظاہر بری معلوم ہوتی ہے لیکن در اصل اس میں بھلائی ہوتی ہے) اس سئے وہ گھبراتا نہیں۔ اور (کم از کم)، یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا علاج اور کفارۂ سیات ہو رہا ہے نیز یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم خدا کے ہیں اپنے نہیں خدا کو اختیار ہے کہ جس حالت کو ہمارے لئے مناسب سمجھیں اسیں ہمیں رکھیں چنانچہ اسی کو مصیبت کے موقع پر فرماتے ہیں "وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

لہذا ظاہرًا ہم پر جو تکلیف آتی ہے یہ ویسی ہی ہے جیسے ماں باپ کسی بچے کے دنبل میں جس نے اس کو بے حد تکلیف دے رکھی ہے یا آئندہ تکلیف پہونچانے کا اندیشہ ہو نشتر لگواتے ہیں کہ وہ ظاہرًا تو تکلیف ہوتی ہے لیکن واقع میں کامل راحت کا سامان ہوتا ہے اور اس تکلیف کی وہ حالت ہوتی ہے کہ

طفل می لرزد زنیش احتجام | مادر مشفق ازاں غم شاد کام

یعنی بچہ تو ڈرتا ہے لرزتا ہے اور ماں خوش ہو رہی ہے حتیٰ کہ نشتر لگانے والے کو انعام دیتے ہیں۔ سو اگر کوئی اجنبی تعجب کرنے لگے اور کہے کہ یہ انعام کس بات کا دیا۔ اس شخص نے تو تکلیف پہونچائی ہے۔ اس کو تو سزا دینا چاہئے۔ تو ماں باپ کہیں گے کہ احمق یہ تکلیف نہیں ہے عین راحت ہے۔ کیونکہ اسی تکلیف کی بدولت لڑکے کی زندگی ہے ورنہ دنبل بڑھتا اور اسی کا زہریلا مادہ تمام جسم میں سرایت کر جاتا۔

توجب ماں باپ کا نشتر لگوانا اور اس کی تکلیف دینا بوجہ ذریعہ راحت ہونے کے ناگوار نہیں ہے تو خدائے تعالیٰ کو تو ماں باپ سے بدرجہا زیادہ محبت اپنے بندوں سے ہے پھر اگر وہ فقر و فاقہ ڈالدیں یا کسی اور مصیبت میں گرفتار کر دیں تو اس کو نشتر کے قائمقام کیوں نہیں سمجھا جاتا اصل بات یہ ہے کہ ہماری نظر اپنے قلب و باطن کے دنبلوں یا بیماریوں پر بہت کم ہے ورنہ احقر تو خود اپنے تجربے بلکہ مشاہدہ کی گواہی دیتا ہے کہ جب سے حضرت علیہ الرحمۃ کی جوتیوں سے کچھ تعلق پیدا ہوا اور اپنے باطنی دنبل دکھلائی دینے لگے۔ تو خدا کو گواہ کر کے عرض کرتا ہوں کہ

سلہ الرفیق صہ ۱۳۱۲

شاید ہی کوئی دنیاوی تکلیف ومصیبت ایسی ہوتی ہوگی، جس کا حیات بخش نشتر یا آپریشن ہونا روز روشن کی طرح نہ نظر آتا ہو۔ اور کتنی بظاہر کردہ ومودی باتیں ایسی پیش آتی ہیں کہ آخر میں اسی دنیا میں اور دنیا ہی کی راحت کا سامان ثابت ہوتی ہیں۔ بس وہی نشتر میں ذرا صبر کی ضرورت ہے تو مومن کی ہر مصیبت بشارت ہی بشارت ہے۔

صرف اسباب پر نظر اس سے بڑھ کر کوتاہ نظری یہ ہے کہ ایمان واسلام کے دعوے کے باوجود مصائب میں نظر صرف ظاہری ومادی اسباب پر ہوتی ہے اور سمجھتے ہیں کہ ظاہری ومادی اسباب مستقل بالذات عمل کرتے ہیں نہ کوئی مسبب الاسباب ہے اور نہ اسباب مصیبت میں ہماری نافرمانیوں اور گناہوں کو کوئی دخل ہے غرض مسبب الاسباب سے قطع نظر کرکے۔

"صرف اسباب ظاہری پر نظر کرتے ہیں۔ سبب اصلی کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا حالانکہ جو مصیبت آتی ہے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ ہوا آگ پانی وغیرہ سب اسباب خداوند کریم کے حکم کے تابع ہیں ان کو جب اللہ میاں کا حکم ہوتا ہے ویسا ہی کرتے ہیں۔

خاک وآب وباد وآتش بندہ اند　　　با من وتو مردہ با حق زندہ اند

یعنی یہ ہمارے سامنے دیکھنے میں مردہ معلوم ہوتے ہیں ورنہ واقعہ میں سب زندہ اور تابع فرمان حق ہیں"۔ جس قدر مصائب آتے ہیں سب حکم خداوندی سے نازل ہوتے ہیں اور اصل سبب جرائم ومعاصی ہوتے ہیں۔ ان سے غضب حق ہوتا ہے اور پھر اسی کے حکم سے بلا ومصیبت نازل ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

ہرچہ آید بر تو از ظلمات وغم　　　آں ز بیباکی وگستاخی است ہم

غم چو بینی زود استغفار کن　　　غم بامر خالق آید کار کن[1]

جب کوئی مصیبت دیکھو فوراً استغفار کرو۔ سبحان اللہ کیا عجیب تعلیم ہے اسی سلسلہ میں حضرت نے خود اپنے قصبہ (تھانہ بھون) کا ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ

"کئی سال ہوتے ہیں ہمارے قصبہ وگرد ونواح میں طاعون بہت زوروں سے پھیلا تھا۔ تو قبل طاعون کے ایک بزرگ آخری شب میں بیٹھے ہوئے تھے کہ قلب پر یہ آیت وارد ہوئی" اِنَّا

---

[1] الرفیق ص ۲۹

مُمۡنزِلُونَ عَلٰٓی اَھۡلِ ھٰذِہِ الۡقَرۡیَةِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ تو ان بزرگ نے اس کو وعظ میں بیان کیا لیکن اپنی طرف منسوب نہیں کیا کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوا ہے۔ مگر لوگوں نے توجہ نہ کی پھر طاعون پھیلا تو ایک سبب وہ گناہ بھی ہوا جو قوم لوط میں تھا[1]۔

غرض اگر ایک طرف اس پر بھی نظر ہو کہ مصائب صرف ظاہر میں مصائب ہیں ورنہ دراصل انجام کے اعتبار سے سراسر ہمارے حق میں مصلحت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہیں۔ دوسری طرف مصیبت کے ظاہری اسباب کے بجائے "مسبب الاسباب" یا خالق اسباب" پر نظر ہو اور ان کو راضی رکھنے کی فکر یعنی احکام و اعمال میں امتثال کی کوشش کرو" تو پھر جیسا حضرت فرماتے ہیں۔

قلب کا پریشان نہ ہونا اس کے بعد حقیقی مصیبت نہ آوے گی۔ یعنی ظاہری مصائب مرض و موت رنج وغیرہ تو ہوں گے مگر اطاعت کی برکت سے تمہارا قلب پریشان نہ ہوگا جیسا کہ بچہ ماں کی گود میں ہوتا ہے تو وہ کسی چیز سے پریشان نہیں ہوتا۔ اسی طرح مطیع کو چونکہ قرب حق نصیب ہو جاتا ہے۔ لہذا یہ بھی پریشان نہیں ہوتا[2]

مصائب کے باوجود قلب کے پریشان نہ ہونے یا دل کے نہ گھبرانے کا نکتہ ہے بڑا اہم۔ مگر کوئی بڑی باریک بات نہیں۔ آدمی اگر ذرا سوچے تو روزانہ کی زندگی میں برابر اسکے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ جتنا زیادہ کسی محنت و مصیبت کا انجام خوشگوار ہوتا ہے۔ اتنی ہی وہ مصیبت کم ناگوار ہوتی ہے اور دل کی پریشانی یا گھبراہٹ کیسی، وہ تو اتنا خوش ہوتا ہے کہ اس مصیبت کو بھی خوشی خوشی جھیلتا ہے اسٹیشن پر جس قلی کی معمولی و متوقع مزدوری مثلاً دو آنے ہو اسکو اگر چار آنے آٹھ آنے دیدو تو دوگنا سامان لادے گا کہ "مزدور خوش دل کند کار بیش" اور اس سے خواہ اس کی گردن اور کمر ٹوٹ رہی ہو۔ مگر دل ہی دل میں خوش ہوگا کہ اسی کو بوجھا کر دوگنے چوگنے دام انعام کا مستحق ہوں گا بیماری میں آدمی کو کیسی کیسی کڑوی اور بدمزہ دوائیں پینا پڑتی ہیں جن سے طبعی ناگواری و تکلیف بھی ہوتی ہے مگر صحت کی امید میں دل پریشان نہیں ہوتا۔ بلکہ خوشی خوشی ان کڑوی دواؤں کی قیمت اور ڈاکٹر کی فیس سب کچھ ادا کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت جب ہی ہے جبکہ اسکا کوئی بہتر انجام و انعام نہ ہو یا اس انجام و انعام پر نظر نہ ہو۔

---

[1] رفیق صلاۃ ۳۲ [2] ایضاً ص ۹۳

انجام پر نظر کا انجام | پھر خیال کرو کہ دین کی حقیقت تو لفظاً و معناً سراسر انجام و آخرت ہی ہے۔ اور کیسا انجام و آخرت کہ اس کی ابدی راحت و نعمت کو نہ دنیا کی ہفت اقلیم کی بادشاہت پہونچ سکتی ہے۔ اور نہ اس کے عذاب و مصیبت کے مقابلہ میں یہاں کوئی بڑی سے بڑی مصیبت، مصیبت ہے تو جس کی نظر و فکر میں وہاں کی راحت و مصیبت ہو وہ اس دنیا کی راحت کو نہ راحت جانے گا نہ مصیبت کو مصیبت۔

"فرض کیجئے ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ مجھے خوب پٹیا جا رہا ہے۔ اور چاروں طرف سے سانپ بچھو ڈس رہے ہیں۔ لیکن بیدار ہوا تو دیکھتا ہے کہ تخت شاہی پر آرام کر رہا ہے کوئی مورچھل جھل رہا ہے کوئی عطر لا رہا ہے کوئی پان لا رہا ہے۔ چاروں طرف لوگ دست بستہ کھڑے ہیں تو کیا اسکے دل پر اس خواب کا کوئی اثر باقی رہے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اگر وہ خواب از خود یاد بھی آجائے گا۔ تو طبیعت اس کو بھلا دے گی اس کے برعکس ایک شخص نے خواب دیکھا کہ میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوں اور تمام لوگ دست بستہ کھڑے ہیں اپنی حاجتیں پیش کر رہے ہیں اور میں پورا کر رہا ہوں آنکھ کھلی تو دیکھتا ہے کہ ایک شخص سر پر جوتیاں مار رہا ہے اور چاروں طرف سے سانپ بچھو کاٹ رہے ہیں اور ایک کتا منہ میں موت رہا ہے کیا بیداری کی اس مصیبت کے بعد بھی خواب کی کسی قسم کی مسرت اس کے دل پر رہ سکتی ہے کبھی نہیں۔ بس دنیا کی مثال آخرۃ کے مقابلہ میں بالکل ایسی ہی ہے جیسے خواب کی بیداری کے مقابلہ میں کسی نے خوب کہا ہے۔

حال دنیا را بپرسیدم از فرزانۂ — گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانۂ
باز گفتم حال آں کس گو کہ دل بروے ببست — گفت یا غولیست یا دیولیست یا دیوانۂ

تو واقعی دنیا کی مثال خواب ہی کی سی ہے اگر عمر بھر عیش کیا اور مرنے کے بعد پکڑا گیا تو وہ عیش کیا کام آئے گا[1]

خوشی و غم کا تعلق مستقبل سے | بات یہ ہے کہ اس دنیا میں بھی ہماری نظر آج سے زیادہ کل پر یا حاضر سے زیادہ مستقبل پر رہتی ہے۔ اور ہماری خوشی و غم کا زیادہ

[1] الرفیق ص۲۷

سرمایہ مستقبل ہی کی امید و بیم سے وابستہ ہے۔ حتیٰ کہ مستقبل کی کوئی امید پوری ہو کر جب حالی بن جاتی ہے۔ تو اس کی مسرت زیادہ دیرپا نہیں رہتی۔ اور اس سے آگے ایک نیا مستقبل اور نئی تمنا ہم پیدا کر لیتے ہیں۔ اور پھر اس کے پیچھے دوڑنے اور مرنے لگتے ہیں اور زیادہ لطف و لذت اسی کے تصور سے اٹھاتے ہیں خواہ وہ تمنائی مستقبل شیخ چلی ہی کے منصوبوں سے زیادہ نہ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ آج بھی وہی آدمی زیادہ مسرور و مطمئن رہ سکتا ہے جو اپنے کل کو آج سے اور استقبال کو حال سے بہتر جانتا اور پاتا ہو ورنہ مستقبل تاریک ہوا تو حاضر کا لطف و لذت بھی تلخ ہو جاتا ہے۔ انسان کی اسی آخرت جو دمانہ اندیش فطرت کے خالق نے اس دنیا یا حاضر کے غم کو بے حقیقت و ناقابل التفات ٹھہرانے کے لئے کافر کے مقابلہ میں اسی راز حقیقت کی طرف اس آیت میں متوجہ فرمایا ہے۔ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ یعنی اگر تم کو اس دنیا میں غم و الم سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو اس سے تو کافر بھی نہیں بچ سکتا لیکن اصل خوشی و مسرت کی بات جو ہے وہ تمہارے ہی پاس ہے کہ تمہارا مستقبل پر امید ہے اور اپنے خدا سے تم جو جو امیدیں رکھتے ہو ان سے کافر محروم ہیں اسی کو حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ کہ "دنیا کی راحت و مصیبت آخرت کے مقابلہ میں کالعدم یا ہیچ ہے"

دنیا کی راحت و مصیبت آخرۃ کے مقابلہ میں ہیچ ہے	"واقعی وہاں جا کر نہ یہاں کا عیش رہے گا اور نہ مصیبت اور آخرت میں تو رہ گذشتہ چیزیں کیا یا در ہتیں دنیا ہی میں دیکھ لیجئے

کہ "عمر گذشتہ بیش از خواب نیست" زمانہ گذرتا چلا جاتا ہے جیسا کہ برف کا ٹکڑا پگھلنا شروع ہوا تو ختم ہی ہو کر رہتا ہے اسی واسطے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب قیامت کے روز اہل مصیبت کو بڑے بڑے درجے عنایت ہوں گے تو اہل نعمت کہیں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں مقراض سے کاٹی گئی ہوتیں لیکن آج ہم کو یہی درجے ملتے تو اس حالت پر نظر کر کے بے تامل کہنا پڑتا ہے کہ دنیا میں کچھ بھی ملتا تب بھی کچھ حرج نہیں تھا"

سچ پوچھو تو دنیا میں انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہی رنج و راحت کا ہے۔ جس کے لئے مدعیان عقل نے قنوطیت و رجائیت کے بڑے بڑے فلسفے چھانٹے ہیں اور بعضوں کو تو خودکشی کے سوا دنیا کے مسائل سے نجات کی کوئی شکل ہی نظر نہ آئی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ

اس فانی زندگی کا کوئی بہتر و باقی (خیر و ابقیٰ) مستقبل اگر نہیں تو اس کی جو کچھ تھوڑی بہت راحت و عزت ہے۔ وہ بھی کوئی ایسی نہیں۔ جس کا مصیبت و ذلت کا چولی دامن کا ساتھ نہ ہو اور جس سے مسرور و مطمئن کوئی ویسا ہی بے حس و بے حیا وحشی رہ سکتا ہے۔ جس کا لطیف قصہ حضرت علیہ الرحمۃ نے جا بجا نقل فرمایا ہے اور جو دراصل لطیف قصہ نہیں بلکہ دنیا پرست کی زندگی کا بڑا کثیف واقعہ ہے

دنیا کی راحت و عزت کی مثال | "ایک سرحدی وحشی ہندوستان میں آیا تھا۔ کسی حلوائی کی دکان پر حلوہ رکھا دیکھا قیمت پاس نہ تھی آپ اس میں سے بہت سا اٹھا کر کھا گئے۔ حلوائی نے حاکم شہر کو اطلاع دی۔ حاکم نے یہ سزا مقرر کی کہ اس کا منھ کالا کر کے جوتیوں کا ہار گلے میں ڈال دیا جائے اور گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں تشہیر کرائی جائے اور بہت سے لڑکے ساتھ کر دئے جائیں کہ وہ ڈھول بجاتے ہوئے ساتھ چلیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جب حلوہ خور صاحب اپنے گھر گئے تو وہاں کے لوگوں نے پوچھا کہ آغا ہندوستان چگونہ ملک است" کہنے لگا "ہندوستان خوب ملک است۔ حلوا خوردن مفت است و فوج طفلاں مفت است سواری خر مفت است۔ دم ڈم مفت است ہندوستان خوب ملک است"۔

"بس دنیا کے حشم و خدم پر ناز کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے سواری خر اور فوج طفلاں پر ناز کیا تھا صاحبو یہ بے حسی ہے ماشاء اللہ اگر حس ہو تو یہ سب عذاب نظر آنے لگے"۔

آج کل سب سے زیادہ ترقی و عزت حکومت میں سمجھی جاتی ہے جس کی حرص و ہوس میں جہنم سے پہلے ہی ساری دنیا اپنے ہاتھوں جہنم بنالی گئی ہے۔ اس کی نسبت اسی سرحدی وحشی کے قصہ کے سلسلے میں ارشاد ہے کہ

طلب حکومت | "حکومت دنیوی کی نسبت حدیث میں آتا ہے کہ جس کی دس آدمیوں پر بھی حکومت ہوگی قیامت میں اس کو مشکیں کس کر لایا جائے گا اگرچہ اس کے بعد چھوٹ ہی جائے آج اسی حکومت کی درخواست کی جاتی ہے اس کے لئے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی کچھ کہتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہم میں اگر صاحب حکومت نہ ہوں گے تو قوم تباہ ہو جائے گی"

آگے اس قسم کے طالب حکومت کان کھول کر سن لیں کہ

"ہم بھی کہتے ہیں کہ ہم میں حاکم ہوں لیکن کون شخص ہو اس کا فیصلہ خود حدیث میں موجود ہے

حضور فرماتے ہیں القضاۃ ثلاثۃ اثنان فی النار وواحد فی الجنۃ اور اس واحد کو عالم باعمل بتلایا گیا ہے تو حکومت ضروری ہے لیکن حکومت کیلئے ایک تو عالم باعمل ہونا چاہئے دوسری ایک اور شرط ہے کہ حکومت کی خود درخواست نہ کرے کیوں کہ جو درخواست کرے گا وہ خود غرض ہوگا اور نفسانیت سے کام کرے گا اس کو لوگوں کی مصلحت پر ہرگز نظر نہ ہوگی بلکہ اپنی مصلحت پر نظر ہوگی اور اس سے جتنی خرابیاں پیدا ہوں وہ کم ہے۔"

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن عمرؓ سے قضا کا عہدہ قبول کرنے کے لئے کہا انھوں نے انکار کر دیا حضرت عثمان نے فرمایا کہ اگر تم منظور نہیں کرتے ہو تو اپنے انکار کی کسی کو خبر نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ سبھی انکار کر دیں اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ سلف صالحین حکومت کو کیا سمجھتے تھے اور حقیقت میں ایسا ہی شخص کام کر سکے گا۔"[1]

اللہ اکبر کیا اور کہاں نظر تھی ہمارے سلف صالحین کی اور کس اسفل السافلین میں ہم جا گرے ہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ عہدے پر اس طرح گرتے ہیں جس طرح مکھیاں غلاظت پر ٹوٹ کر گرتی ہیں اسی نے آج کل حکومت کو سراپا شر و فساد ہی نہیں بلکہ اس کی عزت کو وہی "سواری خر و فوج طفلاں" والی بے حسی و بے حیائی کی عزت بنا دیا ہے۔

آخرت فراموشی مطلب یہ ہے کہ حکومت جس کو دنیا میں سب سے بڑی ترقی و عزت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اس کی اہلیت و صلاحیت کی شرط بھی یہی ہے کہ نظر خود اس حکومت پر نہیں بلکہ آخرت پر ہو لیکن اس آخرت فراموشی میں غیروں کا کیا ذکر خود اپنا حال یہ ہے کہ گو —

"مسلمان تو ایسا کوئی نہیں جس کا یہ عقیدہ ہو کہ آخرت کوئی چیز نہیں مگر حالت ضرورت ایسی ہے کہ ان کے برتاؤ اور معاملات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی منکر ہو کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے اتنی محبت آخرت کی نہیں۔ دنیا میں قیام کی بابت کیا کیا خیالات پکاتے ہیں۔ کہ یوں کرینگے یوں کریں گے۔ جائداد ہوگی ملازم ہوں گے ڈپٹی کلکٹر ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

" انصاف سے دیکھو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگیں ہوتی ہیں کہ مر جائیں گے تو خدا کے

---

[1] الرفیق صفحہ ۳۸

سامنے جائیں گے۔ یوں جنت ہوگی اس میں باغات اور مکانات ہوں گے حوریں ہوگی غالباً کبھی بھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں بلکہ خیال بھی بہت ہی کم آتا ہوگا تو دنیا کی جس قدر محبت ہے نہ آخرت کی وہ محبت نہ وہاں جانے کا اتنا شوق ورنہ جیسے یہاں کی زندگی کے متعلق خیالات پیدا ہوتے ہیں وہاں کی زندگی کے بھی تو ہوتے اور جیسے دنیاوی امور میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں اور یہاں کی خوشیوں میں کھپے رہتے ہیں۔ ایسا ہی امور آخرت کے متعلق بھی کچھ ہوتا۔

"پھر جیسے یہاں کی تکلیف کو سوچ کر تدبیر سوچتے ہو کہ شاید فلاں تدبیر سے یہ مصیبت کٹ جائے یا فلاں تدبیر سے یہ مشکل آسان ہو جائے۔ ایسے کبھی آخرت کے مصائب کو سوچا ہے۔ حالانکہ دنیا کے مصائب تو بعض ایسے ہیں کہ جن کی کوئی تدبیر ہی نہیں۔ اس لئے اس کو سوچنا ہی عبث ہے مگر اس کو پھر سوچتے ہو۔ اور آخرت کی کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں جو لا علاج ہو۔ ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے لیکن پھر بھی اس کا ذکر نہ فکر...

آخرت کی خوشی و غم ہر حال اگر کوئی دنیا کی خوشیاں مناتا ہے تو یہ شکایت ہے کہ آخرت کی خوشیاں کیوں نہیں منائی جاتیں۔ اور اگر یہاں کوئی غم میں رہتا ہے تو اس کی شکایت ہے کہ آخرت کا غم کیوں نہیں کیا جاتا۔ اور اگر کوئی خوشی منانے والا کہے کہ آخرت کی خوشی کہاں سے منائیں اس کی ہمیں امید ہی کہاں ہم تو گنہگار ہیں اور دنیا کی خوشی تو حاضر ہے، اس کو کیوں نہ منائیں تو یہ شیطان کا دھوکا ہے اس میں دو دعوے ہیں" دونوں غلط یعنی اول ہی غلط کہ دنیا کی خوشی حاضر ہے۔ دوسرا بھی غلط کہ آخرت کی خوشی کہاں ہے۔

"پہلا تو اس لئے غلط کہ یہ جو کہا جاتا ہے یوں بیٹا ہوگا یوں چین کریں گے تو یہ تمہارے قبضہ میں کہاں ہزاروں آدمی ایسے ہیں کہ وہ سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے۔ پھر اگر خوشی ہوئی بھی تو تجربہ ہے کہ تمنائیں ہمیشہ تعداد میں حاصل یا حاضر سے بڑھی ہوتی ہیں یعنی حاصل ہوتا ہے کم اور تمنا ہوتی ہے زیادہ تو جس کی تمنا جسقدر زیادہ ہوگی وہ ہمیشہ اسی قدر زیادہ غم میں رہے گا اللہ والے ہمیشہ خوش رہتے ہیں اس لئے کہ وہ دنیا کی کچھ تمنا ہی نہیں کرتے اولاد ہوئی اس پر خوش نہ ہوئی اس پر خوش، ہر حال میں راضی اور دنیا داروں کو خوشی کہاں واللہ راحت جس کا

نام ہے (یعنی راحت قلب) اگر وہ حاصل نہیں ہوتی تو پھر اس کا جتنا سامان ہو گا اتنا ہی زیادہ موجب تکلیف اور موجب حسرت ہو گا۔ لوگ روپیہ پیسے کو راحت سمجھتے ہیں حالانکہ راحت روپیہ پیسہ نہیں ورنہ چاہئے تھا کہ صندوق کو جس میں وہ رہتا ہے زیادہ راحت ہوتی مگر یہ لوگ صندوق سے بھی بدتر ہیں کیونکہ اس کو ادراک الم کا تو نہیں اور یہ لوگ تو آلام میں مبتلا ہیں تو معلوم ہوا کہ دنیادار بہت ہی کم آرام میں ہیں۔

آخرت کی بڑی سے بڑی خوشی اختیاری ہے اور دوسری بات کہ آخرت میں کون سی خوشی ہے اس لئے غلط ہے کہ وہ بعد وعدۂ الٰہیہ کے بالکل تمہارے اختیار میں ہے آخرت کی کوئی راحت بھی ایسی نہیں جو تمہارے اختیار میں نہ ہو خدا کی رحمت ہے کہ آخرت کی کتنی ہی بڑی سے بڑی تمنا ہو وہ باستثناء منصوص مثلاً درجات نبوت سب اس کے اسباب کی مباشرت یا اختیار کرنے سے ضرور پوری ہوتی ہے مثلاً اگر چھوٹے درجے کا عاصی گنہگار آدمی بڑے درجہ مثلاً حضرت جنید کے درجہ میں جانا چاہے تو جا سکتا ہے اس طرح کہ اپنے اعمال میں ترقی کرے تو بس وہاں تو خوشی ہی خوشی ہے جو بالکل اپنے اختیار میں ہے۔

"تو اس کی فکر کرو اور امنگیں پیدا کرو اور اس کی تدبیر کرو یعنی معصیت کو چھوڑ دو نمازیں جو اب تک چھوٹ گئی ہیں ان کی قضا کرو زکوٰۃ دو اسی طرح تمام اختیاری احکام کی پابندی کرو اس کے بعد سب خوشی تمہارے ہی واسطے ہے اور تم کو حق ہے کہ خوشی مناؤ"

"اسی طرح اگر کوئی مصیبت زدہ کہے کہ یہاں کی مصیبت تو حاضر ہے اس لئے اس کا اہتمام ہے اور وہاں تو اللہ غفور الرحیم ہے پھر کیوں غم کریں تو سمجھ لو کہ یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے غفور الرحیم نے یہ وعدہ کہاں کیا ہے کہ خواہ تم جو کچھ ہی کرو تم کو جنت میں بلا عقوبت اول ہی بار داخل کردوں گا (الرفیق صفحہ ۴۳ و ۵۳)

آخرت کی سعی میں ناکامی نہیں جس طرح آخرت کی بڑی سے بڑی خوشی کا حاصل کر لینا آدمی کے خود اپنے اختیار کی بات ہے اسی طرح آخرت کی سعی میں ناکامی و نامرادی کا بھی قطعاً احتمال نہیں کیونکہ وہاں کی کامیابی نام ہے اپنے اختیار و امکان بھر خدا کی رضا و ثواب کے حصول کی نفس سعی کا، نہ کہ کسی خاص نتیجہ تک پہونچنے کا اگر کوئی

شخص نماز جماعت کے ارادے سے گھر سے چلا اور مسجد پہونچنے سے پہلے ہی راستہ میں اچانک مر گیا تو اس کے ثواب میں قطعاً کمی نہ ہوگی اسی لئے کہا جاتا ہے اصل مطلوب طلب ہے حصول نہیں، حتی کہ بیماری آزاری کی معذوری میں آدمی کا وہ سارا نیک عمل لکھا جاتا ہے جو وہ صحت و تندرستی میں کرتا تھا بخلاف دنیاوی سعی کے کہ مثلاً ایک شخص نے اپنے لڑکے کو وکیل بنانے کے لئے بیس پچیس سال تک پڑھایا لکھایا ہزاروں روپیہ خرچ کیا لیکن جس دن امتحان میں اس کی کامیابی کا نتیجہ نکلا اسی دن خدانخواستہ گھر سے جنازہ نکلا تو فرمائیے اس غریب کی عمر بھر کی محنت و مشقت اور والدین کے سینکڑوں ہزاروں کے خرچ کا دنیا و آخرت کے خسران کے سوا کیا نتیجہ نکلا۔

"غرض دنیا کی یہ حالت ہے کہ کوشش سے کبھی حاصل ہوتی ہے دہلا۔ دل بھر کر پوری کبھی کسی کو حاصل نہیں ہوتی) اور کبھی کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور آخرت کی سعی کسی حال میں ناکام نہیں اگر کوئی شخص کسی عمل آخرت کا اہتمام کرے اور وہ حاصل بھی نہ ہو یا پورا نہ ہو جب بھی اس کو ثواب ملتا ہے یہاں سے عوام کی ایک اور غلطی بھی معلوم ہو گئی کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن صحیح کر لو تو جواب میں کہتے ہیں کہ اب بوڑھے طوطے کیا پڑھیں گے یہ جواب بالکل غلط ہے آپ کا کام صرف کوشش کرنا ہے صحت ہو یا نہ ہو اگر تم کوشش میں لگ جاؤ پھر بھی کامیابی کا درجہ حاصل نہ ہو تب بھی ثواب ملے گا بلکہ دونا ثواب ملے گا ایک محنت کا اور ایک ناکامی کی حسرت کا! یہ کہو کہ ایک پڑھنے کا اور ایک زیادہ مشقت کا اور ناکامی پہ ثواب ملنے سے حیرت نہ کیجئے حدیث میں تصریح ہے والذی یتتعتع فی القرآن یتتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران یعنی جو قرآن میں اٹکتا ہے اور وہ اسپر دشوار معلوم ہوتا ہے اسکو دو اجر ملیں گے اسی بنا پر اہل اللہ نے ناکامی کو بھی سبب ثواب قرار دیا ہے حضرت رابعہ نے جب حج کیا تو حج سے فارغ ہو کر جناب باری میں عرض کیا کہ میں نے حج کر لیا اب ثواب دیجئے خواہ حج قبول ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اگر قبول ہوا ہو تب تو حج مبرور پر ثواب دینے کا آپ کا وعدہ ہے اور اگر قبول نہیں ہوا تو یہ سخت مصیبت ہے

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم   ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

اور مصیبت زدہ کے لیے بھی آپ نے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اس لئے بہر حال ثواب

دینا پڑے گا اور حضرت رابعہ نے جو یہ عنوان اختیار فرمایا یہ ناز کا مقام ہے جو ہر ایک کا مقام نہیں ہمارے لئے تو نیاز ہی زیبا ہے کہ "زشت باشد روئے نازیبا و ناز"

بے شک یہ ناز تو مقام ناز ہی والوں کو زیبا ہے۔ لیکن ہم گنہگار بھی راستہ چلتے ہی رہیں خواہ گرتے پڑتے ہی سہی تو اس کی وسعت رحمت کے سہارے ایسی صورت میں اپنا مقام جا تو نبا ہی سکتے ہیں۔

نامرادی میں بھی مزہ اور یہ مضمون سالکین کے بڑے کام کا ہے کہ دین کے راستے میں اگر کوشش ناکام بھی ہو۔ یا کمزور ہو جب بھی اجر ملے گا۔ اگر تم نے قرآن صحیح کرنے کی کوشش کی اور نہ ہوا تو حرج کیا ہے۔ خدا تو راضی ہو گیا۔ ہمارے ایک مجمع نے ایک موقع پر دینی کام کی کوشش کی تھی اور ناکام رہے تو ایک بددین نے اعتراض کیا کہ ان لوگوں کو کیا حاصل ہوا۔ ایک اللہ کے بندے نے جھلا کر جواب دیا۔

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن | بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز | اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکر است | بے مرادی نے مراد دلبر است

مراد میں تو مزہ ہے ہی نامرادی میں بھی ایک مزہ ہے، وہ یہ کہ محبوب نے تو دیکھ لیا کہ ہم نے کسی کو طلب کیا تھا اور وہ نہیں ملا

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم | کہ من نیز از خریداراں اویم

(باقی)

بلبن اور اُسکے اُصولِ حکومت

از جناب قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم، اے علیگ
وائس پرنسپل اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول شاہجہانپور

ذیل کا مضمون دراصل ایک تازہ تالیف تاریخ کا ایک باب ہے۔ جناب قاری بشیر الدین صاحب ایم، اے (علیگ) نے محمد بن قاسمؒ سے لیکر خاندان لودی کے خاتمہ تک کی ایک تاریخ کئی جلدوں میں مرتب فرمائی ہے جو اُن کی ساری عمر کی محنت و مطالعہ کا حاصل ہے، خدا کرے یہ مفید کتاب جلد چھپ سکے۔

کتاب کا یہ خاص باب ہمیں ہمارے محب محترم جناب سید عبد الرب صاحب صوفی ایم، اے نے فاضل مصنف سے حاصل کرکے بھیجا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اس کتاب کے ایسے ہی اور ابواب بھی آئندہ الفرقان میں اشاعت کیلئے کبھی کبھی بھیجا کرینگے جو تاریخی حیثیت کے علاوہ اصلاح کردار اور سیرت سازی کے لحاظ سے بھی کامیاب ہوں۔

اِس سلسلہ کی اشاعت سے ایک فائدہ انشاء اللہ یہ بھی ہوگا کہ پچھلے دور کے سیاسی اقتدار نے اپنے خاص اغراض کیلئے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے متعلق جو بدگمانیاں اور غلط فہمیاں تاریخ کی راہ سے پھیلائی ہیں جن سے نہ صرف ہمارے برادرانِ وطن ہی متاثر ہوئے ہیں بلکہ خود بہت سے مسلمان بھی ان کا شکار ہوگئے ہیں، اُمید ہے کہ انشاء اللہ ان خاص ابواب کی اشاعت سے اِن بدگمانیوں اور تہمت طرازیوں کی حقیقت بھی آشکارا ہوجائے گی۔

آج جو مختصر باب ہدیۂ ناظرین کرام کیا جارہا ہے اس میں سلطان غیاث الدین بلبن کے اُصولِ حکومت اور طرزِ حکمرانی پر روشنی ڈالی گئی ہے ——————— مدیر

تخت نشینی اور ابتدائی حالات

سلطان غیاث الدین بلبن فروری ۱۲۶۶ء تا جنوری ۱۲۸۷ء :- سُلطان ناصر الدین محمود کی

وفات کے بعد ناصر الدین یا التمش دونوں کی اولاد ذکور میں سے کوئی بھی ایسا نہ رہا جو بارِ حکومت کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا سکے۔ اِسلئے سلطنت کو طوائف الملوکی سے بچانے دنیز سلطان مرحوم کی وصیت کا لحاظ کر کے اُمرا سلطنت نے بلبن کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ اس کو سلطان التمش کی لڑکی منسوب تھی۔

سلطان التمش نے ۴۰ غلام خریدے تھے ان میں سے بلبن بھی ایک تھا۔[1] بلبن سے پہلے اس کا بھائی کشلی خاں سلطان کی ملازمت میں داخل تھا۔ شاہی سقہ گیری سے لیکر داروغہ مطبخ، میر شکار، حاجب، گورنر اور پھر ناصر الدین کے عہد میں وزارت عظمیٰ کے جلیل القدر منصب پر فائز ہوا۔ لیکن سلطان مرحوم کی زندگی تک بلبن سلطنت کے نظم ونسق میں وہ ضبط وباقاعدگی پیدا نہ کر سکا جو اُس کے عہد بادشاہی کی خصوصیت ہے اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ وہ تمام اختیارات رکھنے کے باوجود بادشاہ وقت کا ماتحت عہدہ دار تھا دوسرے سلطنت کے مختلف اقطاع پر ان ملوک شمسی کا تسلط تھا جو بلبن کے ہم قوم وہم حشم تھے اور جو التمش کے بعد اس درجہ سرکش ہوگئے تھے کہ انھیں مرکزی سلطنت کا باجگذار رکھنا اور خود مختار بادشاہ نہ ہونے دینا ہی بلبن کا بڑا کارنامہ ہے۔

ان چالیس ترک غلاموں میں جو چہلگان شمسی کہلاتے ہیں بعض غلام عمر واقتدار کے لحاظ سے بلبن سے بھی بڑے تھے[2] اور حرف "انا ولاغیری" (یعنی جو میں ہوں وہ دوسرا نہیں) ہر ایک کی زبان پر تھا۔[3] انھیں غلاموں نے طاقتور ہو کر اُن آزاد اُمرار وشاہزادوں کو بھی امورِ سلطنت سے بیدخل کر دیا جو چنگیز خانی سیلاب سے بچکر دہلی چلے آئے تھے اور جن کی وجہ سے درگاہ سلطان شمس الدین درگاہ محمودی وسنجری معلوم ہوتی تھی۔[4]

---

[1] کہتے ہیں کہ بلبن کا باپ البتی قبیلے کا ایک ترک سردار تھا جسکے قبضے میں دس ہزار سوار تھے۔ مغلوں کے حملوں کیوجہ سے خاندان تباہ ہو گیا اور بلبن کو انقلاب روزگار کی وجہ سے غلام بننا پڑا۔ (طبقات ناصری ص ۲۸۱ وفرشتہ ص ۷۴ جلد اول)

[2] اعزالدین کشلو خاں وغیرہ کا حال پیچھے لکھا جا چکا ہے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو (طبقات ناصری طبقہ ۲۲ ص ۲۶۱)

[3] ضیائے برنی ص ۲۸

[4] ضیائے برنی ص ۲۷ وفرشتہ جلد اول ص ۷۵

اس میں شبہ نہیں کہ بلبن نے مرکزی حکومت میں دخل پاتے ہی اپنی قوت اس قدر بڑھالی کہ کسی کو بھی دربار دہلی سے انحراف کرنے کی بمشکل جرأت ہو سکتی تھی پھر بھی ملوک شمسی کی انانیت اور مقامی ہندو رؤساء کی باغیانہ اسپرٹ کو دبانے کیلئے (تاکہ ملک میں بدامنی نہ پیدا ہونے پائے) اس کو مجبوراً بعض عجمی شعائر[1] پر عمل کرنا پڑا جن کو بعض مورخین نے اس کے اصولِ حکومت میں داخل کرکے اس کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ بلبن ایرانی اکاسرہ کی تقلید میں خود پرستی و عظمت نمائی کے طور و طریق[2] کو اسلامی تعلیمات کے نہ صرف منافی بلکہ شرک سمجھتا تھا، اور اپنے افعال کے جواز میں

---

[1] عجمی شعائر میں جاہ و حشمت کی نمود و نمائش اور عدم مساوات شامل ہیں۔ (مؤلف)

[2] بلبن نے اپنی بادشاہی کیلئے عجمی شعائر عظمت و جلال کو بلا سوچے سمجھے یا محض خود پسندی کی بنا پر اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اسلئے کہ لوگوں کے دلوں پر بادشاہ کا رعب و دبدبہ مستولی ہو جائے تاکہ مفسدوں کو فتنہ و فساد کی اور ظالموں کو کمزوروں کو ستانے کی ہمت و جرأت نہ ہو سکے (ملاحظہ ہو برنی ص۳۱، ص۳۲) وہ بارہا کہتا تھا کہ "رعایا در عصر بادشاہی بے حرمت و حشمت و ہول و ہیبت زندقہ بار آرد و تمرد و طغیاں رو نماید ہندواں سرتابی ہا کنند و مسلمانان از کثرت فسق و فجور و بسیاری زنا و لواطت و شراب خوردن و ناکردنی ہائے دیگر بدبخت شوند" (ضیائے برنی ص۳۵) یعنی وہ بادشاہ جو رعب و داب اور شان و شوکت نہیں رکھتا اسکی رعایا میں الحاد و سرکشی بڑھتی ہے۔ ہندو بغاوت کرتے ہیں اور مسلمان فسق و فجور و دیگر افعال شنیعہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسلئے وہ شاہانہ تزک و احتشام کا خاص طور سے لحاظ رکھتا تھا۔

اسکے شاہانہ رکھ رکھاؤ کی ضیائے برنی نے نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے۔ لکھتا ہے کہ "جو وقت اُس کا دربار آراستہ ہوتا یا سواری چلتی تو صدہا نقیب و چاؤش، پیادہ و سرہنگ، امراء و فوجی سردار اسکے گرد و پیش ہوتے تھے۔ ملک سیستان کے دیو ہیکل نوجوانوں کو بیش قرار تنخواہیں دے کر خاص طور سے اس کام کیلئے نوکر رکھا گیا تھا کہ وہ ننگی تلواریں کندھوں پر رکھے بادشاہ کی خواصی میں رہیں۔ اور اس شان محمودی اور شوکت سنجری کے ساتھ جب بادشاہ برآمد ہوتا یا سوار ہو کر چلتا تو نقیب و چاؤش قدم قدم پر صدائے بسم اللہ اس زور سے بلند کرتے کہ بازار و جنگل گونج جاتے تھے اور آواز دو دو کوس تک سنائی دیتی تھی۔ اس نظارہ سے تماشائیوں کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں اور حاضرین کے قلوب دہل جاتے تھے جو سو سو اور دو دو سو کوس سے محض یہ تماشا دیکھنے کیلئے دہلی آتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات نئے آدمی جو حضور میں باریاب ہوتے تھے خواہ وہ کہیں کے سفیر ہوں یا ہندوستان ہی کی کسی ریاست کے راجہ یا راجکمار تو وہ "خاکبوس" یعنی سلام کے وقت خوف سے گر پڑتے تھے

حجت پیش کرتا تھا کہ "اگر بادشاہ کا اعتقاد صحیح اور نیت درست ہو اور اِس قسم کے افعال سے اس کا مدعا محض حق کی حمایت اور عدل و امن کا قیام ہو تو وہ عنداللہ مواخذہ سے بری ہی"۔
(برنی صـ۴۱ و صـ۱۰۳)

---

۴۴ یا بیہوش ہو جاتے تھے"۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی صـ۳۰، ۳۱ از ضیائے برنی)

بلبن نے وقار بادشاہی و داب و آداب بادشاہی کی مبالغہ کی حد تک محافظت کی۔ برنی کا کہنا ہی کہ "۲۰ سالہ دورِ حکومت میں بلبن کے محلسرا کے خادموں اور ملازموں نے بھی اس کو کبھی بغیر ٹوپی و موزے کے نہ دیکھا۔ اس مدت میں اگر ۲۰ سال عہدِ وزارت کے بھی شامل کر لئے جائیں تو ۴۰ سال کے عرصہ میں اُسنے کسی رئیس و بازاری و مطرب و سفلہ و مسخرہ کو شرفِ ہمکلامی نہیں بخشا اور نہ اپنے حرکات و سکنات و نیز قول و فعل سے کوئی ایسی بات ظاہر ہونے دی جو شاہی وقار کو کم کرتی۔ اُسنے بادشاہی کے زمانے میں نہ کسی سے مزاح کیا اور نہ کسی کو مزاح کی اجازت دی۔ اسی طرح دربار میں نہ وہ کبھی قہقہہ مار کر ہنسا اور نہ کسی کو جرأت تھی کہ اسکے سامنے ہنسے۔ اس زمانہ کے ایک مشہور و معروف رئیس فخر باؤنی کو اس امر کی ہمیشہ تمنا رہی کہ بادشاہ سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع ملجائے اسکے لئے اُسنے بادشاہ کے مصاحبین و مقربین کی خدمت میں نذرانے پیش کئے۔ تاکہ وہ بادشاہ سے سفارش کر کے گفتگو کا موقع بہم پہونچائیں لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ بادشاہ نے ملک علاء الدین کشلیخاں "باربک" کے ذریعہ منع کروا دیا اور انکار کے وجوہ بیان کئے جو اس زمانہ کی اخلاقی و سیاسی فضا کو دیکھتے ہوئے بالکل صحیح ہیں۔ (صـ۳۳ تا صـ۳۶ از برنی)

بلبن کے زمانے میں قریبًا ۱۴ بادشاہ اور شاہزادے دہلی کے اندر پناہ گزیں تھے۔ یہ سب مغلوں کے ستائے ہوئے تھے اور مختلف ممالک سے بھاگ کر دہلی میں آئے ہوئے تھے۔ بلبن کو اپنے ان مہمانوں پر بڑا فخر تھا، اُسنے انکے نام پر محلّے آباد کرائے، جو سمرقندی، کاشغری، ختائی، رومی، خوارزمی وغیرہ نام سے پکارے جاتے تھے۔ پناہ گزیں بادشاہوں اور شہزادوں کی اس قدر و منزلت کے باوجود انھیں دربار میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ سب مودبانہ صفیں باندھے ہوئے کھڑے رہتے اور کھڑے ہی کھڑے بشرط اجازت عرض و معروض کرتے تھے۔ صرف ۲ دو عباسی شہزادے ایسے ضرور تھے جنھیں دربار میں بیٹھنے کی اجازت تھی اور جو بغداد سے پناہ لینے کی خاطر ہندوستان کی طرف آنکلے تھے۔

بلبن کو دربار کے رکھ رکھاؤ کا اتنا زیادہ خیال تھا کہ جب اُسکے محبوب شہزادے محمدؒ (خاں شہید) کے شہید ہونے کی خبر آئی تو وہ فرطِ غم سے نڈھال ہو گیا لیکن کیا مجال کہ دربار کے اوقات میں کوئی شخص اُسکے حرکات و سکنات سے اُسکے اُس غم کا اندازہ لگا سکے جسنے اُس کو بالآخر گھلا کر بسترِ مرگ پر پہونچا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بلبن جو کچھ کہتا تھا ویسا ہی سمجھتا تھا اور اسکے مطابق عمل بھی کرتا تھا اسلئے اس کے اصولِ حکومت میں ہمیں صرف دو چیزیں نظر آتی ہیں جن پر اس کی حکومت کا مدار تھا یعنی بادشاہ کو عادل و منصف ہونا چاہئے اور اس کا ذاتی کیریکٹر اتنا بلند ہونا چاہئے کہ دوسرے کیلئے نمونہ بن سکے۔ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو کسی حکومت کے استحکام و مضبوطی کی ضامن بن سکتی ہیں۔

(۱) عدل و مساوات

برنی نے بلبن کے عدل و انصاف کو بہت کچھ سراہا ہے لیکن ملازمتوں کے سلسلے میں بظاہر وہ میزان عدل سے ہٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے ملازمتوں کی تقسیم میں دو عملی رنگ کیوں اختیار کیا؟ اس کے اسباب پر بحث کرنے کے بعد بلبن کے عدل و انصاف کے دیگر واقعات پر تبصرہ کیا جائیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس پر آشوب زمانہ میں جبکہ ہندوستان کا سیاسی مطلع ابر آلود تھا ایک طرف وحشی مغلوں کے لشکر بادل کی صورت میں چھائے ہوئے تھے اور دوسری طرف مقامی ہندو مسلم اُمراء کے باغیانہ عزائم بجلیوں کی شکل میں کوند رہے تھے۔ بلبن کو اس قسم کے شریف النفس مجاہدین کی ضرورت تھی جو باطل کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو سکیں اور جن پر حکومت کو پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہو۔ اس قسم کی جماعت میں ظاہر ہے کہ نو مسلموں[1] کو شامل نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ آزمودہ کار سپاہی نہیں تھے اور انھوں نے ابھی حال میں اخلاق و معاشرت کے جس گرے ہوئے ماحول کو خیرباد کہہ کر اسلام میں قدم رکھا تھا اس کی بنا پر ذمہ دار عہدے انھیں اس وقت تک تفویض نہیں کئے جا سکتے تھے جبتک کہ ان کی سیرتیں اسلامی سانچے میں نہ ڈھل جائیں۔ ایسی حالت میں نہ صرف بلبن بلکہ سلطان التمش جیسے پاکباز و نیک نفس بادشاہ کو بھی انھیں افراد پر اعتماد کرنا پڑا جو نسلاً مسلمان تھے اور جن پر ابھی ہندوستان کی اخلاقی و معاشرتی حالت نے خراب اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کو اگر برنی کے الفاظ میں دوہرایا جائے تو "وہ (بلبن) حسب و نسب اور قوم و خاندان کی شرافت کا خاص طور پر لحاظ رکھتا تھا اور اجلاف و کم اصل لوگوں کو اعلیٰ عہدے نہیں دیتا تھا، چنانچہ اُس نے اپنے

---

[1] ان نو مسلموں میں بالعموم ہندوؤں کے اچھوت طبقے شامل تھے۔

عہدِ حکومت کے شروع ایام میں جبکہ اقطاع امروہہ کی حکومت ملک امیر علی سر جاندار کو عطا کی تو اس سلسلے میں ایک ایسے متصرف کی تلاش ہوئی جو اصیل ہو۔ اس زمانہ میں ملک علاء الدین کشلیخاں امیر حاجب تھا اور ملک نظام الدین بزغالہ وکیلدر کے عہدہ پر فائز تھا۔ دونوں نے کمال مہیار کو بجہت خواجگی امروہہ بارگاہ حکومت میں پیش کیا لیکن بلبن کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ نومسلم ہے تو وہ بہت جھلّایا اور وکیلدر، نائب وکیلدر، امیر حاجب، نائب امیر حاجب اور خاص حاجب ان پانچوں اعلیٰ عہدہ داروں کو بلا کر تنبیہ کیا کہ "ایں زماں مولازادہ کم اصلی و کم بضاعتی گزیدند" اس لئے اگر آیندہ اس قسم کے کارداروں کا تم نے میرے سامنے ذکر بھی کیا تو میں تمھیں ایسی سزا دوں گا جو دوسروں کیلئے باعثِ عبرت ہو۔ اسکے بعد ایک مجلس میں عادل خاں اور تمر خاں سے مخاطب ہو کر بلبن نے کہا کہ تھیں میرے آقا سلطان شہید (شمس الدین التمش) کا وہ واقعہ یاد ہے کہ جب انھوں نے ایک مرتبہ اقطاع قنوج کی حکومت اپنے پسر کلاں شہزادۂ ناصر الدین کو دی اور خواجگی قنوج کے عہدہ پر جمال الدین مرزوق کو نامزد کیا لیکن جمال الدین کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ کم اصل ہے تو سلطان مرحوم نے نہ صرف جمال الدین کو بلکہ تفحص کر کے ۳۲ اور کم اصلوں کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا۔ ان میں کوئی خواجہ و متصرف تھا تو کوئی مشرف و برید کے ذمہ دار عہدوں پر سرفراز تھا" (بحوالہ برنی ص۳۶ تا ص۳۹)

بلبن و التمش کا یہ طریقِ عمل جو بظاہر اسلامی عدل و مساوات کے منافی معلوم ہوتا ہے ان حضرات کیلئے خاص طور سے قابلِ غور ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اکثر ہندوؤں نے عہدوں کے لالچ میں اسلام قبول کر لیا تھا نومسلم کا لفظ برنی نے عمومیت کے طور پر استعمال کیا ہے جس طرح دوسرے مقام پر لفظ ہندو۔ بلبن کے عہدِ حکومت میں نومسلم زیادہ تر جاہل اور نیچے طبقہ کے لوگ تھے جن کو ذمہ دار عہدے صرف اس بنا پر نہیں دئیے جا سکتے تھے کہ انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا تھا۔ ملازمت کیلئے اصل چیز ذاتی قابلیت و شرافت ہے یعنی اُن کی تربیت و خاندانی روایات عمدہ و بہتر ہونی چاہئیں۔ بہرحال بعض سیاسی و معاشرتی وجوہ کی بنا پر سلطان التمش، بلبن نے مجبوراً نومسلموں کو ذمہ دار عہدوں سے الگ رکھا ورنہ اسلام میں مسلم و نومسلم کی حیثیت مساوی ہے۔ برنی نے جن گرے ہوئے الفاظ میں نومسلموں کو یاد کیا ہے اُن سے دھوکا نہ کھانا چاہئیے۔ اُس نے بلبن کا حال کم و بیش ۷۵ سال بعد ۷۵۸ھ میں لکھا ہے جبکہ دہلی کے تخت پر حکومت کرتے ہوئے مسلمانوں کو ۱۵۰ سال سے زائد ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں نومسلموں کی معاشرتی و

اخلاقی حیثیت پر اسلامی تعلیمات نے بہت کچھ اچھا اثر ڈالا ہو گا لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ قدیم شرفا کی اولاد روبہ تنزل ہو گی کیونکہ از روئے حساب ۱۰۰ سال کے اندر ۳ نسلیں بدلتی ہیں اور تیسری نسل پہلی سے یقیناً خراب ہوتی ہی جس کی زندہ مثال خود برنی کی اپنی ذات ہی کہ اُسکے بزرگ کیا تھے اور وہ کیا تھا، اُسکے زمانہ میں نومسلم اپنی اعلیٰ صلاحیتوں وقابلیتوں کی وجہ سے حکومت کے اونچے سے اونچے عہدوں پر مقرر کئے جارہے تھے لیکن برنی اور اُس جیسے دیگر شریف خاندانوں کے افراد اپنی نااہلیت کی وجہ سے کس مپرسی کے عالم میں تھے۔ ظاہر ہی کہ یہ تبدیلی اُس کی ذہنی و رُوحانی کوفت کا کتنا بڑا سبب ہو گی یہی وجہ ہے کہ جب اس کا بس نہیں چلتا تو بزعم خود اپنے کو شریف سمجھ کر نومسلموں کو رذیل، کم اصل اور لئیم وغیرہ کے خطابات سے موسوم کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہی اور اُنکے وزن کو گھٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں برنی کے طرز تحریر سے ایک اور چیز کا بھی پتہ چلتا ہی اور وہ یہ کہ ہندوستان کے نومسلم اسلامی مساوات کی رو سے حکومت کے ہر شعبہ میں حکمراں طبقے کے دوش بدوش کام کرنا اپنا حق سمجھتے تھے! اِسلئے ملازمتوں کیلئے ان کی مانگ کا اثر براہِ راست ترکوں پر پڑتا تھا اور یہ بات ان (ترکوں) کو کھٹکتی تھی۔ اسلئے وہ حکومت میں نومسلموں کو برابر کا شریک کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ اِس سے اُنکی معیشت و ملازمت پر اثر پڑتا تھا، یہی وجہ ہی کہ جب ایک نومسلم جمال الدین مرزدق کو سلطان التمش نے خواجگی قنوج کے عہدہ پر نامزد کیا تو شہزادہ ناصر الدین حاکم قنوج کے نائب (وزیرزادہ) خواجہ عزیز پسر بہروز نے اس کو خلعت دیئے جاتے وقت پیچھے سے کانٹا مارا اور اسکی اہانت کیلئے بلند آواز سے یہ شعر پڑھا سے

بدست دوں مدہ خامہ کہ گردوں رامجال افتد
بہ سنگے کہ در کعبہ است سازد سنگ استنجا

اس کا نتیجہ آپ کو بتایا جاچکا ہی۔ اسی طرح ملک اعز الدین باربک اور ملک قطب الدین حسن غوری "وکیلدر" نے از راہِ حسد التمش سے وزیر اعظم نظام الملک جنیدی کی چغلی کھائی کہ وہ نسلاً جولاہہ ہے لیکن بادشاہ پر اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔ (برنی ص ۳۸، ۳۹)

بہر حال التمش کی طرح بلبن نے بھی ذمہ دار عہدوں کی تقسیم میں اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ حکومت نااہلوں اور غیر ذمہ دار لوگوں کے ہاتھ میں نہ جانے پائے تاکہ ان کو رعایا پر بے جا ظلم و تشدد اور حکومت میں

اختلال پیدا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ بادشاہوں کی نجات کیلئے جو اعمال[1] ضروری ہیں وہ اُسے از بر یاد تھے، وہ اپنی مخصوص مجلسوں میں اپنے لڑکوں و نیز اراکین سلطنت کو جمع کر کے ان اعمال کی طرف توجہ دلایا کرتا تھا اور رقتِ قلب کیساتھ کہا کرتا تھا کہ "شما کہ فرزندان و نزدیکاں من اید پائے برہوش نہید کہ اگر ظلم شما بر عاجزے مرا معلوم شود من شمارا سزائے آں برسانم و بیشتر آں باشد کہ من قاتل مظلوم را زندہ نگزارم نزدیکی شما و حقوق خدمت شما مرا در انصاف ستانی مانع نباشد"[2] یعنی مجھ سے تمہارا تقرب اور حقوق خدمت میرے حق دادرسی میں مانع نہیں آسکتے، اگر مجھے تمہارے ظلم کا علم ہو جائے تو غیر ممکن ہی کہ میں تمھیں عبرتناک سزا نہ دوں اور بیشتر تو تم یہی دیکھو گے کہ مظلوم کا قاتل زندہ نہیں رہنے پائے گا۔ چنانچہ مظلوم کی دادرسی اور عدل کرنے کے وقت کسی دنیاوی مصلحت یا مروت کی اُسے ذرہ برابر پرواہ نہ ہوتی تھی۔ آج بھی تاریخ کے صفحات اِس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا تھا اُسی کے مطابق عمل بھی کرتا تھا۔

برنی نے اس ضمن میں دو نہایت نصیحت آمیز و عبرت خیز واقعات کا تذکرہ کیا ہی اُن میں سے پہلا یہ ہی کہ "ملک بق بق پدر قیرا بیگ شاہی باڈی گارڈ کا افسر اعلیٰ (سر جانداران) تھا، اُسے حد درجہ شاہی تقرب حاصل تھا۔ بادشاہ نے اس کو اپنے عہد کے سب سے زیادہ وقیع صوبہ بدایوں کا گورنر بنا دیا تھا اور اس کو اجازت دے دی تھی کہ وہ ذاتی طور پر چار ہزار سواروں کا دستہ ملازم رکھ سکے اس لئے وہ ایک نہایت عالیجاہ امیر بھی تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ غصہ کی حالت میں اپنے ایک فراش کو تازیانہ سے اِتنا

---

[1] سلطان بلبن کہا کرتا تھا کہ "میں نے شمس الدین التمش کے یہاں مجلس وعظ میں دو مرتبہ سید نور الدین مُبارک غزنوی کی زبان سے سنا ہی ...... کہ چار چیزوں سے نجات اخروی حاصل کی جا سکتی ہی۔ (۱) بادشاہ کا اعتقاد درست ہو اور وہ امر بالمعروف کے رواج دینے اور نہی عن المنکر کے جاری رکھنے کی کوشش کرے۔ (۲) مسلمانوں میں فسق و فجور نہ پھیلنے دے اور عمدہ قسم کے پیشوں میں مشغول ہونے کی ترغیب دے۔ (۳) احکام شرع کے نفاذ کیلئے متقی و پرہیزگار و نیز خداترس دیندار لوگوں کا انتخاب کرے۔ (۴) دادرسی اور انصاف ستانی میں کسی کی رو رعایت نہ کرے تاکہ بہ قہر و غلبہ و سطوتِ بادشاہی ظلم ظالماں برنیزاند"، وغیرہ وغیرہ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہوں ص۴۱ تا ص۴۴ از برنی)

[2] (تاریخ فیروز شاہی ص۴۱ از برنی)

پڑوایا کہ وہ ہلاک ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بلبن غالباً دورہ کے سلسلہ میں بدایوں گیا اس وقت فرّاش کی بیوی نے حضور میں نالش کی۔ بلبن کو جب واقعہ کی تصدیق ہوگئی تو اُس نے حکم دیا کہ اس عورت کے سامنے کھڑا کرکے مجرم صوبیدار کے اتنے دُرّے مارے جائیں کہ وہ ہلاک ہوجائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور ساتھ ہی بدایوں کا برید یعنی ڈاک کا عہدہ دار بھی جس نے اس واقعہ کی اطلاع نہیں کی تھی سُولی پر لٹکا دیا گیا۔ اسی طرح ملک ہیبت خاں حاکم اودھ نے ایک شخص کو بیجا طور پر قتل کرا دیا تھا۔ مقتول کی بیوی نے بادشاہ سے دادرسی چاہی۔ بلبن نے اپنے سامنے ہیبت خاں کے پانچسو دُرّے (کوڑے) لگوائے اور اس کے بعد مستغیثہ سے کہا کہ "ایں قاتل بندۂ من بود من تو بخشیدہ ام ایں را بزخم کارد بدست خود بکش" یعنی یہ قاتل آجتک میرا غلام تھا اب یہ تیرا غلام ہے اس کو تو اپنے ہاتھ سے قتل کردے۔ ہیبت خاں نے منت وسماجت کرکے لوگوں کو اپنا سفارشی بنایا اور اس عورت کو بیس ہزار تنکہ (بطور خون بہا) دیکر اس کی غلامی سے آزادی حاصل کی اور پھر گوشہ نشین ہوکر اپنی بقیہ زندگی گذار دی[1]۔ ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بلبن کس مزاج اور کس قماش کا آدمی تھا۔

راجہ شیو پرشاد صاحب نے اپنی تاریخ میں بلبن کی بابت کتنا موزوں فقرہ لکھا ہے کہ "وہ اپنا نام اور کام دونوں اپنی یادگار چھوڑ گیا"[2]۔ جس طرح بچوں پر ماں وباپ کی شفقت و محبت ہوتی ہے۔ اسی طرح مظلوموں وعاجزوں کے لئے اُس کی محبت وشفقت مشہور ہے۔ برنی لکھتا ہے کہ "دریاب مظلوماں وعاجزاں پدری ومادری کردے واذاں کہ پسران ومقربان وخواصان و کارداران ووالیان ومقطعان او را از مزاج انصاف ستانی ودادرہی سلطان بلبن روشن بود زہرہ نبودے کہ ایشان با غلام وکنیزک وسوار وپیادہ خود زیادتی کنند"[3]۔ یعنی اس کے عدل و انصاف کی وجہ سے کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں پر ذرا سی بھی زیادتی کرسکے۔

حضرت امیر خسروؒ بھی برنی کے بیان کی تائید کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

زہے عون مظلومان دل تنگ — غیاث الدین ودنیا شد برا ورنگ

---

[1]:۔ برنی صفحہ ۴۰ و ۴۱۔ [2]:۔ تاریخ آئینہ نما صفحہ ۲۰ و آئینہ حقیقت نما صفحہ ۲۸۷۔
[3]:۔ تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۴۰ از ضیائے برنی۔

شہے بود او کہ از بخشائش و زور خرام پیل نپسندید بر مور

(ملاحظہ ہو مثنوی دولرانی قلمی کتب خانہ حبیب گنج)

اس نے اپنے عمال حکومت کی نگرانی و نیز ملک کی عام حالت سے باخبر رہنے کیلئے[1] معتبر مریدوں کی ایک جماعت کو مملکت کے ہر چھوٹے بڑے شہر و قصبہ میں متعین کر رکھا تھا۔ یہ ایک طرح کا محکمہ جاسوسی تھا۔ یہ محکمہ صوبجاتی حکومتوں کے اثر و اقتدار سے باہر تھا۔ اس محکمہ کے افراد براہ راست شہنشاہ کو جوابدہ تھے۔ ان جاسوسوں کی وجہ سے مقطع، والی یا عامل کو اتنی جرأت و ہمت نہ تھی کہ وہ رعایا کے کسی فرد پر دست تظلم دراز کر سکے۔

(۲) ذاتی خصائل

عہد جوانی میں بلبن اپنی فیاضی کی بدولت بلاشبہ ایک مسرف اور عیش پسند امیرزادہ نظر آتا ہے لیکن تاج شاہی سر پر رکھتے ہی اس نے تمام لغو مشاغل کو خیرباد کہکر وہ اعتدال و تقویٰ اختیار کیا جو اس کے آقا سلطان شمس الدین التمش کا امتیازی وصف سمجھا جاتا تھا۔

بادشاہ ہونے کے بعد بلبن کے اندر اس طرح کی یکایک و اچانک تبدیلی دنیا کے ان تمام غیر مسلم افراد کے لئے ضرور ایک معمہ سے کم نہیں جو حیات بعد الممات کے قائل نہیں اور جو مرنے کے بعد اپنے کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے لیکن ایک مسلمان کے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد ایک وہ بھی دن آنے والا ہے جبکہ خدائے عز وجل کے سامنے اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس صورت میں اپنے اعمال ہی کیا کم ہیں جو دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی جائے۔ بلبن نے بتوفیق ایزدی اس بات کو سمجھا اور خوب سمجھا اس کے نزدیک دنیا میں نبوت کے بعد بادشاہت کا درجہ ہے جو ایک بڑی جلیل و عظیم نعمت ہے۔ وہ شہزادہ محمد کو وصیت کرتے وقت آگاہ کرتا ہے کہ "دیکھو! الناس علی دین ملوکھم کی حقیقت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا اگر بادشاہ اور اس کے اعوان و انصار و ولات و عمال وغیرہ دیندار و

---

[1] آجکل دنیا کی تمام متمدن حکومتوں میں جاسوسی کا محکمہ قائم ہے اور اس سے طرح طرح کے کام لئے جاتے ہیں لیکن بلبن کی طرح کوئی حکومت بھی اس سے اپنے حکام کے اعمال کے نگہداشت کا کام نہیں لیتی اور نہ اس کی ضرورت سمجھتی ہے کیونکہ حکام کے اعمال کو ذاتی (نجی) اور سرکاری: دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اگر کوئی حاکم ذاتی طور پر کتنا ہی بدچلن، فاسق و فاجر، اور بد معاملہ ہو، رات کو کلب میں بیٹھ کر شراب میں بیتا ہوا ور اپنے احباب کے ساتھ فلاش و برج کے ذریعہ مہذب جوا کھیل کر اپنا جی بہلاتا ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں حکومت اس سے کوئی تعرض نہیں کرتی بشرطیکہ وہ سرکاری فرائض کو قانون کے مطابق ٹھیک طور سے انجام دیتا ہو، اب اس کا اندازہ آپ خود لگائیے کہ ایسا حاکم جس کے ظاہر و باطن میں کوئی یکسانیت و مطابقت نہ ہو کیا وہ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر اسی تدین و بے لوثی کے ساتھ سرکاری کام کو کر سکے گا جو وہ بصورت دیگر انجام دیتا۔ (مؤلف)

خدا ترس ہونگے تو اس کے تمام ملک میں خرد و بزرگ، مرد و زن، پیر و جوان، عدل و احسان، خیرات و حسنات، طاعت و عبادت، امانت و دیانت اور راستی و راستکاری کو اپنا شعار بنائیں گے ورنہ بصورت دیگر سب کے سب فاسق و فاجر بن جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کے اعمال کی تمام تر ذمہ داری بادشاہ پر عائد ہوگی جن کا اسے روز قیامت جواب دینا ہوگا اور وہ بڑا سخت دن ہوگا" اس کے بعد ہدایت کرتا ہے کہ "خلیفہ دوم سیدنا عمرؓ اور (خلیفہ بنو امیہ) عمر ابن عبد العزیز کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ عمل بناؤ[1]" اسی طرح شہزادہ بغرا خاں کو صوبہ بنگال کی حکومت تفویض کرتے وقت نیک اعمال کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلائی کہ "سب سے مشکل کام آخرت کا ہے وہاں جو تمہیں جوابدہی کرنا پڑے گی اس سے غافل نہ رہنا[2]۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو وقتاً فوقتاً جو کچھ بھی وصیتیں و نصیحتیں کیں وہ ان پر خود بھی کاربند تھا اس کو اوباش اور بدچلن و نیز فاسق و فاجر سے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان بڑی سخت نفرت تھی چنانچہ ایک مرتبہ شہزادہ بغرا خاں کو جو اوائل عمر میں شراب کا عادی تھا بہت سخت پکڑا اور پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ تنبیہ کے بعد "برائے پسر بریدان گماشت و در کار تتبع بسیار کرد او ہم راست ایستاد و لایعنیہا ترک داد[3]" یعنی اسکی دیکھ بھال کے لئے جاسوس مقرر کئے یہانتک کہ وہ راہ راست پر آگیا اور بیہودہ مشاغل کو ترک کر دیا۔

غرضکہ بلبن نے ملک کی اخلاقی حالت کو بہت بلند کرنے کی کوشش کی جس کے لئے اس نے سب سے پہلے اپنا نمونہ پیش کیا۔ وہ خود نہایت عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار شخص تھا بادشاہ ہونے کے بعد ہر قسم کے لایعنی مشاغل سے توبہ کرلی اور برنی کی روایت[4] کے بموجب طاعت و عبادت اور روزہ و نماز میں حد سے زیادہ انہماک برتا۔ وہ نماز جمعہ و جماعت کے اہتمام میں نیز نماز اشراق و چاشت و اوابین و تہجد کی ادائگی میں ذوق و شوق کے ساتھ حصہ لیتا تھا۔ راتیں خواہ وہ کسی موسم کی ہوتیں، قیام میں گذارتا اور معمولات ور دو وظائف سفر و حضر دونوں میں فوت نہ ہونے دیتا۔ کھانا کھانے کے وقت دینی مسائل پر علماء سے گفتگو کرتا اور جمعہ کی نماز کے بعد ان کے مکان پر حاضری دیتا۔ اور ان کے وعظ و نصائح کو کمال انکسار وادب کے ساتھ سنتا تھا بعض اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ نہایت جاہ و جلال کے ساتھ سوار ہو کر کہیں جا رہا ہے۔ راستہ میں دیکھتا کہ کسی مسجد میں وعظ ہو رہا ہے فوراً سواری سے اتر کر عام مجمع میں جا کر

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص۷۰ تا ۷۲، ۷۶ از ضیائے برنی	[2] تاریخ فیروز شاہی ص۹۲، ۹۳، ۹۴ از ضیائے برنی

[3] ضیائے برنی ص۸۱	[4] ضیائے برنی ص۴۶، ۴۸

بیٹھ جاتا اور ذکر و اذکار سے متاثر ہو کر زار زار رونے لگتا[1]۔ نماز جمعہ کے بعد بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دیتا۔ اکابرین کی نماز جنازہ میں شرکت کرنا بھی اس کے معمولات میں داخل تھا۔

بایں ہمہ وہ باغیوں و مجرموں کے لئے نہایت سخت تھا وہ ان کو ایسی قابل عبرت سزائیں دیتا تھا جس سے سوسائٹی کا معیار بلند رہے اور بداخلاقیاں رعایا کا مزاج نہ بن سکیں اس کی اس اصلاح پسند سخت گیری پر نکتہ چینوں نے بے رحمی وناشروعیت کا بھی شبہ کیا ہے لیکن یہ اعتراض نگاہ کی کمی اور اخلاقی معیار کی پستی سے پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ ؎

نکوئی با بدان کردن چنانست ‏ ‏ ‏ ‏ که بد کردن بجائے نیک مردان

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ محتاجوں کی امداد اور بیکسوں کی دستگیری اور ویران علاقوں کے آباد کرنے میں اس کی رعایا پروری ضرب المثل تھی۔ ضعیفوں اور بیواؤں یتیموں کا اس سے زیادہ ہمدرد اور خبرگیراں سردار ہندستان بھر میں کوئی نہ تھا۔ اپنے غریب اور زخمی بیمار سپاہیوں کے ساتھ اس کی مہربانی مشہور تھی کہ سفر کے دشوار گزار مقامات پر بادشاہی سواریاں ان کے لئے وقف کر دی جاتی تھیں اور جبتک وہ اس مقام سے بآرام نہ گذر جاتے، وہ آگے قدم نہ بڑھاتا۔ اور اس سلسلہ میں بعض وقت اس کو اس مقام پر دس، دس بارہ، بارہ دن تک قیام کرنا پڑتا۔ اور اس کو وہ بخوشی برداشت کرتا۔

برنی کے اس بیان کی تصدیق ایک کتبہ سے بھی ہوتی ہے جو کہ نیم سنسکرت اور نیم مقامی زبان ہریانہ میں لکھا ہوا پالم کے مقام پر دستیاب ہوا ہے۔ کتبہ کا سن ۱۳۳۷ بکرمی مطابق ۱۲۸۰ء عیسوی ہے۔ اس کتبہ میں گزشتہ سلاطین دہلی کی بیحد تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ بلبن کے لئے خاص طور سے لکھا ہے کہ "اس کی رعایا پروری اور عدل گستری کو دیکھ کر وشنو دیوتا کو اب اس کی فکر نہیں رہی کہ وہ دنیا کی دیکھ بھال کریں اس لئے وہ بشرام (آرام) کرنے کے لئے شیر ساگر (دودھ کے سمندر) کو چلے گئے ہیں"۔ اسی کتبہ میں آگے چل کر دہلی کا کچھ حال عمدہ الفاظ میں لکھا ہے[2]۔

---

[1] دہلی میں اس وقت بڑے بڑے نامور علماء و مشائخ جمع تھے برنی نے مولانا برہان الدین بلخی، قاضی شرف الدین دلوالجی، مولانا سراج الدین سنجری اور مولانا نجم الدین دمشقی کے نام گنائے ہیں۔ جس طرح بلبن علماء و مشائخ کی قدر کرتا تھا اسی طرح لشکر کے قاضیوں کی بھی بڑی عزت کرتا تھا یہ سب اپنی دینداری و تقویٰ کے لئے مشہور تھے۔ (مؤلف)

[2] EPIGRAPHIA INDO-MOSLEMICA 1913—14 PP 35—45

بحوالہ ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت از قریشی صفحہ ۲۰۴ تا صفحہ ۲۱۴

مردانِ حق کی حق گوئی و بے باکی

(از مولانا محمد رابع صاحب حسنی)

اظہار حق خصوصاً سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہنا اسلامی تاریخ میں سرفروشی اور بے باکی کے صدہا واقعات کا عنوان ہے اس کلمۂ حق کی مثالیں ہم کو تاریخ اسلام کے ہر دور میں ملتی ہیں، اور ان کو پڑھ کر مردان حق آگاہ کی جرات و بے باکی اعتماد علی اللہ شوق شہادت اور دنیا و دنی کی حقارت کے عجیب نمونے نظر آتے ہیں بعد کی صدیوں میں دین سے جس قدر بعد ہوتا گیا اور مسلمانوں میں جس قدر حب دنیا و جاہ طلبی، اور حکومت نوازی عام ہوتی گئی اس قسم کے حالات اور واقعات کم اور ضمیر فروشی کے واقعات زیادہ نظر آنے لگے پھر بھی ان واقعات سے تاریخ کے صفحات یکسر خالی نہیں، خود ہمارے ملک ہندوستان میں اس اظہار حق اور جرأت و بے باکی کی ایسی درخشاں مثالیں ملتی ہیں جو نہ صرف اس ملک کی تاریخ بلکہ عمومی تاریخ اسلام کی زینت ہیں، موجودہ دور ابتلا میں جس میں اظہار حق کی جرات اور حق و صداقت پر استقامت کی ہر دور سے زیادہ ضرورت ہے ان مثالوں کا حافظہ میں تازہ کرتے رہنا بڑی مفید خدمت اور امت کی اہم ضرورت ہے اس بنا پر ہم ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے آغاز کے چند موثر واقعات پیش کرتے ہیں جو شمع راہ کا کام دیں گے۔ ان واقعات میں ہمارا ماخذ تمام تر (مولانا سید عبدالحئی صاحبؒ) کی عربی تالیف نزہۃ الخواطر ہے جو ہندوستان کے سیر و تراجم کا سب سے مستند اور مکمل ماخذ ہے ــــ ع

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

محمد رابع حسنی

امیر علاء الدین برنی

نواب اعظم علاء الدین علاء الملک ان مشہور و معروف لوگوں میں تھے جن کی سوجھ بوجھ ہوش و حواس اور جن کی سیاست و تدبر اور دوسرے فضائل مسلم ہیں، ان کو سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی نے "کڑہ" اور اس کے اطراف کا حاکم مقرر کیا تھا پھر ان کو مرکز میں بلا لیا اور شہر دہلی کا کوتوال مقرر کیا یہ منصب اس وقت نہایت اہم سمجھا جاتا تھا اس پر وہی سرفراز ہوتا تھا جس پر بادشاہ وقت کا پورا پورا اعتماد ہو کیونکہ وہ بادشاہ اس کے متعلقین اور خزانہ کا محافظ ہوتا تھا

سلطان علاء الدین نے جب بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں تو ان شاندار فتوحات اور مسلسل کامیابیوں کا اُس کو نشہ سا رہنے لگا، اس نے ایک مرتبہ مجلس خاص کے سامنے اپنے دو خیال پیش کئے ایک تو یہ کہ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کے سامنے ایک نئی شریعت پیش کرے اور اس سے دنیا میں اس کا نام روشن اور یادگار باقی رہے اور اپنے خواص میں سے ایک شخص کو اپنا قائم مقام بناکر دنیا کو فتح کرنے نکل جائے اور سکندر اعظم کی طرح دنیا کو زیر و زبر کر ڈالے ان دو ارادوں کے بیان کرنے کے بعد کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ بادشاہ کو بھی اس خواہش پر ٹوک سکتا کیونکہ بادشاہ کا رعب و داب ہر خاص و عام پر تھا بادشاہ نے اپنی اس خواہش کو علاء الملک کے سامنے بھی پیش کیا علاء الملک نے سُنا اور فکر میں پڑ گئے انھوں نے خیال کیا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں تھوڑی عمر باقی ہے قول حق سے کیوں باز آؤں ممکن ہے مجھ کو شہادت حاصل ہو ورنہ شاید اللہ سلطان کو ہدایت دیدے ؏ زدیم بر صف زندان و ہرچہ باداباد

علاء الملک بادشاہ کی طرف متوجہ ہوے اور انھوں نے عرض کیا کہ اگر آپ جواب چاہتے ہیں تو سب کو ہٹائیے۔ بادشاہ نے تخلیہ کرایا علاء الملک نے کہا کہ میرا آفتاب عمر لب بام ہے ضعف و پیری کا زمانہ ہے اگر جواب صحیح ہو تو محض اللہ کا فضل ہے اور اگر جواب صحیح نہ دے سکوں تو مجھے میرے بڑھاپے اور ڈھلتے ہوے ہوش و حواس کی وجہ سے معذور سمجھا جائے۔ پھر کہنے لگے کہ شریعت کا تعلق انبیاء سے ہے اور نبوت کا تعلق وحی سے ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہو چکا اب اس کے بعد کسی شریعت کے وضع کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور دیکھئے اپنی اس رائے کا کسی

کسی سے ذکر نہ کیجئے گا ورنہ لوگ متنفر ہو جائیں گے اور ملک میں بدامنی اور انتشار رونما ہو جائے گا رہی دوسری بات تو اس سے بادشاہ کی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کا اندازہ ہوتا ہے یہ مقصد بلند بادشاہ کی ہمت عالی کے بالکل شایاں شان ہے مگر اس کے باوجود بادشاہ کو اس بات کا اہتمام اور فکر ہونی چاہیے کہ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کا نائب کون ہوگا اور جب بادشاہ واپس آئے گا تو کیا وہ قائم مقام اپنے عہد کا ایفا کرے گا یا غدر اور بے عہدی کرے گا پھر جس طرح ارسطو نے سکندر اعظم کی نیابت ۲۲ سال تک کی تھی یہاں بھی کوئی ایسا ہے جو اس مدت میں آپ کی نیابت کرے بادشاہ نے کہا کہ میں پھر کیا کروں علاء الملک نے کہا کہ آپ کو چاہیے کہ ہندوستان کے جنوبی صوبجات کیطرف توجہ کریں اور شمال میں کابل اور شمالی صوبجات کی مہم سر کریں جہاں بدامنی ابتری اور قتل و غارت جاری ہے دوسری اہم بات یہ ہے کہ بادشاہ اپنے ملک کی سرحد کو مضبوط کریں تاکہ تاتاریوں کی جو حملے کرتے رہتے ہیں اور ہلاکت اور انتشار پھیلاتے رہتے ہیں روک تھام ہو سکے اگر ان علاقوں پر بادشاہ کا قابو ہو جائے تو بادشاہ کے لئے دوسرے ممالک میں لشکر بھیجنا آسان ہو جائے گا اور آسانی سے وہ ممالک کو مسخر کر سکے گا میرے نزدیک تو لہو و لعب شراب و کباب اور عیش پرستی کی عادات اگر دور کی جائیں تو ان کاموں کا انجام دینا کوئی مشکل نہیں

سلطان علاء الدین نے یہ باتیں غور سے سنیں ان سے متاثر ہوا اور امیر علاء الدین کے ساتھ اعزاز و اکرام سے پیش آیا۔

قاضی مغیث الدین بیانوی رحمۃ اللہ علیہ

سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی کے زمانہ میں قاضی مغیث الدین بیانوی بہت بڑے حنفی فقیہ تھے بادشاہ ان کا احترام کرتا ان کے ساتھ نشست کے لئے وقت نکالتا اور ان کو کھانے میں شرکت کی دعوت دیتا۔ قاضی مغیث الدین بادشاہ سے بالکل مرعوب نہ تھے کلمہ حق سے ذرا نہ چوکتے۔ ایک دفعہ بادشاہ نے قاضی صاحب سے کہا کہ مجھے تم سے ایک بات دریافت کرنی ہے مگر صحیح صحیح جواب دینا قاضی صاحب نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا وقت قریب ہے بادشاہ حق بات دریافت کرتے ہیں اور حق بات بادشاہ کے دل کو لگے گی نہیں اور میرا ناحق خون ہوگا بادشاہ نے کہا کہ نہیں تم اطمینان

رکھو ایسا نہ ہوگا، بادشاہ نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ عمال حکومت کے لئے چوری اور رشوت ستانی کی سزائیں شرع میں کہاں تک گنجائش ہے قاضی صاحب نے جواب دیا کہ میں نے جہاں تک کتابوں میں دیکھا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ان کو کافی نہ ملتا ہو اور یہ لوگ خراج سے یا بیت المال وغیرہ سے لیتے ہوں تو ان پر قید و بند اور جرمانہ جائز ہے مگر ایسی حالت میں قطع ید کی اجازت نہیں دی گئی بادشاہ نے کہا کہ میں نے کام کرنے والوں کو پورا پورا دینے کا حکم دے رکھا ہے مگر اس کے باوجود وہ جب خیانت کرتے ہیں تو میں مار پیٹ اور حبس کے ذریعہ ان سے وصول کر لیتا ہوں اسی لئے تم اس زمانہ میں دیکھتے ہو کہ چوری رشوت ستانی خیانت ناپید ہیں۔

پھر بادشاہ نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ دیوگیر میں میں نے مشقت اور تکلیف جھیل کر اس وقت مال غنیمت حاصل کیا ہے جب کہ میں بادشاہ نہیں ہوا تھا تو کیا وہ مال میرا ہی یا بیت المال کا۔ قاضی نے جواب دیا کہ دیوگیر میں جو مال بادشاہ نے حاصل کیا ہے وہ مال لشکر اسلام اور مجاہدین کے ذریعہ سے حاصل کیا ہے اگر بادشاہ صرف اپنی محنت اور جفاکشی سے حاصل کرتے تو وہ صرف بادشاہ کا ہوتا مگر اس صورت میں وہ بیت المال کا ہے بادشاہ یہ سن کر ناراض ہوا اور غصہ میں کہنے لگا کہ یہ تم کیسے کہتے ہو میں نے وہ مال اپنے خدام کے اور اپنے ذریعہ سے حاصل کیا ہے وہ بیت المال کا کیسے ہو سکتا ہے اچھا یہ تو بتاؤ کہ بیت المال سے مجھے اور میرے گھر کے خرچ کے لئے کس قدر ملنا چاہیئے قاضی صاحب کہنے لگے کہ مجھے میری قضا آتی دکھائی دیتی ہے بادشاہ نے کہا کہ یہ کیسے کہتے ہو قاضی صاحب نے کہا کہ بادشاہ نے ایسا سوال کیا ہے کہ اگر صحیح بیان کیا گیا تو جان بچنا مشکل اور اگر غلط یا توڑ مروڑ کے بیان کیا گیا تو قیامت میں جہنم سے نجات مشکل ہے بادشاہ نے کہا کہ تم مامون ہو کہو جو کچھ کہنا چاہتے ہو قاضی صاحب کہنے لگے کہ اگر بادشاہ خلفاء راشدین کی اقتدا کرنا چاہتے ہیں تو بیت المال سے اس قدر لیں جتنا مجاہدین کو دیتے ہیں یعنی دو سو چونتیس تنکہ لیں اور اگر بادشاہ اتنے میں کفایت نہ سمجھیں تو اتنا لیں جتنا اپنے وزراء اور حاکموں کو دیتے ہیں اور اگر بعض علماء کے فتوی کے مطابق اس سے زاید لینا چاہتے ہیں تو زاید لے کر اس سے اچھی زندگی گذار سکتے ہیں اور خبردار اتنا زاید نہ ہو کہ بادشاہ سلامت اپنی عورتوں کو ڈھیری کی ڈھیری سونا چاندی دیں اور بیت المال اور خراج کا روپیہ اس میں خرچ

کریں اور جاگیریں عمدہ لباس بہترین برتن بھی مسلمانوں کے مال سے دیں اگر ایسا ہوا تو یہی مال قیامت کے دن وبال جان اور بادشاہ کیلئے عذاب بن جائیگا بادشاہ نے کہا کہ تمہیں ہماری تلوار کا خوف نہیں تم کہتے ہو کہ بادشاہ جو کچھ اپنی عورتوں کو دیتا ہے وہ حرام ہے قاضی صاحب نے کہا کہ بے شک میں آپ کی تلوار سے ڈرتا ہوں جب ہی تو مجھے خطرہ ہے کہ میرا عمامہ میرا کفن بنے گا لیکن بادشاہ نے مجھ سے مسائل شرعیہ دریافت کئے تھے میں نے ٹھیک بیان کیا اور اگر بادشاہ مجھ سے حکومتی مصالح کے لحاظ سے پوچھتے تو میں کہہ سکتا تھا کہ بادشاہ اپنی عورتوں پر جو کچھ خرچ کرتے ہیں وہ ہزار میں ایک کے برابر ہے بادشاہ نے کہا کہ تم نے تمام باتوں کو حرام کہہ دیا اور تم نے میری سختی اور سزاؤں کو حرام نہیں کہا جانتے ہو میں نے شراب پینے اور بیچنے والوں کو کنوؤں میں قید کا حکم دے رکھا ہے زانی مردوں کے اعضاء قطع کرنے کا اور زانی عورتوں کے قتل کا حکم دے رکھا ہے اور میں باغیوں میں نیک و بد کی تمیز نہیں کرتا ان کو قتل کراتا ہوں انکے بیوی بچوں کو ہلاک کرواتا ہوں اور جو بیت المال میں خیانت کرتا ہے اس کو قید و بند سختی و سزا کا حکم دیتا ہوں حتیٰ کہ وہ شخص تمام حساب ادا کرتا ہے۔ قاضی صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور جوتے کے فرش پر پہنچ کر تعظیم کی اور کہنے لگے کہ بادشاہ مجھے قتل کریں یا رکھیں شریعت نے تو اسکو ناجائز قرار دیا ہے اور اس طرح آزاد نہیں کیا کہ آدمی جو چاہے کرے بادشاہ اپنے غصہ کو دبا گیا اور وہاں سے اٹھ کر چپ چاپ زنانہ میں چلا گیا ادھر قاضی صاحب اپنے گھر چلے آئے دوسرے دن قاضی صاحب غسل کرکے اپنے اعزہ سے رخصت ہو کر آئے اور دربار میں بادشاہ کے سامنے جب پہونچے تو بادشاہ بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا ایک ہزار تنکہ پیش کش کی جوڑا پہنایا اور کہنے لگا کہ میں جاہل آدمی ہوں مگر مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہوں مجھے خوف تھا کہ کہیں بغاوت نہ ہو یہ لوگ شورش نہ کریں اس لئے میں نے جیسا بھی موقع ہوا اس کے لحاظ سے ان پر سختی کی اور مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ شریعت نے اجازت دی یا نہیں دی مجھے کیا معلوم میرا رب قیامت کے دن میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا اور میں تو اللہ سے مناجات کرتا ہوں کہتا ہوں کہ میرے پروردگار اگر کوئی شخص کسی کی بیوی سے زنا کرتا ہے تو میرے ملک میں کیا نقصان ہو جاتا ہے اگر شراب نوشی کرتا ہے تو مجھے کیا نقص[illegible]ن اگر چوری کرتا ہے تو میرے ترکہ میں کیا کمی ہوتی ہے اور امانت میں خیانت کرتا ہے تو میرا کیا میں تو ان سب کو شرع کے حکم کے بموجب سزا دیتا ہوں زمانۂ نبوت کے لوگ اب کہاں ہیں آدمی بہت بدل چکے ہیں

لاکھوں میں ایک بھی اللہ سے ڈرنے والا نہیں ملتا اسی لئے تم دیکھتے ہو کہ لوگ ان سزاؤں کے باوجود معصیتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور زنا، رشوت ستانی وغیرہ کی جرأت ہو جاتی ہے اور یہ تکلیفیں جھیلتے ہیں۔

مولانا شہاب الدین جامی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ بڑے صالح اور فاضل لوگوں میں تھے سلطان قطب الدین مبارک شاہ اور سلطان غیاث الدین تغلق ان کی قدر اور تعظیم کرتے تھے ان سے ملاقاتیں کرتے تھے اور ان کی برکت و تقدس کے قائل تھے۔ جب محمد شاہ بادشاہ ہوا تو اس نے چاہا کہ مولانا سے کام لے اس کی عادت یہ تھی کہ وہ علماء و مشائخ سے اس دلیل پر کام لیتا تھا کہ زمانۂ سلف میں اہل علم اور اہل دین ہی سے کام لیا جاتا تھا مگر مولانا شہاب الدین نے کام کا ذمہ لینے سے انکار کر دیا بادشاہ نے ان سے دربار عام میں خدمت قبول کرنے کو کہا مگر انھوں نے وہاں بھی انکار کر دیا بادشاہ اس پر برافروختہ ہوا اور مولانا ضیاء الدین سمنانی کو حکم دیا کہ ان کی داڑھی نوچ لیں انھوں نے اس سے انکار کر دیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ دونوں کی داڑھی نوچ لی جائے اس حکم پر ان دونوں کی ڈاڑھیاں نوچ لی گئیں بادشاہ نے مولانا ضیاء الدین کو صوبہ تلنگ کی طرف اخراج کا اور مولانا شہاب الدین کو دولت آباد کی طرف اخراج کا حکم دیا کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ مولانا ضیاء الدین سے خوش ہوا اور ان کو ورنگل کا جج بنا دیا مولانا شہاب الدین نے دولت آباد میں سات سال گذارے۔ پھر ان کو بادشاہ نے بلوایا اور ان کی تکریم کی اور عزت کے ساتھ ان کو دربار میں داخل کیا پھر انکو شہر کوتوال مقرر کر دیا اور برابر انکے اعزاز میں اضافہ کرتا رہا حتی کہ تمام حکماء و امراء کو حکم تھا کہ ان کو سلام کرنے آیا کریں پھر جب بادشاہ گنگا کے کنارے منتقل ہونے لگا اور وہاں اسنے ایک قصر تعمیر کرایا جس کا نام "سرگ دوارہ" رکھا اور لوگوں کو بھی اجازت عام ہوئی تو مولانا شہاب الدین نے دہلی میں قیام کرنے کی اجازت چاہی اور ان کو اجازت مل گئی تو وہ میوات چلے گئے اور وہاں انھوں نے ایک بڑا غار انتخاب کر کے وہاں مکانات حفاظت گاہیں ہوٹل حمام تیار کرائے دریائے جمنا سے پانی لائے اس زمین کو شاداب اور آباد کیا۔ وہاں انھوں نے بادشاہ کی

غیر موجودگی میں ڈھائی سال قیام کیا وہاں ملازمین خدام اور غلام دن میں خدمت کرتے اس زمین کی ترقی میں لگے رہتے رات کو غار بند کرکے سوتے کیونکہ وہاں ڈاکہ اور چوری کرنے والوں کا خطرہ رہتا تھا۔ جب بادشاہ واپس ہوا تو انھوں نے اس کا سات میل بڑھ کر استقبال کیا بادشاہ نے معانقہ کیا بڑی تعظیم سے پیش آیا پھر وہ اپنی جگہ پر لوٹ آئے بادشاہ نے ان کو کچھ عرصہ کے بعد بلوایا انھوں نے آنے سے انکار کر دیا بادشاہ نے مخلص الملک کو بھیجا انھوں نے بہت سمجھایا بادشاہ کے غصہ سے ڈرایا جس کے جواب میں مولانا نے کہا کہ میں کسی ظالم کی خدمت نہ کروں گا مخلص الملک واپس آئے اور بادشاہ کو واقعہ کی اطلاع دی بادشاہ نے حکم دیا کہ پکڑ لایا جائے وہ لائے گئے تو بادشاہ نے ان سے کہا کہ تم مجھے ظالم کہتے تھے مولانا نے کہا کہ ہاں میں کہتا تھا اور آپ نے فلاں فلاں موقع پر ظلم کیا۔ آپ نے دہلی کو اُجاڑا اس کے باشندوں کا وہاں سے اخراج کرایا۔ بادشاہ نے یہ سن کر تلوار نکالی اور قاضی کمال الدین کو یہ کہہ کر دی کہ اگر میں ظالم ثابت ہوں تو میری گردن مار دینا مولانا شہاب الدین نے کہا کہ یہ کون کرسکتا ہے کہ بادشاہ کی خواہش کے خلاف شہادت دے اور مارا جائے ہاں بادشاہ اپنے ظلم سے خود زیادہ واقف ہے۔ بادشاہ نے ان کو قید کا حکم دیا ان کے ہتکڑی اور بیڑی ڈال دی گئیں اور چودہ دن تک وہ اسی حال میں رہے نہ کچھ کھایا نہ پیا روزان کو دربار لایا جاتا اور سمجھایا جاتا کہ اپنے قول سے پھر جائیں اس کے جواب میں وہ کہتے کہ میں زمرہ شہدا میں داخل ہونا چاہتا ہوں چودھویں دن بادشاہ نے ان کے پاس کھانا بھیجا انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ میرا رزق زمین سے اُٹھ چکا ہے بادشاہ نے زبردستی کھلانے کا حکم دیا اور یہ کام کافروں کے سپرد تھا انھوں نے ان کو لٹا کر سمسی سے منھ کھولا اور زبردستی پانی کے ذریعہ سے ٹھونسا دوسرے دن دربار لائے گئے اور لوگوں نے سمجھانا شروع کیا اور ان کو اچھا برا بتایا اور ان سے کہا کہ اپنی ضد سے باز آجائیں مگر انھوں نے سب سے انکار کر دیا اس پر ان کو شہید کر دیا گیا ان کی شہادت سنہ ۷۴۱ھ میں ہوئی رحمہ اللہ تعالیٰ وغمدہ فی رحمتہ۔

علامہ فخر الدین زرادی

علامہ بڑے پائے کے اہل علم میں تھے بہت ہی آزاد ضمیر مخلوق سے بے خوف اللہ کی بات میں ملامت کی ذرا پرواہ نہ کرنے والے کسی سے ڈرتے نہ تھے کلمۂ حق سے بادشاہ کے سامنے بھی نہ رکتے حج و زیارت سے واپسی میں جہاز کے غرق ہونے سے شہید ہوئے۔ سیر الاولیاء میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے محمد شاہ تغلق نے ایک مرتبہ ان کو اس لئے بلا بھیجا کہ ان پر کچھ الزام رکھ کر اس بہانے کو ماخوذ کرے اس نے ان سے کہا کہ میں تاتاریوں سے جہاد کرنا چاہتا ہوں مسلمانوں کو اس پر تیار کرو مولانا نے کہا کہ انشاء اللہ تعالیٰ بادشاہ نے کہا کہ یہ کلمہ شک ہے مولانا نے کہا کہ نہیں یہ وہ کلمہ ہے جو ہر مستقبل پر کہنا چاہیئے بادشاہ یہ سن کر غصہ میں بے تاب ہو گیا اس نے کہا کہ مجھے مفید نصیحت کرو مولانا نے کہا غصہ ضبط کیجئے بادشاہ نے کہا کیسا غصہ مولانا نے کہا کہ یہ درندگی کا غصہ، بادشاہ کے آگ لگ گئی مگر اس نے غصہ دبایا اور ان کو ایک ریشمی تھیلی دینار سے بھری ہوئی پیشکش کی تاکہ نہ لینے پر ان کو ماخوذ کرے

ان کے شاگرد قطب الدین موجود تھے انھوں نے استاد کی طرف سے وہ پیشکش قبول کر لی تاکہ استاد دار و گیر سے بچ جائیں مولانا اس ترکیب سے محفوظ رہے۔

[یہ نظم ہمارے مخدوم و محترم دوست جناب سید عبدالرب صاحب صوفی (ایم اے) نے حج سے واپس آکر کہی تھی، اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں کو کبھی عزم حج کی توفیق دے خاص طور سے ان کے لئے یہ نظم انشاء اللہ بہت ہی مفید ہوگی، نیز جو حضرات حج کی نعمت سے سرفراز ہو چکے ہیں وہ بھی اس کی ذریعہ اپنے اندر حسرت کے جذبات پیدا کرکے انشاء اللہ بڑی دولتیں حاصل کرسکتے ہیں۔]

یہ حسرت رہ گئی پہلے سے حج کرنا نہ سیکھا تھا
کفن بر دوش جا پہونچا مگر مرنا نہ سیکھا تھا

نہ رہبر تھا نہ رہرو تھا نہ منزل آشنا تھا میں
محبت کا سمندر دل کی کشتی نا خدا تھا میں

ہوائیں تھیں تلاطم تھا سفینہ ڈگمگاتا تھا
بڑا گہرا سمندر تھا جدھر نظریں اُٹھاتا تھا

وہ موتی تہ نشیں تھے ہیں مسافر جن کا جویا تھا
کہاں موتی کہاں ہیں! خود سفینہ ہی ڈبویا تھا

اگر فضل الٰہی دستگیر اپنا نہ ہو جاتا
تو ایک ادنیٰ تھپیڑا موج عصیاں کا ڈبو جاتا

تسلسل واردات عشق کا کچھ بے خبر کیا تھی
جہاں ہو شرط یکسوئی یہ آوارہ نظر کیا تھی

یہ کیا معلوم تھا ان کی تجلی کیسی ہوتی ہے
خبر کیا تھی کہ دل کیسا تسلی کیسی ہوتی ہے

یہ کیا معلوم تھا کیا چیز خود لیلائے کعبہ ہے
خبر کیا تھی کہ کس رفعت کے اوپر پائے کعبہ ہے

اسے لے دے کے ابراہیمؑ کی تعمیر سمجھا تھا
جو خود ہی جان و قالب ہے اسے تصویر سمجھا تھا

زمیں سے عرش اعظم تک کبھی دیکھا نہ تھا میں نے
غضب ہے اپنا پرچم تک کبھی دیکھا نہ تھا میں نے

فقط اک نام سے معمور کے کچھ آشنائی تھی
یہ کیا معلوم تھا کعبہ اسی کی رونمائی تھی

سمجھتا تھا صدا لبیک کی، آواز ہے خالی
وہاں پہونچا تو حسرت تھی کہ اپنا ساز ہے خالی

کوئی نغمہ نہ تھا شایان محفل ساز ہستی میں
خدا کا نام بھی لینا نہ سیکھا خود پرستی میں

ہزاروں منزلیں آئیں گئیں میں رہ گیا سوتا
دل بیدار ہی لے کر نہ پہونچا تھا تو کیا ہوتا

زہے وہ آنکھ جو وا از پئے دیدار ہو جائے
زہے وہ دل وہاں جو مہبط انوار ہو جائے

صفا، مروہ، مقام سعی، زم زم، خیف، یہ سب تھا یہیں
میں ششدر تھا اڑاتے تھے یہ سب عرفان کی تانیں

دل ہر ذرہ سے تھی چھوٹ انوار الٰہی کی
مگر کچھ فکر میں نے کی نہ تھی دل کی سیاہی کی

خبر کیا تھی کہ کیا ہیں بو قبیس و طور کے جلوے
یہ کیا معلوم تھا ہوتے ہیں کیسے نور کے جلوے

یہ کیا معلوم تھا ان کی کرم فرمائیاں کیا ہیں
حرا کی خلوتیں یا ثور کی تنہائیاں کیا ہیں

میری چشم محبت خون حسرت اب بھی روتی ہے
خدا کاش یہ ہوتی کہ حج کیا چیز ہوتی ہے

وہ منزل قرب باری کی وہ رفعت کوہ رحمت کی
خبر کیا تھی کہ یہ سیڑھی ہے معراج محبت کی

گیا حج کر کے لوٹ آیا تو اب حسرت یہ ہی طاری
کہ پہلے سے نہ کی افسوس حج کرنے کی تیاری

حرم سطح زمین پر مرکز عشق و محبت ہے
جسے کہتے ہیں صحرائے عرب بحر حقیقت ہے

جسے کہتے ہیں حاجی غیرت صد قیس ہوتا ہے
پکڑ کر دامن لیلائے کعبہ خوب روتا ہے

نہ جانے سحر کیا کرتی ہے یہ کالی ردا والی
کہ لاکھوں قیس آکر چومتے ہیں عتبہ عالی

نہ سیریں ہیں نہ تفریحیں تجارت ہے نہ میلے ہیں
مگر اس دشت میں یہ جذب و مستی ہے یہ ریلے ہیں

اگر فولاد کے کانٹے بچھائے جائیں صحرا میں
بجائے موج زنجیریں اگر تن جائیں دریا میں

تو ابراہیمؑ نے جن خوش نصیبوں کو پکارا تھا
پکارا کیا! جنون عشق کا اک نقش ابھارا تھا

وہ مجنون محبت وہ سراپا عشق دیوانے
چلے آئیں گے کانٹے توڑنے زنجیر کھڑکانے

یہ دیوانے اگر پہلے سے کچھ ہشیار ہو جاتے
حرم میں بن کے محرم صاحب اسرار ہو جاتے

جسے کہتے ہیں بطحا منزل عشق الٰہی ہے
یہاں شاہی فقیری ہے فقیری رشک شاہی ہے

کفن پہنے پریشاں حال، وہ ژولیدہ مو راہی
چلا آتا ہے آنکھیں پونچھتا سرمست جانکاہی

یہ جانکاہی حقیقت میں حیات جاودانی ہے
وگرنہ گوشت + ہڈی + کھال = مٹی، خون پانی ہے

فضاؤں میں یہیں کی عشق کا پودا پھپکتا ہے
ہوا یہ کھا کے گلزار دل مومن لہکتا ہے

منور کر کے قندیل حرم سے اپنے سینے کو
چلا جاتا ہے ہنستا کھیلتا حاجی مدینے کو

ملائک راہ میں پیروں کے نیچے پر بچھاتے ہیں
نہ ہے عشاق جو محبوب کی گلیوں میں جاتے ہیں

یہ وہ دربار ہے روح الامین دربان ہیں جسکے
سمجھ میں کاش آجاتے یہ رتبے ان کی مجلس کے

ہزاروں بار تجھ پر اے مدینہ میں فدا ہوتا
جو بس چلتا تو مر کر بھی نہ میں تجھ سے جدا ہوتا

یہیں جاں دادگان عشق کی بزم حسینیاں ہے
احد کا دامن نہ ریں گلس ران شہیداں ہے

اگر کان شہادت کی طرف ہم کان دیتے ہیں
تو یہ معلوم ہوتا ہے صحابہؓ سانس لیتے ہیں

نبی کے نطق کی حامل مدینہ کی ہوائیں ہیں
یہاں گونجی ہوئی اب تک صحابہؓ کی صدائیں ہیں

فضا خاموش ہو جاتی ہے جب تاروں کی چھاؤں میں
تو ہنگام تہجد کی سکوت افزا فضاؤں میں

نبی کا نطق دل میں نور سینہ بن کے آتا ہے
صحابہؓ کا تکلم اک سکینہ بن کے آتا ہے

یہاں کا ذرہ ذرہ کھینچتا ہے دل کے دامن کو
کہ او طائر کہاں؟ اب چھوڑ کر اپنے نشیمن کو

کہیں ایسا نہ ہو مر کر کہیں برباد ہو جائیں
چلو طیبہ چلیں صوفی وہیں آباد ہو جائیں

اطلاقی تصوف

(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ دکن)

اور ایک الیافعی کیا المرشدی اور ابن تیمیہ دونوں کے معاصر جلیل علامہ شمس الدین الذہبی جو ابن تیمیہ کی طرف داری وحمایت میں کافی شہرت رکھتے ہیں اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، حضرات صوفیہ کے ساتھ بدگمانیوں میں ابن تیمیہ سے الذہبی کسی طرح پیچھے نہیں ہیں، لیکن حافظ ابن حجر نے درر کامنہ میں الذہبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ المرشدی کے متعلق ذہبی نے لکھا ہے کہ

کان یتکلم علے الخواطر وکان قلیل الدعوی، علی یرا لشطح حسن المعتقد۔ (ص۲۶۳)

وہ لوگوں کے قلبی خطرہ کو بتادیا کرتے تھے، دعوی بہت کم کرتے تھے، ان کے کلام میں شطح (بڑ) بھی نہیں پایا جاتا، وہ حسن المعتقد تھے یعنی انکے اعتقادات بھی اچھے تھے

کیا کسی فاسق وفاجر کے متعلق اس قسم کے الفاظ خصوصاً الذہبی کے قلم سے نکل سکتے ہیں؟ سب سے زیادہ ابن تیمیہ یا الذہبی جیسے بزرگوں کو صوفیوں سے اعتقادی خرابیوں ہی کی شکایت ہوتی ہے، لیکن جب ذہبی بھی "حسن المعتقد" اور خوش اعتقاد مسلمان المرشدی کو قرار دے رہے ہوں، تو میرے خیال میں یہ اُنکی اعتقادی صحت کی سب سے بڑی سند ہوسکتی ہے، صوفیہ اپنے "شطحیات" میں بھی بدنام ہیں، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس صوفیانہ داغ سے بھی ذہبی کہتے ہیں کہ المرشدی کا دامن پاک تھا خاص حالات میں بعض صوفیوں سے "انا الحق" یا "سبحانی ما اعظم شانی" الفاظ جو نکل گئے ہیں، ان ہی کا نام دعوی رکھا گیا ہے اور منجملہ مطاعن کے ایک طعن یہ بھی ہے جو اس گروہ پر علماء کی طرف سے عموماً کیا جاتا ہے، لیکن ذہبی گواہی دیتے ہیں کہ اس طعن کی بھی ان میں گنجائش نہ تھی۔

اور ایک الذہبی ہی کیا حافظ ابن حجر نے دوسری شہادتوں کی بنیاد پر المرشدی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

کان اسمر مبدنا ربعۃ حسن الشکل منورۃ الصورۃ جمیل الھیئۃ حسن الاخلاق کثیر التلاوۃ (ص۲۶۹)

وہ گندم گوں گداز بدن تھے میانہ قد، پاکیزہ صورت روشن چہرہ خوبصورت شکل اور اچھے اخلاق کا آدمی تھے اور کثرت سے قرآن کی تلاوت فرماتے رہتے تھے

گو ظاہری شکل وصورت سے باطنی کیفیات پر استدلال کلی حیثیت سے تو صحیح نہیں ہے لیکن پھر بھی ساحروں جادوگروں جناتی اعمال والوں کی عمومی حیثیت سے شکلاً وصورۃً ادباساً ووضعاً یہ ہیئت نہیں ہوتی، جسے المرشدی کی طرف حافظ ابن حجر نے منسوب کیا ہے اس قسم کی پاک وصاف ستھری دھلی دھلائی پرجمال زندگی عموماً تقویٰ وطہارت اور پارسائی وپاکبازی کی زندگی رکھنے والوں کی دیکھی گئی ہے اور حافظ نے صرف ظاہری حالات ہی کی تو رپورٹ نہیں کی ہے، بلکہ اسی کے بعد ان کے باطنی اوصاف واخلاق کو بھی سراہا ہے، سب سے زیادہ یاد رکھنے کی چیز یہ ہے کہ المرشدی کی طرف منجملہ دیگر صفات اور خصوصیتوں کے حافظ نے یہ بھی منسوب کیا ہے کہ وہ "کثیر التلاوۃ" تھے جسکا مطلب ظاہر ہے کہ بکثرت قرآن کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے میں پوچھتا ہوں کہ شیخ الاسلام جب خود فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والوں سے اس قسم کے جنات بھاگتے ہیں جن کے مخدوم ہونے کی تہمت انھوں نے المرشدی پر لگائی ہے تو بتایا جائے کہ تہمت اور سوءظن کے سوا شیخ الاسلام کے اس بے محابا فیصلہ کو میں اور کیا قرار دوں،

خود ان ہی نے لکھا ہے بلکہ تصریح کی ہے کہ جنوں کے اقرار سے یہ معلوم ہوا ہے کہ "ارباب ایمان واخلاص اور روشن ضمیر بزرگوں کے قلبی حالات سے آگاہی ووا قفیت ان کیلیے ناممکن ہے" ان کے الفاظ میں نقل کر چکا ہوں کہ

ویعترف انہ لا یکاشف ھؤلاء وامثالھم،	جن اقرار کرتے ہیں کہ اس قسم کے لوگوں کے اندرونی خیالات سے وہ آگاہی نہیں حاصل کر سکتے

پھر یہ باور کر لینا کہ لوگوں کے قلوب کے ضمائر وخواطر سے المرشدی جو واقف ہو جاتے تھے اور اسی بنیاد پر ہر مہمان کے آگے وہی کھانا ان کی طرف سے پیش ہوتا تھا جس کی اسے خواہش ہوتی تھی اس کے متعلق یہ دعویٰ کہ جناتی تائیدوں کو اس میں دخل تھا، بے بنیاد ہی نہیں بلکہ حد سے زیادہ سوءظن کے سوا اسے اور کیا قرار دیا جائے "مخدومیت" کا دعویٰ ابن تیمیہ المرشدی کے متعلق کرتے تھے، اس کا تذکرہ کرنے کے بعد الیافعی نے جو یہ لکھا ہے کہ یہ ابن تیمیہ کا صرف "ظن کاذب" ہے، اور ان کی طرف [illegible]
انھوں نے یہ وجہ جو پیش کی ہے

فان العباد ليس لهم اطلاع على بواطن العباد و ما يخطر فى بواطنهم نعوذ بالله من سوء الاعتقاد، (ص ۲۹۵)

کیونکہ اللہ کے خاص بندوں کے اندرونی کیفیات سے جن واقف نہیں ہو سکتے نہ ان سے اور نہ ان خطروں سے جو ان بزرگوں کے قلوب میں گذرتے ہیں، بدگمانی سے میں خدا ہی کی پناہ مانگتا ہوں۔

شائداس سے بھی ان کا مقصود وہی ہو جو فقیر نے عرض کیا۔

یہ واقعہ ہے کہ المرشدی میں ظاہری اعمال و افعال کے لحاظ سے کسی قسم کی کوئی کمزوری بھی اگر ہوتی تو اگر دوسرے نہیں مگر الذہبی اُسکے ذکر کئے بغیر قطعاً خاموشی کے ساتھ گذر نہیں سکتے تھے، صوفی ہونے کی وجہ سے طبعاً ان کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ تعریف کے الفاظ لکھیں، لیکن یقیناً کوئی چیز ان کو ایسی ملی ہی نہیں جسے حملہ کا ذریعہ وہ بنا سکتے ہوں، البتہ کرامات اور کشوف کی اس کثرت کو دیکھ کر چلتے ہوئے ایک فقرہ آخر میں لکھ گئے ہیں جو حافظ ابن حجر نے ان کے حوالہ سے درر کامنہ میں نقل کیا ہے۔

والذی یظهر لی انه کان مجذوبا ص ۴۶۳ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ المرشدی مجذوب تھے۔

مگر اسکی وجہ انھوں نے نہیں لکھی، بظاہر خیال گذرتا ہے کہ الذہبی کچھ المرشدی سے ڈرے ہوئے ہیں اور غالباً "مجذوب" قرار دینے کی وجہ ان کا غیر شعوری خوف ہی معلوم ہوتا ہے۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ جس جماعت سے ذہبی یا ابن تیمیہ کا تعلق ہے غالباً اُن کے یہاں مجذوب اور مجنون میں شائد کوئی فرق نہیں ہے یہ تو غریب صوفیوں کی تقسیم ہے مگر خدا ہی جانتا ہے کہ مجذوب مان لینے پر ذہبی کو کس چیز نے آمادہ کیا کسی ظریف کا خیال ہے کہ اس طرح دھن دولت کو مسلمانوں کے کھلانے پلانے میں پانی کی طرح بے دریغ لٹاتے رہنا، علماء رسوم کے نزدیک جنون ہی کی شکل ہو سکتی ہے لیکن خیر، یہ تو ظرافت کی بات ہے، اگر جذب کا یہی معیار ہو تو الذہبی کیا فرمائیں گے اس شخص کے متعلق جو صرف اللہ اور اسکے رسول کے سوا سب کچھ پیغمبر کے قدموں پر نثار کرنے کیلئے لے آیا تھا، خود اس پیغمبر ہی کا (صلوات اللہ علیہ وسلامہ) کیا حال تھا اُحد پہاڑ کے برابر سونے کے متعلق جو بار بار اعلان کرتا ہو کہ میرے قبضہ میں اگر آجائے تو تین دن سے زیادہ وہ میرے پاس باقی نہیں رہ سکتا۔ بلال کو حکم دیا جاتا ہے کہ

انفق یا بلال ولا تخش من ذی العرش بلال خرچ کئے چلے جاؤ اور عرش والے سے تنگی کا

اقتدار۔ اندیشہ نہ کرد۔

اسی پیغمبر کے ایک امتی کے قبضہ اقتدار میں جو کچھ آیا تھا، اگر وہ مسلمانوں پر سب کو لٹا رہا تھا تو اس کو جنون قرار دینے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں،

حافظ ابن تیمیہ نے تو خود لکھا ہے کہ اس قسم کے خوارق عادات دین کی صداقت کیلئے یا حجت کا کام دیتے ہیں یا مسلمانوں کی حاجت وضرورت ان سے پوری ہوتی ہے بجنسہ اُن کے الفاظ میں نقل کر چکا ہوں

پھر المرشدی سے اس باب میں جس قسم کے غیر معمولی کارنامے ظاہر ہو رہے تھے ان سے تو دونوں ہی نتائج پیدا ہو رہے تھے۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ قرآن کے اس قسم کے اعلانات عامہ مثلاً

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۔	اللہ سے جو ڈرتا رہتا ہے تو خدا اس کے لئے کشائش کی راہ پیدا فرماتا ہے اور ایسی جگہ سے اسے روزی پہونچاتا ہے جہاں سے سان گمان بھی نہ ہو۔

جن میں "غیر احتسابی رزق" کا وعدہ تقویٰ کی زندگی بسر کرنے والوں کے لئے کیا گیا ہو ظاہر ہے کہ اُنکی شکل دعوی کی ہے یقیناً اس دعوی کی دلیل اسی قسم کے واقعات بن سکتے ہیں، جن کا ظہور المرشدی جیسے متقی اور پرہیزگار بزرگوں کے ہاتھ پر وقتاً فوقتاً اسلام میں ہوتا رہا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ آمدنی کے اسباب کی ناواقفیت لوگوں کو اچنبھے میں ڈالتی ہے پوچھتے ہیں کہ آخر جب وہ کسی سے لیتے تھے اور نہ ان کی آمدنی کے ذرائع لوگوں کو معلوم تھے تو ان لوگوں کے پاس یہ چیزیں کہاں سے آتی تھیں میں عرض کرتا ہوں کہ اسباب جس رزق کے معلوم ہی ہو جائیں تو پھر وہ "لایحتسب رزق" ہی کیا باقی رہتا ہے۔

اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف قرون وادوار ممالک و امصار میں ایسی ہستیاں مسلمانوں میں جو پیدا ہوتی رہی ہیں[1] جن کے مصارف کا پیمانہ غیر معمولی طور پر وسیع تھا لیکن مداخل کی راہیں عموماً لوگوں کو

---

[1] عہد صحابہ میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت ابوہریرہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بھی مختلف صحابیوں سے ایسی صحیح روائتیں کتابوں میں پائی جاتی ہیں کہ غلہ یا اسی قسم کی چیزوں کا ایسا ذخیرہ جو چند دنوں سے زیادہ استعمال کے (ملاحظہ ہو صفحہ مابعد)

معلوم نہیں، غالباً اس قرآنی اعلان اور دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے ایسے ہوتا رہا اور جہاں تک میرا خیال ہے آئندہ بھی قرآن کے اس دعویٰ کا تجربہ ان لوگوں کو قدرت ہمیشہ کراتی رہے گی جو اس کا تجربہ کرنا چاہیں گے قدرت کی طرف سے تجربہ کا ارادہ جب فرمایا جائے گا۔

بہرحال المرشدی کی غیر معمولی مہمان نوازیوں سے ایک طرف جہاں "تقویٰ" کے اس قرآنی ثمرہ اور نتیجہ کا ثبوت فراہم ہو رہا تھا، وہیں ظاہر ہے کہ بیچارے عام مسافر مسلمانوں اور حجاج کی ایک ضرورت بھی اس ریگستانی ٹاپو میں پوری ہوتی تھی، پھر ان کے اس طرزِ عمل کو جذب قرار دینے کے آخر معنے کیا ہو سکتے ہیں۔

جذب میں کچھ بھی ہو، اتنی بات تو اس میں بہرحال ضروری ہے کہ "عقلی نظام" مجذوبوں کا عموماً عمومی نقطۂ اعتدال پر باقی نہیں رہتا، اسی لئے مجذوب بزرگوں کو جن کا جی چاہتا ہے مجنون بھی کہتے ہیں لیکن عقلی اختلال کی بھی آخر کچھ علامتیں ہوتی ہیں، ایک شخص جس کے متعلق دیکھنے والوں کا یہ بیان ہو کہ

"وہ بڑے خوبصورت میانہ قد آدمی تھے، ہئیت اور وضع ان کی جمیل تھی اخلاق بھی اُن کے اچھے تھے" صـ ۶۶۳ درر

یہ حافظ ابن حجر کے ان الفاظ کا ترجمہ ہے جنھیں کچھ دیر پہلے میں نقل کر چکا ہوں سوچنا چاہیے

بعد باقی نہیں رہ سکتا تھا، وہی ذخیرہ مدت ہائے مدید تک ان لوگوں کو کام آتا رہا حدیث و سیرت کی کتابوں میں یہ روائتیں موجود ہیں اور مسلمان عموماً ان سے واقف ہیں، پچھلے زمانہ میں بھی اور تو اور ہندستان ہی میں ایسے متعدد تماشے دیکھے گئے ہیں جنکی کوئی صحیح توجیہ دنیا اب تک نہیں کر سکی ہے حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کے سفرۂ عام کے عام قصوں کے سوا جلال الدین خلجی کے زمانہ کے مشہور بزرگ شیخ مولہ جن کے باورچی خانہ کا روزانہ خرچ بتایا گیا ہے کہ "ہزار من میدہ پانسو من گوشت تین سو من شکر" تھا اور ان کی یہی خصوصیت تھی کہ کسی سے کچھ نہ لیتے تھے، دیکھو میری کتاب تعلیم و تربیت صـ ۲۱۷ ج ۱۔ اور یہ تو خیر پرانے زمانے کی باتیں ہیں، چند سال ہی گذرے ہیں اسی ہندوستان میں حضرت مولانا عین القضاۃ حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤ میں بیٹھ کر اسی "لا یحتسب" رزق "کا" قدرت سالہا سال تک دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے ہزار ہا روپیہ ماہوار حضرت کی طرف سے امور خیر میں صرف ہوتے تھے لکھنؤ جیسے بڑے شہر کی ہر سال سات دفعہ دعوت آپ کی طرف سے ہوتی تھی جس میں کسی کی تخصیص نہ ہوتی اور کھانا بھی کیسا کا بلی دنبوں کا گوشت کشمیری چانول کی بریانی مزعفر گھی جس میں پانی کی طرح استعمال ہوتا تھا لیکن آخر وقت تک دنیا کو اس کا پتہ نہ چلا کہ اس متقی کے پاس رزق کا یہ دریا کس راستہ سے جاری ہے ۱۲

کہ مجنونوں یا مجذوبوں کی سی شکل ہی صورت یہی وضع و قطع ہوتی ہے۔

اور ایک یہی کیا جس کسی نے بھی المرشدی کے حالات بیان کئے تھے، کسی کے بیان میں اب تک مجھے ایسی کوئی چیز نہیں ملی ہے جس سے ان کے عقلی نظام کے معمولی اختلال کا بھی ثبوت ملتا ہو، بلکہ جس کسی نے ان کا جو حال بھی بیان کیا ہے سب ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے باوقار، بھاری بھرکم ہوش و تمکنت رکھنے والے آدمی تھے انتہا یہ ہے کہ علاوہ صوفیانہ زندگی کے انھوں نے اپنی عالمانہ زندگی کے اس شان کو بھی باقی رکھا تھا، حافظ ابن حجر ہی نے لکھا ہے کہ

کان یفتی بلفظہ لا بکتابہ ص۲۶۳　　　تحریری طور پر تو نہیں لیکن زبانی فتوے دیا کرتے تھے[1]

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان سے فقہی سوالات بھی کیا کرتے تھے اور ان سوالوں کا جواب بھی وہ دیدیتے تھے اگر کچھ بھی ان میں جذب یا مجذوبوں کی وارفتگی کا رنگ ہوتا تو جیسا کہ عام دستور ہی قطعاً مسلمان ان سے فتویٰ پوچھنے کی جرأت نہ کرتے اور نہ ہی فتویٰ جیسے اہم علمی و دینی کام کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے کیونکہ مجذوبوں کا گروہ اور جس معاملہ میں بھی مجذوب ہو، پر تجربہ شاہد کہ شریعت کے معاملات میں وہ بھی ہوشیار رہتے ہیں۔

بہر حال میں نے جہاں تک المرشدی کے حالات کا مختلف کتابوں میں مطالعہ کیا ہے، انہیں کوئی ایسی چیز مجھے نہیں ملی جس سے ذہبی کے نظریۂ مجذوبیت" کی تائید ہوتی ہو، جیسے ابن تیمیہ کے نظریۂ "مخدومیت" کا بھی کوئی ثبوت اس وقت تک نہیں ملا ہے، اور نہ ان کی زندگی میں کوئی ایسی بات ملتی ہے، جو کسی حیثیت سے بھی علماء رسوم کے نزدیک محل طعن و اعتراض ہو۔

صرف ایک ہیر کا اس سلسلہ میں حافظ ابن حجر نے تذکرہ کیا ہے میں ان ہی کے الفاظ میں اس کو نقل کر دیتا ہوں، ارقام فرماتے ہیں

وانکروا علیہ ان فی زاویتہ منبرا للخطیب فیصلی الناس　　　المرشدی پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کی خانقاہ میں خطیب کے لئے حالانکہ منبر بھی موجود ہے لوگ جمعہ اور جماعات کی

---

[1] یہ بات کہ تحریری فتویٰ نویسی سے المرشدی کیوں بچتے تھے یہ بھی ان کی غایت بیداری کا ثبوت ہے علماء کی ایک جماعت گذری ہے جو فقہی فتووں کے متعلق قائل تھی کہ قید کتابت میں لانا ان کا مناسب نہیں ہے کیونکہ عموماً یہ اجتہادی مسائل ہوتے ہیں، وقت پر جو بات سمجھ میں جس عالم کے اپنے معلومات کی روشنی میں آگئی اس نے بتادی، آئندہ کی ضرورتوں کو اس زمانہ کے علماء کیلئے چھوڑ دینا پسند کرتے تھے، میرے خیال میں یہ انتہائی احتیاط ہی کا اقتضا ہو سکتا ہے

الجمعة والجماعة ولا يصلى معهم۔ (ص۴۶۳)　　نمازیں وہاں پڑھتے تھے لیکن خود مرشدی لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تھے

بلاشبہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اعتراض کی گنجائش ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن سب سے پہلی بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ الجمعۃ والجماعۃ کے الفاظ جو حافظ نے لکھے ہیں، ان کا مطلب کیا ہے؟ آیا صرف جمعہ کی جماعت میں عدم شرکت مقصود ہے، تو اسکی یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ صوفی المشرب بزرگوں کا عام طریقہ چونکہ عمل بالاحوط تھا، اور معلوم ہے کہ ان کا گاؤں مرشد کھلان ایک معمولی قریہ تھا، اسلئے ہوسکتا ہے کہ حنفی مذہب کی رعایت کرکے شیخ جمعہ کی نماز گاؤں میں نہ پڑھتے ہوں، اور اس علاقہ کے عوام جو عموماً حنفی تھے اُن کو پڑھنے سے منع بھی نہ کرتے ہوں[1]

اور اگر جمعہ کی جماعت کی حد تک "جماعت" کا مذکورہ بالا لفظ محدود نہیں ہے بلکہ پنج وقتہ نمازوں کی جماعت میں بھی المرشدی شریک نہیں ہوتے تھے، یہی اس کا مطلب قرار دیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عام حالات کے لحاظ سے اعتراض کرنے والوں کو شرعاً اس اعتراض کا بجا حق حاصل ہے یہ مان بھی لیا جائے کہ نماز میں جماعت کی پابندی کا مطالبہ وجوب کی حد تک نہ بھی ہوتا ہو تو سنت موکدہ ہونے میں اس کے کون شک کرسکتا ہے ایسی ہستیاں جو دین میں قیادت اور نمائندگی کی حیثیت رکھتی ہیں اور عوام جن کے نمونوں سے متاثر ہوتے ہیں ان کے لئے موکدہ سنتوں کا ترک یقیناً اہمیت رکھتا ہے کم از کم اپنے ذاتی مذاق کی بنیاد پر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے مسائل اغماض اور چشم پوشی کے مستحق کسی حیثیت سے نہیں ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ایک دوسرا پہلو بھی ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن بزرگوں کی دینی زندگی کے عام پہلوؤں کو لوگوں نے بے داغ پایا ہو اور باوجود اس کے کسی ایسے شرعی مطالبہ کے متعلق جس کی حیثیت وہی ہو جو موکدہ سنتوں جیسی چیزوں کی ہے اگر ان کے متعلق کسی قسم کی کوتاہی پائی جاتی ہو، تو اس وقت یہ سوچنے کی بات ہے کہ شریعت کے سارے اہم مطالبات کی جو تکمیل کررہا ہے وہ ایک

---

[1] گو اس کا ثبوت تو مجھے نہیں ملا ہے لیکن جس قسم کی اقتداری قوت المرشدی میں معلوم ہوتی ہے اسکو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ چنداں بعید نہیں ہے کہ سلیمانی طریقہ پر وہ جمعہ کے دن قریب کے کسی شہر میں جمعہ کی نماز ادا کرلیتے ہوں، سلیمانی طریقہ سے میرا اشارہ تسخیر ریح وغیرہ ذرائع پر ہے آپ ابن تیمیہ کے حوالہ سے سن چکے ہیں کہ گذشتہ پیغمبروں کے معجزات امت محمدیہ کے اولیا کے ساتھ بشکل کرامات پیش آتے ہیں مثلاً ابراہیمی معجزہ آگ کے برد و سلام ہونے کا اگر ابو مسلم خولانی کے ساتھ بشکل کرامت پیش آسکتا ہے تو کسی محمدی کے ساتھ سلیمانی واقعہ کے پیش آنے پر تعجب کیوں کیا جائے۔

خاص مسئلہ میں عمداً بغیر کسی وجہ کے لاپروائی سے کام لے کر اپنے آپ کو شریعت کی نظروں میں بھی اور علم مخلوق کی نظروں میں بھی مطعون و ملام بننے کا موقع کیوں دے گا مطلب یہ ہے کہ عذر اگر معلوم ہو، تو اس وقت جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ شریعت کے ان مطالبات کی شدت میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے، جن کی حیثیت فرائض و واجبات کی ہوتی ہے، پھر ایسی صورت میں یہ کیوں نہ خیال کیا جائے کہ یہاں بھی کسی عذر ہی کی وجہ سے ممکن ہے کہ ترک سنت کی یہ کوتاہی ہوتی ہو، آخر میں پوچھتا ہوں کہ مرشدی بیچارے تو پچھلے زمانہ کے آدمی ہیں، اقرون مشہود لہا بالخیر کی مسلم الثبوت ہستی امام دار الہجرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے متعلق کیا یہ چھپی ڈھکی بات ہے کیا الذہبی یا شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس سے واقف نہ تھے، کہ آخر عمر میں حضرت امام مالک :۔

لم یکن یشھد الصلوات فی المسجد ولا الجمعۃ - الدیباج المذھب ص۲۲	مسجد میں نمازوں کے لئے حاضر نہیں ہوتے تھے اور نہ جمعہ کی نمازیں حاضر ہوتے تھے،

اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ

وکان ربما قیل لہ فی ذلک فیقول لیس کل الناس یقدر ان یتکلم بعذرہ، ص۲۲	بسا اوقات اس مسئلہ میں لوگوں نے ان سے کہا بھی مگر جواب میں آپ نے فرمایا کہ ہر شخص اسکی قدرت نہیں رکھتا کہ اپنے عذر کو وہ بیان کرے

جس کے معنی یہی ہوئے کہ "جمعہ و جماعات" کے اس ترک کی وجہ بھی لوگوں کو معلوم نہ تھی اور باوجود دریافت کرنے کے حضرت نے اپنے اس عذر کو بیان بھی نہیں فرمایا، پھر جب ان قرون کے مسلمانوں نے جیسا کہ لکھا ہے

واحتمل الناس لہ ذلک حتی مات علیہ	لوگوں نے امام مالک کے اس طرز عمل کو برداشت کیا حتی کہ اسی حال میں حضرت امام کا انتقال ہوا

اور اس کے بعد بھی اس وقت تک حضرت امام مالک کے اس خاص طرز عمل کے متعلق لوگوں نے سکوت ہی کو اول خیال کیا محض اس کو ذریعہ بنا کر میں نہیں جانتا کہ ان کی امامت اور جلالت قدر پر کسی نے نکتہ چینی کی ہو بلکہ یہی سمجھا گیا کہ خدا اور اس کے بندے کے درمیان یہ کوئی خاص معاملہ تھا، وجہ اس کی وہی تھی کہ امام مالک کی دینی زندگی اپنے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے جتنی پاک و

صاف بھی ان کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی اس کا خیال بھی نہیں کر سکتا تھا اور نہ اب کر سکتا ہے کہ العیاذ باللہ ان کا یہ فعل شریعت سے بغاوت یا سرکشی پر مبنی تھا، اور نہ ان کے متعلق کبھی سوچا جا سکتا ہے کہ شرعی مطالبات کی ان کی نظر میں اہمیت و وقعت نہ تھی، بہر حال بقول شخصے المرشدی کی طرف اگر یہ انتساب صحیح بھی ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ

لیس هذا اول قارورة انکسرت فی الاسلام۔		یہ پہلا شیشہ نہ تھا جو اسلام میں ٹوٹا ہو۔

منزلت و مرتبہ میں ان سے بھی بلند ترین ہستی کی طرف تاریخ جب ٹھیک اسی واقعہ کو منسوب کر چکی ہے تو جو توجیہ حضرت امام مالک کی طرف سے پیش کر کے لوگ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں المرشدی کو بھی سکوت اور خاموشی کے حق سے محروم کرنے کی معقول وجہ خود ہی غور کرنا چاہئے کہ کیا ہو سکتی ہے۔

اور یہ سب تو جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں یہ مان کر کے عرض کر رہا ہوں کہ منسوب کرنے والوں نے المرشدی کی طرف ترک جمعہ و جماعات کو جو منسوب کیا ہے اسکو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے، حالانکہ سچ پوچھئے تو بجائے خود اس انتساب میں گفتگو کی کافی گنجائش ہے بلکہ میرے نزدیک تو یہ بھی کچھ اڑائی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حافظ ابن حجر جنھوں نے الزام لگانے والوں کے اس الزام کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، اپنی اسی کتاب درر کامنہ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ

وکان کل من انکر علیہ حالہ		یہ واقعہ ہے کہ ہر وہ شخص جسے مرشدی کے حال (طرز عمل)
اذا اجتمع بہ زال عنہ		پر اعتراض ہوتا جب ان سے اسکی ملاقات ہو جاتی تو اس
ذالک۔ (ص ۲۶۲)		اعتراض کا [illegible] دل سے ازالہ ہو جاتا تھا۔

حافظ کی کلی تعبیر اس باب میں خاص توجہ کی مستحق ہے۔ آخر ان کی اس کلی شہادت کی بنیاد پر اگر یہ سمجھا جائے کہ ترک جمعہ و جماعات کا اعتراض بھی ان ہی الزاموں میں شریک ہے جن کا المرشدی سے ملنے کے بعد ازالہ ہو گیا تو جو ان کے الفاظ ہیں یقیناً ان میں اس کی کافی گنجائش موجود ہے،

بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی مشہور ہستیوں کے متعلق جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ جہاں ان کی تعریف و ستائش کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے وہیں ہر زمانہ میں کچھ ایسے سر پھرے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو ان تعریفی چرچوں کو برداشت نہیں کر سکتے، اور عام خیال سے ہٹ کر اپنی بدگمانیاں مختلف قسم کے لطیفے تراش کر دنیا میں پھیلاتے رہتے ہیں، شاید المرشدی

کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی صورت پیش آئی، بغیر کسی تحقیق کے پھیلانے والے ان کے متعلق اپنے خود تراشیدہ الزاموں کو عوام میں پھیلا دیا کرتے ہوں گے، لیکن ان سے ملنے کے بعد لوگوں پر اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہو گی اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے مسلمانوں ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ عام انسانی تاریخ میں شائد ہی کوئی بڑا آدمی اس قسم کی چہ میگوئیوں کے شکار ہونے سے محفوظ رہا ہو۔

دوسرے الزامات اور اتہامات جو المرشدی پر لگائے گئے تھے ان کا تو مجھے علم نہیں ہے کیونکہ صراحۃً انکا کسی نے ذکر نہیں کیا لیکن "ترک جمعہ و جماعات" کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں اگر کچھ بھی حقیقت کا شائبہ ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ شمس الدین الذہبی جیسے بزرگ کا قلم اسکے ذکر کئے بغیر آگے بڑھ جاتا لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، ذہبی نے اپنی کسی کتاب میں اسکی طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے، اور نہ اسی کا پتہ چل سکا کہ ابن تیمیہ کی کسی کتاب میں اس کا تذکرہ پایا جاتا ہے، حالانکہ "مجذوبیت" ہو یا "مجذوبیت" ان دونوں دعووں کے اثبات میں ظاہر ہے کہ ان حضرات کو اس واقعہ سے کافی مدد مل سکتی تھی،

"ملنے کے بعد سارے اعتراضات اور شکایتیں جو المرشدی سے لوگوں میں پائی جاتی تھیں انکا ازالہ ہو جاتا تھا" حافظ ابن حجر نے علاوہ اس "کلی دعوی" کے چند جزئی مثالیں بھی دی ہیں اور کیسی مثالیں؟

المرشدی اور علامہ ابن سید الناس علامہ ابن سید الناس سے عوام ممکن ہے کہ واقف نہ ہوں، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ علم و فضل کے ساتھ ساتھ تقویٰ و دیانت میں انکا پایہ کتنا بلند ہے، حافظ ابن حجر نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے

صدوق فی الحدیث وحجۃ فیما ینقلہ۔ — حدیث کی روایت میں وہ سچے ہیں اور جو بات بھی نقل کرتے ہیں اسکے متعلق وہ حجت ہیں یعنی ان پر اعتماد کیا جاتا ہے

(درر کامنہ ص۲۰۹ ج ۴)

اور البرزالی کے حوالہ سے حافظ ہی نے نقل کیا ہے

کان احد الاعیان معرفۃ و اتقانا وحفظا للحدیث وتفهما فی عللہ واسانیدہ — چند ممتاز شخصیتوں میں ان کا شمار تھا، یعنی حدیث کے علم میں اس کے متعلق ضبط و احتیاط میں اور اس کے حفظ اور یاد رکھنے میں، حدیثوں کی علتوں کے پہچاننے میں

عالما بصحيحه وسقيمه۔ — اور ان کی سندوں کے پرکھنے میں وہ سربرآوردہ لوگوں میں گنے جاتے تھے وہ خوب جانتے تھے کہ صحیح حدیثیں کون سی ہیں اور قابل جرح کون سی۔

اسی سے ان کی جلالت قدر کا اندازہ کیجئے کہ شیخ تقی الدین بن دقیق العید جن کے ابن سید الناس چہیتے شاگرد ہیں لکھا ہے کہ طالب العلمی کے زمانہ ہی میں شیخ ابن دقیق العید ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ درس حدیث میں کسی صحابی، یا سند کے کسی راوی کے حالات کے پیش کرنے کی ضرورت ابن دقیق العید کو اگر پیش آتی، تو ابن سید الناس کو خطاب کر کے فرماتے،

ايش ترجمة هذا يا ابا الفتح، — ابو الفتح اس شخص کے حالات کیا ہیں بیان کرو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو رجال کی کتابیں گویا زبانی یاد تھیں، شیخ سے اشارہ پانے کے ساتھ ہی

فياخذ في الكلام ويسرد وا الناس سكوت والشيخ مصيغ الى مايقول۔ (ص۲۱) — وہ جواب میں گفتگو شروع کر دیتے اور کہتے چلے جاتے لوگوں پر خاموشی طاری رہتی اور شیخ (ابن دقیق العید) ہمہ تن گوش بن کر جو کچھ وہ کہتے جاتے اسے سنتے رہتے۔

بہر حال ابن سید الناس کی بلند شخصیت اور ان کی مذکورہ بالا خصوصیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اب حافظ ابن حجر کی اس شہادت کو سنئے یعنی ملنے کے بعد جن لوگوں کے دل سے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوا، ان کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں

منهم ابن سيد الناس ص۲۶۳ ج ۳ — ان لوگوں میں ابن سید الناس بھی ہیں

ظاہر ہے کہ یہ کسی عامی آدمی کی حالت نہیں ہے بلکہ تنقید رجال میں جس کی نظر محدثین کے نزدیک مسلم تھی یہ اس کا حال ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ملاقات کے بعد صرف ابن سید الناس کی طرف سے یہ اعلان کہ المرشدی کی طرف جو باتیں منسوب کی جاتی ہیں، غلط ہیں، شیخ مرشدی کے تزکیہ اور توثیق کیلئے نہ صرف کافی ہے بلکہ سند کی حیثیت ان کے اس اعلان کو اگر دی جائے تو ابن سید الناس کا علم و تحقیق میں جو مقام ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہ یہ غلو ہوگا اور نہ مبالغہ۔

المرشدی اور الامیر محمد بن جنکلی بن یابا کی شہادت حافظ ابن حجر نے اسی سلسلہ میں دوسرا نام جو لیا ہے وہ تو اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے، مصر کے سلاطین کا وہ سلسلہ جو "ممالیک" کے نام سے موسوم

ہے، ان ہی سلاطین کے امراء میں ایک عجیب و غریب شخصیت تھی، نام بھی ان کا کچھ عجیب سا تھا، حافظ ابن حجر نے "جنکلی" لکھا ہے، واللہ اعلم یہی اس کا واقعی تلفظ بھی تھا، یا اصل نام کی یہ معرب شکل ہو کچھ بھی ہو حافظ ہی کا بیان ہے کہ نسباً یہ حضرت ابراہیم بن ادہم سے تعلق رکھتے تھے، پورا نام ان کا یہ ہے جنکلی بن محمد الیا یا ابن جنکلی بن خلیل بن عبداللہ العجلی، بدرالدین ان کا لقب تھا، ابتداءً تاتاری بادشاہ غازان خاں جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کی طرف سے آمد کے متصلہ علاقہ "راس عین" کے گورنر تھے، غازان خاں کی وفات کے بعد مصری حکومت کی دعوت پر یہ شام ہوتے ہوئے مصر پہنچے، اور وہاں کے طبقہ امراء میں شریک ہو گئے، مصر کے متعدد ممالیک سلاطین کا زمانہ انھوں نے پایا تھا حافظ نے لکھا ہے کہ سلطان صالح اسماعیل کے زمانہ میں توان کا اقتدار و اعزاز اس حد کو پہونچ گیا تھا کہ بادشاہ کی طرف سے ان کو "الوالدی الامامی" کا خطاب ان کے موسومہ فرامین میں لکھا جاتا تھا[1]

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے، کہ منجملہ دوسری خصوصیتوں کے حافظ ابن حجر نے ان کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ

یمیل الی ابن تیمیہ ویتعصب لہ	ابن تیمیہ کی طرف امیر جنکلی کو خاص میلان تھا، بلکہ ان کی
ویرد علیٰ من یرد علیہ	طرف سے وہ متعصبانہ جانبداری سے کام لیتے تھے ابن تیمیہ
(ص ۵۳۹ ج ۱)	پر جو اعتراض کرتا تھا اس کا جواب دیتے تھے،

جس کے معنی یہی ہوئے کہ امیر "جنکلی" ابن تیمیہ کے خاص معتقدوں میں تھے، اب سنئے ان ہی امیر جنکلی کے صاحبزادے جن کا نام محمد بن جنکلی بن محمد بن بابا تھا علاوہ امارت کے انھوں نے علم بھی حاصل کیا، اور امیر "جنکلی" کے غالباً اسی میلان کی وجہ سے جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرف ان کو تھا، امیر محمد بن جنکلی نے اپنے آبائی مسلک حنفی کو چھوڑ کر حنبلی مذہب اختیار کر لیا تھا حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ

---

[1] حافظ ابن حجر نے اسی سلسلہ میں اس لطیفہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ "شاہی موکب" میں نقیب جنکلی کے آگے آگے یہ پکارتا جاتا تھا کہ یا آتا بک۔ سبحان من اتی بک۔ یعنی اے شاہی اتالیق پاک ہے وہ خدا جو آپ کو مصر لایا۔ اسی کتاب میں ہے کہ حکومت مصر کی طرف سے بڑی جاگیریں ملی تھیں اسی سے ان کی دولت کی فراوانی کا اندازہ کیجئے کہ علاوہ زکوۃ کے انکی طرف سے آٹھ ہزار اردب گیہوں اور چار ہزار درہم نقرہ غرباء میں بطور خیرات کے ہر سال تقسیم ہوتے تھے بالاتفاق مورخین کا بیان ہے کہ دنیا اور دین دونوں کی عقل اس شخص کو غیر معمولی طور پر عطا ہوئی تھی اس زمانہ کے امراء کے عام عیوب سے ان کا دامن پاک تھا، ایک بیوی کے سوا دوسری عورت ان کے پاس نہ تھی، وفات ان کی سنہ ۷۴۶ھ ص ۵۴۰

تفقه للحنفية ثم تحول حنبليا۔ (ص۲۱۶ ج ۳) گو انھوں نے تعلیم تو فقہ حنفی کی پائی تھی، لیکن حنفی مذہب کو ترک کر کے حنبلی مذہب اختیار کر لیا تھا،

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ابن تیمیہ کی عقیدت میں وہ اپنے والد سے بھی آگے بڑھ گئے تھے، کیونکہ جہاں تک میں جانتا ہوں "امیر جنکلی نے حنفی مسلک ترک نہیں کیا تھا اگرچہ شیخ الاسلام سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے

بہر حال امیر محمد بن جنکلی کی ان تمام خصوصیتوں کو پیش نظر رکھئے اور اسی کے ساتھ حافظ وغیرہ کی اس علمی توثیق کو بھی کہ

تخرج فی معرفة اسماء الرجال و مذاهب السلف۔ (ص۲۱۷) اسماء الرجال اور سلف کے مذاہب کے جاننے میں انھوں نے امتیاز حاصل کیا تھا۔

اور اس کے بعد ملاحظہ فرمائیے حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ المرشدی سے مل کر جن لوگوں کے قلوب میں ان کی جانب سے کسی قسم کی شکایت باقی نہ رہی ان میں ابن سید الناس کے بعد دوسرے آدمی یہی امیر محمد بن جنکلی بن الیابا بھی ہیں، اگر امیر محمد کی اس شہادت کو حافظ ابن تیمیہ کے ایک غالی معتقد کی شہادت قرار دی جائے تو اس کے انکار کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور یہ شہادتیں ان ہی دونوں حضرات تک محدود نہیں ہیں، حافظ ابن حجر نے یہ لکھ کر منهم ابن سید الناس و ابن جنکلی بن الیابا "کے بعد" وغیرہما" کا بھی اضافہ کیا ہے، جس کے معنی یہی ہوئے کہ ان دونوں ثقات علماء ناقدین کے سوا اوروں کو بھی اس کا تجربہ ہوا تھا کہ المرشدی کی طرف جو قابل اعتراض باتیں منسوب کی جاتی تھیں، وہ بے بنیاد اور غلط تھیں، جب شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا ایک خاندانی معتقد بھی یہی شہادت ادا کرتا ہو تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ جمعہ اور جماعات کے ترک کا جو الزام ان کی طرف منسوب کرنے والے اب تک منسوب کر رہے ہیں اس انتساب کا حق ان کو کس حد تک باقی رہتا ہے۔

بہر حال بات زیادہ پھیل گئی ورنہ میرا مقصود تو صرف یہ تھا کہ المرشدی کی طرف حافظ ابن تیمیہ نے اپنے نظریۂ "مخدومیت" کو جو منسوب کرنے کا ادعا فرمایا ہے، یا اُن سے ذرا نیچے اتر کر الذہبی نے بجائے مخدومیت کے "مجذوبیت" سے ان کی زندگی کے واقعات کی توجیہ کرنی چاہی ہے میرے نزدیک یہ دونوں دعوے دعووں سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتے، واقعات آپ کے سامنے پیش کر دئے

گئے، ہر انصاف پسند آدمی ان کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔

اور واقعہ تو یہ ہے کہ، تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ المرشدی کی شاہی مہمان نوازیاں جیسا کہ ابن تیمیہ کا ادعا ہے مخدومیت ہی کی راہیں منت تھیں، یعنی تسلیم بھی کر دیا جائے کہ "جنات" ان کے تابع تھے اور وہی اس غیر معمولی ضیافت کے سارے کاروبار کو انجام دیتے تھے اور لوگوں کے ضمائر و خواطر کا علم بھی ان کو ان ہی جنیوں کے ذریعہ سے ہو جاتا تھا تو ابن تیمیہ جب خود فرماتے ہیں کہ

والجن اذا اخذموا الرجل الصالح فی بعض اغراضه المباحة فاما ان یکونوا مخلصین یطلبون الاجر من الله ولا یطلبونه منه اما دعاءه لهم واما نفعه لهم بجاهه او غیر ذلک۔

(کتاب النبوات صـ۲۶۶)

اور جنیوں کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کسی مرد صالح کی جب وہ خدمت کرتے ہیں، یعنی ایسے اغراض و مقاصد جو شرعاً جائز ہیں، ان میں اس صالح آدمی کی جنی جب مدد کرتا ہے تو کبھی وہ اس امداد میں مخلص ہوتا ہے یعنی صرف اللہ سے ثواب و اجر کی توقع قائم کر کے ان کی مدد کرتا ہے یا اس بزرگ آدمی کی دعا کا طالب ہوتا ہے یا ان کے جاہ سے نفع اٹھانا چاہتا ہے یا اسی قسم کے اغراض جنی کے سامنے ہوتے ہیں

اس کے بعد میری سمجھ میں نہیں آتا کہ "مخدومیت" قرار دے کر ارباب صلاح و تقویٰ کی جماعت سے المرشدی کو جو ابن تیمیہ خارج کرنا چاہتے ہیں اس کی بنیاد کیا باقی رہتی ہے،

اور ابن تیمیہ لکھتے، یا نہ لکھتے ولی تو ولی قرآن میں تو "نبی" تک کے متعلق یہ خبر دی گئی ہے کہ "جن" ان کے خادم تھے اور طرح طرح کے خدمات انجام دیتے تھے آخر سلیمان علیہ السلام کے قرآنی قصہ سے کون ناواقف ہے، پس جنوں کی مخدومیت جب نبوت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے تو ولایت کے ساتھ کیوں جمع نہیں ہو سکتی۔

ملہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے امام غزالی کی بعض کتابوں میں شکایت کی ہے کہ فلسفہ کے جال سے نکل بھاگنے کی گو اس شخص نے پوری کوشش کی لیکن فلسفہ کی آنتوں میں پھر بھی ٹانگیں الجھ کر رہ گئیں، شیخ الاسلام بڑے آدمی ہیں ان کی علمی دینی عظمت کا خیال سامنے آجاتا ہے ورنہ میرا احساس تو یہ ہے کہ کچھ یہی کیفیت مجھے خود شیخ الاسلام ہی کی معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ ان کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے فلسفہ کا کافی مطالعہ انھوں نے کیا ہے، بظاہر اسی مطالعہ نے

(ملاحظہ ہو صفحہ مابعد)

اور یہی حال مجذوبیت کا بھی ہے بلکہ مجذوبیت "تو ولائت ہی کی راہوں میں ایک عام اور مسلمہ راہ ہے [1]

المرشدی اور ان کے خصوصی حالات کے متعلق علماء رسوم کی طرف سے جو نکتہ چینیاں یا تنقید اُس زمانہ میں کی گئی، یہ تو ان کی داستان تھی یہ ممکن تھا کہ اس داستان کو چند لفظوں میں ادا کرکے میں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر شعوری طور پر ان کے دماغ کو علت و معلول کے قانون کی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑ دیا تھا کہ ان کے لئے یہ ناقابل برداشت تصور تھا کر پکانے والے دیکھے جاتے تھے نہ پکنے والی چیزیں نظر آتی تھیں لیکن ہر وقت پکا پکایا کھانا جتنے مہمان بھی مرشدی کے پاس آتے تھے ان کی خواہش کے مطابق پیش کر دیا جاتا تھا اب ایک طرف ان کا تدین جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اسنے ان میں جنوں کے ملنے کی گنجائش پیدا کر دی تھی اور تفلسف علت و معلول کے قانون کو تلاش کرتا تھا دونوں ہی کی باہمی ترکیب سے مخدومیت کا نظریہ ان میں شائد پیدا ہو گیا تھا اس سے تسکین مسلسل کر لینے ہوں گے کہ ان دیکھے طور پر جن کہیں سے کھانے پکا کر مرشدی تک پہونچا دیا کرتے تھے حالانکہ ایسا ایمان جو فلسفہ کی آمیزش سے قطعاً پاک ہو، اسکے لئے لا یحتسب رزق" کی صورت ہی یہ ہونی چاہئے کہ بجائے اسباب کے خود مسبب الاسباب کے امر و حکم سے اُسکی توجیہ کرے، آخر چار چار سو یا پانسو کھانے والوں کے لئے بسا اوقات تین چار آدمی کے کھانے کو کافی ہوتے ہوئے متعدد بار عہد نبوت میں جو پایا گیا تو کیا شیخ الاسلام مسبب الاسباب کے سوا کسی دوسرے سبب کو ثابت فرما سکتے ہیں؟ اور حضرت سے کہاں ملنے کی کیا توجیہ فرما سکیں؟ —

---

[1] خاکسار نے آج سے تقریباً تیس سال پہلے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح عمری میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مسلمانوں میں "مجاذیب و بہالیل" فقراء کا ایک سلسلہ جو پایا جاتا ہے، عہد صحابہ میں اس طبقہ کے خصوصی آثار کا بہت بڑا حصہ حضرت ابوذر صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتا ہے، واقعات کی روشنی میں اپنے اس دعویٰ کو خاکسار نے پیش کرنے کی جرأت کی تھی، خدا کا شکر ہے کہ اتفاقاً اس مضمون پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی التھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کی جب نظر پڑی تو گو فقیر کی شخصیت سے اس وقت تک اگرچہ ناواقف تھے کیونکہ میری طالب علمی کا زمانہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا تھا، تاہم آپ نے اپنے ایک خاص گرامی نامہ سے فقیر کو سرفراز فرماتے ہوئے خیال کی تائید فرمائی ۔ بلکہ اسی مکتوب گرامی میں یہ بھی ارقام فرمایا گیا تھا کہ مقالہ نگار سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں لیکن اس مضمون کو دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ محقق نہیں ہو چکے ہیں تو "محققیت متوقعہ" کی دلیل ان کا یہ مضمون ضرور ہے۔ یہ حضرت والا کی ذرہ نوازی تھی ورنہ اس وقت بھی "چار پائے بر وکتا بے چند" کا جو حال تھا اسی حال میں اس وقت تک گزر رہا ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ ۱۱

آگے نکل جاتا جیسا کہ الیافعی اور حافظ ابن حجر نے بھی کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ صوفیاء کے متعلق طویل تاریخی آویزشوں کی گرہوں کے کھولنے اور کھولنے میں اس جزئی داستان سے جاننے والے اگر چاہیں گے تو بہت کچھ مدد حاصل کر سکتے ہیں، اسی لئے بجائے اختصار کے میں نے قصداً طوالت کی راہ اختیار کی، وانما الاعمال بالنیات ولکل امرء ما نوی۔

اور اب میں چاہتا ہوں کہ المرشدی کی خاص روش پر علماء رسوم ہی کی طرف سے نہیں بلکہ جس گروہ سے ان کا تعلق تھا، یعنی خود "صوفیوں" کی جانب سے اس زمانے میں جو بعض تنقیدیں کی گئی تھیں ان کا ذکر کروں، سچ پوچھئے تو ان ہی صوفیانہ تنقیدوں کا تذکرہ یہاں اصل مقصود ہے اسی سے اندازہ ہوگا کہ "تصوف" اور "صوفیاء" میں بھی علاوہ جزئی اختلافات کے نقطۂ نظر کا ایک ایسا اصولی اختلاف بھی ہے جس نے میرے نزدیک صوفیہ کی روش اور طریقہ عمل کو دو مستقل حصوں میں بانٹ دیا ہے اسی تقسیم سے جو دو راہیں تصوف میں پیدا ہو گئی ہیں ان ہی میں سے ایک راہ کی تعبیر خاکسار نے "اطلاقی تصوف" سے کی ہے

المرشدی کے متعلق ان صوفیانہ تنقیدوں کا تذکرہ الیافعی نے مراۃ الجنان میں کیا ہے، پہلی تنقید تو انھوں نے اپنے استاد ارشیخ حسین الحاکی کے حوالہ سے بایں الفاظ نقل کی ہے

لوکنت یظھر علیٰ یدی مثل ھذا الذی یظھر علیٰ یدیه لدخلت فی سرب تحت الارض ص۲۹۵ ج ۳ مراۃ	المرشدی کے ہاتھ پر جو باتیں ظاہر ہو رہی ہیں اگر میرے ہاتھ پر یہی باتیں ظاہر ہونے لگیں تو میں زمین کے اندر کسی تہ خانہ میں جا کر چھپ جاتا۔

قریب قریب اسی کے شیخ الھادی المغربی سے بھی انھوں نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ

لاشك انه حصل له نصیب من احوال الفقراء الا ان الفقراء لایرضون بشھرۃ ھذہ الکرامات التی تظھر منه ص مراۃ	اس میں مجھے شک نہیں ہے کہ المرشدی کو فقراء کے بعض حالات سے حصہ ضرور ملا تھا لیکن فقراء اس طریقہ اپنی کرامتوں کے اظہار کو پسند نہیں کرتے جیسے اس شخص سے ظاہر ہو رہی ہیں۔

مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خوارق عادات جن کا ظہور ہر کس و ناکس کے سامنے المرشدی کے ہاتھوں پر ہو رہا تھا جو گویا کرامات کے افشاء و اعلان کی ایک شکل تھی، ان کے اس طریقہ عمل کو صوفیانہ اخلاص کے مناسب نہیں خیال کیا جاتا تھا،

مگر ظاہر ہے کہ یہ بالکلیہ اپنے مذاق کی بات ہے، فطرۃً بعض بزرگوں میں ستر و خاموشی، اخفاء کا جذبہ غالب ہوتا ہے احدیثوں میں اللہ کے ان ہی خاص بندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا

رب اشعث اغبر مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللہ لابرہ۔

(رواہ مسلم)

بہت سے پراگندہ مو، گرد آلود چہرے والے لوگ جنہیں دروازوں پر دھکے دیئے جاتے ہیں، (خدا کے پاس ان کا مرتبہ اتنا بلند ہوتا ہے کہ) اگر خدا پر قسم کھا بیٹھیں تو خدا اسے پوری کرکے رہتا ہے۔

لیکن کرامات کا چھپانا ہر حال میں ہر شخص کے لئے ضروری ہے میرے نزدیک نہ قرآن ہی سے اسکی تائید ہوتی ہے اور نہ حدیث سے، بلکہ خود حضرات صوفیاء کرام میں ایک بڑا طبقہ ایسا پایا جاتا ہے جنہوں نے یہی نہیں کہ اپنی کرامتوں کے اخفاء کی کوشش نہیں کی بلکہ علانیہ ان خوارق عادات کا اظہار علی رؤس الاشہاد وہ کرتے رہے، سید الاولیاء حضرت شیخ عبدالقادر الجیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی اسکی سب سے بڑی مثال ہو سکتی ہے، تواتر کے ساتھ یہ قصے انکی طرف منسوب ہیں، ہزارہا ہزار انسانوں کے مجمع میں حضرت والا سے خوارق عادات کا علانیہ ظہور بھری مجلسوں میں ہوتا رہتا تھا اور یہ انکی مجلس وعظ کی عام بات تھی، شاید ہی کوئی مجلس حضرت والا کے خطبات کی ایسی ہوگی جس میں شریک ہونے والوں کو غیر معمولی خوارق کا تجربہ نہ ہوتا تھا، آخر میں پوچھتا ہوں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ منکرین کے مقابلہ پر خوارق کا اظہار وہ فرماتے تھے، حالانکہ یہ کلیہ بھی صحیح نہیں ہے، بسا اوقات رفع ضرورت کے لئے بھی انہوں نے خوارق سے کام لیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جن معجزات کا قرآن میں تذکرہ کیا گیا ہے ان میں "فلق البحر" یا انفجار عیون (یعنی پتھر سے پانی کے جھرنوں کا) جاری ہونا یا بادل کا وہ سایہ جو بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، یا من و سلویٰ وغیرہ چیزوں کا تعلق ظاہر ہے کہ ان ہی خوارق سے ہے جن سے رفع حاجات میں مدد لی گئی ہے خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جن آیات باہرات کا انتساب حدیث و سیر کی کتابوں میں کیا گیا ہے، ان میں زیادہ تر "رفع حاجات" ہی والے خوارق ہیں عموماً مسلمان ان سے واقف ہیں،

لیکن نبوت کے منصب عالی سے جو سرفراز نہ تھے مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جو صاحب

کتاب کا علم رکھتے تھے عام طور پر آصف بن برخیا سمجھا جاتا ہے کہ ان کا اسم گرامی تھا اور حضرت سلیمان کے وزیر تھے، انھوں نے ملکہ سبا کے تخت کے آنے کا جو دعویٰ فرمایا، اور دعویٰ کے مطابق اس کو کر دکھایا، ظاہر ہے کہ اس قرآنی قصہ کا تعلق ایک ایسی ہستی سے ہے جو نبی بھی نہ تھے اور اپنی کرامت کا دفع ضرورت کے لئے انھوں نے اظہار فرمایا، صحابہ کرام کے حالات میں بھی ایسے سینکڑوں خوارق کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا دفع ضرورت سے تعلق تھا، تفصیل کے لئے دفتر درکار ہے،

خود شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حوالہ سے میں نقل کر چکا ہوں کہ "خوارق عادات" کی ایک قسم کے متعلق وہ بھی لکھتے ہیں کہ اللہ کے عباد صالحین سے ان کا ظہور دین کی تائید اور مسلمانوں کی حاجتوں کی تکمیل کے لئے بھی ہوتا ہے میں نے اسی موقعہ پر عرض کیا تھا کہ اسلام کی سیزدہ سالہ تاریخ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف ممالک اور اقالیم میں اس قسم کی ہستیوں کو قدرت پیدا کرتی رہی ہے

اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ المرشدی جو کچھ کر رہے تھے یا کر کے دکھا رہے تھے اس میں بجائے ان کے ارادے اور خواہش کے اسی کا ارادہ اور اسی کا حکم کارفرما نہ تھا جو ان کے ذریعہ سے ان امور کو ظاہر فرما رہا تھا، جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ چیزیں انہیں لوگوں کو ملتی ہیں جو اپنا سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں پھر کیوں نہ سمجھا جائے کہ یہ بھی جو کچھ ہو رہا تھا اسی کے ارادے سے ہو رہا تھا، جس کے ارادے میں المرشدیؒ نے اپنے ارادے کو گم کر دیا تھا،

بہرحال شیخ حسین الحاکی یا شیخ عبدالهادی المغربی کی یہ تنقیدیں بظاہر ان بزرگوں کے ذاتی مذاق کی تابع معلوم ہوتی ہیں اسی لئے ان کی اس تنقید کی کم از کم میرے نزدیک تو کوئی اہمیت نہیں ہے مطلب یہ نہیں ہے کہ ولایت و کرامت لازم و ملزوم ہیں ولایت کی اصل تو تحت کتاب و سنت عرفان اور ایمان و تقویٰ کی زندگی ہے اور نہ کرامت مقربان حق کی خواہش و مراد ہوتی ہے۔ (باقی)

لہ الیافعی نے بھی اس مقام پر تقریباً اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں ان کا خیال ہے کہ اپنی ان کراموں کے اظہار پر وہ مامور تھے وہ فرماتے ہیں ان الاولیاء لا یتعاطون الاشیاء بھوی نفوسهم اذ لو فعلوا ذلک ما کانوا اولیاء اللہ یعنی اولیاء اللہ تو نام ہی ان لوگوں کا ہے جو اپنی نفس کی خواہشوں سے دست بردار ہو چکے ہیں اسے ہوائے نفس کے مطالبہ [illegible] اس قسم کے کام کرنا [illegible] کا شمار اولیاء اللہ کے گروہ ہی میں کیسے ہو سکتا ہے دیکھو [illegible] مرآۃ

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۶ نمبر ۳ بابتہ ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۸ھ

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھیے!
"الفرقان" اور "کتبخانہ الفرقان" بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں
لہذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھیے!
دفتر "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ (یو۔پی)

چندہ سالانہ چار روپیہ نمونہ کا پرچہ چھ آنے

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ کی مطبوعات

کلمۂ طیبہ۔ (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح) ۵/

نماز۔ (نماز کی عظمت و اہمیت اور اسکی حقیقت) ۱۲/

حکمت ولی اللّٰہی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی علمی خصوصیات پر مولانا عبیداللہ سندھی کا بلند پایہ مقالہ جو "شاہ ولی اللہ نمبر" میں بھی شائع ہو چکا تھا ۸/

منصب تجدید کی حقیقت
تجدید و احیاء دین کے موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا قابل دید مقالہ جو "شاہ ولی اللہ نمبر" میں بھی شائع ہو چکا ہے ۸/

خطبات مبئی (جناب مدیر الفرقان کی آٹھ تقریریں) .... عمر

تدوین اصول فقہ
(از قاضی عبدالرحمٰن ایم اے عثمانیہ) فن اصول فقہ کی تاریخ اور اسکے ممتاز مصنفین اور انکی تصانیف پر تبصرہ اس کتاب کا موضوع ہے عجیب و غریب فاضلانہ تصنیف ہے ..... عہر

تحقیق مسئلہ ایصال ثواب (از مدیر الفرقان) ۶/

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت کا جدید اڈیشن (تیار ہو گیا) .... عا/

مسلمانوں کی اصلی طاقت اور اسکے عروج و زوال کے اسباب ...۶/

برکات رمضان المبارک (از مدیر الفرقان) ۵/

میری زندگی کے تجربے (از مدیر الفرقان) ۶/

بوارق الغیب (حصہ اول) کاغذ سفید چکنا .... عہ/ کاغذ رف سفید .... عمر

بوارق الغیب (حصہ دوم) کاغذ سفید چکنا .... عہ/ کاغذ رف سفید ۱۲/

شارع حقیقی کاغذ چکنا .... ۴/ کاغذ رف ۳/

مسئلہ خداشناسی ۳/

احکام النذر لاولیاء اللہ و تفسیر ما اہل بہ لغیر اللہ ۳/

مسئلہ حیات النبی کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ قیمت ۳ر

کتب خانہ الفرقان میں

مفید دینی اور اصلاحی کتابوں کے مہیا رکھنے کی خاص کوشش کیجاتی ہے

خصوصاً

"دار المصنفین" "ندوۃ المصنفین" اور "مکتبہ جماعت اسلامی"
جیسے علمی و دینی اداروں کی مطبوعات
اور گذشتہ و موجودہ اکابر علماء میں سے
شاہ ولی اللہؒ اور انکے سلسلہ کے دیگر اکابر و مشائخ کی تصنیفات
اور علماء دیوبند و سہارنپور کی خاص تالیفات
حتی الوسع جمع رکھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے

اس کے علاوہ

چونکہ لکھنؤ میں اور بھی چند بڑے بڑے کتبخانے ہیں جن سے کتابیں لیجا سکتی ہیں اسلئے آپ "کتب خانہ الفرقان" سے ہر قسم کی اچھی اور مفید کتابیں طلب فرما سکتے ہیں

حضرت مجدد الف ثانی اور زمانۂ حال کے اہل بدعت ۲/

خاکسار تحریک کیوں قابل قبول نہیں؟ ۲/

علم انجیل (اصلی انجیل کے دنیا سے ناپید ہونے کا ثبوت) ۴/

مسئلہ علم غیب پر فیصلہ کن مناظرہ ... قسم اول ۸/ قسم دوم ۶/

روداد مناظرہ گیا .... ۸/ ۔ کوائف مبئی ۳/

فتنۂ رفض و تفضیل کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی کا جہاد ۴/

تعلیم جدید اور علمائے کرام ۳/ ۔ نماز اور خطبہ کی زبان ..۲/

اسلام اور نظام سرمایہ داری ۸/

اسلام کا نظریۂ سیاسی (از مولانا مودودی) ۳/

روداد مناظرہ بریلی ... ۸/ ، روداد مباحثہ سماج بریلی ... ۴/

جلد (۱۶) | بابت ماہ ربیع الاوّل ۱۳۶۸ھ | نمبر (۳)

ضروری گذارش

(۱) اِس جگہ ▭ سُرخ پنسل کا نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مُدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے لہذا آئندہ کیلئے اپنا چندہ روانہ فرما کر ممنون فرمائیں اسیواسطے آپکے رسالہ کیساتھ منی آڈر فارم بھیجا جارہا ہے — اگر اگلے پرچہ کی اشاعت تک جناب کا چندہ نہ آیا اور کوئی اطلاع بھی نہ ملی تو حسبِ قاعدہ اگلا پرچہ جناب کو وی پی روانہ کیا جائے گا، اُمید ہے کہ وصول فرما کر ممنون فرمائینگے ———— (۲) گذشتہ سال (۱۳۶۷ھ) کے ماہ شعبان و ماہ رمضان کے الفرقان کی دفتر الفرقان کو ضرورت ہے۔ ناظرین کرام میں سے جو حضرات فائل اہتمام سے نہ رکھتے ہوں اگر وہ ہم کو بذریعۂ ڈاک روانہ کردیں تو ہم اُنکی مُدتِ خریداری میں اضافہ کردینگے، اور اگر وہ چاہیں گے تو ہم ان کو قیمت بھی ادا کرسکتے ہیں۔

ناظم الفرقان لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے "نامی پریس" لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

باسمہٖ سبحانہٗ حمداً وسلاماً

نگاہِ اوّلیں

بعض نیازمندوں کی استدعار پر مخدومنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری مدظلہم العالی وسط محرم میں لکھنؤ تشریف لائے، ۱۷۔ ۱۸ دن دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام رہا، دارالعلوم کی مسجد اور اس سے متصل مہمانخانہ اس پورے عرصہ میں معمور خانقاہ بنا رہا، دن کی مجلسوں میں شرکت کرنے والوں کے علاوہ وہیں رات گذارنے والے ذاکرین وطالبین کی تعداد بھی اکثر ۴۰۔ ۵۰ اور کسی کسی دن اس سے بھی زیادہ ہوتی تھی، خصوصاً شب کے آخری حصہ کا سماں بہت ہی اثر انگیز اور کیف آور ہوتا تھا۔

انھیں دنوں اس عاجز نے اپنے محبِ محترم جناب سید عبدالرب صاحب صوفی ایم اے کو ایک عریضہ لکھا جس میں حضرت رائے پوری مدظلہم العالی کے قیام لکھنؤ اور اسکی برکات کا ذکر کرتے ہوئے ایک ایسا فقرہ بھی لکھ دیا جس کا تعلق ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے تھا، یہ فقرہ اگرچہ یوں ہی زبانِ قلم سے نکل گیا تھا اور اس عاجز کے نزدیک اس میں کوئی خاص بات نہ تھی لیکن ہمارے صوفی صاحب کی حساس طبیعت کو اس نے بے چین اور انکے ایمانی تصورات کو متلاطم کر دیا اور اسی حال میں پورے سَو شعر کی ایک نظم انھوں نے کہدی ——— جس پیغام کی یہ نظم حامل ہے اس کا حق ہے کہ نگاہِ اوّلیں کے زیرِ عنوان، ناظرینِ الفرقان کے سامنے سب سے پہلے یہی پیش ہو ———

صوفی صاحب نے میرے عریضہ کے جواب میں جو خط لکھا تھا چونکہ وہ انکی نظم کا بہترین دیباچہ بھی ہو سکتا ہے اسلئے ناظرین کرام اگلے صفحہ پر "فکرِ موت وحیات" کے زیرِ عنوان پہلے اُسی کو ملاحظہ فرمائیں۔ نظم کا عنوان "تریاقِ سکرات" صوفی صاحب ہی کا تجویز کردہ ہے اور بلاشبہ بہت موزوں ہے۔

بہت سے شعروں میں قرآنی آیات اور احادیث کے اقتباسات اور تلمیحات سے صوفی صاحب نے بڑے بڑے مضامین کا کام لیا ہے۔ ناظرین کرام میں سے جنکی نظر ان آیات واحادیث پر نہیں ہے وہ ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے، اسلئے حاشیہ میں اُن مقامات کی مختصر توضیح کر دیگئی ہے۔

فکرِ موت وحیات

مخدومی ومحبی! سلام مسنون۔

آپ نے لکھا ہے کہ "حضرت رائے پوری کا قیام انشاء اللہ ہفتہ عشرہ سے بھی کچھ زیادہ ہوگا۔ قیام ندوہ ہی میں ہے اور ہم دونوں[1] وہیں حاضر رہتے ہیں، میں صبح کو آجاتا ہوں اور بعد ظہر پھر پہنچ جاتا ہوں، الحمد للہ اچھی خانقاہ بنی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے حالات کی رفتار دیکھ کر کبھی خیال ہوتا ہے کہ معلوم نہیں یہ میخانے کب تک اور قائم رہیں گے، کبھی خیال ہوتا ہے کہ جس ملک میں یہ ہو وہاں سے اسلام کیونکر مٹ سکے گا۔ والامر بید اللہ تعالیٰ۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

آپ کے قلم سے یہ ٹکڑا زندگی کے عوامل کو برانگیختہ کرنے والا ادا ہوا ہے، جس کو نفسیات سے مس ہو آپ کے اس جاندار شعر کی قدر کر سکتا ہے۔ ایسے جملے بہتر ہے کہ صفحات الفرقان کی امانت میں دیدیئے جائیں تاکہ محفوظ رہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اسٹیشن شاہجہانپور پر حاضر ہو کر رات کے وقت علی میاں کی خدمت میں بطور تحفہ ایک کاغذ اُس وقت پیش کیا تھا جبکہ وہ آپ کے نیز بعض اور احباب کے ساتھ کچھ پینے پلانے کی طلب میں نکلے تھے اُس پرچۂ قرطاس پر بس یہ ایک شعر میں نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا۔

ازصد سخن بیرم یک نکتہ مرا یاد است

عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد است

آپ کا یہ مختصر منشور ساقی نامہ پڑھ کر میرے تصورات متلاطم ہو رہے ہیں اور زبان پر یہ مصرعے آرہے ہیں۔ ان مصرعوں سے جو نظم تیار ہو جائیگی اُس کا نام "تریاقِ سکرات" تجویز کرتا ہوں۔

والسلام ناچیز سید محمد عبدالرب صوفی عفی عنہ

۲۵ نومبر ۱۹۴۸ء

---

[1] یہ عاجز مدیر الفرقان اور رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (جو بے تکلف دوستوں میں علی میاں کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں)۔

رو کے پوچھا "ہائے کیا مُسلم فنا ہو جائے گا؟" ہنس کے فرمایا "جو ہو جائے تو کیا ہو جائے گا؟"
ڈر گیا میں، یاس طاری ہو گئی، دل نے کہا:۔ وہ صمد بھی ہے ظہور 'اِسْتَنَا'[1] ہو جائے گا؟
پھر بندھی اُمید، پھر رو کر کہا:۔ "پروردگار! کیا ترے قرآں کا حامل بھی فنا ہو جائے گا؟"

غیب سے آواز آئی "حاملِ قرآں ہیں کے؟
قوم کا قانونِ ناطق 'وَاتَّقُوْا فِتْنَةً'[2] بھی ہے!"

میں نے پھر یہ کی گذارش:۔ "یا الٰہ العالمیں! قطعہ قطعہ اس زمیں کا ہے مساجد کا امیں!
چپہ چپہ پر یہاں آسودہ ہیں تیرے شہید بوئے خوں سے جنکی، ذرہ ذرہ تک ہی عنبریں
آئی تھی تیرے نبیؐ کو بھی محبت کی مہک جس طرف سے، یا الٰہی ہے یہی وہ سرزمیں

اُف یہ گنجینے، یہ سینے، یہ دفینے اے خدا!
یک بیک ہو جائینگے کیا نذرِ طوفانِ بلا؟"

یہ ندا دی:۔ "مسجدیں اے عاشقِ مسجد نہ گن! ہو گیا تو حیف! خالی مسجدوں سے مطمئن!
مسجدِ اقصیٰ کا تو نے حشر دیکھا یا نہیں؟ 'لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ'[3]
جس مہک کا ذکر ہے وہ تو فنا نہ ہو چکی! ہو چکی وہ فصلِ گُل، اب وہ نہ راتیں ہیں نہ دن!

ہے شہیدوں کا لہو بھی مشکبو تن بھی چمن
روضۂ جنت ہے لیکن ان غزالوں کا ختن

---

[1] یہ لفظ قرآن مجید میں بہت سی جگہ آیا ہے اس سے مراد عذاب خداوندی ہے۔ ۱۲ [2] یہ الفاظ قرآن کی جس آیت میں آئے ہیں اس کا مضمون یہ ہے کہ کسی قوم کی غالب اکثریت کی وجہ سے جب اس پر اللہ کا عذاب آتا ہے تو اسکی زد میں قوم کے وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو خود بدکار اور مجرم نہیں ہوتے ہیں۔ [3] قرآن شریف میں جہاں یہ الفاظ آئے ہیں وہاں اس تاریخی واقعہ کا ذکر ہے کہ بنی اسرائیل کی قوم نے جب نافرمانیاں کیں اور ایمانی عہد کو توڑا تو اللہ نے انکے بے رحم اور ظالم دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیا جنھوں نے بنی اسرائیل کے دینی[4]

[4] قبلہ (مسجد اقصیٰ) تک کو پامال کر ڈالا۔

وزنِ کہساروں کا جیسے کھینچ لے گا نفخِ صور
مسجدوں کا وزن کھو دیتا ہے اُمت کا فجور

رُوحِ کعبہ جیسے نکلے گی قیامت کے قریب
مسجدوں کی موت ہے مومن کا عمرانی فتور

آج بھی تو سیکڑوں طیطوس ہیں جالوت ہیں
کر چکے جو مسجدِ اقصیٰ کا ہیکل چور چور

گلشنِ رنگِ وفا، گلگوں قبا ہیں وہ شہید
گلخنِ قہر و بلا ہیں یہ 'اُولِی بَأسٍ شَدِید'

سب ہمارا ہے، وہ حق یہ باطلِ خونخوار ہے!
وہ گلِ صد چاک ہے، یہ خارِ صد آزار ہے!

اپنے اپنے حوصلے ہیں، اپنی اپنی کوششیں!
آلۂ تعذیب یہ ہے، وہ ذلیل و خوار ہے!

کس کے زلزلے، بجلیاں کس کی ہیں، کس کی آندھیاں؟
کس کے شعلے، کس کے خنجر، کس کی گیر و دار ہے؟

غیر کو مت دیکھ! ہم کو دیکھ غارت گر ہیں ہم
جنس تیری ہے مگر میزانِ خیر و شر ہیں ہم"

تھام کر دل ڈرتے ڈرتے عرض پھر میں نے کیا:-
"یہ وہ پیارا ملک ہے، اے مالکِ ارض و سما!

جس کو تیرے فکر، تیرے ذکر، تیرے عشق سے
کر گئے پُر نور تیرے عاشقانِ باصفا

چاند سورج کی طرح نکلے، اُجالا کر گئے
جلوۂ حق سے اندھیری رات کو دن کر دیا

نور سے اُن کے فضا اِس دیس کی معمور ہے
اختتام اُس کا کہ اتمام، آہ کیا منظور ہے؟

گرچہ اَب زیرِ زمیں سوتے ہیں وہ شب زندہ دار!
لیکن اُن کے میکدوں میں ہے وہی تازہ بہار!

کتنی آنکھیں ہیں چھلکتے جام اب بھی اے خدا!
یہ مئے غم رات بھر پیتے ہیں کتنے بادہ خوار!

کتنے پہلو بستروں سے اَب بھی رہتے ہیں جُدا!
لب پہ تیرا نام، دل بیتاب، آنکھیں اشکبار!

پیرِ برحق کا مجھے یہ ایک نکتہ یاد ہے
'ہم نہ ویراں ہونگے جبتک میکدہ آباد ہے!'

اَب بھی ہیں مےخوار! ساقی کی نگاہیں اَب بھی ہیں!
میکدوں میں طالبوں کی تجھ سے راہیں اَب بھی ہیں!

وصل کی اَب بھی لگن ہے، ہجر کی اَب بھی جلن!
عاشقوں کا گریہ، بے چینوں کی آہیں اَب بھی ہیں!

اس زمیں پر غلغلہ اَب بھی ہے تیرے ذکر کا!
سیکڑوں روتی تڑپتی، خانقاہیں اَب بھی ہیں!

ذکر کی کرتے ہیں جو حلقوم نغمہ باریاں
کیا اُنھیں سے چھوٹتی ہیں خون کی پچکاریاں؟

[illegible] یعنی بڑے سخت اور طاقتور لوگ۔

تیرے ان بندوں میں یارب وہ بھی ہیں مسکین و زار — جن کا ظاہر اُن کے باطن کا نہیں آئینہ دار
جو پریشاں بال و خاک آلود رہتے ہیں مگر — ہے ترے دربار میں اِس درجہ اُنکا اعتبار
جس ہم کے واسطے وہ تجھ پہ کھا بیٹھیں قسم — لاج اُن کی تو بھی رکھ لیتا ہے اے پروردگار

کیا نگاہِ لطف اُن پر بھی نہ ڈالی جائیگی؟
اے خدا! کیا اُن کی بھی فریاد خالی جائیگی؟"

بہہ رہے تھے میرے آنسو غیب سے آئی صدا:- — "میرے بندے! پُراثر ہے تیرے رونے کی ادا!
ذکر کا ہر نغمہ نکہت، اشک کا ہر قطرہ عطر! — فکر کا ہر لمحہ ہے آئینۂ حُسنِ بقا!
سُن رہے ہیں شب کے نالے، صبح کی آہیں بھی ہم — ہم سے پنہاں رہ نہیں سکتا ہے کوئی ماجرا

چشمِ بیخواب و دلِ بیتاب سب ہیں کامیاب
اجر ہم دیتے ہیں اپنے طالبوں کو بے حساب

لیکن اے بندے! یہ سب ہے انفرادی ماجرا — ہو چکا طے "لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی"
فرد کے میزان میں ناداں جماعت کو نہ تول — خود بتا- ہے اور — "کَثُرَ الۡخَبَثُ"[1] کا کیا مقتضا؟
زندہ تیرے بادہ کش! آباد تیرے میکدے! — اُن سے لیکن ہو نہ پائی دردِ اُمت کی دوا

نکتہ تیرے پیرِ برحق کا ہے حق اے ناصبور!
ذکرِ حق جبتک ہے دنیا میں، نہ ہوگا نفخِ صور

چاند سورج بننے والے سب کو روشن کر گئے — دہر کے ظلمت کدے کو نورِ حق سے بھر گئے
"اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ" کا وعدہ بھی پورا ہو چکا — جو گدا اٹھے بن کے شاہنشاہِ بحر و بر گئے
کچھ قسم کھا بیٹھنے والے تو ہیں مثلِ براء — دیکھ کر تیور مشیت کے ہماری ڈر گئے

وہ قسم کھانے پہ مائل ہوں تو ہم منھ توڑ دیں
رحم فرمائیں تو اُن کے عزم کا رُخ موڑ دیں"

دیکھ کر یہ حال میں نے کی دعا باچشمِ تر:- — "یا الٰہی! رحم فرما، اُمتِ مرحوم پر
ملتوی کر دے خداوندا! "اَخَذۡنَا"[2] کا عمل — شامتِ اشرار سے اخیار کو ضائع نہ کر
تو جو چاہے یک بیک سب نیک ہوں بد برباد ہوں — تو جو چاہے نیک بن جائیں بدوں کی بھی سپر

عالمانِ دینِ برحق ہیں مثیلِ انبیا!
ان میں ہر عیسیٰ نفس ہے دردِ اُمت کی دوا!

---

[1] ایک حدیث میں ہے "بعض صحابہؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ کیا اس امت پر ہلاکت کا عذاب ایسے وقت بھی آسکتا ہے جبکہ اس میں کچھ لوگ نیک بھی ہوں؟ حضورؐ نے فرمایا ہاں (اس امت میں اگر خباثت یعنی فسق و فجور کی کثرت ہو تو آسکتا ہے)۔ [2] یہ لفظ قرآن کی جن آیتوں میں آیا ہے اُنمیں قوموں کی بدکرداریوں پر اللہ کی پکڑ اور دنیا ہی میں نزول عذاب کا ذکر کیا گیا ہے۔

پھر کسی کو بخش دے داؤدؑ کا عزمِ بلند
دل بڑی مدت سے ہیں سینوں کے اندر بند بند
پھر کسی اہلِ عصا کو بخش موسیٰؑ کا جگر
ڈٹ کے جو فرعونیوں سے لے حسابِ چون و چند
خالدؓ و فاروقؓ کی جرأت عطا فرما انھیں!
ان کو کھائے جا رہا ہے روز و شب وہمِ گزند

عالموں میں علم بھی ہے، جسم بھی، تدبیر بھی
عزمِ طالوتی کا طالب ہی جواں بھی پیر بھی"

یہ ندا دی - ہم وہ قادر ہیں کہ ہم چاہیں اگر
شبنم انگارے سے ٹپکے، برف سے نکلیں شرر
جبر کر سکتے ہیں ہم "حتّٰی یکونوا مؤمنین"[1]
توڑ بھی سکتے ہیں ہم یکسر حدودِ خیر و شر
لیکن اے ناداں! یہ دنیا عالمِ اسباب ہے
نظمِ خلق و امر ہم کرتے نہیں زیر و زبر

جنگ گر آئینِ فطرت سے ہے تخریبِ زمیں
دینِ حق سے جنگ ہے غارتگرِ دنیا و دیں

"یک بیک برباد ہوں سب نیک و بد" یہ کیا کہا؟
فرد یا اُمت کسی کو یوں نہیں ملتی سزا
بلکہ احقاقِ حق و ابطالِ باطل کیلئے
بیشتر ہم بھیجتے ہیں اُمتوں میں انبیا!
سلبِ نعمت کیلئے ہے "مَا بِاَنفُسِہِم" کی قید
شرط ہے "فَسَقُوا"، "اَخَذنَا" کی "فَدَمَّرنَا" جزا[2]

اُمتوں کو پیشتر ہشیار کر دیتے ہیں ہم
پھر بغاوت پر ذلیل و خوار کر دیتے ہیں ہم

کس نظر سے تو نے دیکھا قوم کے ادبار کو؟
لے نہ ڈوبے شامتِ اشرار کیوں اخیار کو؟
حق کی بنیادیں اُلٹ دیں ہیبتِ طاغوت نے
کر دیا برہم نگاہِ یاس سے اقتدار کو
اِن "مثیلِ انبیا" نے یہ رسالت کی ادا
دی ترے عیسیٰ نفس نے یہ دوا بیمار کو

خیرِ اُمت عالم افروزی پہ بھی مامور ہے
شمعِ حق پھر بھی اندھیری رات میں بے نور ہے

جس جماعت کو عطا کی خدمتِ پیغمبری
اُس نے توڑا بھی کلیمؑ آسا، طلسمِ سامری؟
کر سکی تھی نطقِ موسیٰؑ کو بھی اپنا ہم نوا
مصلحت، تدبیر، یا فرعونیت کی دلبری؟
خیرِ اُمت کے مثیلِ انبیا کا کام ہے
حصہ داری، مجلس آرائی، وفا، یا رہبری؟

عزمِ عمرانی وہاں تھا، لوثِ ہامانی یہاں
ہمتِ مومن وہاں تھی، کفر سامانی یہاں

---

[1] یہ بھی قرآنی الفاظ ہیں ترجمہ یہ ہے کہ "یہاں تک کہ وہ ہو جائیں سچے ایمان والے۔
[2] اس شعر میں قرآن مجید کی چند آیتوں کی طرف اشارات [illegible]

نطق و کلک و خلق و سعی و جنبش و لغزش گواہ!
دل ہے اپنا دل، نہ ہے ظالم نگاہ اپنی نگاہ!

"شیخِ[۱] صنعا خرقہ رہنِ خانۂ خمار داشت
گر مریدِ راہِ عشقی فکرِ بدنامی" گناہ!

کہہ رہا ہے لہجہ "لَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ"
اور ہی کچھ چیز ہے "اِنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقٰاة"

دیدنی ہے اس کلیمِ وقت کا عزمِ بلند
ڈالتا ہے بامِ فرعونی پہ بڑھ بڑھ کر کمند

ہے یقیں زورِ ستیزہ، بے یقینی ضعف ساز
روحِ ایماں فقر، روحِ بے یقینی حرص و آز

سجدۂ خالق، کلیدِ شوکت و شانِ شکوہ
سجدۂ مخلوق، لعنت، مسکنت، ذلت، نیاز

علمِ نورانی سراپا کاشفِ اسرارِ وحی
علمِ ظلمانی حجاب و نکتہ ساز و حیلہ باز

جو بدوں کی بھی سپر بننے کی کرتے آرزو
"لَوْ هَدٰانَا اللّٰه" کہہ دیں گے ہمارے روبرو

دارِ باقی میں سزائے بے یقینی ہے جحیم
دارِ فانی میں حجارہ، صاعقہ، ریحِ عقیم

ذلت و خواری، غلامی، رعب و دہشت، جُبن و وہن
قحط و بیماری، ہلاکت، قتل و غارت، خوف و بیم

امتیں اپنی شرارت کا یہ پاتی ہیں صلہ
دل رسولوں کے ہمارے ڈر سے رہتے ہیں دو نیم

یک سرِ مو فرق کر دیتے اگر پیغامبر
سر نہ ہم اُن کے بھی رکھ دیتے حسامِ بے سپر

گاہ نقضِ عہد پر برباد کر دیتے ہیں ہم
گاہ کچھ دن کیلئے "آزاد" کر دیتے ہیں ہم

گاہ دو قوموں کو دیتے ہیں تصادم کا عذاب
گاہ دونوں کو ثمود و عاد کر دیتے ہیں ہم

آلۂ تعذیب ٹھہرا کر کسی کو چند روز
تختۂ مشق "لَبِالْمِرْصَاد" کر دیتے ہیں ہم

امتِ مرحوم صدیوں سے ہے محوِ ارتکاب
چکھ رہی ہے جس کے خمیازے میں مدت سے عذاب"

سر بسجدہ ہو کے میں نے کی گذارش:- "یا الٰہ
امتِ مرحوم کیا ہو جائے اب یکسر تباہ؟

"هُمْ عِبَادُكَ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ!"
تو سراپا رحم و رافت، یہ سراپا ہیں گناہ

قوتیں فکر و عمل کی بن چکیں یاس و ہراس
کچھ نہیں سرمایۂ بیچارگی جز اشک و آہ

مضطرب ہے دل، نظر حیراں، پریشاں ہے دماغ
ہائے کیا باطل کے پھونکوں سے ترے حق کا چراغ ....؟"

۱؎ پورا شعر حافظ کا ہے، صرف "مکن" کی جگہ "گناہ" کر دیا ہے۔ صبحی۔ (حاشیہ نمبر ۲ تا ۴ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

پاسِ عظمت تھا۔ نہ منھ سے کہہ سکا "بجھ جائے گا؟" غیرتِ حق نے ندا دی:- "موسمِ گُل آئے گا
خارزارِ یاس و غم کو ہم بنا دیں گے چمن ابرِ نیسانِ کرم، پیہم گُہر برسائے گا
گریۂ اخلاص و استغفار و آہنگِ عمل میرے بندے! مژدۂ آمرزگاری لائے گا

شرط ہے لیکن کہ ہو تجدیدِ میثاقِ وفا
ہو علومِ وحی پر تعمیرِ ملّت کی بِنا

متنِ میثاقِ وفا ہے زیبِ عنوانِ حیات آیتِ ہستی ہی یہ شایانِ قرآنِ حیات
ہم بتاتے ہیں سُراغِ چشمۂ آبِ بقا خیرِ اُمت جسم ہے قرآن ہی جانِ حیات
مثلِ ایامِ "خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ" یہ دن بھی ہیں حرفِ "نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْن" اعلانِ پیمانِ حیات

مردِ مومن زندۂ جاوید ہے، فانی نہیں
ہے ہمارا امرِ محکم، نقشِ انسانی نہیں"

ناچیز:- صوفی ۲۷ر دسمبر ۱۹۴۶ء

(بقیہ حاشیہ صث ملاحظہ ہو) سے٢ یہ الفاظ قرآن شریف کے ہیں انمیں تنبیہ کی گئی ہی کہ تم ناحق پرستوں کے خیالات و خواہشات کی پیروی نہ کرو بلکہ اللہ کی ہدایت کی روشنی میں چلو۔ سے٣ یہ الفاظ جس آیت کے ہیں اسمیں یہ مضمون بیان ہوا ہی کہ خوف و خطر کے خاص حالات میں اپنی جان بچانے کیلئے کسی ایمان والے سے اگر کچھ کمزوری ظاہر ہو اور وہ خلاف عقیدہ اُسوقت کوئی بات کہہ کے اپنی جان بچالے تو اُس سے مواخذہ نہ ہوگا۔ سے٤ سورۂ الحاقہ کی آیت "لو تقول علینا الخ" میں یہی لرزا دینے والا مضمون بیان ہوا ہے۔ سے٥ ان الفاظ سے قرآن مجید کی جس آیت کی طرف اشارہ ہی اسکا مطلب یہ ہی کہ — خداوندا! اگر تو ان لوگوں کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو رحمت سے ان کو معاف فرمادے تو یہ معافی کسی کے دباؤ سے نہ ہوگی کیونکہ تو زور و قوت اور حکمت والا ہی۔

(حاشیہ نمبر (۱) صفحۂ ہٰذا) سے١ اس شعر میں "خلوا من قبلھم" سے مراد اگلی امتوں کی تاریخ عذاب ہی۔ اور "ننج المومنین" سے اشارہ سچے ایمان والوں اور فرمانبرداروں کی نجات اور سرفرازی کے وعدۂ خداوندی کی طرف ہی۔ یہ دونوں لفظ بھی قرآن مجید ہی کے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کیلئے دو راستے

حقیقی ایمان ـــ یا ـــ اکبری الحاد

ـــــ(ادارہ)ـــــ

انڈین یونین کے بسنے والے مسلمانوں کیلئے وقت کا ایک اہم سوال یہ ہے کہ آیندہ اس ملک میں وہ عزت و عافیت کے ساتھ کس طرح رہ سکتے ہیں؟ یہ واقعہ ہے کہ پچھلے دس بارہ سالوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کی روش کچھ ایسی رہی جس نے یہاں کی اکثریت والی قوم کے دلوں میں انکی طرف سے سخت غصہ اور عناد بھر دیا ہے پس اب جبکہ سیاسی اقتدار اعلیٰ اور ملک کا سارا نظم و نسق اس اکثریت والی قوم ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت بھی گویا اُن ہی کے ہاتھ میں ہے تو قدرتی طور پر یہاں کے مسلمانوں کے مستقبل کا مسئلہ واقعۃً نازک اور سخت قابل فکر ہو جاتا ہے۔

اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں جبتک کوئی ایسی تبدیلی نہ ہو جو یہاں کی اکثریت کے نقطۂ نظر کو ان کے حق میں بدل دے اسوقت تک اس ملک میں اور اس جمہوری دور میں بظاہر اسباب اُنکے لیے عزت و عافیت کی زندگی مشکل ہے۔ لیکن آگے اس تبدیلی کے بارہ میں دو مختلف نظریئے ہیں جن میں نہایت اہم اصولی اور بنیادی فرق ہے۔

مسلمانوں میں جو لوگ صرف قومی مسلمان ہیں اور اسلام سے بحیثیت دین کے اُن کو کوئی خاص تعلق نہیں ہے اور نہ اسلام کے اصول اور تعلیمات و ہدایات سے انھیں واقفیت ہے اور یہ حقیقت بھی جن کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے کہ کسی شخص یا کسی قوم کے کسی دین و مذہب سے وابستہ ہونے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد والی دوسری زندگی میں (جو اس دنیوی زندگی سے بہت زیادہ قابل فکر ہے) نجات و فلاح حاصل ہو سکے۔ بہرحال جن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ مسلمان کہے جانے کے باوجود وہ اسلام کی حقیقت سے ناواقف اور آخرت کے مسئلہ سے بالکل فارغ اور بے پرواہیں، اُن کی رائے اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اب انڈین یونین کے مسلمانوں کو

یہاں کی اکثریت والی قوم سے اپنے کو اتنا قریب اور ایسا ہمرنگ بنا دینا چاہیئے کہ کوئی امتیاز اور دوئی بیچ میں نہ رہے حتی کہ اس طبقہ کے انتہا پسندوں کی رائے تو یہاں تک ہے کہ مسلمانوں کے نام بھی اب ایسے نہ ہونا چاہئیں جن کی وجہ سے مسلمان دوسروں سے پہچانے جائیں اور وضع و ہیئت میں بھی اب ایسی کوئی چیز نہ رہنی چاہیئے جو غیر مسلموں سے انھیں ممتاز کرنے والی ہو بلکہ دستور ساز اسمبلی کے ایک "مسلمان" رکن نے تو ابھی پچھلے مہینے اسمبلی سے اس کے متعلق قانون پاس کرانے کی کوشش بھی کی تھی۔

اس سلسلہ میں بعض حضرات بہت کھل کر اکبر کی مثال بھی پیش کرتے ہیں اور مسلمانوں کو صاف صاف مشورہ دیتے ہیں کہ تمہارے لئے اس ملک میں عزت و عافیت سے رہنے کی شکل اب صرف یہی ہے کہ تم اکبر کے نقش قدم پر چلو اور اورنگ زیب کا طریقہ چھوڑ دو۔

[جو حضرات اکبر اور اورنگ زیب عالمگیر (رحمۃ اللہ علیہ) کی شخصیتوں سے اور ان دونوں دادا پوتوں کے نقطہ نظر اور طرز عمل کے اختلاف کی تفصیلات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اکبر نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیئے عملاً اپنے کو غیر مسلم بلکہ کہنا چاہیئے کہ بڑی حد تک ہندو بنا لیا تھا اور ہندوؤں کو خوش رکھنے کے لیئے وہ علانیہ اسلام کے مقابلہ میں ہندویت کے ساتھ ترجیحی معاملہ کرتا تھا اور اسی کے ساتھ اپنی عقیدت و دلچسپی کا زیادہ اظہار کرتا تھا[1]۔

اور اورنگ زیب ایک پابند مذہب اور با اصول مسلمان بادشاہ تھا اور اپنے پردادا اکبر کے مذکورۂ بالا ملحدانہ یا منافقانہ طرز عمل کو اس کی سفاہت اور ضلالت سمجھتا تھا با اینہمہ وہ اپنی غیر مسلم رعایا کے حق میں منصف بھی تھا اور روادار و فیاض بھی]

بہرحال انڈین یونین کے مسلمانوں کو بعض "مسلمانوں" ہی کی طرف سے ایک مشورہ آجکل تو یہ دیا جا رہا ہے کہ اگر اس ملک میں وہ عزت و عافیت سے رہنا چاہتے ہیں تو اکبر کی اقتدا کریں۔ ہمارے صوبہ سے ایک بلند معیار اور سنجیدہ سیاسی ماہنامہ اردو میں نکل رہا ہے جس کا خاص موضوع ہی ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی ہے، اس کی حالیہ اشاعت میں اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اور ہندوستانی مسلمانوں کو نئی سیاسی پالیسی کے انتخاب میں کوتاہ اندیشی سے بچنے اور دوراندیشی سے کام لینے کا مشورہ دیتے ہوئے اس کے اداریہ میں لکھا گیا ہے۔

---

[1] اکبر کے اس طرز عمل کی پوری تفصیل اس کے معاصر مورخ بلکہ اس کے منصب دار بدایونی کی "منتخب التواریخ" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کچھ اشارات حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں بھی ملتے ہیں۔ الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر (سنہ [illegible]) میں اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے ۱۲

"ہندوستان کی تاریخ میں دو شخصیتیں ایسی ہوئی ہیں (جو مسلمان بھی تھیں) جو اپنی دوراندیشی اور کوتاہ اندیشی کی اپنی آپ مثال ہیں، یعنی اکبر اور اورنگ زیب، اکبر نے سو سال نہیں بلکہ ہزار سال آگے سوچا تھا اور ہندو مسلمانوں کی ایک متحدہ قومیت کی تعمیر کی بنیاد رکھی تھی، اگر اسکی اولاد بھی اسکے نقش قدم پر چلتی تو اس ملک کے اندر ہندو مسلم سوال ہی نہ ہوتا"

یہ بات تو بلاشبہ سو فیصدی صحیح ہے کہ اکبر کے سارے جانشین مغل بادشاہ اگر اس کے نقش قدم پر چلتے تو اس ملک میں ہندو مسلم سوال ہی نہ ہوتا۔ (کیونکہ اس پالیسی کا نتیجہ یہی ہوتا کہ اس ملک کا ہندو تو اگرچہ ہندو ہی رہتا لیکن مسلمان، مسلم نہ رہتا[1]) پھر بھلا ہندو مسلم سوال کیوں باقی رہ جاتا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، اسوقت ہمارا مقصد اس رائے پر تنقید کرنا نہیں ہے اور نہ ہم اسوقت اس بحث میں پڑنا چاہتے ہیں کہ اکبر اور اورنگ زیب دونوں میں سے واقعی دوراندیش و عاقبت اندیش کون تھا اور کوتاہ اندیش و ناعاقبت اندیش کون؟ اور عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مغلیہ سلطنت کے انحطاط و زوال کا اصلی باعث انکی اسلامیت اور مذہبی زندگی تھی یا انکے بعض نالائق جانشینوں کی غلطیاں اور بداعمالیاں؟ — الغرض یہ سب چیزیں اسوقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں ہم کو تو اسوقت صرف یہ بتلانا ہے کہ مسلمان کہلانے والوں میں ایک طبقہ کی رائے اسوقت یہ ہے کہ انڈین یونین کے مسلمانوں کو اس ملک میں عزت و عافیت سے رہنے کے لئے اکبر کے نقش قدم پر چل کر اپنے کو یہاں کی اکثریت کے ہم رنگ کر دینا چاہیئے —

"تا کس نگوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری۔"

اس رائے کے متعلق اصولی طور پر اسوقت ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ مسلمان کہلانے والوں میں جو لوگ اس فیصلہ پر واقعتہً پہنچ چکے ہیں کہ عملی زندگی میں انھیں مسلمان رہنے کی اور اللہ و رسول کی ہدایات کی پیروی کرنے کی اب ضرورت نہیں رہی، یا ہندوستان میں رہتے ہوئے اب وہ اس کو اپنے لئے مناسب نہیں سمجھتے اور اس لئے اسلام سے قطع نظر کر کے ہی وہ اپنے مسائل کو حل کرینگے، اُنکے لئے بلاشبہ یہ بہت صاف اور سیدھا راستہ ہے کہ وہ اقلیت و اکثریت اور ہندو مسلم مسئلہ کی الجھنوں اور دقتوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے اپنے کو اکثریت والی قوم کا غیر متمیز جزو بنا دیں۔ لیکن اسکے ساتھ اپنے کو مسلمان کہنا کہلانا منافقت کے علاوہ حماقت بھی ہوگی۔ جو لوگ سرے سے اسلام کی ضرورت ہی کے قائل نہیں رہے اور اسکی پابندیوں سے آزادی کو اپنے مسئلہ کا حل قرار دے چکے، اُن کا اسلام کے نام کو خواہ مخواہ اپنے ساتھ چپکائے رکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے

---

[1] کیونکہ ہندو تو ہر حال ہندو رہتا ہے جبتک کہ اپنے کو ہندو کہے خواہ اس کا عقیدہ اور عمل کچھ ہی ہو۔ لیکن مسلمان اگر اسلامی تعلیمات و ہدایات سے ہٹ جائے تو مسلم و مومن نہیں رہتا۔ اگرچہ نادانی یا منافقت سے اپنے کو مسلمان کہتا رہے۔ ۱۲

ہمارے علم میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو ہمیشہ سے اچھے خاصے مذہبی مسلمان رہے ہیں، اسلامی داڑھیاں بھی رکھتے ہیں اور عملاً نماز روزہ کے بھی پابند ہیں بلکہ مذہب کے جاننے والوں اور اسکی نمائندگی کرنے والوں میں انکا شمار ہوتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ کسی وقت بھی دیدۂ و دانستہ وہ اسکے لیے آمادہ نہیں ہوسکتے کہ مسلمان اسلام سے قطع نظر کرکے اور خدا و رسول کی ہدایات سے یکسر آزاد ہو کے زندگی گزاریں لیکن اسوقت انکے ذہن و دماغ کا حال بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ اسی طرح کے بعض لوگوں کا ۱۸۵۷ء کے بعد ہوگیا تھا کہ انگریزی اقتدار کی غیر شعوری مرعوبیت کی وجہ سے اُن کے دماغوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اب اِس ملک میں مسلمان عزت ترقی جب ہی حاصل کرسکیں گے جب کہ اپنے کو وہ انگریزوں سے زیادہ سے زیادہ قریب کردیں پس اُسوقت جسطرح مذہبی علم رکھنے والوں میں بعض لوگ مسلمانوں کی (اور شاید اسلام کی بھی) بڑی خدمت یہ سمجھتے تھے کہ مذہبی کتابوں سے تلاش کرکر کے ایسی باتیں نکالیں جو مسلمانوں کو انگریزوں سے قریب تر ثابت کرسکیں اور عیسائیت یا انگریزیت سے مسلمانوں کو جو بُعد اور تنفر تھا اس کو کسی طرح کم کرسکیں۔ اسیطرح اسوقت بعض حضرات اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت یہ سمجھ رہے ہیں کہ اسلام میں کوئی ایسی راہ نکالدیں جس پر چل کر ہندی مسلمان، مسلم رہتے ہوئے ہندویت سے قریب تر ہوجائے، خدا بھی راضی رہے اور وطن کے دیوتا بھی خوش! ان لوگوں کی ذہانت اور علمی قابلیت آجکل اسی پر صرف ہو رہی ہے، اور ان کی کوشش یہ ہے کہ اسلام کا ایک نیا ہندی ایڈیشن کسیطرح جلدی تیار ہوجائے[1] اس دور کے یہ ابو الفضل اور فیضی دین کی بنیادوں تک کو بدلدینے پر آمادہ نظر آتے ہیں اور انہیں سے بعض، دینداری و دین دانی کے زعم کے باوجود اسلام اور کفر کو خلط ملط کردینا چاہتے ہیں۔

بہرحال ہندوستانی مسلمانوں کو موجودہ مشکلات و مصائب سے نجات دلانے اور انکے مستقبل کو روشن کرنے کے لیئے ایک رائے تو یہ دی جارہی ہے کہ وہ اکبر کے نقش قدم پر چل کے اپنے کو یہاں کی

---

[1] الہ آباد کے ایک دوست نے ایک "مسلمان صاحب" کے انگریزی مقالہ کا ترجمہ کرکے راقم کے پاس بھیجا ہے، اس ظالم مقالہ نگار نے اسلام اور ہندو دھرم کو ملادینے کی اور ایک ثابت کرنے کی اپنے نزدیک پوری کوشش کی ہے حتی کہ ظالم نے ثابت کرنا چاہا ہے کہ تناسخ کے عقیدہ کی بھی اسلام میں بنیاد موجود ہے۔

ایک اور اچھے خاصے شہرت یافتہ اور مذہبی مسلمان صاحب کو دیکھا کہ وہ تیرھویں صدی کے ایک صوفی بزرگ کے ایک فارسی مکتوب سے یہ ثابت فرمانے کی کوشش کرتے تھے کہ ہندوؤں کی بت پرستی اسلامی توحید کے خلاف اور عرب کے شرک کی مانند نہیں ہے جو خلود فی النار کا موجب ہو اور تناسخ کا عقیدہ بھی موجب کفر نہیں ہے بس اللہ ہی اپنی پناہ میں رکھے! ایسی ہی نفسانیں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ بار بار اپنے مکاتیب میں تحریر فرماتے تھے "چو مید برسر ایمان خود لرزم" یا مقلب القلوب ثبت قلوبنا علی دینک! ۱۲

اکثریت والی قوم کے بالکل ہمرنگ بنا دیں اور ان اسلامی طور طریقوں کو ایکدم یا آہستہ آہستہ ختم ختم کر دیں جو انھیں اس ملک کی اکثریت سے ممتاز اور جدا کرتے ہیں۔

(جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس بارہ میں ہماری صاف رائے یہ ہے کہ جن لوگوں کو اکبری اس پالیسی پر یقین ہو اور وہ اس کو صحیح سمجھتے ہوں، انھیں ضرور ایسا ہی کرنا چاہئے لیکن ضروری ہے کہ پھر وہ منافقت سے کام نہ لیں بلکہ اسلام سے اپنا تعلق علانیہ منقطع کر کے جو کچھ انھیں کرنا ہو کریں۔)

دوسرا راستہ انڈین یونین کے مسلمانوں کے لیئے یہ ہے کہ وہ عملاً سچے مسلمان بن جائیں، اسوقت صورت یہ ہے کہ مسلمان قوم کی اکثریت عملاً نا مسلمان ہے نہ انکی سیرت مسلمانوں کی سیرت ہے نہ انکے اعمال و اخلاق اسلامی اعمال و اخلاق ہیں۔ دلوں میں خدا کا خوف نہیں، آخرت کی فکر نہیں، اللہ و رسول کے احکام کی پروا نہیں۔ قریباً ہر طبقہ میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جنکی عملی زندگی اسلامی احکام سے آزاد ہے۔ مثلاً ان میں جو حکومت کے عہدوں پر ہیں اگر انھیں اپنے افسران بالا کا خوف نہ ہو تو رشوت ستانی میں وہ غیر مسلموں سے بھی سبقت لیجانے والے ہیں، جو تاجر اور کاروباری ہیں وہ کاروبار میں جھوٹ فریب سے کام لینے میں غیر مسلموں سے زیادہ بیباک ہیں۔ غریب اور جاہل طبقہ میں آوارگی اور بد اخلاقی عام ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ہماری اکثریت بلکہ غالب اکثریت کی حالت اس سے بد تر ہے جیسی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہود و نصاریٰ کی تھی، حتیٰ کہ دین و مذہب کی نمایندگی کرنے والے طبقہ کی اکثریت میں بھی کم و بیش وہ سب خرابیاں موجود ہیں جو اسوقت یہود کے احبار اور نصاریٰ کے رہبان میں تھیں اور قرآن نے جا بجا جن کی شکایت کی ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی کے مطابق اس امت میں ابھی اللہ کے کچھ ایسے بندے موجود ہیں جو اللہ سے کیئے ہوے عہد و پیمان پر قائم رہنا اور اسی حالت میں جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔ نیز امت کی اکثریت میں دین سے جو دوری ہے (جس کا ذکر اوپر کیا گیا) وہ بھی صرف غفلت ہی کی وجہ سے ہے ایسا نہیں ہے کہ خدانخواستہ دل دماغ اسلام سے اور خدا و رسول کے احکام سے ارادۃً باغی اور منکر ہو گئے ہوں۔

پس ہندوستانی مسلمانوں کے لیئے دوسرا راستہ یہ ہے (اور وہی ہمارے نزدیک راہ نجات ہے) کہ وہ غفلت و جاہلیت کی موجودہ غیر اسلامی زندگی چھوڑ کر حقیقی اسلامی زندگی اختیار کر لیں، پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مسلمان قوم کا صرف متوسط طبقہ ہی (جو عموماً قوم کی نمایندگی کیا کرتا ہے اور جس کے طرز زندگی کو دنیا اس قوم کا طرز زندگی سمجھا کرتی ہے)

اس مشورہ کو مان لے اور صرف اسکی ہی زندگی میں یہ تبدیلی ہو جائے کہ اسلامی احکام کے مطابق وہ خداترس اور خداپرست ہو جائے، اسکی سیرت اسلامی سیرت اور اسکے اعمال و اخلاق اسلامی اعمال و اخلاق ہو جائیں، اپنے دین اور اپنے اصول پر استقامت، خدا کی عبادت، خلق خدا کی خدمت، خصوصاً ضعیفوں اور کمزوروں کی ہمدردی و غمخواری اور بے لاگ انصاف اور سچائی اُن کی زندگی کے نمایاں اوصاف ہو جائیں تو قسم ہے عزت و ذلت کے مالک کی کہ مسلمان ہی اس ملک میں سب سے زیادہ با عزت ہوں گے۔ اور آج جو عناصر اس ملک سے ان کو نکال دینا چاہتے ہیں یا عزت و عافیت اُن سے چھین لینے کے درپے ہیں وہ خود مسلمانوں کو عزت کے ساتھ اس ملک میں رکھنے پر مجبور ہوں گے اور جمہور کی یہ خواہش ہوگی کہ یہ خداترس و خداپرست اور صاحب عدل و انصاف جماعت ہی ملک کا نظم و نسق چلائے۔ کاش مسلمان اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس ارشاد کی حقیقت کو سمجھ لیتے جو آپ نے اپنی دعوت کے ابتدائی دور میں اپنی قوم کے سرداروں سے کہا تھا کہ "میں تمہارے لئے اللہ کی طرف سے وہ چیز لایا ہوں جس کو تم اگر اختیار کر لو تو عرب و عجم تمہارے لئے جھک جائیں گے"۔ [وہ چیز ہے اللہ و رسول پر حقیقی ایمان اور اُس ایمان کے مطابق زندگی جس کا نام الاسلام ہے]

اپنی قوم کو ہمارا مشورہ بلکہ ہماری دعوت یہی ہے، پس اللہ کے جن بندوں کو اس راہ کی صحت پر اور اسی کے راہ نجات ہونے پر یقین ہو ان کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں میں اسی تبدیلی کی کوشش کو اپنی زندگی کا اصل مقصد و مصرف بنا لیں اور اللہ کی مدد پر بھروسہ رکھتے ہوئے جد و جہد میں لگ جائیں[1]۔

اکبر اور ابو الفضل و فیضی کی ذریت نے تو وقت کو ساز گار دیکھ کر اپنا کام تیزی سے شروع کر دیا، اب سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک اور آسمان کے فرشتے منتظر ہیں کہ مجدد الف ثانی کا کام کرنے کے لئے اللہ کے کون کون بندے میدان میں آتے ہیں ؎

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمی آید سواراں راچہ شد

[1] اس کام کے طریقہ اور پروگرام کے متعلق الفرقان میں کئی بار پہلے بھی لکھا جا چکا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی لکھا جاتا رہیگا۔

مذہبیت و لا مذہبیت

از جناب مولانا سید اختر علی صاحب تلہری
(استاذ فارسی گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہانپور)

یورپ سے دہریت و لامذہبیت کی جو طوفانی ہوائیں چلنا شروع ہوئی ہیں انھوں نے ہر جگہ بظاہر مذہب کی اساس ہلا دی ہے۔ نوبت یہ پہونچی ہے کہ دنیا کے ان حصوں میں بھی جن کا مذہبی شغف اب تک شہرۂ آفاق تھا دہریت والحاد کی جنس "متاع ہر دکاں" بنتی جارہی ہے۔ مذہب کی طرف سے عام بددلی پیدا ہو رہی ہے مذہب کا وقار دلوں سے رخصت ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال نہایت ہی بھیانک ہے۔ جمعیت بشریہ کے ارتقائی راستہ میں ربانی مذاہب کے جو نورانی چراغ جل رہے ہیں اگر انھیں بجھا دیا گیا تو پھر انسانی دنیا کا مستقبل جس قدر تیرہ و تار ہو جائے گا اس کا اندازہ بھی آسان نہیں ہے۔

نوع بشر کے تمدنی مقتضیات پر جب نظر کی جاتی ہے تو اس کا تسلیم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ انسانی شائستگی اپنے ارتقا کی کسی منزل میں بھی ربانی مذاہب کی روشنی سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاشرہ (سماج) ترقی کی کسی حد میں بھی پہونچ جائے مگر اپنا شیرازہ صحیح طور سے منتظم رکھنے کے لئے وہ ربانی مذاہب کا محتاج ضرور ہے کیونکہ خود زندگی سچے مذہب سے ہٹ کر پاکیزہ عنوان سے پنپ ہی نہیں سکتی۔ اس کے بازوؤں میں حقیقی توانائی آہی نہیں سکتی اس لیے کہ زندگی میں معنی سچا مذہب ہی پیدا کرتا ہے۔ زندگی کے لیے مستقل غایات کی تعیین سچا مذہب ہی کرتا ہے۔ حرص و ہوس اور استیثار و خود نمائی کے نفس سے اٹھنے طوفانوں میں سچا مذہب ہی زندگی کے مسافر کی ساحل مراد کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

سچے مذہب سے مراد ہی وہ مبدأ فیاض یا کسی مافوق البشر طاقت سے حاصل شدہ دستور العمل ہے جس میں ایسے حکیمانہ قوانین و ضوابط موجود ہوں جو ہماری عقلی و اخلاقی و روحانی و مادی قوتوں کی

نشوونما کے لئے امکانی منزلیں طے کر سکنے کی سہولتیں فراہم کر سکیں تاکہ ہمیں حقیقی ودائمی سکون وراحت نصیب ہو۔ نفس کے تزکیہ "کتاب وحکمت" کی تعلیم، قوائے بہیمیہ کی تہذیب، مختلف جذبات ورجحانات کی تعدیل کا اس کے سوا آخر نشا بھی اور کیا ہو سکتا ہے؟

میں کیوں آنے والی نسلوں کی آسائشوں کے لئے خطروں کے راستوں میں سے گذروں؟ میں کیوں اپنے ابنائے نوع کو فائدہ پہونچانے والی حکومت قائم کرنے کے لئے اپنا سب کچھ تج دوں؟ میں کیوں نہ اپنے لئے منفعتوں کی دنیا مخصوص کر لینے کے واسطے قوم ووطن کے فائدے نظرانداز کر دوں؟ میں کیوں نہ اپنے کیسوں کو سیم وزر سے بھرنے کے لئے دولت کے اصلی پیدا کرنے والوں کو ظالمانہ طور سے کچلتا رہوں؟ مختصر لفظوں میں آخر میں کیوں نہ اپنی انفرادی لذت کوشیوں کی قربانگاہ پر تمام اجتماعی فائدے بھینٹ چڑھا دوں؟ یہ اور اسی قسم کے دوسرے بہتیرے سوال ہیں جن کا نہایت ہی قریبی تعلق زندگی سے ہے اور ان کے صحیح جوابات کے حصول ہی پر جو صرف سچے مذہب کی بارگاہ سے مل سکتے ہیں مستقل غایاتِ حیات کی تعیین منحصر ہے۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب تک ان سوالات کے ٹھیک جوابات کی روشنی میں ہمارے عمل کی دنیا تعمیر نہ ہوگی زندگی میں کوئی واقعی معنی پیدا نہ ہو سکیں گے گویا زندگی وہ لفظ رہے گی جو کبھی شرمندۂ مفہوم نہ ہو سکے گی۔ اور وہ زندگی جو معنی وغایت سے محروم ہو انسانیت کی دنیا میں کوئی زندگی ہی نہیں ہے اس کے قدم انسانی ارتقا کے راستہ میں مستقل جوش کے ساتھ اُٹھ ہی نہیں سکتے۔ اس کے آگے بڑھنے کی رفتار بہکی بہکی رہے گی۔ مذہبیت ولا مذہبیت کے اسی اہم نفسی نکتہ (PSYCOLOGICAL POINT) کو غالباً پیش نظر رکھتے ہوئے نظریۂ ارتقا کے بانی ڈارون کے مشہور معاصر ہکسلے نے کہا ہے "لامذہبیت کی دنیا مٹی کی سٹھائی ہے جس کو دو اندھے بچوں (مادہ اور قوت) نے مل کر بنایا ہے" اس حکیمانہ مقولہ کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ لامذہب کی دنیا عقل غایت اندیش کی کار فرمائیوں سے محروم ہوتی ہے۔ اس کے ہنگاموں کا کوئی ماحصل نہیں ہوتا۔ اندھے بے شعور بچوں کی بنائی ہوئی دنیا مٹی کا گھروندا ہی تو ہو سکتی ہے جسے ضابطۂ ترتیب اور معنی وغایت سے کوئی تعلق نہ ہو۔

مذہبی احساس اور بیداری :- یہ مذہب ہی کا معجزہ ہے کہ اس کا احساس جیسے ہی کسی قوم میں بیداری کی کروٹیں لینا شروع کرتا ہے ویسے ہی اس کی رگوں میں بلند حوصلگی کا خون دوڑنے لگتا ہے اور اس کے

دل میں ایثار و قربانی کے جذبے تڑپنے لگتے ہیں۔ اگر غور سے دنیا کے تاریخی صفحے اُلٹے جائیں اور گذشتہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر نظر کی جائے تو شاید سب سے پہلے یہ حقیقت ہی سامنے آئے گی کہ مذہبی احساس کی بیداری نے دفعتاً انھیں اوج عروج پر پہونچا دیا اور اس احساس کے سو جانے نے انھیں حضیض نکبت میں گرا دیا۔ کسی فرد میں کسی قوم میں جب تک سچے مذہب کی روح جاگتی رہتی ہے اس کی زندگی درخشاں ہوتی چلی جاتی ہے لیکن جیسے ہی یہ روح دب جاتی ہے اس کی زندگی پر اضمحلال طاری ہو جاتا ہے۔ اور مختلف گوشوں سے اس کی حدود میں ہلاکت خیز رسمیں اور تباہ کن اوہام داخل ہو جاتے ہیں۔ یہیں سے اس کی بربادی و تباہی کا سامان پیدا ہو جاتا ہے اور حکیمانہ احتیاط ملحوظ نہ رکھنے والے نقادوں کو مذہب پر طنز کا موقع ملتا ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اگر احتیاط کے ساتھ مذہب کی اصلی حدیں پیش نظر رکھی جائیں تو ایسی چیزوں پر جو فکر و نظر اور فعل و عمل میں جمود پیدا کرتی ہیں مذہب کا دعوٰی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ سچے مذہب کو اپنی "علت مادی و علت غائی" کے لحاظ سے ایسے رسوم و اوہام سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے جو ہمارے عنوان غور و انداز فکر کو خطرناک طریقے سے محدود کرتے اور ہمیں معرکہ ہائے عمل میں مردانہ وار حصہ لے سکنے کے لئے نا اہل بناتے ہیں۔

مذہب سے غیر متعلق قومیں ممکن ہے کہ "مذہبی احساس اور ترقی کے لزوم" پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اور تہذیب و شایستگی اس قسم کے دعوے مذہب سے خوش عقیدگی کا نتیجہ ہیں ورنہ ضروری نہیں ہے کہ مذہبی احساس کی بیداری کا نتیجہ قومی و ملی ترقی کی شکل میں ظہور پذیر ہو یا مذہبی احساس کے فقدان کی حالت میں انحطاط لازمی طور پر رونما ہو کیونکہ بہت سی مذہبی احساس رکھنے والی قومیں روز بروز پستی کی طرف جا رہی ہیں اور ان کے برخلاف مذہب سے نا آشنا یا مذہب کو اپنے سعی و عمل کے دایرے سے خارج کر دینے والی قومیں ترقی کی منزلیں طے کرتی چلی جا رہی ہیں۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے یعنی مذہبی احساس رکھنے والی قوموں کا مائل با نحطاط ہونا تو اس کا جواب صاف ہے۔ درحقیقت ان میں صحیح قسم کا مذہبی احساس ہی نہیں ہے جسے مذہبی احساس سمجھا جا رہا ہے وہ "سرابی نوعیت" کی چیز ہے۔ آماس کو فربہی قرار دے لینے کا مغالطہ ہے مذہبی احساس "جاہلانہ کٹرپنے" یا چند اوہام و رسوم سے غلامانہ وابستگی کا نام نہیں ہے۔ مذہبی احساس نام ہے انفرادی و اجتماعی فکر و عمل کے ارتقا کی منزل کی طرف صحیح انسانی راستوں سے جادہ پیما ہونے کی مخلصانہ سعی کا

"حکیمانہ الہیاتی عقائد" کا سہارا لیتے ہوئے کسی مذہبی نظام سے رسمی طور پر اپنی وابستگی کا اعلان بھی مذہبیت نہیں ہے بلکہ اگر سچ پوچھیے تو یہ مذہبیت سے "عملی استہزا" ہے۔ اس پر وہ نتائج مرتب نہیں ہو سکتے جو مذہبیت سے سچی وابستگی کے لئے قدرت کی طرف سے نامزد کیے جا چکے ہیں۔

اب رہی دوسری صورت یعنی مذہب سے ناآشنا یا مذہب کو اپنے سعی وعمل کے دائرے سے خارج کر دینے والے افراد اور قوموں کا ترقی کی منزلیں طے کر لینا تو اس کے متعلق بھی یہ گزارش کی جائے گی کہ ترقی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ زندگی مادی عیش و آسایش کے جھولوں میں ہر وقت بسی رہے۔ طرب ونشاط کے سامان اس کے چاروں طرف مہیا رہیں۔ معتدل حد تک ضروری مادی آسائش کا حاصل ہونا ترقی کے مفہوم میں داخل ہے لیکن اس شرط سے کہ یہ مادی آسایشیں انسانیت کی پاکیزگیوں کی دولت کے لئے غارتگر نہ بن جائیں کہ اس صورت میں قلبی اطمینان اور دماغی سکون کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ اخلاقی زندگی کا صاف ستھرا ہونا دماغ وقلب وروح کی آسایش کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر وہ سیاسی یا اقتصادی ہی کیوں نہ ہو "انسانی اقدار" (HUMAN VALUES) جب تک اثر انداز نہ ہونگے اجتماعی دماغ و قلب وروح کو کرب واضطراب کے تشنج سے نجات نہیں مل سکتی۔ جو افراد یا قومیں مذہبی نظام سے بے نیاز ہو کر ترقی کی منزل کی طرف گامزن نظر آ رہی ہیں انھیں سچی ترقی کی دولت حاصل ہی نہیں ہو رہی ہے۔ ظاہر میں مادی آسایشوں سے وہ ضرور ہمکنار معلوم ہوتی ہیں لیکن چونکہ ان مادی آسایشوں کے حاصل کرنے یا ہونے کے بعد ان کے باقی رکھنے کے لئے خالص مادی ذرائع کا استعمال کیا گیا ہے یا کیا جا رہا ہے اس لئے انھیں نہ تو قلبی اطمینان حاصل ہے اور نہ دماغی سکون۔ ایسی صورت میں اس کیفیت کا نام ترقی نہیں رکھا جا سکتا اور اگر اسے ظاہری حیثیت کی رعایت سے ترقی مان لیا جائے تو پھر یہ عرض کیا جائے گا کہ اگر ایسے افراد یا ایسی اقوام کے دل ودماغ کی اندرونی تہیں "نفسی اصول" کے تحت کریدی جائیں تو کہیں نہ کہیں ان میں مذہب کی چنگاری ضرور موجود ملے گی خواہ وہ زیر خاکستر ہی ہو کر سہی۔ یہی دبی ہوئی چنگاریاں چھپے ہوئے گوشوں سے ان کی زندگی پر اپنا پرتو ڈالتی ہیں اور نتیجہ میں اسی توازن سے ان کی تہذیب وشائستگی جگمگا اٹھتی اور اسی کے تناسب سے ان کے ارتقا کا راستہ روشن ہو جاتا ہے۔ ایثار وقربانی، راست بازی ودیانت داری، جواں مردی وجواں ہمتی وغیرہ کے نفسی فضایل کو زندگی کے صحیح ارتقا سے قریبی تعلق ہے اور مذہب سے مستحکم ارتباط ہی سیرت وکردار کی لوح پر ان اخلاقی سعادتوں کے نقش بٹھاتا ہے اس لیے خدا سے الگ ہو کر اپنی عملی زندگی کے نقشے

میں اخلاقی رنگ بھرنے کے مدعی یا تو اپنے دعوے میں سچے نہیں ہیں یا پھر ظاہری طور پر ان کی زندگی اور اخلاق میں کتنا ہی ارتباط نظر آرہا ہو مگر وہ صرف فریب نظر ہے۔ ان کی زندگی پر سے اخلاق کا ملمع امتحان کی ذرا سی کڑی آنچ میں دور ہو جائے گا اور اگر وہ سچ مچ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو انھیں خود اپنے دل کی گہرائیوں کا پتہ نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بہت سے ارباب نظر کا یہ خیال ہے کہ ان اخلاقی سعادتوں کی طرف میلان انسانی فطرت میں موجود ہی مذہب سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ "ماڈرن اسلام ان انڈیا" کے وسیع النظر مصنف نے اسی نظریہ پر زور دیا ہے مگر غور کی نگاہ کو تو یہ صرف دھوکا معلوم ہوتا ہے آخر مذہب سے اسے کیوں واسطہ نہیں؟ مذہب کی طرف میلان بھی تو انسانی فطرت میں موجود ہے "کل مولود یولد علی الفطرۃ ای فطرۃ الاسلام ثم ابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ" ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے اس کے والدین (یعنی ماحول و وراثت) اسے یہودی بناتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی۔ دوسرے لفظوں میں اس قسم کی اخلاقی سچائیاں مذہب سے مغایر نہیں ہیں۔ اب جو افراد یا اقوام مذہب سے بے نیازی کے مدعی ہیں مگر ان اخلاقی فضائل کے سرمایہ کے مالک ہیں تو یہ نتیجہ ہے اسی فطری میلان کا جو مذہب کی طرف موجود ہے یا پھر "ارثی اثرات اور ماحولی تعلقات" کی وجہ سے انھوں نے انھیں جذب کر لیا ہے۔ "لامذہبیت" کو یقینی طور سے اس فرد یا قوم کے ارتقائی منازل طے کرانے میں کوئی دخل نہیں ہے۔

لامذہبیت کی تخریبی حیثیت

لامذہبیت اپنی ذات کے لحاظ سے بالکل تخریبی چیز ہے اس کے عام نقطۂ نظر کی حیثیت منفی (NEGATIVE) ہے۔ لامذہبیت کے مرکزی عناصر صرف چند انکار ہیں (۱) خدا کے وجود کا انکار (۲) انسانی روح کا انکار (۳) دنیا میں کسی غرض و غایت کے وجود کا انکار۔ لامذہبیت انھیں "چند انکاروں" کے محور پر چکر لگاتی رہتی ہے۔ ایسی صورت میں "نفسی حقیقت" کے لحاظ سے وہ کسی اثباتی و ایجابی (POSITIVE) پہلو کی مالک ہی کیونکر ہو سکتی ہے اور اسے انسانی زندگی کی تعمیر سے کوئی خاص ربط کیا ہو سکتا ہے؟ چند انکاروں کے مجموعہ سے جس میں غیر مربوط ضمیمہ کے طور پر مذہب کے خزانہ سے کچھ مستعار لی ہوئی سچائیاں بھی شامل ہو جائیں یا شامل کر لی جائیں زندگی مستقل طور پر با غایت اور بامعنی نہیں بن سکتی۔

لامذہبیت کی تخریبی حیثیت اس امر پر نظر کرنے سے بھی واضح ہوتی ہے کہ جس شخص کو یہ آزار لگ جاتا ہے اس کے اطمینان و سکون کی دنیا تہ و بالا رہتی ہے۔ ایک اتھاہ سمندر میں ایک کشتی پر بلا کسی غرض و غایت کے بیٹھے ہوئے چلے جانے کا تخیل تسلی بخش اور اطمینان آفریں ہو ہی کیونکر سکتا ہے۔

لامذہبیت کی سکون دشمنی کے متعلق چند سائینس دانوں کی شہادتیں | گزشتہ صدی نے انگلستان میں دو مشہور سائینس داں پیدا کیے تھے جو بعد میں بالکل ہی لامذہب ہو گئے تھے۔ ایک کا نام ہے کنگسلورڈ کلیفرڈ اور دوسرے کا نام ہے جارج رومینس۔ ان دونوں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے اقرار سے دستکش ہو جانے کے بعد ان کے دماغی و قلبی تحیر و اضطراب کا کیا عالم تھا۔

کلیفرڈ کہتا ہے "مذہب کا عقیدہ اپنے ماننے والوں کے لیے اطمینان اور تسلی کا سرمایہ ہوتا ہے اور اس سے محرومی بہت ہی تکلیف دہ محرومی ہے"۔ پروفیسر رومینس نے فزیکس (PHYSICUS) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو لامذہبیت کی حمایت میں اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ فاضل سائینس داں اسی کتاب کے آخر میں لکھتا ہے "وجود خدا کے ابطال کے بعد یہ دنیا عام محبوبیتوں سے الگ ہو جاتی ہے۔ میں جب اپنی اس لامذہبیت کی کیفیت کا مقابلہ اپنی پرانی مذہبیت سے کرتا ہوں تو حد سے زیادہ اذیت اور تکلیف محسوس ہوتی ہے"۔

جوزف ووکرچ بھی خدا کے انکار میں بہت زیادہ بیباک واقع ہوا تھا وہ ایک جگہ کہتا ہے "جب اس نے مذہبی خیالات سے دست برداری کی ہے تو اسے بہت زیادہ ذہنی کوفت اور دلی کرب کا سامنا کرنا پڑا اور اخلاقیات کے متعلق تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا" ان کھلے ہوئے اقراروں سے واضح ہو جاتا ہے کہ لامذہبیت انسان کی "صحت مندانہ نفسیاتی کیفیات" کے لیے سم قاتل ہے اور یہ کہ اخلاقیات کے متعلق مایوسی لامذہبیت کا ایک ناگزیر نتیجہ ہے۔ ایسی صورت میں انسانی زندگی کے تعمیری ارتقا میں لامذہبیت سی تخریبی سکون دشمن چیز کو موثر قرار دے سکنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ شاذ و نادر طور سے بعض لامذہب افراد یا لامذہب جماعتوں میں خوش کرداری اور پاکیزہ سیرتی کی جو خصوصیت دکھائی دے جاتی ہے اس کا چشمہ لامذہبیت کے منبع سے نہیں پھوٹتا ہے بلکہ مذہبیت ہی کے منبع سے جو نفس ہی کے کسی گوشہ میں چھپا ہوا ہوتا ہے ان فضایل کا چشمہ پھوٹتا ہے۔

لامذہبیت کی فضا میں سانس لینے والوں کی تو دنیا ہی دوسری ہو جاتی ہے۔ اخلاقی زندگی کا اس میں کوئی بھاؤ نہیں رہتا۔ ایثار و قربانی کا چہرہ یہاں بالکل ہی زرد بے رونق اور پھیکا پڑ جاتا ہے عہد و پیمان کا پاس یہاں احمقی کا دوسرا نام ہو جاتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ انصاف کرنا یہاں بزدلی کا نشان بن جاتا ہے "کھاؤ پیو خوش رہو نہ ہے انداز" (EAT, DRINK AND BE MERRY) ہی کا چرچا

اس دنیا میں رہتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ جب ہمیں اپنے اعمال کی کہیں جواب دہی نہیں کرنا ہے تو پھر کیوں نہ ہم مزے کریں اور خواہ مخواہ اخلاقی پاسداری کی خاطر تکلیفیں جھیلیں؟ عیش و عشرت کے بہار بدوش چمنستان سامنے ہوں اور ہم چند موہومی دیانتی قانونوں کی خاطر آنکھیں بند کیے ہوئے آگے بڑھ جائیں اور ہمیں حسن اتفاق سے اس جنتِ دنیا میں جو چند لمحات نشاط میسر ہو رہے تھے انھیں نقد نہ کرلیں یہ کون سی دانائی کی بات ہے؟

لارڈ لوتھین نے غالباً ۱۹۳۶ء میں علی گڈھ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے موقع پر اپنا بصیرت افروز فاضلانہ خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا تھا "بچوں کی طرح بہت سے مغرب کے باشندے رفتار اخبار اور حواس خمسہ کی لذتوں میں اتنے منہمک ہیں کہ وہ نہ صرف سادہ زندگی کی صلاحیتوں سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ انھیں غیر محدود ابدی و سرمدی ذات سے کوئی عملی تعلق ہی باقی نہیں رہا ہے۔ مذہب جو انسان کا واقعی رہنما ہے اور جو انسان کی زندگی میں شرافت اور اخلاقی غایت پیدا کرنے کا ایک وسیلہ ہے اس کے اثر و نفوذ میں زوال و انحطاط ہی اس کی فی الجملہ توضیح کرتا ہے کہ مغربی دنیا اس طرف کیوں ان سیاسی نظریات کی معتقد ہوتی چلی جا رہی ہے جن کی بنیاد قوم و نسل کی تفریقات پر ہے یا پھر وہ کیوں سائنس کی اس شکل پر عقیدہ رکھ رہی ہے جو مسلم طور پر انسان کو مادی حیثیت سے ترقی دینا چاہتی اور زندگی کو پیچیدہ اور مسرفانہ بناتی چلی جاتی ہے"

لارڈ لوتھین کے اس ارشاد سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مذہب سے جو زندگی بیگانہ ہو جاتی ہے اس کا عمومی رجحان کیا ہوتا ہے؟ اور پھر یہ کہ تمام مذکورۂ صدر خرابیاں مذہب ہی کے وسیلہ سے دور ہو سکتی ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض قلوب میں یہ شبہ پیدا ہو رہا ہو کہ سائنس دانوں کی جو شہادتیں اوپر پیش کی گئی ہیں ان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب سے علیحدگی کے بعد انھیں سکون قلب میسر نہ ہوا یا اس سے الگ ہوتے وقت انھیں سخت کرب اور کوفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن صرف اتنی بات کے اقرار سے مذہبی حقائق کی سچائی کا ثبوت تو نہیں ملتا۔ موروثی عقاید سے علیحدگی ہمیشہ "نفسی خلجان" کا باعث ہوتی ہی ہے اس شبہ کے جواب میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہ تو سچ ہے ان سائنس دانوں کی شہادت سے خدا کے وجود اور اس سے متعلق دوسری چیزوں پر کوئی برہان عقلی قائم نہیں ہوتا مگر اس مقالہ کا یہ مقصد بھی نہیں کہ خدا کے وجود اور اس کے دوسرے متعلقات پر کوئی منطقی برہان قائم کیا جائے۔ اس کے لیے

دوسرے مستقل دلائل ہیں جن کا بالفعل یہاں تذکرہ مقصود نہیں۔ اس مقام پر صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ مذہب سے علیحدگی انسانی ارتقاء کے راستہ میں کانٹے بچھا دیتی ہے کیونکہ اس سے انسان کی نفسی دنیا تلپٹ ہو جاتی ہے۔ سکون دماغ کی نعمت اس سے بالکل ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اطمینان قلب کا ذرا سا حصہ بھی اس کے پاس نہیں رہتا ہے ظاہر ہے کہ یہ صورت حال بہت ہی تباہ کن ہے اور ترقی کے راستہ میں کانٹے بچھانے والی۔ سائنس دانوں کی جو شہادتیں اوپر پیش کی گئی ہیں اُن سے اتنی بات بہر حال ثابت ہو جاتی ہے وھو المراد۔ اب رہا یہ امر کہ ہر موروثی خیال سے علیحدگی کے بعد یہ خلجانی کیفیت رونما ہوتی ہے تو اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے ایسے موروثی خیالات ہوتے ہیں جن سے علیحدگی کے بعد تو اور اطمینان کی دولت مل جاتی ہے۔ توہمات خواہ وہ کتنے ہی موروثی ہوں لیکن علم کی روشنی میں جب کسی کے نزدیک ان کی کوئی حقیقت نہیں رہتی تو ان کے انکار سے اُسے ذرا بھی خلجان لاحق نہیں ہوتا بلکہ سکون مل جاتا ہے۔ اسی طرح "لا مذہبیت" سے "مذہبیت" کی طرف جو لوگ آتے ہیں انھیں بھی اطمینان قلب و سکون دماغ حاصل ہوتا ہے۔ اس خصوص میں جتنی شہادتیں ملیں گی اس کے موافق ہی ملیں گی۔ اس سے یہ بات صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ مذہب سے انحراف کی نوعیت اور خیالات سے انحراف کے مقابلہ میں بالکل ہی دوسری ہے۔

انسانی فطرت میں مذہب کا رسوخ

نظر بالا یہ ادعا بالکل حق بجانب ہے کہ مذہبیت انسانی فطرت کے خمیر میں شامل ہے۔ اسی لیے اس سے انحراف نفسی کرب و روحانی ایذا کا باعث ہوتا۔ یہاں بھی اور اس سے پہلے بھی اجمالاً اس کا ذکر آ گیا ہے کہ مذہب انسانی فطرت میں داخل ہے بیجا نہ ہوگا اگر موقع کی مناسبت سے اس کی فی الجملہ تفصیل کر دی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب سے وابستگی کسی نہ کسی شکل میں انسانی فطرت کا جزو ہے۔ ممکن ہے کبھی یہ وابستگی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے لیکن اس کا یہ اوجھل ہونا بہت ہی عارضی چیز ہے۔ لیکی نے اپنی مشہور کتاب ہسٹری آف یوروپین مارلس (تاریخ اخلاقیات یورپ) کی پہلی جلد میں لکھا ہے "ان سب سے بالاتر اور قوی تر سبب نفس انسان کا ایک نہ مٹنے والا جذبہ ہوا۔ وہ کون جذبہ؟ مذہب کا جذبہ۔ مذہبیت انسان کی جبلت میں انسان کی سرشت میں انسان کے خمیر میں داخل ہے تاریخ گواہ ہے کہ اس کے برگ و بار بارہا کاٹے گئے لیکن اس کی جڑ جوں کی توں قائم رہی بلکہ میرے نزدیک تو مذہب کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ یہ جذبہ ہماری ہستی کا ویسا ہی نہ جدا ہو سکنے والا جزو ہے جیسے ہمارا جسم اور ہمارے قوے۔ رواقیین نے (جو اس حیثیت سے

ہمارے معاصرین میں کینٹ کے فلسفۂ حس کے متبعین سے بہت کچھ مشابہ کہے جا سکتے ہیں) یہ کوشش کی کہ انسان کی توجہ مذہب و الٰہیات کے مباحث سے ہٹا کر تمام تر اخلاقی مسائل پر مصروف رکھیں۔ یہ کوشش زیادہ دنوں تک چلنے والی نہ تھی۔ کچھ روز تو مذہب سے بے اعتنائی رہی لیکن جبلت کے نقش کون مٹا سکتا ہے؟ جذبۂ مذہبیت اُچھلا اور اس زور کے ساتھ اچھلا کہ الحاد و انکار و تشکیک و تغافل سب کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ پہلی صدی عیسوی تک تو مذہب سے بے اعتنائی رہی لیکن اس کے بعد انکار کی جگہ اعتقاد نے لینا شروع کی۔ حکومت نے اس کی روک تھام کرنا چاہی مگر مذہب کی قوت کے آگے کچھ نہ چل سکی۔ بالآخر خود حکومت اس کی تائید پر آمادہ ہو گئی"

لیکی نے مذہب کے متعلق سطور بالا میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ مذہب سے کوئی قوم دستکش ہونے کی کتنی ہی کوشش کرے مگر اس سے مستقل طور پر الگ نہیں ہو سکتی۔ جو چیز سرشت میں داخل ہے اس سے علیحدگی ممکن ہی کیونکر ہے؟ جرمنی کے مشہور نفسی ماہر پروفیسر اسپرانگر نے بھی لیکی ہی کی رائے سے ملتی جلتی ہوئی رائے ظاہر کی ہے وہ کہتے ہیں "مذہبی احساس کسی شخص کے ارتقائے نفس میں ایک ہلکی سی لہر کی طرح ساتھ رہتا ہے۔ کسی کے یہاں زلزلہ اور طوفان اُٹھاتا ہے کسی کے دل میں اس طرح رہتا ہے کہ اس کی گہرائی یا سطحیت کا شعور تک نہیں ہوتا لیکن ہر صورت میں زندگی کا آغاز و انجام یہی ہے" مذہب کی اس خصوصیت پر نظر کرتے ہوئے مجھے اس کا یقین ہے کہ آج جو قومیں مذہب سے الگ دکھائی دیتی ہیں کل ان کی صورت حال یہ نہ ہو گی۔ اس کا ردِّعمل بہت جلد ہو گا وہ دن دور نہیں ہے جب اشتراکیت کی انتہا پسندانہ شکل بھی اپنی ملحدانہ حیثیت کو خیرباد کہہ کر مذہب کا دامن تلاش کرنے لگے گی شعور ابتدائیہ روس میں اس ذہنی تغیر کے ہلکے ہلکے آثار ظاہر ہونا بھی شروع ہو گئے ہیں۔

مارکس و لینن کے پیرو حیات انسانی کے مادی تصور میں گُم رہیں اور یہی کہے جائیں کہ اس دنیا کے حالات کی توجیہ و تشریح کے لئے کسی ماوراء عقل چیز کے ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ سچا مذہب بھی یہ نہیں کہتا کہ مادی دنیا کے حالات و واقعات کی توجیہ میں "مادی علل و اسباب" نظر انداز کیے جائیں اس کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ یہاں کے مادی حالات و کیفیات مادی اسباب و علل ہی کا نتیجہ ہیں اور ہمیں اپنی مادی فارغ البالی کے لیے مادی اسباب سے کام لینے کی ضرورت ہے البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مذہب صرف اپنے کو اس مادیت ہی کا پابند بنانا نہیں چاہتا ہے۔ وہ "الٰہیاتی و نفسی وجوہ" کی بنا پر ایک "ماوراء طبیعت ہستی" یقیناً مانتا ہے اور اس میں شک بھی نہیں کہ ایسا عقیدہ اس دنیا میں انسانی حیثیت سے ایک کارآمد فرد ایک کارآمد جماعت بننے کے لیے ضروری بھی ہے کیونکہ اس کا سہارا لیے بغیر یا اسے پس نظر میں رکھے بغیر سیاسیات و اقتصادیات وغیرہ کسی شعبہ میں بھی باہمی عدل و انصاف کا تصور عمل پذیر نہیں ہو سکتا۔

آنکھوں کی سوئیاں

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

ہندوستان کی کہانیاں اپنے اندر بڑی بڑی حقیقتیں رکھتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے حکیموں نے زندگی کے بڑے بڑے فلسفوں کے عام فہم اور دل چسپ ترجمے کر دیے ہیں یا خشک حقیقتوں کو چلتی پھرتی زندگی میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے، ہم ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی مدد سے زندگی کے بہت سے حقائق کو ذہن کی گرفت میں لا سکتے ہیں۔

بچپن میں ہم نے جو کہانیاں سنی تھیں اور دماغ کی سلوٹوں میں کہیں چھپی ہوئی رہ گئیں ان میں سے کوئی ایسی کہانی ہوتی تھی جس میں کسی مظلوم عورت کی داستان درد بیان کی گئی تھی جس کے سارے جسم میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں اس کی دشمن سارے دن اس کی سوئیاں نکالتی تھی لیکن آنکھوں کی سوئیاں قصداً چھوڑ دیتی تھی اور رات ہو جاتی تھی دوسرے دن پھر نئی سوئیاں چبھ جاتی تھیں اور پھر وہ سوئیاں نکالتی تھی، لیکن آنکھوں کی سوئیاں چھوڑ دیتی تھی ہم کو کہانی کے صرف اتنے ہی حصہ سے غرض ہے۔

آپ غور کریں گے تو مظلوم انسانیت کے ساتھ زمانہ دراز سے یہی معاملہ درپیش ہے اس کا سارا جسم سوئیوں سے چھلنی ہو رہا ہے جسم کے ہر حصہ میں ظالم سوئیاں چبھ رہی ہیں کچھ ہمدرد ہاتھ اس کی یہ سوئیاں نکالنے کے لئے بڑھتے ہیں لیکن ہر مرتبہ آنکھوں کی سوئیاں چھوڑ دیتے ہیں اور اس کی نجات کا کام ناتمام رہ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے روز وہ اسی طرح مجروح اور مبتلا نظر آتی ہے اور از سر نو محنت کرنی پڑتی ہے۔

انسانیت ایک مکمل انسانی جسم اور وجود کی نمائندہ ہے وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کی جامع ہے اس کے ساتھ جسم بھی ہے پیٹ بھی ہے دل بھی ہے دماغ بھی ہے روح بھی ہے ان تمام حصوں کے کے ساتھ کچھ مصائب اور آلام بھی ہیں یہ اس کے جسم کی سوئیاں ہیں جو اس کو زار و نزار کئے ہوئے ہیں۔

بھوک فاقہ اچھی اور صحیح غذا کا نہ ملنا یہ پیٹ کی سوئیاں ہیں یقیناً ان سے انسانیت کو تکلیف اور دکھ پہونچتا ہے، عالم انسانیت کی یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے اور زندگی کا یہ بڑا شرمناک پہلو ہے کہ قدرت کی فیاضیوں اور غذائی سامان کی پوری فراوانی کے باوجود چند انسانوں کے ناجائز تصرف یا کسی نظام سلطنت کے جابرانہ طرز عمل سے انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو پیٹ بھر روٹی میسر نہ ہو اور وہ اپنے فطری حق اور ضروری سامان زندگی سے محروم رہے اس پر غم وغصہ اضطراب واحتجاج، اس صورت حال کے خلاف جدوجہد ایک قدرتی امر اور صحیح انسانی احساس ہے جس پر تعجب یا ملامت کا کوئی موقع نہیں۔

انسان جسم رکھتا ہے اس جسم کو ٹھنڈک اور گرمی کا احساس دیا گیا ہے اور لباس کی طلب بخشی گئی ہے اس طلب کو پورا کرنے کے لئے زمین پر پورے انصاف اور ضرورت کے مطابق لباس پیدا کرنے والی چیزیں اور لباس تیار کرنے والے ہاتھ پیدا کیے گئے ہیں پھر بڑی بے انصافی ہے کہ چند آدمیوں کے زائد لباس استعمال کرنے یا بکسوں میں بند کر کے رکھنے یا بے جان دیواروں کو جاندار انسانوں کے کام آنے والا کپڑا اڑھانے کی وجہ سے انسان سردی سے ٹھٹھر کر مر جائیں یا ان کو ستر پوشی کے لئے بھی کپڑا نہ ملے۔

انسان دل رکھتا ہے اس کی کچھ جائز خواہشات ہیں ان کا نہ پورا ہونا بڑی زیادتی اور ظلم ہے۔ وہ دماغ رکھتا ہے اس کا علم سے محروم اور دماغی ترقی اور صحیح قوت فکر سے دور رہنا نا انصافی اور نظام زندگی کا نقص ہے اور اس نقص کو دور کرنا ایک حساس انسان اور ایک صحیح الاحساس جماعت کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے۔

انسانی تہذیب وتمدن کو پھلنے پھولنے اور انسانوں کی روحانی ذہنی اور جسمانی طاقتوں کو متوازن نشوونما حاصل کرنے کے بہترین مواقع جب حاصل ہوتے ہیں جب ان کے راستہ میں کوئی جابر قوت حائل نہ ہو عموماً دیکھا گیا ہے کہ غیر ملکی حکومت وسائل زندگی پر قبضہ کر لیتی ہے اور ان کی تقسیم کا کام اپنے غیر ہمدرد اور ناانصاف ہاتھوں میں لے لیتی ہے اس کے اقتدار میں محکوم قوم کے جائز جذبات بھی افسردہ اور اس کی ذہانت کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے وطن میں جیل کے قیدیوں کی طرح زندگی گزارتی ہے اس لئے غلامی بھی انسانیت کے لئے ایک بڑی مصیبت اور ... زندگی کے حقیقی لطف سے متمتع ہونے کے لئے شرط ہے۔

اس لئے ... فاقہ کشی ... وہ سوئیاں ہیں جو انسانیت کو ... چبھتی رہتی ہیں ان کا دور کرنا ایک بڑی ... خدمت ہے۔

لیکن کیا اس دکھی انسانیت کے سارے دکھ اور روگ یہی ہیں اور یہی اس کے جسم کی سوئیاں ہیں ان سوئیوں کے نکلتے ہی اس کو دل کا سکون، جسم کا آرام اور سکھ کی نیند نصیب ہو جائے گی؟ اور اس کی آنکھ کی کھٹک اور دل کی خلش دور ہو جائے گی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت کی مصیبت اسی پر ختم نہیں ہوتی کہ ہر شخص کو پیٹ بھر کر روٹی، ضرورت بھر کا کپڑا، جائز خواہشات کی تکمیل کا سامان اور تعلیم کے مواقع حاصل ہو جائیں، اس کے جسم میں کچھ اور بھی زہر کی بجھی ہوئی سوئیاں ہیں جو اسکو اندر اندر گھلاتی رہتی ہیں اور ایسی سوسائٹی جس کو زندگی میں اپنی منھ مانگی مراد مل چکی ہو ان زہر کی بجھی ہوئی سوئیوں کی وجہ سے ہر وقت کراہتی تڑپتی اور اندر اندر سے گھلتی رہتی ہے۔

انسان اس پر بس نہیں کرتا کہ اس کو پیٹ بھر کر کھانا اور اپنی اور اپنے بچوں اور متعلقین کی ضرورت کا کپڑا اور سامان زندگی حاصل ہو گیا ہے، اس کے اندر اس فطری پیٹ کے علاوہ ایک اور مصنوعی پیٹ پیدا ہو جاتا ہے وہ حرص و ہوس کا پیٹ ہے جو جہنم کی طرح ھل من مزید (کچھ اور ہے) ہی پکارتا رہتا ہے اس کو روپیہ سے صرف اسی لئے نہیں کہ وہ ضروریات زندگی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے بلکہ بغیر کسی مقصد کے ذاتی محبت و عشق ہو جاتا ہے اور اس کو کوئی بڑی سے بڑی مقدار تسکین نہیں دے سکتی، دولت کے اس ذاتی عشق کی وجہ سے وہ ہر مجرمانہ فعل کا بے تکلف ارتکاب کرتا ہے رشوت ستانی، چور بازاری نفع اندوزی اس ذہنیت اور مزاج کے ادنےٰ کرشمے ہیں۔

اگر دنیا کی اخلاقی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور تعصبات سے الگ ہو کر بدنظمیوں بے عنوانیوں اور شہری زندگی کے مشکلات کے حقیقی اسباب تلاش کئے جائیں تو ان کی تہ میں جائز انسانی خواہشات اور حقیقی ضروریات کا ہاتھ کم ملے گا ان کی تہ میں عموماً ناجائز خواہشات اور فرضی ضروریات نکلیں گی انہی ناجائز خواہشات اور فرضی ضروریات نے ہر زمانہ میں شہری زندگی میں نئی نئی الجھنیں اور ہر نظام حکومت کے لئے نئے نئے مشکلات پیدا کئے ہیں، انھیں فرضی ضروریات نے لوگوں کو مظالم، بددیانتی، غبن، استحصال بالجبر رشوت خوری سٹہ بازی، ذخیرہ اندوزی، فریب دہی پر آمادہ کیا اور ان کے اثر سے پورے پورے ملک اور بڑی بڑی حکومتیں "اندھیر نگری چوپٹ راج" بن کر رہ گئیں۔

آج بھی اگر موجودہ مشکلات اور شکایات کی تحقیق کی جائے گی تو صاف نظر آئے گا کہ موجودہ پریشانی اور بے اطمینانی کا سبب یہ نہیں ہے کہ ملک کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد یا اکثریت کو ضروریات زندگی

میسر نہیں اور اس کی جائز خواہشات پوری نہیں ہوتیں اور اس ملک میں بھوکوں اور ننگوں کی زیادتی ہے!
انصاف سے اگر دیکھا جائے تو ان بھوکوں اور ننگوں نے کسی کی عافیت تنگ نہیں کی ہے، عافیت ان لوگوں نے تنگ کی ہے جن کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں، لیکن ان کا دل دولت سے کسی طرح نہیں بھرتا
حقیقی ضروریات کا نام بدنام ہے ان کی فہرست کچھ طویل نہیں، ساری خرابی فرضی ضروریات نے پیدا کی ہے جن کی فہرست ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے اور کبھی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ پورے محلہ اور کبھی پورے شہر کی دولت ایک فرد کے لئے کافی نہیں ہوتی۔

آج یہ ہوش ربا گرانی، اشیاء کی نایابی اور افراط زر کیوں ہے، کیا اس لئے کہ اہل ملک کی اکثریت بھوکی اور ننگی ہے؟ ظاہر ہے کہ صرف اس لئے کہ دولت کی ہوس بہت بڑھ گئی ہے، زیادہ اور جلد سے جلد دولت مند بننے کا شوق جنون کی حد تک پہونچ گیا ہے، قناعت زندگی سے مفقود ہو چکی ہے، فخر، ریاکاری جاہ طلبی، نمائش شہرت کے خمیر میں داخل ہو چکی ہے۔

آج جس چیز نے زندگی کو عذاب اور دنیا کو دارالعذاب بنا رکھا ہے اور جس سے ہر موڑ پر سابقہ ہے وہ بڑھی ہوئی رشوت ستانی، چور بازاری اور ظالمانہ نفع خوری ہے، لیکن کیا ان جرائم کا ارتکاب بھوک، فاقہ کشی اور برہنگی کی مجبوری سے کیا جاتا ہے یہ تو اسی طبقہ کے حرکات ہیں جس کو اپنی خوراک سے زیادہ غلہ، اپنے حصہ سے زائد کپڑا اور اپنی ضرورت سے فاضل سامان زندگی حاصل ہے ہزاروں مجرمین میں ایک بھی نان شبینہ کا محتاج اور سردی سے ٹھٹھرنے والا انسان نہیں ملے گا یہ متوسط اور دولت مند طبقہ کے اعمال ہیں جس کے پاس ضروریات زندگی میں سے کوئی چیز کم اور ارتکاب جرم کے لئے کوئی مجبوری نہیں ہے
حقیقت میں انسانوں کی فطری اور واجبی ضروریات کا معاملہ کچھ مشکل نہیں، یہ بالکل ممکن ہے، ایک ملک میں ہر شخص کو پیٹ بھر کر کھانا ضرورت کا کپڑا اور سامان زندگی میسر ہو جائے، لیکن کیا دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی حکومت اور بہتر سے بہتر نظام کسی مختصر سے مختصر آبادی کے لئے بھی اس کی فرضی ضروریات مہیا کر سکتا ہے اور کسی ایک انسان کے بھی مصنوعی پیٹ کو بھر سکتا ہے جس کی جھوٹی بھوک (اشتہار کاذب) سارے انسانوں کا رزق کھا کر بھی نہیں مٹتی؟ پھر جب سوال حقیقی ضروریات کا نہیں بلکہ فرضی ضروریات کا ہے اور مرض اشتہاء صادق نہیں، بلکہ اشتہاء کاذب ہے تو کوئی ایسا معاشی فلسفہ یا اقتصادی نظام جو سوسائٹی کے ضمیر کو نہیں بدلتا جو صرف انسانوں کے پیٹ بھرنے اور ان کا تن ڈھکنے کی ذمہ داری لیتا ہے اور جو مادی

احساس میں اعتدال پیدا کرنے کے بجائے اشتعال پیدا کرتا ہے، کیا کسی سوسائٹی کو بھی اندرونی طور پر مطمئن کر سکتا ہے اور زندگی کو موجودہ مشکلات سے نجات دے سکتا ہے؟

غور سے دیکھا جائے تو رشوت ستانی، چور بازاری، حد سے زیادہ نفع خوری اور اخلاقی جرائم اصل پیچیدگیاں نہیں ہیں، اصل پیچیدگی وہ ذہنیت اور مزاج ہے جو ان بداخلاقیوں اور بے اصولیوں پر آمادہ کرتا ہے جب تک اس مزاج میں تبدیلی نہ ہو ان خرابیوں کا مستقل سدباب نہیں ہو سکتا اگر ایک دروازہ بند کیا جائے گا تو دس دروازے کھل جائیں گے انسانی ذہن اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بہت سے چور دروازے رکھتا ہے اگر اس میں کوئی گہری تبدیلی نہ ہو تو اسکا راستہ روک کر کوئی عاجز نہیں کر سکتا اس کو اپنی مطلب برآری کے لئے بہت سی تدبیریں اور حیلے آتے ہیں وہ ان سے اپنا مطلب نکال لے گا

موجودہ زندگی کی اصل خرابی یہ ہی کہ پوری سوسائٹی کا ضمیر خود غرض اور مطلب پرست بن گیا ہی اس کا ایک فرد اپنی غرض کے لئے بے تکلف بڑی سے بڑی بے اصولی کا ارتکاب کر لیتا ہے، اگر وہ کسی شعبہ کا امین بنایا جاتا ہے تو اس کو خیانت میں باک نہیں، اگر کسی قومی ادارہ کا رکن منتخب ہوتا ہے تو اس کو اپنے حقیر فائدہ کے لئے بڑے سے بڑے قومی و جماعتی فوائد کو پامال کرنے اور دوسروں کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر آباد کرنے میں عذر نہیں، اگر وہ ماتحت ہے تو کام چور، سست کار اور احساس فرض سے عاری ہے وہ اپنے کسی متوقع فائدہ یا کسی ذاتی رنجش کی بنا پر ایک گھنٹہ کے کام میں بآسانی ایک مہینہ لگا سکتا ہے اور آسان سے آسان معاملہ کو برسوں الجھا سکتا ہے اور اس طرح سے اپنے ذاتی فوائد کے لئے نظام حکومت کو ناکام یا بدنام کر سکتا ہے، اگر وہ صاحب اختیار ہے تو اعزہ نوازی، احباب پروری، بے جا پاسداری اور شخصی یا خاندانی فوائد کی بنا پر صریح بے اصولی کا ارتکاب کر کے ملک و قوم کو نقصان پہونچاتا ہے اگر تاجر ہے تو دولت میں غیر ضروری اضافہ کرنے کے لئے چور بازاری اور ناجائز نفع خوری کر کے لاکھوں غریبوں کو پیٹ کی مار مارتا ہی اور روزانہ دانہ کو ترساتا ہے، اگر وہ روپیہ کا کاروبار کرتا ہے تو سود خواری اور مہاجنی کے ذریعہ صد ہا عزیبوں کا بال بال قرض میں جکڑ دیتا ہے اور ان کو پیسہ پیسہ کا محتاج بنا دیتا ہے۔

افراد سے بڑھ کر جماعتوں اور پوری پوری قوموں پر خود مطلبی اور خود غرضی کا شیطان مسلط ہو گیا ہے۔ سیاسی جماعتیں جماعتی خود غرضی اور خود بینی میں مبتلا ہیں، یورپ اور امریکہ کی جمہوریتوں پر قومی خود غرضی کا بھوت سوار ہے، جس کے پاؤں کے نیچے چھوٹی اور کمزور قومیں سبزہ کی طرح پامال ہوتی رہتی ہیں۔ انہی قومی خود غرضی

نے ساری دنیا کو تجارت کی منڈی یا لوہار کی بھٹی بنا رکھا ہے اور ساری زمین کو ایک وسیع میدان جنگ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسی قومی خودغرضی کی خاطر بڑی سے بڑی بے اصولی اور بے آئینی روا ہے اسی کے ادنیٰ اشارے پر لاکھوں بے گناہ انسانوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، بھیڑ بکریوں کی طرح ایک قوم کو دوسری قوم کے ہاتھ بیچ ڈالا جاتا ہے، متحد ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں، یورپ کی اسی قومی خودغرضی نے پہلے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھاڑا اور "کل عرب سلطنت" کا خواب دکھایا، پھر اسی خودغرضی نے شام جیسے چھوٹے ملک میں چار مستقل حکومتیں قائم کیں، پھر اسی نے یہودیوں کو "وطن الیہود" کا سبز باغ دکھایا، آج بھی فلسطین میں جو کچھ ہو رہا ہے اور اس کی گتھی جس طرح الجھتی جا رہی ہے وہ محض امریکہ، برطانیہ اور روس کی قومی خودغرضی کا نتیجہ ہے ہندوستان میں سو برس سے جو کچھ ہوتا رہا ہے اور پھر آخر میں جس طرح اس امن پسند ملک کو قتل گاہ بنا کر چھوڑا گیا ہے وہ یا تو برطانیہ کی براہ راست قومی خودغرضی کا کرشمہ ہے یا اس کی پیدا کی ہوئی اس بدترین قومی خودغرضی کا جس کا زہر یہاں کی آبادی کے جسم میں سو برس تک سرایت کرتا رہا ہے، مغربی تہذیب اور مغربی سیاست کی لائی ہوئی اس قومی خودغرضی نے ۱۹۴۷ء میں یہاں کے لوگوں کو اتنا اندھا اور دیوانہ بنا دیا کہ ان سے وہ غیر انسانی افعال صادر ہوئے جن کی نسبت سے چوپایوں اور درندوں کو بھی شرم آئے گی اور آدم خور وحشیوں کی گردن شرم سے جھک جائے گی، اور زمانۂ آئندہ کا مورخ ان واقعات کی تصدیق میں سخت پس و پیش کرے گا۔

• پھر اس خودغرضی نے ساری دنیا میں اور ملک کے تمام طبقوں میں ایک مخصوص مزاج پیدا کر دیا ہے جس کا خاصہ ہے کہ انسان اپنے حقوق کے مطالبہ میں بڑا مستعد ہے اور فرائض و حقوق کے ادا کرنے میں سخت کوتاہ اور حیلہ جو، اس ذہنیت اور سیرت نے ساری دنیا میں انفرادی، جماعتی اور طبقاتی کشمکش برپا کر دی ہے ہر شخص اپنا حق مانگتا ہے اور دوسرے کا حق ادا کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اگر دنیا پر نظر ڈالی جائے تو ساری دنیا حقوق طلبوں کی ایک آبادی نظر آئے گی جس میں حق طلبی کا نعرہ تو ہر زبان پر ہے لیکن ادائے فرض کا احساس کسی دل میں نہیں، جس آبادی میں ہر شخص حق طلب ہو لیکن فرض شناس کوئی نہ ہو وہاں کی زندگی کی الجھنوں اور دقتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور وہاں کی کشمکش کو کوئی انسانی تدبیر یا تنظیم دور نہیں کر سکتی۔

ہم اس خودغرضی پر خواہ کتنے چیں بجبیں ہوں اور اس سے ہمیں خود اپنی روزمرہ کی زندگی میں خواہ کتنی مشکلات پیش آئیں وہ ہے بالکل ایک قدرتی چیز، جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس زندگی کے بعد کوئی

زندگی نہیں، اس مادی زندگی کی لذتوں اور فائدوں کے سوا کسی اور حقیقت کا یکسر وجود نہیں اور ہمارا سارا فلسفہ اور پورا ماحول اسی کی تلقین کرتا ہو، اسی کی مثالیں سند اور معیار کے طور پر پیش کر رہا ہو، سارا نظام حیات اسی محور کے گرد گردش کر رہا ہو، زندگی بعد موت کا ہر تصور ختم ہو چکا ہو، اخلاقی قدروں اور زندگی کی دوسری بلند اور لطیف تر حقیقتوں نے خالص مادی وجسمانی احساسات کے لئے جگہ خالی کر دی ہو، پیٹ اور جسم نے پھیل کر زندگی کی ساری وسعت گھیر لی ہو اور تمام دوسری حقیقتوں کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہو، وہاں انسان خود غرض کیوں نہ ہو؟ اور وہ اس اول و آخر زندگی کی لذتوں اور منفعتوں کو کس دن کے لئے اٹھا رکھے اور اس زندگی سے لطف اندوزی میں کس لئے بخل اور احتیاط سے کام لے۔ پھر جب اسکو کسی بالاتر نگرانی اور کسی قادر و توانا ذات اور کسی ہمہ بیں وہمہ داں ہستی کا بھی اعتقاد اور خوف نہ ہو تو وہ ان اغراض کے حصول کے لئے جو اس کی زندگی میں خوش حالی یا لذت ولطف پیدا کریں ان اسباب و ذرائع کے اختیار کرنے میں کیوں پس وپیش سے کام لے جو اس کے لئے کسی وقت بھی ممکن ہو سکیں؟

اور پھر جب مادہ پرست سیاسی فلسفہ نے انسان کی زندگی کو ایک قوم اور ایک وطن کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور ہر ایسے تصور اور ہمدردی کو ذہن سے نکال دیا ہے جس کا دائرہ ایک قوم یا وطن سے زیادہ وسیع ہو اور ہر ایسی چیز کو راستہ سے ہٹا دیا ہے جو انسانیت کا وسیع تر تصور اور زندگی کا غیر فانی تخیل پیش کرتی ہو تو انسان کی فطری خود غرضی اپنے انتہائی ارتقا میں بھی قومی اور وطنی خود غرضی کی سطح سے کس طرح بلند ہو سکتی ہے اور وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کسی جائز و ناجائز فعل کے ارتکاب سے کس طرح احتیاط کر سکتی ہے۔

یہ خود غرضی اور مطلب پرستی اس موجودہ نظام معاشرت وسیاست کا جسم روگ ہے جب تک اس کا ازالہ نہ ہو ظاہری انتظامات، اصلاحات و ترقیات کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں، سیاسی طور پر ملک آزاد و خود مختار ہو یا غیر ملکی حکومت کے ماتحت جب تک ہماری سوسائٹی پر خود غرضی مسلط ہے، دولت وعزت کا عشق ملک کے تمام افراد پر چھایا ہوا ہے، ذمہ داری کا احساس افراد کے دلوں سے نکل چکا ہے اور معاشرہ کا قلبی رجحان زیادہ سے زیادہ لطف اندوزی فرضی ضروریات کے حصول اور خواہشات نفس کی تکمیل کی طرف ہے علاوہ سوسائٹی زندگی کی حقیقی مسرتوں اور آزادی کے اعلی نتائج سے محروم رہے گی۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ سوسائٹی پر ایک غیر طبعی فربہی چھا رہی ہے، وہ اپنی ظاہری آرائش میں بھی ترقی کر رہی ہے فاقہ کشی اور عریانی کا تناسب بھی کم ہو رہا ہے اور بعض ملکوں میں معاشی ناانصافی کا خاتمہ

ہوگیا ہے، تعلیم عام ہورہی ہے نئے نئے شعبوں کی کثرت ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سوسائٹی کو اندر سے روگ لگ چکا ہے جو اندر اندر سے اس کو گھلا رہا ہے جب دلوں میں ناانصافی گھر کر گئی ہو تو محض معاشی ناانصافی کو مٹا دینے سے کسی ملک میں حقیقی انصاف اور عام ہمدردی پیدا نہیں ہوسکتی، معاشیات کے علاوہ بھی زندگی کے بہت سے میدان ہیں جن میں انسان کو انسان پر ظلم کرنے اس کا حق دبانے اور کم سے کم اس کو تنگ کرنے کے پورے مواقع حاصل ہیں جب تک دلوں سے اس ناانصافی اور ظلم کی طرف رجحان اور خودغرضی کا بیج نہ نکالا جائے کوئی شہری نظام ظلم و ناانصافی اور بددیانتی سے پاک نہیں ہوسکتا۔

ایشیا میں ابھی حال میں جو نئی خودمختار ریاستیں قائم ہوئی ہیں یا جن ممالک کو نئی نئی آزادی حاصل ہوئی ہے وہ بھی اس حقیقت کو نظرانداز کر رہے ہیں کہ ملک کی خوش حالی اور قوم کی ترقی صرف زندگی کی ظاہری تنظیمات اور وسائل کے حصول میں نہیں ہے بلکہ ان مقاصد کی صحت میں ہے جن کے لئے یہ وسائل استعمال ہوتے ہیں جان کی درستی اور انصاف و ہمدردی کے قلبی جذبات میں ہے اور یہ چیزیں کسی مشینی طریقہ اور سیاسی تنظیم سے نہیں پیدا ہوتیں اگر یہ کسی مشینی طریقہ یا کسی نظام سے پیدا ہوسکتیں اور وسائل زندگی کی فراہمی اور ملک کی ظاہری تنظیم خوش حالی، امن و اطمینان و قلبی سکون کی ضامن ہوتی تو یورپ و امریکہ کی مستحکم و منظم سلطنتیں امن و سکون کا گہوارہ ہوتیں اور وہ ممالک جنت نظیر ہوتے مگر سب جانتے ہیں کہ ان ممالک کو حقیقی اطمینان نصیب نہیں، وہاں کی اندرونی انجمنیں کوئی چھپا ڈھکا واقعہ نہیں۔

مقاصد کی صحت، زندگی کی درستی اور انصاف و ہمدردی کے قلبی جذبات کا سرچشمہ ایک صحیح و طاقتور اخلاقی و روحانی مذہب ہی ہے جو انسان کے جسم کے ساتھ اس کے دل پر بھی حکومت کرے، جو اس کی خواہشات کو اپنے ضبط و نظم میں رکھے جو اپنی روحانی طاقت سے اس سے بنی نوع کے حق میں ایثار و قربانی کرا سکے جو اس محدود و مختصر زندگی کے علاوہ کسی غیر فانی زندگی کو اس کی نگاہ میں اس طرح حقیقت بنا سکے کہ اس کے شوق میں آدمی اس زندگی میں اعتدال و احتیاط سے کام لے، جو اس کے سامنے کمانے پینے پہننے اوڑھنے دولت و عزت حاصل کرنے اور حیوانی تقاضوں کو انسانی عقل و ہنرمندی سے پورا کرنے کے علاوہ انسانیت اور زندگی کے کچھ اور معانی بتلا سکے اور انسان کی زندگی کے کچھ زیادہ بلند مقاصد انسان کے سامنے لا سکے، ایسے ہی مذہب کی صحیح تعلیم اس خودغرضی اور کوتاہ نظری کو زائل کرسکتی ہے جس سے ہمارا موجودہ نظام معاشرت و سیاست داغ داغ ہو رہا ہے۔

مبارک ہیں وہ ہاتھ جو مظلوم انسانیت کے جسم کی سوئیوں کو نکالنے کے لئے بڑھیں مگر یاد رہے

کہ آنکھوں کی سوئیاں نکالے بغیر اس کو سکھ کی نیند اور دل کا چین حاصل نہیں ہو سکتا، آزادی اور حکومت خود اختیاری کا حاصل کرنا بڑا ضروری کام اور اعلیٰ مقصد ہے، ملک سے فاقہ کشی، برہنگی اور افلاس کو دور کرنا، معاشی ناانصافیوں کا خاتمہ کرنا اور ہر شخص کے لئے ضروری وسائل زندگی کا مہیا کرنا نہایت مبارک کام ہے اور جو لوگ اس میں حصہ لیں وہ انسانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں، لیکن ان کو اپنے کام کو بالکل ادھورا اور ناقص سمجھنا چاہئے جب تک انسانیت کے دل کی پھانس اور آنکھ کی کھٹک دور نہ ہو اس کا ضمیر خداترس اور پاک باز نہ ہو جائے اس میں ذمہ داری کا احساس نہ پیدا ہو جائے، اس کی نفس پرستی، شکم پروری اور تن پروری سے بلند ہو کر نوع انسان کے عام فائدوں پر نہ ہو، اس میں وسعت نظر اور عالی حوصلگی نہ پیدا ہو جائے وہ ضروریات زندگی اور فضولیات زندگی میں فرق نہ کر سکے اور اس کو ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کرنے اور اپنے نفس کے خلاف کرنے میں دقت نہ ہو۔

کئی بار اس جسم کی سوئیاں نکالنے کے لئے انسانیت کے ہمدرد ہاتھ بڑھے لیکن ہر بار انھوں نے آنکھوں کی سوئیاں چھوڑ دیں اور رات ہوگئی کسی ملک کو اس کے فرزندوں نے اپنی قربانیوں اور بہادری سے آزادی دلائی، کہیں ایک دوسرے کے ستائے انسانوں نے جابر شخصی سلطنتوں کا تختہ الٹ کر ملک میں جمہوری نظام اور عوامی حکومت قائم کی لیکن دل کی پھانس دل کے دل ہی میں رہ گئی، ملک کا نظم و نسق کرنے والے بدل گئے مگر نظم و نسق کا طریقہ اور حکومت کی روح اور اس کا مزاج نہ بدلا، اب بھی کئی ملکوں میں معاشی انقلاب کی جدوجہد جاری ہے لیکن لوگ پیٹ کی سوئیاں دیکھ رہے ہیں اور آنکھوں کی سوئیوں کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں، انسانیت فریاد خواہ ہے کہ رات آنے سے پہلے جسم کی سوئیوں کے ساتھ آنکھوں کی سوئیاں بھی نکال دی جائیں، تاکہ اس کو حقیقی سکون، دیرپا راحت اور متوازن زندگی حاصل ہو۔

یہ مقالہ بہ شکل رسالہ

یہ مقالہ (آنکھوں کی سوئیاں) اور ایک دوسرا مقالہ "روشنی کا مینار" (جو الفرقان کی گذشتہ اشاعت میں شائع ہوا تھا) دونوں چھوٹی کتابی تقطیع پر الگ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں، اسی طرح کے چند اور بھی دعوتی و اصلاحی مقالے عنقریب چھپنے والے ہیں — ان مقالات کا سلسلہ ایک خاص دعوتی و تبلیغی پروگرام کے تحت شروع کیا گیا ہے آپ ان رسائل کو منگوائیے اپنے مسلم و غیر مسلم احباب اور سوشلسٹ و کمیونسٹ دوستوں کو دکھلائیے بعض حلقوں میں دعوت و تبلیغ م

کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

(از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

(گزشتہ سے پیوستہ)

حقیقت یہ ہے کہ "با آخرت و بے آخرت" یا دین و بے دینی کی دنیا کے رنج و راحت، خوشی و غم میں یہ بڑا زمین و آسمان کا فرق ہے کہ دینی زندگی کی سعی و طلب کا ہر قدم عین منزل و مراد اسلئے عین کامیابی ہے۔ اور بے دینی کی زندگی اپنی سعی و طلب کی اگر مظنون و مشکوک مراد تک نہ پہونچے تو بیگار یا بے مزد کی مزدوری و مشقت کے حرمان و حسرت کے سوا کیا ملا؟ تجارت میں آخرت یا خدا کے احکام و رضامندی کو پیش نظر رکھنے والے کو اگر خسارہ بھی رہا تو ظاہری و عارضی خسارہ ہے لیکن اگر بے آخرت والے کی تجارت بیٹھ گئی تو اس کا کلیجہ ہی پھٹ جاتا ہے۔ دنیاوی خواہشوں اور ارمانوں کا قدم ہمیشہ اس کی کامیابیوں سے آگے ہی نکلا رہتا ہے تو عقل و تجربہ دونوں سے معلوم و مشاہد ہے کہ دنیا کا کامیاب سے کامیاب آدمی بھی ناکامی ہی کے غم میں مرتا ہے کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غرض اگر اس زندگی کا دامن آخرت سے کاٹ دیا جائے تو پھر نہ اس کے غم اور آلام و مصائب کی کوئی حد رہتی ہے اور نہ اس کی خوشیاں خوشیاں رہتی ہیں الا آنکہ کوئی بے حس و بے حیا "حلوا خوردن منفعت است" اور "سواری خر د فوج طفلاں" ہی کو لذت و عزت کا معیار بنا اور سمجھ لے۔

بخلاف اس کے دین و آخرت کے تعلقات و تصورات کو جس پہلو سے بھی دیکھو وہ

مسرت تو مسرت مصیبت میں بھی مسرت کی چاشنی پیدا کر دیتے ہیں اولاد کی موت سے بڑھ کر کون سا صدمہ جانکاہ ہوگا جس کے بدلے آدمی خود مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن

"اگر آخرت یاد ہو تو دنیا کی کوئی تکلیف سرائے کی دو روزہ تکلیف سے زیادہ نہیں ستا سکتی اور وطن اصلی کو یاد کرکے راحت ہو جایا کرتی۔ خواہ کتنی ہی بڑی مصیبت ہوتی۔ مثلاً اس شخص کا کوئی پیارا بچہ مر جاتا تب بھی اس کو پریشانی نہ ہوتی۔ اگر کوئی شخص سفر میں ہو اور اس کا کوئی بچہ گم ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ گھر چلا گیا ہے جہاں میں جارہا ہوں تو کیا وہ روئے پیٹے گا؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ معلوم ہو کر اطمینان ہو جائے گا اور سمجھے گا کہ اب کوئی دن میں بھی اسی سے جا ملتا ہوں۔ تو اگر ہم آخرت کو اپنا وطن سمجھتے تو اولاد کے جاتے رہنے پر اتنا بڑا صدمہ لے کر نہ بیٹھا کرتے"

البتہ عارضی مفارقت کا غم ایسی صورت میں بھی طبعاً و قدرتاً ہوگا اسی طرح جیسے سفر کا کوئی رفیق وطن ہم سے پہلے پہونچ جائے تو رفاقت کی اس عارضی جدائی کا طبعی رنج ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی خوشی بھی ہوگی کہ وہ اپنی آرام کی جگہ جا پہونچا اور اس سے تسلی ہوگی کہ ہم بھی عنقریب اس سے جا ملنے والے ہیں اسی کو آگے فرمایا کہ ایسی حالت میں بھی

"جدائی کا غم ہوتا ہے سو اس کا مضائقہ نہیں، اس کی اجازت ہے لیکن جیسے جدائی کا غم ہوتا ہے تسلی بھی تو ہونی چاہئے کہ وہ اپنی راحت کی جگہ پہونچ گیا ہم بھی وہیں جائیں گے اور مل لیں گے۔ خدا تعالیٰ نے یہی مضمون اس آیت کے دوسرے جملہ میں سکھلایا ہے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" یعنی جو چیز گئی خدا کے پاس گئی اور ہم بھی خدا کے پاس جائیں گے اور سب کے سب جمع ہو جائیں گے تو اس کو سوچ کر تسلی ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اب تو وہ مار دھاڑ ہوتی ہے کہ گویا خدا تعالیٰ نے ان کی جائداد چھین لی۔

بڑی بھاری غلطی "بس بڑی بھاری غلطی ہماری یہ ہے کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے اس لیے یہاں سے جدا ہونے کا رنج و غم ہوتا ہے، ورنہ جب آدمی سفر میں جاتا ہے تو جتنا گھر سے قریب ہوتا جاتا ہے خوشی بڑھتی جاتی ہے اور یہاں یہ حالت ہے کہ جوں جوں مرنے کے دن قریب آتے ہیں روح فنا ہوتی ہے بخلاف اہل اللہ کے کہ ان کو اس کا ذرا غم نہیں ہوتا نہ اپنے

مرنے کی پروا ہوتی ہے نہ اولاد کے مرنے کی حتی کہ بعض دفعہ جہلا کو ان کے سنگ دل ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے ایسا نہیں ہے ان سے زیادہ تو کوئی رحم دل ہی نہیں ہوتا مگر اس پریشانی نہ ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اس لیے ان کو اولاد کے مرنے کا غم اتنا ہی ہوتا ہے جتنا سرائے سے لڑکے کے گھر چلے جانے پر مسافر باپ کو ہوتا ہے کہ ایک گونہ مفارقت سے قلق ہوا اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ خود مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو خوشیاں مناتے ہیں جس طرح سفر سے واپس آکے گھر کے قریب پہونچ کر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اسی خوشی کو ایک بزرگ کہتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسراین غم روزے — تا در میکدہ شادان و غزل خواں بروم

احقر راقم نے خود اپنی آنکھوں حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے اس حال کو دیکھا کہ موت کے لئے بیتاب معلوم ہوتے تھے کبھی کبھی فرماتے تھے کہ خودکشی حرام نہ ہوتی تو اب ضبط نہیں کر سکتا تھا۔

احقر کے علاوہ بھی حیدرآباد میں حضرت موصوف کے اس حال کے دیکھنے والے اور جاننے والے بہت سے موجود ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی قدس سرہ کا حال نقل فرمایا ہے کہ "ایک شخص نے کہا کہ حضرت اب تو آپ بوڑھے ہو گئے آپ نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا کہ الحمد للہ اب وقت قریب آیا"۔

"مگر ان حکایات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کو اپنے اعمال یا مقبول ہونے پر ناز ہوتا ہے، اس لئے احتمال مواخذہ نہ ہونے سے خوش رہتے ہیں، استغفر اللہ ناز کی مجال کس کو ہے بلکہ وہ خوشی صرف اس لئے ہوتی ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان کو دار و گیر کا اندیشہ ہوتا ہے یا نہیں، تو سمجھو کہ اندیشہ ضرور ہوتا ہے لیکن رحمت خداوندی سے امید بھی ہوتی ہے کہ انشاء اللہ پھر چھوٹ جائیں گے جیسے کسی کا گھر ٹوٹا پھوٹا پڑا ہو اور سرائے کا نہایت پختہ ہو تو وہ اپنے گھر ہی کو پسند کرے گا اور سوچے گا کہ اگرچہ اس وقت میرا گھر ٹوٹا پھوٹا ہے لیکن انشاء اللہ تعالیٰ اس کو پختہ کروں گا۔ اسی طرح اگرچہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے مگر جانتے ہیں کہ ایمان کی سلامتی ہے تو ضرور رحمت ہوگی غرض وطن سے بس محبت ہوتی ہے گو وہاں کچھ تکلیف بھی ہو۔ تو کوئی یہ

شب نہ کرے کہ ان کو ناز ہوتا ہے۔

علیٰ ہذا اگر سرائے پختہ نہ ہو اس میں راحت کا سامان نہ ہو یعنی سفر آرام سے نہ گذر رہا ہو لیکن آدمی چونکہ سفر کو سفر ہی اور سرائے کے قیام کو عارضی و چند روزہ ہی جانتا ہے اس لئے اس کی تکلیف کی چنداں پروا نہیں کرتا۔ لہٰذا اس چند روزہ زندگی کی سرائے دنیا میں بھی

"سارے غم اس لئے ہیں کہ دنیا کو گھر بنا رکھا ہے ورنہ اگر اس کو گھر نہ سمجھتے تو کوئی بھی غم نہ ہوتا۔ دیکھو جب کبھی سفر میں جاتے ہیں اور کسی سرائے میں قیام ہوتا ہے۔ تو وہاں کی چارپائی میں کبھی کھٹمل ہوتے ہیں کبھی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے مگر سوچتے ہیں کہ ایک شب تو قیام ہی کرنا ہے۔ جس طرح ہو گذار دو۔۔۔ یہی حال دنیا کی تکلیفوں کا ہے سو اگر آپ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھتے تو اسی طرح اسکے ساتھ بھی برتاؤ ہوتا۔ ہرگز اس کے متعلق ہر وقت تذکرہ نہ ہوتا نہ اس کا اس قدر سلسلہ گھسیٹتے بلکہ ہر بات میں زبان پر یہ ہوتا کہ ہمارا گھر آخرت ہے وہاں چین و آرام کریں گے یہاں کی ذرا سی تکلیف کا کیا ہے"۔[1]

دنیا کو گھر بنانے کی حماقت کی ذرا اور تفصیل سن لیں جس کی بدولت ساری مصیبت ہے۔

"ہم جو دنیا میں چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہو جائے وہ بھی ہو جائے یہ ایسا ہی ہے جیسے سرائے میں کوئی یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ فانوس سب لگا دئے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا بھی دے تو کتنی بڑی حماقت ہے خاصکر جب یہ بھی حکم ہو کہ مثلاً چاروں سے زیادہ کوئی اس سرائے میں قیام نہ کر سکے گا اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی آرائش میں لگانا بورا خلل دماغ ہے اور دنیا ایسی ہی محدود قیام کی سرائے ہے جس کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا اوّل تو سرائے میں قیام اگر اختیاری ہو تب بھی یہی ہونا چاہئے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے اور جب اختیاری بھی نہ ہو تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہئے بلکہ اس سے توحش اور ضیق رہنا چاہئے

"الدنیا سجن المومن" کے معنی اور یہی معنی ہیں میرے نزدیک "الدنیا سجن المومن"[2] کے۔ لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنی کیے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ جیلخانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا کیونکہ مومنوں کو دنیا میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس لئے فرمایا

---

[1] الرفیق صفحہ ۳۶ و ۳۷ [2] "دنیا مومن کے لئے جیلخانہ ہے"

کہ جیلخانہ میں کبھی جی نہیں لگا کرتا اگرچہ کیسا ہی عیش ہو تو مسلمان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے۔ پھر جب جی نہ لگے گا تو کیوں سوچے گا کہ یوں ہو یہ ہو اور وہ ہو بلکہ اب یہ سوچے گا کہ دنیا تو پردیس ہے یہاں جس طرح بھی گذر جائے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپاہج اور بے عمل ہو جائے گا بلکہ اس کا سارا فکر و عمل اصلی گھر کی آرام و آسائش اور اس کے بناؤ سنوار کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔

"اور دنیا کی سوچ کے بجائے اب یہ ہو گا کہ آخرت کی سوچ ہو گی کہ اس کے لئے یہ سامان ہونا چاہئے یہ فکر ہونا چاہیے اپنے نفس کی اصلاح ہونی چاہئے (قدم قدم پر حق و شریعت کے موافق عمل ہونا چاہئے) کہ اگر یہ سامان ہو گیا تو پھر یوں بہار ہو گی یوں عیش ہو گا ورنہ یوں مصیبت ہو گی یوں پریشانی ہو گی۔ اب دیکھو کہ کتنے آدمی ہیں جو یہ سوچتے ہیں دنیادار تو الگ رہے دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق نہ امنگیں پیدا ہوتی ہیں نہ اندیشے خدا تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔[1]

آخرت کو گھر سمجھنے کا اثر "دیکھو ایک دن کا سفر ہوتا ہے تو اس میں ناشتہ بھی ہمراہ لیا جاتا ہے اور سامان بھی ہوتا ہے آخرت کا اتنا بڑا سفر درپیش ہے اس کے لئے کیا زاد راہ تیار کر رکھا ہے۔ بالخصوص جبکہ وہ وطن اور گھر بھی ہے تو اس صورت میں تو اس کے لئے بہت کچھ سامان کرنا چاہئے تھا یعنی قطع سفر کے لئے زاد و ناشتہ اور گھر پر بیٹھنے کے لئے کمائی اور ذخیرہ"

"پس ایک اثر تو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہئے تھا اور دوسرا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ دنیا کے حوادث سے غم نہ ہوتا نہ اپنے واسطے نہ لگے سگے کے واسطے، گھر تو وہاں ہے اب جو موت سے ہم کو موت آتی ہے یہ صرف اسی لئے کہ اس کو گھر نہیں سمجھتے۔ بلکہ موت کے خیال سے ایسی حالت ہوتی ہے جیسے کسی کو جیلخانہ میں لے جاتا ہوں"

"ہمارے حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بوڑھا شخص آیا کہ میری بیوی مرتی ہے حضرت فرمانے لگے اچھا ہوا جیلخانہ سے چھوٹتی ہے۔ کیوں غم کرتا ہے

---

[1] اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور ہر آدمی کو چاہئے وہ غور کرے اور سوچے کہ کل کے لئے اس نے کیا تیاری کی ہے۔ ۱۲ م

تو بھی چلا جائے گا، وہ کمنے لگا ردی کون پکائے گا، حضرت نے فرمایا کہ کیا ماں کے پیٹ سے ردی پکاتی ہوئی آئی تھی۔

"تو موت کے متعلق اس تمام رنج وکرب کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ آخرت کو بھولے ہوئے ہیں۔ ورنہ اگر وہ یاد ہوتی تو موت کا کیا غم ہوتا

"اور ایک اثر آخرت کو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہئے تھا کہ کسی سے عداوت، رنج نہ ہوتا اگر بہ مجبوری طور پر کسی بات پر لڑائی بھی ہو جایا کرتی۔ دیکھو ریل میں مسافروں میں لڑائی تو ہوتی ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ سفر کے سامان کو چھوڑ کر کسی سے الجھنے لگیں کیونکہ جانتے ہیں اس سے سفر کھوٹا ہوگا مگر اس طرح دنیا کے فضول قصوں میں بھی کسی نے سوچا ہے کہ ان میں پھنسنے سے آخرت کا سفر کھوٹا ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کو گھر نہیں سمجھتے

نیز اگر آخرت کو گھر سمجھتے تو دنیا کے ساز وسامان پر اترایا نہ کرتے اگر سفر میں کہیں سیج بند کسا ہوا پلنگ ملے تو کوئی بھی اس پر اتراتا نہیں کیونکہ جانتا ہے کہ یہ تو مانگی ہوئی چیز ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہمارے پاس چار پیسے ہوں تو ہم ان پر اتراتے ہیں (الرفیق ص۳۸ و ۳۹)

ایک اور پہلو یہ ہے کہ آدمی ہر کام کم وبیش تجارت کے نقطۂ نظر سے کرتا ہے۔ یعنی جس کام میں مال ومحنت ووقت کا جو کچھ سرمایہ لگاتا ہے تو اس کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے۔ اور جتنا زیادہ نفع یا نفع کی امید ہو اتنا ہی مال ووقت کے لگانے اور محنت ومشقت اٹھانے میں کلفت کم اور مسرت زیادہ ہوتی ہے بلکہ تاجر کی تاجرانہ ذہنیت تو یہ ہوتی ہے کہ کاروبار میں جو مصیبت ومشقت وہ اٹھاتا ہے اگر دلخواہ اس کا نعم البدل یعنی بہترین بدل مل جائے تو وہ اس مصیبت کو سرے سے خاطر میں ہی نہیں لاتا نہ اس کو مصیبت محسوس کرتا ہے (الجبر بالصبر تلخیصاً از صفحہ ۱۱) آیت یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِمَنْ فِیْ اَیْدِیْکُمْ مِنَ الْاَسْرٰی اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ خَیْرًا یُّؤْتِکُمْ خَیْرًا مِّمَّا اُخِذَ مِنْکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ[1] کے تحت مصیبت کی اسی حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ وہ دراصل تجارت ہے۔

---

[1] (ترجمہ) اے نبی تمہارے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو کہ اگر اللہ کے علم میں تمہارے دل میں نیکی ہے تو وہ تم کو اس سے بہتر دولت دے گا جو تم سے لی گئی ہے اور تمہاری مغفرت فرمادے گا"۔ ۱۲ م

مصیبت کی حقیقت تجارت ہے "اس آیت سے یہ قاعدہ مفہوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر مصیبت کا نعم البدل ملتا ہے اور اس قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر ایک اور حقیقت واضح ہوئی کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے۔ یہی حقیقت ہماری نظر سے غائب ہوتی ہے۔ اس لئے مصیبت سے رنج زیادہ ہوتا ہے ...... تو صاحبو اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ واقعات رنج و مصیبت تمامتر تجارت ہیں اور تجارت بھی ایسی جس سے بڑھ کر نفع کسی تجارت میں نہیں ہوتا تو کیا پھر نالہ و شیون باقی رہے گا، میں رنج طبعی کا مانع و منکر نہیں جو فطری طور پر ہوتا ہے بلکہ طبعی رنج تو ہونا چاہیے ورنہ ثواب و اجر ہی نہ ہوگا، مگر واقعات رنج و مصیبت کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد رنج عقلی نہ ہونا چاہئے۔

چار قسم کے حالات خلاصہ یہ کہ حالات کی دو قسمیں ہیں گوارا اور ناگوارا اور پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں اختیاری و غیر اختیاری یہ کل چار قسم کے حالات ہوئے جن میں سے ہر ایک کے متعلق جدا جدا حقوق ہیں اور مومن اگر ان حقوق کو ادا کرتا رہے تو اس کو نعم البدل ملتا ہے اسلئے مومن کسی حالت میں بھی نقصان میں نہیں، بلکہ ہر حالت میں نفع میں ہے اسی لئے حدیث میں ہے "نعم الرجل لمومن ان اصابتہ سراء حمد وان اصابتہ ضراء صبر وفی کل اجر" (او کما قال) یعنی مومن آدمی بڑی اچھی حالت میں ہے اگر اس کو راحت پہونچتی ہے حمد و شکر کرتا ہے اگر تکلیف پہونچتی ہے صبر کرتا ہے اور ہر ایک میں اس کو اجر ملتا ہے یعنی شکر میں بھی اور صبر میں بھی۔"

امور غیر اختیاریہ میں اجر کی وجہ "اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امور غیر اختیاریہ میں جو اجر ہے وہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو اختیاراً اسوقت مومن سے صادر ہوتے ہیں یعنی راحت میں حمد جس کی حقیقت بیان شکر ہے اور وہ ایک عمل ہے جو اس نے حق تعالیٰ کے حضور میں پیش کیا۔ اس کے عوض میں اجر ملتا ہے اور مصیبت میں صبر کرنا بھی ایک عمل ہے جس پر اجر ملتا ہی بس دونوں صورتوں میں نعم البدل اسی عمل پر بلا جو اختیاری ہے۔"

"البتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سودا اور معاملہ کرنے میں وہ نفع و نعم البدل یا اجر ملتا ہے" جو خیال سے باہر ہے حدیث میں ہے کہ "اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت

ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر" (یعنی میں نے اپنے نیکوکار بندوں کیلئے جو کچھ تیار کر رکھا ہے اس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال آیا ہے) اور نماز روزہ حج زکوٰۃ جملہ اعمال صالحہ کا بجالانا بھی ایک تجارت ہوئی جس کی شان یہ ہے کہ

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را — کہ بیک گل می خری گلزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد — آنچہ در وہمت نہ آید آں دہد

"اور اگر عبادت کا تعلق اموال سے ہو تو وہ بھی تجارت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے صراحۃً ارشاد فرمایا ہے" اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" جس میں تجارت کی حقیقت پر صاف طور سے تنبیہ ہے (وقال تعالیٰ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وقال اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۔ وقال تعالیٰ بِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝) چونکہ تجارت کی طرف طبائع عام طور سے راغب ہیں اسی لئے تجارت کا عنوان اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمایا کہ تم جو اعمال کرتے ہو وہ درحقیقت ایک تجارتی معاملہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تم کر رہے ہو۔"

"افسوس نماز کو ہم لوگوں نے اس لئے مصیبت سمجھ لیا ہے کہ اس کی حقیقت نہیں سمجھی اگر ہم یہ سمجھ لیتے کہ اس کی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز دیدی اور ایک لے لی تو نماز سے کبھی گرانی نہ ہو اور نہ اس کو بیگار کی طرح ٹالا جائے۔ بلکہ جس طرح تاجر اپنے مال کو صاف ستھرا رکھتا ہے اور خوبصورت بنا کر خریدار کو دیتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی نماز کو خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا کرتے۔"

غرض آخرت کے یقین و اعتقاد کے ساتھ ایمان و عمل کی ساری زندگی ایک ایسی تجارت بن جاتی ہے جس میں نہ نفع کی کوئی انتہا اور نہ گھاٹے کا کوئی امکان، لیکن یہاں خصوصیت سے مصائب کے متعلق گفتگو ہے اس لئے

"سنئے احادیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ مصائب میں بھی تجارت کے الفاظ حضور نے استعمال فرمائے ہیں چنانچہ آپ کی صاحبزادی کا بچہ مرنے لگا اور انھوں نے حضور کو بلایا تو آپ نے فرمایا" ان للّٰہ ما اخذ و للّٰہ ما اعطیٰ وکل شیٔ عندہ باجل مسمیٰ فلتصبر ولتحتسب کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ دیا اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ لیا، پس صبر کریں اور ثواب کی امید رکھیں" یہاں "آخذ و اعطیٰ" (یعنی لین دین ہے) اور لین دین ہی تجارت کی حقیقت

عجیب تجارت کہ سرمایہ بھی خریدار ہی کا | البتہ مومن کے لئے اس تجارت کی ایک اور ایسی عجیب و غریب خصوصیت ہے، جو دنیا کی کسی تجارت میں نہیں پائی جاتی کیونکہ دنیا کی تجارت میں تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی چیز دیتا اور دوسرے کی لیتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی تجارت ہے کہ جو چیز دی وہ بھی در اصل انھیں کی تھی اور جو اس کے بدلے میں ملی وہ بھی انھیں کی، ایسا خریدار کون ہوگا جو سرمایہ بھی ہم کو دے اور پھر ہم کو زیادہ سے زیادہ نفع دے کر خرید بھی لے۔

"محض صوری تجارت ہے حقیقی تجارت نہیں۔ کیونکہ حقیقی تجارت تو یہ ہے کہ اپنی چیز دے اور دوسرے کی لے اور یہاں جو کچھ بھی ہے بس خدا ہی کا، اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم بچے کو کوئی چیز بطور اباحت کے دیں (اباحت کی قید اس لئے تاکہ آگے شرعی اعتراض نہ ہو) پھر کسی مصلحت سے اس سے لے لیں اور دوسری دے دیں مثلاً کوئی اپنی اولاد کو اصول تجارت سکھلاتا ہے وہ اس کو ایک آبگینہ کا ٹکڑا دیتا ہے اور ایک اشرفی کے بدلہ میں خرید لیتا ہے تاکہ وہ آبگینہ کی حقیقت اور روپیہ اشرفی کی حقیقت سے واقف ہو جائے، تو یہ در حقیقت تجارت نہیں بلکہ صورت تجارت ہے۔

اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی بعض مصالح کی وجہ سے بعض دنیا کو ہمارے نامزد فرما دیا ہے ایک مصلحت تو یہ ہے کہ نامزدگی میں بندہ کو حظ آتا ہے کہ میرا مال، میری بیوی، میرا بچہ، میری زمین میرا مکان وغیرہ وغیرہ دوسرے یہ کہ اس سے کوئی چھین نہ سکے اگر نامزد نہ ہو اور بندہ کی ملکیت نہ ہو تو کسی کے پاس کوئی چیز سلامت نہ رہے۔

جاہل صوفیوں کی "حقیقت" کی "حقیقت" | اور یہیں سے میں کہتا ہوں کہ "حقیقت"

شریعت کی محتاج ہے یعنی وہ حقیقت جو عام طور پر صوفیہ کے ذہن میں ہے ورنہ طریقت و حقیقت شریعت ہی کے اجزاء ہیں، مگر جس حقیقت کو جہلا صوفیہ گاتے پھرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ وہ بھی شریعت کی محتاج ہے۔ اگر شریعت نہ ہو تو صوفی صاحب کی تسبیح و مصلی اور نذرانے اگر کوئی لُٹا لیجائے پھر وہ برا نہ مانے۔ کیونکہ

در حقیقت مالک ہر شے خداست　　　این امانت چند روزہ نزد ماست

جب بندہ کی کوئی شے نہیں نہ اس کو حق ملک حاصل ہے تو لُٹانے والوں کو یہ کہنے کا حق ہے کہ کچھ دنوں خدا کا یہ مال تم نے برتا اب ہم برتیں گے۔ اعتراض ناگواری کی کیا بات:- جیسے مولانا نے ایک جبری کی حکایت لکھی کہ وہ ایک شخص کے باغ میں گھس کر مالک کے سامنے انگور توڑ توڑ کر کھانے لگا اس نے کہا یہ کیا حرکت نہ اجازت لی نہ قیمت دی، جبری نے کہا بس خاموش بیٹھا رہ باغ بھی خدا کا پھل بھی خدا کا میں بھی خدا کا، تو روکنے والا کون، مالک باغ بڑا ہوشیار تھا اس نے اپنے غلام کو آواز دی کہ ایک رسی اور ڈنڈا لانا، غرض دونوں نے جبری کو رسی میں باندھا اور ٹُھکائی شروع کی اب لگا چلانے۔ مالک باغ نے کہا رسا بھی خدا کا، ڈنڈا بھی خدا کا، میں بھی خدا کا، تو بھی خدا کا، پھر چلاتا کیوں ہے،

"تو صاحبو اگر یہ حقیقت واضح کردی جائے تو سب آدمی بالشویک ہو جائیں، جن کا دعوی ہے کہ سب انسان مساوی ہیں کسی کو کسی سے زیادہ مالدار بننے کا حق نہیں، بلکہ جس کے پاس زیادہ مال ہوتا ہے اس سے لے کر غریبوں کو تقسیم کر دیتے ہیں حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب نے مثنوی کے اس شعر کا کہ

سر پنہان است اندر زیر و بم　　　فاش گر گویم جہاں بر ہم زنم

یہی مطلب بیان فرمایا تھا کہ اگر مسئلہ وحدۃ الوجود ظاہر کردوں تو عالم میں فساد برپا ہو جائے کم فہموں کی نظر سے امتیاز اُٹھ جائے۔ جو عالم میں نظام و امن قائم ہے شریعت ہی کی بدولت ہے کہ یہ زید کا حق ہے یہ عمرو کا حق ہے، دوسرے کے حق میں تصرف حرام ہے۔

خیر یہ تو درمیان میں ایک مزیدار جملہ معترضہ تھا جس کو چھوڑنے کا جی نہ چاہا ورنہ گفتگو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اپنے بندوں کے ساتھ تجارت کا ایسا عجیب معاملہ فرما رکھا ہے کہ خود ہی

اس کو خرید کر اُلٹے بندہ کو نفع عطا فرماتے ہیں گویا ہم کو اپنے پاس سے کچھ لگائے یا خرچ کئے بغیر نفع ہی نفع ملتا ہے، مگر اس کا یہ مطلب تو نہ ہونا چاہئے کہ

"اگر کوئی آقا اپنے غلام سے کہہ دے کہ پلنگ تمہارا ہے جس میں مصلحت یہ ہو کہ دوسرے غلام اس کو تنگ نہ کریں بلکہ اس کی نازبرداری میں بلا تکلف اس کو تصرف کرنے دیں اب اگر یہ غلام آقا کو بھی اس پلنگ پر بیٹھنے سے روکنے لگے تو یقیناً وہ بڑا نمک حرام ہوگا صاحبو یہی حالت ہماری ہو رہی ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ نے تو ہماری مصلحت کے لحاظ سے نازبرداری فرمائی تھی۔ہم خود خدا کے تصرف کو بھی ان چیزوں سے روکنا چاہتے ہیں اور اگر وہ کوئی تصرف کرتے ہیں تو ہم پیٹ پھاڑ کر مرے جاتے ہیں حالانکہ جو چیز بادشاہ کے خزانہ میں پہونچ جائے وہ تو زیادہ محفوظ ہو جاتی ہے۔

حاصل یہ کہ اگر ہمارے پیش نظر آخرت کی تجارت اور وہاں کا سود و زیاں ہو تو دنیا کی کوئی مصیبت حقیقی مصیبت نہیں رہ جاتی خصوصاً جب یہ بھی معلوم ہو کہ جس جان و مال کے ضرر و زیان سے ہم کو مصیبت پہونچی ہے وہ سرے سے ہمارا تھا ہی کہاں۔ اور جو کچھ تھا بھی تو ایسی جگہ اور ایسے کے پاس پہونچ گیا جہاں ہمارے پاس سے زیادہ محفوظ و بے خطر ہے ایمان و اعتقاد کی دولت نصیب ہو تو یہ ایسی موٹی بات ہے کہ ایک عامی اور دیہاتی بھی اس کو بے تکلف سمجھتا ہے۔

ایک بدوی کی عجیب تعزیت "حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اور حضرت عبداللہ بن عباس کو بہت صدمہ ہوا تو ایک بدوی (دیہاتی) نے آکر اشعار میں ان کو تسلی دی۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بدوی سے بہتر کسی نے تسلی نہیں دی کہتا ہے کہ

خیر من العباس اجرك بعده	والله خير منك للعباس

یعنی آپ کے لئے حضرت عباس کے زندہ رہنے سے وہ اجر زیادہ بہتر ہے جو ان کے وصال پر آپ کو ملا۔ کیونکہ حضرت عباس اگر زندہ رہتے تو بہت سے بہت حضرت عباس آپ کو ملتے اور آپ کے حق میں ثواب اس سے بہتر ہے کیونکہ ثواب کی حقیقت ہے رضائے خدا

تو یوں کہئے کہ حضرت عباس کے وصال پر صبر کرنے سے آپ کو خدا ملا اور یقیناً خدا تعالیٰ سب سے بہتر ہیں۔ اور حضرت عباس کے لئے خدا آپ سے بہتر ہے کیونکہ وہ مر کر خدا تعالیٰ کے پاس پہونچ گئے اگر نہ مرتے تو دنیا ہی میں رہتے جس میں رویت و لقاء نہ ہو سکتی اور وہ اگر آج نہ بھی مرتے تو کسی نہ کسی دن ضرور مرتے ؎

اور سنئے حدیث میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو صحابہ کو غیب سے اس طرح تسلی دی گئی "ان فی اللہ عزاء من کل مصیبۃ وخلفا من کل فائت فباللہ فثقوا وایاہ فارجوا فانما المحروم من حرم الثواب" کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر مصیبت سے تسلی کے لئے کافی ہے اور وہ ہر فوت ہونے والی چیز کا عوض ہیں اسی پر بھروسہ رکھو اور اسی سے امید رکھو کیونکہ محروم تو وہ ہے جو ثواب (یعنی رضائے حق) سے محروم رہے، صاحبو یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ تمہارے عزیز کے بدلہ تم کو خدا ملتا ہے بس اب تو ایسے موقع پر یہ کہنا چاہئے کہ

روزہا گر رفت گو رو باک نیست تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

صوفیوں کی بڑی ہوشیاری

کیا اس سے بھی آپ کی تسلی نہ ہوگی کہ آپ کو اپنے عزیز کے بدلے میں خدا مل جائے جس کی جنت بھی ہے دوزخ بھی، یقیناً جنت کے ملنے سے خدا کا ملنا بدرجہا بہتر ہے اور جس کو خدا مل گیا اس کو ساری خدائی مل گئی۔ حضرات صوفیا کی یہی تو سب سے بڑی معرفت و ہوشیاری کی بات ہے کہ انھوں نے اصلی مطلوب و مقصود جنت سے بھی بڑھ کر خود خدا کو بنا لیا۔ اسی پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے مزے کی حکایت نقل فرمایا کرتے ہیں کہ خلیفہ ہارون رشید نے ایک دفعہ عید کے جشن میں یہ اعلان کر دیا کہ

"دربار میں جتنی چیزیں موجود ہیں ان میں سے جس چیز پر جو ہاتھ رکھ دے وہ اس کی ہو جائیگی کسی نے جواہرات پر ہاتھ رکھا کسی نے سونے چاندی پر ایک باندی نے جو ہارون رشید کو پنکھا جھل رہی تھی خلیفہ کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا خلیفہ نے برہم ہو کر سوال کیا یہ کیا حرکت۔ کہا حضور کا اعلان عام تھا اس میں کوئی استثناء نہ تھا تو میں نے دیکھا کہ یہ درباری بیوقوف ہیں، جو سونے چاندی اور جواہرات پر ہاتھ دھر رہے ہیں میں نے سوچا ایسی چیز پر ہاتھ رکھنا چاہئے جس کے ہاتھ

میں یہ سب چیزیں ہیں اس لئے حضور پر ہاتھ رکھ دیا کہ جب آپ میرے ہوں گے تو
سب چیزیں میری ہو جائیں گی (تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سب ہی کچھ مل جائے)
تو بتلائیے ان واقعات مصیبت میں کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ ان کے ذریعہ سے خدا ملتا ہے
جس کی جنت بھی ہے دوزخ بھی

یہاں ایک وسوسہ کا ضمناً کیسا دلچسپ حکیمانہ ازالہ فرمایا گیا ہے فرماتے ہیں کہ
" شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ آیا ہو کہ دوزخ ہماری ہو گئی تو کیا نفع ہو گا کیا ہم دوزخ
میں رہیں گے افسوس آپ نے بات کو سمجھا ہی نہیں دنیا میں جیلخانہ بادشاہ کی ملک ہوتا
ہے تو کیا بادشاہ جیلخانہ میں رہتا ہے مطلب یہ ہے کہ تم جس کو چاہو گے بخشوالو گے اور
اور جہنم سے نکلوالو گے۔ اس پر شاید کہیں کہ کیا کفار کو بھی بخشوالیں گے اس کا کیا جواب
(اور کیا عجیب و غریب جواب) یہ ہے کہ جس کے تعلق سے جہنم بواسطہ آپ کی ملک ہو گئی ہے
جب وہ کفار کو بخشانا نہ چاہیں گے تو تم بھی نہ چاہو گے "

مصیبت کی تجارت دنیا میں بھی نفع سے خالی نہیں

بہر حال خدا کا مل جانا یا دوزخ و جنت کا ہماری ملک میں آجانا یہ تو آخرت کا نعم البدل یا بہترین بدل و نفع تھا جو مصیبت کے سرمایہ تجارت سے ہم کو ملتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اس تجارت کا کوئی نفع یا نعم البدل سرے سے نہیں ملتا

" دنیا میں بھی ہر فوت ہونے والی چیز کا نعم البدل ہم کو عطا ہوتا ہے خواہ مال و اولاد فوت ہو یا
کوئی عزیز و قریب ۔ چنانچہ حضرت ام سلمیٰ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصیبت کے
وقت کے لئے ہم کو یہ دعا تعلیم فرمائی ہے " انا للہ وانا الیہ راجعون اللھم عندک
احتسب مصیبتی فاجرنی فیھا وابدلنی بھا خیرا منھا (اے اللہ میں
آپ سے اس مصیبت کا ثواب مانگتا ہوں پس مجھ کو اس کا اجر عطا فرمائیے اور اس کا نعم البدل
دیجئے) حضرت ام سلمیٰ فرماتی ہیں کہ جب میرے شوہر ابو سلمیٰ کا انتقال ہوا تو میں نے یہ دعا پڑھی
مگر " وابدلنی بھا خیرا منھا " کہتے ہوئے دل رکتا تھا کہ ابو سلمیٰ سے بہتر کون ہو گا اور
حضور کے ملنے کا وہم بھی نہ ہوتا تھا کیونکہ " آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ " لیکن فرماتی ہیں کہ میں
نے دل پر جبر کر کے یہ بھی کہا تو خدا نے مجھے ابو سلمیٰ کے عوض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا

"اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز لی گئی اور دوسری چیز دی گئی نصوص میں اس تجارت پر صاف اشارات موجود ہیں اسی لئے اعمال کا وزن ہوگا جیسا تجارت میں وزن ہوا کرتا ہے اور جب وہاں اعمال بھی جو اعراض ہیں اعیان بن جائیں گے جیسا کہ وزن کا مقتضا ہے تو اعیان تو اعیان ہیں ہی اور مصائب کے بارے میں لفظ اخذ واعطاء و ابدال وارد ہے یہ بھی تجارت کے معنی پر دال ہیں اور تصدق اموال میں لفظ اقراض اور بذل نفس وبذل مال میں لفظ اشتراء وارد ہے غرض جو چیز بھی ہمارے ہاتھ سے جاتی ہے اس کا عوض اور نعم البدل ملتا ہے اعمال کے متعلق ایک اور نص یاد آئی جس میں ایتاء بمعنی اعطاء ہے وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝ یعنی جو لوگ اس حال میں کچھ دیتے ہیں کہ ان کے دل لرزاں و ترساں ہوتے ہیں کہ ان کو اپنے پروردگار کے پاس واپس جانا ہے تو یہ بھلائی میں ترقی کرتے ہیں اور اس میں سبقت کرنے والوں میں ہوتے ہیں۔

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو گناہ کر کے ڈرتے ہیں فرمایا نہیں جو تصدق اور صوم صلوٰۃ بجا لا کر ڈرتے کہ شاید قبول نہ ہوا ہو اور خدا کے سامنے شرمندگی ہو کہ تم نے کیا عمل ہمارے یہاں بھیجا۔ حضرت عائشہ کے سوال سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں یؤتون اعطاء مال کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر عمل کو شامل ہے جب ہی تو انھوں نے اس کو اعمال گناہ پر محمول کیا"

"یہ ہیں وہ نصوص جن سے اعمال واموال کا تجارت ہونا معلوم ہوتا ہے ان ہی میں سے ایک وہ آیت ہے جس کو میں نے (ابتدائے وعظ میں) تلاوت کیا ہے کہ "يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ کہ ان قیدیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تمھارے دلوں میں خیر (یعنی ایمان) ہوگی تو اللہ تعالی تم کو اس سے بہتر چیزیں دے گا جو تم سے لی گئی ہے" یہاں بھی نقصان مالی، نعم البدل کا وعدہ ہے جس کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ مومن کو ہر نقصان

(۱) [illegible]

اِطلاقی تصوّف

گزشتہ سے پیوستہ

(از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی دکن)

(۴)

اس کے بعد الیافعی نے ان الفاظ کے ساتھ جو دوسری تنقید نقل کی ہے یعنی

بلغنی عن السید الجلیل الامام الحفیل الشیخ خلیفۃ الشاذلی الاسکندرانی انه لما ذکر عنده قال کلاما معناه تری متی یتفرغ هذا الرجل لذکر الله لشغل اوقاته بمن یاتیه من الامراء والوزراء وغیرهم من اهل الدنیا۔ ص۲۹۶

سید جلیل حضرت شاذلی کے خلیفہ جو سکندریہ کے رہنے والے تھے ان کا یہ بیان مجھ تک پہونچا ہے کہ جب المرشدی کے کارناموں کا ذکر لوگوں نے ان کے سامنے کیا تو خلیفہ شاذلی نے سن کر فرمایا جس کا حاصل یہ تھا کہ یہ شخص (یعنی المرشدی) آخر اللہ تعالیٰ کی یاد کیلئے کیا وقت نکالتا ہے کیونکہ اس شخص کا سارا وقت ان دنیادار امیروں وزیروں وغیرہ کی ملاقاتوں میں گذرتا ہے جو اس کے پاس آتے رہتے ہیں۔

بظاہر "الشاذلی الاسکندرانی" کے الفاظ سے الیافعی نے آٹھویں صدی کی مشہور شخصیت حضرت شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ الشاذلی الاسکندرانی کی طرف اشارہ کیا ہے[1]۔

---

[1] میں نے بظاہر کا لفظ اس لئے لکھا ہے کہ شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ اگرچہ سلسلہ شاذلیہ کے مشہور بزرگ ہیں، لیکن وہ براہ راست خلیفہ حضرت شیخ ابوالحسن الشاذلی قدس سرہ العزیز کے نہیں ہیں، بلکہ الشاذلی کے خلیفہ شیخ ابوالعباس المرسی سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، مراۃ الجنان میں الیافعی نے لکھا ہے کہ ابتداءً صوفیہ کی طرف سے شدید نفرت اسکندرانی میں پائی جاتی تھی، لیکن بتدریج اس

(بقیہ حاشیہ آئندہ)

بہرحال رہ ہوں، یا کوئی اور صاحب ہوں، مقصود تو ان کی تنقید ہے، میں نے المرشدی کے جن حالات کا ابتداء میں تذکرہ کیا ہے، ان ہی میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان کے پاس امراء و وزراء کی آمد و رفت کا تانتا بندھا رہتا تھا، الذہبی نے لکھا ہے کہ اس وقت کی حکومت پر المرشدی کا غیر معمولی اثر تھا، ان کے الفاظ میں،

عظیم شانہ فی الدولۃ جداً حتی کان یکتب ورقتہ الی کاتب السر والدویدار وغیرھما من ارکان الدولۃ فی المھمات فلا یستطیعون ردھا۔ ص ۲۶۳

حکومت میں اس شخص کا (المرشدی) کا اثر بہت بڑھ گیا تھا حتی کہ کاتب السر (سکریٹری) یا دویدار (دیوان) جو حکومت کے بڑے عہدہ دار تھے ان کو بھی معمولی پرزہ اہم مسائل میں بھی المرشدی اگر لکھ دیتے تو اس کو ٹال نہیں سکتے تھے۔

اور خود سلطان وقت ہی جب "المرشدی" کے دربار میں حاضر ہو چکا تھا تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد اور کسی کے آنے پر کیوں تعجب کیا جائے[1]

نفرت نے ان کو اس عقیدت تک پہونچا دیا کہ آخر میں بجز ایک صوفی کے اور کچھ نہیں رہ گئے تھے۔ "لطائف المنن" کے نام سے ایک کتاب بھی انھوں نے لکھی ہے جس میں اپنے ابتدائی گریز کے حالات اور بعد کو شیخ ابو العباس المرسی کی ملفوظ گوئی کی تفصیل کی ہے، تصوف کے نظری و عملی دونوں شعبوں میں ان کی بعض بڑی روح پرور کتابیں ہیں، جن میں "شذور الحکم" عام طور پر متداول ہے، اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا ہے، حافظ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے مقابلہ میں علماء اور صوفیا کا جو طبقہ کھڑا ہو گیا تھا ان میں یہ بھی شریک تھے، بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ فبالغ فی ذلک (یعنی دینی مخالفت میں بہت آگے بڑھ گئے) درر کامنہ ص ۲۷۳ ج ۱۔

لکھا ہے کہ جامع ازہر میں ان کے لئے خاص کرسی بچھائی جاتی تھی جس پر بیٹھ کر یہ وعظ فرماتے تھے کلام میں غیر معمولی اثر تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ "عوام الناس اور بہت سے اہل علم بھی ان پر ٹوٹ پڑے اسی لئے ان کے ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تھی" ص درر کامنہ۔

---

[1] حافظ ابن حجر نے المرشدی اور سلطان مصر کی اس ملاقات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ انھوں نے بادشاہ کی پیش کی ہوئی نہ کوئی چیز قبول کی، اور جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا کسی کی سفارش ہی بادشاہ سے کی صرف ناظر الجیش جس کا نام فخر تھا، ان کے متعلق بادشاہ سے انہوں نے تعریفی الفاظ بھی کہے تھے اور یہ بھی کہا کہ ان کا خاص (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ المرشدی کی خانقاہ اور ان کی مجلس ہمیشہ اسی قسم کے آنے والوں اور جانے والوں سے معمور رہتی تھی، جو ان سے ملنے گیا ہے اس نے ان کی خانقاہ میں اسی منظر کو پایا ہے، آخر جہاں مفت الوان نعم ہر شخص کی مرضی و خواہش کے مطابق لوگوں میں تقسیم ہو رہے ہوں اور اسی کے ساتھ ایسی سفارش بھی بہ آسانی مل سکتی ہو جس کے رد کرنے کی جرأت حکومت کے بڑے سے بڑے عہدہ دار اور حکام نہیں کر سکتے تھے خود سوچ لیجئے کہ ایسی حالت میں اس کے اردگرد اگر

از یمین و یسارت چہ بے قرار ارند

کا تماشا شب و روز اگر پیش ہو رہا ہو، تو عام انسانی فطرت کا جو اقتضاء ہے اس کے لحاظ سے یقیناً یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہو سکتی، بس یہ واقعہ تو بہر حال واقعہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ شیخ کی تنقید کا دوسرا جزء یعنی

"آخر خدا کو یاد کرنے کے لئے یہ شخص کب وقت نکالتا ہے"

اسی سوال کا جو جواب حضرت شیخ المرشدی نے دیا ہے، در حقیقت اسی کا تذکرہ میرا اصل مقصود ہے، اور یہ ساری تمہیدی گفتگو محض اس فقرہ کو پیش کرنے کے لئے کی گئی۔

الیافعی ہی نے شیخ اسکندرانی کی مذکورہ بالا تنقید کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

قال الراوی فلما سمعنا منه هذا الكلام اتينا الشيخ محمد المرشدي فقال لنا قولوا للفقيه خليفه والله ما شغلوني عن الله طرفة عين او قال والله لو شغلوني

راوی کا بیان ہے کہ اسکندرانی کے ان الفاظ کو سننے کے بعد میں شیخ محمد یعنی المرشدی کی زیارت کے لئے ان کے پاس حاضر ہوا، تو مجھ سے فرمانے لگے کہ اس فقیہ خلیفہ (شاذلی) سے کہنا کہ خدا کی قسم ایک چشم زدن کے لئے بھی اگر (ان لوگوں کی آمد و رفت) مجھے حق تعالیٰ سے غافل بنانی، شیخ المرشدی نے یہ فرمایا

طور پر خیال رکھا جائے یہ چونکہ المرشدی کا ذکر بادشاہ سے ابتداءً فخر ہی نے کیا تھا اس لئے بعض لوگوں کو بدگمانی بھی ہوئی کہ ہر لاء یتقارضون الثناء یعنی باہم ایک دوسرے کے تعریف کا قرض دیتے ہیں گو بالفاظ دیگر من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کا معاملہ جاری تھا لیکن حافظ نے اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ ناظر الجیش فخر کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۃً یہ شخص ظلم کا سب سے بڑا دشمن تھا اور خلق خدا کی اس باب میں بہت زیادہ دستگیری کرتا تھا، ساری زندگی اس کا یہی شیوہ رہا دیکھو درر کامنہ ص ۳۰۲ ج ۳

عن الله طرفة عين ما سلمت عليهم او قال ما قرأت عليهم السلام او كما قال من الكلام۔

صفحہ ۲۹۶

جلد (۴)

مرأة الجنان

یا یہ کہا کہ اللہ سے یہ لوگ مجھے چشم زدن کے لئے بھی اگر غافل کر سکتے تو میں ان لوگوں کو سلام بھی نہیں کرتا، بہرحال یہ یا اسی کے قریب قریب مرشدی نے ارشاد فرمایا (راوی کے طریقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ المرشدی نے شیخ شاذلی کے اعتراض کا یہ جواب کہنے والے سے سنے بغیر دیا تھا اور یہ ان کی عام عادت تھی بلکہ اس قسم کے بزرگوں کے متعلق عام تجربہ ہے کہ سوال سے پہلے ان کی طرف سے ہر ایک کو اپنے خیال کے مطابق جواب ملتا ہے.

ظاہر ہے کہ فرائض وواجبات یا شریعت کے دوسرے عام مطالبات سے یقیناً اسکندرانی کے اس اعتراض کا تعلق نہ تھا۔ اس کے متعلق کافی بحث میں پہلے کر چکا ہوں، اس قسم کی کوتاہیاں اگر مرشدی کی زندگی میں ہوتیں تو صرف جمعہ اور جماعت کے ترک ہی والے الزام کے منسوب کرنے پر لوگ قناعت نہ کرتے، نیز خود اس الزام کے متعلق بھی عرض کر چکا ہوں کہ سنی سنائی باتوں کی حد تک تو ان الزاموں کا اثر لوگوں پر باقی رہتا تھا، لیکن براہ راست شیخ مرشدی سے جو بھی ملا، اور جس طبقہ کے لوگوں کو ذاتی تجربہ ومشاہدہ کا موقع ملا، حافظ ابن حجر کی شہادت گذر چکی کہ ان کی بدگمانیاں بالکلیہ ختم ہو جاتی تھیں، ان لوگوں میں ابن سید الناس [illegible] اور [illegible] باعمل شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے خاندانی عقیدت مند بھی شریک ہیں پس بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت نکالنے کا مطالبہ شیخ اسکندرانی کی طرف سے جو کیا گیا تھا، اس مطالبہ کا تعلق یقیناً ان عام نوافل واوراد، اور دیگر صوفیانہ مشاغل سے تھا جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ صوفیانہ زندگی بسر کرنے والوں کے لئے ان کی پابندی بہرحال ضروری ہے، اور کوئی شبہ نہیں، کہ المرشدی کی مشغول زندگی کا جو نقشہ پیش کیا جاتا ہے اس قسم کی اژدحامی زندگی میں ان خاص صوفیانہ مشاغل کے لئے وقت نکالنا ناممکن تھا، جن کی پابندی کی توقع عموماً اس طبقہ کے لوگوں سے کی جاتی تھی، جلوت کی ایسی گرم مجلس میں کھلی ہوئی بات ہے کہ ان اوراد اور اذکار مراقبات ومحاسبات اشغال وغیرہ کی کیا گنجائش نکل سکتی ہے جن کے لئے تنہائی اور خلوت کی

ضرورت ہے شیخ اسکندرانی کا اپنی اس تنقید سے یقیناً ان ہی امور کی طرف اشارہ تھا جن کی تعبیر انھوں نے ایک عام اجمالی لفظ یعنی "خدا کی یاد" یا ذکر اللہ کے الفاظ سے فرمائی تھی اور جیسے اجمالی رنگ میں ان کا اعتراض تھا المرشدی نے بھی اس کا جواب اجمال ہی کے رنگ میں دیا ہے اور گو المرشدی کے جواب کے اس مجمل فقرے کے الفاظ عدداً بظاہر زیادہ ہیں لیکن میرے نزدیک اسی اجمال کی شرح المرشدی کا وہ پرمعنی فقرہ ہے جسے خاکسار نے اپنے اس مضمون کی پیشانی پر ثبت کیا تھا یعنی الیافعی کو دیکھ کر المرشدی نے جو فرمایا تھا کہ

ما اراها الا غزالیه (مرأۃ ص۲۹۳) نہیں پاتا ہوں میں اس شخص کو مگر غزالی کے طریقہ پر

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے تو یہ چند ہی الفاظ لیکن درحقیقت "اسلامی تصوف" کی ایک طویل تاریخ کا عکس ان ہی الفاظ میں جھانک رہا ہے،

شیخ مرشدی کے ان ارشاد فرمودہ الفاظ کا کیا مطلب ہے، مناسب ہے کہ اس مطلب کو بجائے میرے اس راہ کے ایک ماہر بصیر یعنی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سنئے اپنی مشہور کتاب انفاس العارفین میں شاہ صاحب نے اپنے عم محترم حضرت شیخ ابو الرضا محمدؒ کے ایک مکتوب گرامی کو نقل کرنے کے بعد اس خط کے بعض خاص جملوں کی شرح فرمائی ہے، اسی سلسلہ میں رقام فرماتے ہیں،

بدانکہ صوفیہ در تربیت سالکین دو مذہب دارند یک مذہب اوائل، کہ امام ابو محمد غزالی شرح و بیان او کرد و آں ایں ست کہ چوں کسے از مقتضیات طبیعت توبہ کرد او را می فرمایند کہ در خلوت نشیند و بخلق نیامیزد، و در جمیع حالات مخالفت نفس پیش گیرد، خود را چناں سازد کہ از شتم و ضرب نفس او شورش نہ کند و مدح و ذم مردم ہمہ نزدیک او مساوی شود، و نوافل اعمال بسیار کند، و دقائق ریا و عجب و سمعہ و غرور نیک بفہمد و در تفحص آنہا افتد و در لقمہ احتیاط تمام نماید و محل شبہ فرو گذارد و در قیام

معلوم ہونا چاہئے کہ خدا کی راہ پر چلنے والوں کی تربیت میں صوفیہ کے دو مختلف طریقے ہیں ایک طریقہ تو اوائل یعنی ان لوگوں کا ہے جو پہلے زمانے میں گذرے ہیں اور یہی وہ طریقہ ہے جس کی تشریح و تفصیل امام غزالیؒ نے فرمائی ہے حاصل اس طریقہ کا یہ ہے کہ طبیعت کے عام اقتضاء اور خواہشوں سے جب آدمی توبہ کرتا ہے تو اس کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ خلوت میں بیٹھے، اور عام مخلوق سے ملنا جلنا چھوڑ دے اور ہر حال میں نفس کی مخالفت کو اپنا وتیرہ بنائے اور اپنے آپ کو ایسا بنائے کہ گالی گفتہ، مار پیٹ سے اس کے نفس میں کسی قسم کی

وقعود واکل وشرب، وسائر حالات آداب را لازم گرداند وغیر ذالک ودریں امور اسقاط واثبات اعمالے کہ از قبیل قضایا شعریہ وعظیہ اند تمسک می نمائند۔

شورش پیدا نہ ہو اور لوگ تعریف کریں یا مذمت دونوں باتیں اس کے لئے برابر ہوجائیں نیز نفلی عبادتوں میں زیادہ مشغول رہے اور ریا وفخر وغرور وغیرہ کی باریک باتوں کو خوب سمجھتا ہو، ہمیشہ ان کی جستجو اور تلاش میں رہے اور لقمہ میں احتیاط کی راہ اختیار کرے اور شبہ کے لقمہ کو چھوڑ دے، اسی طرح نشست و برخاست، خورد ونوش میں مقررہ طریقوں کا پابند بن جائے امام غزالی نے ان امور کی نفی واثبات میں زیادہ تر شاعرانہ مقدمات جن سے وعظ گوئی میں کام لیا جاتا ہے ان ہی کو پیش کیا ہے۔

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ جب ان منزلوں کو طے کرالیا جاتا ہے تب

چوں از ہمہ پاک شد محبت خدا تعالیٰ راہ می دہند۔

جب سالک ان منزلوں سے گذر جاتا ہے تب اللہ تعالیٰ کی محبت کی راہ پر سالک کو ڈالتے ہیں۔

تربیت کے اس اصول کی تفصیل امام حجۃ الاسلام نے اپنی جن کتابوں میں فرمائی ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

چنانکہ بہ تفصیل در احیاء و کیمیا مبین است (انفاس ص ۱۴۲)

جیسا کہ احیاء العلوم اور کیمیاء سعادت میں امام غزالیؒ نے اس طریقہ کی تفصیل کی ہے۔

سچ پوچھئے تو تربیت کے اس خاص طریقہ کو "طریقۂ غزالیہ" کے نام سے المرشدی نے جو موسوم کیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ، اس خاص طریقہ کے سلوک کی جتنی تفصیل اور جتنے دل نشیں پیرائے میں اس کی تعبیر امام حجۃ الاسلام نے اپنی مذکورہ بالا کتابوں یا ان کے سوا دوسرے چھوٹے بڑے رسالوں میں فرمائی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ان ہی کی کتابیں مروج ہوگئیں اور آئندہ تصوف کی اس راہ کے بزرگوں نے جو کچھ بھی لکھا امام غزالی کی ان ہی کتابوں کو سامنے رکھکر لکھا۔ ورنہ جیسا کہ احیاء العلوم میں حجۃ الاسلام نے یہ ارقام فرمانے کے بعد کہ

لقد صنف الناس فی بعض هذه المعانی کتبا۔ (احیاء ص ۳ ج ۱)

ان مسائل کے متعلق جن کا میں اپنی اس کتاب یعنے احیاء العلوم میں ذکر کرونگا لوگ کتابیں لکھ چکے ہیں۔

خود اپنے کام کی خصوصیتوں کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

ولکن یتمیز هذا الکتاب عنها بخمسة امور الاول حل ما عقدوه، وکشف ما اجملوه والثانی ترتیب ما بددوه ونظم ما فرقوه الثالث ایجاز ما طولوه وضبط ما قرروه الرابع حذف ما کرروه واثبات ما حرروه والخامس تحقیق امور غامضة اعتاصت علی الافهام لم یتعرض لها فی الکتب اصلا۔ (ص ۴)

پہلے لوگوں کی تصنیف کردہ کتابوں میں اور میری اس کتاب میں صرف پانچ باتوں کا فرق ہے یعنی ان کے نزدیک جو مضامین پیچیدہ تھے ان کو میں نے حل کر دیا ہے اور جس چیز کو اجمالاً بیان کیا تھا، میں نے اس کی تفصیل کی ہے، یا غیر ضروری تفصیل جن مسائل کے بیان کرنے میں انھوں نے اختیار کی میں نے ان کو مختصر کر کے بیان کیا ہے اسی طرح جن اصولی باتوں کا پتہ ان کی کتابوں سے چلتا ہے میں نے ان کو منضبط کر دیا ہے اور بار بار دہرا کر جو باتیں کی گئی ہیں ان کو میں نے حذف کر دیا ہے اور جو فیصلے انھوں نے کیے تھے ان کو میں نے اور زیادہ مضبوط کر دیا ہے اور ان چار باتوں کے سوا پانچواں کام میں نے یہ کیا ہے کہ بعض مشکل باتیں جن کا سمجھنا لوگو کے لئے دشوار تھا اور ان کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا میں نے ان کی بھی تحقیق کی ہے۔

اپنی کتاب کی ان پانچ خصوصیتوں کو گنوانے کے بعد امام غزالیؒ آخر میں فرماتے ہیں کہ

فهذه خواص هذا الکتاب مع کونه حاویا لمجامع هذه العلوم۔ (ص ۴)

یہ ہیں میری اس کتاب کی خصوصیتیں ان خصوصیتوں کے سوا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ (صوفیہ کے) ان علوم پر میری یہ کتاب حاوی ہے

جس کے معنی یہی ہوئے کہ ان کی کتاب احیاء العلوم، سلوک و تربیت کے اس خاص طریقہ کی گویا انسائیکلوپیڈیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ترتیب و تہذیب، احتواء و احصاء کے اس کام کو امام

حجۃ الاسلام کے قلم سے زیادہ بہتر طریقہ پر مشکل ہی سے کوئی دوسرا انجام دے سکتا تھا، انتخاب طبعی کے عام قانون کے تحت امام کی کتاب نے اس سلسلہ کی دوسری کتابوں کو میدان سے ہٹا دیا تقریباً آٹھ ساڑھے آٹھ صدیوں سے اسلامی دنیا امام کی ان کتابوں کے مطالعہ میں مشغول و منہمک ہے۔ (باقی)

دو نئے دینی اخبار

"تعمیر لکھنؤ"۔ پندرہ روزہ ۲۰ × ۳۰ ۸/۱ سائز ۱۲ صفحے سالانہ چندہ ۶ فی پرچہ ۴ر لکھنؤ کے مشہور دینی دارالاشاعت اور دارالتعلیم "ادارۂ تعلیمات اسلام" کی طرف سے گزشتہ ستمبر ہی سے یہ پرچہ جاری ہوا ہے اور گویا ادارہ کا ترجمان ہے۔ محب محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس کے خاص لکھنے والوں میں ہیں، اور ناظرین الفرقان ان دونوں حضرات سے خوب واقف ہیں عموماً ہر اشاعت میں مولانا عبدالسلام صاحب کے ایک سے زیادہ مضامین اور کم از کم ایک مضمون مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کا بھی رہتا ہے اور یہ حضرات عموماً وہی لکھتے ہیں جس کی اس وقت مسلمانوں کو ضرورت ہے اور اسلام کی خدمت کا جو تقاضا ہے، دوسرے حضرات کے مضامین بھی عموماً مفید اور اچھے ہوتے ہیں —— بہرحال "تعمیر" دین کا درد و فکر رکھنے والے مسلمانوں کے تعاون کا پورا مستحق ہے، اس وقت اس طرح کے اخبارات و رسائل کی توسیع اشاعت کی کوشش بلاشبہ بڑی دینی خدمت ہے

منشان منزل بھوپال" دس: ۲۰ × ۳۰ ۸/۱ سائز ۸ صفحے سالانہ چندہ ۵ر فی پرچہ ۲ر، یہ پرچہ گزشتہ دسمبر ہی سے جاری ہوا ہے ابھی صرف ۶ نمبر نکلے ہیں، مسلمانوں میں سچا دینی جذبہ پیدا کرنا اور دین کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے ان کو واقف کرنا اس پرچہ کا خاص مقصد و موضوع ہے اور جو پرچے اب تک شائع ہوئے ہیں وہ سب اس مقصد کے حامل ہیں —— یہ پرچہ بھی دین سے وفادارانہ تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے تعاون کا پورا مستحق ہے۔

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٍ مِّنَ ٱلْهُدَىٰ وَٱلْفُرْقَانِ

جلد ۱۶ نمبر (۴) بابتہ ماہ ربیع الآخر سنہ [illegible]

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھیے!
الفرقان اور کتبخانہ الفرقان بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں
لہذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھیے!
دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ (یو۔پی)

چندہ سالانہ چار روپیہ
نمونہ کا پرچہ چھ آنہ

کتبخانہ الفرقان لکھنؤ کی مطبوعات

کلمہ طیبہ۔ (لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح) زیر طبع

نماز۔ (نماز کی عظمت اہمیت اور اسکی حقیقت) ؍

برکات رمضان۔ (از مدیر الفرقان) ۵؍

اسلام کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں؟ (از مدیر الفرقان)

یہ تازہ تالیف اصلاحی کتاب ہے جس میں دین کی اہم ہدایات اور بنیادی تعلیمات کو اسباق کی شکل میں مرتب کرکے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا اکثر حصہ الفرقان میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ اپنی اصلاحی اور افادی حیثیت سے اس لائق ہے کہ ہر مسلمان گھر میں اس کا ایک نسخہ ہو۔ (زیر طبع)

منصب تجدید کی حقیقت

تجدید و احیاء دین کے موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا قابل دید مقالہ جو "شاہ ولی اللہ نمبر" میں شائع ہوا تھا ۶؍

خطبات بمبئی (مدیر الفرقان کی آٹھ تقریریں) ۱۰؍

تدوین اصول فقہ (از قاضی عبدالرحمٰن ایم اے عثمانیہ)

فن اصول فقہ کی تاریخ اور اسکے ممتاز مصنفین اور انکی تصانیف کا تذکرہ اس کتاب کا موضوع ہے عجیب و غریب فاضلانہ تصنیف ہے۔ ۴؍

تحقیق مسئلہ ایصال ثواب (از مدیر الفرقان) اس مقالہ میں کتاب و سنت کی روشنی میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ زندوں کے اعمال سے مردوں کو نفع و ثواب پہنچ سکتا ہے یا نہیں۔ اس موضوع پر اردو میں پہلا علمی اور تحقیقی رسالہ ہے۔ ۶؍

فتنہ رفض و تفضیلیت کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی کا جہاد ۴؍

اللہ کا ایک وفادار بندہ (شاہ ولی اللہ) (از مولانا سید مناظر احسن گیلانی) ۱۲؍

امام ولی اللہ دہلوی (از مولانا سندھی مرحوم) ۱۰؍

مولانا محمد الیاسؒ اور انکی دینی دعوت ۱۲؍

مسلمانان عالم کی کمزوری کا بنیادی سبب ۶؍

مسلمانوں کی اصلی طاقت ۶؍

مسلمان قوم کی حالت ۶؍

میری زندگی کے تجربے (از مدیر الفرقان) ۶؍

بوارق الغیب (حصہ اول)
کاغذ سفید چکنا ۱۲؍
" رف سفید ۱۰؍

بوارق الغیب (حصہ دوم)
کاغذ سفید چکنا ۱۰؍
" رف سفید ۱۲؍

شارع حقیقی
کاغذ سفید چکنا ۴؍
" رف سفید ۳؍

رسالہ خدا شناسی ۴؍

احکام النذر لاولیاء اللہ و تفسیر ما اھل بہ لغیر اللہ ۳؍

مسئلہ حیات النبی کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ۱؍

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور زمانہ حال کے اہل بدعت ۳؍

اسلامی تمدن (از مولانا عبدالماجد صاحب)

عدم انجیل (اصلی انجیل کے دنیا سے ناپید ہونے کا ثبوت) ۴؍

اسلام اور نظام سرمایہ داری ۸؍

اسلام کا نظریۂ سیاسی (از مولانا مودودی) ۳؍

کتبخانہ الفرقان میں

مفید دینی اور اصلاحی کتابوں کے مہیا رکھنے کی خاص کوشش کیجاتی ہے

اس کے علاوہ

چونکہ لکھنؤ میں اور بھی چند بڑے بڑے کتبخانے ہیں جن سے کتابیں بروقت لیجا سکتی ہیں اس لئے اب آپ "کتبخانہ الفرقان" سے ہر قسم کی اچھی اور مفید کتابیں طلب فرما سکتے ہیں

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد (۱۶)	بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ	نمبر (۴)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحات
۱	چند ضروری دفتری باتیں	ناظم الفرقان	۲
۲	اپنے ناظرین سے	محمد منظور نعمانی	۳ - ۴
۳	نگاہِ اولیں	مولٰنا سید ابو الحسن علی ندوی	۵ - ۸
۴	عبرت کی باتیں	ادارہ	۹ - ۱۰
۵	اسلام کے تین بنیادی عقیدے	"	۱۱ - ۱۶
۶	حیاتِ طیبہ	جناب مولٰنا عبد الباری صاحب ندوی	۱۷ - ۳۸
۷	انتخاب	ادارہ	۳۹ - ۴۵
۸	"ایک سیدزادی روضۂ اقدس پر" (نظم)	(پردۂ راز میں)	۴۶ - ۴۷
۹	ایک مصرفِ خیر کی اطلاع	محمد منظور نعمانی	۴۸

(۱) الفرقان کے خریدار صاحبان

خط کتابت اور منی آرڈر میں صاف اور خوشخط اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر ضرور لکھا کریں۔ جو حضرات تساہل کرتے ہیں وہ دراصل ہمارے لئے بڑی تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ جن خطوط میں خریداری نمبر درج نہیں ہوتا، رجسٹر میں انکا نام تلاش کرنے میں کبھی کبھی کئی کئی گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اس بارہ میں آپ حضرات کبھی غفلت نہ فرمائیں ورنہ اندراجات کی غلطی کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

(۲) یہاں سرخ پنسل کا نشان ▭

اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ہمارے حساب سے ختم ہو چکی ہے اسی واسطے آپ کو منی آرڈر فارم بھیجا جا رہا ہے براہِ کرم آئندہ کیلئے اپنا چندہ آپ فوراً منی آرڈر سے روانہ فرمادیں۔ اگر کسی وجہ سے آپ کچھ دنوں کے بعد بھیجنا چاہیں یا آئندہ خریداری جاری رکھنے کا ارادہ نہ ہو تو فوراً اطلاع دیں، ورنہ اگلا پرچہ حسب قاعدہ وی۔ پی روانہ ہوگا جس کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

ناظم دفتر الفرقان

چند ضروری دفتری باتیں

(۱) الفرقان کے پرانے خریداروں میں قریباً چار سو ایسے تھے جنکی خریداری ذی الحجہ پر ختم ہوتی تھی ان کو حسب قاعدہ ذی الحجہ کے رسالہ کے ساتھ ختم مدت خریداری اور آئندہ وی پی آنے کی اطلاع دی گئی۔ کچھ حضرات نے آئندہ کیلئے منی آرڈر سے چندہ روانہ کردیا، بعض حضرات نے آئندہ خریداری سے معذوری کی اطلاع دیدی، قریباً تین سو حضرات کی طرف سے کوئی اطلاع نہ آئی ان سب کو سابقہ اطلاع اور قاعدہ کے مطابق محرم کا رسالہ وی پی روانہ کردیا گیا۔ افسوس ہے کہ ان میں سے قریباً ۸۰ — ۹۰ حضرات کے وی پی واپس آئے، اگر یہ حضرات صرف دو پیسے کا کارڈ لکھ کر پہلے سے اطلاع دیدیتے تو دفتر الفرقان کا نقصان نہ ہوتا۔ آئندہ کیلئے احباب کرام اس کا لحاظ رکھیں۔

(۲) الفرقان پوری احتیاط سے تمام خریداروں کو روانہ کیا جاتا ہے جن صاحب کو نہ ملے انھیں سمجھنا چاہئے کہ ڈاک سے ضائع ہو گیا، اور دفتر کو اطلاع دے کر دوبارہ رسالہ منگوالینا چاہئے۔

(۳) ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ سے ہر مہینہ کا رسالہ انشاء اللہ مہینہ کے اندر اندر شائع ہو جایا کریگا لہذا جس مہینہ کا رسالہ اگلے مہینے کی ۱۵ تاریخ تک جن حضرات کو نہ ملے وہ بلا تاخیر دفتر کو اسکی اطلاع دیدیا کریں۔ آئندہ سے صرف انہی حضرات کو دوبارہ پرچہ روانہ کرنے کی ذمہ داری دفتر پر ہو گی، جنکی اطلاع اگلے مہینے کی ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچے گی۔

---

(۴) اس وقت دفتر الفرقان اور کتب خانۂ الفرقان کے کارکن قریباً سب نئے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہر کام کو صحیح طور پر اور بروقت انجام دے سکیں لیکن تجربہ اور واقفیت کی کمی کی وجہ سے بعض اوقات ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے اور دیر بھی۔ لہذا حساب یا تعمیل میں جو غلطی کسی صاحب کے علم میں آئے براہ کرم وہ اس سے مطلع فرمائیں کہ تلافی کی جاسکے۔ ہمیں اُمید ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد دفتر اور کتب خانہ کا کام و نظام بالکل درست ہو جائے گا۔

(۵) گزشتہ مہینہ ربیع الاول کا رسالہ دفتر میں ختم ہو گیا ہے جو حضرات باقاعدہ فائل نہ رکھتے ہوں اگر وہ اپنا رسالہ دفتر الفرقان کو بہ قیمت دیدیں تو ہم ممنون ہوں گے۔ ناظم دفتر الفرقان لکھنؤ

(۶) بہت سے حضرات کتب خانہ الفرقان کی فہرست طلب فرماتے ہیں۔ عرصہ سے کتب خانہ کی کوئی فہرست نہیں چھپ سکی ہے انشاء اللہ عنقریب تیار ہو جائیگی۔

اپنے ناظرین سے

از - محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

اخوانِ دینی! وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ سلام و رحمت!!

الفرقان کے باقی و جاری رہنے کیلئے خریداروں میں جتنے اضافہ کی ضرورت تھی، اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم ہے کہ مخلص دوستوں کی پرخلوص کوششوں سے وہ تعداد اب قریب قریب پوری ہوچکی ہے دعا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے ان بندوں کو جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے بڑے خلوص اور درد کے ساتھ الفرقان کے مالی مسئلہ کو حل کرنے اور میرا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے یہ کوششیں فرمائیں ——— اب جبتک الفرقان جاری رہے گا اور دین کی خدمت و دعوت کا جو کچھ کام اس کے ذریعہ ہوگا اور اللہ کے جن بندوں کی ہدایت و اصلاح کا وہ ذریعہ بنے گا، انشاء اللہ ان سب چیزوں کا اجر و ثواب ان تمام محبین و مخلصین کے نامۂ اعمال میں بھی درج ہوتا رہے گا۔

اب دوسرا کام جو درحقیقت اصلی کام ہے وہ یہ ہے کہ الفرقان کے پیغام اور اسکی دعوت کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے ——— حالات کا علم رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اسوقت خاصکر ہندوستان میں دین کی دعوت و حفاظت کی کوششوں کی ضرورت پہلے سے ہزاروں درجہ زیادہ بڑھ گئی ہے اور اسکی علامتیں بالکل ظاہر ہوچکی ہیں کہ مستقبل میں اللہ کے صرف وہی بندے اس ملک میں دین پر ثابت اور اللہ کے عہد پر قائم رہ سکیں گے جو واقعی سچے اور پکّے مومن ہوں گے اور جو دین پر چلنے اور دین کے ساتھ جینے اور مرنے کیلئے اعزاز و منصب، اور بڑی سے بڑی دولت و وجاہت کو قربان کرسکنے کی ہمت رکھتے ہوں گے، یعنی دین سے جن کا تعلق ہر دوسرے تعلق پر اور اللہ و رسول سے انکی وفاداری ہر دوسری وفاداری پر اور جنت کا شوق ہر دوسرے شوق پر غالب ہوگا۔ مسلمانوں میں ایمان و استقامت کی اسی صفت کو عام کرنا اسوقت الفرقان کا خاص موضوعِ دعوت ہے اور اس سلسلہ میں جس علمی جدوجہد کی ضرورت ہے اور چند برسوں سے جس کا سلسلہ

شروع ہے، الفرقان اس کا آرگن اور "پیام بر" ہے — ہندوستان کے کروروں مسلمانوں میں سے اگر لاکھوں تک بھی ہم اپنا پیام نہ پہنچا سکے تو ظاہر ہے کہ اس مقصدِ عظیم میں ہم کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکیں گے۔ اسلئے خاصکر ہندوستان میں الفرقان کے پیام کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہونچانا ہمارا فرض ہے جس کی چند قابلِ عمل صورتیں یہ ہیں۔

(۱) الفرقان منگوانے والے حضرات دین کی خدمت و دعوت کی نیت سے اپنا پرچہ دوسرے پڑھے لکھے مسلمانوں کو مطالعہ کیلئے عاریتہً دیدیا کریں اور خوشامد و لجاجت کیساتھ اُنسے مطالعہ کی درخواست کریں۔

(۲) الفرقان کے خاص خاص دعوتی اور اصلاحی مضامین مساجد میں اور مجمعوں اور بیٹھکوں میں خود جاکر سنایا کریں اور جو بات وضاحت کی محتاج ہو اُسکی زبانی وضاحت بھی کر دیا کریں۔

(۳) جن مقامات پر اور جن حلقوں میں الفرقان بالکل نہیں جاتا ہے وہاں خود جاکر کسی پڑھے لکھے مسلمان بھائی کو الفرقان منگوانے کی ترغیب دیں اور اگر کوئی صاحب منگوانے کیلئے آمادہ نہ ہوں تو وہاں کے رہنے والے کسی ایسے مسلمان کا پتہ دفتر الفرقان کو لکھدیں جن سے یہ اُمید ہو کہ وہ الفرقان کی دینی دعوت کی طرف توجہ کرینگے اور اس کا پیام دوسروں کو بھی پہنچائیں گے۔ انشاءاللہ ایسے حضرات کو الفرقان دفتر کی جانب سے کسی نہ کسی طرح جاری کر دیا جائے گا۔

مستقبل میں مسلمانوں کو دین پر قائم رکھنے کیلئے اور ان میں اسلامی رُوح اور ایمانی سیرت پیدا کرنے کیلئے ہمارے پاس جو پیام اور پروگرام ہے، اگر ممکن ہوتا تو ایک ایک مسلمان بھائی کی خدمت میں خود حاضر ہو کر ہم اپنی بات پہنچاتے۔ لیکن چونکہ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے اسلئے کسی نہ کسی درجہ میں اس کا بدل یہی ہو سکتا ہے کہ الفرقان کے ذریعہ اپنا پیام جتنے بھی مسلمانوں تک پہنچا سکتے ہوں پہنچائیں اور جہاں خود پہنچ کر اپنا دردِ دل سنا سکتے ہیں وہاں جانے میں دریغ نہ کریں ـــــ مسلمانوں میں نئے سرے سے دینی زندگی اور ایمانی استقامت پیدا کرنے کیلئے ہمارے سامنے اِسوقت پیام رسانی اور دعوت کے یہی دو ذریعے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ اپنے مقدور بھر ان سے کام لینے میں کمی نہ کریں، اور دعوت کی رفتار کو زیادہ تیز اور وسیع کرنے کے جو وسائل فی الحال ہم کو نصیب [illegible] کیلئے ہم اللہ سے دعا بھی کرتے رہیں یقیناً اسباب و وسائل کے سب خزانے اُس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اِلَیْكَ نَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِنَا وَقِلَّةَ حِیْلَتِنَا وَھَوَانِنَا عَلَی النَّاسِ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ۝

باسمہ سبحانہ حمداً وسلاماً

نگاہِ آوّلیں!

(از- جناب مولٰنا سید ابو الحسن علی ندوی)

اخلاق وسیرت کے اعتبار سے دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ رہے ہیں، ایک وہ جن میں کسی عقیدہ، کسی اُصول اور کسی صداقت پر زیادہ دیر تک قائم رہنے اور اس کیلئے کسی مخالفت اور کسی آزمائش کا مقابلہ کرنے کی بالکل طاقت نہیں ہوتی، وہ کسی عقیدہ واصول پر اسوقت تک قائم رہ سکتے ہیں جبتک سارا ماحول اور ساری فضا اس کیلئے سازگار ہو، اور اس کو سوسائٹی کی تائید اور سرپرستی حاصل ہو، واقعات اسکی تصدیق وتوثیق کر رہے ہوں، اس کے ماننے والوں کی مادی کامیابیاں اسکی صداقت پر مہر تصدیق لگا رہی ہوں، کوئی قابلِ التفات آواز اسکے خلاف نہ اُٹھ رہی ہو اسوقت اس عقیدہ پر ان کا اطمینانِ قلب بہت بڑھ جاتا ہے اور انکی ذہانت اپنا پورا کام کرنے لگتی ہے، اور ہر طرف ان کو اسکی تائید ہی تائید نظر آتی ہے لیکن جیسے ہی مطلع غبار آلود ہوتا ہے، زمانہ کے تیور بدلتے نظر آتے ہیں، ان کا سینہ تنگ اور ذہن کند ہونے لگتا ہے، قوتِ ارادی اور قوتِ عمل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جواب دینے لگی ہے، کان میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غیبی آواز آرہی ہے کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" اور "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"

قرآن مجید میں اس صورت حال کی نہایت سچّی اور بلیغ تصویر کھینچی گئی ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ (بعض آدمی اللہ کی بندگی ایسے طور پر کرتے ہیں جیسے کسی کنارہ پر کھڑے ہوں، اگر ان کو کوئی نفع پہونچتا ہے تو ان کو قرار رہتا ہے اور اگر کوئی آزمائش ہو جاتی ہے تو اپنے منہ کے رخ پر پلٹ جاتے ہیں)

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے کہ جبتک ان کو نرم وہموار راستہ ملتا رہتا ہے وہ دھیمی چال چلتے رہتے ہیں انھیں کسی خاص عزم وجوش اور قوتِ ارادی کا احساس نہیں ہوتا، لیکن جیسے ہی انکے راستہ میں رکاوٹیں آتی ہیں، ٹیلے اور چٹانیں ان کو اپنے ارادہ سے باز رکھنا چاہتی ہیں، خاردار جھاڑیاں انکا دامن پکڑتی ہیں،

سنگریزے اور پتھر انکے پاؤں پڑتے ہیں، راستہ کی دل آویزیاں ان کو پھسلاتی ہیں ان میں منزلِ مقصود کا عشق ترقی کرتا ہے، اپنے سفر کی تکمیل کا ارادہ جنون کی حد کو پہونچ جاتا ہے، انکی رفتار اور طاقت کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے، ان کو نہ راستہ کی ناہمواری کا احساس رہتا ہے، نہ مسافت کی زیادتی کا، نہ اپنے تکان کا، میدانی ندی آہستہ آہستہ اور مزے مزے سے بہتی رہتی ہے، لیکن پہاڑی دریا کو جب کوئی مغرور چٹان یا عندی پتھر اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ جوش میں آکر آبشار کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اپنی آواز سے کوہ وصحرا کو پر شور بنا دیتا ہے اور اپنے زور میں چھوٹی چھوٹی چٹانوں کو بہا کر اور بڑے بڑے پتھروں کو گرا کر سرمہ بنا دیتا ہے اسوقت اسکے جوش کے سامنے نہ ہاتھیوں کے پاؤں جم سکتے ہیں نہ پہلوانوں کے پنجے، یہی حال اہلِ یقین کا ہے کہ جب ان کو ہر طرف مزاحمتیں اور آزمائشیں نظر آتی ہیں، تو ان کا اپنے عقیدہ پر ایمان، اپنے اصول کی صداقت کا یقین اور اس پر قائم رہنے کا جذبہ اور جوش اور بڑھ جاتا ہے، ہر رکاوٹ میں ان کو اپنے عقیدہ کی صحت کی نئی دلیل اور ہر آزمائش میں ان کو اپنے مسلک کی صداقت کا تازہ ثبوت نظر آتا ہے کہ روزمرہ کے واقعات، طبعی عادات اور نفس کی خواہشات سے عقائد و اصول کو جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ انکے راستہ کی مشکلات اور اس راہ کی آزمائشیں ہی ہیں، قیمت کی زیادتی اور سودے کی کمیابی اسکی بیش قیمتی اور مقبولیت کی دلیل ہے، اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّة (حدیث) یاد رکھو اللہ کا سودا بڑا قیمتی ہے، اللہ کا سودا جنت ہے، اس سودہ کی خریداری طبعی ناگواریوں کے بغیر ممکن نہیں حفت الجنة بالمکارہ وحفت النار بالشہوات (جنت ان تمام چیزوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں اور جہنم ان تمام چیزوں سے گھری ہوئی ہے جو نفسانی و طبعی طور پر نہایت خوشگوار ہیں)

اسی لئے جب رکاوٹوں، دقتوں اور وقت کی آزمائشوں میں لوگوں کیلئے تذبذب تردد کا سامان ہوتا ہے اہلِ یقین کیلئے یقین کی ترقی اور اطمینان کی زیادتی کا سامان ہوتا ہے، موجوں کے تھپیڑوں سے وہ سمجھتے ہیں کہ جہاز سمندر میں آچکا ہے اور اپنے سفر پر روانہ ہے، گو ندی میں لگے ہوئے اور خشکی پر کھڑے ہوئے جہاز کیلئے کیسی موج اور کہاں کا تلاطم؟ مزاحمتوں سے وہ سمجھتے ہیں کہ اب ہماری دعوت اور ہمارے عقیدہ نے اپنا طبعی سفر شروع کر دیا ہے اور یہ جو کچھ پیش آرہا ہے اسکی قدرتی منزلیں ہیں، قافلہ

اگر صحیح سمت کی طرف روانہ ہوا ہی تو اس کو راستہ کی وہ سب منزلیں اور مقامات ملیں گے جو واقف کار رہنما نے بتلائے تھے اور انکی پیش گوئی کی تھی، اسلئے ان منزلوں کے پیش آنے سے قافلہ کے ہمراہیوں کو اپنے سفر کی صحت اور اپنے رہنما کی بصیرت پر اعتماد بڑھتا ہی کہ یہ جو کچھ پیش آرہا ہو بالکل وہی ہے جسکی اس نے خبر دی تھی فَلَمَّا رَأَ الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا جب غزوہ خندق کے موقع پر اہل ایمان نے مخالفین کی فوجوں کو دیکھا تو انھوں نے کہا کہ یہی ہی جس کا اللہ اور اُسکے رسُولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اُسکے رسُولؐ نے سچ کہا تھا اور اس سے انکے ایمان و تسلیم میں ترقی ہی ہوئی۔

راستہ کی مشکلات اہلِ یقین اور اہلِ عزم کیلئے تازیانۂ شوق کا کام دیتی ہیں ان سے انکی ذہانتیں اُبھرتی اور طاقتیں اُبلتی ہیں، علم و تمدن کی ترقی میں بھی مشکلات کا بڑا ہاتھ ہی اور اہل دین کی رُوحانی ترقی میں بھی مشکلات کا بڑا دخل ہی اگر مشکلات نہ ہوتیں تو قوتیں ٹھٹر کر رہ جاتیں، ذہانت کے بہت سے چشمے خشک ہو جاتے، انسانی کوششیں اور انسانی ذہن سیدھی پٹری پر آرام سے چلنے کے عادی ہو جاتے، زندگی کے مسائل و مشکلات میں دماغ اجتہاد سے اور قوائے عمل مقابلہ و جہاد سے عاری ہو کر رہ جاتے۔ زندگی کے دریا کی سطح بالکل ساکن ہوتی جس پر کائی جمی ہوتی، سچ پوچھئے تو مشکلات سے بہت کچھ زندگی کی ہماہمی اور چہل پہل قائم ہے۔

سہولتوں اور راحتوں کی فراہمی جمود و غفلت کا پیش خیمہ ہی اور جمود و غفلت قوموں کے زوال، سلطنتوں کے سقوط اور عام بربادی کا مقدمہ ہی، دنیا کے مسلمانوں پر بھی اور ہندستان کے مسلمانوں پر بھی سہولتوں اور راحتوں کا طویل دَور گذرا اور اسکے نتیجہ کے طور پر وہ طویل عرصہ تک جمود و غفلت کا شکار رہے، اور اس کا طبعی نتیجہ ظاہر ہوا، اب تمام دنیا میں مشکلات کا دور ہی یہ دور اگر انھوں نے صبر و استقامت سے گذار دیا اور انکے قوی بیدار ہو گئے تو انکی تاریخ کے نئے اور بہتر دور کا آغاز ہوگا جس کی پیشگوئی وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ کہکر کی گئی، اور جسکی طرف سے إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا دو دو بار کہکر اطمینان دلایا گیا۔ حقیقت یہ ہی کہ مشکلات سے کہیں زیادہ راحتوں اور سہولتوں کا دَور

خطرناک امتحان ہے کہ اس میں ذراسی چوک بڑی گرفت کا سامان بن جاتی ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (جب وہ ان چیزوں کو بھول گئے جوان کو یاد دلائی گئی تھیں تو ہم نے ہر چیز کے دروازے ان پر کشادہ کر دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر اترا گئے جوان کو دی گئی تھیں ہم نے ان کو دفعۃً پکڑ لیا پھر وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے)۔

اور راحتوں اور سہولتوں کے دور میں ہوشیار و خبردار رہنا اور دولت و قوت کے نشہ سے سرشار نہ ہونا بڑا مشکل اور قوموں کی تاریخ کا بڑا نادر واقعہ ہے، یہ انبیاء علیہم السلام کے جانشینوں اور صدیقین و صالحین ہی کا کام ہے جن کی اعلیٰ روحانی و اخلاقی تربیت ہو چکی ہو، ورنہ

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے — صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و خرد و علم و ہنر ہے خس و خاشاک

ہندو دوستوں کیلئے تحفہ

تعلیم یافتہ غیر مسلم حلقوں میں اسلام کی دعوت پہنچانے کیلئے اور ان کو زندگی کی موجودہ مشکلات و مسائل کو حل کرنے کیلئے اسلام کے بتائے ہوئے راستہ کی طرف متوجہ کرنے کیلئے مجلسِ اشاعت لکھنؤ نے ہندی میں اپنا لٹریچر شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں تین رسالے "ٹنڈن جی سے" "روشنی کا مینار" اور "آنکھوں کی سوئیاں" شائع ہو چکے ہیں۔ جو حضرات اپنے ہندو دوستوں، افسروں یا ماتحتوں کو پیش کرنے کیلئے یہ رسالے منگوانا چاہیں وہ دفتر "الفرقان" سے طلب کر سکتے ہیں۔ ایک رسالہ کی قیمت ۲ر ہے۔ زیادہ تعداد میں منگوانے والے حضرات کو پچیس فی صدی کمیشن۔ اُمید ہے کہ مسلمان ان رسالوں کو بڑی تعداد میں منگوا کر اور اہتمام کے ساتھ اپنے ہندو احباب کی خدمت میں پیش کر کے دعوت کے فریضہ سے عہدہ برآ ہونگے نیز اس کے ذریعہ سے دوسرے مفید رسالوں کی اشاعت کیلئے سامان مہیا کرینگے۔

(ناظم) محمد اسحاق۔ سکریٹری مجلس اشاعت لکھنؤ۔

عبرت کی باتیں :

کچھ دن ہوئے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے یہ اصول طے کیا تھا کہ آئندہ اس ملک میں رہنے والے سب فرقوں اور سب آدمیوں کے لئے ایک ہی مشترک قانون ہوگا ــــــ (گویا انگریزی دور میں بھی مسلمانوں کے لئے جو یہ اصول طے شدہ تھا کہ نکاح و طلاق اور وراثت جیسے ان کے خاص معاملات اسلامی قانون کے مطابق طے ہوا کریں گے، آئندہ یہ صورت بھی نہ رہے گی بلکہ جو ملکی قانون ہوگا اسی کے مطابق مسلمانوں کے یہ معاملات بھی فیصل ہوا کریں گے) ــــــ لکھنؤ کے ایک "مسلمان" بیرسٹر صاحب نے اپنے ایک مضمون مندرجہ نیشنل ہیرلڈ مجریہ ۲۶ دسمبر میں بڑی مسرت کے ساتھ دستوری اسمبلی کے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا ہے اور اس پر بڑی طمانیت اور خوشی کا اظہار کیا ہے "صدق لکھنؤ" کے الفاظ میں اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے

"بڑی خوشی کی بات ہے کہ ملک اب صحیح خطوط پر ترقی کر رہا ہے۔ چنانچہ دستوری اسمبلی نے اسے منظور کر لیا ہے کہ ملک کے لئے ایک مشترکہ ضابطہ ہوگا...... انگریزوں کے زیر حکومت رہتے رہتے ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ ہندوؤں کے لئے ہندو قانون اور مسلمانوں کے لئے اسلامی قانون۔ لیکن اس دقیانوسی خیال کیلئے دنیائے جدید میں کوئی جگہ نہیں۔ یورپ مدت ہوئی اس منزل سے آگے نکل چکا ہے۔ فرانس میں جرمنی میں سب کہیں ایک ہی قانون سب کے لئے عام ہے.... فوجداری قانون آخر ہندوستان میں بھی سب کے لئے مشترک ہے..... لے دے کے صرف دو معاملے ذرا الجھے رہ جاتے ہیں ایک معاملہ نکاح کا دوسرا ترکہ کا۔ سو نکاح میں بھی اگر "سول میرج" (قانونی شادی) کی رسم عام کر دی جائے (جو کہ میرے خیال میں ہونی چاہیے) تو رسوم نکاح سب بے معنی مضحکہ خیز ہو کر رہ جائیں گے اسی طرح تقسیم ترکہ کا بھی ایک ہی قانون سب کے لئے ہونا چاہیے۔ جیسا کہ تعلقداری کا قانون سب کے لئے ایک ہے"

ان بیرسٹر صاحب کی یہ رائے اور یہ اظہار مسرت کسی تبصرہ کے محتاج نہیں، افسوس اس کا نہیں کہ ایک شخص نے اپنا یہ خیال کیوں ظاہر کیا۔ ہر شخص اپنی رائے کا مالک ہے ہاں قلق اس کا ہے کہ ان خیالات کے باوجود بھی یہ صاحب مسلمانوں میں گنے جاتے رہیں گے گویا مسلمان ہونے کے لئے اب اس کی بھی ضرورت نہیں رہی کہ اسلامی احکام و تعلیمات کی صحت اور بہتری پر بھی یقین و اعتقاد ہو۔ اسلامی احکام و تعلیمات کو

نادرست اور نامناسب سمجھنے اور برملا اس خیال کا اظہار کرنے کے باوجود اسلام سے اور اسلامی معاشرہ سے وابستہ رہنا دین کی نظر میں تو نفاق اور جرم عظیم ہے ہی لیکن ہمارے خیال میں عقل عام کی نگاہ میں بھی یہ بڑے گھٹیا درجہ کی بے اصولی اور ساوتی قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔

(۲)

ایک محترم دینی رفیق اور ممتاز عالم دین نے (جو بفضلہ تعالیٰ صلاح وتقویٰ میں بھی ممتاز ہیں) لکھنؤ کے ایک بیرسٹر صاحب کا واقعہ راقم سے خود بیان کیا کہ —— اسمبلی کے گزشتہ الکشن میں اودھ کے ایک ضلع کی مسلم سیٹ پر یہ بیرسٹر صاحب امیدوار تھے۔ فلاں بڑے عالم و بزرگ کی معیت میں اور ان ہی کے حکم سے ایک دو دفعہ مجھے بھی ان کی انتخابی کوشش میں ان کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا —— بیرسٹر صاحب ان دوروں میں بڑی پابندی سے ہمارے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے اور دیر تک نفلیں پڑھا کرتے تھے یہانتک کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں بھی سنتوں نفلوں سے فارغ ہو گیا اور حضرت مولانا..... بھی فارغ ہو گئے اور دیر تک ہم دونوں کو بیرسٹر صاحب کی فراغت کا انتظار کرنا پڑا —— لیکن پھر معلوم ہوا کہ یہ نمازیں غالباً صرف الکشنی تھیں۔ اور اب تو ان ہی بیرسٹر صاحب کا حال یہ ہے کہ غیر اسلامی قانون و دستور کو وہ برملا اسلامی قانون و دستور پر ترجیح دیتے ہیں! اور اسلام کو دقیانوسی خیالات و رسوم کا مجموعہ سمجھتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ اسلام کو باہر سے یعنی کھلے غیر مسلموں سے کوئی خطرہ نہیں —— ہاں اُن نام کے مسلمانوں سے بہت بڑا خطرہ ہے جو یقین کی دولت اور پختہ سیرت سے محروم ہیں اور —— چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی —— جن کا مذہب ہے۔

موقع پرست اور کمزور سیرتوں کے لوگوں کا وجود جس ملت میں بھی ہو اس کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے اور خصوصاً ہندوستان میں اس وقت جس نئے دور کا آغاز ہے اس میں تو ایسے لوگوں کا اسلامی معاشرہ میں رہنا ہماری دینی حیات کے لئے نہایت ہی خطرناک ہے

اسلام کے تین بنیادی عقیدے
اور
موجودہ مسلمان قوم

اسلام میں تین عقیدوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے مطلب یہ ہے کہ ان تین عقیدوں پر ایمان ویقین جتنا گہرا اور حقیقی ہوگا عملی زندگی اتنی ہی اسلامی تعلیمات اور ہدایات کے مطابق ہوگی اور جس قدر یہ یقین کمزور اور ڈھیلا ہوگا زندگی اسلامی معیار سے اسی قدر پست ہوگی —— ان ہی عقیدوں کو امہات العقائد یعنی بنیادی عقیدے کہتے ہیں۔

(۱) ان میں پہلا عقیدہ یہ ہے کہ اس ساری کائنات کا ایک خالق ومالک ہے وہی اس کے پورے نظام کو چلا رہا ہے اور وہی ہمارا پروردگار اور پالنہار ہے یعنے دراصل وہی ہماری زندگی کی ساری ضرورتیں مہیا کرنے والا ہے اور ہر ایک کا بناؤ بگاڑ اور نفع نقصان سب اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہم سب اسی کے بندے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اسی کی عبادت کریں اور پوری زندگی اس کی بندگی اور فرماں برداری میں گزاریں ——

(۲) اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اس دنیوی زندگی کے خاتمہ کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں ہر ایک کو یہاں کی برائی بھلائی کا بدلہ ملے گا اور وہ زندگی چونکہ دائمی اور ابدی ہوگی جس کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا اس لئے وہ اس دنیوی زندگی سے زیادہ فکر کے قابل ہے اور وہاں فلاح ونجات صرف وہی لوگ حاصل کرسکیں گے جو اس دنیا میں اپنے خالق ومالک کی مرضی کے تحت اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گذار کے جائیں گے۔

(۳) تیسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اس دنیا کے خالق اور پروردگار کی طرف سے وقتاً فوقتاً اسکی ہدایتیں

اور اسی کے احکام لے کر پیغمبر آتے رہے ہیں یہ سب اللہ کے مقدس بندے تھے اور انکی تعلیمات و ہدایات دراصل اللہ کی تعلیمات و ہدایات تھیں اور اس لئے ہر قوم کے واسطے اپنے پیغمبر کی پیروی اور تابعداری ضروری تھی۔ اس سلسلہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جو اپنے زمانے کے اور بعد میں پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے واسطے خدا کا پیغام اور اس کی ہدایات لائے اب اس دنیا کے خاتمہ تک تمام انسانوں کے لئے ان کی لائی ہوئی خداوندی ہدایات واجب العمل ہیں اور اب کوئی شخص بھی ان کی اطاعت و پیروی کے بغیر اپنے خالق اور پروردگار کی رضامندی حاصل نہیں کر سکتا اور اس کی خاص رحمت و محبت کا مستحق نہیں ہو سکتا ؎

محال ست سعدی کہ راہ صفا　　تواں رفت جز در پے مصطفا

خلاف پیمبر کسے رہ گزید　　کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

سب جانتے ہیں کہ یہ تین عقیدے اسلام کے بنیادی عقیدے ہیں بلکہ کسی شخص کے مومن و مسلم ہونے کے لئے تو ان کے علاوہ بھی چند اور حقیقتوں پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے لیکن بہر حال اُن کا درجہ اِن تین کے بعد ہی ہے اور اساسی و بنیادی حیثیت اِن ہی کو حاصل ہے۔

ان تین بنیادی باتوں کو مان لینے اور ان پر ایمان لانے کے بعد چند باتیں آدمی پر آپ سے آپ لازم ہو جاتی ہیں گویا وہ ان کے لازمی اور منطقی نتائج ہیں۔

مثلاً یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے ـــــ کسی منفعت کی امید اور کسی نقصان یا تکلیف کا خوف حقیقی طور پر اس کے سوا کسی سے نہ ہو ـــــ ربِ حقیقی اور آقائے برحق ہونے کی حیثیت سے اس کے احکام کی تعمیل کی جائے اس کے حکموں کو تمام حکموں سے بالاتر سمجھا جائے اور ہر دوسری چیز سے زیادہ اس کی رضاجوئی کی فکر کی جائے ـــــ اس کے مقابلہ میں کسی کو ترجیح نہ دی جائے۔

پہلے عقیدہ (توحید) کے یہ سب لازمی نتائج ہیں۔

اسی طرح دوسرے عقیدے (حیات بعد الممات) کے لوازم یہ ہوں گے کہ

آخرت کی فکر سب دنیاوی فکروں پر غالب ہو گی ـــــ اپنے ہر عمل اور اقدام میں آدمی یہ خیال رکھے گا کہ اس کا انجام آخرت میں کیا ہو گا عذاب ہو گا یا ثواب ـــــ اگر کوئی منفعت یا عزت اس دنیا میں

ایسے طریقے سے حاصل ہوتی ہوگی جس کا انجام آخرت میں عذاب ہو تو آخرت پر سچا ایمان و یقین رکھنے والا آدمی ہرگز اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور ایسی منفعت و عزت سے اپنے کو دور رکھے گا

اسی طرح تیسرے عقیدے (رسالت) کے لازمی نتائج یہ ہوں گے۔ کہ اس پر ایمان رکھنے والا آدمی اللہ کے سارے پیغمبروں کو اس کے برگزیدہ بندے اور انسانیت کے سب سے بڑے محسن سمجھے گا ــــ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس دور کا پیغمبر اور آخری نبی سمجھتے ہوئے اپنی اور اس دور کے سارے انسانوں کی نجات وفلاح آپ پر ایمان لائے اور آپ کی پیروی کرنے میں منحصر جانے گا ــــ آپ کی لائی ہوئی شریعت اور آپ کے بتلائے ہوئے طریقہ زندگی کو اللہ کا الہام کیا ہوا دستور العمل جانتے ہوئے انسانی زندگی کے تمام دوسرے طریقوں اور ضابطوں سے بہتر اور صالح تر یقین کرے گا اور اپنے لئے اور ساری دنیا کے لئے اسی کو پسند کرے گا ــــ آپ کے اتباع اور آپ کی پیروی کو انسانیت کی سعادت اور آپ کی نافرمانی کو شقاوت و بدبختی سمجھے گا۔

اسلام کے ان تینوں بنیادی عقیدوں کے یہ سب ایسے لوازم ہیں جن کی لازمی حیثیت کو ہر سمجھدار آسانی سے سمجھ سکتا ہے

پھر ہر ایک کے لئے یہ اندازہ کرنا بھی آسان ہے کہ ان تین عقیدوں پر اگر کسی کو پورا پورا ایمان اور کامل یقین ہو (جیسا کہ ہونا چاہیے) اور ان کے مذکورہ بالا لوازم ونتائج بھی ظاہر ہو جائیں (جن کا ظہور لازمی ہے) تو اس شخص کی سیرت کیسی ہوگی اور اس دنیا میں وہ زندگی کس طرح گزارے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بندہ ہوگا اس کی عبادت اور بندگی کرے گا اس کے احکام پر چلے گا اسی سے ڈرے گا اور اسی سے امیدیں رکھے گا اس کی مخلوق کا ہمدرد اور خیر خواہ ہوگا اور اس کا ہر کام خودغرضی اور تنگ نظری سے بالاتر ہوگا اور اللہ کی مخلوق کے لئے اس کا وجود سراسر رحمت ہوگا

اسی طرح دنیا سے زیادہ وہ آخرت کی فکر کرے گا اور یہاں کی منفعتوں اور لذتوں کے لئے اپنے دوسرے ابنائے جنس سے جھگڑنے کے بجائے آخرت کی فلاح و بہبود اور جنت کی نعمتوں کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ کو زندگی کا اصل مقصد سمجھے گا اور ہر کام کے دنیاوی نتیجوں سے زیادہ اکی

نظر اس کے اخروی انجام یعنی عذاب و ثواب پر ہوگی اس لئے نہ تو وہ زیادہ دولت مند بننے کے لئے ناجائز طریقے اختیار کرے گا نہ کسی کا حق غصب کرے گا نہ ناحق کسی پر ظلم کرے گا۔

علی ہذا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر حقیقی طور پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور ہر انفرادی و اجتماعی معاملہ میں آپ کی ہدایت اور رہنمائی تلاش کرے گا اور اسی کی روشنی میں چلے گا اس کا طریقہ یہ نہ ہوگا کہ جو جی میں آیا یا جس کام میں اپنا یا اپنی پارٹی یا اپنی قوم کا یا اپنے ملک اور اپنی حکومت کا فائدہ نظر آیا وہ کر ڈالا بلکہ اس کا اصول یہ ہوگا کہ اللہ کے رسول نے ایسے موقع کے لئے اللہ کی طرف سے جو ہدایت اور جو تعلیم دی ہے وہ بس اسی کی پیروی کرے گا الغرض اس کا اصول نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی اور احکام خداوندی کی بجا آوری اور نبوی ہدایات و تعلیمات کی پیروی کرنا ہوگا اور ہر معاملہ میں اس کی نظر مصلحتوں اور منفعتوں سے زیادہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اُسوۂ حسنہ اور آپ کی ہدایتوں پر ہوگی

بہرحال مومن اگر سچا مومن ہے اور اسلام کے ان تین بنیادی عقیدوں پر کامل اور حقیقی ایمان اس کو نصیب ہو چکا ہے تو یقیناً اور لازماً اس کی زندگی بالکل یہی ہوگی اور اس میں جتنی کمی اور کوتاہی ہوگی وہ بلاشبہ نتیجہ ہوگا ایمان و یقین ہی کی کمزوری کا۔

صحابہ کرام کی پوری جماعت کا امتیاز یہی ہے کہ دین کی ان تین بنیادی حقیقتوں پر ان کو ایسا ایمان و یقین نصیب ہو گیا تھا کہ زندگی کے تمام شعبے اور اس کی ساری جزئیات ان ہی عقیدوں کے زیر اثر آ گئی تھیں وہ ہر معاملہ کو خدا کی عبدیت، رسول کے اتباع اور اخروی انجام کے ماتحت سوچتے تھے اور ان کا کوئی فیصلہ اُن تین عقیدوں سے آزاد یا غافل ہو کر نہیں ہوتا تھا وہ جس طرح نماز روزہ اور نکاح و طلاق جیسے معاملات میں اللہ و رسول کے احکام اور آخرت کے انجام کا فکر رکھتے تھے اسی طرح اپنے عام انفرادی اور اجتماعی معاملوں میں بھی اللہ و رسول کی ہدایت کا اتباع کرتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ اگر ہم نے ان معاملات میں اللہ و رسول کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کیا تو ہم اللہ کی لعنت و عذاب کے مستحق ہو جائیں گے اور خدا نخواستہ جہنم ہمارا ٹھکانا ہوگا۔

پھر بعد کے زمانوں میں دینی لحاظ سے مسلمانوں میں جو انحطاط ہوتا رہا ہے اس کا اصلی سبب یہی ہوا ہے کہ مختلف اسباب سے مسلمانوں کے اکثر طبقوں میں یہ بنیادی عقائد کچھ سست اور کمزور ہوتے گئے اور زندگی پر سے ان کی گرفت ڈھیلی ہوتی رہی۔ پھر جس طبقے میں یہ عقیدے جتنے کمزور ہوئے اس کی زندگی اسلامی معیار سے اتنی ہی پست اور خدا و رسول کے احکام سے اتنی ہی بے تعلق اور آخرت کی فکر سے اتنی ہی آزاد ہوتی گئی۔

اس وقت مسلمانوں کی جو یہ حالت ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد (قرآن کے الفاظ میں) هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ کی حالت میں ہے (یعنی وہ اپنے طرزِ زندگی کے لحاظ سے بہ نسبت ایمان و اسلام کے کفر سے زیادہ قریب ہیں) اس کا اصلی سبب صرف یہی ہے کہ یہ تین عقیدے (جو آدمی کی زندگی کو ایمانی اور نورانی بناتے ہیں) بے حد کمزور پڑ گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمان کہلانے کے باوجود اللہ کے ساتھ اپنی عبدیت کے تعلق کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی اور پیرو ہونے کی اپنی حیثیت کو گویا بالکل فراموش کر چکے ہیں اور آخرت کے ثواب و عذاب سے یکسر غافل ہیں۔

ان بنیادی عقیدوں کی کمزوری اور زندگی میں ان کی بے اثری کے بارہ میں اس وقت مسلمانوں کی غالب اکثریت کا حال وہی ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول کے وقت اہل کتاب کا خاص طور سے یہود کا تھا کہ وہ زبان سے ان عقیدوں کے اقراری تھے اللہ کو اپنا واحد الٰہ و رب مانتے تھے حضرت موسیٰ کو خدا کا سچا رسول اور اپنے کو ان کا امتی کہتے تھے، تورات کو اللہ کی کتاب یقین کرتے تھے آخرت کی جزا و سزا کے بھی قائل تھے غرض ان میں سے کسی چیز کے بھی وہ منکر نہ تھے مگر بات یہ تھی کہ ان کے یہ عقیدے بےحد کمزور ہو چکے تھے اور زندگی پر ان کا جو اثر ہونا چاہئے تھا وہ نہ تھا، خدا پرستی اور خدا کی بندگی پر عملاً غرض پرستی اور نفس و خواہشات کی بندگی غالب تھی، دنیوی مال و دولت اور عزت و جاہ کی طمع میں آخرت کو برباد کر دینا ان کی عام سیرت تھی، اپنے رسول کے احکام اور اس کی لائی ہوئی کتاب کی ہدایات کے وہ پابند نہیں رہے تھے ان کی یہی وہ غیر ایمانی زندگی تھی جس سے اللہ تعالیٰ سخت ناراض تھا آج غور کیجئے بالکل یہی حالت مسلمان قوم کی غالب اکثریت کی ہے۔ مسلمانوں میں بہت تھوڑی تعداد ایسے بندگان

خدا ہی باقی ہے جن کو دین حق کے ان تین بنیادی عقیدوں پر ایسا ایمان و یقین ہو جو زندگی میں مؤثر ہو رہا ہو اور ان عقیدوں کے لوازم و نتائج ظاہر ہو رہے ہوں ——— آخری نبی کی آخری امت کی اکثریت کا اس حالت تک گر جانا اتنا بڑا حادثہ ہے اور ہم لوگوں پر اس کی اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ اگر اس کو سوچیں اور سمجھیں تو راتوں کو ہیں آرام کی نیند نہ آئے اور کھانے پینے میں لذت محسوس نہ ہو جس امت کو قیامت تک کے لئے نبوت و رسالت کی نیابت و نمائندگی کا منصب سپرد کیا گیا ہو خود اسکی اکثریت کا ایمان و یقین تک کی دولت سے محروم ہو جانا خدا اور رسول کے احکام سے بے پروا اور آخرت کے انجام سے بے فکر ہو کر زندگی گزارنا اللہ کے غضب کو جتنا بھی بھڑکائے کم ہے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ دین کی امانت کے امین اپنا فرض ادا کریں۔ کیا ہم عذاب الٰہی اور غضب الٰہی کی آخری اور انتہائی صورتوں کے منتظر ہیں۔

حیات طیبہ

از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

(۳)

تکوینی معاملات کی حقیقت بھی تجارت ہے

خلاصہ یہ کہ معاملات تشریعیہ کا تجارت ہونا تو ظاہر ہے کہ ایک عمل ہم نے پیش کیا اور اُدھر سے اس کی قیمت مل گئی، مگر اس کے علاوہ ہمارے ساتھ جس قدر معاملات تکوین میں بھی ہوتے ہیں ان سب کی حقیقت بھی تجارت ہی ہے جیسا کہ مذکور ہوا اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر غم بہت ہلکا ہو جائے گا باقی طبعی غم کا انکار نہیں وہ تو ہو گا اور ہونا چاہیے کیونکہ اسی کی وجہ سے اجر ملتا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ طبعی غم بھی اگر نہ ہو تو پھر اجر کس چیز کا ہو سکتا ہے بلکہ دنیا میں اگر انسان کو طبعی رنج و غم سے بھی آزاد کر دیا گیا ہوتا تو انسان واقعی سارا فرعون ہو جاتا کہ عجز و عبدیت جو مقصود تخلیق تھا وہی باطل ہو جاتا اس لیے نفس طبعی رنج و غم میں بڑی حکمت ہے۔

طبعی رنج، اجر کے علاوہ عبدیت کے لیے ضروری ہے

اس سے شان عبدیت ظاہر ہوتی ہے اگر انسان پر رنج و غم وارد نہ ہو تو یہ فرعون بے سامان ہو جائے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس غم کو ہلکا کیا جائے اور غم ہلکا ہونے کی وہی تدبیر ہے جس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی جب انسان یہ سمجھے گا کہ ہر معاملہ میں حق تعالیٰ ہم کو نعم البدل عطا فرماتے ہیں تو غم ہلکا ہو جائے گا، پھر نعم البدل بھی اس قدر کہ اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ اور مصائب پر صبر کرنا تو نہایت دشوار ہے، اس پر وہ اجر غیر متناہی ملنا کیا عجب ہے،

جس پر آیت "إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ"[ع]
میں متنبہ فرمایا ہے۔ وہاں تو خفیف سے خفیف عمل پر بھی بے اندازہ اجر مل جاتا
ہے چنانچہ حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک بار "اللہ اکبر" کہنے سے زمین و آسمان
کی درمیانی فضا بھر جاتی ہے اور "سبحان اللہ" کہنے سے آدھی میزان عمل اور
"الحمد للہ" کہنے سے پوری میزان عمل"[ل]

بھلا ایسے خریدار سے سودا کرنے سے محروم رہنا محروم ازلی کے سوا کس کا کام ہو سکتا ہے مومن
ایسے ہی سوداگر کا نام ہے جو اپنا سب کچھ ایسے ہی خریدار کے ہاتھ بیچ ڈالے "إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ"[ع]۔

"غرض آپ کو ہر عمل صالح پر بے انتہا اجر ملتا ہے اور ہر مصیبت میں نعم البدل
عطا ہوتا ہے یہاں تک کہ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن جب اہل نعمت اہل مصیبت
کے اجر کو دیکھیں گے تو تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچی سے کاٹی
جاتیں تاکہ آج ہم کو یہ ثواب (بدلہ) حاصل ہوتا۔ پس اس ثواب یا بدلے کے استحضار
سے آپ کو غم ہلکا کرنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ یہ مصائب درحقیقت تجارت
میں داخل ہیں"[ع]

اسلام کے تمام عقائد میں غم کو ہلکا یا دور کرنے کی خاصیت ہے

ایک عقیدۂ آخرت ہی پر کیا موقوف! اسلام کے سارے عقائد صحیحہ نہ صرف آخرت ہی کی نجات کے ضامن ہیں بلکہ دنیا کے آلام و مصائب کو بھی دور

ع صبر والوں کو بے حساب بے شمار اجر دیا جائے گا۔ ۱۲

ل اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کلمات میں یہ خاصیت ہے جیسے کہ طبیب کہے کہ بنفشہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ دماغ کا تنقیہ کرتا ہے جس کا علت ہوتا ہے کہ جبتک مضر شے استعمال نہ کی جائے جو اس خاصیت کو باطل کردے، اگر کوئی سنکھیا کھا کر بنفشہ پی لے تو بنفشہ سے کیا خاک نفع ہوگا ایسے ہی سبحان اللہ و الحمد للہ کی واقعی یہ خاصیت ہے بشرطیکہ ترک صلوۃ وغیرہ کوئی اس کے منافی (معاصی) نہ پائے جائیں الجبر بالصبر ص ۲۵

ع اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے خرید لی ہیں انکی جانیں اور انکے مال اس کے بدلہ میں کہ ان کے واسطے جنت ہے۔ ۱۲

ع خیر الحیاۃ وخیر المماۃ ص ۔ ۱۲

یا ہلکا کرنے کی ان عقائد میں ایسی خاصیت ہے کہ ان کی بدولت واقعی یہاں کی زندگی بھی مزے دار (حیات طیبہ) بنجاتی ہے " الاجر النبیل علی صبر الجمیل " نام وعظ میں ارشاد ہے کہ

" صاحبو عقائد اسلامیہ میں سے ہر عقیدہ کو ازالۂ غم میں بڑا دخل ہے اور اس کی لم اور وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسلام کا بالخاصہ یہی اثر ہے کہ اس سے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے اطبا جانتے ہیں کہ بعض اشیاء مفید بالکیفیت ہیں ان کے فائدہ کی وجہ بیان ہو سکتی ہے ...... اور بعض اشیاء مفید بالخاصہ ہیں اس لئے ان کی وجہ بیان نہیں ہو سکتی اور میرا خیال تو یہ ہے (اور یہی جدید تحقیق بھی ہے) کہ ہر دوا موثر بالخاصہ ہے کیفیت کا نام ہی نام ہے "۔

" اور خیر طب کے متعلق کوئی میرا قول مانے نہ مانے . لیکن عقائد و اعمال شرعیہ کے متعلق تو میں یہی کہوں گا کہ سب مفید بالخاصہ ہیں اور میں اس پر قسم کھا سکتا ہوں اور کیوں نہ قسم کھاؤں اول تو مجھے اس کا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بھی نہ ہوتا تو حق تعالیٰ کا ارشاد کافی ہے کہ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ[1] وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ[2] (ص ۷)

مثلاً تقدیر ہی کا عقیدہ بلو کہ اس سے مصائب میں کتنی تسکین و خفت ہوتی ہے اور

" حق تعالیٰ نے تقدیر کا مسئلہ جس کا حاصل تاثیر قدرت ہے . اسی لئے ہم کو بتلایا ہے کہ حوادث میں ہم کو راحت ہو . پریشانی اور گھبراہٹ حد سے زیادہ نہ ہو چنانچہ فرماتے ہیں " مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُــوْرِ "

[1] یاد رکھو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے ۔۱۲ م

[2] اور جو ایمان رکھے اللہ پر تو اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے ۔۱۲ م

(کہ جو مصیبت بھی پہونچتی ہے خواہ زمین میں یا تمھاری جانوں میں۔ وہ سب ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے قبل اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں اور یہ کام خدا پر آسان ہے آگے فرماتے ہیں کہ "لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ" کہ ہم نے تم کو اس مسئلہ تقدیر کی خبر اس لیے دی تاکہ جو چیز تم سے فوت ہو جائے اس پر رنج نہ کرو۔ اور جو چیز تم کو عطا کی جائے اس پر ناز نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی متکبر یا اترانے والے کو پسند نہیں فرماتے"۔

"اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ اعتقاد تقدیر کی تعلیم سے فلاح آخرت کے ساتھ یہ بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں بھی راحت رہے کہ کسی چیز کے فوت ہونے سے ان کو زیادہ رنج نہ ہوا کرے بلکہ یہ سمجھ کر تقدیر میں یوں ہی تھا صبر و شکر سے کام لیا کریں"۔

اور نفسیاتی وجہ اس کی ظاہر ہے کہ کسی بات کی جتنی شدید تمنا و امید ہوگی اتنا ہی اس کے خلاف وقوع پر غم و الم ہوگا لیکن جو شخص تقدیر کا صحیح معنی میں معتقد ہے وہ ہمیشہ اپنی ہر سعی و طلب امید و تمنا میں جانب مخالف کے وقوع کا بھی پورا احتمال رکھتا اور اس کے لیے تیار رہتا ہے۔ تیار ہی نہیں بلکہ جیسا اوپر معلوم ہوا "عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ" کے مزید اعتقاد اور بارہا کے تجربات کی بنا پر طلب و تمنا کے خلاف ہونے ہی کو اپنے حق میں خیر اور بھلائی سمجھتا اور جانتا ہے۔

شریعت کے متبع کو حقیقی غم کبھی نہیں ہوتا

"غرض جو لوگ شریعت مقدسہ کی تعلیم پر عمل کرنے والے ہیں ان کو حقیقی غم کبھی ہوتا ہی نہیں بس "اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ"[1] میں تاویل کی ضرورت نہیں، مطلب یہ ہے کہ ان کو حقیقی خوف و حزن نہیں ہوتا کیونکہ وہ تقدیر پر پورا ایمان رکھتے ہیں جس کا اثر یہی ہے کہ رنج و غم اور تجویز کی جڑ کٹ جاتی ہے (کیونکہ معتقد تقدیر اپنی تجویز و تدبیر کو بالذات موثر

[1] یاد رکھو اللہ والوں کو نہ خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔ ۱۲ م

ہی نہیں جانتا کہ اس کے خلاف سے اس کو صدمہ ہو)

"پس قائل تقدیر کو آخرت میں تو حزن وخوف ہو ہی گا نہیں دنیا میں بھی نہیں ہوتا اس لیئے "لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ" ہر حال میں اپنی حقیقت پر ہے اور جو شخص تقدیر کے اعتقاد سے خالی ہے اس کو دنیا میں بھی غم ہے اور آخرت میں بھی ..... اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے عمل و اعتقاد کو کامل کرو۔ پھر تمھارے لیئے دنیا میں بھی چین ہو گا۔ "لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ"[1]۔

مفتی عنایت احمد صاحب علم الصیغہ کے مصنف حج کو تشریف لے گئے تھے شاید واپسی میں جہاز طوفان میں آگیا بعض مسافر بچ کر نکل آئے تھے وہ کہتے تھے کہ جس وقت جہاز غرق ہونے لگا تو تمام مسافروں میں کہرام مچا ہوا تھا مگر مفتی صاحب بڑی بے فکری سے بیٹھے ہوئے یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ[3]

ایسے لوگ بس اختیاری امور و منہیات کا اہتمام و فکر رکھتے ہیں اور غیر اختیاری باتوں کے متعلق دور دراز تجاویز اور لمبے چوڑے پروگرام بناتے ہی نہیں نہ ان کی سعی وطلب میں جان کھپاتے ہیں کہ ان کے نہ پورا ہونے کے غم ہی میں جان دیدیں۔ نہ ایسی چیزوں میں کسی کی ریس و مقابلہ کر کے اس کی سوزش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بس۔

"ہمیں تو یہ کرنا چاہیئے کہ جو حکم ہے اس کے ادا کرنے کی فکر میں لگے رہیں اور ان ہی چیزوں کو طلب کریں جو اختیاری و مامور بہ ہیں اور جو مامور بہ

---

[1] ان کے لیئے دنیوی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی ۱۲

[2] خیر الحیوٰۃ وخیر الممات ص.....

[3] کہو ہم پر صرف وہی حالات آسکتے ہیں جو اللہ نے ہمارے لیئے پہلے سے لکھ دیئے ہیں وہ ہمارا مالک ہے اور ایمان والوں کو چاہیئے کہ وہ اسی پر اعتماد اور بھروسہ کریں۔ ۱۲

نہیں ان کی فکر ہی عبث ہے ایسی چیز کے ملنے نہ ملنے کی مصلحت کسی کو کیا معلوم اس کو تو حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کے لئے کیا مفید ہے اور کیا مضر جو عطا فرمادیں وہی اس کے لئے مفید ہے حق تعالےٰ نے ہر چیز کے اندر حکمت و مصلحت رکھی ہے خواہ عطا ہو یا منع اسی لئے فرماتے ہیں "لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ [1]

دنیا میں لوگ اسی کے پیچھے کتنا مرتے اور غم کھاتے ہیں کہ ہائے فلاں کے پاس تو ہے وہ ہے اور ہمارے پاس نہیں حالانکہ۔

"یہ مسئلہ قرآن پاک نے طے کر دیا ہے کہ تم ایسے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعض پر فوقیت بخشی ہے۔۔۔ پس جب موہوب (بخشیدہ) میں دخل نہیں تو کیوں پیچھے پڑے اور فرماتے ہیں واسئلوا اللہ من فضلہ یعنی اللہ تعالےٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو۔ یہ فرما کر تعب سے بچا لیا۔ کہ اگر کسی ایسی چیز کو جی ہی چاہے تو مانگ لیا کرو۔ تحصیل کے درپے مت ہو ان اللہ کان بکل شیئ علیما۔ کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (کہ کیا تمھارے حق میں مفید و مناسب ہے اور کیا نہیں)" دیکھئے جذبات کو روکا نہیں۔ یہ بھی گوارہ نہیں فرمایا کہ جذبات کو روکا جائے کیا ٹھکانا ہے حق تعالیٰ کی اس رحمت کا یعنی اگر جی چاہے مانگ لو اگر مناسب ہوگا دیدیں گے ورنہ خیر۔ تو دیکھئے تعب (رنج) سے کیسا بچایا۔ [2]

سبحان اللہ حضرت مجدد کا فہم قرآن بھی بالکل موہوب اور اللہ تعالیٰ کا فضل ہی ہے۔ یوتیہ من یشاء۔

صورت مصیبت "جو شخص تقدیر کا معتقد ہے اس کو رنج و غم کبھی نہیں ہوتا اور یہ جو کبھی کبھی آپ ایسوں کو بھی مصائب میں غمگین دیکھتے ہیں

---

[1] ان چیزوں کی تمنا نہ کرو جن کے ذریعہ اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت و فوقیت دی ہے ۱۲

[2] الافادات الیومیہ صد ۲ ۔ ۱۲

یہ نظر بد سے بچانے کے لیے صورت رنج و غم ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں [1]

دل ہمی گوید از و رنجیدہ ام ❊ وز نفاق سست اُو خندیدہ ام

اُن کو ان مصائب سے ایسی کلفت ہوتی ہے جیسے مرچوں کے کھانے والے کو کلفت ہوتی ہے کہ ظاہر میں آنسو جاری ہیں مگر مزے لے لیکر کھا رہا ہے[1]

کچھ آگے ذرا اسی کی مزید تفصیل و مثال سنئے کہ ایسے غم کو دراصل

"غم کہنا ہی غلط ہے وہ واقع میں غم نہیں محض صورت غم ہے اور جو واقعی غم ہے اس کا شریعت مقدسہ پر عمل کرنے والے پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتا یا اس کا کوئی عزیز نہیں مرتا۔ یا اس کو دنیوی نقصان نہیں ہوتا یہ سب کچھ اس کو پیش آتا ہے اور کلفت بھی ہوتی ہے مگر پریشانی اور حقیقی غم نہیں ہوتا کیونکہ غم کہتے ہیں دل کی گھٹن کو اور کلفت کہتے ہیں الم (دکھن) کو تو ان کو الم تو ہوتا ہے مگر گھٹن نہیں ہوتی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی ڈاکٹر تمھارے زخم میں نشتر لگائے اس وقت تم کو الم تو ہوگا مگر رنج و غم نہ ہوگا گو ظاہر میں تم ہائے ہائے بھی کروگے مگر دل اندر سے خوش ہوگا اور اس الم پر راضی ہوگا کیونکہ تم اس نشتر کو حکمت کے موافق سمجھتے اور اپنے لیئے نافع و مفید خیال کرتے ہو۔"

ایک بڑے اشکال کا حل

غم و الم کی اس صورت و حقیقت کے فرق و تفصیل سے اکبر الاعمال نام وعظ میں ایک اور بڑے اشکال کا حل فرمایا ہے کہ

"مصیبت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صورت مصیبت ایک حقیقت مصیبت اس سے ایک سوال کا جواب حل ہو جائیگا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ کہ تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے تمھارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ حوادث کا نزول

---

[1] خیر الحیوۃ و خیر المماۃ مبث ۲۱۲ صث ۱۳ و صث ۱۵ ۔ ۱۲

انبیاء علیہم السلام پر بھی ہوا ہے بعض انبیاء کو قتل تک کیا گیا ہے اور موت کو قرآن میں بھی مصیبت کہا گیا ہے فَاَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ" نیز غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک پر صدمہ آیا۔ سر میں زخم آئے تو کیا نعوذ باللہ حضرات انبیاء سے بھی گناہ سرزد ہوا تھا جس کی وجہ سے ان پر مصیبت نازل ہوئی حالانکہ اہل حق کا مذہب تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں۔ پس جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورت مصیبت تھی اور یہ محض تاویل نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہو جائے گا وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض و پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی اور تسلیم و رضا زیادہ ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں گو صورت میں ہو سہ

ناخوشی تو خوش بود برجان من ۔۔۔ دل فدائے یار دل رنجان من

دینی نقطۂ نظر سے غم کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے

حاصل سب کا یہ ہے کہ دینی تعلیمات کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ان کے قبول و اذعان سے دنیا کی بھی کوئی مصیبت حقیقی مصیبت نہیں رہ جاتی اور صوری یا طبعی درد و الم کے سوا دل کی پریشانی یا حقیقی غم کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے ایک عام فرق تو دینی و دنیوی نقطۂ نظر کا وہی ہے کہ دنیا کی زندگی میں آدمی مال وجاہ کے حصول اور اپنی تمناؤں کے جو لمبے لمبے پروگرام بناتا اور ان سے اپنی راحت و مسرت کو وابستہ کرتا ہے وہ نہ سب اس کے اختیار میں ہوتے ہیں اور نہ سب پورے ہوتے ہیں اور اکثر اموال و اولاد الٹے عذاب جان ہو جاتے ہیں بلکہ جن کے بظاہر بہت کچھ پورے ہوتے ہیں ان کے بھی نہ پورے ہونے والے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور نایافت کا غم یافت کی مسرت سے ہمیشہ زیادہ ہی رہتا ہے اور اسی غم میں دم نکلتا رہتا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں ولیکن پھر بھی کم نکلے

بخلاف دینی نقطۂ نظر والی زندگی کے کہ اس میں انسان کو اپنی وسعت و اختیار کے استعمال کے علاوہ کسی خاص مقصد و مراد تک پہونچنے کی تکلیف ہی نہیں، اگر اس نے اپنی اختیاری سعی کا حق ادا کر دیا جو بہرحال اس کے اختیار میں ہے اور پھر بھی بظاہر ناکام رہا تو یہ حقیقی ناکامی و نامرادی ہے ہی نہیں، اس لئے کہ اس کی حقیقی مراد تو اجر و ثواب یا اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہے جو اس ظاہری نامرادی میں بھی بدستور بلکہ زیادہ حاصل ہے کیونکہ اس صورت میں ناکامی کے رنج کا مزید اجر ملتا ہے (جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا) اس لئے دیندار آدمی دنیا اور دین کے ہر معاملہ میں بس اپنی بساط بھر سعی کر کے بے غم ہو جاتا ہے

مومن کی پریشانی کی صرف ایک چیز ہے

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میرے لڑکے بہت ہی بد شوق ہیں تعلیم کی طرف ان کو قطعی التفات اور رغبت نہیں اس سے میرا قلب پریشان رہتا ہے فرمایا کہ قلب کے پریشان اور مشوش رکھنے کی کیا ضرورت ہے مومن کو پریشان کرنے والی چیز بجز ایک کے اور کوئی نہیں وہ حق تعالیٰ کی عدم رضا ہے اس سے تو مومن کے قلب میں جتنی بھی پریشانی اور جو بھی حالت ہو تھوڑی ہے اور جب کہ رضا کا اہتمام اپنی وسعت و قدرت کے موافق ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مومن کا قلب پریشان و مشوش ہو۔

پریشانی کا اصلی سبب

"اس لئے کہ ہمارے ذمہ صرف تدبیر ہے مثلاً تعلیم اولاد کے لئے شفیق استاد تلاش کر دینا کاغذ قلم دوات کا مہیا کر دینا۔ کتابیں قرآن شریف کا خرید دینا اور مزید براں علم کے منافع اور علم دین کے فضائل سنا کر ترغیب دینا، وقتاً فوقتاً نگرانی اور دیکھ بھال کر لینا بس اگر یہ سب کچھ ہے تو ہم اسی کے مکلف تھے آگے ثمرہ کے ہم ذمہ دار نہیں اس لئے کہ ثمرہ کا مرتب ہونا نہ ہونا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

خلاصہ یہ کہ اختیاری کاموں کو انسان کر لے اور غیر اختیاری کے پیچھے نہ

بڑے اصلی سبب پریشانی کا غیر اختیاری کاموں کے درپے ہونا ہے۔[1]

مطلب یہ کہ جو شخص دیندار ہو گا اس کا نقطۂ نظر چونکہ دنیا کے کاموں میں بھی دین ہی ہو گا یعنی بقدر وسعت و اختیار اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی ہو گی نہ کہ ثمرات و نتائج کی ذمہ داری جو اپنے اختیار میں نہیں، اس لئے ایسے شخص کا دل دنیا کی ظاہری ناکامیوں سے پریشان و مشوش بھی نہ ہو گا اسی لئے ایک دوسری جگہ وعظ "اصلاح ذات البین[2] میں ارشاد ہے کہ

"اب میں ببانگ کہتا ہوں کہ لطف زندگانی جو کچھ ہے دیندار کے پاس ہے، دنیا دار کے پاس کچھ بھی نہیں اور اگر کسی دنیا دار کو لطف میں دیکھا بھی جاتا ہے تو وہ یا تو دنیا کا اثر نہیں بلکہ اس کی وجہ دین کا اثر ہے جو اس کو حاصل ہے اور جس قدر اس کے دین میں کمی ہے اتنا ہی لطف بھی کم ہے اور اسکی ظاہری حالت سے دھوکا ہوتا ہے اندرونی حالت کی تفتیش کی جائے تو پریشانی ہی ثابت ہو گی اور یا اس نے حقیقی لطف دیکھا ہی نہیں اسلئے وہ اس صورت لطف کو لطف سمجھتا ہے۔

راحت اور سامان راحت

"اور راز اس کا وہی ہے کہ لطف و راحت اور چیز ہے اور سامان لطف و راحت اور چیز ہے جن اسباب دنیا کو لوگ سامان راحت سمجھتے ہیں اگر حقیقی راحت نہ ہو تو واللہ وہ حقیقت میں عذاب ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں " وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا"

واقعی بعضے اموال و اولاد تو عذاب ہی ہو جاتے ہیں — ہائے بس اس شخص کا عمر بھر یہ حال رہتا ہے ؎ چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد ،

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

جاں ہمہ روزہ از لکد کوب خیال	می شود مجروح و خستہ پائمال
نے صفا می ماندش نے لطف و فر	نے بسوے آسماں راہ سفر

[1] الافاضات الیومیہ ص ۱۹۶ ۱۲ [2] ص ۲۴ و ۲۵ ۱۲

اسی سلسلہ گفتگو میں اور اسی وعظ میں آگے بڑھ کر پھر فرماتے ہیں کہ

جتنا دین کامل اتنا ہی لطف زندگی حاصل

"اب اس مسئلہ میں کوئی شبہ نہ رہا کہ جتنا دین کامل ہوگا اتنی ہی لذت و لطف زندگانی میں ترقی ہوگی گو سامان زیادہ نہ ہو۔ لوگ آج کل سامان راحت کو مقصود سمجھتے ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہوجائے اور سامان اس کے پاس سب کچھ ہو تو کیا اسے کچھ راحت ہوگی، ہرگز نہیں اور اگر ایک لنگوٹا بند بھی اس کے ساتھ قید ہو جو چند روز کے بعد رہا ہوجائے تو گو اس کے گھر میں سامان راحت کچھ نہ ہو مگر رہائی کی خبر سن کر اس کے ہاں کیسی عید آئے گی۔ معلوم ہوا کہ راحت اور چیز ہے اور سامان راحت اور چیز ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ جس کے پاس سامان راحت ہو اس کو راحت بھی حاصل ہو اور نہ یہ ضرور ہے کہ جس کے پاس سامان راحت نہ ہو اس کو راحت حاصل نہ ہو۔"

"اور میں فقط دلیل ہی سے نہیں بلکہ مشاہدہ سے دکھلاتا ہوں کہ آپ ایک کامل دیندار شخص کو لیں، مگر ہم جیسا دیندار نہیں بلکہ واقع میں کامل دیندار ہو اور ایک نواب یا رئیس کو لیں۔ پھر ان کی نجی حالت کا موازنہ کریں تو واللہ ثم واللہ وہ دیندار تو آپ کو سلطنت میں نظر آئے گا اور یہ نواب و رئیس مصیبت میں گرفتار نظر آئے گا مشاہدہ کے بعد تو آپ مانیں گے کہ راحت کا مدار سامان پر نہیں۔"

سامان راحت بالذات منافی راحت نہیں

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ سامان راحت بذات خود منافی راحت ہے بلکہ سامان راحت کی جو طلب احکام دین کے منافی یا ان میں مخل ہو یا خدا و دین سے بے تعلقی کا موجب ہو وہ یقیناً راحت کا نہیں مصیبت ہی کا سامان ہوگا۔ اسی لئے فرمایا کہ "میں سامان سے منع نہیں کرتا بلکہ دین کے برباد کرنے سے منع کرتا ہوں، اگر

دین کے ساتھ یہ سامان دنیا بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں مگر دین کو برباد کر کے
اس کو جمع کرنا سخت حماقت ہے جس سے خاک راحت نصیب نہیں ہوتی
شریعت نے ضعفا کو سامان راحت جمع کرنے کی اجازت دی ہے بلکہ بعض
عارفین بھی کمزور طبیعت کے ہوتے ہیں وہ بھی جمعیت قلب کے لئے کچھ سامان
رکھتے ہیں مثلاً کپڑوں کے چار جوڑے اور سال بھر کا اناج۔ سو دین کی
نگہداشت کے ساتھ اس کا بھی مضائقہ نہیں۔ مگر عبد الدینار و عبد الدرہم
ہونا برا ہے اس کے لئے حدیث میں وعید وارد ہے۔ "تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ
وَتَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَاِنْ لَّمْ يُعْطَ سَخِطَ"[1]
"پس تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو کامل دیندار کہ دنیا سے کوئی تعلق
نہیں، اور ایک کامل دنیا دار جو اسی میں منہمک ہے اور اس کی حالت
استسقاء کے بیمار جیسی ہے جس کو پانی سے ایک منٹ صبر نہیں ہوتا۔ اسی
طرح اس کو دنیا کی فکر سے کسی دم فرصت نہیں...... اور ایک وہ
شخص ہے جو دین پر قائم ہے مگر حصول اطمینان کے لئے بقدر ضرورت
سامان رکھتا ہے۔ یہ برا نہیں"[2]

اس میں کلام نہیں کہ دین کے صحیح عقائد و تصورات خصوصاً یوم دین یا آخرت کے یقین و اذعان
کے ساتھ ظاہری سامان راحت ہو جب بھی نہ ہو جب بھی ہر حال میں دنیا کی زندگی بھی یقیناً
پر لطف و مزیدار ہی رہتی ہے اور دنیا کی ہر پریشانی و مصیبت کو دور یا ہلکا کرنے کا
بہترین علاج آخرت کی راحت و مصیبت کا استحضار ہی ہے۔

خود غم آخرت کا کیا علاج

لیکن آخرت کی مصیبت خود جو سب سے بڑی مصیبت ہے
اس کا کیا علاج؟ اس مصیبت کے تصور و احضار کے
بعد تو دنیا کی بڑی سے بڑی راحت بھی تلخ ہو جانی چاہئے۔ وہی کہ اگر کسی کو پھانسی کا

---

[1] (ترجمہ) ہلاک و برباد ہیں دینار و درہم یعنی مال و دولت کے وہ بندے جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان کو مال دیدو تو خوش
اور اگر نہ دو تو ناخوش۔ م ۱۲

[2] وعظ "اصلاح ذات البین" ص ۲۸ و ۲۹ ۱۲

حکم مل چکا ہو تو اس کو بادشاہت میں بھی کیا راحت محسوس ہو سکتی ہے۔ یہ سب بالکل سچ ہے اور پوچھیئے تو مصیبت آخرت ہی کی مصیبت ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اسکے آگے بے حقیقت ہے۔ جواب بالکل آسان ہے کہ وہاں کی مصیبت سے بچنا بھی آسان ہے کیونکہ بالکل اپنے اختیار میں ہے دنیا کی بیماری و آزاری، افلاس و تنگدستی، دوستوں عزیزوں کی موت و زندگی وغیرہ کے اکثر مصائب اپنے اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ نہ اُن کا آنا اپنے اختیار میں نہ دور کرنا۔ بخلاف آخرت کی مصیبت کے کہ اس کا دور کرنا تمامتر اپنے اختیار میں ہے۔ اس لیئے کہ اس کا مدار تمامتر معصیت سے اجتناب اور طاعت کے اہتمام پر ہے اور ان دونوں چیزوں میں ہم سے مطالبہ یا ہم کو تکلیف صرف اسی قدر کی ہے کہ جس قدر ہماری طاقت و اختیار میں ہے وہ بھی بقدر تحمل و سہولت۔ یہ نہیں کہ قمار و شراب کا ترک کھانے پینے کے ترک کی طرح ہماری طاقت سے باہر ہو۔ یا کذب و فریب، ظلم و جبر، بغض و عداوت، کبر و غرور وغیرہ کوئی ایسی معصیت ہو جس کو سہولت یا بقدر تحمل مجاہدہ و کوشش سے چھوڑا نہ جا سکتا ہو، اسی طرح سارے اعمال صالحہ خواہ وہ صوم و صلوٰۃ کے عبادات ہوں یا بیع و شرا کے معاملات یا اخلاق و معاشرات انمیں سے کون سا شعبہ ہے جس کا ایک حکم بھی ہماری قوت برداشت سے باہر ہو ایک نماز ہی کو لیجئے کہ کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکتے ہوں تو بیٹھ کر اجازت ہے، بیٹھنے کی قوت نہ ہو تو لیٹ کر، حرکت کی قوت نہ ہو تو اشارے سے۔ پانی نہ ملتا ہو یا کسی مرض میں مضرت کا اندیشہ ہو تو تیمم کی اجازت ہے اور اسکا بالکل وہی حکم و اجر ہے جو پانی سے وضو کا۔ حد یہ کہ کوئی شخص اپنی صحت و تندرستی میں نیکی و طاعت کے جو اعمال بجا لاتا ہے۔ بیماری میں اگر ان سے معذور ہو جائے تو بھی اجر کے اعتبار سے نامۂ اعمال میں صحت و تندرستی ہی کے اعمال لکھے جاتے رہیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آخرت کی مصیبت سے بچنا یا وہاں کی راحت کا خریدنا اس سے ارزاں و آسان تو دنیا کا کوئی حقیر سے حقیر سودا بھی نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ وہاں تو کوڑیوں کے مول بادشاہت ملتی ہے وہی کہ

"نیم جاں بستاند و صد جاں دہد"

رہا یہ احتمال کہ ایسا کون ہے جو تمام چھوٹی بڑی طاعات کا اہتمام کر سکے یا تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے محفوظ رہ سکے اور اوامر و نواہی میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ حالانکہ وہاں

تو ذرہ ذرہ نیکی بدی کی جزا و سزا ملے گی۔ "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ" پھر وہاں کی ذرا سی مصیبت بھی یہاں کی بڑی سے بڑی مصیبت سے بڑی ہوگی لیکن ساتھ ہی دوسرا قانون یہ بھی تو ہے "إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ" جس کا مطلب یہ ہے کہ میزان میں حسنات کا پلہ بھاری رہا تو بس انشاء اللہ معاملہ پار ہے اس کے علاوہ کفارۂ سیأت کا باب کتنا وسیع ہے کہ کانٹے کی معمولی خلش اور خواب کی تکلیف بھی اجر و کفارہ سے خالی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ انابت و استغفار کا دروازہ کسی وقت بند نہیں، بڑے سے بڑے معاصی سے بھی صحیح اور سچی توبہ کرکے آدمی اس طرح پاک و صاف ہو جا سکتا ہے۔ جس طرح گویا ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے کفر و شرک سے بڑھ کر کون سی معصیت ہوگی جب اس تک کو توبہ نیست و نابود کر دیتی ہے تو دوسرے معاصی کا ذکر ہی کیا! غرض یہ احتمال محض احتمال ہے اور اتنا احتمال رہنا عین مطلوب ہے ورنہ آدمی سرے سے نڈر اور بے خوف ہو جائے ایمان کی شان ہی یہ ہے کہ بین الخوف والرجاء رہے۔

اور اتنا خوف و احتمال نہ دنیا میں ہمارے غم و مصیبت کو بڑھاتا ہے اور نہ راحت و مسرت میں مخل ہوتا ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی محنتی و شوقین طالب علم کو بھی باوجود محنت و شوق اور پوری تیاری کے امتحان میں ناکامی کا کچھ نہ کچھ احتمال و خوف لگا ہی رہتا ہے لیکن یہ خوف چونکہ اس کی رجا یا امید کامیابی پر غالب نہیں ہوتا اس لئے نہ اس امید کی مسرتوں میں مخل ہوتا ہے اور نہ ان مسرتوں کے مقابلہ میں امتحان کی محنت و مشقت کوئی معتدبہ مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے ذوق و شوق میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی حال دنیا کے تمام کاموں کا ہے ملازمت و تجارت، صنعت و حرفت سبھی کا ہے کہ اسباب کامیابی کی زیادہ سے زیادہ فراہمی کے باوجود ناکامی کا اندیشہ و احتمال کچھ نہ کچھ باقی رہتا ہے۔

انتہائی تسلی ان سب باتوں کے باوجود خود راقم احقر کے ضعف قلب و ضعف تحمل کا یہ حال ہے کہ آخرت و جہنم کی مصیبتوں کا حال پڑھ کر ایک دن کیا ایک

لمحہ کے لئے بھی ان کی برداشت کا یارا نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے گو یہ سچ ہے کہ "مان بھی لو کہ کچھ دن کے لئے جہنم میں جانا پڑا تو پھر بھی عقلی قاعدہ یہ ہے کہ جو تکلیف منقطع ہونے والی ہو وہ ہلکی ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کا عذاب یقیناً ایک نہ ایک دن منقطع ہوگا اس لئے بعد کی حالت کو یاد کر کے اور جنت میں جانے کی امید سے یہ کلفت سہل ہو جائے گی" لیکن احقر جیسے کم حوصلہ و کم ہمت کی اس سے بھی کیسے تسلی ہو سکتی تھی اس لئے آگے حضرت نے ایسے کم ہمتوں کی تسلی کے لئے عجیب بات بیان فرمائی جس کے دہرانے سے گو طبیعت جھجکتی ہے کہ خدانخواستہ کسی پڑھنے والے کی جرأت کا باعث ہو جائے جس پر خواہی نخواہی بکرا ہو جائے۔ تاہم بقول حضرتؒ ہی کے جس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں چھپایا "میں اس کو کیوں چھپاؤں"۔

"وہ یہ کہ مسلم کی صحیح حدیث میں ہے کہ جو مسلمان جہنم میں داخل کیے جائیں گے حق تعالیٰ ان کو ایک قسم کی موت دیدیں گے اَمَاتَھُمُ اللّٰہُ اِمَاتَۃً یہ الفاظ ہیں حدیث کے۔ اس کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی موت نہ آئے گی مگر کوئی حالت مشابہ موت کے ہوگی۔ مثلاً یہ کہ جسم بےحس ایسا کر دیا جائے جیسا موت سے بےحس ہو جاتا ہے یا کم حس کر دیا جائے، سو اب اس کو عذاب وغیرہ کا احساس ہی نہ ہو یا کم ہو بہرحال مسلمان کا عذاب بھی دوسروں کے عذاب کی طرح نہیں حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب مسلمان پل صراط سے گذریں گے جس کا راستہ جہنم کی پشت پر سے ہوگا تو جہنم مسلمانوں سے کہے گی "جُزْ یَا مُؤْمِنُ فَاِنَّ نُوْرَكَ اَطْفَأَ نَارِیْ" (اے مسلمان جلدی سے پار ہو جا تیرے نور کی ٹھنڈک نے تو میری آگ ہی کو بجھا دیا) جب پشت پر سے گذرنے کا یہ اثر ہے تو جب مسلمان جہنم کے اندر ہوگا اس وقت تو بھلا کیا حال ہوگا کچھ عجب نہیں کہ برد ایمان کی وجہ سے نار جہنم اُس پر اثر ہی نہ کرے یا اثر کرے اور اس کو احساس نہ ہو یا احساس ہو اور کم ہو گو وہ کم بھی خدا کی پناہ بہت کچھ ہے"[1]

ایک بڑا غم آدمی کو اپنی موت کا ہوتا ہے اور جو گو غفلت کی وجہ سے عام لوگوں کو بس کبھی کبھی

[1] خیر الحیاۃ و خیر المماۃ ص۴۳-۴۴۔

اور بہت کم محسوس ہوتا ہے تاہم بہت سے اچھے اور نیک عمل لوگوں کو اس سے اس لیئے بھی وحشت ہوتی ہے کہ خدا جانے وہاں کیا معاملہ پیش آئے تقریر بالا زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کے لیئے تھی چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"میں ان باتوں سے معاصی پر جرأت نہیں دلاتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ موت سے جو آپ کو ایسی وحشت ہے کہ اس کے تصور سے بھی ڈرتے ہیں اس کو دور کردوں مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اپنے خدام سے تفریح و تفریح کے لیئے دریافت کیا کہ کیوں بھائی آخرت میں بھی وہی خدا ہے جو یہاں دنیا میں ہے سب نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا پھر تو انشاء اللہ کچھ اندیشہ نہیں۔ کیونکہ یہاں تو وہ بڑے مہربان ہیں بس وہاں بھی ایسے ہی مہربان ہوں گے۔"

محبت کی پڑیا

"میں کہتا ہوں بلکہ وہاں یہاں سے زیادہ مہربان ہوں گے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے دنیا میں رحمت کے سو حصوں میں سے ایک حصہ ظاہر کیا ہے اور آخرت میں پورے سو حصوں کے ساتھ مسلمانوں سے برتاؤ کریں گے دیکھیئے کیسی اچھی بات ہے کہ جب آخرت میں وہی خدا ہے جو دنیا میں ہے تو پھر ڈرنا کاہے کا اور یہ اثر محبت کا تھا، مولانا کو حق تعالیٰ سے محبت تھی اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ تم محبت کی پڑیا کھالو۔ پھر سب تکلیفیں آسان ہو جائیں گی میں یہ نہیں کہتا کہ محبت کے بعد پٹو گے نہیں۔

"بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اگر پٹو گے تو اسی طرح پٹو گے جس طرح عشاق پٹا کرتے ہیں۔ عشاق کو غیروں کی طرح نہیں پٹوایا کرتے بلکہ یوں ہی برائے نام کچھ سزا دیدیتے ہیں محبوب کو ان کی محبت و عشق کی بھی لاج ہوتی ہے دوسری ایک اور بات ہے گو کہنے کی نہیں مگر جب زبان پر آگئی تو چھپاؤں کیوں وہ یہ کہ عشاق کو محبوب کے ہاتھ سے پٹنے میں بھی مزہ آتا ہے۔ بلکہ محبوب کے سامنے پٹنے میں بھی مزہ آتا ہے اسی کو ایک عاشق کہتا ہے کہ ؎

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

ایک عاشق کا قصہ ہے کہ اس کو کسی سے محبت تھی اس کی اطلاع محبوب کے اقارب کو ہوئی تو انھوں نے اس کے سو دُرّے لگائے ننانوے تک تو اس نے ایک بھی آہ نہ کی اس کے بعد جو ایک لگا تو آہ کی کسی نے ملامت کی کہ ننانوے تک تو تحمل کیا آخر میں ایک کا تحمل نہ ہو سکا کہنے لگا کہ بات یہ ہے ننانوے دُروں تک تو محبوب مجھ کو اور میری اس حالت کو دیکھ رہا تھا تو اس وقت مجھ کو حظ آرہا تھا کہ محبوب دیکھ رہا ہے کہ اس کی محبت میں میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جا رہا ہے اسی حظ نے ضرب کے الم کو محسوس نہ ہونے دیا جب ننانوے دُرّے لگ چکے تو وہ چلا گیا اس وقت مجھے ضرب کا احساس ہوا اس لیے آخر دُرّے پر آہ کی۔

" اور گو یہ عشق مجازی کا واقعہ ہے مگر عشق مجازی و حقیقی کے بعض آثار متحد ہیں کیونکہ عشق تو دونوں جگہ مشترک ہے اس لیے ایک سے دوسرے کی تفسیر ہوتی ہے العشاق یفسر بعضھم بعضا اور یہی تو وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مراقبہ تعلیم فرمایا (وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا) کہ اپنے رب کے فیصلہ پر صبر کیے رہو اور استقلال سے جمے رہو کیونکہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا اسی لیے بڑھایا تاکہ آپ پر کفار کی ایذائیں آسان ہو جائیں اور ان سے بجائے کلفت کے لذت حاصل ہو۔ بتلا دیا کہ جو کچھ آپ کے ساتھ برتاؤ ہو رہا ہے ہم سب کو دیکھ رہے ہیں اس مراقبہ کا یہ اثر لازمی ہے کہ کلفت مبدل بہ لذت ہو جائے یہاں تک کہ سب سے بڑھ کر مکروہ و ناگوار چیز موت ہے۔ مگر عشاق کو وہ بھی لذیذ ہو جاتی ہے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم | راحت جاں طلبم و زپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے | تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم[1]

"از محبت تلخہا شیریں شود" اس "محبت کی پڑیا" سے پہلے ایسے باطنی و قلبی اخلاق و فضائل یا ایسے دینی و اسلامی عقائد و تصورات کا بیان تھا جن کے

[1] ایضاً ص ۴۴ و ۴۵ ۱۲۰

کسب و استحضار سے انسان کی دنیوی غم و مصیبت یا پریشانیاں اگر دور نہیں تو ہلکی اور بہت ہلکی ضرور ہو جاتی ہیں مسلمان اپنے ایمان و عمل میں اگر اوسط درجہ کا بھی مسلمان ہو تو اس کی اس دنیا کی زندگی بھی یقیناً "حیات طیبۃ" بنجاتی ہے لیکن اسلامی تصوف جیسا کہ اوپر جا بجا معلوم و مذکور ہوتا رہا دراصل نام ہے کمال اسلام کا اس لیئے کمال حیات طیبۃ بھی یہ ہوگا کہ مصیبت کا دور یا ہلکا ہونا کیا معنی مصیبت سرے سے مصیبت ہی نہ رہے عین راحت و لذت بنجائے محبت کی بڑیا اسی کا نسخہ ہے کہ "از محبت تلخہا شیریں شود"

یہ معلوم ہے کہ تصوف میں کمال عشق و محبت کی تعلیم و حصول پر اتنا زور ہے کہ تصوف کا سارا دفتر کہنا چاہیئے داستان عشق ہی ہے اس لیئے بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ دین کا تو کہنا ہی کیا دنیا کے بھی سارے آلام و مصائب کا کامل علاج و استیصال اگر چاہتے ہو تو بس پکے صوفی بن جاؤ پھر تو یہ کہنے لگوگے کہ

ناخوش تو خوش بود برجان من — دل فدائے یار دل رنجان من

عشاق صوفیا اور اہل اللہ کے مصائب کی مثال حضرت علیہ الرحمۃ اکثر یہ دیا کرتے ہیں کہ

"دیکھو اگر ایک شخص کا محبوب مدت سے بچھڑا ہوا اچانک مل جائے اور اس عاشق کو بہت زور سے اپنی بغل میں دبائے حتیٰ کہ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں تو بظاہر یہ نہایت تکلیف میں ہے لیکن دل کی یہ حالت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اور دبائے تو اچھا ہے اور اگر محبوب کہے کہ تکلیف ہوتی ہے ہو تو چھوڑ دوں تو جواب میں کہے گا کہ

اسیرت نخواہد رہائی ز بند — شکارت نخواہد خلاص از کمند

اور اگر وہ کہے کہ تم کو دبانے سے تکلیف ہوتی ہو تو تم کو چھوڑ کر تمہارے رقیب کو اسی طرح دباؤں تو کہے گا کہ

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

حتیٰ کہ اگر اس کا دم بھی نکل جائے تو اس کے لیئے عین راحت ہے۔

اور یہ نری شاعری نہیں۔ بلکہ اس رنگ کے اہل محبت کے واقعات سے اہل اللہ کے تذکرے

بھرے ہیں خود حضرت علیہ الرحمۃ نے اپنے استاد رحمۃ اللہ (مولانا محمد یعقوب صاحب) کی زبانی ایک واقعہ بیان فرمایا کہ

"ایک بزرگ سخت مرض میں مبتلا تھے اور ساتھ ہی زخمی بھی تھے کوئی جگہ زخم سے خالی نہ تھی زمین پر پڑے تھے۔ زخموں پر مکھیاں بھن بھن کر رہی تھیں۔ ایک دوسرے بزرگ وہاں سے گذرے تو انھوں نے پہچانا کہ یہ صاحب نسبت اور عالی مقام ہیں وہ خدمت کے لئے ان کے پاس آگئے اور پنکھا جھلنے لگے ان کو افاقہ ہوا تو گھبرائے اور فرمایا کہ یہ کون شخص ہے جو مجھ میں اور میرے محبوب میں حائل ہو گیا انھوں نے عرض کیا کہ حضرت میں خدمت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا نہیں مجھ کو اس کی ضرورت نہیں تم اپنے کام میں لگو اور مجھے اور میرے محبوب کو چھوڑ دو۔

"بتلایئے اس شخص کو اس تکلیف میں کچھ تو لذت تھی جو دوسرے کی خدمت اور راحت رسانی تک گوارا نہ ہوئی بلکہ تکلیف میں پڑا رہنا ہی پسند ہوا۔ تو بات یہ ہے کہ مصیبت میں بھی اسرار و حکم ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مصیبت مصیبت نہیں رہتی بلکہ لذیذ ہو جاتی ہے۔

اسی کے ساتھ حضرت خود اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ

"اس کی چھوٹی سی نظیر اپنا ہی واقعہ بیان کرتا ہوں۔ گو مجھے بزرگوں سے کیا نسبت مگر ان کی جوتیاں سیدھی کرنے سے اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کو تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس سال آنت کے درد کی سخت تکلیف ہوئی کلفت تو بعض وقت ایسی ہوتی تھی جیسی نزع میں سنی جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے قلب کو اپنے ساتھ متعلق کر کے اس کلفت کو آسان کر دیا پھر اس میں جو حکمت معلوم ہوئی تو اس نے کلفت کو عقلاً لذیذ کر دیا پھر جسمانی تکلیف جاتی رہی اور صرف عذر رہ گیا تو وہ عقلی لذت طبعی فرحت بن گئی۔

"وہ حکمت یہ ہے کہ مجھے سفر سے بہت کلفت تھی کچھ تو طبعاً اور کچھ اس لیئے کہ سفر میں بد مذاق لوگوں سے پالا پڑتا ہے ...... اب حق تعالیٰ نے غیب سے یہ عذر پیدا کر دیا (جس کی وجہ سے لوگ سفر پر اصرار نہیں کرتے) ..... تو اس کلفت میں یہ حکمت معلوم ہو کر مجھے اس قدر راحت ہے جسے بیان نہیں کر سکتا ... اب کوئی اس قسم کا خط آتا ہے کہ ہم نے فلاں شخص سے سنا کہ آپ کو تکلیف ہے تو جواب میں لکھ دیتا ہوں کہ صَدَقَ وَکَذَبَ یعنی عذر کے بیان میں تو راوی سچا ہے لیکن تکلیف کی روایت میں غلط۔ کیونکہ مجھے اس عذر سے الم و پریشانی نہیں بلکہ حظ حاصل ہوتا ہے[۱]۔

حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادی کا یہ رنگ اپنی آنکھوں کا دیکھا ہے کہ اکثر بیماری و تکلیف میں بھی جوش و خروش کے ساتھ بے تکلف اپنے خاص رنگ توحید کی باتیں مزے لے لے کر فرماتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ غالباً نمونیا میں مبتلا تھے یا حقر مولانا گیلانی کے ساتھ عیادت کو حاضر ہوا تو جب تک پردہ کا انتظام ہو حضرت خالی ململ کا معمولی کرتا پہنے فوراً باہر آگئے اور حسب معمول ذوق و مستی کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوگئے۔ مزاج پرسی تک کا ہم لوگوں کو اطمینان سے موقع نہ دیا۔ ایک دفعہ سخت زہریلے بچھو نے ڈس لیا تو کبھی کبھی فرماتے بڑا مزہ آیا۔ سب سے بڑی مصیبت آدمی موت کو سمجھتا ہے لیکن محبت میں موت بھی محبوب ہو جاتی ہے۔ مولانا موصوف (یعنی حضرت مولانا شاہ محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ) کو دیکھا جیسا اوپر بھی کہیں ذکر آچکا کہ موت کے مشتاق معلوم ہوتے بلکہ کبھی کبھی ایسا فرماتے بھی کہ خودکشی حرام نہ ہوتی تو اب تاب نہ ہوتی اور جب موت ہی حیات ہو تو کیسے تاب ہو۔

"جب منصور سولی پر چڑھانے کے لئے بڑھائے جانے لگے تو یوں کہتے جاتے تھے اقتلونی یا ثقاتی[۲]۔ ان فی قتلی حیاتی۔ غلبۂ محبت کے بعد موت کا اشتیاق بھی غالب ہو جاتا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ جس دن صبح کو

---

[۱] خیر الحیات و خیر الممات ص ۳۹ و ۴۰۔ ۱۲

[۲] اے ثقہ لوگو مجھے قتل کر دو میرے مارے جانے ہی میں میری زندگی ہے ۱۲ م۔

شہید ہونے والے تھے اس کی رات میں آپ کو مکشوف ہو گیا تھا کہ کل کو شہادت کا دن ہے تو رات کو آپ کی یہ حالت تھی کہ غسل کر کے عمدہ کپڑے پہنے خوشبو لگائی اور وصال حق کے لئے تیار ہو گئے اور جب باہر تشریف لائے ہیں تو بار بار یہ شعر پڑھتے تھے ؎

سرجدا کرد از تنم یارے کہ با ما یار بود ۔۔۔ قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود[1]

اسی طرح کسی دوسرے بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مرنے لگے تو خوش ہو کر یہ شعر پڑھتے تھے ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم ۔۔۔ جسم بگذارم سراسر جاں شوم

غرض عشق و محبت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ موت و مصیبت، موت و مصیبت ہی نہیں رہ جاتی حیات و راحت بنجاتی ہے اور محبوب حقیقی کے عشق میں یہ حال کیوں نہ ہو جب کہ

"مجنوں نے ایک ادنی مخلوق کی محبت کے غم سے نجات نہ چاہی جب اس کا عشق مشہور ہوا اور سوز و گداز سے کھانا پینا تک متروک ہو گیا اور دیوانوں کی طرح جنگلوں میں پھرنے لگا تو اس کا باپ مکہ معظمہ لایا اور کہا کہ بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر خدا سے دعا کرو کہ لیلیٰ کی محبت میرے دل سے نکال دے تو اس نے رو کر کہا.

یارب[2] لا تسلبنی حبها ابدا ۔۔۔ ویرحم اللہ عبداً اقال آمینا

اور کہا ؎

الٰہی[3] تبت من کل المعاصی ۔۔۔ ولکن حب لیلیٰ لا اتوب

تو جب ایک ادنی مخلوق کی محبت میں غم لذیذ ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ کے عشاق کو اگر مصائب میں راحت ہو تو کیا عجب ہے[4]

---

[1] خیر الحیات وخیر الممات ص۳۳ ۱۲

[2] میرے پروردگار! لیلیٰ کی محبت میرے دل سے نہ نکال، اور خدا کی رحمت ہو اس بندے پر جو میری اس دعا پر آمین کہے ۱۲ م

[3] خداوندا میں سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت اور اس کے عشق سے توبہ نہیں کر سکتا ۱۲ م

[4] خیر الحیات وخیر الممات ص۵۹ ۱۲

اسی کو مولانا فرماتے ہیں کہ

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود — گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

یعنی کیا مولیٰ کی محبت لیلیٰ کی محبت سے کم ہے ہرگز نہیں تو اب غور کیجیے کہ وہ کیسی لذت کی ہوگی۔

ہمارے کتاب و سنت کے مجدد وقت کو کتاب و سنت سے جو عشق ہے اس کی کرامت یہ ہے کہ ایسی چیزوں کی بھی سند بے تکلف کتاب و سنت سے پیش فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ خود حضرات صحابہ میں سے اسی رنگ کے ایک صحابی کا حال حدیث میں آتا ہے کہ

"نماز میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ ایک تیر آکر لگا لیکن قرآن پڑھنا ترک نہیں کیا آخر ایک دوسرے صحابی جو سو رہے تھے جاگنے کے بعد انھوں نے اس حالت کو دیکھا اور بعد سلام ان سے پوچھا تو فرمایا کہ جی نہ چاہا کہ قرآن شریف کی تلاوت کو قطع کر دوں"

"غرض محبت ایسی چیز ہے لیکن چونکہ ہم نے محبت کا مزہ چکھا نہیں اس لیے سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مصیبت میں ہیں۔

(باقی)

ضروری انتباہ

مضمون بالا (حیات طیبہ) کی اس قسط کے صفحہ ۳۱ و ۳۲ پر بعض باتیں ایسی آگئی ہیں جن سے اندیشہ ہے کہ کم فہم اور کوتاہ نظر قسم کے لوگ ان سے کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ آخرت میں مسلمانوں کو کوئی عذاب ہوگا ہی نہیں حتیٰ کہ دوزخ میں بھی اگر وہ ڈالے جائیں گے تو انھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی یا بہت ہی معمولی سی ہوگی ——— خود محترم مضمون نگار نے بھی یہ خطرہ محسوس فرمایا ہے۔ سو اس سلسلہ میں دو باتیں خاص طور سے ذہن نشین کر لینا چاہئیں اول یہ کہ حدیث و قرآن میں جہاں مومن کا لفظ آتا ہے اس سے وہی لوگ مراد ہوتے ہیں جو کم از کم ایمان کی ضروری اور بنیادی شرطوں کو پورا کرتے ہوں اور آجکل بدقسمتی سے مسلمان کہلانے والوں میں کافی تعداد ایسی ہے جو قرآن و حدیث کی اصطلاح کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کے مومن بھی نہیں ہیں بلکہ صرف نسل و قوم کے لحاظ سے مسلمان کہے جاتے ہیں ——— دوسری بات یہ ملحوظ رکھنی چاہیے کہ مومن کی شان یہ ہے کہ اللہ کے قہر و عذاب سے لرزاں و ترساں رہے۔ قرآن پاک میں ایمان والوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ "وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنَ"۔ پس اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو کر معاصی پر جری ہو جانا مومن کی شان نہیں کفر کا ایک شعبہ ہے۔ اور ایسے لوگ اللہ کی رحمت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

"الفرقان" کی اس اشاعت سے یہ مستقل عنوان قائم کیا جارہا ہے آیندہ انشاءاللہ ہر اشاعت میں اس عنوان کے تحت دوسرے اخبارات و رسائل کے منتخب مقالات سے ایسے اقتباسات درج ہوا کریں گے جن کا اپنے ناظرین کی نظر سے گزارنا ہم کسی حیثیت سے مفید و مناسب سمجھیں گے خصوصاً جنھیں مسلمانوں کے افکار و جذبات اور سیرت و کردار کی اصلاح و تربیت میں موثر سمجھا جائے گا۔ رسالہ کے آخری صفحات اسی سلسلہ کے لیے مخصوص ہوں گے۔ واللہ الموفق

صنعت خداوندی کی عجائب کاریاں :-

"ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ قلب انسانی جس کا حجم تقریباً اتنا ہوتا ہے جتنا ہاتھ کی بند کی ہوئی مٹھی کا اور وزن کوئی ۱½ پاؤ کا۔ وہ بچے کی پیدائش کی گھڑی سے بڑھاپے کی آخری منزلوں تک بغیر کسی کوک کے ہر وقت چلے ہی جاتا ہے۔ ایک دس سکنڈ کے لیے بھی عمر بھر میں کبھی آرام نہیں لیتا۔ اس کی دھڑک کی شرح ساٹھ۔ ستر ضربیں فی منٹ ہے۔ وہ روزانہ خون کے ۲۰۰ نلے صاف کرتا رہتا ہے۔ جس میں اتنی قوت صرف ہوتی ہے جتنی ایک لاکھ پونڈ (۵۰ ہزار سیر) کا وزن زمین سے اٹھا کر شانے تک لے جانے میں۔ ایسا عجیب و غریب انجن آجتک ایجاد نہیں ہو سکا ہے!-

انھیں ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ انسانی آنکھ میں جو پتلی کا قدرتی کیمرا لگا ہوا ہے یہ آناً فاناً دور اور نزدیک کی ہر مرئی چیز کا عکس لے لیتا اور اسے دماغ تک منتقل

کرتا رہتا ہے۔ عصب بصری (بینائی کا پٹھا) ۵ لاکھ ننھے ذرات پر شامل ہے۔ اور یہ لاکھوں کی تعداد میں ذرّے ہر ہر عکس سے متعلق اس کے مناسب حال عمل خود بخود کرتے رہتے ہیں ـــ اتنا حیرت انگیز آٹومیٹک (خود کار) کیمرا آج تک کس نے دیکھا ہے؟

انھیں ڈاکٹروں کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ کان کے اندر کا حصہ جو ایک چھوٹے سے گھونگھے سے مشابہ اور اس کا ہم جنس ہوتا ہے۔ اور اس کے اندر ایک منجمد رطوبت بھی رہا کرتی ہے۔ جس چوبیس ہزار ننھی ڈوریاں سی اندر ہوتی ہیں، اور تین سونارک سی ہڈیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہوا کا ہر تھپیڑ عصب سمعی پر جا کر لگتا ہے اور ہر ٹکراؤ دماغ تک پہونچتے پہونچتے آواز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا کارگذار ٹیلی گراف آج تک کہیں سننے میں بھی آیا ہے؟

دل آنکھ کان کے عجائبات اور حکمت و صنعت کی ان عجائب کاریوں سے متعلق اہل فن کی ان تصریحات کو پڑھ لینے کے بعد پھر قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھئے! اور سوچئے کہ جس نے یہ کہا کہ اے انسانو!

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ۔

وہ صانع مطلق وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے کان اور آنکھ اور قلب کی حیرت انگیز مشین بنا دی۔ اس پر بھی تم ان نعمتوں کا شکر بہت کم ادا کرتے ہو۔

کیا اس نے ذرہ بھر بھی مبالغہ یا شاعری سے کام لیا۔؟

(صدق لکھنؤ)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ماننے کا مطلب :-

رسول اللہ علیہ وسلم مخلوق الٰہی کے لیے ایک پیام خیر و سعادت لیکر آئے تھے آپ نے لوگوں کو دعوت دی کہ وہ اس پیام حق کو قبول کریں اور اس کی روشنی میں اپنے لیے راہ عمل متعین کریں۔ حضور کے ماننے کا مطلب یہی ہے کہ بے کم و کاست

آپ کی دعوت حق قبول کی جائے۔ آپ کے نقش قدم ہمارے لئے دلیلِ راہ ہوں۔ آپ کی لائی شریعت ہماری زندگی کا دستور عمل بنے۔ ہمارے تمام اعمال و افعال آپکے احکام کے مطابق ہوں۔ اور آپ کا ہر فرمان ہر حال میں ہمارے لئے واجب الاتباع ہو۔ نبی کے آنے کا یہی مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ — ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو صرف اس لیئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

ایک اور جگہ اس سے بھی زیادہ صراحت اور اس سے زیادہ زور و قوت کے ساتھ ارشاد ہوا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ — تیرے رب کی قسم اِس وقت تک مومن نہیں ہوں گے جب تک یہ اپنے باہمی اختلافات میں آپکو حکم نہ بنائیں پھر جو کچھ آپ فیصلہ کر دیں اسے بے چون و چرا تسلیم کریں اور اس بارے میں اپنے دلوں میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان کے لیئے ضروری قرار دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو ہمہ وقت اپنے سامنے رکھے اور آپ کی نمونے پر اپنے آپ کو ڈھالے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ — تمہارے لیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں عمدہ نمونہ ہے۔

بلکہ اس بارے میں یہاں تک کہہ دیا۔ کہ میری محبت کی آرزو ہے تو میرے رسول کے نقش قدم کی پیروی کرو۔ حکم ہوا ہے کہ اے نبی

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ — لوگوں سے کہدیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تعالیٰ تمھیں چاہنے لگے گا

(تعمیر لکھنؤ)

سبق لیجیے:-

"واقعات سے سبق لینا ہر صحیح العقل انسان کا فریضہ ہے۔ ہنگامی حالات اور خطرات ہی کے موقعوں پر لوگوں کی نفسیات اور عقائد و ایمان کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ پچھلے فسادات کے موقعہ پر جہاں جان بچانے کے لیے بعض مسلمانوں نے اپنے کو ہندو کہہ کر جان بچائی ہے یا بعض ڈاڑھی رکھنے والوں نے اپنی ڈاڑھیاں اس لیے منڈوا دیں کہ وہ مسلمان معلوم نہ ہوں، وہاں ایسے بھی لوگ ہیں جنھوں نے ڈاڑھی مونچھیں منڈانے کی عادت رکھتے ہوئے ڈاڑھی بڑھائی اور اس کا سبب یہ بتایا کہ اس جنون کے زمانہ میں کوئی مسلمان مجھے ہندو سمجھ کر مار نہ دے۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ کوئی ہندو تم کو مسلمان سمجھ کر مار دے تب؟ تو انھوں نے جواب دیا اور یہی جواب اس واقعہ کی روح ہے کہ بہر حال وہ مسلمان سمجھ کر مارے گا اور یہ اس سے بہتر ہے کہ کوئی مسلمان مجھ کو غیر مسلم سمجھ کر مار دے"

ایک اور کمسن بچے کے متعلق بیان کیا گیا کہ وہ اسکول سے پڑھ کر واپس آ رہا تھا کہ کچھ فسادیوں نے اس کو گھیر لیا۔ ہندو ساتھیوں نے (از راہِ ہمدردی) کہا کہ یہ ہندو ہے مگر جب فسادیوں نے خود اس بچہ سے پوچھا تو اُس نے صاف کہا کہ میں مسلم ہوں اور اس کو مار دیا گیا۔"

سوچیے کیا آپ کو کردار کا یہ نمونہ پسند ہے اور اپنے لیے بھی آپ اس کو پسند کرتے ہیں؟

"نقیب پھلواری شریف"

موجودہ مسلمان قوم اور دینِ اسلام:-

ہماری قوم عرصہ دراز سے اپنی صحیح حیثیت ختم کر چکی ہے وہ داعی کی حیثیت سے یہاں آئی تھی مگر اب کہنا یہ ہے کہ وہ دوسروں کو دین کی دعوت کیا دیتی خود اپنے ہاتھ سے دین کا دامن چھوڑ چکی ہے۔ اس کی سیاسی و معاشی شکست اور ذلت و پامالی کی حقیقی وجہ یہی ہے۔ یہ تلخ حقیقت ہم کو اپنے حلق سے اتارنی پڑے گی کہ ہماری قوم اجتماعی حیثیت سے ہدایت دین سے وابستہ

نہیں رہی ہے اور اس کی زندگی کسی عنوان سے بھی دینی زندگی نہیں رہی ہے۔ اگر آپ اسلام کی تلاش میں نکلیں تو بازاروں، اسٹیشنوں، ملکوٹھیوں اور بنگلوں، عام گزرگاہوں یا بود و باش کی جگہوں میں اس کا نام و نشان بھی نہ پائیں گے۔ اگر آپ بہت تلاش کریں تو کچھ بڑی چھوٹی خانقاہوں، مسجدوں اور مدرسوں میں اس کو مغموم و افسردہ حالت میں پائیں گے۔ مگر دین کی ان پناہ گاہوں میں بھی شاید ہی کوئی ایسی پناہ گاہ نکلے جہاں دین مکمل صورت میں پلیا جائے اس اجمال کی قدرے تفصیل بھی سنئے اور خون کے آنسو بہائیے۔ جو لوگ مسلمان کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں وہ کئی طبقات پر منقسم ہیں:۔

ایک طبقہ تو وہ ہے جو یہ بھی نہیں جانتا کہ اسلام کس چیز کا نام ہے۔ بہت سے غیر مسلم ایسے نکل آئیں گے جو ان سے زیادہ اسلام سے واقف ہوں گے۔ ان لوگوں کو دین سے کوئی وابستگی ہے نہ ان کے دل میں اس کی کوئی عظمت ہے۔ ان کی غیر اسلامی رحمیں ہمارے پڑھے لکھے مسلمانوں کو کوس رہی ہیں جنکی غفلت شعاری، عیش کوشی، اور دنیا طلبی نے ان کو صدیاں گزرنے پر بھی ایمان کی شیرینی سے ناآشنا رکھا اس طبقہ کے دین و ایمان پر تو فاتحہ پڑھ لیجئے اور قیامت میں اُنکے جرم ارتداد کی جوابدہی کے لیئے تیار ہو جائیے۔

دوسرا طبقہ اُن غافل اور بے حس لوگوں کا ہے جنہوں نے جسم کے خلاؤں کو بھرنا اور خالی کرنا اپنا مقصود حیات بنالیا ہے اور لکنہ اخلد الی الارض الخ کی عملی تفسیر بن گئے ہیں دین سے بے تعلقی نے حیرت انگیز طور پر دو متضاد اور احمقانہ صفتیں انہیں جمع کردی ہیں۔ ایک طرف تو بے حسی کا یہ عالم کہ گویا اس آسمان کے نیچے رہتے ہی نہیں دوسری طرف حسی مصیبت سے گھبراہٹ دہراس کی یہ حالت کہ سوتے میں چونک پڑتے ہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں انابت الی اللہ مفقود۔ اس لیئے دینی و روحانی مصیبت کے احساس و ادراک سے بالکل خالی، اور بزدلی کم ہمتی، مرعوبیت، اعتراف غلامی کا چلتا پھرتا نمونہ بنے ہوے ہیں۔ انھیں میں ایک قلیل تعداد ایسے اشخاص کی بھی نکل آئیگی جو اُسوقت ذرا چونک اٹھتے ہیں جب کوئی تازہ مصیبت اُنکے چٹکی لیتی ہے مگر صبر کے خوبصورت لباس میں اپنی بزدلی و بے غیرتی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دین کی حمایت میں ایک تنکا ہلانا بھی اُن کے یہاں حماقت میں داخل ہے۔ البتہ اس کے زوال پر

تھوڑی دیر لفظی ماتم کر کے اپنی دانست میں دین کا حق ادا کر دیتے ہیں۔
"صدق لکھنؤ" (مقالہ مولانا محمد بخاری صاحب ندیلوی)

نسلی اسلام کے حامل اپنے کردار کے آئینہ میں:۔

اخبارات میں یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ کسی ذی ثروت مسلم گھرانے کی ایک لڑکی نے کسی ہندو سے شادی کرلی، خبر میں اس بات کی صراحت کی گئی تھی کہ زوجین مذاہب کی بنیادی وحدت کے قائل ہیں اس لیے اپنے اپنے مذاہب پر قائم رہیں گے۔

اُن لوگوں کے لیے جو دعوائے اسلام کے باوجود غیر اسلامی طریق پر سوچنے کے عادی ہیں یہ خبر بہت زیادہ وجہ اذیت ہوگی اور وہ حضرات بھی اس واقعہ کی اطلاع پاکر ناک کٹ جانے کے تصور سے "مہرے آتش دید" بن رہے ہوں گے جو کل تک مغل سلاطین کے حرم میں ہندوانیوں کے داخلہ اور مسلم نوجوانوں کے ہندو لڑکیوں سے تعلقات پر فخر کرتے اور بغلیں بجاتے رہے ہیں۔ کاش یہ لوگ جانتے کہ اسلامی زاویہ نگاہ سے نہ وہ کوئی کارنامہ تھا، نہ یہ کوئی حادثہ۔!

اب ذرا "مذاہب کی بنیادی وحدت" کی حقیقت بھی ملاحظہ ہو۔ یہ فی الحقیقت الحاد اور دین قومیت کا کلمہ اور عنوان ہے۔ جو لوگ اسلامی اصولوں پر زندگی بسر کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتے، اُن کے لیے یہ آسان راہِ فرار بھی ہے۔ اور محفوظ کمین گاہ بھی اس رخنہ سے بڑے بڑے ثقہ حضرات نے خروج فرمایا ہے۔

اسلام میں "مذاہب کی بنیادی وحدت" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اصولی طور پر اس کا اقرار کرتا ہے کہ خدا نے ہر قوم کے لیے ہادی بھیجے، خدا کے برگزیدہ بندے ہر عہد میں ایک ہی "الدین" کو پیش کرتے رہے۔ ان کے بعد امتداد زمانہ اور بعض ناگزیر اسباب سے اس "الدین" کے ازلی و ابدی حقایق پر پردے پڑتے گئے اور اس کی اصل صورت مسخ ہوگئی۔ سب سے آخر میں اسلام آیا اور اُس نے اُسی "الدین" کو واضح اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کے سامنے رکھا۔ اب وہ ہمیشہ کے لیے تنہا تمام انسانوں کا مذہب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام اپنے کو دوسرے مذاہب کا حریف نہیں بلکہ حلیف قرار دیتا ہے۔ وہ اس کا معترف

ہے کہ اس حال میں بھی دوسرے مذاہب کی کتابوں میں صداقت کا عنصر کہیں کہیں ضرور جھلکتا ہے لیکن اصل "الدین" اس وقت صرف اسلام ہے اسے یا کلیۃً قبول کیا جا سکتا ہے یا قطعاً رد، درمیانی کوئی صورت نہیں جن لوگوں کے دماغ میں یہ خناس سمایا ہے کہ قرآن کریم کے صریح احکام کی خلاف ورزی کے باوجود کوئی ذی فہم ان کے دعوائے مسلمانی کو سنجیدگی سے باور کرے گا وہ عقل عام کی توہین کرتے ہیں۔

اس قسم کے واقعات سے اُن لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو ہر حق گو کا منھ بند کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں جو یہ سچی، ٹھوس اور کڑوی حقیقت انکے سامنے رکھتا ہے کہ مسلمانوں کی وافر اکثریت دین کے تقاضوں سے نا آشنا، اس کے مطالبات سے بے پروا اور اس کے علم سے قطعی نابلد ہے۔

کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ہم اپنے ماضی و حال کا جائزہ لیں اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنا اور اپنے ساتھیوں کا موقف متعین کر لیں، نسلی و روایتی اسلام اب بیل کی حیثیت سے بھی اپنا وزن اور افادیت کھو چکا ہے۔ اگر ہم حیات و کائنات کے بارے میں اسلامی اصولوں کی صحت پر یقین رکھتے ہیں تو ہماری پوری زندگی کو اس پر گواہ ہونا چاہیئے! اور اگر ترک و اختیار اور رد و قبول کے معاملہ میں ہمارے نزدیک کتاب و سنت کا فیصلہ حرفِ آخر کا مقام نہیں رکھتا تو کم سے کم شرافت یہ ہے کہ اس دو رخی پالیسی کو چھوڑ کر ہم فی الواقع جو کچھ ہیں اسی شکل میں دنیا کے سامنے آئیں اور اس بہروپ کو خیرباد کہہ دیں۔

اب رہے وہ لوگ جو اسلام کو دین حق باور کرتے اور اس کے اصولوں کی برتری پر ذہنی و قلبی حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں انھیں مستعدی حکمت و بصیرت اور عزم کے ساتھ "شہادت حق" کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے، کسی خاص واقعہ نے اُن پر یہ فرض عائد نہیں کیا، اُنکے لئے تو یہی مقصود حیات اور زندگی کا واحد سودا ہے، مسلمان گھرانوں میں دین کے ناقص تصور، دینی تعلیم و تربیت کے فقدان اور دین سے فکر و عمل کے ہر رشتہ کے انقطاع، مختصر یہ کہ ہر ہر رخنہ کو نگاہ میں رکھنا اور ایک ایک کو بند کرنا ہے۔ خدا کا فضل شامل حال ہے تو یہ کام ہو کر رہے گا۔

(الانصاف الہ آباد)

ایک سیّد زادی روضۂ اقدس پر

از جناب تسکین[1] صاحبہ

تسکین باب ساقیِ کوثر کے سامنے
عرضِ نیاز روضۂ اطہر کے سامنے

تسکین اور سرورِ عالم کی بزمِ ناز
حوریں خجل ہیں میرے مقدّر کے سامنے

سلام اے رحمتِ عالم! سلام اے لطفِ ربانی! سلام اے نازشِ آدم! سلام اے فخرِ انسانی!
سلام اے ساقیِ کوثر! سلام اے شافعِ محشر حبیبِ خالقِ اکبر! کلیدِ فضلِ یزدانی!
سلام اے رونقِ کعبہ! سلام اے زینتِ طیبہ! جلالِ مہرِ اسلامی! جمالِ ماہِ ایمانی!
سلام اے سالکِ اسریٰ! امامِ مسجدِ اقصیٰ! سلام اے صاحبِ معراجِ جسمانی و روحانی!
سلام اے مستویِ قربتِ "قوسین او ادنیٰ"! سلام اے سرِ "اوحیٰ" مہبطِ آیاتِ ربانی!
سلام اے سیّدِ و سرور! مکینِ روضۂ اطہر! ضیائے حجرۂ انور! فروغِ قصرِ لاثانی!
یہ وہ گھر ہے جہاں جاروب کش حوریں ہیں پلکوں سے یہ وہ در ہے جہاں روح الامیں کرتے ہیں دربانی
یہی حجرہ حریمِ خاصِ انوارِ حمیرا ہے یہی خلوت سرا ہے منزلِ تنزیلِ فرقانی!

---

[1] یہ تخلص فرضی ہے اصل نام پردۂ راز میں ہے ۱۲۰ مدیر

اسی منزل میں ہیں آرام فرما سیّدِ والاؐ
ضیا گستر اسی محفل میں ہے شمعِ شبستانیؓ

درخشاں ہیں یہیں خورشیدِ عالمتابؐ کی ضو سے
اِدھر لعلِ بدخشانیؓ! اُدھر یاقوتِ رُمّانیؓ

اِدھر صدیقؓ ہیں پہلو نشینِ سیّدِ والا
اُدھر فاروقؓ ہیں پابوسِ محبوبِ سبحانی

سلام اے محرمِ آرامگاہِ خاصِ پیغمبرؐ!
سلام اے یارِ بارگاہِ قربِ سلطانیؐ!

سلام اے زیبِ محرابِ پیمبرؐ! رونقِ منبرؐ!
ابوبکرؓ و عمرؓ قائم مقامِ اول و ثانی!

سلام اس خستہ جاں تسکیں کے منظور ہو جائیں
زہے قسمت اگر مقبول ہو جائے ثنا خوانی!

خداوندا! کرم تیرا، دیارِ پاک میں لایا
مجھ ایسی بے حقیقت پر یہ رحمت کی فراوانی!

الٰہی یہ مری قسمت! یہ میں! یہ روضۂ جنت!
خزاں دیدہ نظر! سیرِ بہارِ باغِ رضوانی!

زہے قسمت! یہ آنکھیں! یہ جمالِ گنبدِ خضرا!
یہ مشتِ خاک! یہ ہر چار جانب جلوہ سامانی!

زہے قسمت! زیارت روضۂ اطہر کی ہوتی ہے
زہے قسمت! مری آنکھوں نے دیکھی جنتِ ثانی

تڑپ کر دم نکل جائے تو بختِ مردہ جی اُٹھے
ملے مجھ کو بقیعِ پاک کا منشورِ غفرانی!

کہیں ہوتا مرا مدفن حبیبِ پاکؐ کا مسکن
وہ کہتے "اُسکنی تسکین فی روحٍ و ریحانٍ"

کھڑی ہوں ہاتھ باندھے دامنِ امید پھیلائے
ادب سے سر جھکائے دل میں مصروفِ دعا خوانی

شہِ لولاکؐ کا صدقہ! درودِ پاک کا صدقہ
یہاں کی خاک کا صدقہ طفیلِ فضلِ ربانی

خدا سن لے دعا "اغفر لنا ولوالدینا" کی
سفارش عرض کرتی ہے مرے اشکوں کی طغیانی

گھٹا رحمت کی اس دربارِ پُر انوار پر چھائے
درودوں کے یہاں برسا کے موتی ابرِ نیسانی

الٰہی ڈھانپ لے اس رحمتِ مخصوص میں ہم کو
بدل دے سربلندی سے اس امت کی پریشانی

سلام اے رحمتِ عالمؐ! سلام اے راحتِ کاملؐ
سلام اے رقّتِ یحییٰؑ! سلام اے عیسیٰؑ ثانیؐ

پریشاں، بے سر و ساماں، ذلیل و خوار ہے امت
توجہ یا حبیب اللہ! دعا محبوبِ سبحانی!

ترے دربارِ پُر انوار میں روتی ہے یہ جدّی!
قریشی فاطمی تسکین نامی ایک دیوانی

ایک اچھّے مصرفِ خیر کی اطلاع

لکھنؤ میں دفتر الفرقان سے تھوڑے سے فاصلہ پر بہت پرانی اور شکستہ سی ایک غیر آباد مسجد تھی جس کے ساتھ کافی زمین بھی تھی جس پر بعض لوگوں نے ناجائز طریقہ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ لکھنؤ کے ایک صاحب خیر تاجر (حافظ خیراتی صاحب) نے اپنی کوشش اور اپنے صرفہ سے عدالتی چارہ جوئی کر کے ان لوگوں کے قبضہ سے اس کو نکلوا کے باقاعدہ مجلس ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تولیت میں دیدیا ہے اور اب وہ اپنے ہی صرفہ سے اس کی تعمیر و مرمت بھی کرا رہے ہیں (بلکہ بہت کچھ کرا چکے ہیں) اور اس سے ملحقہ افتادہ زمین پر چند کمروں پر مشتمل ایک دینی اور تربیتی اقامت خانہ بھی بنوا رہے ہیں جس میں دینی خدام اور تبلیغی جدوجہد کے سلسلہ میں آنے والے باہر کے مہمان اور جماعتیں انشاء اللہ قیام کیا کریں گی گویا وہ ایک تبلیغی "صفّہ" اور تربیتی دارالاقامہ بھی ہوگا (اور اسی لیے راقم سطور کو بھی اس سے کچھ تعلق و دلچسپی ہے) حافظ خیراتی صاحب کے اس عمل کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے وہ اب تک کئی ہزار روپئے اس تعمیری سلسلہ پر صرف کر چکے ہیں اور برابر کر رہے ہیں۔ لیکن کام بڑا ہے اور موصوف کوئی بڑے دولتمند قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ جو حضرات اپنا روپیہ صرف کرنے کے لیے اس قسم کے صدقہ جاریہ کے موقع کے تلاشی رہا کرتے ہیں انکے لیے یہ موقع پورے اعتماد اور اطمینان کے لائق ہے وہ اس کار خیر میں حافظ صاحب کے شریک ہو سکتے ہیں۔ امدادی رقم اگر کوئی صاحب بھیجنا چاہیں تو "ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء گوئن روڈ لکھنؤ" کے پتہ پر بھیج سکتے ہیں۔ لیکن ہر رقم کے ساتھ اسکی تصریح کر دینا چاہیے کہ "یہ رقم زیر تعمیر "تبلیغی خانقاہ" کے لیے بھیجی جا رہی ہے۔

نوٹ :- اس طرح کی امدادی اپیلوں کے لیے الفرقان کے صفحات عام طور سے استعمال نہیں کیے جاتے ہیں لیکن اس خاص کام کا کچھ تعلق چونکہ اُس دینی جدوجہد سے بھی ہے جو الفرقان کا موضوع دعوت ہے اس لیے یہ سطریں لکھی اور شائع کی جا رہی ہیں۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ — ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۶ نمبر (۵) بابتہ ماہ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۶۸ھ

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مُدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھیے!
"الفرقان" اور "کتبخانہ الفرقان" بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں
لہٰذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھیے!
دفتر "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ (یو۔پی)

چندہ سالانہ چار روپیہ نمونہ کا پرچہ چھ آنے

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

جلد (۱۶)	بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۸ھ مطابق مارچ ۱۹۴۹ء	نمبر (۵)

(۱) الفرقان کے خریدار صاحبان

خط کتابت اور منی آرڈر میں صاف اور خوشخط اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر ضرور لکھا کریں۔ جو حضرات اسمیں تساہل کرتے ہیں وہ دراصل ہمارے لیئے بڑی تکلیف کا باعث بنتے ہیں جن خطوط میں خریداری نمبر درج نہیں ہوتا رجسٹر میں انکا نام تلاش کرنے میں کبھی کبھی کئی گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اس بارہ میں آپ حضرات کبھی غفلت نہ فرمائیں ورنہ اندراجات کی غلطی کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

(۲) یہاں سرخ پنسل کا نشان ▭

اس بات کی علامت ہے کہ آپکی مدت خریداری ہمارے حساب سے ختم ہو چکی ہے اسی واسطے آپکے منی آرڈر فارم بھیجا جا رہا ہے، براہ کرم آیندہ کے لیئے اپنا چندہ آپ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیں۔ اگر کسی وجہ سے آپ کچھ دنوں کے بعد بھیجنا چاہیں یا آیندہ خریداری جاری رکھنے کا ارادہ نہ ہو تو فوراً اطلاع دیں، ورنہ اگلا پرچہ حسب قاعدہ وی پی روانہ ہوگا جس کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

ناظم دفتر الفرقان

بابت شعبان ۷۱ھ
جمعہ ۱۸ ... ۱۹۵۲ء

نگاہِ اوّلین!

(۱) اسلام کے بارہ میں اگر آپ کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں تو یہ بنیادی حقیقت - (جو الفرقان کے صفحات میں اس سے پہلے بھی بار بار دہرائی جا چکی ہے) ضرور آپکے علم میں ہوگی کہ اسلام کسی ذات برادری کا نام یا کسی قومیت کا عنوان نہیں ہے بلکہ اُس خاص طرز زندگی کا نام اسلام ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کیا ہے اور جس کی تعلیم و تبلیغ کے لیئے اس نے دنیا میں وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبر بھیجے اور کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے۔ اور سب آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری اور مکمل شکل میں اُس کی تعلیم لے کر آئے ! الغرض اسلام کے متعلق اگر آپ کو ادنیٰ سی بھی واقفیت ہوگی تو اتنی بات ضرور آپ جانتے ہوں گے کہ دراصل اسی طرز زندگی اور ضابطۂ حیات کا نام اسلام ہے۔

(۲) اسی کے ساتھ اگر آپ موجودہ مسلمان قوم کے طرز زندگی سے متعلق کچھ تفصیلی معلومات رکھتے ہوں گے اور کبھی آپ نے دینی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے مختلف طبقات کی حالت کا جائزہ لیا ہوگا تو اس حقیقت میں بھی آپکے کوئی شک شبہ نہ ہوگا کہ اس قوم کا طرز زندگی بحیثیت مجموعی بدتوں سے وہ نہیں ہے جو اس کے لیئے اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول نے متعین کیا تھا اور جس کا جامع عنوان اسلام تھا اور جو کسی امت کو اللہ کی محبت اور رحمت کا مستحق بنا دیتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس موجودہ مسلمانوں کی اکثریت کا طرز زندگی اس وقت وہ ہے جو قوموں کو اللہ کے غضب اور لعنت کا مستحق بناتا ہے۔ قرآن پاک میں اگلی امتوں بالخصوص یہودیوں اور نصرانیوں کو اُن کے جن اعمال و احوال پر مغضوب اور مستحق لعنت قرار دیا گیا ہے واقعہ یہ ہے کہ موجودہ مسلمان قوم کی بہت بڑی تعداد میں وہ ساری گندگیاں موجود ہیں۔ اور اسی لیئے اس وقت مسلمان قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بظاہر رضا اور رحمت کا معاملہ نہیں ہے بلکہ غضب اور لعنت کے آثار بہت صاف نمایاں ہیں اور اگر اس امت نے اپنے رویہ میں اللہ کو راضی کرنے والی تبدیلی نہ کی تو اس کا بہت امکان ہے کہ اللہ کے بے لاگ قانون کا فیصلہ یہی ہو کہ (خدا نکردہ) اللہ کا غضب اپنی آخری شکل میں ہم پر چھا جائے۔ سُنَّةَ اللهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا ۔

(۲) اور اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ چشم بصیرت عطا فرمائی ہے جو حال کی رفتار سے مستقبل کے بارہ میں صحیح قیاس کر سکتی ہو تو پھر آپ کو اس کا اندازہ بھی ضرور ہوگا کہ مسلمانوں کے جو طبقے اس وقت اس حال میں ہیں کہ وہ نام ونسبت یا چند رسوم کے لحاظ سے تو مسلمان ہیں لیکن ایمان واسلام کو اپنی زندگی بنانے کا انھوں نے کوئی خاص فیصلہ نہیں کیا ہے یا جن کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اُس حد تک اسلام کے احکام سے اپنا تعلق رکھتے ہیں جب تک اُن کے دنیوی مفادات پر کوئی آنچ نہ آئے، لیکن اگر دین کے احکام پر چلنے کی وجہ سے انھیں کسی منفعت سے دست بردار ہونا پڑے یا کسی ملتے ہوئے اعزاز کو چھوڑنا پڑے یا فیشن کے خلاف چلنا پڑے تو پھر وہ منفعت یا اعزاز ومنصب یا فیشن کو نہیں چھوڑتے بلکہ اسلام کے احکام کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بہرحال اگر اللہ نے آپ کو خاص بصیرت دی ہے تو ایسے نام کے یا ادھورے مسلمانوں کے متعلق آپ کو ضرور اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے مستقبل میں خدانخواستہ پلس درجہ کے بھی مسلمان نہ رہ سکیں گے ــــ اللہ تعالیٰ نے جن بندوں کو وہ خاص فراست نصیب فرمائی ہو جس سے اس قسم کی چیزوں کو سوچا سمجھا جا سکتا ہو، انھیں اس بارہ میں ذرہ برابر بھی شک نہیں ہو سکتا کہ آیندہ اس ملک میں اللہ کے صرف وہی صادق بندے "دین حق" پر قائم رہیں گے جو دین کو اپنی عزیز ترین متاع سمجھیں گے اور اللہ ورسول کے ساتھ جن کا تعلق دوسری تمام چیزوں سے زیادہ گہرا ہوگا اور جن کے دلوں میں اللہ کی رضا اور جنت کا شوق دوسرے تمام شوقوں پر غالب ہوگا، یعنی جو صرف نام ونسل کے لحاظ سے مسلمان نہ ہوں گے بلکہ جو واقعی اور حقیقی مومن ومسلم ہوں گے اور جن کی زندگی ایمان واسلام والی زندگی ہوگی۔

یہ تین حقیقتیں اور ہمارے یہ تین یقین ہیں جن کا ہم سے اور اللہ کے ہر اُس بندے سے جو اللہ ورسول کا اور اسلام کا اپنے پر کوئی حق سمجھتا ہے تقاضا اور مطالبہ ہے کہ مسلمان قوم میں حقیقی ایمان واسلام پیدا کرنے کے لیے اور اسلام کو ان کی زندگی کا فیصلہ بلکہ بعینہٖ ان کی زندگی بنا دینے کے لیے اس وقت جو کچھ ہم کر سکتے ہیں اُس کے کرنے میں ذرہ برابر دریغ نہ کریں۔

اللہ کے جن بندوں کی نظروں سے یہ سطریں گزریں اُن کو سمجھنا چاہیے کہ وہ اس گزارش کے خصوصی مخاطب ہیں اور انھیں سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ اس مقصد کے لیے وہ کیا کیا کر سکتے ہیں؟ ــ

ظاہر ہے کہ یہ کام چند افراد کے یا کسی خاص طبقے کے کرنے کا نہیں ہے. کروڑوں میں اگر لاکھوں کام کرنے والے بھی نہ ہوں تو کام نہیں چل سکتا۔ ضرورت ہے کہ اس نازک گھڑی میں اللہ کے جو بندے اللہ و رسول کے خاص وفاداروں میں اپنے کو شامل کرنے کی طمع رکھتے ہوں وہ اس کام کو اپنی زندگی کا جزو بنالیں. اُن متفرق انفرادی کوششوں کے علاوہ جو اللہ کے بندے اپنے اپنے طور پر اس سلسلہ میں کر سکتے ہیں. اصل بنیادی کام وہ اجتماعی جدوجہد ہے جس کی طرف الفرقان کے ذریعہ برابر دعوت دی جاتی رہتی ہے —

اگرچہ بہت سے تجربوں کے بعد اور اس کام کی نظرت اور خاص ساخت پر نظر رکھتے ہوئے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کام کے لیئے جدید طرز کی کوئی انجمن یا پارٹی نہ بنائی جائے اور مسلمانوں کو اس انجمن یا پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت نہ دی جائے لیکن کام بہرحال اجتماعی طور پر اور مل جل کر ہی کیا جائے۔

اس کام کے لیئے ہم جس طریقہ کو زیادہ مفید اور بہتر سمجھتے ہیں اور جس کی ہم دعوت دیتے ہیں چونکہ وہ سراسر عملی ہے اس لیئے اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیئے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ابتدا میں کچھ دنوں اس کام کی کرنے والی کسی باقاعدہ باسلیقہ اور تربیت یافتہ جماعت کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔

جو حضرات ایسے موقعوں کے منتظر رہتے ہیں یا جن کے دل میں اب اس کے لیئے آمادگی پیدا ہو انکی اطلاع کے لیئے لکھا جاتا ہے کہ

ایک اصلاحی و تبلیغی دورہ کی اطلاع | انشاء اللہ ۲۰ ر اپریل کو ایک جماعت اس کام کا پیغام لے کر اپنا دورہ شروع کرے گی خدا نے چاہا تو یہ عاجز راقم سطور بھی اس کے خادموں میں ہوگا. جو حضرات اس دورہ میں ساتھ ہونا چاہیں وہ مزید تفصیلات خط کتابت سے دریافت فرمائیں۔

نوٹ :۔ اس دورہ میں صرف وہی حضرات ساتھ لیئے جاسکیں گے. جو خط کتابت کے ذریعہ یا زبانی پہلے سے ساتھ چلنا طے فرمالیں گے۔ اور جو جماعت کے نظام کی پوری پابندی کر سکیں گے۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۹ جمادی الاولیٰ سنہ

ایک خط

جو حضرت صوفی سید عبدالرب صاحب (ایم۔ اے) نے
اپنے ایک عزیز دوست کے نام لکھا

[مخدوم و محترم حضرت صوفی صاحب مدظلہ نے اشاعت کی فرمایش کے ساتھ ایک گرامی نامہ کی نقل ناچیز مدیر الفرقان کو بھی بھیجی ہے جو ذیل میں درج ہے۔ اس میں اس نامۂ سیاہ کے متعلق یا "الفرقان" کے متعلق جن نیک گمانیوں کا بڑی افراط سے اظہار فرمایا گیا ہے میں اسکو اپنے حق میں صرف نیک فال سمجھتا ہوں، ورنہ اپنی حالت اور اپنی نیت سے میں خوب واقف ہوں اور الحمد للہ کسی دھوکہ میں نہیں ہوں۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ۔"

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح محض اپنے کرم سے میرے عیبوں اور میری گندگیوں کو اپنے بندوں سے چھپا رکھا ہے اسی کرم و فضل سے وہ ان کی اصلاح بھی فرمائے اور دنیا و آخرت کی رسوائیوں سے بچائے۔

ورحم اللہ عبداً قال آمینا] محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ]

برادر عزیز سلمہ۔ سلام مسنون۔ میرا ربیع الآخر ۱۳۶۶ھ کا الفرقان آپکے پاس کئی روز سے ہے لیکن آپکا ایک جملہ سن کر مجھے اسکی واپسی کی کوئی جلدی نہیں رہی آپنے کیسا شیریں جملہ ادا کیا تھا کہ "الفرقان میں تو بڑے کام کی باتیں ہیں" فکر کی جن گہرائیوں اور احساس کی جن وسعتوں پر آپ کا یہ جملہ چھا سکتا ہے کاش آپ کو اس کا ادراک ہوجاتا۔ بادلوں کی رگڑ سے اللہ تعالیٰ بجلی کی ایک لہر پیدا کردیتے ہیں جو سکینڈ کے کسی حصہ کے مختصر سے وقفہ میں زمین و آسمان اور این و آن کو روشن کر جاتی ہے اور پھر گھپ اندھیرا ہوجاتا ہے۔ روشنی کے اس جلوے کی ایک جھلک دکھا کر اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کے دماغ کو اس جلوے کی گرفت کا شیدائی بنا دیا اور پھر اس کی گرفت کا طریقہ بتا دیا جس کے نتیجہ میں آج شہر کے شہر رات کے وقت "تمام آفتاب" بنجاتے ہیں۔ ایک اس سے تیز تر روشن تر اور قوی تر برقی رو خود انسان کے اندر بھی موجود ہے جو یوں ہی چمک کر غائب ہوجاتی ہے لیکن پکڑنے والے اسے بھی پکڑ لیتے ہیں اور اپنے اقلیم جسم و جان کو "نور علیٰ نور" بنا لیتے ہیں بلکہ اسی جلوے سے ساری دنیائے انسانیت منور ہوتی ہے حق یہ ہے کہ انسان ہے ہی سارے عالم کا خلاصہ جو ہر جز اپنی نوعیت میں

زیادہ عجیب تر اور پرتاثیر ہے ظاہر ہے کہ ہر چیز کا مت اصل نفی سے زیادہ تیز ہوتا ہے گو عدا میں قلیل ہوتا ہے یہی حال انسان کی جوہریت کا سارے عالم کے مقابلہ میں ہے۔ اہل بصیرت نے اسی پر یہ کہہ دیا ہے ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درا   تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درا

یعنی بڑے غضب کی بات ہے کہ ہوس سیر سرو وسمن کے لئے تم کو کھینچ لیجائے جب کہ تم خود ہی اپنی ذات میں غنچے سے کم شگفتہ تھوڑا ہی ہو۔ ذرا دل کا دروازہ کھولو اور چمن کے اندر داخل ہو جاؤ۔

بہرحال وہ تیز تر برقی رو جو انسان کے اندر موجود ہے وہ اس کا "احساس ہے"۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۰ر ۱۱ر فروری کی درمیانی شب میں جلال آباد سے تین میل دور موضع روپاپور میں اللہ کا ایک بندہ تہجد کیلئے اٹھا تھا ہم آپ جیسے غافل بستر کی نرمی و گرمی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کو سرد ہواؤں سے سابقہ ہے لیکن یہ تو وہی بتا سکتا ہے جس نے بستر کی نرمی و گرمی پر پچھلے وقت کی ہوائے سرد اور آب خنک کے درمیان نماز کو اور اللہ کے ذکر کو ترجیح دی تھی"۔ لطف این مے نشناسی بخدا تا نچشی "(یعنی خدا کی قسم تم اس شراب کا لطف نہیں سمجھ سکتے جب تک اسے خود نہ چکھو) روپاپور کی سردی کی کیا حقیقت ہے جب کہ لندن کی سردی کا ذکر علامہ اقبال یوں کرتے ہیں ؎

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی   نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

بات یہ ہے کہ۔ ع۔ چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی ۔ اور بغیر اس کے نہ زندگی کی لذت حاصل ہوتی ہے نہ کوئی دولت ہاتھ آتی ہے ؎

عطار ہو، رومی ہو، جامی ہو، غزالی ہو   کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

اور جس طرح کوئی شخص کسی کے نرم و گرم گدے اور لحاف کو دیکھ کر للچا سکتا ہے اس سے زیادہ ان آرام بخش خوابگاہوں سے اپنے پہلو جدا کر کے اللہ کے لئے کھڑے ہونے والوں کو دیکھ کر ایسا ہی کرنے لگنے کی طمع پیدا ہوتی ہے بلکہ تو محبت بھی وہ آگ ہے جس میں کسی کو جلتے ہوئے دیکھ کر آدمی اس میں کود پڑنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اب ایسے دل جلے ناپید ہوتے جاتے ہیں اور یہ آگ نایاب ہوتی جاتی ہے میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ اسی آگ کی ایک چنگاری آپ پر بھی پڑی تھی اور میرے سامنے آپ نے اللہ کے اس بندے سے فجر سے پہلے کہا تھا کہ "جب سے آپ اٹھے ہیں مجھے نیند نہیں آئی ہے میں پڑا ہوا یہی سوچ رہا ہوں کہ اللہ کے ایک یہ بندے ہیں جو راتوں کو اٹھ کر اللہ کو پکارتے ہیں ایک ہم ہیں کہ پڑے ہوئے کروٹیں لے رہے ہیں"۔ یہی وہ برقی رو تھی جو بادل کے ٹکڑوں کی رگڑ سے ظاہر ہونے والی بجلی کی دمک سے تیز تر اور قوی تر ہوتی ہے اسی کا نام احساس ہے اور اسی احساس نے آپ کو اسی دن سے نماز پر کھڑا کر دیا تھا حالانکہ روپاپور کے گرد و نواح میں نہ مسجد نہ اذانیں نہ مسلمان نہ جماعتیں۔ یہ کیا چیز تھی جس نے بھرے پڑے شاہجہانپور میں تو آپ کو نہ اذانوں سے جگایا نہ وعظوں سے چونکایا لیکن اس کوز دیہہ میں آپ کو نمازی بنا دیا لیکن آپ نے اس برقی رو کو اپنی گرفت میں نہ لیا وہ آپ کو جھکا کر اور خود جھک کر آپ کی گرفت سے باہر ہو گئی۔ اب آپ ہیں اور شاہجہانپور کی اذانیں

اور آپ کا نرم و گرم بستر ہے اور آپ کی غفلتوں کی نرالی شانیں۔ ایسی ہی صدہا برقی لہریں ہمارے اقلیم جسم و جان پر چمک کر گزر جاتی ہیں اور ہم بے خبر رہ جاتے ہیں ویسی ہی ایک رو آپ کے منقولہ بالا جملہ میں چھپی ہوئی تھی جو آپ نے الفرقان کے بارے میں ادا کیا لیکن اس لمحہ کے ساتھ وہ جملہ بھی گیا اور اپنے ساتھ آپ کے احساس کی دنیا کو بھی لے گیا آئیے ہم اور آپ اس جملہ کو کرید کر اس سے وہ احساس کی برقی رو پھر پیدا کریں۔ آپ نے اس زمانہ کے ادبی سیاسی علمی اور طرح طرح کے رسالے دیکھے ہوں گے وہ کون سی چیز ہے جو "الفرقان" کو ان سے بہت ممتاز کرتی ہے یقیناً اس میں تصاویر بھی نہیں۔ فلم کے اشتہارات بھی نہیں افسانے اور ڈرامے بھی نہیں جاذب نظر بلکہ جاذب ہوس جنسی میلانات کے البم بھی نہیں۔ پھر اس کے اندر ہے کیا؟ وہی احساس کی برقی رو۔ اس تار کو جو چھوئے گا اس سے چپک کر رہ جائے گا۔ آپ نے اس صفحہ ۳ و ۴ پر وہ فقرے بھی دیکھے ہوں گے جو کوئی ایڈیٹر اور مدیر نہیں لکھ سکتا مثلاً صفحہ پر نمبر ۲ پڑھیے جو اس فقرے پر ختم ہوتا ہے کہ "انشاء اللہ ایسے حضرات کو الفرقان دفتر کی جانب سے کسی نہ کسی طرح جاری کر دیا جائے گا" بھلا یہ بھی سوچیے کوئی مدیر اپنے خریداروں سے یہ کہے گا جو آپ کو صفحہ پر درج ملتا ہے کہ "خریداروں میں جتنے اضافہ کی ضرورت تھی وہ تعداد اب قریب قریب پوری ہو چکی ہے" مدیر کی اس قناعت کا سبب قناعت نہیں ہے، بلکہ طمع ہے ہاں طمع مال کی نہیں بلکہ اس چیز کی طمع جو واقعی طمع کے لائق ہے اور اس کو صفحہ کے ان الفاظ نے کھول دیا کہ "اب دوسرا کام جو درحقیقت اصلی کام ہے وہ یہ ہے کہ الفرقان کے پیغام اور اس کی دعوت کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہونچانے کی کوشش کی جائے" دیکھا آپ نے طمع کا حال۔ یہ ہے اصل طمع۔ یہ طمع جتنی زیادہ ہو اتنی ہی پسندیدہ ہے۔

ہمارا آپ کا تو یہ حال ہے کہ نام کے پہلے سید لکھے بغیر اور آخر میں صدیقی فاروقی عثمانی لکھے بغیر جی نہیں مانتا۔ حالانکہ جن بزرگوں کی طرف ہم اپنے کو ان الفاظ کے اضافہ سے منسوب کرتے ہیں ان بزرگوں کو کس چیز نے بزرگ بنایا تھا وہ یہی جذبۂ طمع تھا ان کے شب و روز اسی لالچ میں بسر ہوتے تھے جس کا ایک حصہ آپ کو مدیر الفرقان کے مذکورہ الفاظ میں نظر آتا ہے۔ حالانکہ ایک اعتبار سے اپنے کو سید اور صدیقی فاروقی عثمانی وغیرہ لکھنے کا جذبہ بھی بسا غنیمت ہے۔ ہماری آپ کی غفلتوں کے ہاتھوں ایک وقت وہ بھی آسکتا ہے کہ سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی بلکہ اپنے کو مسلمان ظاہر کرنے میں بھی ہچکچاہٹ ہو۔ کیوں؟ بسبب مرعوبیت! وہ مرعوبیت کبھی مصلحت لاتی ہے کبھی ضرورت پیدا کرتی ہے کبھی دقت

اس کو برانگیختہ کرتی ہے۔ کبھی اس کا کوئی اور سبب ہوتا ہے اور وہ کوئی انوکھی چیز نہیں بلکہ آج بھی بڑی افراط کے ساتھ وہ چیز ہمارے آپ کے درمیان موجود ہے۔ خود پوچھئے اور خود جواب دیجئے کہ ہم آپ پورے طور پر زندگی کے ہر شعبے میں پابند شریعت کیوں نہیں۔ آخر کیوں ہچکچاہٹ ہے ہماری باطنی حالت، ظاہری حالت، لباس، وضع، صورت، نشست، برخاست، رہن سہن، عقائد عبادات۔ معاملات۔ معاشرت۔ اخلاق غرضکہ زندگی کے جتنے پہلو ہیں اُن کا نسب نامہ کہاں ختم ہوتا ہے مورث اعلیٰ کفر کا خاندان ہے یا اسلام وایمان کا؟ پھر آپ اور ہم تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اور اتنا بہرحال جانتے ہیں کہ ہم میں کمی ہے اور نہ ہونی چاہیئے آج اکثریت کیسوں کی ہے؟ ایسوں کی جو یہ جانتے ہیں؟ یا ان کی جو اس سے بالکل خالی الذہن ہیں۔ تو ہماری آپ کی ذمہ داری کیا ٹھہرتی ہے اور ہم آپ اس کو کہاں تک ادا کر رہے ہیں یہی تھوڑا سا احساس ذمہ داری ہے جو مدیر الفرقان سے یہ لکھواتا ہے کہ اصل کام الفرقان کی خریداری نہیں بلکہ خریداری کا مقصد پورا کرنا ہے یعنی الفرقان کی دعوت کو قلوب کے گوشوں تک پہونچا دینا ہے۔ کیا کل فردائے قیامت میں ہم سب سے یہ سوال نہ ہوگا کہ دین کو جس وقت نصرت وحمایت کی سخت ضرورت تھی تم نے کیسا نصرت کی تھی۔ تم تو خود ہی ڈھیلے تھے دوسروں کو کیا ابھارتے۔ جس طرح بجلی چمک کر سب کو روشن کر جاتی ہے اور غائب ہو کر اندھیرا بکھیر جاتی ہے یوں ہی احساس صلاح واحساس اصلاح پیدا ہو کر حقیقت کو منکشف کر جاتا ہے اور روح کو گرما جاتا ہے لیکن یہ احساس رخصت ہو کر گمراہی کی ظلمت اور غفلت کی تاریکی میں ہم کو پھر چھوڑ جاتا ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو یہ سوچکر زندگی محسوس کرتے ہوں گے کہ جس کام کے لیئے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ رسول بھیجے ہم اس کو اٹھالیں اور کتنے ہیں جو یہ کہنے لگتے ہوں گے کہ اتنی فرصت کہاں ہے کہ الفرقان کے مضامین اہل وعیال دوست واحباب اور عام مسلمانوں کو چوپالوں اور دالانوں میں جا کر سنائیں۔ اتنی بھی مہلت کس کو ہے کہ الفرقان کے پرچون پر موٹا کاغذ لگائیں اور ہمیشہ ان کو گردش میں رکھیں کسی نے تو شراب کے لیئے یہ مصرعہ کہا ہے کہ۔ ع

دَور میں ساغر رہے گردش میں پیمانہ رہے

حالانکہ یہ دینی کتابوں اور الفرقان جیسے رسالوں کے لیئے ہی چسپاں ہے جن حضرات بدر

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

زندگی کے نقشہ میں مسلمانوں کی جگہ

از جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کے نقشہ پر نظر ڈالیے گا تو آپ کو بہت سے غیر آباد علاقے، بڑے بڑے میدان لمبے چوڑے ریگستان دکھائی دیں گے اور زمین کا بہت بڑا رقبہ ناقابل کاشت نظر آئے گا لیکن زندگی کے نقشہ پر نظر ڈالیے گا تو آپ کو کوئی ایسی خالی جگہ نظر نہ آئے گی جس کو انسان نے گھیر نہ رکھا ہو، ساری زندگی انسانی مشغلوں اور تمدن کے مختلف شعبوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور چپہ چپہ جگہ بھی خالی نہ تھی، بازار کی جگہ بازار تھے اور کھیتوں اور باغات کی جگہ کھیت اور باغات، تاجر اور کاشتکار سب اپنے کام میں مشغول تھے نہ اسکو وکان سے چھٹی تھی نہ اس کو ہل سے فرصت، دنیا میں سیکڑوں قومیں تھیں، اور بیسوں سلطنتیں، سلطنتوں کو اپنی بچی جھوٹی ضرورتوں کے لئے ملک ناکافی معلوم ہوتے تھے، اور قوموں کو اپنی ترقی کے لئے دنیا تنگ نظر آتی تھی، اس کا نتیجہ تھا کہ روم و ایران کی حدیں کئی بار ٹوٹیں اور بنیں اور دونوں شہنشاہیوں کا رقبہ کئی بار سمٹا اور کئی بار پھیلا، انسانی نسل برابر بڑھتی اور پھیلتی جارہی تھی اور انسانیت کے جسم میں کئی بار اتنا خون جمع ہوگیا کہ قدرت کے جراح نے اس کی فصد کھولی اور فاسد خون نکالا، تمدن کا ہر شعبہ اتنا لبریز تھا کہ کسی نئی بھرتی کی بالکل ضرورت نہ تھی، زندگی کا پیالہ ایسا لبالب اور چھلکنے کے لئے تیار تھا کہ اس میں ایک قطرہ پانی کی گنجائش نہ تھی۔

لوگ زندگی کے اس نقشہ پر نظر ڈالتے تھے اور ان کو یہ نقشہ ہر طرح مکمل نظر آتا تھا، یہاں قوموں کی جگہ قومیں تھیں، اور سلطنتوں کی جگہ سلطنتیں، بادشاہوں کی جگہ بادشاہ تھے اور رعیت کی جگہ رعیت منتظم کی جگہ منتظم تھے اور لشکر کی جگہ لشکر، دسترخوانوں پر الوان نعمت چنے ہوئے تھے اور خزانے سونے چاندی سے بھرے ہوئے تھے۔ زندگی کے تماشائی نے ساری دنیا گھوم پھر کر دیکھ لی، اور آکر کہدیا کہ زندگی ہر طرح مکمل ہے، اور دنیا ہر طرح آراستہ، نہ کچھ کم ہے نہ کچھ زائد، دنیا کا کام خوب چل رہا ہے کہ آدمیوں کا پیٹ بھر رہا ہے اور

زندگی کے دن پورے ہو رہے ہیں، کسی کو نہ کسی بات کی شکایت ہے نہ کسی کا کچھ اور مطالبہ اس نے امیر و غریب شاہ و گدا، عالم و درویش سب کو مطمئن پایا، میں انسانوں کی اس پوری بستی کو میٹھی نیند سوتا چھوڑ کر آیا ہوں۔

لیکن حقیقت میں نگاہ نے کہا کہ یہ زندگی کا بہت سرسری جائزہ ہے اور بڑی عجلت کا فیصلہ، جہاں تک انسانی زندگی کے حیوانی پہلو کا تعلق ہے اس میں بلاشبہ کسی خانہ پری کی ضرورت نہیں قوموں کی فہرست میں کسی نئی قوم کی اور سلطنتوں کی فہرست میں کسی نئی سلطنت کی واقعی گنجائش نہیں، بلکہ کئی قوموں کو چھانٹنے اور کئی سلطنتوں کو حذف کرنے کی ضرورت ہے، کہ جسم انسانیت کے یہ اعضا سڑ چکے ان کا جسم سے جدا کر دینا ہی انسانیت کی مصلحت ہے، اگر کوئی نئی قوم اس بات کی امیدوار ہے کہ اس کو قوموں کی صف میں جگہ دی جائے تو یہ واقعہ ہے کہ اس صف میں کوئی جگہ نہیں، یہاں تو کئی کئی ہزار برس کی قوموں کو زندگی کے صف سے نکالنے پر غور کیا جا رہا ہے، اگر کسی نئی سلطنت کی بنیاد پڑنے والی ہے تو پہلے ہی یہاں سلطنتیں کیا کم ہیں ان سلطنتوں نے انسانوں کو کیا فائدہ پہونچایا؟ اگر عیش و راحت اور عزت و طاقت کے نظام کے لئے کوئی نئی محلسرا تعمیر ہو رہی ہو تو اللہ کی اس وسیع سرزمین پر کسرے کے سفید محل اور قیصر کے زرد محل کی بھی گنجائش نہیں رہی، اور قدرت کا ہاتھ ان کی بھی جگہ بہت سی جھونپڑیوں کے لئے خالی کرنے والا ہے، اگر کسی خاندان کو عروج کا شوق ہوا ہے اگر کسی نسل و قوم نے کسی دوسری قوم کو ہضم کرنے کا ارادہ کیا ہے، اگر کسی بادشاہ یا فاتح کے سر میں دنیا کی فتح کا سودا سمایا ہے تو دنیا میں ایسے تماشے بہت دیکھے جا چکے اب کسی نئے تماشے اور نئے سوانگ کی ضرورت نہیں، بے شک یہ دنیا حیوانی ضروریات و خواہشات سے بھری ہوئی ہے۔ زندگی کے ظاہری نقشہ میں کوئی خانہ خالی نہیں۔ اس لئے ہر نئی قوم ہر نئی سلطنت یہاں فاضل اور ہر نئی خانہ پری اس وقت فضول ہے۔

لیکن اگر زندگی محض کھانے پینے کا نام نہیں، اگر انسان ایک ترقی یافتہ جانور کو نہیں کہتے جو اپنی حیوانی ضروریات کو انسانی سلیقہ سے پورا کرتا ہے اگر انسان کے جسم میں پیٹ کے سوا کچھ اور بھی ہے اگر روح بھی کوئی چیز ہے اور وہ جسم کی طرح سڑ گل کر ختم ہو جانے والی نہیں، اگر دل بھی کوئی انسانی شعبہ ہے اور اس کی بھی زندگی اور موت ہے، اگر دنیا صرف تجارت کی منڈی، غلہ کے کھلیان اور جنگ کے میدان کا نام نہیں، اگر انسان صرف گھوڑے اور بیل کی طرح محنت کرنے یا محلوں کے اندر پالتو جانور کی طرح اپنا رات کمانے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے، اگر اس کارخانہ کا کوئی بنانے اور چلانے والا ہے اور اس کا پہچاننا کچھ

ضروری ہے، اگر اس سفر کی کوئی منزل ہے، اگر اس زندگی کا کوئی مقصد ہے تو یہ زندگی بالکل ناقص اور ادھوری ہے، اور چودھویں صدی مسیحی کی یہ آباد اور گلزار دنیا افریقہ کے صحرا سے زیادہ ویران اور قبرستان سے زیادہ سنسان ہے، یہاں قومیں ہیں، لیکن بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ جو جنگل میں دن بھر چرنے چگنے کے بعد نہیں جانتا کہ شام کو کہاں جانا ہے، یہاں بادشاہ اور حکمراں ہیں، جو چرواہے کے روپ میں بھیڑیے، یہاں دولت و قوت کے بڑے بڑے ذخیرے ہیں لیکن بے کار یہاں صلاحیتیں ہیں لیکن ضائع یہاں وسائل کی بہتات ہے لیکن مقاصد کا کال، یہاں سامان سفر کی فراوانی ہے لیکن منزل بے نشاں، یہاں علوم و معلومات کی کمی نہیں لیکن سب منتشر و بے ترتیب جن میں کوئی نظم اور مرکزیت نہیں۔

دفعۃً عرب کے ملک میں ایک نئی جماعت کا ظہور ہوتا ہے؟ اس جماعت کو قوموں کی گزشتہ تاریخ کی طرح کسی بادشاہ کی حوصلہ مندی یا کسی مورث کی ناموری نے پیدا نہیں کیا، نہ کسی نام و نسب یا قوم و وطن پر اس کی بنیاد پڑی تھی، اللہ تعالٰی نے بنی ہاشم کے گھرانہ کے ایک فرزند کو نبوت اور وحی سے سرفراز کیا اور انسانوں کی طرف مبعوث کیا یُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ أَنْ أَنْذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ

اس نے لوگوں کو بلا امتیاز قوم و وطن اس کی دعوت دی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کو اللہ کا پیغمبر تسلیم کریں، مرنے کے بعد کی زندگی اور حساب و کتاب پر یقین کریں اور اس دن کے لئے تیاری کریں جن لوگوں کے دل میں یہ بات اتر گئی انھوں نے اس کو اختیار کر لیا اور خود دوسروں کو اس کی دعوت دینے لگے، جن لوگوں کے دل نے اس کو قبول نہیں کیا، انھوں نے اس کی مخالفت شروع کی، اور اسی طرح ایک چھوٹی سی لیکن بڑی پرجوش اور صاحب یقین اور ثابت قدم جماعت بن گئی۔ اس جماعت میں اس وقت عرب کے گرد و پیش کی تمام قوموں کے افراد اور عرب کے اندر کے ہر طبقہ کے نمائندے تھے، رومیوں میں سے میں سے صہیب، حبشیوں میں سے بلال، ایرانیوں میں سے سلمان، مذاہب میں یہودیوں میں سے آئے ہوئے عبداللہ بن سلام و عیسائیوں میں سے آئے ہوئے عدی بن حاتم وغیرہ، آزاد اور مستقل لوگوں میں سے ابوبکر اور دوسرے صحابہ کرام، غلاموں میں سے زید بن حارثہ، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، دولتمندوں میں سے عثمان، مصعب بن عمیر، عبدالرحمن بن عوف، فقیروں اور ناداروں میں سے یاسر، عمار اور عبداللہ ابن ام مکتوم، غرض اس وقت کی زندگی کا جتنا پھیلاؤ تھا اور عرب کے ملک میں دوسری

قوموں اور نسلوں کے جو افراد تھے وہ اس جماعت میں شامل ہو کر اس حقیقت کا اعلان کر رہے تھے کہ اس جماعت کی بنیاد کسی نسل و وطن یا کسی مظلوم و مفلوک الحال طبقہ کے جذبۂ انتقام یا کسی خوش حال و آسودہ جماعت کی اقتدار پسندی پر نہیں ہے بلکہ ایسی چند حقیقتوں پر ہے جو اس زندگی کے تمام امتیازات سے بھی بالاتر ہیں۔

جب یہ جماعت وجود میں آئی تو اس کے معاصروں نے اس کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا اور ان کو شروع میں شبہ کرنے کا حق تھا! ایک کام کے کرنے والے اگر پہلے سے موجود ہوں اور کوئی دوسرا اس میدان میں نیا نیا آئے تو پہلے لوگ زبان سے یا صورت سوال بن کر پوچھتے ہیں کہ ہماری موجودگی میں اس میدان میں کسی نئے آدمی کی ضرورت کیا ہے؟ حضرت آدم کا پتلہ جب بن کر تیار ہوا تو فرشتوں نے بھی پوچھا تھا کہ نحن نسبح بحمدك ونقدس لك ہماری تسبیح و تقدیس میں کیا کمی اور کوتاہی ہے کہ اس کے لئے ایک نیا اہتمام کیا جا رہا ہے؟ ایک عرصہ تک مکہ کے لوگ جہاں اس دعوت کی ابتدا ہوئی تھی اس جستجو میں رہے کہ اس جماعت کا داعی دنیا کی دوسری حکومتوں اور جماعتوں کے بانیوں کی طرح ترقی کے کس میدان میں پیش قدمی چاہتا ہے اور یہ نئی جماعت کس میدان کو فتح کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ حوصلہ مندوں کے لئے ترقی و امتیاز کے تین ہی میدان تھے، حکومت کا میدان، دولت و امارت کا میدان اور عیش و عشرت کا میدان، انھوں نے اس کشمکش کو مختصر کرنے کے لئے اس نئی دعوت کے داعی کے سامنے تینوں میدانوں کی پیش کش کر دی، لیکن ان کے لئے یہ بالکل نیا تجربہ اور بالکل خلاف توقع بات تھی کہ اس نے ایک لمحہ میں تینوں کو ٹھکرا دیا اور ثابت کر دیا کہ اس کا راستہ ہی الگ ہے، وہ دنیا کی ان تین چیدہ صفوں میں سے کسی صف میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے لئے اور کسی کو اپنی اغراض و خواہشات کا غلام بنانے کے لیے نہیں آیا بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو جھوٹی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کرنے کے لئے آیا ہے وہ سب کی طرف اس اللہ کا پیغمبر اور رسول بن کر آیا ہے جس کی سلطنت میں زمین و آسمان داخل ہیں (یا ایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعا الذی له ملك السموات والارض)، وہ دنیا کی بیڑیوں میں کسی نئی زنجیر کا اضافہ کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ پرانی بیڑیوں اور زنجیروں کو بھی توڑنے کے لئے آیا ہے (ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم) وہ لوگوں کی فانی اور عارضی لذتوں اور محدود

دغیر فوائد میں حصہ دار بنانے کے لئے نہیں آیا؛ بلکہ تمام انسانوں کو غیر فانی اور غیر محدود زندگی کا طلبگار اور دنیا اور آخرت کی نعمتوں میں حصہ دار بنانے کے لئے آیا ہے سارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا السمٰوٰت والارض اعدت للمتقین (اللہ کے بندو اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو جس کی وسعت میں زمین و آسمان آجائیں جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے) اس سے کسی بادشاہ یا حاکم کو کیا خطرہ کہ وہ اپنے یا اپنے خاندان کے لئے کوئی حکومت قائم کر کے جانے والا نہیں اس سے کسی دولت مند و سرمایہ دار کو کیا اندیشہ کہ وہ تو کہتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ انما الحیوۃ الدنیا لہو ولعب وان الدار الاٰخرۃ لھی الحیوان (دنیا کی زندگی تو محض کھیل تماشہ ہے اور آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے) اور جس کی زندگی ایسی زاہدانہ تھی کہ دو دو مہینے اس کے گھر میں چولھا نہ جلتا اور جو دنیا سے اس شان سے گیا کہ گھر کا چراغ جلانے کے لئے اس دن تیل نہ تھا کسی پڑوسی سے قرض لیا گیا اور جو قیامت تک کے لئے اپنی اولاد اور خاندان کو سب سے بڑی آمدنی (زکوٰۃ وصدقات) سے قانوناً محروم کر گیا۔

جن لوگوں کو یہ شبہ تھا کہ ان کی زندگی کے میدانوں میں ایک نئی حریف جماعت اور ایک نئے رقیب کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کا شبہ بہت جلد زائل ہو گیا جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ان کے حصول کے سب راستے انھوں نے اپنے اوپر خود بند کر لئے ہیں بلکہ ان کے پچھلے سرمایے بھی خطرہ میں ہیں اور بہت سے ان سے محروم ہو چکے یہ وہی صادق و امین کہلانے والا پوری وطن کا محبوب و معتمد ہاشمی سردار جس پر مکہ کے سارے قبائل اور ان کے سرداروں کا اتفاق تھا اپنی مرکزیت اور ہر دلعزیزی کو قربان کر چکا، اب طعن و تشنیع ہے اتہامات و الزامات ہیں اور اینٹ پتھر، حکومت و دولت اور عیش و عشرت کا مقصد و خلاصہ کیا ہے؟ عزت و راحت اور پر سکون زندگی! یہ عزت و راحت اور پر سکون زندگی تو اس کو اول دن سے حاصل تھی اور اب بھی ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے لیکن اس نے یہ سب جان بوجھ کر کھویا اور دعوت کی کانٹوں بھری راہ اختیار کی حکومت و سرداری عزت و راحت کا راستہ بالکل سیدھا اور صاف تھا لیکن وہ اس راستہ کو دیکھ کر اور اس کا لذت آشنا ہو کر اس سے علیحدہ ہوا، اور اب بھی وہ اس راستہ کا مطلوب ہے لیکن اس کو اس کا طالب بننا اور مڑ کر بھی اس کی طرف دیکھنا ایک لمحہ کے لئے گوارا نہیں اس کے ساتھیوں میں سیکڑوں ایسے آدمی ہیں جن کو پہلے دن سے ان میدانوں کی وہ ترقیاں حاصل تھیں جو اس راستہ کے تیز رفتار مسافروں کو برسوں کی کوششوں سے حاصل ہوتی ہیں، مگر انھوں نے ان کو ٹھوکر مار کر وہ راستہ اختیار کیا۔ جس میں بظاہر ان

کامیابیوں کی کوئی توقع نہیں، ابو بکرؓ کی کامیاب تجارت تھی، مکہ کی سوسائٹی میں کسی انسان کو جو وقار
اور اعتبار حاصل ہو سکتا ہے وہ ابو قحافہ کے نیک سیرت اور عالی دماغ فرزند کو حاصل تھا لیکن اس نے
تجارت اور دکان کا کیا ذکر اپنی زندگی کو بھی خطرہ میں ڈال رکھا ہے جس دولت سے وہ مکہ کے مختلف بازاروں
میں نئی نئی دکانیں کھول سکتا تھا اس سے وہ ستم رسیدہ غلاموں کو خرید کر اللہ کے راستہ میں آزاد کرتا ہے کہ
آزادی سے اللہ کی بندگی کر سکیں، جو چہرہ مکہ میں بڑا مکرم و محترم تھا جس پر محبت کی نگاہیں پڑتی تھیں اور سلاموں
کے پھول برستے تھے، خدا کی شان ہے کہ عتبہ کی جوتیوں سے وہ پہچانا نہ جائے، وہ عثمان جو ایک آسودہ
حال اور صاحب حیثیت خاندان کے فرزند تھے نہایت اطمینان کے ساتھ پوری زندگی بسر کر سکتے تھے اب
ان کے چچا ان کو رسی میں باندھ کر مار رہے ہیں۔ یہ مصعب بن عمیر اپنی ماں کے چہیتے، اور باپ کی دولت کے
وارث تھے جن کے بدن پر دو دو سو کی پوشاک ہوتی تھی اور ان کی سواری کے ساتھ آگے پیچھے غلام چلتے
تھے اب ایک کمل گلے میں ڈالے اور ببول کے کانٹوں سے اٹکائے گلی گلی پھرتے ہیں، یہ صہیب رومی ساری
عمر کریں کماتے رہے اور جب ساری عمر کا سرمایہ اور اندوختہ لے کر مدینہ جاتے ہیں تو مکہ کے لوگ کہتے ہیں
کہ تم جا سکتے ہو مگر مکہ کا روپیہ مکہ کے باہر نہیں جا سکتا، دولت کا طالب یہیں سے راستہ بدل دیتا اور مدینہ
کے بجائے وہیں واپس آجاتا جہاں اس کا مطلوب اس کو مل سکتا تھا، مگر صہیب نے اپنے انتخاب
سے ثابت کر دیا کہ وہ دنیا میں دولت کے طالب نہ تھے، ان سب لوگوں نے جن میں سے صرف چند کے
نام ہم نے لئے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ انھوں نے دولت و عزت اور سکون و راحت کے صاف سیدھے
اور برسوں کے آزمائے ہوئے راستہ کو قصداً چھوڑا اور مصائب و تکلیف کو خود دعوت دی اور ثابت کر دیا
کہ حکومت و طاقت، مال و دولت اور عیش و راحت میں سے کوئی چیز ان کی زندگی اور جدوجہد کا اصل مقصود
نہیں ورنہ وہ ان کو ان کے بہترین مواقع پر نہ چھوڑتے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر یہ ثابت کیا کہ یہ امت ایک ایسے کام کے لئے مبعوث
ہوئی ہے جو دنیا کی کوئی دوسری قوم قطعاً انجام نہیں دے رہی ہے اور جس سے دنیا کی ساری امتیں جو
اپنے اپنے وقت پر اس کی داعی تھیں رفتہ رفتہ دست کش ہو چکی ہیں اور زندگی کے دوسرے راستے اختیار
کر چکی ہیں، یہ کام ہے اللہ کی بندگی اور اس کی دوسروں کو دعوت دینا آپ نے اس امت کے افراد کی
تمام صلاحیتوں اور ان کی زندگی کے ہر قسم کے مشاغل کے ساتھ اس کی زندگی کا اصل مقصد اور اصل دعوت

معین اور واضح کر دیا، اور مسلمانوں کو صاف طور پر بتا دیا کہ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنہون عن المنکر و تؤمنون باللہ آپ نے واضح کر دیا کہ یہ امت کوئی خود رو یا خود ساختہ انسانی جماعت نہیں بلکہ ایک مامور و مبعوث امت ہے جو اسی کام پر مقرر کی گئی ہے اور وہ اپنے فوائد مصالح کے لئے جیتی مرتی نہیں بلکہ انسانیت کی مصلحت اور دنیا کی صحیح زندگی اس سے وابستہ ہے آپ نے صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس امت سے وابستہ اور اُسکے دم سے قائم نہیں، جو اُسکے بغیر دنیا میں باقی نہ رہ سکے، دنیا کا تمدن اور انسانوں کی شہری زندگی، نسل آدم کی وسعت و کثرت حکومتوں کا نظم و نسق کاروبار کی ترقی ضروریات کی فراہمی کوئی چیز بھی ان مسلمانوں سے اس طرح متعلق نہیں کہ ان کے نہ ہونے سے وہ خطرے میں پڑ جائے دنیا کا کارخانہ اپنی طبعی رفتار اور زندگی کی گاڑی اپنی قدرتی چال میں مسلمانوں کی بالکل محتاج نہیں سیکڑوں برس کا تجربہ ہے کہ دنیا کا کام ان کے بغیر چلتا رہا لیکن ہاں ایک شعبہ ہے جو اس جماعت سے وابستہ ہے اور وہ خدائے واحد کی بندگی اور عبادت ہے، بدر کے میدان میں آپ نے اس چھوٹی سی جماعت کے لئے جس پر حقیقتاً اس دعوت و زندگی کے مستقبل کا انحصار تھا کہ وہی تنہا روئے زمین پر اس کی داعی اور اس کے لئے کوشاں تھی یہ کہہ کر سفارش کی کہ اے اللہ اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کر دے گا تو دنیا کا تو کوئی کام نہیں بگڑے گا مگر پھر تیری بندگی کا سلسلہ ختم ہے اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لن تعبد ان لفظوں میں آپ نے غیر مشتبہ طور پر اس امت کا دنیا میں اصل کام اور اس کی اصل مہم کا اعلان کیا اور انگلی رکھ کر زندگی کی نقشہ میں اس کا مقام معین کر دیا جو اس کی آمد سے پہلے بھی خالی تھا اور جو اس کے بغیر قیامت تک خالی رہتا بدر کی خلاف قیاس فتح اور غیبی امداد نے اس کی صداقت پر قیامت تک کیلئے مہر لگا دی بدر کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا جو دن گزرا اور اب بھی جو دن گزر رہا ہے وہ اسی مقصد کے حساب میں ہے اگر مسلمان اس مقصد اور اس مہم سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور اس کام سے جس کے لئے انکی زندگی منظور کی گئی تھی رشتہ قطع کر لیں تو گویا وہ اپنے کو زندگی کے استحقاق سے محروم کر رہے ہیں اور اس شاخ کو کاٹ رہے ہیں جس پر انکا آشیانہ ہے اور گویا وہ اس سفارش کو واپس لے رہے ہیں جس پر انکے دنیا میں ہزار مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود باقی رہنے اور فتحمند ہونے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

جب مسلمان اس مقصد زندگی کی اشاعت کے لئے اس وقت کے سب سے بڑے حریفوں رومی و ایرانی سلطنتوں کی طرف متوجہ ہوئے تو قدرتی طور پر ان کے متعلق پھر وہ سوال سامنے آیا کہ تم کیوں آئے؟ ایران

وشام کے بادشاہوں اور وزیروں کو یہ پوچھنے کا حق تھا کہ تمھاری آمد کا مقصد کیا ہے؟ اگر حکومت! تو سیکڑوں برس سے جو کیانی اور بازنطینی خاندان اپنے ملکوں میں حکومت کر رہے ہیں ان کے مقابلہ میں تمھاری ترجیح کی وجہ کیا ہے قومی نسلی تاریخی وجغرافی قانونی واخلاقی اعتبار سے ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلہ میں دور افتادہ غیر تعلیم یافتہ غیر مہذب عربوں کو اپنا ملک چھوڑ کر ایران وشام کے سرسبز وشاداب علاقوں میں حکومت کرنے کا اور وہاں کے ذخائر دولت سے متمتع ہونے کا ازروئے عقل وانصاف کیا حق حاصل ہے! یہ وہ سوال ہے جو ہر مفتوح قوم ہر غیر ملکی فاتح سے کر سکتی ہے اور جس کا سکندر وسکندر سے لیکر آخری بے مقصد فاتحین تک کوئی جواب نہیں دے سکتا! لیکن عرب سفیروں نے صاف کہہ دیا کہ ہم تمھارا ملک اپنی قوم کے لئے فتح کرنے نہیں آئے ہمارا مقصد یہ بالکل نہیں ہے کہ ملکی ذخائر دولت اور وسائل زندگی سے تمھیں محروم کر کے ہم فائدہ اٹھانے لگیں بجائے اس کے کہ تم داد عیش دو اور غریبوں اور بے زبان رعیت کی محنت سے زندگی کا لطف تم اٹھاؤ ہم اٹھائیں، اگر سوال لطف وعیش اور تمتع کا ہے تو یقیناً تمھیں ہمارے مقابلے میں ترجیح حاصل ہے اور ہمارے لئے کوئی وجہ جواز نہیں لیکن ہم بالکل الگ مقصد سے آئے ہیں ہم کو اللہ نے اس کام پر مقرر کیا ہے کہ ہم اسکے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اسکی بندگی میں داخل کریں دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت میں پہونچائیں مذاہب کی الجھنوں سے نجات دے کر اسلام کے عدل وانصاف سے متمتع ہونے کا موقع دیں اگر تم کو ہمارے اس دعوے کی صداقت اور ہماری دیانت میں شبہہ ہو تو تم خدا کی بندگی جس کی ہم تمھیں دعوت دیتے ہیں قبول کر کے دیکھو اگر اس کے بعد بھی ہم تمھارے ملک اور تمھارے خزانوں اور وسائل پر قبضہ کرنے سے باز نہ آئیں تو سمجھ لو کہ ہم دنیا کے طالب ہیں، لیکن اگر ہم دنیا کے طالب نہیں ہیں اور صرف خدا کی بندگی چاہتے ہیں تو تمھارا ملک تم کو حوالہ کر کے اپنے صحرا کو واپس جائیں گے اور وہاں کی گزران اور تنگی پر صبر کریں گے، ایران وروم کے ذمہ داروں کو ان سفیروں کو اس بیان کی صداقت میں نظر نہیں آ رہا اور نہ وہ اس کا ضرور امتحان کرتے

ایرانی ورومی سرداروں نے عربوں کی خستہ حالی اور فاقہ کشی کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہم کو تمھاری حالت پر ترس آتا ہے ہم کو معلوم ہے کہ تمھاری اپنے صحرائی ملک میں بڑی مشکل سے گزران ہوتی ہے ہم تمھارے کھانے پینے کے لئے کچھ مقرر کر دیں اور تم کو اچھی طرح کھلا پلا کر رخصت کریں اور تم ان ملکوں کا خیال چھوڑ دو مسلمان سفیر نے اپنی تقریر میں اسی کا جواب دیا تھا کہ ہم تم کو دنیا کی تنگی سے نکال کر　　وسعت میں

داخل کرنا چاہتے ہیں، ہماری خستہ حالی کا احساس ہم کو ہمارے ملک سے نکال کر نہیں لایا بلکہ تمہاری خستہ حالی اور تمہاری بد نصیب زندگی کا افسوس یہاں کھینچ کر لایا ہے ہم تمہاری اس کال کوٹھری میں جس کو تم اپنی تنگ نظری اور بے خبری سے سلطنت اور اس کے قیدی کو شہنشاہ و قیصر کہتے ہو ہم حصہ بٹانے نہیں آئے ہم تم کو خود اس جیل خانے سے نکال کر اس کی وسیع دنیا اور اس کی غیر محدود فضاؤں میں پہونچانا چاہتے ہیں جس کو لے دے کر یہ دنیا ملے، جس کے حوصلے اور امنگیں اس کی تنگ چار دیواری سے باہر نہ جائیں جو اپنے نفس اور پیٹ کے دائرہ میں چکر لگائے۔ وجنۃ عرضہا السموات والارض کی وسعت سے بے خبر وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان کی حیات جاودان سے محروم ہو۔ جس نے اپنے گلے میں غلامی کے طوق اور اپنے پاؤں میں خود بیڑیاں ڈالی ہوں، اس سے بڑھ کر محبوس و مجبور کون ہو سکتا ہے ہم تم کو اس حبس اور اس دار العذاب سے نجات دینے آئے ہیں

مسلمانوں نے اپنی آمد کا جو کچھ مقصد بتلایا یقیناً رومیوں و ایرانیوں کو اس کا دعویٰ نہ تھا اور کوئی دوسری جماعت اس مقصد کو پورا نہیں کر رہی تھی اس لئے وہ اس معقول دلیل کا جواب کسی معقول دلیل سے نہیں دے سکے صاف بات تھی کہ زندگی کے اس بھرے ہوئے نقشہ میں سیکڑوں برس سے یہ خانہ خالی تھا مسلمانوں نے اپنی جگہ تلاش کر لی اور اپنے وجود کی ضرورت ثابت کر دی اور دنیا نے اسکو تسلیم کر لیا، یقیناً روم و ایران میں سب کچھ تھا حکومت تھی۔ دولت تھی، تجارت تھی صنعت تھی، پیشے تھے پیشہ ور تھے علم تھے معلم تھے درسگاہیں تھیں حکومت کا سارا نظم و نسق اور تمدن کے سب شعبے تھے لیکن وہ خدائے واحد کی بندگی نہ تھی نہ اسکی دعوت تھی نہ اس کا قانون تھا نہ دوسری زندگی کا احساس تھا نہ اسکے لئے تیاری تھی گویا انسان کا پیدا کیا ہوا تو سب کچھ تھا مگر نبوت کی روشنی نہ تھی مسلمان یہ روشنی لے کر آئے اور انہوں نے ایسی چیز پیش کی جس سے دنیا کا دامن خالی تھا اُنکی جگہ زندگی کے اس نقشہ میں محفوظ تھی، دنیا کی کوئی دوسری قوم کوئی نظام زندگی، کوئی فلسفہ کوئی دعوت اس خانہ میں ان کا شریک نہیں جبتک انسانیت باقی ہے ان کے اس منصب کی ضرورت باقی ہے اور جبتک ان کی زندگی کا یہ رشتہ اس مقصد دعوت سے قائم ہے ان کی ضرورت مسلم اور دنیا کی ہر ضرورت پر مقدم ہے آج بھی دنیا کا نقشہ چھٹی صدی مسیحی کی دنیا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں آج بھی زندگی کا نقشہ دیکھنے میں بھرا بھرا سا نظر آتا ہے انسانی ضروریات میں سے ہر ضرورت کی خانہ پری نظر آتی ہے حکومتوں کی جگہ قومیں ہیں سلطنتوں کی جگہ سلطنتیں، منتظم کی جگہ منتظم ہیں اور فوجوں کی جگہ

توجیسے بازار کی جگہ بازار میں باغات اور کھیتوں کی جگہ باغات اور کھیت درسگاہیں بھی ہیں اور کتب خانے بھی علم بھی ہے اور تہذیب بھی، لیکن صورت کچھ زیادہ مختلف نہیں دولت وقوت کی بڑے بڑے ذخیرے ہیں لیکن صنائع و وسائل کی پہلے کے مقابلہ میں ہزاروں درجہ زیادہ ترقی و کثرت لیکن صحیح مقاصد کا پہلے سے کہیں زیادہ فقدان سامان سفر کا انبار ہے لیکن منزل پہلے کی طرح نامعلوم اور بے نشان، علوم و معلومات کی پہلے سے ہزاروں درجہ زیادہ بہتات ہے لیکن نظم و ترتیب پہلے کی طرح مقصود زندگی کی ڈور پہلے سے زیادہ اُلجھی ہوئی اور سراب تک گم دنیا کی کوئی قوم اس عالمگیر تاریکی میں کسی روشنی اور رہنمائی کی مدعی نہیں اور خواہشات وقیاسات کے علاوہ کسی علم و بصیرت اور کسی یقین کا دعویٰ نہیں رکھتی، نشر و اشاعت کے وسائل کی کثرت کے باوجود دنیا کے کسی گوشہ سے مادی مسائل کے علاوہ کسی بالاتر حقیقت اور کسی بے غرض دعوت کی صدا سننے میں نہیں آتی ہر جگہ ملک کے مصلح ہیں، اور قوم کی ترقی اپنی عظمت و تعریف میں مبالغہ ہے یا دوسری قوموں کی تنقید اور شکایت انسانیت کی آس اب بھی اس جماعت سے لگی ہے جس کا رشتہ کلیتاً اس مقصد و دعوت سے کٹنے نہیں پایا ہے۔ اس کا وجود اب بھی ثابت کرتا ہے کہ جس شرط پر بدر کے میدان میں اس کی زندگی کا فیصلہ کیا گیا تھا وہ کسی درجہ میں ابھی اس قوم میں باقی ہے اس کی اذانیں وقتاً فوقتاً لوگوں کو سوتے سوتے چونکا دیتی ہیں اور احساس دلاتی ہیں کہ ابھی اس حقیقت کا وجود دنیا میں موجود ہے۔

اگر یہ مقصد دعوت مسلمانوں میں زندہ ہے اور خدائے واحد کی بندگی اور اس کی طرف دعوت ان کے دم سے کسی نہ کسی طرح قائم ہے، تو ان کا وجود دنیا میں ضروری ہے اور فیصلہ خداوندی ہے، نہ زمانہ کا اختلاف اس پر اثرانداز ہے نہ ملکی و مقامی حالات کا تغیر نہ سیاسی انقلابات اس کو نہ کسی قوم کا فیصلہ بدل سکتا ہے نہ کسی جماعت کی خواہش، اس پر نہ ملکی رقابتیں اثرانداز ہیں نہ سیاسی اختلافات و قومی تعصبات وہ ایک ابدی حقیقت ہے اور ابدی حقائق بدلنے والے حالات و واقعات اور لوگوں کی خواہشوں سے نہیں بدلا کرتے ؎

مٹ نہیں سکتا مردِ مسلمان کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

(بقیہ صفحہ ۸) احساس بیدار ہو گئی ہے اور جو احساس کی قیمت سمجھتے ہیں اور تبلیغی دوا دوش جلت بھرت گردش دورہ کے اجر و ثواب کا اندازہ کر چکے ہیں وہ تو یہ کہتے ہیں ؎

جستجو میں جو نہ دوڑیں تری ٹوٹیں پاؤں
سر وہ کٹ جائے کہ جس میں نہ ہو سودا تیرا

کتنے اللہ کے بندے ذی استطاعت ایسے ہیں جو دین کا کام کرنے والوں کی معاشی کفالت کر کے اُن کو دین کی خدمت ہی کے لیئے فارغ کر دیتے ہیں اور خود بھی دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ اور ہم جیسے بھی بہت ہیں جو الفرقان دوسروں تک پہنچانے کا تصور کر کے بھی تھک جاتے ہیں کہ یہ تو بڑی دردسری ہے۔ حالانکہ یہ دردسری۔ سر کے لیئے اعزاز و بلندی ہے۔ بشرطیکہ ایمان کی حلاوت ہم کو نصیب ہو جائے ابھی تو ہم اسی فکر میں ہیں کہ ہمارا پرچہ دو چار ہاتھوں میں جا کر بوسیدہ ہو کر ضائع ہو جائے گا۔ حالانکہ اُن قدموں پر ہماری اولادیں قربان۔ جو طائف میں گرد آلود ہوئے تھے پھر تھکے تھے پھر ٹوٹے پھوٹے تھے اور لہو لہان ہوئے تھے۔ اُن مقدس دانتوں پر ہمارے محبوبوں کی جبینیں بتیسی صدقے جو دامن احد میں شکست و ریخت سے دو چار ہوئے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجلد صاف شستہ الفرقان کے پرچے تو الماریوں ہی میں رکھے رہ جائیں گے لیکن اس طرح ہاتھوں ہاتھ پہونچنے کے سبب پھٹنے اور بوسیدہ ہونے والے پرچوں کے متعلق امید ہے کہ انشاء اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے جنت میں شرف کیے جائیں گے اور ان کو سونے چاندی کے اوراق میں منتقل کر دیا جائے گا اور رجب کاغذ کی یہ وقعت ہوگی تو جس بندے نے الفرقان کو دور بین لکھنے کا انتظام کیا اس کا رتبہ کیا ہو گا بس ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

میرے بھائی یہ بتاؤ کہ ربیع الآخر کے الفرقان کے مضامین جو نگاہ اولین، عبرت کی باتوں میں بنیادی عقائد، حیات طیبہ۔ اصحاب اور روضۂ اطہر کے زیر عنوان آپ نے پڑھے کیا آپ اپنی زبان سے کسی سے دو چار ملاقاتوں میں بھی اوسی مفید اور مؤثر انداز میں دہرا سکتے ہیں؟ نہیں یا بجز الفرقان دوسروں تک پہنچا دینا کتنی بڑی دولت کمانا ہوگا بالخصوص جب اس خیال سے ہم

جب کہ ایک سنت کے زندہ کرنے پر سو شہیدوں کے ثواب کا وعدہ ہے۔ خط تو ذرا طویل ہو گیا لیکن اب یہ بتائیے کہ آپ الفرقان مجھ سے لے لے کر خود ہی پڑھیں گے یا خود اپنے نام جاری کرا کے دوسرے لوگوں کو بھی دے دے کر پڑھوائیں گے۔ اور آخری سوال یہ ہے کہ میں آپ کو شریعت کی طرف لپکنے کی دعوت دوں یا آپ لوگوں کو شریعت کی طرف کھینچیں گے اور پیغمبرانہ سکون سے اپنا خزانہ بھریں گے۔ کتنی پسندیدہ آپ کی یہ عمر جوانی ہے کاش ان کاموں میں صرف ہو۔ کیسی اچھی آپکی صحت ہے کاش اس سے فائدہ اٹھائے جائیں۔ کیسے کھاتے پیتے آدمی آپ بنائے گئے ہیں کاش غفلت کی روٹیاں نہ توڑیں۔ آپ ہاکی اسٹک لیکر کھیل کے میدان میں کتنا تیز دوڑتے ہیں کاش اپنے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیغام لے کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت کے درمیان دوڑیں۔ اب بتائیے کیا رائے ہے نماز کی پابندی کے بارے میں۔ اللہ سے قریب کرنے والے نوافل اور اللہ کے ذکر کے سلسلے میں، اور دین کے درد، اس کی نصرت، اس کی اشاعت اور اس کی تبلیغ کی بابت؟ اللہ تعالیٰ ہم آپ سب کو حق پر ثابت قدم رکھے اور اس امتحانی دور میں حق کی نصرت و اشاعت کی توفیق دے۔ آمین۔

والسلام

ناچیز صوفی

ایمان و امان

از جناب مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی
استاذ دینیات و معاشیات دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج سارا عالم آماجگاہ فتنہ و فساد ہے، امن و امان عنقا، اضطراب اور قلب، سکونِ قلب کے لئے بیتاب ہے انسانی سفاکیوں پر انسانیت شرمسار اور آدمیت سر بزانو نظر آتی ہے۔ مشکلات و مصائب تکلیف و بے اطمینانی، بدامنی و خونریزی کا ایسا سلسلہ سارے عالم میں جاری ہے جس کو دیکھ کر زندہ مردے پر رشک کرتا ہے۔ کیا انسان اطمینان و امان کا خواہشمند نہیں رہا؟ کیا انسانی فطرت بدل گئی؟ اگر ایسا نہیں ہے اور واقعی انسان فطرتاً اطمینان کا خواہاں ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ بدامنی و بے اطمینانی کی بادِ سموم تو سارے عالم کو دن رات جھلسا رہی ہے۔ مگر زندگی کے اس باغ میں امن و امان کی نسیم کا کوئی جھونکا نہیں آتا۔ ہندوستان، پاکستان، فلسطین، چین، یونان، کسے کسے مثال میں پیش کیا جائے۔ دنیا کی وہ کون سی مبارک سرزمین ہے جس نے انسانی خون سے اپنی پیاس نہ بجھائی ہو۔ جہاں بظاہر فضا کچھ پرسکون معلوم ہوتی ہے وہاں بھی خوف و خونخواری کے مخلوط جذبات دلوں میں موجزن ہیں اور زندگی حقیقی امن و راحت سے محروم۔

وسیع اجتماعات کو چھوڑ کر نسبتاً چھوٹے اجتماعات مثلاً منزلی اور شہری زندگی کو دیکھئے تو انسانیت اور بھی زخمی نظر آئے گی۔ اکثر و بیشتر اشخاص ایسے نظر آئیں گے جن کے حلق میں زندگی ایک تلخ اور خاردار نوالے کی طرح پھنسی ہوئی ہے جو نہ باہر آتا ہے اور نہ حلق کے نیچے اترتا ہے۔ گھروں اور پارکوں میں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں، اسپتالوں اور کالجوں میں، اسکولوں میں اور ان کے علاوہ ہر اس

جگہ جہاں اولادِ آدم کے قدم پہونچے ہیں انسانیت دیوانہ وار بے یار و مددگار گریاں و نالاں پھرتی ہوئی اور حیوانیت امن و راحت کو ذبح کرتی ہوئی دکھائی دے گی۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ سب کیوں ہے؟

امن و اطمینان انسانیت کی خوشگوار اور پسندیدہ غذا ہے۔ اس سے محروم ہو کر انسانیت کتنے دن زندہ رہ سکتی ہے؟ اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے بعد اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے کہ سوال کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالی جائے۔ اگر انسانیت کی بقا مقصود ہے اگر انسان کے فطری مطالبہ کو پورا کرنا ہے اور اگر زندگی کو ویسا ہی بنانا ہے جیسا کہ واقعتہً ہونا چاہیئے تو اس سوال پر غور کرنا ناگزیر ہے۔

یہ کوئی ریاضی کا فرضی سوال نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کی زندگی کا حقیقی سوال ہے اس لیئے ایسے نکے دماغ شاید بہت کم ہوں گے جنھوں نے کسی نہ کسی طریقے سے اس مسئلہ کو سوچا نہ ہو۔

یہ دنیا عالم اسباب ہے، جو حوادث ہم کو نظر آتے ہیں اُن کے پیچھے کچھ دوسرے حوادث ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ بے انتہا نہیں ہے مگر لمبا ہے۔ اگر ہم کسی زہریلے درخت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہیں تو اس کی جڑوں کو نکال دینا ضروری ہے۔ قیام امن کے بارے میں کوشش کرنے والے اشخاص اور اداروں کی ناکامی کا راز اسی اصول میں پوشیدہ ہے۔ اُن کی مساعی کی داد نہ دینا خلاف اخلاق ہے۔ مگر ناکامی کو کامیابی کہہ دینا اور غلط طریقوں کو صحیح قرار دینا بھی خلاف انصاف ہے۔ عقل انگشت بدندان ہے کہ سارے عالم کے مفکرین امن و امان کا شور بلند کر رہے ہیں مگر فتنوں کا یہ حال ہے کہ وہ طلسم ہوشربا کے کسی طلسمی سپاہی کی طرح ایک کو مارنے سے دو ہو جاتے ہیں اور اُن کو ختم کرنے کی ہر کوشش اُن میں مزید اضافہ کر دیتی ہے پچھلی جنگ عظیم کے بعد مجلس اقوام امن عالم کی ضامن بنکر آئی تھی مگر چوتھائی صدی بھی نہ گذری تھی کہ اسی مجلس اقوام نے امن عالم کو اپنے ہاتھوں سے دوسری جنگ عظیم کی بھٹی میں جھونک دیا۔ اس کرۂ آتش فشاں کا لاوا کچھ سرد پڑنے کے بعد سلامتی کونسل امن و سلام کا جھنڈا لہراتی ہوئی آئی۔ مگر واقعات بتا رہے ہیں کہ سلامتی کے یہی ضامن [illegible] اپنی خود غرضیوں اور جنبہ داریوں سے تیسری جنگ عظیم کے لیے [illegible] صاف کر رہے ہیں جو بہت تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ [illegible] نہ سمجھنا چاہیے کہ ناکامی کا داغ صرف یورپ ہی کی پیشانی پر لگا ہوا ہے [illegible]

کہیں زیادہ دہشتناک اور ہولناک ہے۔ یورپ اور ایشیا پر موقوف نہیں دنیا کے ہر ملک میں حامیان امن و اطمینان فتنوں کے استیصال میں قطعاً ناکام ہیں۔ اور ایک مبصر کے نزدیک اس کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی کہ کبھی ان کا سفینۂ تمنا ساحل مراد کو پہونچ سکے گا۔ بلکہ گرداب ناکامی میں غرق ہو جانا ان کے لئے مقدر معلوم ہوتا ہے۔

اس خطرناک ناکامی کی وجہ یہی ہے کہ بدامنی و بے اطمینانی کے حقیقی سبب تک ان مفکرین کی رسائی ابتک نہیں ہوئی ہے۔ انھوں نے شاخ تراشی کی مگر گہری جڑوں کو نہیں دیکھا۔ مرض کی علامتوں کو دیکھا مگر اصل سبب کی تشخیص نہیں کی، چشمے کا بند باندھنے کی کوشش کی مگر سرچشمہ کو بند نہیں کیا۔ ایسی صورت میں ان کو ناکامی و نامرادی کی سزا کے بجائے کامیابی و بامرادی کا انعام قدرت کے کس قانون کی بنا پر مل سکتا تھا؟ ناکامی اور بدتدبیری کا الزام قلم کی وہ گستاخانہ جسارت ہے جو ان مفکرین کی پیشانی پر غالباً بل ڈالے گی جن کے تدبر و تدبیر پر دنیا کی بہت بڑی آبادی مکمل اعتماد رکھتی ہے مگر حق بہرحال حق ہے اس کی تلخی اس کے اخفا کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتی بلکہ اس کے وجود کا ثبوت ہے۔ تاہم دلیل و برہان کی روشنی ہی ان تاریکیوں کو دور کر سکتی ہے جن کی وجہ سے غلطی کے بنیادی اسباب کی دریافت اور بحران کا علاج مشکل ہو رہا ہے۔

اسوقت ہمارے کام کے دو حصے ہیں اسؔ امر کا ثابت کرنا کہ فسادات عالم کا جو سبب مفکرین عالم بیان کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت فسادات کا سبب نہیں ہے اور اُن کے حقیقی سبب کو بیان کرنا۔

ان دونوں حصوں پر علیحدہ علیحدہ کلام کرنا توضیح کے لئے مناسب ہے۔

فقدان امان کے مبینہ اسباب

دنیا میں ایسے سادہ لوحوں کی بھی کمی نہیں ہے جو عالم کی بدامنی اور فسادات کا رشتہ محض حرکات قلب کی وقتی تیزی وسستی سے جوڑ دیتے ہیں۔ اور صرف وقتی جذبات و میلانات کو ان کا حقیقی سبب قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ جو دنیا کو اس قسم کے دوری جنون کا مریض سمجھتے ہیں درحقیقت خود ایک قسم کے جنون میں مبتلا ہیں ان کی اس توجیہ کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بجائے سیاسی مجالس کے ہمیں کسی طبی محل کی جانب رجوع کرنا چاہئے

تاکہ اس قسم کے جنون کو روکنے کے لئے کوئی انجکشن ایجاد کرلیا جائے۔ اِس مہمل توجیہ کی تردید میں وقت ضایع کئے بغیر ہم ان توجیہات پر نظر کرتے ہیں جو سمجھدار لوگوں کی طرف سے بیان کی جاتی ہیں۔

نسبتہً گہری نظر رکھنے والے مفکرین اس خیال پر متفق ہیں کہ انسانی زندگی کا یہ مسلسل تلاطم جس میں انسانیت کا بیڑا غرق ہو رہا ہے ان متضاد سیاسی و معاشی نظریات کا اور دہ ہے جو باوجود غلط اور خلاف عقل و فطرت ہونے کے بہت سے ذہنوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں اور عالم میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا رہے ہیں ان مفکرین کا کہنا ہے کہ اگر فسطائیت کا نظریہ جرمنی و اٹلی کے دماغوں پر مسلط نہ ہوتا تو دنیا کو دوسری جنگ عظیم کے جہنم میں نہ جلنا پڑتا۔ اگر سرمایہ داری سیم و زر کو خون دہقان سے زیادہ قیمتی قرار دینے کا خیال ترک کردے تو مزدور کے غضبناک دل کی چنگاریاں عالم کے خرمن امن و امان کو خاکستر نہ بنا سکیں۔

اس توجیہ کی صحت سے ہم کو کلیتہً انکار نہیں ہے بلکہ اگر ہم ان مفکرین کی دقیقہ رسی کی داد نہ دیں تو انصاف کی عدالت میں مجرم قرار پائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر سیاست و معاش کے متعلق غلط نظریات کا وجود نہ ہوتا تو فتنہ فساد میں بہت کمی ہوجاتی۔ اور دنیا اگر بالکل مطمئن نہ ہوجاتی تو کم از کم اس کے مصائب میں کمی تو ضرور ہوجاتی مگر یہ توجیہ اسی حد تک قابل تسلیم ہے۔ اس کی کلیت کا دعویٰ بالکل ناقابل تسلیم اور دلیل و برہان کی تائید سے قطعاً محروم ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ افراد انسانی کی ایک بڑی تعداد کا خون سیاسی و معاشی نظریات کے اختلاف و تضاد ہی کی گردن پر ہے مگر صرف انھیں کو ہر قتل و خونریزی اور ہر فتنہ و فساد کا ذمہ دار قرار دینا عقل، تاریخ، مشاہدہ کسی کے یہاں بھی قابل قبول نہیں ہے۔

توجیہ کی وسعت و گیرائی کو دلائل کے پیمانوں سے ناپنا اس وقت پیش نظر نہیں ہے بحث اس کی گہرائی سے ہے حقیقت یہ ہے کہ ان مفکرین کی عقل بہت دور تک پہونچی مگر حقیقت اس سے بھی زیادہ گہرائی پر ملتی ہے اصل سبب تک ان کی رسائی نہ ہوسکی۔

سوال یہ ہے کہ یہ غلط اور تباہکن و متضاد نظریات پیدا ہی کیوں ہوئے؟ کسی مرض کا پورا ازالہ اس وقت تک غیر ممکن ہے جب تک اس کے اصل سبب کا ازالہ نہ کیا جائے اور اس کا

ازالہ اس وقت تک غیر ممکن ہے جب تک اس کو معلوم نہ کر لیا جائے ان مفکرین کی یہی کمزوری ہے کہ انھوں نے اس سوال پر پورا غور نہیں کیا ہمارے نزدیک مسئلہ پر غور کا آغاز اسی نقطہ سے ہونا چاہیئے۔

ہر مسافر یہ چاہتا ہے کہ اپنی منزل مقصود پر پہونچے، فکر کا سفر بھی اسی غرض سے ہوتا ہے۔ کوئی مفکر بھی اس ارادے سے نہیں سوچتا۔ کہ وہ غلط نتائج حاصل کرے۔ کوئی شخص اس لئے پانی نہیں پیتا کہ اس سے اس کی تشنگی بڑھ جائے۔ اس غلطی کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے جس کو انسان کی ذہنی بیماری کے عنوان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بیمار فکر غلط نتیجے پر پہونچاتا ہے۔ اور بیمار فکر بیمار ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔

یہ فکر کی بیماری کیا ہے؟ فکر کے داخلی سفر کو انسان کے خارجی سفر کے ساتھ جو مشابہت ہے وہ آسانی کے ساتھ اس مرض کا پتہ بتا دیتی ہے۔ نقطۂ آغاز۔ و نقطۂ انجام اور راستہ کا غلط تعین یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں سے ہر ایک انسانی فکر کو ناکام بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔ یہی وہ امراض ہیں جو انسانی نظر کو ہلاکت و بربادی تک پہونچا دیتے ہیں۔ آنکھ مناظر کا عکس لیتی ہے۔ کان آوازوں کا ادراک کرتے ہیں اور زبان تلخ و شیریں کی ممتحن اور نطق و گویائی کی خادمہ ہے۔ مگر یہ سب آلات اپنے اپنے کام میں زندگی کے دست نگر ہیں اور زندگی روح یا قوت حیات کی محتاج ہے۔ فکر کا معاملہ بھی یہی ہے وہ دو قدم بھی اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک اس میں روح حیات نہ ہو۔ کیا آپ نے کسی لاش کو چلتے پھرتے دیکھا ہے؟ اگر نہیں دیکھا تو پھر آپ اس کی امید کیوں رکھتے ہیں کہ روح فکر کی لاش حرکت کرنے لگے گی۔

غالباً اب ہم فسادات عالم کے سبب تک پہنچ گئے ہیں۔ دلائل کی روشنی گمان کو یقین کے درجہ تک پہونچا دے گی۔ اور منصف مزاج مخالفین کو بھی یہ حقیقت نظر آجائے گی کہ جس چیز کو فساد کا اصل سبب سمجھ رہے ہیں وہ ایک دوسرے سبب کا نتیجہ ہے یعنی غلط نظریات۔ غلط فکر کا نتیجہ ہیں اور غلط فکر روح فکر کے فقدان سے پیدا ہوا ہے۔

روح فکر | اب ہم نے ڈور کا سرا پا لیا ہے یعنی ہم کو اب روح فکر کی جستجو کرنی چاہیئے۔ اگر ہم یہ معلوم کر لیں کہ وہ کون سی چیز ہے۔ جس کے فقدان نے غلط نظریات کو انسانی ذہن میں داخل ہونے کا موقع دیدیا تو ہم بہت آسانی کے ساتھ مرض کا علاج تجویز کر سکیں گے۔

انسان سب کچھ بھول جائیگا لیکن یہ نہیں بھول سکتا کہ وہ "کچھ نہیں" سے "کچھ" ہو گیا ہے۔ "نیست" سے "ہست" ہونے کا تصور بالکل فطری ہے جس میں ایک عامی دہقان اور ایک فلسفی دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

ہم کہاں سے آئے؟ معدوم سے موجود کیسے ہو گئے؟ آیندہ ہم کہاں جائیں گے؟ یہ سب سوالات ہیں جو اسی فطری احساس سے بالکل فطری و منطقی طور پر ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ حقیقت انسانی چونکہ بقا کی خواہشمند ہے اور فنا کے تصور سے بھی وہ گھبراتی ہے اس لئے جادۂ زندگی پر انسان کا ہر قدم سوالیہ جملے کا نشان ہوتا ہے، بیدار جبلت اس سے اس کے ہر حرکت سے پہلے پوچھتی ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے؟ کیا اس کے اس فعل کو اس کی بقا و فنا سے کوئی تعلق ہے؟ پھر وہ سوچتا ہے کہ اس راستہ کو طے کرنے کے لئے میں کس سے رہبری حاصل کروں؟ اس تاریک اور نامانوس وادی سے گذرنے کے لئے روشنی کہاں سے لاؤں؟

یہی تین سوال ہیں جو انسان کی پوری زندگی کا محور ہیں انسان کے کل افکار و اعمال انھیں کے گرد گھومتے ہیں ان کے جوابات افکار کی روح اور ان کی قوت حیات ہیں۔ انسان جو کچھ سوچتا سمجھتا ہے جو نظریات قائم کرتا ہے جو نتائج اخذ کرتا ہے اس میں یہی روح جاری و ساری ہوتی ہے۔ گویا افکار کا شجر اسی تخم سے پیدا ہوتا ہے اس کی کل شاخیں اور پھول پتیاں اسی جڑ سے نکلتی ہیں۔

فسادات عالم کے حقیقی ذمہ دار اصل سیاسی یا معاشی نظریات نہیں ہوتے بلکہ انھیں فطری سوالات کے غلط اور خلاف واقعہ جوابات ہوتے ہیں۔ افکار کی خشت اول اگر کج ہو جاتی ہے تو ثریا تک پوری دیوار ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ اور اگر یہ بنیاد درست ہوتی ہے تو افکار کی پوری عمارت سیدھی تیار ہوتی ہے اگر انسان اپنی پیدایش اور اپنے انجام کے متعلق غلط عقیدہ قائم کرتا ہے اور جادۂ حیات پر چلنے کے لئے کسی ناواقف یا گمراہ کن رہبر سے رہنمائی حاصل کرتا ہے تو اس کے سارے نظریات و افکار کا رخ منزل مقصود کی طرف سے پھر جاتا ہے۔ خواہ وہ سیاسی نظریات ہوں یا معاشی، معاشرتی ہوں یا اخلاقی۔

تاریخ میں شاذ و نادر ایسے فسادات بھی ملیں گے جو اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوں لیکن ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ شاید پوری تاریخ عالم میں ان کی کل تعداد انگلیوں پر شمار کی جا سکتی ہے۔

ایسے شاذ واقعات اصول کے عموم میں کوئی معتد بہ فرق نہیں پیدا کر سکتے اس کے علاوہ اس قسم کے واقعات کسی دوسرے اصولی سبب سے بھی متعلق نہیں ہوتے بلکہ کسی خاص غلط فہمی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اس بحث کو مزید طول دینے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں صرف اتنا ثابت کرنا ہے کہ قیام امن کی خواہ کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کی جائیں اس مقصد کا حصول اس وقت تک ناممکن ہے جب تک انسانی حرکات کی بنیاد ان فطری سوالات کے صحیح جوابات پر نہ قائم کی جائے۔ اور جو نظام زندگی ان مسائل کے غلط حل پر قائم کیا جائیگا اس کا فتنہ و فساد کے جہنم میں گرنا بالکل یقینی ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کے ان ناگزیر سوالات کا صحیح حل اس کے نظام زندگی کی روح و بنیاد بنا دیا جائے تو امن و راحت کا حصول آسانی کے ساتھ ممکن ہے۔ بلکہ اگر جزئی اور غیر ضروری اسباب نہ پیش آئیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں مکمل امن و امان کا قیام ایک لازمی و لابدی چیز ہے۔ اس لئے عالم میں مکمل امن و امان کے قیام و بقا کے لئے یہ ضروری اور ناگزیر ہے کہ پہلے ہم ان سوالات کے صحیح جوابات تلاش کریں۔

پہلا سوال | ہم کیوں موجود ہیں؟ ہم معدوم سے موجود کیونکر ہو گئے؟ ہم کہاں سے آئے؟ کسی نے ہمیں پیدا کیا یا ہم خود بخود پیدا ہو گئے؟ یہ سب ایک ہی سوال کے مختلف عنوانات ہیں مگر ماحصل سب کا ایک ہی ہے۔ یعنی انسانی فطرت یہ احساس رکھتی ہے کہ انسان پہلے نہیں تھا پھر ہو گیا وہ اس کی علت دریافت کرتی ہے۔ اور اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی جب تک اس کا جواب نہ حاصل کرلے۔

اس سوال کے دنیا میں جو مختلف جوابات دیئے گئے با وجود کثرت تعداد صرف تین اقسام کے ذیل میں داخل ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ انسان اور کل عالم کو پیدا کرنے والی ایک ایسی تنہا ذات ہے جو دانا بینا، علیم و حکیم ہے اس نے اپنے ارادے اور اپنی قدرت کاملہ سے انسان کو پیدا کیا ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انسان اور عالم کو پیدا کرنے والی کوئی تنہا ذات نہیں ہے بلکہ متعدد قدرت و طاقت رکھنے والی ذی ارادہ ہستیاں ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کو موجودات کے وجود میں دخل ہے۔

تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان و دیگر موجودات کا وجود کسی ذی ارادہ ہستی کا مرہون منت نہیں ہے بلکہ چند غیر ذی شعور و غیر ذی ارادہ قوتوں کے غیر شعوری تعامل کا نتیجہ ہے۔

یہ تین قسم کے جوابات ہیں جو انسان کی اس فطری پیاس کو بجھانے کے لئے پیش کئے گئے۔ ان کے تناقض اور تخالف کو دیکھنے کے بعد ہر شخص یہی فیصلہ کرنے پر مجبور ہے کہ حق ان میں سے صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ وہ صحیح جواب کون سا ہے؟ یہی اصل مسئلہ ہے جس کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

ہمارے نزدیک صرف پہلا جواب صحیح اور حق ہے۔ اور باقی جوابات غلط اور باطل ہیں لیکن ہم اس موقعہ پر کسی فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہمیں تو یہاں صرف فسادات عالم کا علاج دریافت کرنا اور امن و راحت کی کنجی حاصل کرنا ہے۔ اس لئے ہم یہ دیکھیں گے کہ ان تینوں اعتقادات میں وہ کون عقیدہ ہے جسے ہم اپنے افکار کی روح بنا کر عروس امن و امان سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

عقیدۂ توحید اور امن عالم

پہلے عقیدے کا مختصر عنوان توحید ہے اس عقیدہ کا پہلا اثر انسان میں احساس بندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور انانیت و کبریائی کا طلسم لوٹ کر اپنی احتیاج اور عاجزی کی حقیقت مجلّٰی ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے۔ اس روشن ادراک سے احساس برتری اور تحقیر ابناء جنس کی تاریکی دل سے دور ہو کر تواضع و انکسار کے انوار سے قلب انسانی منور ہو جاتا ہے۔ گویا توحید وہ تیشہ ہے جو فتنہ و فساد کے شجرۂ خبیثہ کی جڑوں کو کاٹ دیتا ہے اس لئے کہ عالم کے ننانوے فی صدی فسادات اور فتنوں کے شعلے استکبار و استعلا کے جہنم ہی سے بلند ہوتے ہیں۔ اگر دنیا میں تکبر اور اپنی بڑائی کا تصور موجود نہ ہو۔ اگر ہر انسان، دوسرے انسان کو اور ہر قوم دوسری قوم کو انسانی حیثیت سے اپنے سے کمتر سمجھنے کے بجائے اپنے سے بہتر ورنہ کم از کم اپنے برابر سمجھے اور اس کی انسانیت کی قدر و قیمت پہچانے تو امن و سلام کی روح پرور نسیم اس خارستان ارضی کو چمنستان سماوی کا نمونہ بنادے۔ تکبر فساد کی جڑ ہے۔ ہٹلر کو فتح عالم کے لئے کس چیز نے آمادہ کیا تھا؟ برطانیہ و امریکہ کو دوسروں کی آزادی کا گلا گھونٹنے پر کیا چیز آمادہ کرتی ہے؟ وہ روسی سازشیں جنھوں نے آج دنیا کے ایک بڑے حصے کو جنگ و جدل کی بھٹی میں جھونک دیا ہے ان کا سرا کہاں ہے؟ اگر غور کیجئے تو ان سب کی تہ میں صرف احساس برتری اور تکبر کا زہریلا مادہ ملے گا جس کا تریاق صرف توحید ہے۔

حق اور ملکیت کا صحیح تصور امن و راحت کی کنجی ہے۔ اگر انسان ذاتی طور پر خود کو

کسی چیز کا حق دار سمجھے اور کسی شے کو اپنی ذاتی ملکیت خیال کرے تو فتنہ و فساد پیدا کرنے کے لیے کسی دوسرے سبب کی ضرورت نہیں باقی رہتی ہے۔ عقیدۂ توحید اس فتنہ پرداز شیطان کو بہت گہرائی میں دفن کر دیتا ہے۔ غور تو کیجیے کہ جو شخص محض اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا خالق اور مالک سمجھتا ہے وہ کبھی اس کا وہم بھی نہیں کر سکتا کہ دنیا کی کوئی شے اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ وہ تو خود اپنے جسم و جان کو بھی اپنی ملک نہیں سمجھتا اور کسی چیز کو تو کیا سمجھے گا پھر اگر وہ کسی چیز کا حقیقی مالک نہیں ہو سکتا بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ملک ہے اور جو اس کے پاس ہے وہ حق تعالیٰ کا عطیہ اور نعمت ہے تو اس کے بعد کسی ذاتی حق اور کسی چیز پر ذاتی ملکیت کے خیال کی گنجایش کہاں باقی رہتی ہے؟ ذاتی حق اور ذاتی ملکیت کے احساسات غائب ہوئے کہ فتنہ و فساد کے زہریلے درخت کی جڑیں کٹ گئیں اور امن و سلام کے عطر بیز جھونکوں سے مشام انسانیت معطر ہو گیا۔

جغرافیائی حدوں نے انسانیت کے اعضا کو الگ الگ کر دیا ہے بعد مسافت اور رنگ و نسل وغیرہ کے فرق نے ان اعضا کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں ایسا خود غرض بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے کو کھانے کی کوشش کرتا ہے۔ عالمگیر "برادری" اور مشترک ہمجنسی کا احساس ہی وہ خون ہے جو ان سب میں دوڑ کر محبت و یگانگت کے جذبات کو ابھار سکتا ہے۔ اور خود غرضی کے سرسام کو دور کر کے انسانیت کی قدر و قیمت کا احساس پیدا کر سکتا ہے۔ مجھ کو کوئی بتائے کہ عقیدۂ توحید کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے جو اس بھولے ہوئے سبق کو یاد دلائے؟ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں اور میرے ساتھ سارا عالم ایک ہی مالک کی ملک اور ایک ہی معبود کے پرستار ہیں وہ خود بخود اس عالمگیر برادری اور خدا کی مخلوقیت و بندگی کے رشتہ میں ساری کائنات کو منسلک پاتا ہے۔ یہ احساس اس کے خلوص و محبت کے دائرے کو سارے عالم پر محیط کر دیتا ہے۔ انسان والدین سے کیوں محبت کرتا ہے؟ اس لیے کہ وہ اس کے وجود کا سبب ہیں۔ اولاد سے وہ محبت اس لیے کرتا ہے کہ وہ اس کے بقا کی ضامن ہے، انسان خاک میں مل جاتا ہے مگر اس کے جگر کے ٹکڑے زمین پر چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ گویا وہ خود باوجود فنا کے باقی ہے۔ یہی وہ نفسیاتی سرچشمہ ہے جو اس کے دل میں محبت اولاد کا ایک دریا موجزن کر دیتا ہے لیکن والدین اور اولاد اس کے وجود و بقا کے حقیقی اسباب نہیں ہیں۔ اس کے وجود کی علت وہی ہستی ہے جو خالق و مالک کائنات ہے۔

غور تو کیجئے کہ کیا انسان ایسی ہستی پر اپنی محبت کی کل کائنات نثار نہیں کر دے گا؟ اور کیا اس کی یہ قربانی بالکل فطرت کی پکار نہ ہوگی؟ عبدیت تو انتہائے محبت ہی کا دوسرا نام ہے۔ عشق جب حسن پر سب کچھ نثار کر کے تہی دامن ہو جاتا ہے تو عبدیت و بندگی کے انمول جواہرات اس کے دامن میں ڈالے جاتے ہیں عبدیت کا خمیر ہی محبت سے تیار ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ پرستش کی شمع شعلۂ محبت کے بغیر روشن ہو جائے، ایک کی بندگی، ایک کی محبت، اُس کی بندگی جو ہر طرح ایک ہے، ذات میں بھی صفات میں بھی، اس کی محبت جو ہر طرح کامل او رجو ہر ایک کا محبوب ہے۔ یہ سب چیزیں انسان کی محبت میں کس قدر وسعت پیدا کرتی ہیں؟ اگر سارا عالم ایک ہی معبود کا پرستار ہو جائے تو نفرت و عداوت کی گنجائش کہاں باقی رہ سکتی ہے۔ بلاشبہ سارے عالم کے دلوں کو جوڑنے کی طاقت صرف عقیدۂ توحید میں ہے۔ عقائد زندگی کی جان ہیں۔ یہ اگر غلط ہوں تو پوری زندگی غلط راستہ پر پڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر وجودِ کائنات کے متعلق اس خالص مادی نظریہ کو لے لیجئے جس کا تذکرہ ہم اوپر کر آئے ہیں یعنی یہ خیال کہ کائنات کا وجود مادے کی اندھی بہری قوتوں اور طبیعت کے غیر شعوری قوانین کا رہین منت ہے کوئی علیم و قدیر ہستی ہیں "نہیں" سے "ہے" بنانے والی نہیں ہے اب غور کیجئے کہ اس عالم پر اس عقیدہ کے کیا اثرات ظاہر ہو سکتے ہیں؟

ایک ایسے دماغ کو لے لیجئے جس میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو۔ تخیل کے دروازے سے اس دماغ کے اندر پہونچئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس عقیدہ کے گرد بہت سے افکار کا انبار لگا ہے۔

"کسی انسان میں طاقت کی زیادتی کے یہ معنی ہیں کہ وہ طبعی قوتوں کا بہترین مظہر ہے۔ یہ اس کی فضیلت کی دلیل ہے۔ حق کا مدار بھی فضیلت پر ہے جو افضل ہے اس کے حقوق بھی طبعی طور پر زیادہ ہیں۔ پس طاقت اور حق مرادف ہیں۔ کمزور کو ہرگز حق وہ حاصل نہیں ہے جو طاقتور کو ہے"

"زندگی کا سرمایہ لذت ہے۔ زیادہ سے زیادہ لذتیں حاصل کرنا ہی مقصودِ زندگی ہے۔ اس مقصد کے حصول میں جو حارج ہو اس کو ہر طرح راہ سے ہٹا دینا چاہیئے۔

"کمزور پر رحم کرنا یا محض انسانیت کے رشتہ کو اہمیت دینا غیر طبعی اور غیر دانشمندانہ چیزیں ہیں اس لیئے کہ انسان طبعی طور پر خود غرض ہے"

یہ اور اسی قسم کے افکار آپ کو اس دماغ میں ملیں گے جن سے قدرتاً زہریلے جذبات

واخلاق پیدا ہوں گے۔ انصاف سے کہئے کہ کیا اس قسم کے دماغ دنیا میں ایک لمحہ کے لیئے بھی امن وسلامتی اور راحت واطمینان کا باعث بن سکتے ہیں ؟

تکبر، خود پرستی، خود غرضی، لذت پرستی، دولت پرستی، حرص وآز یہ سارے امن سوز جذبات واخلاق اس عقیدے کے لیئے لازم ہیں جو بارود سے کہیں زیادہ آتشگیر ہیں معمولی سی گرم فضا انکو مشتعل کر دینے کے لیئے کافی ہو جاتی ہے، اور محبت وانسانیت کا خرمن دم کے دم میں خاک کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

انسانی فکر کی طاقت بہت بڑی طاقت ہے۔ ہر شخص کی اس بے پناہ طاقت وقوت کو اگر بالکل آزاد رکھا جائے تو اس میں تصادم ہونا یقینی ہے۔ یہ تصادم اس قدر خوفناک ہوتا ہے کہ سالمات (atom) کا تصادم اس کا ایک معمولی سا منظر ہے اس کا مداوا صرف یہی ہے کہ افکار کی ان منتشر قوتوں کو ایک مرکز کے ساتھ مربوط کر دیا جائے۔ اتحاد مرکز کی وجہ سے کل افراد انسانی کے افکار میں باوجود اختلاف ایک اتحاد کا رنگ نمایاں ہوگا۔ جو تصادم کو روک کر امن وسلامتی کے تحفے کے ساتھ فکری تعاون وترقی کا تحفہ بھی انسانیت کے سامنے پیش کرے گا۔ وحدت معبود ہی کا عقیدہ وہ مرکز ہے جو افکار عالم کو ایک رشتہ میں پرو سکتا ہے دنیا کے کسی عقیدہ میں یہ طاقت وقوت نہیں جو افکار کے اس عظیم الشان اور لاتعداد مجمع کو جمع کر سکے یہاں تک کہ خود انسانیت بھی اس سے ہمیشہ قاصر رہی ہے جس کی وجہ ظاہر ہے۔ انسانیت اشخاص کے قالب میں ظاہر ہوتی ہے اور یہ دولت ہر شخص کے پاس موجود ہوتی ہے کوئی شخص فطرتاً اپنے اندر کوئی ایسا خلا نہیں محسوس کرتا ہے جسے دوسرے شخص کی انسانیت پُر کر سکتی ہو۔ نہ اسے اپنے اس لباس میں کوئی ایسا نقص محسوس ہوتا ہے جس کی تکمیل کے لیئے اسے دوسرے کی انسانیت میں سے پیوند لگانا پڑے ہر فرد اپنی آدمیت کو کامل سمجھتا ہے پھر انسانیت کی محبت کا جذبہ ابھرے تو کیوں ابھرے، حاصل شدہ چیز کی طلب کون کرتا ہے ؟ محبت وشوق کی آگ ہجر وفراق کے چقماق سے نکلتی ہے، یہ چقماق نہ ہو تو شمع محبت کا فروزاں ہونا ناممکن ہے۔ بے شک نوعی اشتراک کی بنا پر کبھی کبھی انسان کے دل میں انسانیت کی محبت کی خلش بھی محسوس ہوتی ہے۔ ابناء جنس کی طرف میلان کا طبعی ہونا ہم کو بھی تسلیم ہے۔ مگر نفس کے دھوکے میں نہ آیئے اور یہ سمجھ لیجئے کہ یہ میلان درحقیقت تکمیل ذات کا میلان ہے۔ نہ کہ خود انسانیت

کی محبت: اس لئے یہ بہت محدود ہوتا ہے اور کوئی عالمگیر مرکز افکار مہیا کرنے کی قطعاً صلاحیت نہیں نہیں رکھتا۔ یہ تو اکثر اوقات ایک خاندان سے بھی آگے قدم نہیں بڑھاتا۔ پورے عالم کو گھیر لینا تو بڑی چیز ہے۔ غور تو کیجئے کہ اگر خود انسانیت کی محبت کا جذبہ بھی انسانی فطرت کے کسی حصہ پر قابض ہوتا تو اپنی اور پرائی اولاد کی محبتوں میں غیر معمولی فرق کی کیا وجہ ہے؟ کیا دونوں کی انسانیت میں بھی کچھ فرق ہوتا ہے؟

ذرا نقشہ کو الٹ کر بھی پڑھیئے۔ تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجئے۔ کہ نسلوں، اور وطنوں کی تقسیم کے ساتھ دنیا میں معبودوں کی بھی تقسیم ہو جائے۔ یا افکار انسانی کا تعلق متعدد مشترک معبودوں کے ساتھ ہو جائے۔ اس حالت میں وہ مرکز کہاں سے آئے گا جو سارے عالم کے افکار کو جمع کر سکے، مختلف افراد کے افکار کا تصادم تو دوسری چیز ہے خود ایک شخص کے افکار میں بھی تصادم اور تضاد شروع ہو جائے گا۔

محبت کی فطرتاً ایک ہی آنکھ ہوتی ہے شاید اس کی نفسیاتی حقیقت ہی توجہات و رجحانات میں یکسوئی ہے۔ معبود کا محبوب ہونا بھی ضروری ہے متعدد معبودوں کی پرستش کا عہد کر کے انسان اپنے دل کی متاع قلیل، کس کے قدموں پر نثار کر سکتا ہے؟ اور یہ قطرۂ خون کہاں کہاں بہائے گا؟ آخر فطرت غالب آئے گی اور دل انہیں سے کسی ایک کی نذر کر کے بقیہ سے نظریں پھیرنی پڑیں گی اس میں ہر شخص اپنے شخصی ذوق کے احکام مانے گا۔ بس تفرقہ اور فساد کی بنا یہیں سے پڑ جائے گی۔ اور انسانیت کی داستان درد کا پہلا باب خود اسی کے خون سے لکھا جائے گا۔

خیالات توجہات اور رجحانات کے اس تصادم و تضاد کے بعد زندگی کے سارے نظریات میں اختلاف ہونا ضروری ہے۔ سیاست، معیشت، اخلاق، اعمال، زندگی کا کوئی شعبہ اس اختلاف سے بچ نہیں سکتا، یہ ذہنی جنگ افراد سے گذر کر اجتماعات تک اور خیالات سے گذر کر عمل تک لازماً پہونچتی ہے اور انسانیت کو فتنہ و فساد کے ایسے جہنم میں دھکیل دیتی ہے جو پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے یہاں تک کہ اجتماعی زندگی کے ساتھ انسان کی انفرادی زندگی بھی اس کے شعلوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

(۴)

اہل محبت کی دنیا ہی الگ ہے | جب محبت سے مصیبت تک لذیذ ہو جاتی تو اسی سے محبت والوں کے دوسرے احوال کا اندازہ کیجئے اصل میں اہل محبت کی دنیا ہی الگ ہے ان کو محبوب کا نام لینے میں بھی مزہ آتا ہے حضرت ہی سے کسی بزرگ کا حال سنا جو فرماتے تھے کہ جب اللہ اللہ کہتا ہوں تو منہ میٹھا ہو جاتا ہے اس کے مقابلہ میں محبت سے محروم دنا آشنا اللہ کا نام لینے والے ہم مسلمانوں کا حال دیکھئے کہ دس پانچ منٹ کی نماز تک ہمارے اوپر پہاڑ ہے مسجد سامنے ہے خدا کا منادی (مؤذن) زور زور سے پکار رہا ہے اور ہم ہیں کہ کان رکھ کر بہرے بن جاتے ہیں کھیل تماشے اور گپ شپ تک کو خدا کی پکار پر چھوڑنا گوارا نہیں کرتے

ہمارے اسی عہد کے ایک مشہور اہل محبت بزرگ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں ان کی شان عشق و محبت کی عجیب و غریب تمنا حضرت علیہ الرحمۃ ہی کی زبان سے سنی کہ فرمایا کرتے تھے بس یہ آرزو ہے کہ قبر میں بھی نماز پڑھتے رہنے کی اجازت مل جائے!

جب ہم اہل غفلت رات کو خرائے لیتے ہوتے ہیں تو یہ اہل محبت، محبت کے جو مزے لوٹتے ہیں اس کے سامنے سلطنت بھی بے حقیقت ہوتی ہے اسی مذکورہ صدر آیت (فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً) کا ایک تفسیری حاشیہ سنئے[1]

[1] از مولانا شبیر احمد عثمانی بر ترجمہ قرآن مجید حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

"ذکر اللہ کی لذت، حب الٰہی کا مزہ، عبودیت کی خوشی، تعلق مع اللہ کی حلاوت، جس کا ذائقہ چکھ کر ایک عارف نے کہا

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد — در دل اگر بود ہوس چتر سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب — من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

سچ ہے اهل الليل فی ليلهم الذّ من اهل اللهو فی لهوهم
اسی لئے ایک بزرگ نے فرمایا کہ اگر سلاطین کو خبر ہو جائے کہ شب بیداروں کو رات کو اٹھنے میں کیا لذت و دولت حاصل ہوتی ہے تو اس کے چھیننے کے لئے اسی طرح لشکر کشی کریں جیسے ملک گیری کے لئے کرتے ہیں"

حد اس لذت کی یہ ہے کہ بعض دفعہ عارفین اس لذت سے بھی پناہ مانگتے اور استغفار کرتے ہیں کہ محبوب کے بجائے کہیں خود یہ لذت ہی محبوب و مقصود بالذات نہ ہو جائے۔

"کیونکہ لذتِ طاعات بھی مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالغیر ہے عارف کو بعض دفعہ شبہ ہو جاتا ہے کہ کہیں میں تہجد و ذکر اس لذت ہی کے واسطے نہ کر رہا ہوں اسی لئے وہ اس لذت پر التفات کرنے سے بھی استغفار کرتے ہیں اب سمجھ میں آگیا ہوگا و بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ کا ربط کَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ سے"۔

"ظاہر میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ رات کو تہجد پڑھنے سے استغفار بالاسحار کو کیا تعلق ہے بعض مفسرین نے تو یہ کہا کہ یہ معاصی سے استغفار کرتے ہیں اور اسحار کی تخصیص اسلئے ہے کہ وہ وقت اجابت دعا کا ہے اور تہجد سے استغفار کا تعلق یہ ہے کہ وہ جلب منفعت ہے اور یہ دفع مضرت ہے اور بعض نے کہا کہ وہ تہجد پڑھ کر خود اس اطاعت ہی سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ طاعات بھی (حق طاعات ادا نہ ہو سکنے سے) معاصی ہیں۔

"مگر میں کہتا ہوں کہ زیادہ سہل اور ظاہر یہ ہے کہ وہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں اور اخیر شب میں لذت طاعات سے یا اس لذت کے آثار سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ اس وقت حال یہ ہوتا ہے کہ

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے — کہ یارے برخورد از وصل یارے

اور وصل کی لذت جیسی ہوتی ہے معلوم ہے اس لذت میں کبھی انہماک ہو کر اس کی مقصودیت

کا شبہ ہو جانا بعید نہیں اور اس دولت وصل سے مشرف ہو کر عجب کا پیدا ہو جانا بھی رجا کا ثار لذت سے

ہے بعید نہیں اسلئے اس سے استغفار کرتے ہیں"

خلاصہ یہ کہ محبت کی بدولت طاعات میں بھی ایسی لذت ملنے لگتی ہے کہ سلطنت بھی ہیچ ہو جاتی ہے

"یہ تو دین کا نفع ہوا اور دنیا کا نفع یہ ہوگا کہ محبت سے تمام پریشانیاں دفع ہو جائیں گی میں یہ نہیں کہتا کہ محبت کے

بعد آپ کو بیماری نہ ہوگی یا کوئی تکلیف نہ پیش آئے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس وقت حوادث کا رنگ دوسرا ہوگا

اسوقت کلفتوں میں بھی آپ کو مزا آئے گا"[1]

از محبت تلخہا شیریں شود

محبت ہی کی طرح ذات وصفات کی توحید بھی جب قال سے گذر کر صوفی کا حال بن جاتی ہے تو اس کی تفویض کا خاصہ بھی تلخیوں کو شیریں بنا دیتا ہے جیسا کہ اس مضمون (حیات طیبہ) کی ابتدا ہی میں "اثر توحید" کے عنوان سے اس کا مجملاً ذکر آچکا ہے البتہ حضرت حکیم الامۃ کی حکیمانہ مصلحت شناسی اس کی صوفیانہ تعلیم و تفصیل کی تعمیم کو پسند نہ فرماتی تھی اولاً تو اس کی فہم کے لئے ذرا تجرید پسند یا فلسفیانہ ذہن درکار ہے (جس کا وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود کے مباحث سے اندازہ ہو سکتا ہے) دوسرے اس توحید کا لازمہ یہ ہے کہ خیر و شر کے سارے افعال و آثار کا منشا حق تعالیٰ ہی کی ذات اور صفات اور اس کے صفات جمال و جلال کو سمجھا جائے جس میں خدا سے سوء ظن و شکایت کا شدید خطرہ رہتا ہے اس خطرہ کی بنا پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ عام طور سے مراقبۂ توحید کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے الا آنکہ کسی پر محبت کا رنگ غالب ہو۔ کیونکہ محبت کے یہ بالکل منافی ہے کہ محبوب سے کسی حال میں بھی شکایت پیدا ہو لیکن ہمارے حضرت علیہ الرحمۃ نے اپنے حکیمانہ رنگ میں اس مراقبہ کا بھی نچوڑ دو لفظوں میں نکال کر اس کو عام و تام دونوں بنا دیا ہے کہ بس ہر امر میں حق تعالےٰ کے حاکم و حکیم ہونے کا خیال رکھا جائے۔ حاکم ہونے کی حیثیت سے تو ان کو ہمارے اندر ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے اور حکیم ہونے کی حیثیت سے یہ تصرف حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا تو پھر اعتراض و شکایت کی کیا گنجائش بلکہ اس مراقبہ کا لازمہ تو خالص تفویض یا بے چون و چرا تسلیم و رضا ہے تاہم ہے مصائب کا یہ علاج خاص ہی۔

---

[1] خیر الحیوٰۃ و خیر المماۃ ص ۳۰ و ۳۹

"جس کو خواص استعمال کرتے ہیں اس کا نام تفویض ہے جس کی حقیقت قطع تجویز ہے یعنی وہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ وہ جو چاہیں ان میں تصرف کریں اپنی طرف سے وہ کوئی حالت یا نظام تجویز نہیں کرتے اور تمام تر پریشانی کا سبب تجویز ہی ہے کہ ہم نے ہر چیز کا ایک خاص نظام (پروگرام) اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہئے اولاد کو اس طرح پڑھنا چاہئے پھر اس نظام کے خلاف واقع ہونے سے کلفت ہوتی ہے اور زیادہ حصہ اس نظام کا جو ہماری طرف سے تجویز ہوتا ہے غیر اختیاری ہوتا ہے تو غیر اختیاری امور کے لئے نظام تجویز کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

"اسی قطع تجویز کے لئے حدیث میں ہے۔ اذا اصبحت فلا تحدث نفسك بالمساء واذا امسیت فلا تحدث نفسك بالصباح کہ جب صبح ہو تو شام کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ لاؤ اور شام ہو تو صبح کے متعلق خیال نہ لاؤ راحت اسی میں ہے اسی لئے اہل اللہ نے تجویز کو قطع کر کے یہ مذہب اختیار کر لیا ہے کہ

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　　دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

اور یہ مذہب بنا لیا ہے کہ

ناخوش تو خوشی بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من[1]

مگر دیکھئے اس توحیدی تفویض کے ساتھ وہی محبت کا رنگ شریک بلکہ غالب ہے۔ جس کے بغیر اس تفویض کا نباہنا ہی دشوار ہے کہ" انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم خدا کے ہیں ان کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہیں تصرف کریں[2]" ساتھ ہی اس تفویض و محبت میں کچھ ایسا لازم ملزوم کا علاقہ ہے کہ جس طرح غلبۂ محبت میں یہ تفویض پیدا ہو جانا لازم ہے اسی طرح اس تفویض کے ساتھ محبت پیدا ہو جانا بھی لازم ہے اسی لئے اس کو عاشقانہ تفویض یا تفویضی عشق دونوں کہا جا سکتا ہے لیکن دراصل یہ تفویض توحید ذات و صفات کی لازمی تفریع اور وہی عبدیت ہے جو انسان کی تخلیق کا خاص مقصد اور خواص کا مردانہ مقام ہے اور جو اس مردانہ مقام پر کھڑا رہ سکے اس کے لئے رنج و مصیبت خوف و حزن کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ

---

[1] الجبر بالصبر ص ۲۳ [2] ایضاً

ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ عبد یا غلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ رب یا مالک کو حق ہی جس طرح اور جس حال میں چاہے اس کو رکھے اور وہ راضی رہے اسلئے آخر میں اپنے رب کے ساتھ عبد کے اس رشتۂ عبدیت و بندگی کو (جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) ایک مرتبہ اور سُن لیجئے۔

"حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ پر اشکال کیا گیا کہ جن وانس کی تخصیص کی کیا وجہ عبادت تو ساری مخلوق ہی کرتی ہے حضرت نے فرمایا کہ ایک تو عبادت ہے اور ایک طاعت اول ایک مثال میں فرق سمجھ لو وہ یہ کہ ایک تو نوکر ہے ایک غلام۔ نوکر کا کام معین ہوتا ہے خواہ ایک خواہ متعدد مثلاً باورچی کے لئے پکانے کی خدمت معین ہے یا مکان پر بازار اور گھر کا کام کرنے کے لئے کوئی نوکر ہے جس خدمت کے واسطے یہ نوکر ہیں ان سے وہی خدمت لے جاسکتی ہے خود آقا بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں حتیٰ کہ اگر آقا باورچی سے کہے کہ یہ خط لیکر گنگوہ چلے جاؤ تو وہ ضابطہ میں انکار کرسکتا ہے"۔

"اور غلام کی کوئی خدمت معین نہیں تمام خدمات اسکے ذمہ ہیں جس کا بھی حکم ہوجائے چنانچہ ایک وقت اس کو آقا کا پاخانہ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اور ایک وقت میں آقا کی پوشاک پہن کر آقا کا قائمقام ہوکر جلسہ یا دربار میں جانا پڑتا ہے۔ غرض غلام کو کسی وقت کسی خدمت سے بھی انکار نہ ہوگا اسی طرح جن اور انس کے سوا تمام مخلوق کی طاعت معین ہے ہر شئے مخلوقات میں سے ایک خاص کام پر معین ہے کہ اس کے سوا دوسرا کام اس سے نہیں لیا جاتا"۔

"مگر انسان کی کوئی خدمت معین نہیں۔ چنانچہ ایک وقت میں انسان کا سونا عبادت ہے اور ایک وقت میں پاخانہ پھرنا بھی عبادت ہے۔ مثلاً جماعت تیار ہو اور پاخانہ پیشاب کا زور ہو تو اُس وقت پیشاب وغیرہ سے فراغت حاصل کرنا واجب ہے اور نماز پڑھنا حرام ہے اس وقت بیت الخلاء جانا ہی عبادت ہے ایک تو یہ حالت ہے اور ایک وقت انسان کی یہ شان ہے کہ مظہر حق بنا ہوتا ہے اسوقت اس کی زبان سے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں غرض جو شان غلام کی ہوتی ہے وہی انسان کی ہے عبد شدن کیلئے انسان ہی ہے باقی تمام مخلوق ذاکر و شاغل ہے مگر عابد صرف انسان ہی ہے۔

لہٰذا اس کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ

"یہ کسی خاص حالت اور کسی خاص کام کو اپنے لئے تجویز نہیں کر سکتا۔ بلکہ حضرت حق جس حالت میں بھی رکھیں اسی میں اس کو رہنا چاہیے کمبل اوڑھائیں تو کمبل اوڑھے دوشالہ اڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے گھی دودھ کھلائیں تو گھی دودھ کھائے یہی شان تھی حضور کی۔

مگر اس مقام سے ناآشنا دین کے نام سے بھی آج کل کیسی غلطی و غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اپنی اپنی

"تجویز و اختیار کا نام بزرگی رکھ لیا ہے کہ فلاں شخص بہت بزرگ ہیں گھی نہیں کھاتے فلاں بزرگ گائے کا گوشت نہیں کھاتے قربانی نہیں کرتے بڑے رحم دل ہیں جانور کے گلے پر چھری رکھنے کو اچھا نہیں سمجھتے حالانکہ قربانی میں تو جانور کو خدا کے نام پر فدا کرنا ہے .... اگر حق تعالیٰ ہماری جان بھی طلب فرماتے تو اس میں بھی دریغ نہ ہونا چاہیے تھا چہ جائیکہ وہ ہمارے بجائے جانوروں کی جانیں طلب کرتے ہیں اور حکم فرماتے ہیں کہ ہمارے نام پر قربانی کرو۔

آنکہ جاں بخشد گر بکشد رواست   نائب است و دست او دست خداست۔

"غرض تفویض کلی عبدیت ہے اور اپنی تجویز سے امتیازی شان بنانا عبدیت کے بالکل خلاف ہے مثلاً جب حق تعالیٰ کھانے پہننے کو اچھا دیں اس وقت خستہ حالت میں رہنا ناشکری نعمت بھی ناقدری اور خلاف اطاعت ہے۔ کیونکہ جیسے شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے نوکروں کو تنخواہ و کھانا کپڑا دو ویسے ہی یہ بھی حکم دیا ہے کہ اپنی جان کو بھی راحت دو بس جیسے نوکر خدا کی مخلوق و مملوک ہے تمہاری جان بھی خدا کی مخلوق و مملوک ہے اسلئے تم کو اپنے اندر بھی بدوں اجازت کسی تصرف کا حق نہیں اگر نوکر کو حکم آتی کہ کھانا کپڑا دیتے ہو تو اسی آقا کے حکم سے تم اپنی بھی خدمت کرو۔ کیونکہ تمہاری جان بھی خدا کی ہے اسی حقیقت پر نظر کر کے ایک عارف فرماتے ہیں کہ

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است   افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

کہ مجھ کو اپنے اعضاء پر اس وجہ سے ناز ہے اور ان کی قدر ہے کہ آپ سے ان کا تعلق ہی صاحبو ہم کو اپنی آنکھ سے اس وجہ سے تعلق نہ ہونا چاہیے کہ وہ ہماری آنکھ ہے بلکہ اس وجہ سے

کہ حق تعالیٰ کی چیز ہے ان کی خدمت کرتی ہے اس نے ان کا جمال دیکھا ہے گو بواسطہ مظاہر ہی سہی آگے فرماتے ہیں

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　　کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اس اعتبار سے عارف کو اپنے نفس سے بھی محبت ہوتی ہے اور اسی لئے حدیث میں ہے اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا کہ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے۔ تو عارف کو اپنے نفس سے اسلیے محبت ہے کہ وہ سرکاری چیز ہے۔ دیکھو اگر کوئی مشین سرکاری کسی کے سپرد ہو تو اُسکے آلات کا صاف رکھنا اور تیل دینا ضروری ہوگا ورنہ باز پرس ہوگی البتہ اگر اپنی ہو تو اختیار ہے چاہے صاف کرکے تیل دے چاہے نہ دے .... غرض عارف اس اعتبار سے حقوق نفس ادا کرتا ہے تاکہ خدا کا کام کرے مگر آج کل جہلا اس قسم کی درویشی کو دلیل ترحم خیال کرتے ہیں (کہ مثلاً فلاں شخص قربانی نہیں کرتا گوشت نہیں کھاتا) "کہتے ہیں کہ فلاں شخص چلہ کھینچ رہا ہے اور چلہ میں گوشت سے پرہیز ہے سبحان اللہ.. حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبل نبوت کچھ ایام کے لئے بغرض خلوت غار حرا میں تشریف لے جانا ثابت ہے اور بعد نبوت کے اعتکاف ثابت ہے مگر آپ نے گوشت سے کبھی پرہیز نہیں کیا پھر یہ کیسی بزرگی ہے کہ چلہ کی وجہ سے لوگ گوشت چھوڑ دیتے ہیں۔

حالانکہ حدیث میں ہے سید الطعام اللحم۔ دست کا گوشت کھانا حضور سے ثابت ہے بلکہ آپ کو مرغوب تھا اسلئے اتباع سنت ہے"۔

حاجی امداد اللہ صاحب کے سامنے ایک متبحر عالم نے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ ترک حیوانات کے ساتھ چلہ کھینچوں۔ حضرت نے فرمایا مولانا تو بہ کیجئے بدعت ہے۔ حالانکہ حاجی صاحب اصطلاحی عالم نہ تھے۔ مگر عالم گر تھے۔ اسی لئے حضرت مولانا قاسم صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا تھا کہ لوگ حضرت حاجی صاحب کے مختلف کمالات کے معتقد ہیں مگر میں علم کی وجہ سے معتقد ہوں اصل یہ ہے کہ جب قوت حاسہ درست و صحیح ہو تو کھانے میں کتنا ہی باریک بال کیوں نہ ہو محسوس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب فہم درست ہو تو حق و باطل میں فوراً امتیاز ہو جاتا ہے حضرت اپنے زمانہ میں صدیق اعظم تھے۔ (جو بہت بڑا مرتبہ ہے مراتب ولایت سے)

غرض اسی طرح اپنی رائے اور تجویز سے گوشت وغیرہ سے پرہیز

"یہ بھی ایک کھیل ہے شیطان کا کہ عبادت کے رنگ میں دھوکہ دیتا ہے ...... باقی کاملین کی نظر ہر وقت عبدیت پر ہے اس لئے وہ پلاؤ اور قیمہ اور چٹنی ایک ہی رغبت سے کھاتے ہیں

اور یہی کمال عبدیت یا توحید، تفویض کی کامل سپردگی اور تسلیم ورضا کا وہ کٹھن مقام ہے کہ :-

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ۔۔۔ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس ۔۔۔ ہمین است بنیاد توحید و بس

باقی خالی زبان سے اسرار و معارف بگھارنا یہ تو ہر تصوف خواں بلکہ فلسفہ خواں بھی کر سکتا ہے۔

بقیہ مضمون صفحہ ۳۲ (ایمان و امان)

تواضع امن و سلامتی اور اتحاد و اتفاق کی جان ہے اس کو شرک کے ساتھ بالکل مناسبت نہیں ہے۔ آقا کی عظمت غلام کے وقار کو بڑھا دیتی ہے اپنے خالق کی برتری اور دوسرے کے خالق کی کمتری کا خیال اپنی برتری اور دوسرے کی کمتری کا احساس منطقی طور پر پیدا کرتا ہے یہ خیال فتنہ کی جڑ اور تکبر کی اصل ہے تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں اس قسم کے خیالات کی وجہ سے کتنے فتنے اور فسادات پیدا ہوئے ہیں۔ انسان میں تواضع اور انکسار جس طرح ضروری ہے اسی طرح خودداری بھی لازم ہے توحید یہ دونوں صفتیں انسان میں پیدا کرتی ہے اور اس طرح آدمی کو مکمل انسان بنا دیتی ہے۔ (باقی)

انتخاب

انقلاب زندہ باد! یا انقلاب مردہ باد؟ :

"دعا وہ اچھی کہ قبول ہو، لیکن اس دعا کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ بددعا بن کر مسلط ہو جائے آج اس کرۂ زمین پر جس طرف نظر ڈالئے طرح طرح کے آشوب چھائے ہوئے دکھائی دیں گے۔ آشوب عام کا یہ عہد اور انقلاب زندہ باد کا وظیفہ صبح و شام تقریباً ایک ہی ساعت کی پیداوار ہیں۔ اس لئے یوں سمجھئے کہ انقلاب زندہ باد ایک عوامی دعا تھی وہ قبول ہو گئی۔ دنیا کے ہر گوشہ اور روئے زمین کے چپہ چپہ پر آشوب انقلاب رونما ہو گیا۔ ہر طرف بے چینی ہے۔ ہر طرف کرب و اضطراب ہے۔ آج اس کرۂ ارضی کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں انقلاب اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ اگر کار فرما نہ ہو تو کم از کم دروازہ پر اپنی ہنگامہ آرائیوں سے دستک نہ دے رہا ہو......

زندگی گوناگوں انقلاب سے دوچار ہے۔ لباس میں انقلاب ہے، غذا میں انقلاب ہے اہل وطن کے باہمی ربط و محبت میں انقلاب ہے۔ دلوں کے سکون و راحت میں انقلاب ہے اس کے باوجود بھی انقلابی دعا گو اپنی دعاؤں میں مصروف ہیں...... معلوم ہوتا ہے کہ مسوران انقلاب ان انقلابوں سے تسلی خاطر حاصل نہ کر سکے جوان پر آچکے۔ جذبہ انقلاب کی دہکتی ہوئی جہنم ھَلْ مِن مَّزِيْد کا نعرہ لگا رہی ہے۔ دنیا شاید کسی اور آشوب جہاں کا انتظار کر رہی ہے کہتے ہیں کہ کمیونسٹ سیلاب نے چین کو تہ و بالا کیا۔ برما میں غارتگری مچائی اب کلکتہ میں طوفان ترتیب دینا چاہتا ہے۔

موجودہ دنیا اپنے پورے تمدنی۔ معاشرتی۔ علمی دعوئی ترقی کے ساتھ جس قدر بے چینیوں

میں مبتلا ہے شاید اس سے پہلے کبھی کسی عہد میں ایسی بے چینیاں اس قدر عام نہوئی ہوں۔

مگر اسی کا نام ترقی ہے۔ اسی کو عروج وکمال سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ عروج و ترقی نام ہے اس عذاب کا جو پورے عالم انسانیت کو مبتلائے آہ و بکا کردے اور اس زمین پر بسنے والا ہر گروہ، ہر فرقہ ہر باشندہ اور ممالک دنیا میں سے ہر ملک، ہر شہر اور ہر قریہ دکھ درد میں تڑپتا نظر آئے۔

اگر ترقی اسی کا نام ہے اور اگر عروج وکمال کی سرحدیں کسی ایسی ہی انسانی جہنم تک پہونچتی ہیں تو جلد یا بدیر انسان کو اپنی اس اندوہناک ترقی پر نادم ہونا پڑے گا۔ اور پھر ایسی شاہراہ زندگی کی تلاش ہی اس کے لئے وجہ نجات بن سکے گی جہاں عدل و مساوات ہو۔ حوصلہ مندی و رواداری ہو۔ انسانیت نوازی ہو، محبت ہو، اعتماد ہو۔ اور کامل سکون نزندگی کے ساتھ وہ باہمی سازگاری ہو کہ پھر دنیا کے انقلاب بھی وہاں سر پٹک پٹک کر تھک جائیں اور کچھ نہ کرسکیں۔ اگر سیلاب آکر ٹکرائیں تو سرد پڑجائیں۔ اگر طوفان اٹھیں تو ٹھنڈے پڑجائیں۔

لیکن دنیا اس شاہراہ امن و آشتی کو حاصل نہیں کرسکتی جب تک وہ مادہ پرستی کو ٹھکرا کر خدا پرستی کا دامن نہیں تھام لیتی۔ (نشان منزل بھوپال)

ہندی مسلمانوں سے :

یہ کیا بات ہے حالات جوں جوں پلٹتے ہیں تم خود تو بدلتے نہیں۔ ہاں اپنی بیرونی دیواروں پر وقت کے مناسب رنگ پھیر دیتے ہو۔ تم بنیادیں بدلتے نہیں مکان کی خارجی ہئیت میں رنگ برنگ کے تغیرات کرتے رہتے ہو۔ تم نے تب بھی یوں کہا تھا کہ ہم مسلمان ہیں اور آج بھی یوں ہی کہنا چاہتے ہو، مگر اس وقت تمہارا نعرہ تھا "ہم ایک مستقل قوم ہیں"۔ اور آج تم خود کو ایک فرقہ کہتے ہوئے بھی جھجکتے ہو ایک اقلیت کہلانا بھی تم پسند نہیں کرتے۔ باوجود اس کے کہ اب سے پہلے بھی تم اپنے کو مسلم کہلواتے تھے اور آج بھی تمہیں اس نام سے ایک مخصوص قسم کی الفت ہے۔ بنیادی طور پر خود کو مسلمان تسلیم کرنا۔ ... پھر "قوم" اور "اقلیت" کے مختلف لباس بدلنا۔ یہ ناموں کا اختلاف اور یہ [illegible] کا تضاد کیا یہ بھی مسلمانوں کی کوئی خاص نوع ہے؟ ایک اصول پر مجتمع ہونے والے

لوگ کیا اس طرح کی رنگتیں بھی بدلا کرتے ہیں؟ ایک مخصوص فکر کی حامل جماعت کبھی اس قسم کے تضاد عمل کا بھی ثبوت دیا کرتی ہے؟ کیا ایک مضبوط و مشترک شعور رکھنے والے لوگ ایسی پریشاں خیالیوں منتشر نیتوں اور بے ضبط زندگیوں کا بھی نمونہ ہوتے ہیں؟

درحقیقت تم نے اس پوری مدت میں کبھی اپنی اصل حیثیت پر غور ہی نہیں کیا۔ تم نے ہمیشہ حقوق طلبیوں اور کرم فرمائیوں کے سائے میں سفر طے کئے ہیں۔ یا پھر وطن اور آزادی کے جھنڈے تلے کچھ قدم اُٹھائے ہیں۔ تم نے اس گذشتہ سو سال کی مدت میں اجتماعی طور سے اس کی طرف توجہ نہیں دی کہ ہم اقلیت اور قومیت کے علاوہ کوئی اور درجہ بھی رکھتے ہیں۔ ہماری زندگیوں پر کسی خاص اجتماعی تصور کا بھی کنٹرول ہے اور ہماری ہیئت ملیہ کا احاطہ کسی عظیم و بسیط فکر نے بھی کر رکھا ہے۔ یا ہماری حیات مجموعی کا دائرہ کچھ مستقل اور پائیدار عناصر سے بھی مرکب ہے! جس جگہ سے ہم سوچتے ہیں وہیں سے فکر کی بنیادوں میں کوئی غیر محسوس اثر نمایاں ہوتا ہے۔ یعنی ہم طبقے اور فرقے کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں۔ "کچھ اور" کا مطلب یہ ہے کہ تم بہرحال "مسلم" ہو اور مسلم ہونا انسان کو اس سے بے نیاز کر دیتا ہے کہ وہ قومیت کا لبادہ اوڑھے یا فرقہ کی پوستین پہنے۔ لیکن افسوس کہ تم نے مسلم نام کو محبوب رکھنے کے بعد بھی قوم اور فرقے کی مروجہ اصطلاحیں مستعار لیں اور ان کو اس طرح چپکا لیا کہ نہ تم قوم ہی بن سکے نہ فرقہ ہو سکے۔ وحدت کے پرستار، اور قومیت کے پجاری، توحید کے قائل اور فرقہ کی پرستش کرنے والے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ نفاق ہے۔ مگر تم ہی اپنے حق میں فیصلہ دو کہ اس کو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔؟

تم مسلمان کے نام سے قوم کے لئے لڑے۔ تم نے اسس نام کو حقوق کی جنگ میں استعمال کیا۔

اور تم اس ٹریڈ مارک کو ہر موقعہ پر استعمال کرتے رہے۔ حالانکہ یہ غریب اصطلاح قوموں کی کشاکش کے لئے نہ تھی۔ اس سے توحق و باطل میں امتیاز مقصود تھا۔ یہ بیکس نام فرقوں اور طبقوں کی آویزش کے لئے کب وجود میں آیا تھا اس کا کام تو فقط خیر و شر کی حدود کا فاصلہ بتانا تھا اس کو تو نیکی اور بھلائی کا ایک پیمانہ بنایا گیا اگر اب مسلم کسی نظام زندگی کے نمائندہ کا نام نہیں بلکہ ملک میں بسنے والے ایک مخصوص فرقے کا نام ہے جو چند تاریخی رسوم و رواج رکھتا ہے۔ (الانصاف، الہ آباد)

تصویروں کے سامنے پوجا:

(ذیل کا مراسلہ معاصر الجمعیۃ کے صفحات میں نکلا ہے)

جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم

گذارش ہے کہ میں آپ کو اپنے اسکول کے ایک واقعہ کی اطلاع کر رہا ہوں۔ برائے کرم اسے بجنسہ اپنے اخبار میں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں

میں آئی سی ایم ہائر سکنڈری اسکول آنا پور (ضلع الہ آباد) کے دسویں درجہ کا ایک معمولی طالب علم ہوں۔ میرے اسکول کے پرنسپل جناب بی ایل صاحب سریواستوا ایم اے نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو شخص فلیگ پریئر FLAGPRAYER اور جے ہند نہ کرے گا، اسے نکال دیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ ایک کمرہ میں دیوتاؤں کی تصویریں بھی ہیں جن کے سامنے پرارتھنا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ایک غیر مذہبی حکومت میں اس قسم کی چیزیں حیرت انگیز ہیں اور پھر لطف یہ کہ پرنسپل صاحب صرف ان ہی چیزوں کو نیشنل ہونے کی علامت سمجھتے ہیں اور انکے خیال میں اس سے محبت بڑھتی ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب ایک شخص کو کسی کام کے لیے مجبور کیا جائے گا تو اسکے دل میں جذبات محبت کیسے نمایاں ہوں گے میرے خیال میں یہ ایسی ہی گمراہی ہے جیسی نمرود اور فرعون کے زمانہ میں پھیلائی گئی تھی۔ (صدق لکھنؤ)

پاکستان میں مسلمانوں کی ترقیاں:

معزز معاصر "کوثر لاہور" (جو ۶ مہینے کی جبری بندش کے بعد حال ہی میں پھر شائع ہونا شروع ہوا ہے) ۱۲ مارچ کی اشاعت میں رقمطراز ہے۔

ایک مقامی روزنامے کا "سٹاف رپورٹر" لاہور کی زندگی کی گہما گہمی اور چہل پہل کے سلسلے میں ایک ڈرامہ کا ذکر کرتا ہے۔ جو لاہور کی "خواتین اسلام" کی جانب سے وائی ایم سی اے ہال میں سٹیج کیا گیا۔ اس ڈرامے کے کرداروں میں چھ سات سال کی بچی نجمہ قیوم بھی تھی، جس نے ناچ دکھا کر داد تحسین حاصل کی "سٹاف رپورٹر" اس ناچ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے

"یوں تو سب کی اداکاری اور بیگم قیوم کی ہدایت کاری اچھی ہے مگر بخمہ قیوم کا ناچ جو چھ یا سات سال کی بچی ہے دل کو بہت بھاتا ہے۔ اس عمر میں جو لڑکی اتنا اچھا ناچ سکتی ہے۔ وہ یقیناً بڑی ہو کر ایک اچھی فن کار بن سکتی ہے"

ایک وقت تھا کہ امت مسلمہ کی آغوش میں سیدہ فاطمہ زہرأ اور رابعہ بصریہؒ ایسی بیٹیاں پرورش پاتی تھیں اور امت کے پیر وجواں ان کی پاکبازی خدا شناسی، بلند کرداری، علم و فضل اور زہد و عبادت پر فخر کرتے تھے۔ لیکن یہ اس دور کی باتیں ہیں جب "وحشت" "تاریکی" اور "رجعت پسندی" کا دور دورہ تھا۔ اب روشنی اور ترقی پسندی کا زمانہ ہے دور وحشت کی باتوں سے اس کا کیا تعلق ہے؟ —— اب تو اس امت کے آغوش میں ایسی بچیاں پروان چڑھ رہی ہیں جو بڑی ہو کر فن کار رقاصائیں بنیں گی اور اپنی قوم کے نوجوانوں کا دل بھانے کا سامان بہم پہنچائیں گی۔

فوجی کمیشن اور پردہ:

"کوثر لاہور" کی اشاعت محولہ بالا ہی میں "اقتباسات" کے زیر عنوان "جہان نو کراچی" سے مندرجہ ذیل شذرہ نقل کیا گیا ہے۔

۲۴ر فروری کے "جنگ" میں فوجی کمیشن کے ایک امیدوار صاحب نے ایک مراسلہ لکھا ہے۔ جب وہ انٹرویو کے لئے بورڈ کے سامنے پیش ہوئے تو انھیں اچانک یہ معلوم ہوا کہ فوجی کمیشن کے حصول کے لئے سب سے اہم سند بیوی کا بے پردہ ہونا ہے اور کسی امیدوار کے فیل ہونے کے لئے اس کی یہ نااہلی بہت کافی ہے کہ اس کی بیوی پردہ کرتی ہے اور اس لئے "غیر سوشل" ہے

امیدوار صاحب نے اپنی ناواقفیت کی وجہ سے جب "بے پردگی" کی سند کے ضروری ہونے کی طرف سے اپنی لاعلمی ظاہر کی تو صدر صاحب نے یہ کہہ کر ان کی اس ناواقفیت کو دور کیا "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے لیڈروں کا اور خاص طور پر وزیر اعظم کا پردہ کے متعلق کیا نظریہ ہے؟"

(کوثر لاہور)

انقلاب عورت

(از حضرت صوفی ایم اے)

افراط کے اونچے ٹیلے پر تفریط کی گہری وادی میں — یا سر پھٹنے کے ساماں ہیں یا مرنے کے بربادی میں

یہ دنیا اور اس دنیا کی تہذیبیں خندق کھائی ہیں — قومیں ان قعروں میں گر گر کے پے در پے مرتی آئی ہیں

وہ واقف ہے اس فطرت سے جو ناظر ہے من ہستی کا — ناواقف انساں کیا جانے یہ راز فراز و پستی کا

جب نوح کا طوفاں برپا ہو جب چار طرف طغیانی ہو — جب کوہ و دمن صحرا و چمن ہر سو پانی ہی پانی ہو

جودی کی اونچی چوٹی پر ڈوبے گا سفینہ کنعاں کا — لیکن کشتی پیغمبر کی ہے ساحل مرد مسلماں کا

اے بیوی! اے بیٹی! اے ماں! اے کشتہ تمدن مغرب کا — او باعصمت! دامن نہ چھٹے زنہار رسول یثرب کا

یہ پیرس [illegible] لندن [illegible] امریکہ میں [illegible] کیا ہوتا ہے — شیطان بدی کا ہنستا ہے نیکی کا فرشتہ روتا ہے

وہ عورت جس کو فطرت نے ماں بننے کی عزت دی ہے — وہ بیوی جس کو قدرت نے دلداری کی دولت دی ہے

تفریط کی وادی میں گر کر وہ عورت لونڈی ہوتی ہے — افراط کے ٹیلے پر چڑھ کر اپنا عورت پن کھوتی ہے

فطرت نے عزت [illegible] عورت کی عورت ہونے میں — لیکن یورپ عزت سمجھا یہ جوہر عزت کھونے میں

[illegible] حق میں دونوں کی ضرورت یکساں ہے — جس منزل [illegible] اس منزل میں عورت [illegible]

[illegible] کرنے سے عدم ترقی ہوتی ہے — در اصل تنزل ہوتا ہے معلوم ترقی ہوتی ہے

فطرت کے عدل مقدس کو جن قوموں نے ٹھکرایا ہے — خود اپنے قصر تمدن کو اپنے ہی ہاتھوں ڈھایا ہے

اک مدت تک یہ بحث رہی آیا عورت انسان بھی ہے — آیا آبادی کے قابل یہ صحرائے ویراں بھی ہے

آیا عورت کے قالب میں [illegible] انسانی روح بھی ہے — اس بحر فنا کی کشتی میں دیکھو تو کوئی نوح بھی ہے

عورت [illegible] — دیدوں کے علموں کے قابل اس کے قالب میں روح نہیں

عورت سے تعلق رکھنے پر بدھ مذہب میں نرواں نہیں
شوہر یا بیوی بننے کا بدھ مذہب میں امکان نہیں

عورت امثال نصاریٰ میں افعال گنہ کی بانی ہے
عورت دنیائے یہودی میں ایک تخلیق شیطانی ہے

یونان کے حکمت خانے میں عورت شایان علم نہ تھی
فطرت کی طرف سے ہی گویا عورت میں شان علم نہ تھی

ایران کی عورت ساغر تھی مصری عورت پیمانہ تھی
روما کے محلوں کی دیوی میخواروں کا میخانہ تھی

صدیوں کے دور غلامی میں عورت احساس مٹا بیٹھی
اپنے ہم خلقت شوہر کو اپنا معبود بنا بیٹھی

سب میں پت ورتا کہلائے عورت دکھیا کو ناز یہ تھا
شوہر کی پرستش کرتی تھی اس لعنت کا اعجاز یہ تھا

اپنے شوہر کی داسی ہو ہندی عورت کا دھرم یہ تھا
تو ظلم سہے منہ سے نہ کہے اس کا معیار شرم یہ تھا

جب بیٹی پیدا ہوتی تھی چہرہ کالا پڑ جاتا تھا....
اک باپ وفور ذلت سے بس دھرتی میں گڑ جاتا تھا

احساس رذالت سے لڑکی مٹی میں دبا دی جاتی تھی
دنیا سے نشانی ذلت کی اس طرح مٹا دی جاتی تھی

سسرالی رشتے ناتے سب سامان ننگ و عار ہوئے
لڑکی والے سسرے سالے اس درجہ ذلیل و خوار ہوئے

عورت کو جب اس ذلت پر ان بیدردوں نے پہونچایا
تب غیب سے عورت کا حامی اسلام کا پیغمبر آیا

وہ بیواؤں کا ناصر تھا وہ مسکینوں کا یاور تھا
وہ تھا عورت کا رکھوالا وہ مردوں کا پیغمبر تھا

اس نے آکر سب مردوں کو ایسا پیغام سنایا تھا
جس نے عورت کے غاصب کو اس کا قوام بنایا تھا

تدریجاً سارے عالم کا اس نے ماحول بدل ڈالا
اس نے الہامی یورش سے رسموں کا ملک کچل ڈالا

پہلے ذہنوں کو جلا بخشی پھر اصلاح ذہنیت کی
پھر کی تبلیغ حکیمانہ عورت کے حقوق و عزت کی

جو سوئے ہوئے تھے جاگ اٹھے جو جاہل تھے ہشیار ہوئے
عورت ہی نہیں حیوانوں کو حق دینے پر تیار ہوئے

اب سمجھے عورت انسان ہے مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ پڑھ کر
خود بھی گرنے سے باز رہے عورت کو تھام لیا بڑھ کر

قوموں میں آج زباں زد ہیں الفاظ حقوق نسواں کے
یہ بھولے ہوئے افسانے ہیں اسلامی عہد و پیماں کے

مِمَّا اکْتَسَبُوْا والے سمجھے رازِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثیٰ
ایمان و عمل میں یکساں ہے رتبہ ہر مرد و عورت کا

ہمدوش بنایا مردوں کا عورت کو اٹھا کر پستی سے
اب عورت بھی آگاہ ہوئی دنیا میں اپنی ہستی سے

عورت کو یوں آزاد کیا پھر دونوں کو پابند کیا
دونوں کو باہم حق دے کر پابند چون و چند کیا

پیدا پھر بھی ہونے نہ دیا وہ جذبہ خودسر ہونے کا
جس سے مفہوم بدل جائے دونوں کے برابر ہونے کا

جو شور تساوی برپا ہے شوریدہ سری ہے دونوں کی
ہر طرح مساوی کہہ دینا اک بے خبری ہے دونوں کی

انقلابِ عورت

(از حضرت صوفی ایم اے)

افراط کے اونچے ٹیلے پر تفریط کی گہری وادی میں
یا سر پھٹنے کے ساماں ہیں یا مرنے کی بربادی میں

یہ دنیا اور اس دنیا کی تہذیب میں خندق کھائی ہیں
تو ہیں ان قعروں میں گر گر کے در پے مرتی آئی ہیں

وہ واقف ہے اس فطرت سے جو فاطر ہے جس ہستی کا
ناواقف انساں کیا جانے یہ راز فراز و پستی کا

جب نوح کا طوفان برپا ہو جب چار طرف طغیانی ہو
جب کوہ و دمن صحرا و چمن ہر سو پانی ہی پانی ہو

جودی کی اونچی چوٹی پر ڈوبے گا سفینہ کنعان کا
لیکن کشتی پیغمبر کی ہے ساحل مردِ مسلمان کا

اے بیوی! اے بیٹی! اے ماں! اے ملکۂ تمدنِ مغرب کا
او باعصمت! دامن نہ چھٹے زنہار رسولِ یثرب کا

پیرس لندن امریکہ میں [illegible] کیا ہوتا ہے
شیطان بدی کا ہنستا ہے نیکی کا فرشتہ روتا ہے

[illegible] عورت جس کو فطرت نے [illegible] عزت دی ہے
وہ بیوی جس کو قدرت نے دلداری کی دولت دی ہے

تفریط کی وادی میں گر کر وہ عورت لونڈی ہوتی ہے
افراط کے ٹیلے پر چڑھ کر اپنا عز و شرف کھوتی ہے

فطرت نے عزت بخشی ہے عورت کی عورت ہونے میں
لیکن یورپ نے عزت سمجھا جوہرِ عزت کھونے میں

تعمیر تمدن کے حق میں دونوں کی ضرورت یکساں [illegible]
جس منزل میں ہے مرد رواں اس منزل میں عورت ساتھ ہو

معکوس [illegible] ترقی ہوتی ہے
دراصل تنزل ہوتا ہے معلوم ترقی ہوتی ہے

فطرت کے محلِ مقدس کو جن قوموں نے ٹھکرایا ہے
خود اپنے قصرِ تمدن کو اپنے ہی ہاتھوں ڈھایا ہے

اک مدت تک یہ بحث رہی آیا عورت انسان بھی ہے
آیا آبادی کے قابل یہ صحرائے ویران بھی ہے

آیا عورت کے قالب میں روحِ انسانی رہتی بھی ہے
اس بحرِ زنا کی کشتی میں دیکھو تو کوئی نوح بھی ہے

عورت پہ ابھی دروازہ [illegible] مفتوح ہے
دہریوں کے علموں کے قابل اس کے قالب میں روح نہیں

عورت سے تعلق رکھنے پر بدھ مذہب میں نرواں نہیں
شوہر یا بیوی بننے کا بدھ مذہب میں امکان نہیں

عورت امثالِ نصاریٰ میں افعالِ گنہ کی بانی ہے
عورت دنیائے یہودی میں اک تخلیق شیطانی ہے

یونان کے حکمت خانے میں عورت شایانِ علم نہ تھی
فطرت کی طرف سے ہی گویا عورت میں شانِ علم نہ تھی

ایران کی عورت ساغر تھی مصری عورت پیمانہ تھی
روما کے محلوں کی زینت میخواروں کا میخانہ تھی

صدیوں کے دورِ غلامی میں عورت احساس مٹا بیٹھی
اپنے ہم خلقت شوہر کو اپنا معبود بنا بیٹھی

سب میں پت ورتا کہلائے عورت دکھیا کو ناز یہ تھا
شوہر کی پرستش کرتی تھی اس لعنت کا اعجاز یہ تھا

اپنے شوہر کی داسی ہو ہندی عورت کا دھرم یہ تھا
شوہر ظلم سہے منہ سے نہ کہے اس کا معیارِ شرم یہ تھا

جب بیٹی پیدا ہوتی تھی چہرہ کالا پڑ جاتا تھا....
اک باپ وفورِ ذلت سے بس دھرتی میں گڑ جاتا تھا

احساسِ رذالت سے لڑکی مٹی میں دبا دی جاتی تھی
دنیا سے نشانی ذلت کی اس طرح مٹا دی جاتی تھی

سسرالی رشتے ناتے سب سامانِ ننگ و عار ہوئے
لڑکی والے سسرے سالے اس وجہ ذلیل و خوار ہوئے

عورت کو جب اس ذلت پر ان بیدردوں نے پہونچایا
تب غیب سے عورت کا حامی اسلام کا پیغمبرؐ آیا

وہ بیواؤں کا ناصر تھا وہ مسکینوں کا یاور تھا
وہ تھا عورت کا رکھوالا وہ مردوں کا پیغمبر تھا

اس نے آ کر سب مردوں کو ایسا پیغام سنایا تھا
جس نے عورت کے غاصب کو اس کا قوام بنایا تھا

تدریجاً سارے عالم کا اس نے ماحول بدل ڈالا
اس نے الہامی یورش سے رسموں کا ملک کچل ڈالا

پہلے ذہنوں کو جلا بخشی پھر اصلاحِ ذہنیت کی
پھر کی تبلیغ حکیمانہ عورت کے حقوق و عزت کی

جو سوئے ہوئے تھے جاگ اٹھے جو جاہل تھے ہشیار ہوئے
عورت ہی نہیں حیوانوں کو حق دینے پر تیار ہوئے

اب سمجھے عورت انساں ہے مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ پڑھ کر
خود بھی گرنے سے باز رہے عورت کو تھام لیا بڑھ کر

قوموں میں آج زباں زد ہیں الفاظ حقوقِ نسواں کے
یہ بھولے ہوئے افسانے ہیں اسلامی عہد و پیماں کے

مِمَّا اكْتَسَبُوا والے سمجھے رازِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى
ایمان و عمل میں یکساں ہے رتبہ ہر مرد و عورت کا

ہمدوش بنایا مردوں کا عورت کو اٹھا کر پستی سے
اب عورت بھی آگاہ ہوئی دنیا میں اپنی ہستی سے

عورت کو یوں آزاد کیا پھر دونوں کو پابند کیا
دونوں کو باہم حق دے کر پابند چون و چند کیا

پیدا پھر بھی ہونے نہ دیا وہ جذبہ خود سر ہونے کا
جس سے مفہوم بدل جائے دونوں کے برابر ہونے کا

جو شورِ فسادی برپا ہے شوریدہ سری ہے دونوں کی
ہر طرح مساوی کہہ دینا اک بےخبری ہے دونوں کی

مردوں میں زور و صلابت ہے عورت میں ضعف و نزاکت ہے
مردوں میں جوش و تشدد ہے عورت میں جذب و لطافت ہے

اعضا کی ساخت جداگانہ کردار جدا اطوار جدا
آواز جدا انداز جدا رفتار جدا گفتار جدا

احوال جدا امراض جدا صحت کا طرز جداگانہ
اس سعی و عمل کی دنیا میں خدمت کا طرز جداگانہ

فطرت نے مرد و عورت کو جیسی اہلیت بخشی ہے
اس اہلیت کے تقاضے سے ویسی ہی خدمت بخشی ہے

عورت میں جذب و نزاکت ہے یہ اس کا حسن فطرت ہے
عورت کو مرد بنانے کی کوشش فطرت سے بغاوت ہے

عورت کو کھیل بناؤ نہیں۔ مردو! تم کو غیرت کی قسم
غاصب نہ بنو بیچاری کے تم کو اپنی ہمت کی قسم

اللہ کی بندی بہر خدا تو بھی تھوڑا سا ہوش میں آ
کچھ سوچ سمجھ کر پاؤں اٹھا للہ نہ اتنا جوش میں آ

افراط سے بچ تفریط سے بچ فطرت کا عدل نہ کھو جائے
تو اپنی اوج ترقی میں پستی کی گرو نہ ہو جائے

تو بزم طرب کی گردش میں پیمانۂ دل ہو جائے گی
فانوس حیا کی شمع ہے تو جھونکوں میں گل ہو جائیگی

[illegible] سلیمانی! تو نور حرم عزت بن
اے ملک حیا کی سلطانہ بلقیس سبائے عفت بن

[illegible] عفت اے حور ہوئی سلطانہ تھی مزدور ہوئی
سامان سکون شوہر تھی اب خود ہی تھک کر چور ہوئی

تو اپنی ذات میں عورت تھی جب مرد بنی عورت نہ رہی
جب مرد بنی تب حق پایا پر عورت کی عزت نہ رہی

در اصل تجھے کچھ نہ ملا مردانہ حق مردانہ تو
شوہر نہ بنی بیوی نہ رہی کس درجہ ہوئی دیوانہ تو

کیا غیرت ہے بازاروں میں مزدور بنا کر لا ڈالا
اس مرد نے جس کو فطرت نے ٹھہرایا تیرا رکھوالا

جب روپ بھرا اک عورت نے جب مرد بنی اک نا عورت
تب وہ عزت دی مردوں نے جو اسکے حق میں ہے ذلت

قسام ازل کی قسمت میں یہ عیب نمائی خوب نہیں
اے عورت نا عورت بننا کیا تیرے لئے معیوب نہیں

ہاں گر کے عروج عورت سے تو مردوں میں کھو جائیگی
تو مرد نہیں بن سکتی ہے ہاں خوار و زبوں ہو جائیگی

کیا عورت بننا ذلت ہے اب ہوش میں آ مخمور نہ بن
تو بیوی بن جنجال نہ بن تو مادر بن مزدور نہ بن

صوفی کیا کہنا عورت کا عورت ہے گھر کی سلطانہ
عورت فطرت کا جلوہ ہے مرد اس جلوہ کا پروانہ

يُهْدِي لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۶ نمبر (۶) بابت ماہ جمادی الاخری سنہ ۱۳۶۸ھ

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مُدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھیے! "الفرقان" اور "کتبخانہ الفرقان" بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں
لہذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھیے!
دفتر "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ (یو-پی)

چندہ سالانہ چار روپیہ　　　　نمونہ کا پرچہ چھ آنہ

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

کتب خانہ الفرقان میں

مفید دینی اور اصلاحی کتابوں

اس کے علاوہ

مسئلہ ایصال ثواب (از مدیر الفرقان)

جلد (۱۶) | بابتہ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۸ھ | نمبر (۶)

ناظرینِ کرام سے!

جن حضرات کی نظر سے الفرقان گزرتا رہتا ہے یا یہی پرچہ جنکے ملاحظہ سے گزرے اُن سے گذارش ہے کہ اگر آپ یہ محسوس فرماتے ہیں اور آپ کا دل گواہی دیتا ہے کہ الفرقان کے ذریعہ جو دینی دعوت دی جارہی ہے وہ حق اور صحیح ہے اور دنیا و آخرت میں ہماری حیات و نجات اس پر موقوف ہے تو پھر آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس دعوت کو اپنی دعوت اور اس پیام کو اپنا پیام بنا کر اللہ کے دوسرے بندوں تک پہنچائیں جس کی بہت آسان اور نہایت مفید اور موثر شکل یہ بھی ہے کہ اپنا الفرقان آپ دوسروں کو دکھلائیں اور مجلسوں، مسجدوں میں اور دوسرے مناسب مقامات پر اس کے خاص خاص دعوتی اور اصلاحی مضامین پڑھ پڑھ کر سنا دیں۔

یقین کیجئے! کہ دعوت و تبلیغ انبیاء علیہم السلام کی خاص نیابت و وراثت اور اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اور اس کام کے کرنیوالوں کیلئے اللہ کے فرشتے بھی خاص طور سے دعائیں کرتے ہیں۔ والسلام

(محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ)

یہاں سُرخ نشان ▭ اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے حساب سے آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے لہٰذا آئندہ کیلئے اپنا چندہ منی آرڈر سے روانہ فرما کر ممنون فرمائیے (اسی لئے منی آرڈر فارم بھی جناب کو بھیجا جا رہا ہے) اگر اگلے رسالہ کی اشاعت تک چندہ وصول نہ ہوا تو حسبِ قاعدہ اگلا پرچہ وی پی حاضرِ خدمت ہوگا۔ ناظم الفرقان لکھنؤ

باسمہ سبحانہ حمداً و سلاماً

نگاہِ اوّلیں!

پاکستان میں "اسلامی حکومت" کی بُنیاد

ہمارے پُرانے ناظرین کو یاد ہوگا کہ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ کے الفرقان میں اُن جانی مالی اور دینی نقصانات و مصائب کا تذکرہ کرتے ہوئے جو تقسیم ہند کی تحریک اور پاکستان کے قیام کے سلسلے میں ہندوستانی مُسلمانوں کو اُٹھانے پڑے ——— "نگاہِ اوّلیں" ہی کے صفحات میں ——— ہم نے لکھا تھا ——— کہ

> اگر پاکستان میں درحقیقت اسلامی حکومت قائم ہوتی ہے جس کی بنیاد اللہ و رسولؐ کے احکام اور کتاب و سنّت کی رہنمائی پر رکھی جاتی ہے تو پھر یہ جو کچھ ہوا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو جو بے حساب بے شمار جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا ہمارے نزدیک وہ کچھ زیادہ رنج و غم کے قابل نہیں! بلکہ اس راہ میں اگر اور بھی قربانیاں دینی پڑیں تو صبر و ثبات کے ساتھ ہمیں اُن کا استقبال کرنا چاہئے۔ ایمان کے بازار میں یہ متاع اتنی ہی گراں ہو کہ سب کچھ نثار کر دینے کے بعد بھی یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎
>
> نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

ایسے اٹھارہ مہینے پہلے ان سطروں میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ کوئی وقتی جذباتی بات نہ تھی، بلکہ ایک سوچی سمجھی ہوئی سنجیدہ ایمانی حقیقت تھی ——— خدا کا شکر ہے کہ اب اسکے کچھ آثار (صرف آثار) نظر آنے لگے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو اور کسی وقت حقیقی معنی میں وہ ایسا "دارالاسلام" بن جائے جہاں کا نظام و دستور اللہ کے احکام کے مطابق ہو اور جہاں کے مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی اسلامی اصول و تصورات کے ماتحت گذرتی ہو۔

---

۱۲ مارچ کو پاکستان دستور ساز اسمبلی نے دستور کیلئے جو بنیادی قرارداد منظور کی ہے، اگرچہ اسمیں ——— جیسا کہ چاہئے تھا ——— اسلامی نظام و دستور کے بارے میں بہت صاف اور واضح اعلان نہیں ہے، لیکن اس کیلئے ایک قانونی بنیاد ضرور قائم ہو گئی ہے ——— قرارداد کا متن ہمارے اکثر ناظرین اگرچہ اخبارات میں

پڑھ چکے ہوں گے، مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم اس کا وہ ابتدائی حصہ جو اسلامی نظام کے قیام کی بنیاد بن سکتا ہے "الفرقان" کے فائل میں بھی محفوظ کر دیا جائے۔ وہو ہذا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"چونکہ پوری کائنات کی حاکمیت اور فرمانروائی خدائے برتر کیلئے ہے اور اقتدار جو اُس نے اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کیلئے ریاست کے باشندوں کی وساطت سے ریاستِ پاکستان کی طرف منتقل کیا ہے ایک مقدس امانت ہے، اسلئے جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلس دستور ساز طے کرتی ہے کہ آزاد و مختار ریاستِ پاکستان کیلئے ایک دستور بنائے ــــ جسمیں ریاست اپنے اختیارات اور اقتدار کو جمہور کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ استعمال کریگی ــــ جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری، اور اجتماعی عدل و انصاف کے اصولوں کی جیساکہ اسلام نے انکی توضیح کی ہے پابندی کیجائیگی ــــ جسمیں مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائیگا کہ وہ اپنی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کو قرآن اور سنت کی بتلائی ہوئی اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق منظم کرسکیں ــــ جسمیں اقلیتوں کو آزادانہ طور پر اپنے مذہب پر قائم رہنے اور عمل پیرا ہونے اور اپنی تہذیبوں کو نشو و نما دینے کیلئے موزوں اور ضروری گنجائش رکھی جائیگی۔"

جیساکہ ہم نے اوپر بھی عرض کیا یہ واقعہ ہے کہ اس بنیادی قرارداد کو اپنے مقصد میں جیسا صاف اور واضح ہونا چاہئے تھا یہ ویسی نہیں ہے اور اس میں کافی ابہام باقی ہے اور اسلئے بدنیتوں کے گریز کیلئے اس میں بہت سے چور دروازے باقی رہ گئے ہیں، لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے موجودہ ارباب اقتدار سے ہمیں اتنے کی بھی اُمید نہ تھی۔ اسلئے ہم خوش ہیں اور دل سے اللہ کے شکر گزار ہیں کہ اُسنے پاکستان کی دستور ساز کو اسکی توفیق دی ــــ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ــــ لیکن ہماری اس مسرت اور خوشی کی تکمیل کا اصلی دن وہ ہوگا جس دن ہم دیکھیں گے کہ ایمان و اسلام کی بنیاد پر دیانت داری کیساتھ پاکستان کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا اور قانون کا اصلی ماخذ کتاب و سنت کو عملاً بھی تسلیم کرلیا گیا۔

اہلِ دین کی ذمہ داری:-

اسکے بعد پاکستان کے اُن تمام بندگانِ خدا سے جو اللہ کے دین سے واقعی اور سچی محبت رکھتے ہیں اور

ایک مومنِ صادق کی طرح جنکی یہ دلی خواہش ہو کہ پاکستان حقیقی معنی میں ایک اسلامی ملک بنے جسمیں شجرِ اسلام پھر سے سرسبز ہو، اسلام کے نام لیوا اہم دور افتادوں کی یہ نیاز مندانہ گذارش ہو کہ آپ حضرات اب مسلمانوں کی زندگی کو حقیقی اسلامی زندگی بنانے کی مہم کی طرف پوری عزیمت کیساتھ متوجہ ہوں اور قوم کے عوام میں یہ اصلاحی اور ایمانی انقلاب برپا کرنے کیلئے اللہ کی دی ہوئی اپنی پوری طاقتوں کو لگا دیں اور تمام جماعتی تعصبات اور اصطلاحی امتیازات سے بالاتر ہو کر پورے تعاون کیساتھ اس مہم کے سر کرنے کیلئے جان کی بازی لگا دیں — کسی ملک کے "اسلامی ملک" بننے اور اسلامی نظام کے وہاں قائم ہونے اور چلنے کا سارا انحصار اسی پر ہے کہ وہاں کے عام مسلمان حقیقی مومن و مسلم ہوں اور اُن کی زندگی ایمان والی زندگی ہو۔

ہمارے پرانے ناظرین کو یاد ہو گا کہ شوال ۱۳۶۶ھ کے "الفرقان" میں اسی موضوع پر کلام کرتے ہوئے، راقم سطور نے لکھا تھا کہ :-

"اس حقیقت سے ہمیں چشم پوشی نہ کرنا چاہئے کہ کسی ملک میں اسلامی نظامِ حکومت جب ہی چل سکتا ہے کہ وہاں کی عام مسلم آبادی پوری پوری مسلمان ہو — جس کا مطلب یہ ہو کہ اُنمیں حقیقی اور شعوری ایمان عام ہو، دین کا ضروری علم و عمل عام ہو، اللہ کا خوف اور آخرت کے حساب کتاب کی فکر عام ہو، اُنکے اعمال و اخلاق میں اسلامی رنگ غالب ہو، اور اُنکا چال چلن اور برتاؤ بڑی حد تک اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو، غرض پرستی اور نفس پروری کے بجائے خدا پرستی اور دین کی پیروی اُن کا اصول ہو، اور دنیا کے مقابلے میں آخرت کی اہمیت اُنکی نظروں میں زیادہ ہو — جب تک عام و خاص مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر یہ دینی انقلاب نہ ہو "اسلامی نظام" جس کا نام ہے نہ وہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ چل سکتا ہے — اسلامی نظامِ حکومت کا قیام، اپنی شرائط اور اپنے طریقہ کے لحاظ سے بھی دوسرے حکومتی نظاموں سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا کہ وہ اپنی حقیقت اور اپنی رُوح کے لحاظ سے اُن سے مختلف ہے۔

اللہ کے جن بندوں کو ان امور کی معرفت و بصیرت کچھ حاصل ہے اور ان چیزوں پر غور و فکر کی صلاحیت جنھیں بخشی گئی ہے انھیں ایک لمحہ کیلئے بھی اسمیں شک نہیں ہو سکتا کہ اگر بالفرض پاکستانی حکومت کے اہل حل و عقد اسلامی نظام قائم کرنے کا اس وقت فیصلہ بھی کر لیں مگر وہ خود ویسے ہی ہیں جیسے کہ وہ آج ہیں، اور وہاں کے عام مسلمان بھی اسلامی زندگی سے اسی طرح عاری رہیں جیسے کہ وہ

مذ رہتے ہیں تو اسلامی نظامِ حکومت اوّل تو قائم نہیں ہو سکتا، اور اگر کسی طرح قائم کر ہی لیا جائے تو چند روز بھی اطمینان و استقلال سے چل نہیں سکتا ——— اسلامی نظام کے قیام کی پہلی شرط صالح قوم اور صالح ماحول کا وجود ہے، اسکے بغیر اسکے قیام کا تخیل اور اسکی اُمید اتنی ہی غلط ہے جتنی کہ دوزخ کی گرم اور زہر بھری زمین میں جنت کے درختوں کے اُگنے اور پھولنے پھلنے کی توقع غلط ہے"

اسلئے پاکستان کے تمام محبانِ دین سے، خاصکر بزرگانِ دین اور خادمانِ دین سے (خواہ اُنکا تعلق کسی جماعت، کسی ادارہ اور کسی حلقہ سے ہو یا کسی سے بھی نہ ہو) پورے ادب، اخلاص اور دینی درد کیساتھ التماس ہے کہ "پاک دستور ساز" کی اس بنیادی قرار داد کے بعد آپکا اہم فرض یہ ہے کہ اپنی ساری طاقتیں پاکستان کے عام مسلمانوں میں اسلامی زندگی کے احیاء پر لگادیں ——— اگر اللہ کی مدد و توفیق سے آپنے یہ کام کر لیا تو یقین کیجئے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کا ایک نمونہ انشاء اللہ قائم ہو جائے گا اور کیا عجب کہ مستقبل میں وہی اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا ذریعہ بن جائے ——— اور اگر یہ کام نہ ہو سکا تو اسمیں ذرہ برابر شک نہیں کہ اس "قرار دادِ مقاصد" کے باوجود پاکستانی حکومت عملاً مغربی حکومتوں کے نمونہ کی ایک غیر اسلامی حکومت ہی رہیگی، ہاں اربابِ حکومت کو جب تک ضرورت رہے گی لیبل اور بورڈ "اسلامی حکومت" ہی کا لگے گا۔

بہرحال پاکستان کے "اسلامی حکومت" بننے اور اللہ کے احکام کے مطابق وہاں کا نظامِ حکومت چلنے کا سارا انحصار اس پر ہے کہ وہاں کے عوام میں صحیح اسلامی شعور اور حقیقی ایمانی زندگی پیدا ہو ——— اور بظاہر اسباب اس کا امکان صرف اسی صورت میں ہے کہ پاکستان کے تمام دیندار عناصر، جماعتیں، ادارے اور افراد پورے تعاون اور اتحاد کے ساتھ، اُن تمام طریقوں اور ذریعوں سے اس کیلئے کوشش کریں جو اللہ نے انھیں دے رکھے ہیں اور اس مقدس جد و جہد میں پیغمبرانہ حکمتِ عملی سے پوری پوری رہنمائی حاصل کریں۔

اس موقع پر ایک اصولی اور بنیادی بات طریقِ کار کے متعلق بھی عرض کر دینے کو جی چاہتا ہے:۔

جس طرح ہر درخت میں پھول پتیاں اور شاخیں ہوتی ہیں اور ایک جڑ بھی ہوتی ہے اور درخت کا سرسبز اور ہرا بھرا رہنا اس پر موقوف ہوتا ہے کہ جڑ میں کوئی روگ نہ ہو اور وہ شاداب ہو ——— اسی طرح دین کے احکام تو اگرچہ سیکڑوں ہزاروں ہیں لیکن کچھ چیزیں وہ ہیں جو دین میں جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اور اگر اُن بنیادوں میں زندگی اور تازگی پیدا کر دی جائے تو اسلامی زندگی کے برگ و بار آپسے آپ پیدا ہو جائیں۔

ان میں سب سے پہلی چیز اور گویا اصل الاصول ہے حقیقی اور شعوری ایمان، اور مرنے کے بعد والی زندگی کی فکر ———

موجودہ مسلمانوں میں بہت بڑی تعداد ایسے افراد کی ہے جو غفلت کی وجہ سے فکر آخرت سے بالکل خالی ہیں اور بعضوں نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا ہوگا کہ انکے مومن و مسلم ہونے کی حقیقت کیا ہے اور ایمان ان سے کیا چاہتا ہے ــــ پس سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ مسلمان قوم میں زبردست اور ہمہ گیر جد و جہد کے ذریعہ ایمانی شعور کو بیدار کیا جائے اور آخرت کی فکر کو انکی سب سے بڑی فکر بنایا جائے اور کوشش کی جائے کہ کوئی مسلمان ایسا باقی نہ رہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ "لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" میں اُس نے کس چیز کا اقرار و اعلان کیا ہے اور جس کو یہ فکر نہ ہو کہ مرنے کے بعد مجھے خدا کے سامنے جانا ہے اور اپنی پوری زندگی کا حساب دینا ہے۔

ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالیوم الآخر کے بعد دوسری چیز جسمیں دینی زندگی بابرگ و بار پیدا کرنے کی خاص تاثیر اور طاقت ہے، وہ نماز ہے۔ بشرطیکہ حقیقی نماز ہو۔ پس اصلاحی کوشش کے سلسلے کا دوسرا کام یہ ہو کہ مسلمانوں میں حقیقی نماز کو عام کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے۔ تیسری چیز یہ ہو کہ مسلمانوں میں دین کی طلب، دین کی ترقی کا شوق اور دین سیکھنے کی فکر کو عام کیا جائے ــــ واضح رہے کہ دین سیکھنے سے ہماری مراد صرف احکام و مسائل کا معلوم کر لینا ہی نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقتِ دین حاصل کرنے کی فکر اور اسکے شوق کو مسلمانوں میں عام کرنے کی جد و جہد کیجائے۔ اسمیں بقدرِ ضرورت احکام و مسائل کا علم حاصل کرنا بھی داخل ہے، اور دینی صفات و ایمانی جذبات کا پیدا کرنا بھی۔ جس کا خاص ذریعہ اللہ والوں کی صحبت اور اللہ کے ذکر و فکر کی کثرت ہے۔

یہ تین بنیادی چیزیں جس جس درجے میں اور جس پیمانے پر مسلمانوں میں عام ہوتی جائینگی، انشاء اللہ اسی رفتار سے اُنکی زندگی اسلامی اور ایمانی زندگی بنتی جائیگی ــــ لیکن ان بنیادی چیزوں کے مسلمانوں میں عام کرنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں ہے کہ دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام ہو جو پوری قوم کا احاطہ کر سکے، اور کسی عمر اور کسی پیشے اور کسی مشغلے والے مسلمان کو بھی نہ چھوڑے۔ حتیٰ کہ دیہات کے بے پڑھے کسان اور مزدور بھی اُس سے بے تعلق نہ رہ سکیں، اور جسمیں ہر طبقے اور ہر صلاحیت کے افراد کی دینی ترقی اور تکمیل کا سامان و انتظام ہو۔

طریقۂ کار کے متعلق یہ صرف مختصر اشارات ہیں، اس مقصد کیلئے ہم جس تفصیلی پروگرام پر یقین رکھتے ہیں وہ "دعوت اصلاح و تبلیغ" کے سلسلے کے مستقل رسالوں اور مقالوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

واللہ الموفق وھو المستعان

ہندوستانی مسلمانوں کا دینی مستقبل

(از- محمد منظور نعمانی)

ان صفحات میں جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے اُس کی حیثیت صرف ایک مضمون اور مقالہ کی نہیں ہے بلکہ سوچنے سمجھنے والے اور دین کا درد رکھنے والے مسلمانوں کیلئے فکر و عمل کی یہ ایک اہم دعوت ہے لہٰذا اسی حیثیت سے اس پر غور فرمایا جائے ——————— !

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مستقبل میں ہندوستانی مسلمانوں کے اپنے دین پر قائم رہنے کے مسئلہ کی اب جو خاص نوعیت ہو اُس کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انگریزی اقتدار کی پچھلی ایک صدی میں ہندی مسلمانوں کے دین و ایمان اور ان کی سیرت میں جو غیر معمولی فرق آگیا ہے اور جو دینی کمزوریاں اور اخلاقی بیماریاں ان کے مختلف طبقات میں پیدا ہو گئی ہیں پہلے اُن کو نظر کے سامنے رکھ لیا جائے :

مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت مسلمانوں کی حالت

مغلیہ حکومت کا چراغ گل ہونے کے بعد جب اُس کی جگہ انگریزی اقتدار نے لی تھی تو اگرچہ اُس وقت اس ملک کے عام مسلمانوں کی حالت دینی اور اخلاقی لحاظ سے کچھ زیادہ اچھی نہ تھی بلکہ معصیات و منکرات اور بہت سی بدعات و خرافات میں وہ بکثرت مبتلا تھے اور بہت بڑی تعداد عوام میں ایسے ہی لوگوں کی تھی جو دین کے اصول و احکام سے جاہل اور صلاح و تقوے سے خالی تھے لیکن اس کے باوجود چند چیزیں اُن میں ویسی بھی تھیں جو ان حالات میں بھی مرتے دم تک اُن کو اسلام کا حلقہ بگوش اور ملتِ اسلامیہ سے وابستہ رکھنے کے لئے کافی تھیں اور نازک سے نازک حالات میں بھی اُن کے ارتداد یا دین سے انحراف کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔

عقائد میں پختگی | ان میں سے ایک چیز تو یہ تھی کہ مسلمانوں میں اُس وقت جو جاہل اور فاسق بھی

بھی تھے ان کو بھی اسلام کے بنیادی عقیدوں میں کسی قسم کا ٹک شبہ نہیں تھا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ حیثیت، وحی و رسالت اور قیامت و آخرت پر انھیں پورا یقین تھا اور وہ دل سے اس پر اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ کے نزدیک مقبول اور نجات دلانے والا مذہب صرف اسلام ہے۔

اسلام کی عظمت و رفعت اور کفر کی حقارت و ذلت کا احساس و یقین

دوسری بات یہ تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی اقتدار کا زمانہ چونکہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا (اور آپ جانتے ہیں کہ اس کے بہت سے آثار تو انگریزی دور میں بھی مدتوں تک باقی رہے) اس لئے اسلام کی فوقیت اور برتری ایمان اور عقیدہ کے علاوہ گویا ان کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بھی تھا اور اسلام کے مقابلے میں کفر کو حقیر و ذلیل جاننا اور اللہ کے نزدیک اس کو مبغوض و ملعون سمجھنا اُن کا وہ عقیدہ اور وہ یقین تھا جس کا دل دماغ سے نکلنا قریباً محال تھا۔

دینی غیرت اور اسلامی حمیّت

تیسری بات یہ تھی کہ اُن میں سے جو فاسق و فاجر بھی تھے اُن میں بھی ایک درجہ کی دینی غیرت اور اسلامی حمیّت عموماً موجود تھی جس کی وجہ سے اُن سے کوئی ایسا کام نہیں کرایا جا سکتا تھا جس سے کفر کے مقابلے میں اسلام کے وقار کو نقصان پہنچتا ..... اور قوم میں اتنا احساس زندہ تھا کہ اگر کوئی فرد ایسی کوئی حرکت کرتا جس سے اسلام کے مقابلہ میں [illegible] کی تائید اور ترجیح ہوتی تو سوسائٹی میں وہ شخص منھ دکھانے کے قابل نہ رہتا اور اُس کے عزیز قریب بھی اُس کو ذلیل سمجھتے۔

اغراض کیلئے عقیدہ اور ضمیر کے خلاف کچھ کرنا سخت عیب تھا

چوتھی چیز یہ تھی کہ کسی ذاتی غرض کے لئے اور کسی نفع کے لالچ میں عقیدہ اور ضمیر کے خلاف کوئی کام کرنا اور خصوصاً کسی نوکری یا کسی عہدہ کے لئے اپنی دینی اور قومی خصوصیات کو قربان کر دینا بہت بڑا عیب اور غیر شریفانہ فعل سمجھا جاتا تھا۔

علماء میں علمی اور دینی رسوخ اور سیرت کی بلندی

پانچویں خصوصیت اس دور کی یہ تھی کہ اُس وقت دین کی نمائندگی کرنیوالے اور مسلمانوں کی دینی رہنمائی کرنے والے جو علماء ربانی تھے اُنکی تعداد تو اگرچہ بہت زیادہ نہ تھی لیکن اُن کا علم گہرا اور پختہ تھا، اور صلاح و تقویٰ اور دین میں استقامت اور سیرت کی پاکیزگی و بلندی اُن کی عام صفت تھی، اور اس لئے عوام پر اُن کا

ایک خاص اثر تھا اور اُن کی بات میں بڑا وزن اور اُن کے فتوے میں بڑی طاقت تھی۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ اس دور میں یہ علماء ربانی ہی پوری قوم کے قائد اور مسلمہ رہنما تھے اور پوری قوم اُن کے ساتھ اور اُن کے پیچھے تھی ——— اور جیسا کہ عرض کیا گیا ان علماء کرام میں زیادہ تر ایسے تھے جو علم میں بھی راسخ و کامل تھے اور دوسری طرف سیرت میں بھی نبوت کے وارث تھے، پھر ایک خاص بات یہ تھی کہ مسلمان حکومت کی جگہ لینے والے انگریزی اقتدار سے نفرت و بغض اور انگریز قوم کے خلاف غیظ بھی ان میں انتہا درجہ کا تھا یہانتک کہ حقارت و ذلت کے لئے ضرب المثل کے طور پر اُن کے قلم اور زبان سے بے تکلف "بدتر از کافر فرنگ" کا لفظ نکلتا تھا۔

الغرض ہندوستانی مسلمان اپنی حکومت کھونے کے بعد جب انگریزوں کے محکوم ہوئے تو اس وقت ان میں یہ چند چیزیں ایسی موجود تھیں جو مسلمانوں کے نیچے کُچھے دین اور ان کی تہذیب کو انگریزی اثرات سے محفوظ رکھنے میں بہت کچھ کارآمد اور موثر ہو سکتی تھیں، اور یہی وجہ ہوئی کہ انگریزوں کا مخصوص نظام تعلیم اور نظام سیاست و حکومت، مسلمانوں کا تعلق اپنے دین اور اپنی تہذیب سے توڑنے اور کمزور کرنے میں بہت دیر میں اور خاص ہی خاص حلقوں میں کامیاب ہو سکا۔

لیکن پھر بھی انگریزی حکومت کی قریباً ایک صدی کی گذشتہ مدت میں انگریزی تسلط و اقتدار اور انگریزی نظام تعلیم نے مسلمانوں کے خیالات و جذبات اور اعمال و افکار پر جو اثر ڈالا اور مسلمانوں کے مزاج و مذاق تک میں جو فرق آگیا وہ بہت بڑا اور غیر معمولی ہے۔

موجودہ مسلمان قوم کا جائزہ

تعلیمیافتہ اور سربرآوردہ طبقوں کا حال

اب حالت یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو طبقہ اپنی دولت و جاہت اور دنیوی تعلیم و ترقی کی وجہ سے ممتاز اور نمایاں ہے، اور ایک عرصہ سے جس کا قوم پر بہت زیادہ اثر ہے اُس میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو چکی ہے جو مغربی سیاسی اقتدار کے پیدا کئے ہوئے مادہ پرستانہ ماحول سے اتنے متاثر ہو گئے ہیں کہ دین کی بنیادی غیبی حقیقتوں پر بھی انھیں یقین نہیں رہا ہے، خصوصاً وحی و رسالت اور قیامت و آخرت پر ایک مسلمان کا جیسا ایمان و اعتقاد ہونا چاہیئے اور ان چیزوں کے متعلق اُس کا ذہن جتنا صاف اور مطمئن ہونا چاہیئے اور پھر اس کی زندگی پر ان عقائد کا جو اثر پڑنا چاہیئے وہ اس سے یکسر خالی ہیں۔

اور اس اعتقادی نفاق کے علاوہ ایسی ہی ایک دوسری خطرناک بیماری مسلمانوں کے اس سربرآوردہ

طبقے میں انگریزوں کی غلامی کے پچھلے صد سالہ دور میں یہ پیدا ہو چکی ہے کہ ذاتی اغراض اور مادی منافع کے لئے دین و دیانت کے خلاف بلکہ خود اپنے عقیدہ اور ضمیر کے خلاف بھی سب کچھ کر لینا ان لوگوں کے لئے ایک معمولی سی بات ہو گئی ہے ــــــ مثلاً حکومت و اقتدار کا کوئی منصب اور عہدہ حاصل کرنے کے لئے یا نوکری میں کسی ترقی کی اُمید پر غیر مسلم افسروں اور آقاؤں کو خوش کرنے کی غرض سے اپنے دین اور اپنے ضمیر کے خلاف بہت سے کام کر لینا اور بعض اوقات صریح کافرانہ اور مشرکانہ رسوم و تقریبات میں حصہ لینا اور ضرورت پڑے تو حکومت کے کسی صریح اسلام کُش اقدام کی بھی تائید و حمایت کرنا ان کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی ہے بلکہ اس طبقے میں یہ چیزیں اب اتنی عام ہو گئی ہیں کہ نہ خود اپنا ضمیر کبھی اس طرزِ عمل پر ملامت کرتا ہے نہ دوسرے ہی لوگوں کو ان باتوں سے اب کوئی نفرت ہوتی ہے۔

اور چونکہ قوم کے مترفین کا یہ طبقہ اپنی امارت اور وجاہت کی وجہ سے دوسرے طبقوں پر بھی خاص اثر رکھتا ہے اس لئے اُس نے اس طرزِ عمل سے دوسرے طبقے بھی بہت کچھ متاثر ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں اور ان کا مزاج و مذاق بھی یہی بنتا جا رہا ہے کہ اپنی ذاتی اغراض اور مادی منفعتوں اور مصلحتوں کیلئے اللہ و رسولؐ کے احکام کو پسِ پشت ڈال دینا اور اپنے دین اور اپنے ضمیر کے خلاف سب کچھ کر لینا گویا کوئی عیب ہی نہیں ہے۔

جاہلوں اور غریبوں کی حالت اس تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ طبقے کے علاوہ مسلمانوں میں جو جاہل اور غریب طبقے ہیں (خاص طور سے دیہاتوں میں رہنے والے کاشتکار اور مزدور) اُن کی عام حالت اس وقت یہ ہے کہ نہ تو اُن بیچاروں میں دین کا علم و شعور ہے اور نہ دین کی ضرورت و اہمیت ہی کا انھیں کوئی احساس ہے، اُن میں زیادہ تر ایسے ہیں جو صرف اس لئے مسلمان ہیں کہ اُن کے باپ دادے مسلمان تھے اور ظاہر ہے کہ اس نام کی اور موروثی مسلمانی میں اتنی جان نہیں ہوتی کہ زیادہ ناسازگار حالات میں بھی یہ قائم رہ جائے ــــ اگست ۴۷ء کے بعد الور، بھرت پور، دہلی، مشرقی پنجاب اور ضلع دہرہ دون وغیرہ میں جو فسادات ہوئے، واقفین کو معلوم ہے کہ مختلف مقامات پر اس غریب اور جاہل طبقے کی کتنی بڑی تعداد نے جان و مال کے خوف سے اس نام کی اور موروثی مسلمانی کو خیرباد کہا، اور چونکہ ان لوگوں کو اسلام کی اہمیت اور قدر و قیمت کا کوئی شعور و ادراک ہی نہ تھا اور اسلام کی حقیقت سے وہ قطعاً جاہل تھے اور جیسا کہ عرض کیا گیا صرف نام اور خاندان کے لحاظ سے مسلمان تھے اس لئے جب حالات اعتدال پر بھی آگئے اور ہر جگہ امن قائم ہو گیا تو ان میں سے بہت سے لوگ اسکے بعد بھی

واپس آنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

بہرحال مسلمانوں میں جو جاہل اور پسماندہ طبقے ہیں انگریزی دور کی گذشتہ ایک صدی میں دین سے اُن کا تعلق اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ جان و مال کا خطرہ خدانخواستہ ان کو علانیہ ارتداد تک پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اور کسی نظامِ تعلیم کے ذریعہ ایسے جاہل اور کمزور طبقوں کو اسلام سے اور زیادہ دور کر دینا اور کسی دوسرے نظامِ زندگی اور کسی دوسری تہذیب کو اُن میں رواج دے دینا تو کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

متوسط طبقہ کا حال ان دونوں طبقوں کے علاوہ مسلمانوں میں ایک تیسرا طبقہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جن کا شمار نہ تو اوّل الذکر تعلیم یافتہ اور سر برآوردہ طبقہ میں ہوتا ہے، اور نہ وہ دوسرے جاہل و غریب طبقہ ہی میں شامل ہیں۔ یہ زیادہ تر تجارت اور صنعت و حرفت سے تعلق رکھنے والے یا چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرنے والے شہری مسلمان ہیں۔ دین کے لحاظ سے اس طبقہ کی حالت کچھ غنیمت ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فی زمانہ دین اور دینداری کا جو کچھ نام نشان ہے وہ گویا اسی طبقہ میں ہے لیکن دین میں صلابت اور استقامت اور دین کی راہ میں نقصانات اور تکالیف کا ہمت سے مقابلہ کرنے والی ایمانی کیفیت اور مردانہ عزیمت سے اس طبقہ کی اکثریت بھی خالی ہے ——— تجربے سے یہی معلوم ہوا ہے کہ اس طبقہ میں بھی اللہ کے ایسے بندے بہت کم بلکہ خال خال ہی ہیں جو ابتلاء و امتحان اور نفع نقصان کی کشمکش کے وقت بھی اللہ و رسول کے وفادار اور ثابت قدم رہنے والے ہوں۔

اہلِ دین کی حالت مسلمان قوم میں ان تین طبقوں کے علاوہ ایک چوتھا طبقہ خاص اہلِ دین کا بھی ہے جن کا امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ دین کے جاننے والے یا اُس کے کسی خاص شعبے کی خدمت کرنے والے ہیں ——— اصولی طور پر یہ طبقہ علماء اور مشائخ کے دو سلسلوں پر مشتمل ہو۔ مشائخ سے ہماری مراد اللہ کے وہ صاحبِ ارشاد بندے ہیں جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خاص صفت "وَيُزَكِّيهِمْ" کے وارث ہوں، اور جنھوں نے اپنی روح کے تزکیہ کی کوشش اور دوسرے طالبین کی اس راہ میں خدمت و تربیت کو اپنی زندگی کا خاص وظیفہ بنا لیا ہو ——— جاننے والے جانتے ہیں کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے وقت بھی سلوک و تصوف کے مختلف سلسلوں اور طریقوں سے تعلق رکھنے والے اہلِ ارشاد کی اچھی خاصی تعداد ہندوستان میں موجود تھی، لیکن انگریزی دور میں دین کے خاص اس سلسلہ پر انتہا زوال آیا! انگلیوں پر گنے جانے والے اللہ کے چند صادق بندوں کے سوا آج جو لوگ پیری اور شیخی کر رہے ہیں اُنکی حقیقت

اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ بزرگوں کے نام کی اور ان کی قبروں کی تجارت کرتے ہیں اور دین کے نام اور بزرگوں کی نسبت کو انھوں نے صرف دنیا کمانے کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے، ظاہر ہے کہ یہ لوگ دین کے لئے اس کے کھلے دشمنوں سے زیادہ مضر اور خطرناک ہیں۔

علماء کی حالت!

اہلِ دین کے طبقے میں دوسرا سلسلہ علماء کا ہے۔ اسلامی ہند کی گذشتہ ایک ڈیڑھ صدی کی علمی اور دینی سرگذشت پر جن حضرات کی نظر ہوگی اُن سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال اور انگریزی حکومت کے قیام کے وقت باقاعدہ اور مستند علماء و فضلاء اتنی تعداد میں تو نہ تھے جتنے کہ مدرسوں سے نکلے ہوئے سند یافتہ اور فارغ التحصیل "عالم فاضل" آج موجود ہیں ـــــ لیکن اُس وقت جو علماء تھے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے بالعموم اُن کا علم راسخ اور گہرا تھا، اسی کے ساتھ صلاح و تقویٰ اور سیرت کی پاکیزگی کی صفت بھی اُس وقت کے علماء میں عام طور سے موجود تھی نیز دین کے بارے میں وہ استقامت اور عزیمت بھی اُن میں موجود تھی جو دین کے حاملوں اور امینوں میں ہونی چاہیے اور ان ایجابی صفات کے علاوہ ایک خاص چیز اُس وقت کے اکابر علماء میں ہم کو یہ ملتی ہے کہ مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد جو انگریزی حکومت اُن پر مسلط ہوئی تھی اُس سے ان کو انتہائی درجہ کی نفرت اور بیزاری تھی جو بعض اوقات افراط اور بے اعتدالی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔

اپنے استاد حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ میں نے خود سنا ہے فرماتے تھے کہ میں حدیث کی سند لینے کے لئے پانی پت حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچا، حضرت ممدوح نے صحاح کے اوائل سُنکر ارشاد فرمایا کہ کسی طالب علم سے دوات قلم لے آؤ، مجھے اُس وقت جو قلم مل سکا وہ انگریزی قلم (ہولڈر) تھا جب وہ قلم لیکر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو بس حضرت کی آنکھیں نمناک ہوگئیں اور فرمایا کہ اگر تم اتنی دور سے نہ آئے ہوتے تو میں تمھیں سند نہ دیتا، اس انگریزی قلم کے ہاتھ میں لینے سے تمھیں تکلیف کیوں نہیں ہوتی۔

اور حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ میں نے براہِ راست حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ عید کے دن اُن کے داماد (حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے حقیقی نانا) نئی اچکن پہن کے سلام کے لئے خدمت میں حاضر ہوئے، اچکن میں انگریزی بٹن لگے ہوئے تھے آپ نے بٹنوں کی خوبصورتی کی تعریف کی، اُس کے بعد ایک خاص تاثر کے انداز میں اور دل کی گہرائی سے کہا کہ جب ہمارے عزیز

اور گھر والے بھی اس کا لحاظ نہیں کر سکتے کہ کسی چیز سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے تو پھر اب ہمیں یہاں نہ رہنا چاہئے چنانچہ ہجرت فرما گئے اور مکہ معظمہ کی راہ لی ـــــ اس دور کے علماء حق کے اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو کتابوں میں بھی لکھے ہوئے ہیں ـــــ سچ یہ ہے کہ آج ہم ان بزرگوں کے اُن احساسات و جذبات کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتے جو انگریزی اقتدار کے متعلق ان بندگانِ خدا کے تھے۔

بہرحال انگریزی دور کے آغاز کے وقت دین کی حفاظت اور نمائندگی اور مسلمانوں کی دینی رہنمائی کرنے والے جو علماء تھے، علم اور دین اور سیرت اور احساسات و جذبات کے لحاظ سے اُن کا حال یہ تھا جو سطور بالا میں عرض کیا گیا ـــــ لیکن انگریزی دور میں جس طرح مسلمانوں کے دوسرے طبقوں کی دینی صفات و کیفیات میں غیر معمولی انحطاط آیا اسی طرح (اگرچہ آگے لکھتے ہوئے دل دُکھتا اور ہاتھ رُکتا ہے مگر ہے یہ ہی واقعہ کہ اسی طرح) علماء کے اس طبقے کی علمی اور دینی کیفیات میں بھی ضعف و زوال آیا اور مستثنیات کو چھوڑ کر) نیتوں اور سیرتوں میں بھی فساد آیا ـــــ ہندوستان کے طول و عرض میں سیکڑوں مدرسے ہیں جن سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طلبہ فاضل اور فارغ ہو کر نکلتے ہیں لیکن بس جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ ان میں کتنے وہ ہوتے ہیں جن کا علم اور جن کی سیرت کسی درجے میں قابلِ اطمینان ہو ـــــ اور علم میں رسوخ اور دین میں تفقہ اور سیرت میں پاکیزگی اور استقامت و عزیمت کی صفات تو بالکل عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم جیسے باطل اور خالص مادہ پرستانہ نظریات بھی جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تعلیم سے بنیادی طور پر متصادم ہیں جس طرح علم دین سے بے بہرہ عوام کے دوسرے طبقات میں نفوذ کر رہے ہیں اس طرح ہمارے زمانے کے بہت سے "عالم فاضل" بھی ان کا شکار ہو رہے ہیں۔ فیا حسرتا!

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غلامی بلکہ وراثت و نیابت کے مُدعی اور مارکس اور لینن کے دین، سوشلزم و کمیونزم کے مدّاح اور مبلّغ، توحید کے دعویدار اور عصر حاضر کے سب سے بڑے بُت وطن اور پیٹ کے پجاری!

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

اگر گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ـــــ اس وقت کے بہت سے نوفارغوں کی رُوحِ دین سے نا آشنائی اور تفقہ فی الدین سے بے بہرگی کا حال یہ ہے کہ معتزلہ اور خوارج اور کرامیہ اور نظامیہ وغیرہ زمانہ قدیم کے باطل فرقوں کے چند اُن عقیدوں کو تو آج بھی وہ بد دینی سمجھتے ہیں جن کا ذکر انھوں نے علم عقائد کی بعض درسی کتابوں میں پڑھا ہے، لیکن آج کل کے وہ ملحدانہ نظریات جو سیاست اور قومیت و وطنیت کی راہ سے آ رہے ہیں چاہے وہ رُوحِ اسلام کے کتنے ہی خلاف اور اصولِ دین سے کیسے ہی متصادم ہوں، اُنکے ذہن بڑی آسانی سے ان کو ہضم کر رہے ہیں۔

ذہنیتیں مادیت سے اتنی متاثر ہو چکی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ زندگی اور اولیاء امت کے مشاغل میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں، اور بجائے اس کے عہدِ حاضر کے خدا فراموش لیڈروں اور انکی خدا ناشناس پارٹیوں کی نقالی میں اُن کے لئے کشش ہو اور وہ اس میں فخر محسوس کرتے ہیں —— خالص مسلمان مجمعوں میں بھی اگر وہ کھڑے ہوں تو اللہ و رسول کے احکام اور آخرت اور جنت دوزخ اور ثواب و عذاب کے ذکر سے وہ شرماتے ہیں اور اگر کبھی دینی بات کہنے کا موقع آتا بھی ہے تو اس کو بھی آخرت کی بنیاد پر نہیں کہتے جو دین کی حقیقت اور رُوح ہے، بلکہ اس کو بھی دنیوی اور مادی مسائل ہی کے رنگ میں کہتے ہیں۔ گویا کہ اُن کا حال قریب قریب وہی ہو چکا ہے جو قرآن مجید کی ان آیتوں میں بعض آخرت فراموش طبقوں کا بیان کیا گیا ہے۔

یعلمون ظاهرًا من الحیٰوۃ الدنیا وهم عن الآخرۃ هُمْ غٰفِلُوْنَ ○	وہ صرف اس دُنیوی زندگی کی ظاہری حقیقتوں ہی کو جانتے ہیں اور اُن ہی کی فکر کرتے ہیں اور آخرت سے وہ بالکل غافل ہیں۔
اور —— "کلا بل تحبون العاجلة و تذرون الآخرۃ"	تم بس دنیا ہی کو چاہتے ہو اور آخرت کو بالکل چھوڑے ہوئے ہو۔

کس طرح کہا جائے، اور جب واقعہ یہی ہے اور ضرورت کہنے کی ہے تو کیسے نہ کہا جائے کہ زمانۂ حال کے ان نئے "علما و فضلا" میں خاصی تعداد ایسوں کی ہے کہ اگر کوئی شخص مہینوں اُن کے ساتھ رہے تو اُسے محسوس نہ ہوگا کہ اُن کو اپنی یا اپنی قوم کی یا عام انسانوں کی آخرت کی بھی کوئی فکر ہے، اور مرنے کے بعد کا مسئلہ اُن کے نزدیک کسی درجہ میں بھی توجہ کے قابل ہو —— عام و خاص مجلسوں میں، شخصی، شہری، ملکی، قومی اور بین الاقوامی مسائل پر آپ ہر روز اُن کی باتیں سنیں گے، لیکن ایمان والی فکر کے ساتھ آخرت کا ذکر اگر کبھی مہینوں میں بھی اُن کی زبان سے آپ سُن سکیں تو یہ آپ کی خوش نصیبی ہوگی —— انھیں اگر عام مسلمانوں کی بھی فکر ہوتی ہے تو بس اُن کے دنیوی اور مادی مسائل و مہمات کی، گویا کہ اپنی اور قوم کی فکرِ آخرت سے وہ بالکل فارغ ہو چکے ہیں —— یہ حال ہے اُس نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اِن "وارثانِ علم" کا، جو اللہ تعالیٰ سے رو رو کر دُعا کرتا تھا:۔

وَلَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَایَةَ رَغْبَتِنَا (الی آخرہ)

ہمارے دین پر کوئی مصیبت نہ آئے، اور دنیا کو ہماری سب سے بڑی فکر اور ہمارا مقصدِ علم اور مبلغ علم اور منتہائے رغبت نہ بنا!

یہ واقعہ ہے، جس میں اس عاجز کے تجربات اور معلومات کی بنا پر ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس عالمِ شہود کی جن چیزوں کی وقعت و رغبت دلوں سے نکالنے یا کم کرنے تشریف لائے تھے، اب صرف اُنہی چیزوں کی وقعت و اہمیت ہمارے بہت سے "عالموں فاضلوں" کے دلوں میں بھری ہوئی ہے اور وہی اُنکی زندگی کی اصلی اور مرکزی فکریں ہیں ——— اور جن غیبی حقیقتوں کی وقعت و اہمیت آپؐ دلوں میں بٹھانا چاہتے تھے اور جن کی فکر کو آپ امت کی ساری فکروں پر غالب فرمانا چاہتے تھے، اب اُن کی وقعت و اہمیت کا احساس ہمارے بہت سے نوجوان بھائیوں کے دلوں سے نکل چکا ہے اور ان کی زندگی میں ان چیزوں کی اب کچھ بھی اہمیت نہیں رہی ہے، اگر کچھ باقی ہے تو بس ایک بے جان سا عقیدہ! جس کا زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں۔

اور اسی قسم کا ایک دوسرا مہلک تغیر اسی طبقے میں یہ ہوا ہے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ حکومت و سیاست اور قومیت و وطنیت کے سلسلے سے ہندی مسلمانوں کے بچے کھچے دین اور ان کی تہذیب و معاشرت پر جو تباہ کن اثرات اس وقت پڑ رہے ہیں اور جو شاید چند ہی برسوں میں مسلمانوں کو اپنے دین اور اپنی تہذیب سے اُس سے زیادہ دُور کر دینگے جتنا کہ انگریزی حکومت اور اُس کے نظامِ تعلیم نے قریباً ایک صدی میں دُور کیا تھا ——— اِن اثرات کا طبقۂ علماء کے بہت سے افراد کو تو پورا شعور و احساس بھی نہیں ہے اور جن کو کچھ ہے بھی اُن میں بہت ہی کم بلکہ شاذ و نادر ہی اللہ کے وہ بندے ہیں جو امت کو ان اثرات سے بچانے کے لئے اپنا فرض اُس طرح ادا کر رہے ہوں جس طرح عزیمت کے ساتھ اور بلا خوف لومۃ لائم علماءِ حق کو ادا کرنا چاہئے؟ ——— بلکہ یہ دیکھ کر دل خون ہوتا ہے کہ طبقۂ علماء ہی کے بعض افراد اس وقت ابوالفضل اور فیضی کا پارٹ ادا کر رہے ہیں، اور اپنے علم اور قلم کے زور سے مسلمانوں کے لئے ان ذہنی اور عملی تبدیلیوں کو آسان اور جائز (بلکہ اُسوۂ سلف) بنا دینا چاہتے ہیں۔

اس شکوہ شکایت سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ خدانخواستہ آج کل کے سب علماء یا اُن کی اکثریت کا ہمارے نزدیک یہ حال ہے۔ بلکہ مقصد صرف یہ بتلانا ہے کہ اس وقت کے "فضلاء" میں خاصکر نوعمروں میں ایک اچھی خاصی تعداد اپنے مقام و منصب سے اس قدر دُور ہو گئی ہے، اور مسلمانوں کے دوسرے عام طبقوں کی طرح اُن کی دینی و ایمانی کیفیات میں بھی اس قدر انحطاط آ چکا ہے۔ اور چونکہ یہی طبقہ امت کا قلب، اور اس کے دین کی پاسبانی کا خاص ذمہ دار ہے، اس لئے اس کا یہ تغیر و انحطاط بہت زیادہ تکلیف و تشویش کا باعث ہے۔ —— س

جب مسیحا دشمنِ جاں ہو تو کیونکر ہو علاج!
کون رہبر ہو سکے جو خضر بہکانے لگے

شدتِ احساس سے بات زیادہ طویل اور تلخ ہو گئی اور سچی بات یہ ہے کہ پوری اب بھی نہیں کہی۔ ناظرین معاف فرمائیں، اور معذور تصور کریں۔ ؎

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

حاصلِ کلام بہرحال عرض یہ کیا جارہا تھا کہ سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گل ہونے کے بعد اس ملک میں جس وقت انگریزی حکومت قائم ہوئی تھی اُس وقت بہت سی خرابیوں کے باوجود یہاں کی مسلمان سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں چند ایسی صفات موجود تھیں جو انگریزی اثرات سے اُن کے دین اور اُن کی تہذیب کی دیر تک حفاظت کر سکتی تھیں۔ اس سلسلہ میں ہم مندرجۂ ذیل چیزوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ عقائد کی بنیادیں محفوظ تھیں، ہر دل میں دین کی عظمت و وقعت موجود تھی، اپنے دین اور اپنی تہذیب کی برتری کا پورا پورا یقین تھا، فاسقوں فاجروں میں بھی دینی غیرت و حمیت اور کفر کی حقارت کا جذبہ پوری قوت کے ساتھ اُس وقت موجود تھا، خانقاہوں میں خاصانِ خدا ابھی خاصی تعداد میں موجود تھے، اور جو اس وقت کے علماء اور ائمہ کے دینی پاسبان تھے جن کا قوم پر پورا اثر تھا اُن میں کافی تعداد ایسے حضرات کی بھی تھی جن کا علم راسخ تھا اور جو حق و باطل میں اپنے نورِ علم سے یقین اور بصیرت کے ساتھ امتیاز کر سکتے تھے اور علاوہ علم کی گہرائی کے ان کے دین میں بھی پختگی اور سیرت میں بھی مضبوطی تھی، اور اسی کے ساتھ انگریزی حکومت اور انگریزی تہذیب سے ان کو سخت نفرت و عداوت بھی تھی ——— دراصل یہی وہ چیزیں تھیں جنھوں نے مسلمانوں کے دین اور ان کی تہذیب کو اس ملک میں کسی حد تک بچایا، ورنہ جو سرمایہ ابتک بچا ہوا ہے یہ بھی باقی نہ رہتا۔

لیکن جیسا کہ تفصیل سے اوپر عرض کیا گیا، انگریزی دورِ حکومت میں مسلمانوں کی ان صفات میں برابر انحطاط و زوال آتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں انگریزی حکومت کے خاتمہ کے وقت ہم نے اپنے کو اس حال میں پایا کہ پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے طبقے میں کافی تعداد ایسوں کی ہے جنھیں اسلام کے بنیادی عقیدوں پر بھی پورا یقین نہیں رہا، بہت سے ایسے ہیں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں لیکن دین کی کوئی قدر و قیمت اُن کے دلوں میں نہیں ہے، اسی طرح دینی غیرت و حمیت بھی اُن کے

دلوں سے نکل چکی ہے، اور وہ معمولی معمولی فائدوں کے لئے اسلام کے خلاف جا سکتے ہیں۔ اغراض پرستی اور ابن الوقتی خصوصاً ہمارے پڑھے لکھے طبقے کا عام مزاج بن چکا ہے، اس لئے بڑے سے بڑے گناہ اور بڑی سے بڑی منافقانہ حرکت پر اب سوسائٹی میں کوئی احتساب نہیں ہوتا، اور ایسا کرنے والے کی عزت و شان میں ذرا فرق نہیں آتا ——— اور چونکہ یہ باتیں امیروں اور پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے لوگوں میں عام ہیں اس لئے اب جاہلوں غریبوں کی نظروں میں بھی ان باتوں میں کوئی برائی نہیں رہی ——— بلکہ امت کے غریب اور جاہل طبقوں میں خصوصاً دیہات کے رہنے والوں میں مذکورۂ بالا برائیوں کے علاوہ ایک خطرناک چیز یہ بھی ہے کہ وہ دین کی اصولی اور بنیادی باتوں سے بھی ناآشنا ہیں اور نہیں جانتے کہ ہمارے مسلمان ہونے کا مطلب کیا ہے، اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا حدِ فاصل ہے۔

اور خود دین کے امینوں اور پاسبانوں یعنی طبقۂ علماء کے بہت سے افراد میں جو علمی اور دینی کمزوریاں اس وقت آ چکی ہیں اُن کا ذکر ابھی اوپر گذر چکا ہے ——— بہرحال ان اندرونی کمزوریوں کے ساتھ ہم نے ۴۷ء کے انقلاب کا، اور نئی قومی وطنی حکومت کا استقبال کیا ہے۔

اب اس انقلاب اور اس نئے نظامِ حکومت کے اثرات ہم پر اور ہمارے دین اور ہماری تہذیب پر کیا کیا اور کس کس طرح پڑ سکتے ہیں۔ آئیے ذرا اس پر بھی غور کریں! اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہم حالات کے نقشہ کو سامنے رکھ لیں۔ (باقی آئندہ)

دعوتِ اصلاح و تبلیغ

اور

اُس کے محرّکات

موجودہ مسلمان قوم کے طرزِ زندگی کے بارہ میں ہمارے چند یقین ہیں جو ہماری اس دینی اور اصلاحی دعوت کے اصل محرکات ہیں آپ بھی سنجیدگی کیساتھ ان پر غور فرمائیے، اور جو کچھ ہم سوچ سمجھ رہے ہیں اگر آپ کے نزدیک وہ صحیح ہو تو پھر جو فرض آپ پر عائد ہوتا ہو اسکی ادائیگی کیلئے اپنے کو آمادہ کیجئے

۱۔ اوّل یہ کہ موجودہ مسلمان قوم کی زندگی وہ ایمانی اور اسلامی زندگی نہیں ہے جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے اور اپنے پر ایمان لانے والوں کو آپ جس کی تعلیم دیتے تھے ——— مطلب یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم میں نہ اس زندگی کا ظاہر موجود ہے نہ باطن، نہ قالب نہ رُوح ——— حتّٰی کہ وہ طبقہ جس کو کچھ دیندار سمجھا جاتا ہے اور جو بظاہر دین کے بعض احکام پر عمل بھی کرتا ہے اُس کے اکثر افراد کا حال بھی یہی ہے کہ ایمان و اسلام کی اصلی رُوح سے اُن کے دل خالی ہیں ——— الغرض ہم کو اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ موجودہ مسلمان قوم کی زندگی بحیثیت مجموعی اُسی طرح کی ایک مسخ شدہ اور محرّف زندگی ہو جیسی کہ رسول اللہ صلعم کی بعثت کے وقت اہلِ کتاب کی تھی جس پر قرآن مجید نے ان کو مغضوب اور ملعون قرار دیا ہو۔

۲۔ قرآنی بیانات اور اگلی اُمتوں کی تاریخ کی روشنی میں ہمارا دوسرا یقین مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے بارے میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی اس زندگی سے سخت ناراض ہے اور یہ زندگی دنیا اور آخرت میں اُس کے غضب اور اُس کی لعنت کو کھینچنے والی ہو۔

۳۔ تیسری بات جس کا ہم کو خاص طور سے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں یقین ہے یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ وہ اسی حال میں رہے اور اصلی اسلامی زندگی کی طرف پلٹنے اور ایمان و اسلام کی صفت کے ساتھ جینے اور مرنے کا انھوں نے فیصلہ نہ کیا اور اپنی زندگی میں انھوں نے وہ اصلاح اور تبدیلی نہ کی جس کا بدل کو کرنا چاہئیے تو خدانخواستہ یہ خطرہ بالکل یقینی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اسلام سے وہ ادھورا اور برائے نام تعلق بھی باقی نہ رکھ سکے گی جو اس وقت موجود ہے۔

اس تیسری بات کے متعلق اگر آپ کو کچھ شک شبہ ہو تو موجودہ مسلمان قوم کے مختلف طبقوں کی حالت کا ذرا تفصیلی جائزہ لیجئے۔

مسلمان کہلانے والوں میں بہت بڑی تعداد تو ہمارے اس ملک میں اُن غریب اور پس ماندہ دیہاتی یا شہری مسلمانوں کی ہے جو ایمان و اسلام کی بنیادی باتیں بھی نہیں جانتے ہیں بلکہ صرف نسلی اور قومی مسلمان ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی وقت زمانہ کوئی ایسا پلٹا کھائے جس میں اس طبقے کو مسلمان رہنے میں جانی یا مالی نقصانات کا خطرہ ہو تو اسلام کے ساتھ جو صرف نام کا تعلق اس طبقے کو ہے وہ اُس کو باقی رکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھے گا۔

اگست، ستمبر، اکتوبر ۴۷ء کے فسادات میں بہت سے مقامات پر اس طبقے کی اس کمزور حالت کا تجربہ ہو چکا ہے اور بہت سے ایسے واقعات بھی علم میں ہیں کہ امن و امان قائم ہونے کے بعد بھی وہ لوگ اسلام کی طرف واپس آنے پر آمادہ نہ ہوئے جو اُس وقت قتل و غارت کے ڈر سے مرتد ہو گئے تھے ——— یہ صرف اسی لئے ہوا کہ یہ بیچارے دین کی حقیقت سے بالکل ناواقف تھے، نہ اس کی ضرورت و اہمیت کا انھیں کوئی احساس تھا، نہ اس کی قدر قیمت انھیں معلوم تھی، بلکہ صرف نام کے مسلمان تھے، اور معلوم ہے کہ موجودہ مسلمان قوم میں آج بھی بہت بڑی تعداد اسی حال میں ہے۔

پھر ان جاہلوں غریبوں کے علاوہ جو متوسط درجہ کے مسلمان ہیں یعنی جو تعلیم یافتہ اور کچھ کھاتے پیتے ہیں اُن میں بھی ۹۵ فی صدی سے زیادہ وہ ہیں جو معمولی نفع کے لئے مثلاً نوکری پانے کیلئے یا کسی منصب و عہدے میں ترقی حاصل کرنے کے لئے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کے عادی ہو چکے ہیں اور اس بارے میں اُن کی دینی حس اس قدر مردہ ہو چکی ہے کہ انھیں کبھی اپنے اس طرز عمل کی برائی کا احساس بھی نہیں ہوتا، اور

اُن کا دل کبھی اس پر نفریں اور ملامت بھی نہیں کرتا، بلکہ اس طبقے کی اکثریت کا حال تو یہ ہو کہ صرف فیشن کے لئے بھی اسلامی احکام کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں، وہ اتنے بے باک ہو چکے ہیں کہ اللہ کے دین سے گویا اُن کا کوئی خاص تعلق ہی نہیں ہے، اور دینی احکام پر چلنے کا گویا اُنکے سامنے کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

الغرض ہمارے اس تعلیم یافتہ اور کھاتے پیتے طبقے کی اکثریت کا تعلق دین سے اس وقت اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ مالی منفعت یا عزّت و وجاہت کے لئے یا صرف فیشن کی خاطر دین کے احکام سے تعلق توڑ لینا اُس کی عام عادت ہو چکی ہے جس سے اُس کے دل میں اب کوئی دُکھن اور گھٹن بھی نہیں ہوتی ــــ اور جس طبقے کی یہ حالت ہو اگر خدا نخواستہ اُس کے لئے کوئی ایسا وقت آجائے کہ نوکری یا عہدہ پانے کے لئے یا کسی طریقے سے عزّت یا منفعت حاصل کرنے کے لئے دین ہی سے تعلق توڑ لینا ضروری ہو تو ظاہر ہے کہ جو لوگ ان مقاصد کے لئے دین کے احکام سے تعلق توڑ لینے کا اپنے کو عادی بنا چکے ہیں ان کو خود دین سے تعلق توڑ لینے میں بھی کچھ زیادہ تامل نہ ہوگا اور اس کے لئے انہیں کوئی بڑی کشمکش کرنا نہیں پڑے گی۔

ہندوستان میں اس نئے دور کو شروع ہوئے ابھی صرف ایک سال ہوا ہے اور راقم سطور کے علم میں ایسے واقعات ہیں کہ دفاتر میں نوکری کرنے والے "بعض مسلمان" اب اس کی کوشش کرنے لگے ہیں کہ انکی شکل و صورت اور کسی بات سے اُن کا مسلمان ہونا ظاہر نہ ہو ورنہ دفتر کی فضا اُن کے لئے ناخوشگوار ہو جائے گی ــــ اسی طرح سنا گیا ہے کہ ریلوں کے سفر میں بعض کمزور سیرت کے مسلمان اب اسکی کوشش کرتے ہیں کہ ڈبہ کے غیر مسلم مسافر اُن کو مسلمان نہ جانیں اور ان کو کوئی دل آزار یا توہین آمیز بات نہ سننا پڑے (اور اس کمزوری کا اظہار ان نام کے مسلمانوں سے اُس وقت ہو رہا ہے جبکہ ایک درجہ میں امن و امان قائم ہے، اور ریلوں میں ناخوشگوار یا دلخراش باتیں سننے سے زیادہ کوئی خطرہ نہیں ہے)۔ اسی طرح بعض مسلمان دُکانداروں کے متعلق علم میں آیا کہ اب وہ اس کی کوشش کرنے لگے ہیں کہ اُن کی صورت یا اُن کے لباس سے کوئی اُن کو مسلمان نہ سمجھے، اور دُکانوں پر نوکر بھی وہ ایسے ہی شخص کو رکھنا چاہتے ہیں جس کی صورت دیکھ کر غیر مسلم گاہک یہ نہ جان سکیں کہ یہ دُکان کسی مسلمان کی ہے۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے جن طبقوں کی اس وقت یہ حالت ہے اگر ان کی اصلاح و درستی کی غیر معمولی کوشش نہ کی گئی اور دین سے اُن کا تعلق بڑھانے کی اور حقیقی اسلامی زندگی اُن میں پیدا کرنے کی

کوئی زبردست جدوجہد نہ کی گئی تو ہندوستان کے حالات کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اس کا بہت امکان بلکہ غالب گمان ہے کہ خدانخواستہ تھوڑے ہی زمانے کے بعد مسلمانوں کے یہ طبقے جو اپنی دنیوی مصلحتوں اور منفعتوں کے لئے ابھی تک اسلام کو صرف جزوی طور پر چھوڑ دینے پر تیار ہوئے ہیں ایک دن انہی مصلحتوں کی خاطر کلی طور پر بھی اس کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اور اب تو "مذاہب کی بنیادی وحدت" اور "مشترک صداقت" کے جیسے شاندار ناموں سے ایسے چور دروازے قائم ہو گئے ہیں جن سے نکل جانا ایسے لوگوں کے لئے بہت آسان ہوگا۔

ان خطرات کا انسداد صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ان طبقوں میں صحیح ایمانی شعور اور سچی اسلامی زندگی پیدا کر دی جائے اور ایمان و اسلام کے ساتھ جینے اور مرنے کو اُن کا اٹل فیصلہ بنا دیا جائے، اور اللہ و رسول کے ساتھ اور دین کے ساتھ اُن کے تعلق میں پختگی اور گہرائی پیدا کر دی جائے۔

۴۔ موجودہ مسلمانوں کے طرزِ زندگی کے متعلق ہمارا چوتھا یقین یہ ہے کہ فی زمانناً دنیا بھر کے غیر مسلموں کی نظر میں اسلام جو بے وقعت ہے، یہانتک کہ کمیونزم جیسے غلط اور غیر فطری نظامہائے حیات پر غور کرنے کے لئے تو آج ہر قوم کے اہلِ فکر تیار ہو جاتے ہیں لیکن اس طرح اسلام پر غور کرنے کا داعیہ اُن کے دلوں میں پیدا نہیں ہوتا، بلکہ دنیا کے دوسرے لغو اور فرسودہ مذہبوں کی طرح وہ اس کو بھی اسی قسم کا ایک مذہب سمجھتے ہیں، تو اس کی ذمہ داری بھی موجودہ مسلمانوں کے طرزِ زندگی ہی پر ہے —— عام دستور یہی ہے کہ لوگ ادیان و مذاہب کو صرف تقریروں اور کتابوں سے نہیں سمجھا کرتے بلکہ اُن پر چلنے والوں کے احوال و اعمال کو دیکھ کر اچھی یا بُری رائے قائم کیا کرتے ہیں۔

پس موجودہ مسلمان قوم کا جرم و قصور صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ ایمانی و اسلامی زندگی کو چھوڑ کر کفرانِ نعمت کر رہی ہے اور اپنے کو اللہ کے غضب و لعنت کا مستحق بنا رہی ہے، بلکہ اپنے عمل اور اپنی زندگی سے وہ اسلام کی غلط نمائندگی کر کے ہو اسلام کے خلاف کھُلی گواہی دے کے وہ عام دنیا کو اسلام سے بدگمان اور دور کرنے کا سبب بھی بن رہی ہے، حالانکہ اس امت کی مخصوص حیثیت یہ تھی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نبوت و رسالت ختم کر کے اور دین کی تعلیم و ہدایت کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے اپنے ذمہ لے کے اپنی عبادت و عبدیت کے علاوہ دوسروں میں اس دین کی دعوت اور شہادت کا کام بھی قیامت تک کے لئے

اس امت کے سپرد کیا تھا —— گویا اس طرح پوری امت کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیغمبری کی نیابت قیامت تک کر دی تھی۔

جس امت کو اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا کام اور اتنا اونچا منصب عطا فرمایا ہو، جب اُسکی اکثریت اپنے مقام اور منصب کو فراموش کر کے دنیا کی دوسری خدافراموش اور خود فراموش قوموں کی طرح صرف دنیا اور اس کی لذات سے دلچسپی رکھنے والی ایک قوم بنکر رہ جائے اور اس کی زندگی اللہ کے مقدس دین کے خلاف ایک گواہی اور سند بن جائے، تو ایسی امت یا تو اپنے حال کو درست کرے اور اپنے مقام کی طرف پلٹے، ورنہ اللہ کی حکمت کا یہ تقاضا ہوگا کہ صفحۂ ہستی سے اس کو مٹا دیا جائے، تاکہ اُس کے وجود اور اس کی زندگی سے دینِ حق کے خلاف جو شہادت قائم ہو رہی ہے اُس کا سلسلہ ختم ہو —— اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بہت مہلت دی، لیکن اب مشرق و مغرب اور عرب و عجم میں جس طرح اُن کو جھنجھوڑا جا رہا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اب اللہ کی مشیت یہ ہے کہ یا تو یہ خود فراموش امت اپنی حیثیت کو سمجھ کر پھر ایمان و عمل صالح اور عبدیت و دعوت والی زندگی اختیار کرے، ورنہ اس جھوٹے اور منافقانہ دعوے کو چھوڑے، اور پھر اللہ تعالیٰ جس سے چاہے یہ کام لے۔ چاہے وہ اسی امت کے کچھ افراد ہوں، یا دوسری قوموں میں بھی ایسے کچھ خوش نصیب ہوں جن کو یہ دولت عطا کر دی جائے۔

بہرحال موجودہ مسلمان قوم اور اس کی زندگی کے بارے میں ہمارے یہ چند یقین ہیں جن کی بنا پر ہم اپنا اور اللہ کے ہر اُس بندہ کا فرض سمجھتے ہیں جو ان حقیقتوں کا کچھ شعور و ادراک رکھتا ہو کہ اس قوم کی دینی اصلاح کے سلسلہ میں اور اس میں ایمانی و دعوتی زندگی پھر سے پیدا کرنے کے لئے جو کوشش اور جد و جہد ممکن ہو وہ کی جائے —— یہی ہماری دعوت اور پکار ہے، اور یہی چند یقین ہماری اس دعوت کے اصل محرکات ہیں۔

یہ اصلاحی جد و جہد اگر اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ ہو تو بلاشبہ اس وقت کا جہادِ عظیم ہے، اور گویا ایک مردہ امت کو زندہ کرنے کی کوشش ہے —— پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس وقت ہمارا کوئی کام اس کام سے زیادہ محبوب نہیں، اور ہمارا کوئی عمل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رُوح پاک کو اس عمل سے زیادہ خوش کرنے والا نہیں —— اور اگر یہ کام اصول

اور طریقے سے ہو تو پھر وثوق کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خود اپنے نفس کی اصلاح و تربیت اور دینی ترقیوں کے لئے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ۔ کاش اللہ تعالیٰ اس کام کی عظمت و افادیت ہم پر بھی منکشف فرمادے ، اور پھر اس جدوجہد کے لئے جس یقین اور جس ہمت و عزیمت کی ضرورت ہے وہ بھی ہم کو نصیب فرمادے ، اور اس راہ کی مشکلات ہمارے لئے آسان ہو جائیں ۔

اللّٰھم لا سھل الا ما جعلتہ سھلاً و انت تجعل الحزن سھلاً اذا شئت

لا الٰہ الا اللہ الحلیم الکریم ؕ

ایک مثالی درسگاہ!

رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک نہایت اہم مقالہ اسی عنوان کے تحت اگلے صفحے سے شروع ہو رہا ہے۔ موصوف نے یہ مقالہ نومبر ۱۹۴۶ء میں دراصل جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ۲۵ سالہ جوبلی کے موقع پر، شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کی خاص فرمائش پر لکھا تھا، اور جوبلی کے پہلے اجتماع میں پڑھا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا ارادہ تھا کہ وہ خود اس پر "پیش لفظ" لکھیں گے، اور اس کے ساتھ یہ شائع ہوگا۔

اگست ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں جالندھر کے اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب پر جو گذری اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُنکی حفاظت فرمائی ناظرین نے اُس زمانے کے اخبارات میں اس کو پڑھا ہوگا ——— اس مقالہ کا اصل مسودہ اُس سفر میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تھا جو اُنکے سامان کیساتھ ضائع ہو گیا، اور اسلئے ابتک شائع نہ ہو سکا ——— اب قریباً ڈیڑھ برس کے بعد کچھ ابتدائی کٹے پھٹے مسودے اور کچھ اپنی یادداشت سے مدد لیکر محترم مولانا نے ترمیم و اضافے کیساتھ پھر سے اُسکو مرتب کیا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی "انجمن الاصلاح" کے اجتماع منعقدہ ۱۵ر مارچ ۱۹۴۹ء میں پڑھا۔

اُمید ہے کہ دینی اور تعلیمی حلقوں میں غور و دلچسپی سے اس کو پڑھا جائے گا، اور جن خیالات کا اسمیں اظہار کیا گیا ہے اُنپر توجہ کیجائیگی ——— اسمیں موجودہ نظامِ تعلیم (خواہ دینی ہو خواہ غیر دینی) کے مشترک بنیادی نقائص پر تنقید کی گئی ہے اور اسکے مقابلے میں پیغمبرانہ طرزِ تعلیم و تربیت کی برتری اور کامیابی ثابت کی گئی ہے ——— اگر غیر دینی تعلیم کے "نقار خانہ" میں یہ "صدائے طوطی" نہ سنی جا سکے، تو کم سے کم دینی تعلیم کے حلقوں میں تو ضرور اس پر سنجیدگی کیساتھ توجہ کرنی چاہئے۔

"مدیر"

ایک مثالی درسگاہ

(از جناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی)

حضرات! قبل اس کے کہ میں اس مثالی درسگاہ کا تذکرہ کروں جو ہمارے اس مقالہ اور آج کی مجلس کا موضوع ہے۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ دنیا کے دوسرے تعلیمی نظاموں اور درسگاہوں پر ایک نظر ڈال لیجائے اور ان کے بنیادی فرق کو محسوس کر لیا جائے۔

۱۔ دنیا کی قدیم و جدید درسگاہوں کی بنیاد ہمیشہ سے اس مفروضہ پر ہے کہ جمہور کے پاس وہ عقائد و یقینیات ہیں جن پر تعلیم کی بنیاد ہے اور جو مبادی کا درجہ رکھتے ہیں اس کو اپنی خامی، جہالت و ناتربیتی کا بخوبی احساس ہے اور اس لیے اس کو عقلی طور پر وہی تکلیف محسوس ہوتی ہے جو جسمی طور پر ایک پریشان حال فاقہ زدہ انسان کو اپنی غربت یا بھوک سے یا ایک مریض کو اپنے مرض سے محسوس ہوتی ہے۔ ان درسگاہوں اور تعلیمی مرکزوں کے بانی اور خادم جب اپنی مقدس تعلیمی مہم شروع کرتے ہیں تو اپنی جگہ پر بڑی سادگی کے ساتھ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ مبادی سے فرصت حاصل کی جا چکی ہے اور احساس و طلب پیدا کرنے کی پہلی منزل طے ہو چکی ہے، اب صرف اس احساس و طلب کی تکمیل کی منزل در پیش ہے۔ قوم کی تہذیب و تمدن کے نظر فریب مناظر اور اس کی مادی ترقی و شائستگی کے شاندار مظاہر ان کو اس کا یقین دلاتے ہیں کہ قوم ذہنی ارتقا اور عقلی و اخلاقی احساس کے بلند درجہ پر فائز ہے، اسلئے وہ ان تعلیمی مرکزوں کو ٹھیک اسی اعتماد و ذہنیت کے ساتھ قائم کرتے ہیں جس اعتماد و ذہنیت کے ساتھ کوئی بھلا آدمی گرمی کے موسم میں سبیل لگاتا ہے یا کوئی مخیر شخص شہر میں کوئی شفاخانہ قائم کرتا ہے۔ اور اس کے منتظر رہتے ہیں کہ لوگ اپنی ضرورتوں سے بے چین ہو کر اور اپنی خامیوں کو محسوس کر کے ان درسگاہوں کی طرف اسی احساس و طلب کے ساتھ رخ کریں گے اور وہاں بھی طالبین کا وہی ہجوم ہوگا جو پیاسوں کا کسی سبیل پر اور مریضوں کا کسی شفاخانہ میں روزانہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ انسانی فطرت کا بہت غلط اندازہ ہے، عقلی و روحانی احساس

وجدان کو مادی و جسمانی احساس پر قیاس کرنا اور دونوں کو ایک ہی سطح کا ماثل قرار دینا یا کسی قوم کی تعمیرات، فنون لطیفہ کی ترقی، یا معاشی جد و جہد سلیقہ مندی سے یہ فرض کر لینا کہ اس کا ضمیر بیدار ہے بالکل صحیح نہیں، ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں مادی فوائد کے حصول کی امید اور سرکاری عہدوں اور ملازمتوں کی لالچ کسی قوم کو ان تعلیمی مرکزوں اور سرکاری درسگاہوں کی طرف مائل کر دے اور پوری قوم کی قوم یا اس کی بڑی تعداد ان مدرسوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانے پر ٹوٹ پڑے جیسا کہ ہم تعلیمی سال کے شروع ہونے پر دیکھا کرتے ہیں، لیکن اس سے یہ رائے قائم کر لینا صحیح نہیں ہے کہ عوام میں علم کی قدر و قیمت اور تعلیم کی ضرورت و اہمیت کا احساس عام ہو، یہ دلچسپی بالکل سطحی اور عارضی ہے اور یہ اس کے ذہنی ارتقاء، اخلاقی احساس، اور تعلیمی ذوق کی مطلقاً دلیل نہیں، جس وقت قوم کے لئے اس تعلیمی نظام یا ان تعلیمی اداروں میں معاشی ترغیب و کشش باقی نہیں رہتی اس کی ساری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور یہ مقبول و محبوب تعلیمی ادارے اس کی سرپرستی اور امداد سے محروم ہو جاتے ہیں قومی و اصولی تعلیمگاہوں اور اصلاحی اداروں کو جو تعلیمی اور ذہنی حیثیت سے بہت کامیاب و ممتاز لیکن ملازمتیں دلانے سے قاصر ہیں اس کا خوب تجربہ ہے۔

انسانی تاریخ میں بہت کم ایسے دور آئے ہیں کہ جمہور کو اپنی اخلاقی و روحانی ضرورتوں کا احساس پورے طور پر ہوا ہو اور اس کے دل میں انکی تکمیل کا مخلصانہ تقاضا اور مطالبہ پیدا ہوا ہو، اور ان کے حصول کے لئے انھوں نے وہی جد و جہد کی ہو جو وہ اپنی مادی ضرورتوں کے لئے کرتی ہے، عموماً یہ کسی پیغمبر کی بعثت یا کسی بڑے روحانی مصلح و معلم کی تبلیغ اور اصلاحی جد و جہد کے بعد ہوا ہے۔ انکے حلقۂ اثر میں اپنے نقائص کا بشدت احساس، اپنی اصلاح کا سچا جذبہ اور علم کے حصول کا حقیقی ذوق نظر آتا ہے۔ ان کو اپنی زندگی میں ایسا شدید خلا اور اپنی ذات میں ایسے بدنما داغ نظر آنے لگے کہ ان کو اپنے وجود سے خود شرم آنے لگی، انکے پاس زندگی کی سب نعمتیں موجود تھیں اور سکون و اطمینان کا پورا سامان میسر تھا، لیکن علم کی کمی نے ان کو ایسا محسوس کرایا کہ گویا ان کی زندگی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خالی ہے۔ انھوں نے جب علم کے فضائل سنے اور یہ معلوم ہوا کہ اللہ کی معرفت اور آخرت کی فلاح بھی صحیح علم پر منحصر ہے تو انھوں نے علم کے حصول کو زندگی کا سب سے اہم اور مقدم کام سمجھا، اور اس کی اس طرح فکر کی جس طرح ضروریات زندگی کی فکر کی جاتی ہے، انکی طلب

کامل اور ان کے جذبۂ صادق نے ان کی طلب کی تکمیل کا سامان اس طرح پیدا کر دیا جس طرح پانی کا فطری مطالبہ اور زندگی کی اولین ضروریات کا احساس پیاس بجھانے اور زندگی کی ضروریات پوری کرنے کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

جن تعلیمی اداروں یا تعلیمی تحریکوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ پہلے لوگوں میں تعلیم کی ضرورت کا احساس اور علم کی طلب پیدا کی جائے۔ انھوں نے اول تو علم کو حرف شناسی اور خواندگی کا مرادف سمجھا دوسرے انھوں نے صرف اپنے مخاطبین کے دماغوں یا حواس کا خطاب کیا، انھوں نے صرف اس کے مادی منافع اور مصالح بتلانے پر اکتفا کی، وہ مجبور بھی تھے، انکے پاس قلب و روح کو متاثر کرنے اور اس کو اندر سے بے چین و بے قرار بنانے کا کوئی سامان نہ تھا۔ ان کو تعلیم دینے کے مواقع تو حاصل تھے مگر علم کے شوق اور عمل کے جذبات پیدا کرنے کے ذرائع حاصل نہ تھے، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ "توسیع تعلیم" کی کوشش کو پڑھے لکھے آدمیوں کا تناسب بڑھانے میں وہ کامیابی نہیں ہوئی جو ضروری علم دین کی اشاعت میں پیغمبروں اور دینی رہنماؤں کو ہوئی ہے۔ اس طریقہ کا دوسرا نقص یہ تھا کہ تعلیمی انتظامات کی فراہمی کی ذمہ داری اور ان کا بار تعلیم کی دعوت دینے والوں ہی کے سر رہا، اس لئے کہ قوم نے علم کو اپنی زندگی کی غذا اور اپنے مرض کی دوا نہیں سمجھا، بلکہ حکومت کا ایک فرض، اور اس ادارہ یا تعلیمی تحریک کا کام سمجھا جس نے تعلیمی مہم کو شروع کرنے کی "غلطی" کی تھی۔

۲۔ مدرسہ نے اپنے ہزاروں سال کی تاریخ اور تغیر و ارتقا میں اس حقیقت کو مسلسل نظر انداز کیا ہے کہ علم و عمل دونوں کے لیے محرکات و جذبات کی ضرورت ہے۔ محرکات و جذبات اور "محبت و عشق" کے بغیر مدرسہ کی پوری تعلیم اور کارکردگی محض الفاظ کی بے جان فہرست، کاغذ کے مردہ نقوش اور معلومات کا ایک جامد اور بے روح مجموعہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کی زندگی میں ہرگز وہ فرق نہیں پیدا ہو سکتا جس کی بنا پر زمانۂ قدیم سے اس وقت تک علم کی اتنی تعریف کی گئی ہے اور غیر تعلیم یافتہ انسان کو حیوان سمجھا جاتا رہا ہے، اس نے ہمیشہ اس نکتہ کو فراموش کیا کہ طاقتور محرکات یا جذبات طبعی دماغ سے نہیں بلکہ زندگی کے اس مرکز سے پیدا ہوتے ہیں جس کو مذہب و زبان کے عالمگیر ادب میں قلب سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کو متاثر کرنے کے لیے وہ سامان و

اختصاص ہمیشہ کافی دونوں نہیں ہوتے جو دماغ کو متاثر کرتے ہیں، قلب کو متاثر کرنے کے لیے ان صفات کے علاوہ جو دماغ کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہیں کچھ مختلف صفات و کیفیات درکار ہیں۔ مدرسہ نے زمانۂ قبل مسیح سے بیسویں صدی عیسوی تک برابر اس غلطی پر اصرار کیا ہے کہ دل کی جگہ بھی دماغ کی زائد مقدار سے پُر کی جاسکتی ہے اور جذبات و کیفیات کی معلومات سے، روحانیت کی فلسفہ سے، عشق کی عقل سے، نظر کی خبر سے، حال کی قال سے، ذوق کی علم سے خانہ پُری کی جاسکتی ہے۔ اس وقت سے جب کہ مدرسہ حروف پہچاننے اور کاغذ پر نقش بنانے کی تعلیم دینے کا ایک کارخانہ سمجھا جاتا تھا اس وقت تک کہ تعلیم کو مجموعی تربیت کا اور مدرسہ کو ایک زندہ معاشری ادارہ کا مرادف سمجھا جانے لگا ہے۔ مدرسہ کی تاریخ ملاحظہ ہو، اس بارہ میں آپ کوئی تفاوت نہیں پائیں گے، بلکہ اس شعبہ میں روز افزوں تنزل و انحطاط نظر آئے گا۔

اہل مدرسہ کو صدیوں سے اس کا تجربہ ہو رہا ہے کہ صحیح جذبات و محرکات کے بغیر ایثار و قربانی کی طاقت اور صبر و استقامت اور عمل کی وہ قوت نہیں پیدا ہوتی جو اس تعلیم کو نتیجہ خیز اور اس کے وسیع انتظامات اور شاہانہ مصارف کو حق بجانب ثابت کر سکے اور تعلیم یافتہ انسان ان ترغیبوں اور تحریصوں پر فتح نہیں پا سکتا جو اصول و اخلاق اور راہ راست سے برگشتہ کرنے کے لیے قدم قدم پر موجود ہیں۔ گزشتہ زمانہ میں ایک غیر تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ انسان میں نفس کی ترغیبات کا مقابلہ کرنے اور اخلاقی امتحان میں ثابت قدم رہنے کی جو قوت تھی آج ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک بڑی درسگاہ کے فاضل میں وہ قوت نظر نہیں آتی۔ ہم برابر دیکھ رہے ہیں کہ تعلیم یافتہ انسانوں کی ایک ایسی قطع پیدا ہوتی جا رہی ہے جس کے دل و دماغ کی تربیت میں کوئی تناسب نہیں اس کا دماغ حکیموں اور فلسفیوں کا، اس کی زبان شاعروں اور ادیبوں کی، لیکن اس کا پہلو انسان کے دل سے خالی اور اس کی زندگی آدمیت و شرافت کے جوہر سے عاری ہے۔ اور وہ اقبال کے الفاظ میں "شستہ رو تاریک جاں روشن دماغ" کی صحیح مصداق ہے، آج تعلیم کا ماحصل اس سے زائد نہیں جو اکبر نے دو لفظوں میں بیان کیا تھا کہ

زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

تعلیم یافتہ طبقہ اور صاحب اقتدار گروہ کے دل و دماغ کے اس عدم تناسب سے دنیا کی تہذیب

وتمدن میں ایک ایسا عدم توازن پیدا ہو گیا ہے جس نے نظام عالم کو درہم برہم کر رکھا ہے، ان تعلیم یافتہ انسانوں کے اقتدار کے زمانہ میں اور تعلیمی وسائل اور اداروں کی اس کثرت کے دور میں (جس کی نظیر تعلیم کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے) دنیا میں اس سے زائد اخلاقی انحطاط اور تاریکی نظر آتی ہے جتنی نیم وحشی اقوام کی حکومت و اقتدار میں نظر آتی تھی، بیسویں صدی میں دنیا محض بیوپار کی ایک منڈی اور لوہار کی ایک بھٹی بن کر رہ گئی ہے جہاں "درد" "عشق" "ایمان" "سیرت" کی دولت اور زندگی اور مذہب کی لطیف اور بلند تر حقیقتیں اور اقدار نا پید ہوتی جا رہی ہیں جہاں شکم پری اور تن پوشی کے علاوہ کوئی مقصد و معیار زندگی ہی نہیں معلوم ہوتا، لیکن اس سب کے باوجود مدرسہ کو اپنے نظام کی صحت اور اصول تعلیم کی صداقت پر اصرار ہے اور اپنی غلط روی کا ابھی تک احساس نہیں، وہ برابر محسوسات اور بدیہیات کا انکار کر رہا ہے، اس نے سیکڑوں سال کے انقلاب و ارتقا اور الٹ پھیر میں بہت سی ترمیمیں اور تغیرات اور نئے نئے تعلیمی تجربے کئے لیکن اس نکتہ میں ابھی تک اس نے قطعاً کوئی ترقی اور اصلاح نہیں کی اور نہ اس سلسلہ میں کسی تجربے اور تغیر کے لئے وہ سنجیدگی کے ساتھ تیار معلوم ہوتا ہے نظام تعلیم میں جو تغیرات یا اصلاحات پیش نظر ہیں، ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس قطع کے لوگ جو اس وقت تک پیدا ہوتے رہے ہیں زیادہ تعداد میں اور تھوڑے وقت میں زیادہ آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکیں، لیکن حاشا کسی کو خیال نہیں، کہ اس نظام تعلیم میں مظلوم دل کے ساتھ انصاف کیا جائے، اور اس کے غاصبوں سے اس کا حق دلایا جائے، ماہرین تعلیم کی مجلسوں میں اس مسئلہ کو اتنی اہمیت بھی حاصل نہیں جو اقامت خانوں کے نظم ونسق اور فنون لطیفہ کی تعلیم کے چھوٹے چھوٹے جزئیات کو بھی حاصل ہے۔

۳- مدرسہ نے اپنی تاریخ کی طویل ترین مدت میں تعلیم کا اصل ذریعہ "نفوس" کے بجائے نقوش کو سمجھا ہے، النفوس کو مدرسہ صرف اس حد تک ضروری سمجھا جس حد تک وہ نقوش کو کاغذ کے صفحات سے دماغوں تک منتقل کر سکیں، اس نے ان کی کامیابی ولیاقت کا معیار بھی یہی قرار دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نقوش کو کاغذ کی سطح سے اٹھا کر دماغ کی سطح پر منقش کر سکیں، اگر بعض تعلیمی مصلحتیں نہ ہوتیں اور ان تعلیم گاہوں کے منتظمین کا بس چلتا تو وہ اسباق کو ریکارڈ کر کے طلبہ کو بتانے کا انتظام کر دیتے اور انسان کو بیچ میں سے بالکل نکال دیتے، لیکن ابھی اس

ترقی میں دیر معلوم ہوتی ہے، اگرچہ مشکل تصادیر نے اس مسئلہ کو بہت حد تک آسان بنا دیا ہے، یہ سب دراصل اس بنیادی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ علم نوشت وخواند اور مجرد معلومات کا نام ہے، اگر علم انسانی استعدادون اور صلاحیتون کے معتدل نشوونما اور جسم، دماغ، دل اور روح تینون کی متوازن تربیت کا نام ہوتا تو "مدرسہ" انسانی نفوس کو اہمیت میں دوسرا درجہ نہ دیتا اور مدرسہ کے طالب علم قدرت کی ان عظیم طاقتون اور دولت کے سمور خزانون سے محروم نہ رہتے جو خالق فطرت نے انسانون کے قلوب میں ودیعت کئے ہیں اور جو کسی پہاڑ کے دامن یا کسی زمین کی تہہ میں نہیں پائے جاتے وہ انسانی قلوب کان سمندرون اور ان کے عجائبات سے کچھ نہ کچھ آشنا ہوتے جن کی تھاہ ابھی تک کوئی نہیں پاسکا اور انکی گہرائی تک کوئی غواص نہیں پہنچ سکا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو متعدد طاقتیں اور صفات رکھے ہیں، جنھون نے اکثر دنیا کو روشنی اور حرارت سے بھر دیا ہے مدرسہ ان کی تربیت سے پھر انکے منتقل کرنے سے برابر غفلت برتتا رہا ہے قدیم مشرقی مدرسہ میں معلم کی شخصیت پھر بھی محبوب اور مقتدیٰ تھی اور اس سے طالب علم کو اچھا خاصا لگاؤ اور قلبی تعلق رہا ہے جس نے کبھی شیفتگی اور فنا و محویت کا درجہ حاصل کرلیا ہے اور تاریخ نے ہمیں ایسے واقعات بھی سنائے ہیں کہ معلم کی غلط خبر وفات پر اس کے بعض شاگرد شدتِ غم سے مرگئے یا روتے روتے ان کی آنکھیں جاتی رہیں، مگر مغرب کے مادہ پرست نظام تعلیم نے اس قلبی تعلق کو بھی ختم کر دیا ہے، اس زمانہ میں مدرسہ کو ایک خوشگوار خاندانی ماحول میں منتقل کرنے اور اس کو ایک خوش اسلوب متعاون جماعت کی شکل میں مرتب کرنے کی طرف رجحان پایا جاتا ہے، لیکن اس کی تکمیل وتشکیل کے لیے جو ذرائع سوچے جاتے ہیں وہ تقریباً میکانکی اور قانونی ہیں، دل کو ڈھالنے اور درد و سوز اور عشق کی حرارت پیدا کرنے میں بیسوین صدی کے سائنس نے ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں کی ہے اور یہ متاع اس وقت تک بازار میں نہیں آئی جہان سے خرید کر مدرسہ میں رکھدی جائے اس لیئے ابھی تک مدرسہ میں حقیقی زندگی کی روشنی اور روحانی تعلق کی گرمی پیدا نہیں ہوئی اور وہ ایک مصنوعی ماحول سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

نقوش کبھی نفوس کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ کتابی نقوش میں روح اور حرکت نہیں،

وہ جامد اور منجمد ہیں ان میں زندگی میں گھل مل جانے کی قابلیت نہیں اور کاغذی لباسوں میں ہر قامت پر راست آنے کی صلاحیت نہیں، ان کے ساتھ زیادہ کشمکش کی گئی تو وہ تنگ کپڑے کی طرح مسک جائیں گے مگر ڈھیلے نہیں ہوں گے۔ انسان کی زندگی متحرک اور منقلب ہے، اسکے ساتھ وہی چل سکتا ہے جس میں حرکت اور ترقی ہو یہ کاغذی نقوش محدود و مقید ہیں، انکے مصنفین نے ان کو کاغذ کے سپرد کرکے ان پر ایسے قفل چڑھا دیئے ہیں کہ وہ خود بھی ان کو کھول نہیں سکتے، لیکن انسان کی زندگی تغیرات سے بھری ہوئی ہے انسان کے دماغ کی سلوٹیں اور اس کے دل کی شکنیں غیر محدود ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس پانی کی سطح پر کس وقت کونسی لہر آئیگی۔ ان سلوٹوں کو دور کرنے کے لیئے اور دل کی شکن کھولنے کے لیئے کسی زندہ انسان کی نگاہ چاہیئے، جس کے بوجھ کو بچہ کا نازک دل، ناکام زخمی قلب اور طالب علم کا تھکا ہوا دماغ بھی محسوس نہ کرے وہ دل کے غلافوں کو اس طرح کھولتی چلی جائے جس طرح نسیم سحر کا ایک لطیف جھونکا نرگس کی آنکھ اور غنچہ کا دہن کھول دیتا ہے، اس کے لیئے کبھی وہ جواب چاہیئے جس کو انسان کے کان سے پہلے اس کا دل سن لے، اس کے لیئے کبھی گویائی مفید ہے کبھی خاموشی کبھی دلیل مفید ہے، کبھی وجدان کبھی تجربہ مفید ہے، کبھی ایمان اور ایک روشن ضمیر اور صاحب دل ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس وقت کیا مناسب ہے۔

۴۔ اب ایک اور حقیقت پر غور کیجیے، مدرسہ میں جو علوم الفاظ کی شکل میں پڑھائے جاتے ہیں وہ دراصل زندگی کے حقائق و تجربات کے مخففات ہیں یعنی زندگی کے حقائق و تجربات کو چند اصطلاحات یا علامات کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے، یوں سمجھیے کہ ایک ضخیم کتاب کو جمل کے اعداد میں منتقل کر دیا گیا ہے، غالباً طوالت و اختصار کی جو نسبت ایک صفحہ اور اس کے اعداد کے مجموعہ میں ہے یا مثال کے طور پر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اور اس کے عدد ۷۸۶ میں ہے اس سے بڑی نسبت اور عظیم تفاوت ان علمی اور تجربی حقائق اور ان کے علمی و اصطلاحی علامات میں ہے جو مدرسہ میں رائج ہیں، یہ علمی و اصطلاحی علامات بلاشبہ اس شخص کے لیئے ایک قلمی یادداشت کا کام دے سکتے ہیں جو ان کا علمی تجربہ کر چکا ہے اور انکی علمی وسعتوں سے آشنا ہے یہ درحقیقت ایک ایسے سیاح کی مختصر یادداشت ہے جو ہزاروں میل کا

رقبۂ زمین طے کرتے ہوئے شہروں اور قصبات کے نام، انکی نمایاں خصوصیات، سمتوں، فاصلوں یا موٹی علامات کے ساتھ درج کرلیتا ہے تاکہ ان کو دیکھ کر اس کے حافظہ میں انکی یاد تازہ ہو جائے وہ جب ان پر نظر ڈالتا ہے تو تصویر کی طرح وہ سارے شہر اور مناظر اور انکی خصوصیات آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں اور چند منٹ میں وہ اس پورے رقبہ کے گرد چکر کرلیتا ہے جو اس نے کئی سال کی سیاحت میں طے کیا ہے، اس کا ہر نام اس کے لئے مشاہدات و تاثرات کی ایک مستقل دنیا اور دلچسپیوں کا ایک مرقع ہے جو اس کے نفس میں مخصوص ذہنی و جذباتی کیفیات پیدا کردیتا ہے کسی کو دیکھ کر وہ ہنسنے لگتا ہے کسی منظر کے تصور سے وہ آبدیدہ ہو جاتا ہے کہیں اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک اور کہیں اس کی پیشانی پر نفرت کی شکن پیدا ہوتی ہے۔

یہی حال زندگی کی حقیقتوں اخلاق کے اصول اور تجربات اور صدہا معانی و مضامین کا ہے وہ شہروں سے کہیں زیادہ وسیع، لطیف لوچدار اور پھسل جانے والے اور الفاظ کی آہنی و سنگین گرفت سے جس میں بہت کم لوچ ہے نکل جانے والے ہیں۔ لغت کے مرتبین و مصنفین نے ان کے معانی بیان کرنے کے وقت اور ان کے لئے مناسب علمی علامات وضع کرنے میں جن کو آپ مفردات کہتے ہیں بڑی دقتیں محسوس کی ہونگی ان کو قدم قدم پر اپنے عجز و درماندگی اور قلم کی گنگ بیانی کا تجربہ ہوا ہوگا لیکن ان کو بہرحال انسانی تمدن کا یہ لازمی فریضہ (ترتیب لغت کا کام) انجام دینا تھا اس لئے انھوں نے حقائق و معانی کا ایک ناقص اور ناکام ترجمہ کردیا کہ "علم نے بہ از جہل ہے" انھوں نے ان وسیع معانی کے لئے بہت محدود الفاظ وضع کئے اور وسیع الفاظ کے بہت محدود معانی بیان کرسکے، یہ الفاظ و مفردات مردہ ہیں، ان میں طالب علم یا خواندہ آدمی کی ذہانت تجربہ یا قیاس ہی جان ڈال سکتا ہے، ان چند الفاظ کو مستثنیٰ کرکے جن میں حکایت صوت پائی جاتی ہے یا ان کی ساخت کسی معنی کی مصوری اور غمازی کرتی ہے عام الفاظ و معانی میں کوئی مادی و محسوس مشابہت نہیں کہ ان کے دیکھنے سے یا سننے سے لازماً ان کے معنی کا تصور پیدا ہو جائے یہ مشابہت محض وضعی اور اصطلاحی ہے "خوف" "محبت" "شرافت" "دیانت" کے الفاظ سن کر ذہن کا ان کے معانی کی طرف منتقل ہونا محض ایک تجربہ پر مبنی ہے جو سننے والے کو اپنی لسانی واقفیت یا عملی زندگی میں حاصل ہے، یہ تجربہ جتنا وسیع اور متنوع

ہوگا اسی قدر اس کا ذہن اس میں نہ سلیقہ و تنوع معانی پیدا کریگا ورنہ بڑے سے بڑے لغت میں خوف کے معنی دو لفظوں میں بیان کر دیے گئے ہوں گے لیکن کیا اس سے اس کی تمام کیفیات اس کے گوناگوں تجربات اور اس کے ضروری متعلقات ذہن میں آسکتے ہیں؟

حضرات! ہم نے اصطلاحی مدرسہ کے امتیازی خصوصیات اور اس کے کمزور پہلوؤں پر ایک نظر ڈال لی ہو اب تعلیم و تربیت کے اس طریق پر نظر ڈالئے جو نوع انسانی کے سب سے بڑے معلم اور مربی (انبیاء علیہم السلام) نے اختیار کیا ہے ہم اس تقابل کے لئے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ کے تربیتی مرکزوں کو انتخاب کرتے ہیں کہ پیغمبرانہ طرز کی نمائندگی کے لئے اس سے بہتر عہد اور مقام نہیں مل سکتا اور تاریخ اور دینیات کے ذخیرہ نے صرف اسی عہد کی تفصیلات اور اس کے صحیح خدوخال محفوظ رکھے ہیں۔

اصطلاحی مدرسہ اور صناعی طریقۂ تعلیم کے برخلاف ہر پیغمبر کی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام بھی کسی مجرد تعلیمی دعوت یا کسی تعلیمی مرکز کے افتتاح یا کسی نصاب تعلیم کی ترتیب یا معلمین کے انتخاب سے شروع نہیں ہوتا، بلکہ ایمان اور مستقل دین کی دعوت سے شروع ہوتا ہے آپ نے چند حقیقتوں پر ایمان لانے کی عام دعوت دی اور اس کے لئے انتہائی دل نشین، عام فہم اور عمومی طریقے اختیار کیے جو اپنی معنوی بلندی اور معجزانہ خصوصیات کے ساتھ لوگوں کی ذہنی سطح سے پورا تناسب رکھتے تھے اور ان کی عقل عملی اور فہم عام کے بالکل مناسب تھے۔ کوہ صفا کا پہاڑی وعظ جو نبوت کی بہترین عام فہم تمثیل ہے اور جس کی نظیر پیغمبروں کے حکیمانہ مواعظ اور امثال کے ذخیرہ میں بھی نہیں ملتی اس کی بہترین مثال ہے۔ دعوت کے اس مرحلہ پر آپ نے کسی عجلت اور زود اثری سے کام نہیں لیا بلکہ مکہ معظمہ کے تیرہ سال زیادہ تر اسی ایمان و یقین کے پیدا کرنے میں صرف ہوئے۔

جن لوگوں میں آپ کی سیرت کی تاثیر، صحبت کے فیض اور قرآن مجید کے اثر سے ایمان و یقین کی یہ قوت پیدا ہو گئی اور ان کے قلب و دماغ میں ہر ایسی چیز کے جذب کر لینے اور امانت کے ساتھ محفوظ رکھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی جو انکے نزدیک علم و یقین کے سرچشمہ سے آئی ہے انکے قلوب شک و تذبذب، ان کے دماغ اشتباہ و اضطراب اور ان کے قویٰ بے عملی و تعطل سے

پاک ہو گئے، صحیح بات پر یقین کرنے اور پھر اس یقین پر جان دینے کی ان میں عادت پیدا ہو گئی "ثواب" "رضائے الٰہی" "نجات اخروی" "فلاح دارین" کے الفاظ میں ان کے لیے مقناطیس کی کشش پیدا ہو گئی، کسی چیز کی دینی فضیلت اور اخروی ثواب کا گمان ان کے قوائے دینی و عملی کے لیے دنیا کی سب سے بڑی محرک طاقت بن گئی، جو ان کی تمام خواہشات، عادات مصالح اور دنیاوی و نفسیاتی ترغیبات پر آسانی سے فتح پالیتی تھی، دلوں میں عشق کی چنگاری اور محبت کی حرارت پیدا ہو گئی جو ان سے وطن و دیار کو چھوڑا سکتی تھی اور دنیا کی ہر رکاوٹ اور مزاحمت کے خس و خاشاک کو جلا سکتی تھی اس وقت آپ نے ان کو بتلایا کہ دین کی اساس صحیح علم پر ہے علم کے بغیر خدا کی معرفت، اس کے احکام و قوانین کی واقفیت اور اس کی رضامندی و نارضامندی سے آگاہی ممکن نہیں، اور اس کے بغیر صحیح عمل اور دینی سیرت کا حصول عادۃً محال ہے، یہی وہ پیغمبرانہ ترتیب تھی جس کو صحابۂ کرام نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

تعلمنا الایمان ثم تعلمنا القرآن۔	ہم نے پہلے اللہ رسول کی باتوں پر یقین کرنا سیکھا پھر قرآن سیکھا۔

اس مرحلہ پر آپ نے ان میں ایک بہتر دینی زندگی کی تمنا اور اس کا شوق و ولولہ پیدا کیا انہیں اندر سے اپنی موجودہ حالت سے بے اطمینانی اور اپنے ماحول میں بے چینی و بے قراری پیدا کر دی، ان کی روح پیاسی ہو گئی اور دل کی گہرائی میں بے اطمینانی کی پھانس چبھنے لگی، انکو اپنی زندگی کے اندر ایک ایسا خلا محسوس ہونے لگا جو صرف علم سے پر ہو سکتا تھا، ان کو حصول علم کے بغیر ہر دن خطرہ کا اور موت جاہلیت کی نظر آنے لگی۔

انھوں نے وحی کے یہ الفاظ سنے،

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔	کیا صاحب علم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں۔
اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔	اللہ سے علم رکھنے والے ہی ڈرتے ہیں۔
وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ۔	ان باتوں کو علم والے ہی سمجھتے ہیں۔

آپ نے اس کے ساتھ ان کو علم کے فضائل سنائے، یہ وہ محرک طاقت تھی جس سے زیادہ طاقتور، زیادہ دیرپا جس سے زیادہ گہرے محرک کا دنیا نے آج تک تجربہ نہیں کیا اور اس سے بہتر نتائج کسی جذبہ نے انسانیت کی پوری تاریخ میں ظاہر نہیں کئے، آپ نے اس موقع پر نہ تو مادی منافع کا ذریعہ اختیار کیا جو ذہن پر بہت عارضی اور سطحی اثر ڈالتا ہے اور صرف انسان کے حیوانی احساس کو بیدار کرتا ہے جو بہت جلد سو جانے والا ہے، نہ حکماء یونان کی طرح خشک و بے لذت عقلی فوائد کا تذکرہ کیا جو انسان کی روح اور قلب کو مس کئے بغیر دماغ کے اوپر اوپر سے چلے جاتے ہیں، آپ نے اس کے لئے ایسی زبان میں گفتگو فرمائی اور انھیں ترغیبات کو اختیار فرمایا جو پیغمبر اور ان کے جانشین ہمیشہ اختیار کرتے رہے ہیں اور انسان کی قوت ارادی کو اس سے زیادہ حرکت میں لانے والی اور اس کی قوت عمل کو بیدار کرنے والی کوئی تعبیر و اصطلاح اور کوئی ترغیب و تحریک نہیں، ان فضائل کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ علم سے ان لوگوں کو دائمی تعلق پیدا ہو گیا اس لئے کہ وہ فضائل دائمی تھے، اور جس ذات کی نسبت سے ان میں فضیلت پیدا ہوتی ہے وہ ابدی اور سرمدی ہے۔

آپ نے فرمایا "جو طلب علم کے راستہ پر چلے گا، اللہ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کردے گا" (مسلم) "جو طلب علم میں نکلے گا وہ جب تک واپس نہ آجائے اللہ کے راستہ میں شمار ہوگا" (ترمذی) "طلب علم پچھلے گناہوں کا کفارہ ہے" (ترمذی) "دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں اللہ کی رحمت سے دور ہیں، سوائے اللہ کے ذکر[1] اس کے متعلقات اور عالم و طالب علم کے" (ترمذی) "عالم کو عابد پر وہی فضیلت حاصل ہے جو مجھے ادنیٰ امتی پر" (ترمذی) "فرشتے طالب علم کے کام سے خوش ہو کر اس کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں، عالم کے لئے آسمان و زمین کی مخلوقات یہاں تک کہ مچھلیاں پانی میں مغفرت چاہتی ہیں عالم کی فضیلت عابد پر وہی ہے جو چاند کی ستاروں پر ہے، علماء انبیاء کے جانشین ہیں انبیاء نے اپنے ترکہ میں دینار نہ درہم نہیں چھوڑے انھوں نے اس علم کی میراث چھوڑی زہے نصیب جس کے حصہ میں یہ آئے!" (ابوداؤد۔ ترمذی) "یا عالم بنو یا طالب علم یا غور سے سننے والا یا ان سے محبت

[1] جو کام اللہ کی اطاعت و رضا کے لئے شرعی طریقہ پر کیا جائے وہ سب ذکر ہے ۱۲

رکھنے والا جو ان میں سے کوئی نہیں وہ خطرہ میں ہے"۔ (جامع بیان العلم) عالم و طالب علم دونوں اجر میں شریک ہیں اور انکے علاوہ کسی میں خیر نہیں"۔

ان فضائل نے صحابۂ کرام کو علم و تعلم کے عشق میں ایسا سرشار کر دیا کہ انھوں نے اس کے لیے نہ موسم کی سختیاں دیکھیں نہ ملکوں کے فاصلے اور مسافتیں ان کو یقین تھا کہ وہ بڑی فضیلت والی عبادت میں مشغول ہیں اس لیے وہ اس کو اسی ذہنیت و نیت، اسی جذبۂ و شوق اور اسی صبر و مجاہدہ کے ساتھ انجام دیتے جس ذہنیت و نیت کے ساتھ نماز و حج کے فرائض انجام دیتے۔

زر بن حبیش کہتے ہیں میں صفوان بن عسال کے پاس موزوں پر مسح کرنے کا مسئلہ سننے گیا صفوان نے مجھ سے کہا کیسے آئے؟ میں نے کہا علم کی طلب میں! فرمایا فرشتے طالب علم کے عمل سے خوش ہو کر اس کے لیے پر بچھاتے ہیں (ترمذی)

ابن عباس کہتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی کہ فلاں صحابی کے پاس ایک حدیث ہے، ہو سکتا تھا کہ میں ان کو بلا بھیجوں وہ فوراً تشریف لے آتے اور مجھے حدیث سنا دیتے لیکن میں خود چل کر جاتا ان کے دروازہ پر جا کر دوپہر کے وقت پڑ جاتا جب وہ نکلتے تو میں حدیث سنتا (جامع بیان العلم)

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک حدیث کی اطلاع ملی جو صرف ایک صحابی کے پاس تھی میں نے اونٹ خریدا اس پر کجاوہ کسا، پھر مہینہ بھر چل کر شام پہونچا وہاں عبداللہ بن انیس انصاری کے مکان پر آیا اور ان کو اطلاع کی کہ جابر دروازہ پر حاضر ہے، انھوں نے کہلوایا کہ کیا جابر بن عبداللہ؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! وہ فوراً تشریف لے آئے، ہم دونوں ایک ایک دوسرے سے معانقہ کیا، میں نے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ایک حدیث حضور سے سنی ہو اور مجھے اس کے سننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اسی غرض کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

ابو ایوب انصاری حضرت عقبہ بن عامر کے پاس ایک حدیث کے سننے کے لیے مصر تشریف لے گئے انھوں نے سنا تو ملنے کیلئے آئے حضرت ابو ایوب نے فرمایا کہ ایک حدیث آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اس وقت آپ کے سوا اس کا سننے والا نہیں ہے، اسی کے معلوم کرنے کے لیے آیا ہوں۔ (جامع بیان العلم)

علم کی اس اہمیت اور فضائل کی وجہ سے ضروری علم حاصل کرنا اس دور کے

ہر مسلمان نے اپنا ذاتی کام اور اپنی زندگی کی ایک اہم ضرورت سمجھ لی تھی جس کی ذمہ داری ہر شخص فرداً فرداً اپنے اوپر سمجھتا تھا اور وہ کسی ادارہ یا جماعت یا حکومت کی طرف نہیں دیکھتا تھا وہ اس کے لیے وہی فکر و اہتمام کرتا جو مادی ضروریات زندگی خورد و نوش اور لباس و مکان کے لیے کیا جاتا ہے۔

ایک طرف آپ نے عام مسلمانوں کو طلب علم اور دین سیکھنے کے فریضہ کی طرف متوجہ کیا اور اس کا بوجھ خود ان کے کاندھوں پر ڈالا، ان کو خود اپنی اس ذاتی ضرورت کا احساس دلایا اور اس کا طالب بنایا، دوسری طرف علم رکھنے والوں کو ان کا فریضہ بتلایا اور ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا اور جو خود جانتے ہیں اس کو دوسروں کو سکھلانے کے فضائل سنائے اور علم میں بخل و سکوت کے خطرات سے ڈرایا۔

آپ نے فرمایا اللہ اور اس کے فرشتے آسمانوں اور زمین کی مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹیاں سوراخوں میں اور مچھلیاں لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والوں کے حق میں دعا کرتی ہیں۔ (ترمذی)

رشک کا موقع دو آدمیوں پر ہے ایک وہ جس کو اللہ نے مال دیا اور وہ حق کے راستہ میں اس کو صرف کرنے پر اترا ہوا ہے دوسرا جس کو اللہ نے حکمت عطا فرمائی وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔ (بخاری۔ مسلم)

اللہ اس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے ہم سے کچھ سنا اور جیسا سنا دوسروں تک پہونچایا، ایسا بہت ہوتا ہے کہ جس کو پہونچایا گیا ہے وہ اس سے زیادہ سمجھنے اور یاد رکھنے والا ہو جس نے اپنے کانوں سے سنا (ترمذی) میری طرف سے دوسروں کو پہونچاؤ چاہے ایک ہی آیت (بخاری)

جس سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی اور اس نے چھپائی قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی۔ (ابو داؤد۔ ترمذی)

ان دو طرفہ فضائل اور تاکیدوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ کی پوری مسلمان نو آبادی ایک غیر اصطلاحی مدرسہ میں تبدیل ہو گئی جس کا ہر فرد یا تو طالب علم تھا یا معلم اور بعض اوقات ایک ہی شخص اپنے لیے طالب علم تھا اور دوسرے کم جاننے والوں کیلئے معلم، دنیا کی تعلیمی تاریخ میں بغیر کسی مادی اہتمام و صرف اور بغیر کسی جبر و تشدد کے پوری آبادی کے مدرسہ کی

زندگی میں منتقل ہو جانے کی یہ ایک شاذ مثال تھی جس کی نظیر شاید نہ مل سکے۔

اس وقت کا کوئی کاشتکار، تاجر، مزدور، بالغ وجائداد کا مالک، ملازم، غلام، مرد اور عورت تعلیم سے مستثنیٰ نہ تھا، وہ دن اور رات کے کسی نہ کسی حصہ میں ضرور تعلیم حاصل کرتا تھا۔ ان میں ایک جماعت ایسی تھی جو باقاعدہ طالب علم یا عالم کہلاتی تھی وہ دن کو مزدوری یا تجارت کرتے تھے اور رات کو پڑھتے تھے۔

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ جن کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں "قراء" (طالب علم یا عالم) کے نام سے پکارتے تھے وہ تعداد میں ستر تھے۔ رات کو وہ مدینہ میں اپنے استاد کے پاس جاتے اور صبح تک پڑھتے رہتے صبح کو ان میں جو طاقتور ہوتے وہ میٹھا پانی بھر کر لاتے اور مزدوری کرتے یا لکڑی کاٹ کر لاتے اور فروخت کرتے جن کو گنجائش ہوتی وہ جمع ہو کر بکری خرید لیتے اس کو بناتے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجروں کے پاس لٹکی رہتی (مسند احمد)

ان باضابطہ طالب علموں کے علاوہ مدینہ کی آبادی کا ہر فرد طالب علم تھا، اس مدرسہ کا سب سے بڑا حلقۂ درس اور سب سے عمومی جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک تھی جس کا شریک درس دنیا کا سب سے بڑا عالم، فقیہ اور حکیم بن کر نکلا، اس مجلس میں صحابۂ کرام کو شریک ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کا اتنا اہتمام تھا کہ بعض لوگ روزانہ مجلس نبوی میں حاضر نہ ہو سکتے تو باری باری سے ایک دن حاضر ہوتے اور جو کچھ اس مجلس میں پیش آتا اسکی اپنے رفیق کے ذریعہ اطلاع حاصل کرتے، جس دن وہ حاضر نہ ہو سکتے اس دن ان کو ایک بے کلی سی رہتی اور انتظار رہتا کہ آج وہاں کیا پیش آیا اور لوگوں نے آج کیا درس لیا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "میں اور میرا انصاری پڑوسی بنی امیہ بن زید کے محلہ میں (جو مضافات مدینہ میں تھا) رہتے تھے ہم دونوں باری باری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے ایک دن وہ حاضر ہوتا اور ایک دن میں، جس دن میں حاضر ہوتا اس دن کی اطلاع اور احکام وغیرہ اس کو پہونچا دیتا اور جس دن وہ حاضر ہوتا اس دن کی اطلاعات اور احکام مجھے پہونچا دیتا (بخاری)

صحابۂ کرام معاشرت کے احکام، اخلاق و آداب اختلاط و صحبت کی زندگی سے ٹھیک اسی فطری و طبعی طریق سے سیکھتے تھے جس طرح اہل زبان میں رہ کر زبان سیکھی جاتی ہے اور مہذب و شائستہ لوگوں کی صحبت میں سلیقہ، حسن معاشرت اور آداب زندگی کی تعلیم حاصل کی جاتی ہے۔

یہ علم ان کے قوائے عقلی اس طرح ہضم کرتے تھے جس طرح طبعی غذا کو تندرست آدمی ہضم کر لیتا ہے اگر اس میں ارتقا اور اضافہ تھا تو وہ بھی طبعی اور تدریجی تھا جس کا بار ان کا دل و دماغ بالکل محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس میں نہ صرف ان کے عقلی ہضم کا لحاظ رکھا جاتا تھا بلکہ ان کی طبعی طلب اور شوق کا بھی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ان کے سامعین نے فرمائش کی کہ وہ روزانہ ان کو مستفیض فرمایا کریں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ناغہ سے ہدایتیں اور نصائح فرمایا کرتے تھے کہ کہیں ہم اکتا نہ جائیں (بخاری)

فقہاء صحابہ اور حکماء امت اس بارہ میں قوت اخذ اور فہم کے مراتب کا بھی لحاظ رکھتے تھے اور مختلف سطح سے بات کرنا اور تعلیم دینا ضروری سمجھتے تھے، حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ لوگوں کے عقل و فہم کے درجہ اور سطح کے مطابق بات کرو کیا یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ و رسول کی باتوں کو جھٹلانے لگیں۔

مدینۂ طیبہ کے اس طبعی مدرسہ میں اگرچہ علمی تعلیم کا سلسلہ شب و روز جاری رہتا تھا لیکن پھر بھی محلوں کا تفاوت، کاروبار کی مشغولیت، مشاغل زندگی کا تنوع و اختلاف پورے اختلاط، ایک دوسرے کے مطالعہ اور استفادہ میں کسی حد تک حارج تھا۔

لیکن مدینہ طیبہ کی زندگی میں بڑی کثرت سے اس کے مواقع آتے تھے کہ یہ دیواریں درمیان سے ہٹ جاتیں اور آبادی کا بڑا حصہ ایک وسیع دار الاقامہ میں تبدیل ہو جاتا جہاں سب ایک جگہ رہتے، ایک جگہ سوتے، ایک جگہ کھاتے، ایک جگہ نمازیں پڑھتے ایک دوسرے کو اس کی طبعی و بے تکلف حالت میں اس کے اصلی اخلاق اور طبیعت کے مظاہر میں دیکھتے، طبقات کی اونچ نیچ پہلے بھی نہ تھی لیکن اس موقع پر بالکل ہی باقی نہ رہتی، یہ سفر جہاد کے مواقع تھے جو ہجرت کی زندگی میں بہت جلد جلد پیش آتے، ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوگا۔ کہ مدینہ طیبہ کے دس

سال کی مدت میں ستائیس بار ایسے مواقع پیش آئے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ سے باہر نکلے ہیں اور مسلمانوں کی بڑی جمعیت آپ کے ساتھ تھی۔ بعض مواقع ایسے بھی پیش آئے۔ کہ مدینہ منورہ میں چند متنفس ہی باقی رہ گئے جو کسی عذر کی وجہ سے باہر نہ جا سکے مثلاً تبوک کی مہم جو شام کی سرحد پر پیش آئی؛ آخری حج اور فتح مکہ۔ ان کے علاوہ کئی سو کی تعداد میں وہ ہیں جن میں آپ بنفس نفیس شریک نہیں تھے۔ صحابہ کرام تنہا گئے۔

ان سفروں میں فقہ کے احکام اور شریعت کے مسائل اعمال میں منتقل ہو جاتے، معقولات محسوسات بن جاتے، مفروضات واقعات ہو جاتے اور مسموعات مشاہدات کی شکل اختیار لیتے اب تعلیم سراسر تجربہ تھی، علم کلیۃً عمل تھا اور زندگی سراپا حرکت، ان موقعوں پر جنھوں نے مسائل و احکام سیکھے وہ انکے ذہن پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو گئے، امت کا بڑے سے بڑا فقیہ انکے سمجھنے اور یاد رکھنے میں انکی ہمسری نہیں کر سکتا، ان کے ذریعہ سے ان مسائل نے عالم میں سب سے پہلے ظہور کیا، مسئلہ ان کے قوٰی کے ذریعہ عمل میں منتقل ہوا اسی لئے بعض بعض صحابہ کسی کسی کے پوچھنے پر فرماتے تھے علی یدیہ دار الحدیث سارا قصہ میرے ہاتھوں ہوا ہے، تیمم، غسل، نماز قصر، صلوٰۃ الخوف اور کتنے مسائل ہیں جن کو انھوں نے اپنی اصلی حالت میں، اور طبعی اوقات میں سیکھا اور پھر دنیا کو سکھایا پھر سفر کتاب زندگی کا ایک مستقل باب ہے، اس کے علیحدہ عنوانات اور مستقل فصلیں ہیں انسان کی زندگی کے بہت سے پہلو سفر کے علاوہ کبھی پیش نہیں آتے، وہ نئی ذمہ داریاں، نئے امتحانات کو لے کر آتا ہے، سفر میں بعض اوقات انسان کے اندر دوسرا انسان نظر آتا ہے جو قیام و سکون کی ساری مدت میں نظر سے مخفی رہا اسی لئے حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے جو کسی دوست کی تعریف میں مبالغہ کر رہا تھا فرمایا کہ کبھی تمہارا اس سے معاملہ پڑا ہے کہا نہیں، فرمایا کبھی ساتھ سفر کیا ہے؟ کہا نہیں، فرمایا پھر تمھیں اسکی تعریف کرنے کا حق نہیں۔

حقوق و فرائض کی ادائیگی، ایثار، انصاف و دیانت، جذبات و امداد باہمی جفاکشی، عالی حوصلگی، فراخ دلی، اللہ تعالیٰ سے دائمی تعلق، دینی استقامت یہ سب وہ صفات ہیں جن کی پوری تصدیق سفر ہی میں ہو سکتی ہے جو اس کسوٹی پر پورا اترا وہ کھرا

سونا ہے، جس کو پھر کوئی صرّاف رد نہیں کر سکتا۔ صحابۂ کرامؓ نے اپنے معلموں اور داعیوں کو اسی کسوٹی پر پرکھا تھا، اور خود اسی کسوٹی پر پورے اُتر کر انھوں نے دنیا کے بہترین معلم بننے کا استحقاق حاصل کیا تھا۔

مدینۂ طیبہ کی شہری زندگی میں زندگی کے اصول و حقائق اس طرح گھلے ملے اور وہاں کی فضا اور ہوا میں اس طرح بسے ہوئے تھے کہ وہ جو کچھ محسوس کر رہے تھے، جو کچھ دیکھ رہے تھے، جو کچھ سُن رہے تھے وہ سب دین اور علم ہی تھا۔ کان سے جو کچھ سنتے تھے، آنکھ سے وہی دیکھتے تھے۔ دماغ جو کچھ سمجھتا تھا دل اسی کی لذت محسوس کرتا تھا۔

وہاں مخففات اور علامات کی تعلیم نہ تھی، بلکہ حقائق بالکل اپنی فطری اور طبعی حالت میں موجود تھے دریا اور دریا کی تصویر، باغ اور باغ کے نقشے، پہاڑ اور پہاڑ کے لفظ میں جو فرق ہے وہی فرق مدرسے اور اُن کی زندگی میں تھا، یہاں اشیاء کی علامات اجسام کی تصویریں اور معانی کے الفاظ ہیں، وہاں اصل اشیاء، حقیقی اجسام اور عین معانی تھے۔ ایک برِّاعظم اور اس کے جغرافی نقشے میں جو فرق ہے وہی اُن کے علم اور مدرسہ کے طالب علم کے علم میں فرق ہے۔ جس طرح ایک برِّاعظم کو کاغذ کے ایک صفحے پر دکھا دیا جاتا ہے اسی طرح وسیع معانی کو جن کی وسعت بعض اوقات ایک برِّاعظم سے بھی زیادہ ہوتی ہے سہ حرفی اور چہار حرفی لفظ میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح نقشے پر پہاڑوں کی صلابت، دریاؤں کی روانی اور میدانوں کی شادابی محسوس نہیں کی جا سکتی، اسی طرح ان معانی کی کیفیات اور انکی لذتوں کا حروف سے ذائقہ نہیں چکھا جا سکتا۔

آج مدرسہ کا طالب علم اپنی تعلیم کے پہلے مرحلے میں ایثار کا لفظ سیکھ لیتا ہے، اور معلم نے اس کا جو ترجمہ کسی دوسرے مفرد لفظ سے یا کسی جملے سے کیا ہے اس کو یاد کر لیتا ہے۔ لیکن کیا وہ اس جذبے کی گہرائی اور اس کی وسعت کو سمجھتا ہے؟۔

صحابۂ کرامؓ نے ایثار کو اس کی عملی اور انتہائی مثالوں سے سمجھا تھا۔ حضرت ابو طلحہ انصاریؓ اپنے گھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مہمانوں کو لیکر آئے، دریافت کیا کہ مہمانوں کیلئے کچھ کھانے کو ہے معلوم ہوا صرف بچوں کا کھانا رکھا ہے، فرمایا! اچھا بچوں کو سلا دو اور چراغ گل کر دو، مہمانوں کیساتھ کھانا کھانے بیٹھے تو خالی ہاتھ منھ تک لے آتے اور مہمانوں کو محسوس کراتے کہ وہ کھانے میں شریک ہیں خود بھوکے اور مہمان سیر ہو کر اٹھے، یہ واقعہ صحابۂ کرامؓ کے علم میں آیا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے

تحسین فرمائی، قرآن مجید میں اس صفت کی تعریف آئی ویؤثرون علے انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ انصاری اپنے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود ان کو تنگی ہو، صحابۂ کرام رضؓ نے ایک لفظ سیکھا اور ان کو معلوم ہوا کہ "ایثار" کسے کہتے ہیں !۔

عبداللہ بن رواحہؓ خیبر فصل کا غلہ لینے جاتے ہیں، یہودی اُن کو رشوت دینا چاہتے ہیں، وہ انکار کرتے ہیں اور خود یہودیوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں اور ایک حبّہ زیادہ نہیں لیتے، یہودی پکار اٹھتے ہیں کہ یہی عدل ہے جس پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ سننے والوں نے ایک نیا لفظ سیکھا اور انکو معلوم ہوا کہ عدل و امانت کس کو کہتے ہیں !۔

خبیب (رضی اللہ عنہ) پھانسی کے تختے پر ہیں، ایک شقی نیزہ مارتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ کیا تم اس پر تیار ہو کہ تمہاری جگہ محمدؐ (علیہ السلام) ہوں، اور تم بچ جاؤ۔ فرمایا! میں تو اس پر بھی تیار نہیں کہ اُن کے تلوے میں کانٹا بھی چبھے اور میں بچ جاؤں۔ یہ واقعہ مدینۂ منورہ پہونچا، صحابۂ کرامؓ کے ذخیرۂ لغت میں اضافہ ہوا، اور اُن کو معلوم ہوا کہ محبت کسے کہتے ہیں ؟۔

یہ چند مثالیں تھیں۔ اخلاقی اصطلاحات، لطیف معانی، دین کے مفردات سب انھوں نے اسی طرح سیکھے تھے، آج یہ الفاظ مدرسہ و مکتب کی چار دیواری میں نہایت ارزاں اور مقررین و مصنفین کی زبان و قلم پر بڑے ہلکے ہیں، ہماری زبان و ادب اور ہماری عملی زندگی میں وہ اپنی قیمت اور قوت کھو چکے ہیں اس لئے کہ ان کے پیچھے عملی مثالیں اور مشاہدات نہیں ہیں اور ہماری عملی زندگی ان کی کیفیات و حسیات سے خالی ہو چکی ہے۔

یہی حال اخلاقی اصولوں اور دینی تعلیمات کا تھا۔ ان سب تک وہ اپنے پاؤں چل کر پہونچے تھے وہ ان راستوں کے نشیب و فراز اور سرد و گرم سے خوب واقف تھے، ان کی ایمانی صداقت مکہ کی گرم ریت اور جلتے ہوئے پتھروں پر آزمائی گئی تھی، ان کی امانت و عدالت کا بارہا سونے چاندی سے امتحان لیا گیا تھا اور وہ ان سے زیادہ کھری نکلی تھی، ان کی محبت وطن و دیار اور خویش و اقارب کے تعلق سے بلند ہو چکی تھی، ان کا صبر فاقہ، غربت اور مظلومیت کے مرحلوں سے گذر چکا تھا، اسی تعلیم و تجربے کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی حکمت نظری نہ تھی بلکہ عملی تھی، وہ جتنے زبان کے بلیغ تھے اس سے زیادہ عقل کے بلیغ تھے، ان کو اپنے علم کو صحیح محل پر صرف کرنے اور اپنی خداداد بصیرت سے وقت پر کام لینے کا ملکہ

حاصل ہو گیا تھا، وہ واقعات وحقائق کو ٹھیک اُسی حالت میں دیکھتے تھے اور ان کی اتنی ہی قیمت قائم کرتے تھے جو خالقِ فطرت نے قائم کر دی ہے۔

اُن کا علم زیادہ پھیلا ہوا نہیں تھا لیکن گہرا اور پختہ تھا، اُن کے پاس معلومات کی اتنی فراوانی اور جزئیات کی اتنی کثرت نہ تھی جو بعد کے لوگوں کے یہاں ملتی ہے لیکن ان کو علم کا سرا ہاتھ آ گیا تھا، انکے یہاں علمی موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں نہ تھیں، لیکن ان کو علم کا مغز اور حقیقت کا لب لباب حاصل تھا۔ ان میں سپاہیوں کی سی سادگی، اہلِ تجربہ کی حقیقت پسندی، اور مشغول آدمیوں کا سا اختصار تھا۔ اُن کی اہم تقریریں بھی جنھوں نے بڑے بڑے انقلابات برپا کر دیئے ہیں، حشو و زوائد سے پاک اور سراپا مغز ہیں، انکے اقوال وکلمات اور اُن کے خطبات ملاحظہ ہوں، سراسر متن ہیں جن کی شرح میں ضخیم مجلدات لکھے جا سکتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے چند لفظوں میں ان کی تعریف کی ہے، اس تعریف میں وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو صحابہؓ کی سیرت کا امتیاز ہے، وہی بلاغت، وہی سادگی، وہی صداقت، وہی اختصار۔

ابرّ الناس قلوبا واعمقهم علما واقلّهم تكلفا — صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے علم کے گہرے، اور تکلفات سے دور تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان بادیہ نشینوں کو دنیا کی تنظیم جدید کے بالکل نئے کام سے سابقہ پڑا جس کا ان کو پہلے قطعاً تجربہ نہ تھا، اور دنیا کی وہ متمدن سلطنتیں ان کی تولیت میں آئیں جہاں ہزاروں برس سے یونان وروم اور ایران کی حکمتوں، فلسفوں اور نظامِ سلطنت کے تجربات کا ذخیرہ جمع ہو رہا تھا اور جس زمین پر دنیا کے ذکی ترین حکماء، فلاسفہ، قانون ساز اور سیاسیین نے استعداد و اجتہاد کے جوہر دکھائے تھے تو انھوں نے ان کو اس طرح اپنے ضبط ونظم میں کر لیا جس طرح طاقتور چوپان بھیڑوں کے گلّے کو اور ضابطہ معلم مکتب کے بچوں کو کر لیتا ہے۔ انھوں نے پرانی قبا سلطنت کو ادھیڑ کر دوبارہ اس طرح سیا کہ اس میں کوئی جھول باقی نہیں رہا، انھوں نے ان گرتی ہوئی سلطنتوں کو سنبھال لیا اور ان میں نئی زندگی، روحانیت، اخلاقی احساس، بہتر تنظیم اور دینی شعور پیدا کر دیا۔ انھوں نے ان کو صحیح مذہبیت، بہتر تہذیب، عادل سیاسی نظام، کارآمد تعلیم عطا کی۔ انھیں میں بغیر کسی دقّت کے بہتر سے بہتر قاضی، خازن، محتسب، قائد اور مشیر مل گئے جنھوں نے روم اور ایران کی شہنشاہیوں کو فوراً سنبھال لیا، اور دیکھتے دیکھتے اپنے نئے سانچے میں ڈھال لیا۔ اور قرآن کا یہ کہنا ثابت ہو کر رہا کہ

یہ سب اس امی کا فیض تھا جس نے اپنی تعلیم سے امیوں کو دنیا کا معلم اور ہادی بنا دیا اور جہالت و ضلالت کی پست سطح سے اُٹھا کر دنیا کی رہنمائی کے منصب تک پہونچا دیا۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ (الجمعہ)

حضرات!

ہم نے پیغمبروں کے طریقۂ انقلاب و اصلاح اور پیغمبرانہ تعلیم و تربیت کے بعض پہلوؤں کو دیکھا اور ان کے نتائج بھی ہمارے سامنے آئے، بات بے نتیجہ رہے گی اگر ہم چلتے چلتے اس پر غور نہ کریں کہ ہم اپنی موجودہ زندگی اور اصطلاحی مدرسہ میں اس سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں، اور کن چیزوں کا ہم اپنے نظامِ تعلیم و تربیت یا شہری زندگی میں اضافہ کر کے اس کے بعض ایسے نقائص دور کر سکتے ہیں جو اب سب کو محسوس ہونے لگے ہیں، اور سب کو تسلیم ہیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم و تربیت کی بنیاد ایمان و یقین اور دین پر ہونی چاہئے اس کے بغیر ہمارا سارا نظام کھوکھلا سطحی اور بے بنیاد رہے گا۔ پائیدار بنیاد اور صحیح محرکات عمل اور جذبات دین کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے، اور صحیح محرکات و جذبات کے بغیر علم محض دماغی تعیش اور بے عملی و فلسفہ آرائی ہے۔ مغرب میں اس کا پورا تجربہ ہو چکا جس پر مزید اضافے کی گنجائش نہیں۔ اگر ایک طالب علم کی متعدد زندگیاں اور جوانیاں ہماری تعلیم گاہوں کو تجربہ کرنے کے لئے ملتیں تو اس خطرناک و بے حاصل تجربے میں کسی حد تک مضائقہ نہ تھا، لیکن ایک طالب علم کے صرف ایک بچپن ایک جوانی اور پورے سرمایۂ زندگی کو اور اس طرح قوم و ملک کے بہترین سرمایہ کو تجربے کی بھٹی میں ڈالنا اور اپنے قیاسات اور آزمائشوں کا تختۂ مشق بنانا اس سے زیادہ خطرناک اور غیر ذمہ دارانہ فعل ہے جتنا بچوں کو سچے موتی اور جواہرات کھیلنے کے لئے دیدینا۔ قمار بازی ہر حالت میں قابلِ مذمت ہے لیکن انسانی زندگیوں کے سرمایہ کو جوئے پر لگا دینا بالکل معاف کئے جانے کے قابل نہیں۔ ہزاروں برس کا تجربہ ثابت کر چکا ہے کہ فلسفہ اور علم، یقین اور سیرت و کردار کے پیدا کرنے سے بالکل قاصر ہیں، ان کے پیدا کرنے کے لئے انسانیت کی پوری تاریخ میں صرف ایمانی تربیت اور صاحبِ یقین اور صاحبِ درد اشخاص کی صحبت و معیت ہی ہے۔ دل، دماغ اور روح و جسم چاروں انسانیت کے ضروری شعبے ہیں، ایسے

کسی کا حق کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔ دل کا چھوٹے سے چھوٹا گوشہ دماغ کی بڑی سی بڑی مقدار سے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس ناانصافی پر مزید اصرار اور واقعات کا انکار علم کی حقیقت پسندی کے شایانِ شان نہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ہمیں اپنی شہری آبادیوں میں بھی ایمان ویقین اور طلب و احساس پیدا کرنے یا ان کو بڑھانے کا بنیادی کام کرنا چاہئے۔ ہمارے "مدرسہ" اور نظام تعلیم کی بنیاد دراصل اس اینٹ پر نہیں ہے جو کسی تعلیم گاہ کی بنیاد کے طور پر رکھی جاتی ہے نہ مدرسہ کا استحکام ان سنگین دیواروں اور اونچے میناروں پر ہے جو کسی تعلیمی عمارت کی زیب وزینت ہیں بلکہ عوام اور جمہور کے ایمان ویقین اور احساس و طلب پر ہے، جس درجہ یہ ایمان ویقین اور احساس وطلب طاقتور اور عام ہونگے اسی درجہ تعلیم گاہ غیر متزلزل اور نظام تعلیم مستحکم ہوگا، اور جس کثرت و عمومیت کے ساتھ یہ یقین اور تعلیمی احساس افراد جمہور میں پایا جائے گا اسی قدر تعلیمی دعوت موثر، تعلیمی جدوجہد نتیجہ خیز اور مدرسے کی اندرونی تعلیمی وتربیتی کوشش بار آور ہوگی، اور تعلیم گاہیں طالب علموں سے آباد ہوں گی۔ مدرسہ کے شاداب درخت کی جڑ مدرسہ کی زمین میں نہیں ہے بلکہ مدرسہ سے باہر قوم کے دلوں اور دماغوں میں ہے، یہ جڑ جب خشک ہو جاتی ہے تو اس کی شاخوں کو مصنوعی طور پر ہرا نہیں رکھا جا سکتا، اور مدرسہ کے اندر انکو پانی دے کر درخت کو زیادہ دیر تک زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر مدرسہ کے باہر یہ بنیادی کام نہیں کیا گیا تو اس کا ابتدائی نقصان تو یہ ہو گا کہ مدرسہ کو طالب علم ملنے مشکل ہو جائیں گے اس لئے کہ طالبِ علم قوم کے جذبۂ طلب اور احساس وضرورت کا ایک قدرتی نتیجہ ہیں، جس طرح کسی درخت کا پھل اُسکے صحیح نمو اور اس کی زندگی کی علامت ہے اسی طرح طالب علم قوم کے احساس فرض اور جذبۂ تکمیل کا طبعی ثمر ہیں۔ اگر کسی قوم کو تعلیم وتربیت کی ضرورت کا صحیح احساس نہیں، اور علم کی کمی یا فقدان پر اس کو اپنی زندگی میں کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا تو وہ زیادہ دنوں تک یہ ایثار نہیں کر سکے گی کہ اپنے فرزندوں کو اپنی گود سے نکال کر مدرسہ کے آغوش میں ڈال دے اور اپنی آنکھوں سے اوجھل کر دے۔ اگر اس کا ذہن تربیت یافتہ اور اس کی نگاہ دور بین نہیں ہے تو وہ نقد کو (خواہ وہ کتنا کم ہو) قرض پر (خواہ وہ کتنا زیادہ ہو) حال کو (خواہ وہ کتنا حقیر ہو) مستقبل پر (خواہ وہ کتنا شاندار ہو) قربان نہیں کر سکے گی اور تعلیم گاہوں کا سارا معاملہ قرض ہی پر ہے۔

عوام میں علم کی ضرورت کا احساس وشوق اور ایمان ویقین پیدا کرنے کے کام سے غفلت کرنے کا

دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ مدرسہ سے باہر کی فضا مدرسہ سے سازگار اور موافق نہیں ہوگی، اور مدرسہ سے پڑھ کر نکلنے والے یا تو اپنے بگڑے ہوئے ماحول میں گم ہو جائیں گے، اگر ان میں انفعال اور احساس کمتری ہے اور عوام کے ہمرنگ ہو کر اپنے معلمین اور مدارس کی ان تمام کوششوں پر پانی پھیر دیں گے جو ان کی تربیت و تکمیل کے لئے کی گئی تھیں، یا (اگر ان میں احساسِ برتری ہے) اپنا امتیاز قائم کر کے قومی زندگی میں ایک ناہمواری، ناخوشگوار کشمکش اور تلخی پیدا کریں گے، یہ اپنے کو ایک برتر وجود اور غیر تعلیم یافتہ و ناخواندہ انسانوں کو حقیر و ذلیل سمجھیں گے، اور ہر چیز میں ان سے ممتاز رہنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح زندگی کے سمندر میں سیکڑوں ہزاروں چھوٹے حقیر جزیرے جو شاید خوردبین کی مدد کے بغیر نہ دیکھے جا سکیں قائم ہو جائیں گے اور زندگی میں نئی مشکلات اور نئے امتیازات پیدا ہو جائیں گے، اس لئے جمہور کو ایک ایسی دینی و ذہنی اور اخلاقی سطح تک لے آنا جہاں سے ان کو تعلیم کی ضرورت کا احساس، اس کی صحیح طلب، پھر تعلیم یافتہ لوگوں سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت اور ان کو کارآمد عنصر سمجھنے اور ان کو زندگی میں قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، ہر اس نظامِ تعلیم کا فریضہ ہے جو عملی زندگی اور خارجی دنیا سے اپنا ربط قائم رکھنا چاہتا ہے۔

ہمیں اس کا بھی یقین رکھنا چاہئے کہ ہم سب افراد جمہور کو "مدرسہ" کی دعوت نہیں دے سکتے خواہشات اور واقعات میں بڑا فرق ہے، ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ جمہور کا ایک بڑا طبقہ "مدرسہ" کی باضابطہ تعلیم سے محروم رہے گا۔ ان بالغین کے لئے جو اپنے ضروری مشاغل زندگی اور وسائل معاش میں منہمک ہیں اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ ان میں دین کی بنیاد پر یہ احساس و ذہنیت پیدا کر دی جائے کہ وہ علم کو بھی اپنی زندگی کا ضروری کام سمجھ کر اپنے مشاغل کے ساتھ اس کی فکر کریں، اس کیلئے وقت نکالیں، عارضی طور پر اپنے ماحول سے باہر نکلیں، ایک دوسرے سے مل جل کر اور ساتھ رہ کر، نیز مطالعہ و گفتگو کے ذریعہ اپنی زندگی کے اس ضروری شعبے کی تکمیل کریں اس کے لئے ہمیں اپنی تعلیم کے تصور اور تعلیم کے وسائل میں وسعت پیدا کرنی ہوگی اور بعض اوقات اس دور کی طرف بازگشت کرنی پڑے گی جب تعلیم زیادہ آزاد، زیادہ فطری اور زیادہ نتیجہ خیز تھی۔

تیسری چیز یہ ہے کہ علم کی عظمت اور تعلیم کے ایک مستقل اور اعلیٰ عبادت ہونے کا تصور پھر پیدا کیا جائے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ طالب علم کا ذہنی مرکز

درست ہو جائے، اور وہ علم کو "پیٹ بھرنے کا ایک ذریعہ" سمجھنے کے بجائے جس نے اس کو اس قدر ذلیل اور پست کر دیا ہے، اور سارے نظامِ تعلیم کو بے روح اور بے سوز اور ساری دنیا کو نیلام کی ایک منڈی بنا رکھا ہے، جہاں علم اور صاحبِ علم کوڑیوں کے مول بکتے ہیں، اور جہاں ذرا سے دام بڑھا کر ہر طرح کا جوہر ادراک خریدا جا سکتا ہے۔ علم کو خدا کی معرفت اس کی رضا کے حصول اور عمل کا ایک ذریعہ سمجھنے لگے۔ علم کی قیمت کو طالبِ علم کی نگاہ میں اتنا بڑھایا جائے کہ اس کو نبوت کے سوا اپنے مقام سے اونچا کوئی مقام اور خدا کے سوا اپنا کوئی معیار نظر نہ آئے۔ اس کی تعلیم گاہ کا ماحول، اس کا نصابِ تعلیم اور اس کے معلّمین اس پر علم کا صحیح مقصد اور اس کا بلند مقام واضح کرتے ہوں، اور مدرسہ کے ہر ہر طالبِ علم کے دل میں یہ حقیقت اُتار دیتے ہوں، کہ ؎

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک   اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت   فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

ایک عرصے سے ہماری دینی درسگاہیں بھی روح سے خالی ہوتی جا رہی ہیں، علم کا مقصد اور مقام اور اس کے دینی فضائل مدرسہ کے تعلیمی ماحول میں بہت غیر اہم بن گئے ہیں اور فضائلِ علم کا یہ حصہ جس میں سیکڑوں بجلیوں کی طاقت اور سیرت سازی اور ولولہ انگیزی کی بہترین قوت ودیعت ہے ہمارے مدارس کے نصاب و نظامِ تعلیم سے عملاً خارج ہے، جس مرحلے پر یہ چیزیں طلبہ کے سامنے آتی ہیں وہ بہت بعد کا مرحلہ ہے اور وہ بھی نہایت تیز رفتاری رواروی اور بے توجہی سے گذر جاتا ہے، جس مرحلے پر طالبِ علم کو ان فضائل و محرکات کی ضرورت ہے وہ مسائل و تفصیلات میں گذر جاتا ہے تعلیم کے آخری یا درمیانی مرحلے پر حدیث کی کتابوں میں یہ فضائل آتے ہیں، لیکن حدیث کی تعلیم اور اسباق کا سب سے کم اہم اور ناقابلِ توجہ حصہ یہی ہے جس کی طرف نہ تو معلم کی توجہ ہوتی ہے نہ طالبِ علم کی، معلم اپنی ساری ذہانت اور متعلم اپنی پوری محنت اختلافی مسائل اور علمی مباحث میں صرف کر دیتا ہے اور فضائل و ترغیبات کی طرف توجہ ایک واعظانہ اور عامیانہ کام سمجھا جاتا ہے، ضرورت ہے کہ ہر دینی مدرسہ کے تعلیمی سال کے آغاز میں اور ہر جماعت میں ان فضائل کا بار بار تذکرہ ہو اور اخلاص و تصحیحِ نیت پر زور دیا جائے، اور طالبِ علم کو اپنے مقصد کے معین کرنے اور ایمان و احتساب (خدا کے وعدوں پر یقین، اور اُن وعدوں کو پیشِ نظر رکھ کر کام کرنے)

کی تاکید کی جائے، اس سے طلبہ میں علم ودین کی وہ کیفیات اور وہ جذبات پیدا ہونگے جن سے ہماری مذہبی درسگاہوں کی فضا اور ہماری مذہبی زندگی روز بروز خالی ہوتی جارہی ہے اور اسی کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ ہمارے دینی علوم بھی اسی طرح روحانیت سے خالی اور ہمارے دینی فضلا بھی جذبہ سے عاری ہوجائیں گے جس طرح غیر دینی علوم اور غیر دینی درسگاہوں کے فاضل نظر آتے ہیں۔

اس کے لئے اہلِ مدارس کو وہ تمام وسائل اختیار کرنے چاہئیں جو مفید وموثر ثابت ہوں سال کے شروع میں اس موضوع پر تقریروں کا انتظام معلمین کا اپنے اسباق میں اس کا خصوصی اہتمام چھوٹے چھوٹے موثر رسالوں کی اشاعت اور نصابِ تعلیم کے ابتدائی مرحلہ میں ایسی کتابوں کی شمولیت جن میں خاص طور پر اس کی طرف توجہ کی گئی ہو۔

(۱)

انتخاب

صبر و تقوے کی طاقت:

[ڈھاکہ میں ۱۹ - ۲۰ فروری کو جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان کی ایک
کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ نے
جو خطبہ صدارت دیا تھا ذیل میں اس کا ایک اہم ٹکڑا ہدیۂ ناظرین کرام
کیا جا رہا ہے یہ پورا خطبہ صدارت "ہفتہ دار الہدیٰ" (حیدرآباد دکن) میں شائع ہوا ہے]

سنہ ۱۹۱۴ کی جنگ کے بعد جو کمیشن فتح و شکست کے اسباب کی تحقیقات کرنے کے لئے بیٹھا تھا اس نے اپنی تحقیق و تدقیق کے نتیجہ کے طور پر اس مادیت میں ڈوبی ہوئی دنیا کے سامنے یہ اعلان کیا کہ آج بھی کوئی جنگ محض بڑے بڑے مہیب اور ہلاکت بار اسلحہ سے نہیں جیتی جا سکتی فتح و کامیابی کا اصل مدار فوجوں کے بلند حوصلہ، مضبوط کیرکٹر اور بہترین ڈسپلن پر ہے۔ اب ذرا دوسری طرف غور کیجئے کہ عہد رسالت کی پوری تاریخ جہاد میں صرف دو موقع ایسے پیش آئے ہیں جنہیں ہزیمت تو نہیں کہا جا سکتا، ہاں ایک قسم کی وقتی ابتری اور اختلال کہہ سکتے ہیں ایک غزوہ احد اور دوسرا غزوہ حنین ان دونوں واقعات کا ذکر قرآن کریم میں ہے لیکن کہیں ایک جگہ بھی حق تعالیٰ نے اس ہنگامی پسپائی یا ابتری کا سبب نہ تو مجاہدین کی قلت تعداد کو قرار دیا نہ میگزین یا رسد یا دوسرے سامان کی کمی کو ہاں احد کے قصہ میں تو یہ فرمایا۔ حَتّٰىٓ اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ یعنی تم نے بزدلی دکھلائی اور جو حکم ملا تھا اس کے متعلق آپس میں جھگڑ پڑے (یہ نااتفاقی ہوئی) اور جو چیز تم پسند کرتے

پھر جب خدا نے تمہاری آنکھوں کے سامنے کر دی تو تم نافرمانی کرنے لگے اس وقت کوئی تم میں
دنیا کا طالب تھا اور کوئی آخرت کا (عصیان ہوا) اور حنین کے بارہ میں یہ ارشاد ہوا۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ
إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ
الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۝
یعنی حنین کا قصہ یاد کرو جب کہ تم اپنی کثرت تعداد پر اترا گئے پھر یہ کثرت تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین
باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے ان آیات پر بار بار غور کیجئے
کیا یہ اسی حقیقت کی طرف صاف رہنمائی نہیں جسے ہم کیرکٹر کی درستی اور ڈسپلن کی مضبوطی کے نا تمام
الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ یاد رکھئے کیرکٹر اور ڈسپلن کی کامل ترین مضبوطی اور پختگی جس راستہ سے حاصل
ہوتی ہے اس پر قرآن کریم نے بکثرت اور شد و مد کے ساتھ متنبہ کیا ہے اور وہ راستہ صبر و تقویٰ کا ہے
مگر افسوس ہم نے اس قدر ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی ادھر التفات نہ کیا اور اللہ کی تعلیم کو ملا کی تعلیم کہہ کر
سرکشی کرتے رہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کثرت تعداد اور فراوانی وسائل کے لحاظ سے ہمارے
اعداء ہم پر فائق ہیں۔ اور سر دست ہم اس قدر استطاعت بھی نہیں رکھتے کہ اپنی مدافعانہ طاقت کو
اپنے دشمنوں کے برابر تک پہونچا دیں اب اگر قلت تعداد و اسباب کے باوجود ہمارے لئے فتح و
کامرانی کی صورت ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ یقیناً ہے تو اس کا مدار صرف قادر مطلق کی نصرت پر ہے
اور یہ نصرت اور امداد مسلمانوں کو صبر و تقویٰ کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے وَإِن تَصْبِرُوا
وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا یعنی اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کا فریب
تم کو کچھ نقصان نہ پہونچا سکے گا

دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ
الْأُمُورِ اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کر لو تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے صبر و تقویٰ ہی وہ چیز ہے جس کے
اختیار کرنے پر آسمان سے فرشتوں کی مدد پہونچتی ہے قید و بند کے سارے شدائد برداشت کرنے
کے بعد حضرت یوسفؑ خزائن ارض پر قابض و متصرف ہوتے ہیں تو اس کا سبب حضرت
یوسف علیہ السلام ہی کے الفاظ میں یہ بتایا جاتا ہے قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ
مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ اللہ تعالیٰ

نے ہم پر احسان فرمایا۔ بلاشبہ جو شخص تقویٰ اور صبر اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ بھلائی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی ساری دھمکیوں کے جواب میں اپنی قوم سے فرمایا۔ اِسْتَعِينُوا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ بیشک زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے وارث بنائے اور بہتر انجام تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے ہے۔

غرض جس چیز کا قرآن پاک نے [illegible] ضمانت اور بار بار اعلان کیا اور تاریخ اسلام صدیوں سے اس کی شاہد رہی اس پر عمل پیرا [illegible] تغافل اور تساہل برتنا ہمارے لئے سخت خطرناک [illegible] ہوگا۔ اسے اختیار کئے بغیر ہمارے لئے فوز و فلاح کی راہ نکلنی محال ہے اس حقیقت کو ہم جس قدر جلد سمجھ لیں اتنا ہی بہتر ہے۔" (الہدیٰ حیدرآباد)

"الٰہی کیوں نہیں اٹھتی قیامت ماجرا کیا ہے" ذیل کا مکتوب ۲۹ مارچ کے صدق میں چھپا ہے

"ایک چشم دید واقعہ عبرت کے قابل ۲۰ مارچ ۱۹۶۳ء کا ہے۔ شہر بابر کی تاریخی عظمت کا ذکر بارہا پڑھا اور سنا تھا۔ ادھر تازہ گردش میں اس شہر کے لٹنے اور برباد ہونے کے تذکرے تو آپ نے بھی اخبارات میں پڑھے ہوں گے۔ پچھلے ہفتہ وہاں خود جانا ہوا۔ شام کا وقت تھا، شہر کو گھوم پھر کر دیکھ رہا تھا، آدمی ساتھ تھا۔ ایک مقام پر پہنچا، تو دیکھا کہ نیچے ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے، اور مسجد کے اوپر چھت پر ایک پرانی توپ رکھی ہوئی ہے، توپ دیکھ کر آگے بڑھا ہی تھا کہ اسی چھت پر اپنے مسلمان بھائی نظر پڑے، جوا کھیلنے میں مست! یہ جوا اسی مسجد کی چھت پر ہو رہا تھا! زبان پر فحش الفاظ جاری تھے۔ اور پاس ہی شراب بھی تھی! نماز سے فارغ ہو کر چلا، تو دیکھا کہ جواری لوگ بھی نیچے اتر رہے ہیں۔ یہ ہیں ہمارے بھائیوں کے اخلاق، اتنا سب گزر جانے کے باوجود، بجائے تائب ہونے کے گناہوں پر اور دلیر ہو گئے ہیں"!

بیشک یہ اپنے ہی ہاتھوں کے کرتوت تو ہیں، جنھوں نے یہ دن دکھایا ہے اتنا سب کچھ ہو چکا! کہ باہر والوں کے سن سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی بد مستیوں کا یہ عالم کہ جوے کی بازیاں (

لگ رہی ہیں، اور نشہ بازی سے پرہیز نہیں، اور فحش گوئی کی لت بھی قائم، اور نماز کا ترک بھی بدستور جاری! —— جگانے اور جھنجوڑنے کے لئے جیسے ابھی کسی اور بدتر وقت کا انتظار ہے!

(صدق لکھنؤ)

پردہ اور پاکستان :—

راقم سطور کو ابھی حال میں پاکستان کے سفر کا اتفاق ہوا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ نوعمر نوجوان اور نوخیز لڑکیوں کو ان کے نوکر اپنی سائیکلوں پر بٹھائے ہوئے اسکول لیے جا رہے ہیں۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں سڑکوں پر چہلیں کرتی پھر رہی ہیں۔ اسکول کے کھیل کے میدانوں میں دیکھیے تو ہر قسم کی مردانہ ورزشوں میں انھیں مصروف پائیے گا، سڑکوں پر دیکھیے تو موٹریں چلاتے ہوئے انھیں پائیے گا، دفاتر میں جائیے تو وہ ملیں گی، ہوائی جہاز کو دیکھیے تو وہاں بھی انھیں مختلف کاموں میں مصروف پائیے گا۔ آنکھوں میں سرمہ، ہونٹوں پر سرخی، ریشمی ساڑی، ریشمی جمپر اس ساز و سامان کے ساتھ وہ گاہکوں سے گفتگو کرتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ (روزنامہ حق لکھنؤ)

عورت کے متعلق فلسفے اور اسلامی نظریہ :—

"مغرب کی وادیوں سے عورت کی آزادی کا شور اٹھا تھا لیکن آزادی کا مطلب بے پردگی تھا جس کا انجام یہ ہوا کہ ..... انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد عورت کی آزادی صرف پیرس کے قہوہ خانوں اور ہوٹلوں میں چند منٹوں کے لئے دعوت نظارہ دے سکی سماجی زندگی کا خاتمہ ہوگیا اور معاشرتی زندگی میں ہزاروں رخنے پڑ گئے، الحاد نے ایک فلسفی پیدا کیا جس نے زندگی کو جنسیات کے محور پر گھما دیا اور عورت کو نفس کے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیا۔ اشتراکیت نے روس میں ایک جنت بنائی اور انسان کو معاشی حیوان قرار دے کر عورت کو کارخانوں میں کام کرنے کی سہولت بہم پہونچائی جس سے سمجھا گیا کہ چلو اشتراکیت کی تگ و دو اکارت نہ گئی ..... عورت مردوں کے تمام کام انجام دینے لگی رہا بچہ جننا اور اس کی پرورش ایک ماں ہونے کی حیثیت سے کرنا تو یہ شاید دل بہلانے کا ایک طریقہ ہے —— ایک وقت تھا جب عرب اپنی

لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے کیونکہ وہ ایک لڑکی کا باپ ہونا ذلت سمجھتے تھے رومیوں اور ایرانیوں کی ترقی یافتہ قومیں بھی عورتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھیں اور عورتوں کا درجہ ان کی سوسائٹی میں بہت ہی پست تھا۔ اور آج بھی مادیت نے اپنے روپ ہی تو بدل لئے ہیں ورنہ عورت آج بھی مرد کے نفس کی بدمستی کے اظہار کا آلہ ہی تصور کی جاتی ہے چاہے یہ بدمستی فرائڈ کی فلسفیانہ زبان کا تعاون حاصل کرے چاہے اسے روس کی جنت ارضی کا سرٹیفکٹ مل جائے۔

ہاں تاریخ کے ..... ایک دور میں ضرور ہمیں پناہ ملتی ہے جب انسان کے تمام جنسی و معاشی مسئلوں کو سلجھایا گیا۔ نیز زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ایک نظم پیدا کیا گیا اور اعتدال کی راہ نکالی گئی اور یہ راہ ہم نے آپ نے نہیں نکالی بلکہ خالق کائنات نے نکالی جو ہمارا بھی خالق ہے اور آپ کا بھی اور جس کی ذات میں کسی طرح آپ سے کم یا زیادہ ہمارا حصہ نہیں۔ یہ راہ یعنی اسلام مادیت کے نئے ادوار اور پرانے تمام ڈھانچوں کی دشمن ہے، یہ عورت کی عظمت کا جو نقش ہمارے ذہنوں میں بٹھاتی ہے حد سے زیادہ پاکیزہ ہے یہ اسے ماں۔ بہن بیٹی اور جیون ساتھی بنا کر زندگی کی بنیاد محبت اور خلوص پر رکھتی ہے یہ، اسے محض نفسانی خواہشات پورا کرنے والی حقیر مخلوق نہیں بناتی بلکہ سماجی اور معاشرتی زندگی کا سنگ بنیاد اسی پر رکھتی ہے یہ ہماری فطری حس کو بے حس نہیں بنانا چاہتی کہ ہم ماں۔ بہن اور بیٹی جیسے پاک رشتوں کی عظمت فراموش کر بیٹھیں ساتھ ہی ساتھ یہ برہمچاری زندگی کا بھی قائل نہیں جس میں مرد و عورت کو ایک ایک مسرت بھری زندگی گزارنے سے محروم رکھا جاتا ہے۔" (الانصاف الہ آباد)

اسلام کے صرف نام اور لیبل سے اشتراکیت کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا:

"مشرقی بنگال کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر مولانا اکرام خاں صاحب نے ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ ...... پاکستان کی سرزمین کمیونزم کی نشوونما کے لئے قطعی غیر موزوں ہے۔ آگے چل کر آپ نے فرمایا کہ کمیونزم کے خلاف ہمارے پاس اسلام کا یقینی ہتھیار موجود ہے۔"

مولانا موصوف نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کا نام کوئی جادو یا منتر ہے جس کے لیتے ہی کمیونزم کا اثر زائل ہوجائیگا ہمیں یقین ہے مولانائے محترم اس قسم کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہیں مگر افسوس کہ ان کی حکومت کے سربراہ کار عام طور پر شاید یہی سمجھ رہے ہیں اور ایسا سمجھنا ان کے لئے سخت خطرناک ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کا لیبل کمیونزم کی حقیقت کو باطل کرسکتا ہے وہ خود سب سے بڑے فریب میں مبتلا ہیں...... اگر صرف روائی مذہب اسلام اشتراکیت کے مقابلہ کے لئے کافی ہوتا...... تو یقیناً چین اور بخارا کے مسلمان اشتراکیت کے جال میں نہ پھنستے اور نہ ہی پاکستان میں مسلمان اشتراکیوں کی عجیب وغریب مخلوق پائی جاتی۔

اگر پاکستان واقعی اشتراکیت کا مقابلہ اسلام سے کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ جلد سے جلد اپنے معاشی مسائل کا اسلامی حل کرکے دکھائے۔ اگر واقعی پاکستان کی اسلامی حکومت نے اسلامی اصولوں پر بھوک، بیروزگاری اور گرانی وغیرہ کے مسائل کا حل کرکے دکھادیا تو نہ صرف پاکستان اشتراکیت سے محفوظ ہوجائے گا بلکہ اس کے پڑوسی ممالک بھی اس بات پر غور کرنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ وہ اسلام کے متعلق اپنے موروثی تعصب کو ختم کریں یا نہیں

اگر مولانا اکرام صاحب کو یقین ہے کہ اسلام دنیا کے معاشی واجتماعی مسائل کا اشتراکیت سے بہتر حل پیش کرتا ہے تو انھیں اپنے ملک میں اس کا عملی نمونہ اسی طرح دکھانا چاہئے جس طرح روس نے اشتراکیت کا عملی نمونہ دکھایا ہے۔ (الانصاف الہ آباد)

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۶ نمبر (۷) بابت ماہ رجب المرجب سنہ ۱۳۶۸ھ

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھئے! "الفرقان" اور "کتبخانہ الفرقان" بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں
لہذا جملہ خط وکتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھئے!
دفتر "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ (یو-پی)

چندہ سالانہ چار روپئے نمونہ کا پرچہ چھ آنہ

جلد (۱۶) | بابتہ ماہ رجب سنہ ۱۳۶۸ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۴۹ء | نمبر (۷)

دو ضروری اعلان!

۱۔ "الفرقان" تمام خریداروں کو پوری احتیاط سے روانہ کیا جاتا ہے، اسکے باوجود جن حضرات کی طرف سے پرچہ وصول نہ ہونے کی شکایتیں موصول ہوتی ہیں ان کو بلاقیمت دوبارہ بھیجا جاتا ہے۔ اور ابھی تک دستور و معمول یہی ہے کہ شکایت خواہ کتنی ہی دیر سے آئے پرچہ اگر دفتر میں موجود ہوتا ہے تو دوبارہ ضرور بھیجدیا جاتا ہے۔
سال رواں کے پرچوں میں سے سوائے ربیع الاول و ربیع الثانی کے سب پرچے دفتر میں موجود ہیں۔ جن حضرات کو ان میں سے کوئی پرچہ نہ پہنچا ہو اطلاع دیکر طلب فرما سکتے ہیں۔

۲۔ یہاں سُرخ پنسل کا نشان ▭ اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے حساب سے آپکی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے لہذا آئندہ کیلئے اپنا چندہ منی آرڈر سے روانہ فرما کر ممنون فرمایئے (اسی لئے منی آرڈر فارم بھی جناب کو بھیجا جا رہا ہے) اگر اگلے رسالہ کی اشاعت تک چندہ وصول نہ ہوا تو حسب قاعدہ اگلا پرچہ وی پی حاضر خدمت ہوگا۔

ناظم:۔ الفرقان۔ لکھنؤ

باسمہ سبحانہ　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　حمداً و سلاماً

نگاہِ اوّلیں

(از - مولٰنا سید ابو الحسن علی ندوی)

دنیا میں جس امت کے سپرد پیغمبروں کا کام کیا جائے اور دنیا کی نجات و فلاح اس سے وابستہ کی جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دینی و اخلاقی احتساب کے ذرائع و مواقع قیامت تک باقی رہیں اس لئے کہ انجیل کی زبان میں "وہ زمین کا نمک ہے اگر نمک کی نمکینی زائل ہو جائے تو پھر نمکینی کہاں سے آئے"۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری پیغمبر ہیں اور آپ کی امت آخری امت ہے اس لئے اس انتظام کی اس کے لئے سب سے زیادہ ضرورت ہے، آپ دیکھیں گے کہ یہ انتظام مکمل طریقے پر موجود ہے، اور وہ اس طرح کہ اس کے افراد کے لئے شریعت کے احکام پر خود عمل کرنا کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ دوسروں کو عمل کی ترغیب دینا اور احکام و فرائض کا پابند بنانے کی کوشش کرنا (تواصی بالحق و امر بالمعروف) اسی طرح گناہوں اور نافرمانیوں سے خود بچنے کے ساتھ دوسروں کو بچانے کی کوشش کرنا (نہی عن المنکر) دین کا ایک اہم شعبہ قرار دیا گیا۔ اس بارے میں قرآن و حدیث میں جو صریح احکام اور اس سلسلے میں کوتاہی کرنے پر جو وعیدیں آئی ہیں وہ معمولی علم رکھنے والوں سے بھی مخفی نہیں، صرف بنی اسرائیل کے اس گروہ کا حال کافی ہے جس میں گناہوں پر روک ٹوک کا دستور نہیں تھا (كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ) نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے دل یکساں کر دیئے گئے اور انبیاء علیہم السلام کی زبانی ان پر لعنت کی گئی؛ نیز ساحلِ سمندر پر رہنے والے اس گروہ کا حشر بھی مسخ ہو جانے والے انسانوں کے ساتھ ہوا جس نے یہ فریضہ (امر و نہی) ادا نہیں کیا تھا۔ (تفسیر ابن عباسؓ)

سنت و بدعت کی تقسیم، سنت کی اس درجہ اہمیت اور بدعت کی اس درجہ شناعت بھی اس امت کے خصائص میں سے ہے، اس طرح دین میں تحریف و مسخ کا وہ خطرناک دروازہ بند کر دیا گیا جو دوسری امتوں میں کھلا رہ گیا یا بعد میں کھول لیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان قوموں اور مذاہب میں دینی اعمال و احکام کی شکل اتنی

بدل گئی کہ ان کے پیغمبروں کے لئے (اگر وہ دنیا میں دوبارہ آئیں) ان مذاہب کا پہچاننا اور مصلحین اور دینی پیشواؤں کے لئے اس قوم کو اپنی قدیم مستند شکل پر لانا محال ہو گیا، اور ایک مستقل مذہب اور مذہبی زندگی وجود میں آ گئی جو سوائے اس کے کہ پہلے مذہب اور پہلی زندگی کی جانشین تھی، بعض اوقات اس سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔

اخلاقی و دینی نگرانی، خلافِ دین و خلافِ شرع چیزوں پر روک ٹوک، بدعات کی تردید، خود ساختہ رسوم کی مخالفت اس امت کی علمی و عملی زندگی کا ایک مستقل شعبہ بن گیا۔ ہر زمانے میں ایسی با اثر جماعت اور شخصیتیں موجود رہیں جنہوں نے اس شعبہ کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ احتساب (الحسبة) ایک اہم بالشان فن ہے جس پر مستقل کتابیں ہیں، بدعات اور دین میں نئی نئی چیزوں کے پیدا کرنے پر اعتراض و انکار اور زندگی کے الگ الگ شعبوں کی بدعات پر منفرد و مستقل کتابیں ہیں۔ اعتصام بالسنة حدیث کی کتابوں کا ایک مستقل باب ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت و اصل دین نے اپنے زمانے کی بدعات و رسوم اور عجمی اثرات کے ساتھ کبھی صلح اور سمجھوتہ نہیں کیا، ایسا تو ہوا کہ کوئی عجمی رسم، کوئی بدعت اور کوئی بداخلاقی لڑ بھڑ کر عالم اسلام کے کسی گوشہ پر اپنی مادی طاقت کے زور سے غالب آ گئی لیکن اس کو قانونی سند کبھی نہیں ملی، دینی طاقت اسکے خلاف دب دب کر ابھرتی رہی اور اسلامی شریعت رہ رہ کر اس سے دست و گریباں ہوتی رہی۔ کبھی کبھی مسلمانوں نے عالموں کی بات نہیں مانی اور کسی غلط چیز پر اصرار کیا لیکن علماء نے بھی ان کو اطمینان و سکون کے ساتھ بیٹھنے نہیں دیا، دینی احساس و ضمیر کو وہ برابر چھیڑتے رہے اور ان کے پہلو میں وہ چٹکیاں لیتے رہے یہاں تک کہ ان علماء نے مسلمانوں کے دینی احساس و ضمیر کو اس بدعت یا معصیت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا اور اس کو مسلمانوں کی زندگی سے جلاوطنی پر مجبور کر دیا، اس امت کی طویل تاریخ اور دنیائے اسلام کی طویل و عریض مساحت میں سیکڑوں بدعات غیر اسلامی رسوم و تقریبات اور معصیت و گناہ کے بیسیوں اقسام مختلف اسباب اور قوموں کے اختلاط سے پیدا ہوئے اور ایسا ہونا اتنے طویل عرصہ اور اتنے بڑے رقبہ میں بالکل طبعی اور قدرتی تھا لیکن محافظینِ شریعت کی کوششوں سے کچھ عرصہ کے بعد ان بدعات اور غیر اسلامی رسوم کا اس طرح خاتمہ ہوا کہ اب صرف ان کا نام کتابوں میں رہ گیا ہے۔ بعض اوقات مرورِ زمانہ اور عدمِ رواج

کی وجہ سے ان کا سمجھ میں آنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ اور الشاطبی وغیرہ کی کتابوں میں بعض ایسی بدعات و رسوم کا تذکرہ اس اہمیت کے ساتھ ملتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کا سب سے بڑا فتنہ تھا، لیکن آج عالم اسلام میں کہیں ان کا نام و نشان نہیں، اس لئے کہ امت کا معدہ اپنی شرعی ساخت کی وجہ سے ان کو ہضم نہ کر سکا اور اخلاقی مسہلات و تنقیہ نے ان کو بالآخر امت کے جسم سے خارج ہی کر دیا۔

آج بھی اس دور میں جو بدعات پائی جاتی ہیں ان کو علماء نے کبھی ایک لمحہ کی فرصت نہیں دی، وہ ایک غاصب اور حریف کی طرح تو موجود ہیں مگر مہمان اور عزیز کی طرح ان کو گھر میں گھسنے اور رہنے بسنے کا موقع نہیں دیا گیا، ہر ملک میں شارحین سنت اور محدثین و فقہاء کی وجہ سے ان بدعات اور ان پر عمل کرنے والوں کی جان غضب میں ہے۔ بداخلاقیاں، نافرمانیاں، قرن اول کو چھوڑ کر نہ اس امت میں پہلے عنقا تھیں نہ اب کمیاب ہیں لیکن بداخلاقیوں اور نافرمانیوں پر مذہب کا پردہ پڑا ہوا نہیں ہے اور ان کو مذہبی حیثیت حاصل نہیں ہو سکی اور نہ قیامت تک حاصل ہو سکے گی۔ اہل سنت نے نہ اس وقت تک محرم کے تعزیوں کو معاف کیا ہے نہ شب برات کی آتش بازی کو، نہ خوشی کی ہندوانہ رسموں کی اجازت دی ہے، نہ غمی کی غیر اسلامی شکلوں کی ہر سال بار بار یہ چیزیں منظر عام پر آتی ہیں اور مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ ان کا ارتکاب کرتا ہے لیکن علماء کی مخالفت بھی برابر ان کے تعاقب میں ہے۔ محرم و شب برات کے نقارخانہ میں جہاں کان پڑی آواز سنائی نہ دے (کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار) کی آواز کہیں نہ کہیں سے پہونچ ہی جاتی ہے" اہل ذوق" کو حسرت ہی رہی کہ کبھی اپنی تفریحات مذہب کے نام سے آزادی کے ساتھ منا لیتے اور سنت و بدعت جائز و ناجائز کے الفاظ سے کچھ دیر ان کے کان نا آشنا رہتے، لیکن کسی چیز میں مذہبی حیثیت آئی کہ یہ سوال پیدا ہوا کہ مذہب میں اس کی کوئی اصل ہے یا نہیں، اور مذہب نے بیچ میں مداخلت کی کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ اس امت کا امتیاز ہے یا اس دین کا اعجاز، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس امت میں عمومی و مجموعی تغیر جو دوسری قوموں میں پیش آیا قیامت تک ممکن نہیں، یہ امت چاہے اپنی جگہ چھوڑ دے لیکن اس کا دین اپنی جگہ سے بال برابر کھسکنے کے لئے تیار نہیں، اور جب تک وہ اس کے ساتھ نہ کھسکے یہ کشمکش جاری رہیگی دین کے محافظ، سنت و شریعت کے عالم اس امت کو اس کے مرکز کی طرف برابر کھینچتے رہیں گے، اور

یہ امت اس سے انکار نہیں کرسکتی۔

ہمیشہ سے سنا کرتے تھے کہ تقابل سے چیزوں کا احساس ہوا کرتا ہے (وبضدھا تتبین الاشیاء) ہمیں امت کی اس خصوصیت کا احساس پچھلے دنوں خاص طور سے ہوا، اور عجب طرح سے ہوا۔ ہولی کے دن تھے اور راقم سطور کا قیام ان دنوں ایک ایسی جگہ تھا جہاں ہندوستان کی ایک بڑی ترقی یافتہ یونیورسٹی کا ہوسٹل اتنا قریب تھا کہ وہاں کی آوازیں صاف کانوں میں آتی تھیں۔ ہولی کی رات کو کچھ آوازیں کان میں آئیں تحقیق اور طالب علمانہ شوق میں ان کو سننے کے لئے باہر نکل آیا، حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ اس ہوسٹل کے طالب علم جو "اعلیٰ تعلیم" حاصل کررہے ہیں ہولی کا مذہبی تہوار منا رہے ہیں اور دوسرے طالب علموں کی گالیوں سے تواضع کررہے ہیں، یہ گالیاں اتنی نایاب تھیں کہ لغت کے ذخیرے ان سے خالی ہیں اور کاغذ ان کی تاب نہیں لاسکتا، دیر تک میں اس فن کے کمالات دیکھتا رہا اور کہنے والوں کی جسارت اور سننے والوں کی قوت برداشت کی داد دیتا رہا، میرے لئے یہ زندگی میں پہلا موقع تھا، اس تہوار کی دوسری بے اعتدالیوں اور سرمستیوں کا حال بھی معلوم ہوا، اس کے بعد کئی دن تک اس کا انتظار رہا کہ ان بے اعتدالیوں پر اس قوم کے کسی مذہبی گروہ کی طرف سے، کسی علمی ادارہ کی جانب سے، اصلاحی و اخلاقی انجمنوں میں یا اخبارات و رسائل کے صفحات پر تنقید و مذمت کی جائے گی، ہولی کی اصل مذہبی حقیقت بیان کی جائے گی، اس کے اضافوں اور اس کی "بدعات" پر ناراضگی و بیزاری کا اظہار ہوگا، آئندہ اس میں اعتدال اختیار کرنے کی تلقین کی جائے گی اور جو عناصر و اجزا اصل مذہبی تعلیم کے خلاف شامل ہوگئے ہیں ان کی تنقیح کی جائے گی، لیکن ان میں سے ہماری کوئی توقع پوری نہیں ہوئی، بلکہ دوسرے تیسرے ہی دن ہم نے انگریزی کے ایک مشہور روزنامہ میں ہولی پر ایک مفصل و طویل مضمون دیکھا جس میں ہولی کا پورا نقشہ کھینچا گیا تھا، اسکے رسوم کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا تھا، اس کی تاریخ بڑی تحقیق سے سنائی گئی تھی۔ اس مضمون میں علمی ادبی تاریخی حیثیت سے سب کچھ تھا لیکن تنقید و اصلاح کا ایک حرف نہ تھا، یہاں تک کہ ان پہلوؤں اور تفصیلات کو بھی بغیر کسی تبصرہ و تنقید کے پیش کردیا گیا تھا جو اخلاقی حیثیت سے ہر ملک و قوم میں قابلِ اعتراض ہیں اور جن کو کسی انسان کا ذوقِ سلیم قبول نہیں کرسکتا۔

اس کے مقابلہ میں زبان وتہذیب، رسم خط وغیرہ دوسرے مسائل پر اخبارات ورسائل، اور مجالس قانون ساز سے لیکر گھریلو مجلسوں اور دوستوں کی محفلوں تک میں ہم روز ایک ہنگامہ برپا دیکھتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا سارا انحصار اور پوری دنیا کی امن وسلامتی کا دار ومدار انھیں مسائل پر ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تشویشناک اخلاقی انحطاط اور ان بے اعتدالیوں اور بدمستیوں کے ساتھ جن میں اس ملک کے مہذب شہری مبتلا اور روز بروز روبہ ترقی ہیں، اور جہاں اخلاقی بنیادیں اس درجہ کمزور ہیں، محض زبان وتہذیب کی یکسانی، اور رسم خط کا دائیں یا بائیں سے شروع ہونا کیا اہمیت رکھتا ہے، فحش ونازیبا کلمات کسی زبان میں ادا کئے جائیں اور کسی رسم خط میں لکھے جائیں مذموم اور معیوب ہیں۔ اور وہ ذہن جس کو تعلیم وتہذیب خوشی ومسرت کے موقع پر بے اعتدالیوں اور بدمستیوں سے باز نہ رکھ سکے۔ آزادی، دولت، اور مادی وسائل سے اپنے ملک کو کیا ترقی دے سکتا ہے اور عام زندگی میں سیدھے راستے پر کیسے چل سکتا ہے، ان مسائل کے لئے جو محض اپنی علمی ذہنی اہمیت رکھتے ہیں صدہا آدمی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی ان کے لئے وقف کر رکھی ہے اور جو ان مسائل کے بارے میں "ہمہ اوست" بن چکے ہیں کہ ان کو ان مسائل کے سوا ملک کا کوئی مسئلہ اور زندگی میں کوئی حقیقت ہی نظر نہیں آتی لیکن اتنے بڑے ملک اور اتنی کثیر التعداد قوم میں اخلاقی انحطاط کا احساس کرنے والا، اس کو دور کرنے کی فکر رکھنے والا، صحیح دینی واخلاقی زندگی پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کرنے والا، یا اس صورت حال پر کم سے کم کڑھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

"قطرات!"

تصوف میں "ہمعات" حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اہم تصنیف ہے جو نایاب ہے۔ ماضی قریب کے ایک صاحب علم اور صاحب دل بزرگ وعارف نے "قطرات" کے نام سے اُس کا ترجمہ کیا تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کام کسی ایسے ہی صاحب علم اور صاحب حال بزرگ کے کرنے کا تھا۔ اسکے چند نسخے کتبخانہ الفرقان میں آگئے ہیں مضامین بہت اعلیٰ ہیں لہذا کم تعلیمیافتہ حضرات طلب نہ فرمائیں۔

کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ قیمت :- (چودہ آنے ۱۴/)

عبرت کی باتیں:-

۶ مئی کے "صدق لکھنؤ" میں "عبرت زار پاکستان" کے زیر عنوان مندرجہ ذیل نوٹ شائع ہوا ہے

"دکن ٹائمس (مدراس) غیروں کا نہیں مسلمانوں کا اور مسلم پرچہ ہے۔ ۲۴ اپریل کی اشاعت صفحۂ اول کالم اول میں ایک مسلمان بے پردہ عورت کی مسکراتی ہوئی تصویر درج ہے، اور تصویر سے نیچے ان خاتون سے متعلق یہ تصریح درج ہے، کہ

"جب لندن پہنچیں تو فوٹو گرافروں نے ان سے دلربایانہ تبسم (CHRMING SMILE) کی فرمائش کی، انھوں نے یہ کہتے ہوئے کہ اچھا لیجئے میری کروڑوں کی قیمت کی مسکراہٹ —— (MY MILLION DOLLAR SMILE) ان کی فرمائش پوری کردی۔"

یہ شریف وغیور خاتون ولایت جاکر وہاں کے تصویر فروشوں اور اخبار چیوں کی فرمائش پر اپنا تبسم ناز پیش کرنے والی آپ سمجھے کون تھیں؟۔ ہند اور پاکستان دونوں کے غیرت مند مسلمان نام سننے کی تاب لائینگے؟ —— یہ خاتونِ محترم کوئی ایکٹرس یا فلم ایکٹرس نہیں بلکہ وزیر اعظم دولت خداداد پاکستان کی بیگم صاحبہ بالقابہا ہیں —— اس بےحجاب عورت کی تصویر اس میں شبہ نہیں کہ بےشمار بار اس سے قبل بھی آچکی ہے لیکن اس حد تک پستی کی توقع تو بہرحال نہ تھی۔ ہندوستان کا واسطہ تو اب دور کا رہ گیا ہے لیکن خود پاکستان کے باحمیت مسلمان انسانیت اور اسلامیت کی اس علانیہ تحقیر و تذلیل کو آخر کب تک برداشت کرتے رہیں گے۔

(صدق لکھنؤ۔ ۶ مئی)۔

اردو کا مشہور ہندو روزنامہ "پرتاب" جو اب دہلی سے نکلتا ہے۔ ۱۲ مئی کی اشاعت کے اداریہ میں پاکستان کے اربابِ اقتدار پر طنز کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ

"آئے دن مسلم پرچوں میں ننگے منہ ان کی دیویوں کی تصویریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اسوقت میرے سامنے ۷ مئی کے "پاکستان ٹائمز" کا پرچہ ہے جس میں ایسی ایک تصویر شائع ہوئی ہے، اس تصویر میں مسٹر غلام محمد وزیر خزانہ پاکستان اپنی نئی بہو مسز انعام محمد کا گورنر جنرل ناظم الدین سے تعارف کراتے دکھائے گئے ہیں۔ اس تصویر میں بیگم حسین ملک دختر مسٹر غلام محمد اور بیگم وصی الدین دختر خواجہ

ناظم الدین بھی دکھائی گئی ہیں، اور بالکل ننگے منہ"

کاش، اس ہندو روزنامہ کی ان طنزیہ سطروں ہی سے ان کی مردہ غیرت و حمیت میں کچھ زندگی آجاتی ــــ ایک طرف "قرارداد مقاصد" کے ذریعہ اپنی اسلامیت اور عقیدۂ عبدیت کا اعلان کیا جاتا ہے اور دوسری طرف شیطان کی پوری پوری پیروی بھی جاری ہو۔ یُخَادِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ہ

"شیخ الہند جنتری" اور اکابر جمعیۃ العلماء:-

اخبار "الجمعیۃ دہلی" اور اس کے علاوہ اُردو کے بعض اور اخباروں میں بھی "شیخ الہند" نامی ایک جنتری کا اشتہار کچھ عرصہ سے شائع ہو رہا ہے جس کی اہم خصوصیت اُس اشتہار میں یہ بتلائی گئی ہے کہ اس میں جمعیۃ العلماء کے فلاں فلاں بزرگوں کی تصویریں ہیں اور خصوصاً حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی تصویر کی بڑی اہمیت ظاہر کی گئی ہے۔

راقم سطور کو کم از کم مولانا ممدوح کے متعلق تو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ موصوف تصویر اور اُسکی اشاعت کو قطعاً ناجائز جانتے ہیں اور اس قسم کی حرکتوں سے سخت ناراض اور رنجیدہ ہوتے ہیں، اور مجھے یاد ہے کہ اب سے کئی سال پہلے ایک دفعہ آپکے علم کے بغیر آپ کا فوٹو لیکر بعض اخبارات نے شائع کر دیا تھا تو آپنے اس پر ناراضی اور بیزاری کا اظہار فرمایا تھا اور اس سلسلہ میں آپ کا ایک خط اُسی زمانہ میں بعض اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا ــــ اور خیال یہ ہے کہ مولانا ممدوح کے علاوہ جمعیۃ کے جن دوسرے اکابر کے فوٹو اس جنتری میں شائع کئے گئے ہیں غالباً ان میں سے اکثر اس بارہ میں حضرت مولانا سے مختلف رائے نہ رکھتے ہوں گے (اگرچہ بعض کے متعلق تو معلوم ہو کہ اب وہ شریعت کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں" سے بالاتر ہو گئے ہیں) بہرحال تصویروں کی اشاعت کی ذمہ داری تو جنتری کے ناشر ہی پر ہے لیکن جمعیۃ العلماء کے جو بزرگ واقعی دل سے یہ چاہتے ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ اس امت میں جائز و ناجائز کا امتیاز اور حرام و منکر باتوں سے نفرت و اجتناب کا جذبہ باقی رہے (جو لازمۂ ایمان ہے) اُن کے لئے یہ چیز خاص طور سے قابلِ غور و فکر ہے کہ جمعیۃ العلماء اور حضرت شیخ الہند کے حلقۂ عقیدت کی دینی حس بھی اب اتنی مردہ ہوتی جا رہی ہے کہ جنتری فروش تاجروں نے بھی یہ اندازہ لگا لیا ہو کہ یہ حلقہ بھی اسی طرح کی مصوّر جنتری کو خوب خریدے گا ــــ اللہ اللہ! کہاں جماعت علماء دیوبند اور اُن کے وابستگانِ عقیدت کا وہ دینی تقشف اور شرعی احتساب جس کے مناظر دیکھنے والے ابھی کافی تعداد میں زندہ ہیں (بقیہ صفحہ ۳۶ پر)

تصوّف و سلوک

مخدوم و محترم جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہٗ نے حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی اصلاحات و تجدیدات پر جو بسوط اور جامع کتاب تصنیف فرمائی ہے، جس کے بعض حصے گذشتہ سال الفرقان میں باقساط شائع ہوتے رہے، اور ایک مستقل فصل بہ عنوان "حیاتِ طیبہ" اس سال کے پچھلے چار پانچ مہینے کے شماروں میں شائع ہوئی ہے —— یہ پوری کتاب چار جلدوں میں ہے جن میں سے ایک مستقل ضخیم جلد، تصوّف و سلوک سے متعلق ہے —— "حیاتِ طیبہ" کے عنوان سے اس کتاب کا جو حصہ الفرقان کے پچھلے شماروں میں شائع ہوا ہے وہ بھی اسی جلد کی ایک فصل ہے —— اس عاجز کی نظر میں اس جلد کے تمام مضامین اصلاحی نقطۂ نگاہ سے بہت خاص اہمیت رکھتے ہیں اور اس لئے جی یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ پوری جلد ہی باقساط "الفرقان" میں شائع ہو سکتی، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا جلد بہت ضخیم ہے (قریباً پانچ چھ سو صفحے کا اندازہ ہے) ظاہر ہے کہ الفرقان کے محدود صفحات میں اتنی بڑی کتاب کے لئے کہاں تک گنجائش نکالی جا سکتی ہے —— اس لئے "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے حکیمانہ اصول پر یہ سوچا ہے کہ کم از کم اس کے جستہ جستہ وہ منتخب حصے ہی جن کا تعلق اُن غلط فہمیوں کے ازالہ سے ہے جو تصوّف کے حامیوں یا منکروں میں اصل حقیقت سے ناواقفی کی وجہ سے عام ہیں، الفرقان میں باقساط شائع کئے جائیں —— آج اس سلسلے کی ابتدا ہو رہی ہے۔ اُمید ہے کہ اس سلسلے کے مطالعے سے انشاء اللہ اُن اہلِ تفریط کے خیالات کی بھی

اصلاح ہو سکے گی جو تصوف کو مطلقاً ایک "بدعت" اور "ضلالت" سمجھتے ہیں، اور ان لوگوں کی بھی اصلاح ہو سکے گی جو تصوف کے نام سے واقعۃً بہت سی غلط خیالیوں یا گمراہیوں میں مبتلا ہیں۔

اصل کتاب کی چھپائی کے انتظامات بھی شروع ہو رہے ہیں اور اُمید ہے کہ انشاءاللہ سال کے اندر ہی اندر کتاب چھپ کر مکمل ہو جائیگی۔ (مدیر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصوف کی حقیقت

بظاہر کتنی عجیب بات ہے کہ تصوف ایک طرف تو کمالِ دین یا درجۂ احسان ہے، جو اسلام و ایمان کا بلند ترین مقام ہے۔ اور حضرات صوفیہ یا اولیاء اللہ کی نسبت تصور یہ ہے کہ ان کو حق تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب و اقربیت، حضور و معیت کا جو مقام حاصل ہوتا ہے وہ خالی علوم ظاہری کے حاملین بڑے بڑے فقہاء و محدثین کو بھی نہیں ہوتا۔ ان کو اپنی زندگی کے سارے اعمال و افعال حرکات و سکنات میں ایک ایسی نسبت میسر ہوتی ہے کہ گویا وہ ہمہ وقت اللہ کے مشاہدہ و حضوری میں ہیں، اور کسی نہ کسی نوع کے مکالمہ و مناجات سے بھی مشرف ہیں، اس طرح صوفیہ سے بلند درجہ صرف انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ یہ اولیاء اللہ یا بزرگان دین کے بارے میں عوام ہی کا عقیدہ نہیں، بلکہ خواص و محققین کے ہاں بھی کسی نہ کسی صورت میں مسلّم ہے۔

لیکن دوسری طرف تصوف کے متعلق اور تصوف کی راہ سے جتنی غلطیاں، غلط فہمیاں بلکہ طرح طرح کی گمراہیاں امت میں پھیلی ہیں، فرق اسلامیہ اور علوم اسلامیہ میں شاید ہی کسی فرقے یا علم و فن کی راہ سے یا اس کے متعلق پھیلی ہوں۔ بدعات و خرافات، اباحت و الحاد، کفر و شرک تک کی کوئی شکل مشکل ہی سے بچی ہوگی، جس کو کوئی نہ کوئی داخلِ تصوف بلکہ عینِ تصوف نہ جانتا ہو۔ اسی بنا پر بہت سے اکابرِ اسلام تصوف کے سرے سے منکر ہو گئے، یا اس کو سراپا ضلالت قرار دے دیا۔

بات یہ ہے کہ کسی شئے کے کمال کا تعلق ہمیشہ اس کے ظاہر سے زیادہ باطن، کم سے زیادہ کیف، قشر سے زیادہ مغز، یا جسم سے زیادہ جان اور صورت سے زیادہ معنی سے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی جس شئے میں جتنا زیادہ کیف و بطون ہوتا ہے اتنا ہی اس کی نسبت غلطیاں اور گمراہیاں زیادہ راہ پا جاتی ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ جس غلطی و گمراہی کو دین ہی نہیں کمالِ دین سمجھ لیا جائے اُس کی جڑ کتنی گہری ہوگی اور اس کا استیصال کتنا دشوار ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف کی راہ سے شرک و الحاد تک کی جو گمراہیاں مسلمانوں میں جڑ پکڑ گئیں اُن کو چونکہ عین دین یقین کیا جانے لگا

اس لئے اُن کا ازالہ آسان نہیں ہوتا۔

عوام اور بہت سے خواص سب کو کیسے کیسے مغالطے ہیں کہ کوئی کشف و کرامات اور تصرفات کو تصوف جانتا ہے، کوئی اشغال و مراقبات اور احوال و کیفیات کو تصوف یقین کرتا ہے، کوئی خاص خاص رسوم و عادات کو تصوف سمجھتا ہے، کسی کے نزدیک تصوف نام ہے ریاضات و مجاہدات اور ترک تعلقات کا، کوئی فلسفی یا فلسفی مزاج تصوف سے مراد وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود کے نظریات لیتا ہے اور کوئی اس کو اسرار و مغیبات کا مجموعہ قرار دیتا ہے، حتیٰ کہ اہلِ مغرب نے اس کا نام ہی سریت (مسٹزم) رکھ دیا۔ خود مسلمانوں میں بھی بہتوں نے اس کو ایک سینہ بہ سینہ راز ہی بنا رکھا ہے۔ اور سب گمراہیوں سے بڑی گمراہی میں مبتلا وہ ہیں جنھوں نے تصوف و طریقت حقیقت و معرفت کو شریعت کا مقابل یا اس کی ضد گمان کر لیا ہے۔

حضرت نے اس طرح کی تمام گوناگوں اغلاط کو ایک ایک کر کے دُور فرمایا ہے، لیکن یہ تجدید تصوف کا صرف سلبی پہلو تھا، اصل تجدیدی کارنامہ اس باب میں طریقت کے اس ایجابی پہلو کو واضح فرمانا ہے کہ وہ شریعت ہی کا دوسرا رُخ بلکہ عینِ شریعت ہے۔ پھر اس رُخ کو صرف نظری طور سے پیش نہیں فرمایا گیا ہے بلکہ عملی طور سے اس کی تعلیم و تربیت کا غایت تحقیق و اجتہاد کی شان سے از سرِ نو احیا فرمایا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح "انسانِ کامل" کے دو رُخ ہیں ظاہر و باطن یا قلب و قالب، اُسی طرح "دینِ کامل" کے بھی دو رُخ ہیں شریعت و طریقت۔ اور جس طرح شریعت نام ہے ظاہر یا قالب کے اعمال و احکام کا، اسی طرح طریقت یا تصوف نام ہے باطن یا قلب کے اعمال و احکام کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ تصوف نام ہے باطن کی فقہ کا۔ جس طرح نماز روزہ وغیرہ کے ارکان و اعمال کی ایک ظاہری صورت ہے جس کے احکام فقہ میں بیان ہوتے ہیں، اسی طرح خشوع و خضوع، حضور قلب یا دل سے حق تعالیٰ کی یاد و ذکر (اقم الصلوٰۃ لذکری) قلب و باطن کے اعمال ہیں۔ جس طرح ترک اکل و شرب روزہ کا ظاہر ہے اسی طرح اس کا باطن تقویٰ (لعلکم تتقون) ہے۔ پھر جس طرح مختلف اعمال شرعیہ اپنی اپنی قالبی صورت رکھتے ہیں اسی طرح ان سب کی صحت و سقم، قبول و عدم قبول کا مدار قلبی نیتوں (الاعمال بالنیات) اور درجات اخلاص پر ہے۔ سب سے بڑھ کر ایمان اور عقائد جن پر نجات اور ظاہر و جوارح کے سارے اعمال کی صحت و قبولیت کا مدار ہے اور جن کے بغیر نہ نماز نماز ہے، نہ روزہ روزہ، وہ بالکلیہ یقین و اذعان کے قلبی و باطنی فعل ہی کا نام ہیں۔

سارے عقائد و ایمانیات کی جڑ "توحید الٰہ یا" لا الٰہ الا اللہ " ہے ۔ یعنی الوہیت و معبودیت، یا نفع و ضرر کی یعنی فعل و اثر کی ساری مخلوقات یا غیر اللہ سے نفی اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا اثبات۔ ظاہر ہے کہ الٰہ و معبود وہی ہوتا یا بنایا جاتا ہے، پوجا اور پرستش اسی کی ہوتی اور کی جاتی ہے، جس کے ہاتھ میں ہم اپنا نفع و ضرر[1] دیکھتے اور یقین کرتے ہیں ۔ غرض لا الٰہ الا اللہ پر ایمان یقین کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم کو موت و زندگی، بیماری و تندرستی، ناداری و تونگری، ذلت و عزت وغیرہ کی ظاہری راہوں اور اسباب سے جو جو کچھ بھی نفع یا ضرر پہنچتا ہے، سب کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کو جاننا اور ماننا اور کسی فعل و اثر کا خالق غیر اللہ کو نہ سمجھنا ہمارا مسلمہ عقیدہ ہے ۔ یہ جاننا اور ماننا قلب و باطن کے فعل کے سوا کیا ہے! لیکن علوم و احکام ظاہر کے عالم و عامل کتنے ہیں، جو نفع و ضرر یا فعل و اثر کا دن رات غیر اللہ کی طرف سے یقین و مشاہدہ نہیں کرتے رہتے ۔ کیا اس یقین و مشاہدہ کی تغلیط اور اس کو مضمحل و فنا کر کے ہر فعل و اثر میں اللہ تعالیٰ ہی کو بالذات فاعل و موثر مشاہدہ کرنے لگنا، جس کو حدیث میں عبادت و بندگی کے مقام احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور جس کو اصطلاح صوفیہ میں توحید افعال سے موسوم کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کے تعلق کو اس طرح قائم کرنا کہ ساری زندگی اور اس کے سارے افعال و اعمال میں اسی کے مشاہدہ و رویت حضور و معیت کا علم و اذعان حاصل ہو، کیا یہ عین دین اور کمال دین کے سوا کچھ اور ہے ۔ بلکہ کیا یہ قلبی و باطنی علم و اذعان یقین و ایمان سارے ظاہری عبادات و معاملات کی روح و جان نہیں ۔ اور کیا اس روح و جان یا ایمان و عقیدہ کی صحت و حفاظت سارے اعمال و افعال جوارح سے بڑھ کر فرض و واجب نہیں ۔

تصوف نام ہے فقہ باطن کا

غرض تصوف یا علم باطن کی حقیقت، جس کو خدا جانے لوگوں نے کیا کیا دور از کار ضال و مضل معنی پہنا رکھے ہیں، صرف یہ ہے کہ وہ ظاہر جسم یا جوارح کے اعمال و احکام، اوامر و نواہی اور صلاح و فساد کی فقہ کے بجائے نام ہے قلب و باطن کے اوامر و نواہی اور اس کے صلاح و فساد کی فقہ کا جس کے احکام کتاب و سنت دونوں میں اسی طرح منصوص ہیں

---

[1] کما قال اللہ تعالیٰ : افتعبدون من دون اللہ ما لا ینفعکم شیئاً و لا یضرکم اف لکم و لما تعبدون من دون اللہ ۔

جس طرح فقہ ظاہر کے، اور جس کی اہمیت واقدمیت قرآن وحدیث ہی کے اشارات وتصریحات سے ثابت ہے (کما قال اللّٰہ تعالیٰ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ) اور حدیث میں اسی کی شرح وتفسیر یوں فرمائی گئی ہے کہ "خوب سمجھ لو کہ بدن کے اندر ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ سنورا اور بنا تو سارا بدن بن سنور جاتا ہے، اور اگر وہ بگڑا تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے، اور خوب سمجھ لو کہ وہ قلب[1] ہے"۔ یعنی ظاہر جسم کے اعمال وافعال کا بناؤ بگاڑ تمام تر اسی باطن قلب کے بناؤ بگاڑ پر موقوف ہے۔ اور تصوف یا فقہ باطن کا موضوع بحث اسی قلب کا بناؤ وسنوار اسی کی سلامتی وصحت کی حفاظت، اور اسی کے بگاڑ یا فساد وبیماری کا علاج ہے۔

تصوف وطریقت کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اس کا دین وشریعت کے منافی ومغائر ہونا تو الگ رہا، بغیر صوفی ہوئے مسلمان مسلمان ہی کب ہو سکتا ہے۔ باقی اگر کسی "خشک دماغ" کو صوفی وتصوف کے نام واصطلاح یا اس کے علیحدہ ومستقل علم وفن ہونے سے بھڑک ہے، تو پھر اس کو تفسیر ومفسر، تجدید ومجدد، حدیث ومحدث، فقہ وفقیہ، کلام ومتکلم وغیرہ سب ہی جداگانہ دینی علوم وفنون اور اُن کے عرفی واصطلاحی ناموں سے بھڑکنا چاہیئے۔ اور اگر یہ نام قرآن وحدیث کے الفاظ واشارات سے ماخوذ ہیں تو راقم الحروف کے نزدیک "صوفی" کی اصل بھی صوف پوش کے بجائے اصحاب صفہ کیوں نہ ہو۔ اس پر بھی اگر نام ہی سے چڑھ ہے، تو علم تصوف کے بجائے اس کا نام علم احسان یا علم قرب رکھ لو جیسا کہ خود بہت سے اکابر صوفیہ نے رکھا بھی ہے۔

تصوف کی حقیقت کی یہ تجدید یا اس کی از سر نو تعلیم وتفہیم جیسی کچھ ضروری تھی، اس کے دیکھتے حضرت مجدد نے مستقل وغیر مستقل رسائل وتصنیفات مواعظ وملفوظات میں بہ کثرت وجا بجا، اجمال وتفصیل کے ساتھ مختلف عنوانات وتعبیرات سے سمجھایا اور واضح فرمایا ہے حقیقت تصوف کے نام سے ایک مستقل رسالہ کی تمہید میں ارشاد ہے۔

> شریعت کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے وہ دو قسم کے ہیں۔
> بعض کا تعلق ظاہر بدن یا ظاہری چیزوں سے ہے جیسے کلمہ پڑھنا نماز روزہ حج زکوٰۃ

---

[1] اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ (مسلم)

ماں باپ کی خدمت، ان کو مامورات کہتے ہیں۔ اور کلمات کفر کہنا، شرک کے افعال کرنا
زنا چوری سود خواری رشوت وغیرہ ان کو مناہی کہتے ہیں بعض اعمال ایسے ہیں جن کا
تعلق باطن سے ہے، جیسے ایمان و تصدیق و عقائد حقہ، صبر و شکر و توکل، رضا بہ قضا
تفویض و اخلاص محبت خدا و رسول وغیرہ ان کو مامورات و فضائل کہتے ہیں، اور عقائد
باطلہ، بے صبری، ناشکری، ریا و تکبر، عجب وغیرہ یہ مناہی و رذائل ہیں جن سے شریعت نے
منع کیا ہے۔

جس طرح قرآن مجید میں اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ موجود ہے، اسی طرح یاایھا الذین
اٰمنوا اصبروا (اے ایمان والو صبر کرو) اور واشکروا للہ (اللہ کا شکر بجا لاؤ) بھی موجود ہے
اگر ایک مقام پر "کتب علیکم الصیام" اور "للہ علی الناس حج البیت" پاؤ گے
تو دوسرے مقام میں "یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ" اور "والذین اٰمنوا اشد حبا للہ" بھی
دیکھو گے، جہاں "اذا قاموا الی الصَّلوٰۃ قاموا کسالیٰ" ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ
یُراؤن النّاس بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام میں تارکِ نماز و تارکِ زکوٰۃ کی مذمت ہے،
تو دوسرے مقام میں تکبر و عجب کی بھی برائی موجود ہے۔ اسی طرح احادیث کو دیکھو جس طرح
ان میں ابواب نماز، روزہ، بیع و شرا نکاح و طلاق پاؤ گے، ابواب ریا و سمعہ و کبر وغیرہ
بھی دیکھو گے۔

اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمالِ ظاہرہ حکمِ خداوندی
ہیں، اسی طرح اعمال باطنہ بھی حکمِ الٰہی ہیں۔ کیا "اقیموا الصَّلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ" امر کا صیغہ ہے
اور "اصبروا" و "اشکروا" امر کا صیغہ نہیں۔ کیا کتب علیکم الصیام سے روزہ کی
مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہے، اور والذین اٰمنوا اشد حبا للہ سے محبت کا
مامور ہونا ثابت نہیں۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ظاہری اعمال سب ہی
باطن کی اصلاح کے لئے ہیں۔ اور باطن کی صفائی مقصود و موجب نجات اور اس کی
کدورت موجب ہلاکت ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (بے شک
جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا، اور جس نے اس کو میلا کیا ناکامیاب رہا) یوم ۸

يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (جس دن مال و اولاد کام نہ آئینگے مگر جو شخص اللہ کے پاس سلامت قلب لے کر آیا) دیکھو پہلی آیت میں تزکیۂ باطن کو موجب فلاح اور دوسری میں سلامتی قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع بتلایا گیا ہے۔

ایمان و عقائد جن پر سارے اعمال کی مقبولیت منحصر ہے، قلب ہی کا فعل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جتنے اعمال ہیں سب ایمان ہی کی تکمیل کے لئے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دل کی اصلاح ہے۔ دل بمنزلہ بادشاہ کے ہے اور اعضا اس کے لشکر یا غلام ہیں۔ اگر بادشاہ درست ہو جائے تو توابع خود بخود اس کی مطابقت کرنے لگیں۔ اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ کے معنی یہی ہیں کہ بدن کے اندر جو قلب ہے اگر یہ بنا تو سب بنا، یہ بگڑا تو سب بگڑا۔ اور یہ امور رات دن آنکھوں کے سامنے ہیں کہ جس چیز کا دھیان دل میں سما جاتا ہے، سارے اعضا اس کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ آنکھ اس چیز کو دیکھنے، کان اس کو سننے، ہاتھ اس کو پکڑنے اور پاؤں اس کی جانب چلنے کو چاہتا ہے خواہ وہ شے بُری ہو یا بھلی۔ مگر دل کا خیال ان اعضا کو اس کے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ دنیا داروں کو دیکھو کہ کس طرح دنیا کے کاموں میں سر سے پاؤں تک مشغول رہتے ہیں کہ ان کے کان میں اذان کی آواز تک نہیں آتی ایسا ہی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد اور دھن میں ہیں ہر طرف سے ان کو اللہ ہی کا خیال آتا ہے۔

بس کہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی
ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

ایک بڑا مغالطہ بڑے بڑے لوگوں کو یہ ہے کہ قلب و باطن کی جس صفائی و تزکیہ پر تصوف میں اس قدر زور ہے کہ گویا سارا تصوف یہی ہے، وہ چونکہ غیر مسلم اشراقیہ اور خصوصاً خود ہمارے ہندوستان کے جوگیوں میں بکثرت اور بڑے بڑے خوارق کے ساتھ پایا جاتا ہے اس لئے ان کو بھی بہتوں نے صوفی ہی سمجھ رکھا ہے "الصوفی لا مذهب له" کا مشرب و مقام کسی خاص شریعت و مذہب سے اتنا وسیع و بلند قرار دے دیا جاتا ہے کہ کفر و اسلام کی قید سے بھی آزاد ہو جاتا ہے! اسلئے متنبہ فرمایا کہ:-

تزکیہ وصفائیٔ باطن اور تصوف کا اطلاق اس صفائی پر کیا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کی پابندی سے حاصل ہو کیونکہ تزکیہ سے مراد وہ تزکیہ ہی جو موجب فلاح ہی۔ "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا" اور ظاہر ہے کہ فلاح منحصر ہی اتباع شریعت پر۔ پس ہندو جوگی وغیرہ جو ریاضت کرتے ہیں وہ سرے سے صفائی ہی نہیں، یا لغوی معنی کے اعتبار سے اس کو صفائی کہو تو ساتھ ہی غیر مقبول کہنا ہوگا۔ اس صورت میں صفائی کی دو قسمیں ہوں گی ایک مقبول دوسری مردود۔[1]

اس کی مثال کیسی عجیب دی ہی کہ

آئینہ پر اگر گرد وغبار بیٹھا ہو تو ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کو پانی سے دھو کر صاف کر دیا جائے، دوسرا یہ کہ پیشاب سے دھو کر گرد وغبار دور کر دیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ بادشاہی دربار میں جس طرح پہلے آئینہ کو پیش کرنے سے انعام وخوشنودی کا استحقاق ہوگا دوسرے کے پیش کرنے سے عتاب وخفگی ہوگی۔ اسی طرح خلاف شریعت سے عقبیٰ میں کچھ فائدہ نصیب نہیں ہوسکتا، اور اصطلاح وعرف میں تصوف اس علم کا نام ہی جس پر عمل کرنے سے باطن کی وہ صفائی نصیب ہوتی ہے جس سے انسان مقبولِ بارگاہ اور صاحبِ مدارج ومقام ہوتا ہے۔

عشق ومحبت جو تصوف کی جان ہے اور جس سے تصوف کا سارا دفتر بھرا پڑا ہی اور جو قلب وباطن ہی کی ایک اعلیٰ صفت وکمال ہی، اس کی راہ بھی خود نص کتاب سے تمام تر اتباع سنت وشریعت ہی ہے۔

محبتِ خدا ورسولؐ جو منجملہ صفاتِ حمیدہ قلبیہ اور اعلیٰ درجے کی چیز ہی اس کا تعلق بھی اتباعِ شریعت ہی سے ہی، بدون اتباعِ شریعت محبت کہاں۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ دیکھو اس آیت میں اتباعِ رسول ہی کو ذریعہ محبت بتایا گیا ہی۔

---

[1] خاکسار نے حضرت کے اسی قسم کے ملفوظات کی تعبیر اس شعر میں کی ہی۔

شعلے اٹھیں ہزار، تجلی مگر کہاں!
یہ آگ ہے ضرور، مگر طور کی نہیں

"س"

یہ "الصوفی لا مذھب لہ" کا مقام بعض جاہل اور نام کے صوفیہ کے ہاں نام نہاد تزکیہ قلب کے بعد اتنا اونچا ہو جاتا ہے کہ نماز روزہ تک پیچھے پڑ جاتا ہے بلکہ سرے سے سارے احکام شریعت ہی مرتفع ہو جاتے ہیں حالانکہ اسلام میں اور تصوفِ اسلام میں وہی صفاتِ قلب معتبر و مقبول ہیں جو نماز روزہ وغیرہ کے مشروع و مامور عبادات و احکام سے نصیب ہوتے ہیں۔ مثلاً

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ میں خشوع بر صفت قلب ہے

اس کو اسی صورت میں وسیلۂ نجات و فلاح فرمایا گیا ہے جو نماز کے اندر پایا جائے پس اگر سرے سے نماز ہی نہ پڑھی جائے، تو یہ نماز والا خشوع کس طرح میسر ہو سکتا ہے اور فلاح کا اثر کس طرح مرتب ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی زکوٰۃ و صدقہ حج و روزہ وغیرہ اعمالِ صالحہ سے جو اثر قلب پر پڑتا ہے اور اس سے صفائی میسر ہوتی ہے وہی مفیدِ آخرت ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب تک انسان احکامِ شرع کی پابندی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کرے گا جنت و رضائے مولیٰ کہ مقصودِ اصلی ہے میسر نہیں آ سکتا۔ تو بلا پابندی شرع کے تصوف کہاں! جس طرح کرامت کی تعریف میں خرقِ عادات کے ساتھ یہ قید ہے کہ عبد صالح متبع شریعت سے صادر ہو، اسی طرح تصوف میں صفائی و تزکیہ باطن کے ساتھ یہ قید ہے کہ اتباع شریعت سے حاصل ہو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم باتفاق امت سارے اولیاء سے افضل ہیں، مگر ان کا طریقہ بھی پابندئ شریعت نماز روزہ، حج زکوٰۃ، جہاد، تلاوت، امر بالمعروف نہی عن المنکر وغیرہ تھا۔ اسی سے اُن کے قلوب ایسے مزکی و مجلی تھے کہ اُن کیلئے خطاب رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کیا گیا۔ ... ... بہرکیف تصوف نام ہے صفائی باطن مع پابندئ شرع کا۔

فلسفہ کے ایک ولایتی ڈاکٹر اور پروفیسر ہمارے دوست جو بڑے "تصوف دوست" بھی ہیں۔ مگر ساتھ ہی تصوف کا وہی تصور رکھتے ہیں جو شریعت کا متبع و پابند بنانے کے بجائے سرے سے ہر مذہب کی قید و بند سے آزاد کر دیتا ہے، ان کو ایک دفعہ راقم نے حضرت کے مکتوبات پڑھنے کو دیئے۔ ہیں بڑے ذہین کہنے لگے بھائی "ملائیت و صوفیت کو خوب ہی ملایا ہے" اصطلاح میں کیا جھگڑا اپنی اپنی جگہ تصوف و صوفی کو جو جس معنی و مراد کے لئے چاہے اصطلاح بنا لے۔ البتہ اس کو "تصوفِ اسلام" کہنا اور سمجھنا بڑی جسارت و جہالت ہے۔ تصوفِ اسلام تو

بہرحال تمام اکابر محققین صوفیائے اسلام کے نزدیک وہی ہے، جو شریعت کیساتھ جمع ہی نہیں بلکہ عین شریعت ہے۔

تصوف کا عرف واصطلاح

اب رہ گیا اس زمانہ کا عرف اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں علم تفسیر علم حدیث علم فقہ واصول فقہ وغیرہ جدا جدا ممتیز نہ تھے پچھلے علماء نے دین کی تائید و تبلیغ کے لئے ایک ایک علم الگ کر کے اس کے قواعد مقرر کئے اسی طرح علم تصوف کو بھی مشائخ کرام نے قرآن و حدیث سے نکال کر باطن کی صفائی کے بعض اذکار و اشغال و مراقبات خاص طریقے سے بتلائے ہیں کہ ان پر عمل کر کے انسان کو تزکیۂ باطن جلد نصیب ہو جاتا ہے۔

جس طرح "پچھلے زمانے میں قرآن و حدیث سے استنباط کر کے بہت سے علوم نکالے گئے اور ہر ایک کا نام جداگانہ تجویز ہوا اور ان کے واضعین کو سب نے امام مانا حتیٰ کہ امام شافعی ایسے لوگوں کو امام ابو حنیفہ کی شان اور فقہ فی الدین دیکھ کر الناس فی الفقہ عیال ابی حنیفة کہنا پڑا، امام بخاری حدیث میں ایسے امام مانے گئے کہ آج تک ان کی محدثیت کا ڈنکا بج رہا ہے اسی طرح تزکیۂ باطن کے بتلانے والے ایسے بزرگان دین گذرے ہیں کہ ان کو سب نے پیشوا مانا ہے جیسے پیران پیر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی اور خواجہ بہاء الدین و خواجہ معین الدین چشتی و شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ تعالیٰ اور ان کے قبل جنید بغدادی حضرت شبلی وغیرہ اور جس طرح اور علوم میں پچھلوں کو اگلوں کی تقلید و پیروی سے چارہ نہیں، علم تصوف میں بھی بدون اتباع طریقۂ بزرگان چارہ نہیں۔ گو اوّلی درجہ کا تزکیہ جو موجب نجات ہے بدون اتباع مشائخ طریق بھی میسر ہو سکتا ہے، مگر وہ امر کہ مطلوب ہے اور کمال کہلاتا ہے، اس کا حصول بدون صحبت کاملین متبعین مشائخ کے ممکن نہیں۔

اور جس طرح دیگر علوم متخرجہ و مستنبطہ کا خاص نام ہو گیا جیسے علم فقہ و علم حدیث اسی طرح مشائخ کے اس خاص متخرجہ طریقہ کا نام تصوف ہو گیا۔ اگر کوئی شرح وقایہ و ہدایہ پڑھتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ فقہ پڑھتا ہے اور اگر تفسیر یا حدیث پڑھتا ہو تو یوں نہیں کہتے کہ فقہ پڑھتا ہے حالانکہ فقہ بالمعنی الاعم یعنی معرفة النفس مالها و ما علیها میں بہت سے علوم حدیث و تفسیر حتیٰ کہ علم کلام وغیرہ بھی داخل ہیں۔ اسی طرح جب کوئی مشائخ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر چلتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ تصوف سیکھتا ہے، یا صوفی ہے۔ اور نماز روزہ کرنے والے کو صوفی نہیں کہتے

حالانکہ تصوف و تزکیہ بالمعنی الاعم سب کو شامل ہے۔

اور یہاں اصطلاحی تصوف کی حقیقت بیان کرنا منظور ہے، جو نام ہے باطن کو رذائل سے خالی کرنے اور فضائل سے آراستہ کرنے کا، جس میں توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے، عام اس سے کہ وہ کسی عمل شرعی سے ہو۔[1]

ماحصل یہ کہ پورا دین نام ہی فلاحِ آخرت اور رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کا، اور جیساکہ الظاہر و الباطن کی مخلوق و مظہر ساری کائنات کا ہر ہر ذرہ ظاہر و باطن دونوں کا مظہر ہے اور انسان اسی کا مظہر اتم ہے، اسی طرح اس کو اپنے کمال مقصد تک پہنچنے کے لئے جو صراطِ مستقیم دکھلائی گئی ہے اس کے بھی دو رخ ہیں ظاہر اور باطن یا قلب و قالب۔ ظاہری علوم دین کا تعلق ظاہری اعمال و احکام یا ظاہر کی درستی و آراستگی سے ہے اور علمِ باطن یا تصوف کا تعلق باطن کی درستی و آراستگی سے ہے۔ اور جیساکہ اوپر معلوم ہو چکا کہ کمال و حقیقت کا تعلق کم کے مقابلے میں کیف یا ظاہر کے مقابلے میں باطن سے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے دین میں بھی کمال رسی اور حقیقت یابی بلا تصوف یا صوفی بنے بغیر ممکن نہیں۔ خواہ اس دعوے سے "اہلِ قشر کتنا ہی ناخوش ہوں مگر مغز، مغز ہی ہے۔ البتہ بے مغز مدعیانِ تصوف بھی آگاہ رہیں کہ مغز، قشر کے اندر ہی ملتا ہے، اور "قشر" یا ظاہر ہی مغز یا باطن کا محافظ ہوتا ہے۔

. . . .

تصوف سے توحش کی وجہ

اسلامی تصوف کی اس حقیقت و اہمیت کے باوصف کہ وہ عینِ دین اور کمالِ اسلام کے سوا کچھ نہیں، جس سے دور ہو کر مسلمان بہ حیثیت مسلمان "حسنۂ دنیا" سے بھی دور سے دور تر ہوتے جا رہے ہیں، پھر بھی اہلِ دنیا ہی کو نہیں، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر بعض اکابر دین تک کو تصوف کے غیر دین یا طریقت کے خلاف شریعت ہونے اور اسکی بدولت اس سے انکار و توحش کا بہت بڑا منشایہ ہوتا ہے کہ حضرات صوفیہ کے بہت سے حقائق و معارف، اذکار و اشغال مجاہدات و مراقبات، احوال و کیفیات توجہ و تصرفات کشف و کرامات ترک لذات و تعلقات بیعت و نسبت اور رسوم و عادات وغیرہ کی خاص خاص صورتوں کا ان حضرات کو کتاب و سنت

---

[1] ایضاً۔ تمہید حقیقت تصوف۔

کی عام و منصوص تعلیمات میں بظاہر نام و نشان نہیں ملتا۔ اور مغالطہ یہ ہو گیا ہے کہ تصوف و طریقت کی اصل و حقیقت یہی "بدعات" ہیں۔

سو تصوف کی اصل حقیقت کی نسبت تو حضرت مجددؒ کی تجدید کامل نے تمام و کمال واضح فرما دیا کہ وہ انسان کے ظاہر و قالب کی طرح قلب و باطن کی صلاح و اصلاح کے انھیں احکام کا عرفی و اصطلاحی نام ہے جو ظاہر کے فقہی احکام کی طرح خود قرآن و حدیث میں منصوص ہیں، اور اس طرح تصوف "ملاپن" کے سوا کچھ نہیں۔ کسی موقع پر اس عرف و اصطلاح کے جھگڑے سے بیزار ہو کر فرما دیا کہ

> ہم نہیں جانتے درویشی کیا چیز ہے۔ یہاں تو ملاپن ہے۔ طالب علم ہیں صاحب علم بھی نہیں۔ بس قرآن و حدیث پر عمل بتاتے ہیں۔ پھر اسی میں جو کچھ کسی کو ملنا ہوتا ہے مل جاتا ہے، اور ایسا ملتا ہے کہ مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر من امثالنا یعنی جو ہم جیسوں میں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی قلب میں اس کا خطرہ تک گذرا۔ مگر ظاہر میں کچھ نہیں، نہ ہو حق، نہ حال و قال، نہ وجد و کیف، نہ کشف و کرامت۔ پھیکا پھاکا طرز ہے، جیسے سمندر کی مچھلی کہ نمک خود اس کے اندر ہوتا ہے، اوپر سے ڈالنے کی ضرورت نہیں، لیکن کھلتا پکنے کے بعد ہے بس یہاں بھی اوپر کا نمک نہیں اندر کا ہے، جو پکنے کے بعد کھلتا ہے۔[1]

رہے اذکار و اشغال مجاہدات و مراقبات وغیرہ کے ایسے صوفیانہ طریقے جو بظاہر قرآن و حدیث میں مذکور یا ان سے ماخوذ نہیں معلوم ہوتے، تو اس بارے میں حضرت مجددؒ کی تجدید و تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف کے دوست و دشمن، معتقد و منکر دونوں ایک مشترک غلطی میں پڑ گئے کہ ان چیزوں کو تصوف کے مقاصد و غایات سمجھ لیا، حالانکہ ان کی اصل حیثیت تدابیر و مقدمات یا آثار و ثمرات کی ہے۔ مقاصد تصوف یہ چیزیں قطعاً نہیں۔ اس لئے ان کو بدعات کہنا سرے سے بے معنی ہے۔ بدعت نام ہے "احداث فی الدین" کا یعنی دین میں دین کا مقصد جان کر کسی نئی چیز کا اضافہ کرنا، نہ کہ "احداث للدین" یعنی مقاصدِ دین کے حصول کے لئے تجربے کی بنا پر کسی نئی تدبیر کا اختیار کرنا۔ جیسے طب میں صحت کے حصول و حفاظت کے لئے نئی نئی تدابیر و ادویہ کا تجربہ

---

[1] اشرف السوانح حصہ دوم ص ۳۳

اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یا خود دین میں مثلاً علوم دین کی حفاظت و اشاعت کے لئے مدرسے کھولنا، کتب خانے قائم کرنا، لیتھو اور ٹائپ میں کتابیں چھاپنا، درس و تدریس کے لئے نصاب تعلیم کی نئی نئی صورتیں تجویز کرنا، امتحان لینا سند دینا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں نئی یا "احداث" ہیں لیکن چونکہ "احداث للدین" ہیں اس لئے نہ بدعات ہیں، نہ ان کو کتاب و سنت میں ڈھونڈنے کی ضرورت ہو۔

مثلاً نماز میں خشوع (ھم فی صلوتھم خاشعون) اور حضور قلب (لاصلوٰۃ الا بحضور القلب) مقصود و مامور ہے، اور تجربہ سے ذکر و شغل یا مراقبہ وغیرہ کی کوئی خاص صورت و ہیئت اس مقصود کے حصول میں معین معلوم ہوئی جس میں کوئی شرعی ممانعت یا قباحت بھی نہیں، تو اس کا خود ایجاد و اختیار کر لینا یا غیر مسلموں اور دین کے دشمنوں تک سے اخذ و قبول کر لینا ایسا ہی ہے، جیسے جہاد کے لئے تیر و تفنگ کے بجائے بندوق اور مشین گن کا ان سے سیکھ بلکہ چھین لینا۔

صوفیہ میں ایک خاص شغل پاس انفاس کا ہے جو بہت عام ہے اس کی نسبت کسی طالب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ

> یہ اشغال میں سے ہے، اس سے یکسوئی ہوتی ہے اور خطرات دفع ہوتے ہیں۔ اسی طرح ذکر کے مختلف طریق ہیں جس میں جس کو جمعیت ہو اختیار کرنا چاہئے۔ کیونکہ جمعیت گو خود مقصود نہیں، لیکن مقدمہ ہے حصول مقصود کا، اور مقدمات کا مقصود میں بہت دخل ہوتا ہے، اسی لئے مشائخ نے مقاصد کے لئے کچھ مقدمات تجویز کئے ہیں اور اُن کو عملاً ایسی ہی اہمیت دی ہے جیسی مقاصد کو[1]

لیکن ان کے مقاصد ہونے کے بجائے مقدمات ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مقاصد کی طرح ان مقدمات میں سے کسی خاص مقدمہ کو اختیار کرنا ہی لازم و واجب نہیں، اس لئے ارشاد ہے کہ

> رہا یہ سوال کہ مختلف مقدمات میں سے کس کو اختیار کیا جائے، اس کا خود ہی فیصلہ کر لے یعنی جس میں جمعیت و دلچسپی زیادہ ہو وہی زیادہ نافع ہوگا۔ اور یہ مسئلہ کہ جمعیت مطلوب و نافع ہے قواعد فن نیز تجربہ سے تو مجھے معلوم تھا ہی لیکن جی چاہتا تھا

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم صفحہ ۳۴۶

کہ اس باب میں کوئی نص بھی مل جائے۔ الحمد للہ کا شکر ہے کہ آج ہی کل میں اس کی دلیل شرعی بھی ذہن میں آگئی۔ حدیث میں ہے کہ اگر کھانا تیار ہو اور نماز بھی تیار ہو یعنی جب بھوک کا تقاضا ہو تو پہلے کھانا کھالے پھر نماز پڑھے۔ سو اس کی علت صرف یہ ہے کہ اگر پہلے نماز پڑھی تو طبیعت مشوش رہے گی نماز میں جمعیت حاصل نہ ہوگی، اور اس کے عکس میں نماز تو جمعیت کے ساتھ ہوگی اور کھانا تشویش کی حالت میں (کیونکہ نماز میں جی لگا رہے گا) حضرت امام ابوحنیفہ نے یہی وجہ عجیب عنوان سے بیان فرمائی ہے کہ "لان یکون اکلی کلہ صلوۃ خیر من ان یکون صلوتی کلہا اکلا" یعنی میرا کھانا اگر نماز بن جائے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ میری نماز کھانا بن جائے۔

ہمارے حاجی (امداد اللہ) صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس اصل پر ایک تفریع فرمایا کرتے تھے اگر کوئی ہجرت کرکے مکہ معظمہ میں قیام کرنا چاہتا، اور حضرت کو فراست سے اس کا یہ مذاق معلوم ہو جاتا کہ اس کو مکہ معظمہ میں ویسی جمعیت نہ ہوگی جیسی ہندوستان میں ہے تو اس کو ہجرت کی اجازت نہیں دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر ہندوستان میں جسم ہو اور مکہ میں قلب، تو یہ اس سے اچھا ہے کہ مکہ میں جسم ہو اور ہندوستان میں قلب[1]۔

سبحان اللہ کیا کہنا! واقعی جو محقق صوفی ہیں اُن کی نگاہ قرآن و حدیث کے مغز و تہ تک جاتی ہے۔

غرض جتنے اشغال ہیں وہ جمع خواطر ہی کے لئے ہیں مقصود بالذات نہیں، اور ایمیں مشائخ نے یہاں تک وسعت کی ہے کہ بعض اشغال جوگیوں تک سے لئے ہیں مثلاً حبس دم جو جوگیوں کے ہاں کا شغل ہے، مگر چونکہ یہ ان کا مذہبی یا قومی شعار نہیں، اور خطرات کے دفع کے لئے نافع ہے، اس لئے اس کو بھی اپنے ہاں لے لیا ہے۔ اور اس میں کچھ حرج نہیں نہ اس میں تشبہ ممنوع ہے۔ کیونکہ جو چیز کسی دوسرے فرقے کا نہ قومی شعار ہو نہ مذہبی، محض تدبیر کے درجے میں اس کو تدبیر ہی کی حیثیت سے کسی نفع کے لئے اختیار کرنے میں کوئی محذور شرعی نہیں ہے۔ چونکہ حبس دم بھی دفع خواطر کی محض ایک طبعی تدبیر ہے اس لئے

[1] الغنہ ص ۲۴۴

اس کا استعمال جائز ہے، کیونکہ یہ اخذ محض تدبیر میں ہے نہ کہ کسی مذہبی یا قومی شعار میں۔

اور اس کے جواز کی دلیل خندق کا واقعہ ہے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینۂ طیبہ کو چاروں طرف سے محدود و محفوظ فرمانا چاہتے تھے حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا کہ ہمارے فارس میں شہر کے گرد خندق کھودتے ہیں۔ چنانچہ حضورؐ نے حکم دیدیا کہ خندق کھودی جائے، اور خود بھی بنفس نفیس کھودنے میں شریک ہوئے، تو یہ انتظام و تدبیر فارسیوں کا کوئی قومی یا مذہبی شعار نہ تھا محض ایک تدبیر تھی، اس لئے حضورؐ نے اس کی اجازت دے دی[1]۔

کثرتِ ذکر باقی نفس ذکر جس کی کثرت و دوام پر تصوف میں اتنا زور ہے کہ خود حضرت علیہ الرحمہ نے قصد السبیل میں تصوف کے دو جزء ٹھہرا کر دوسرے یا اعلیٰ مرتبے کا (ظاہر کی مندوب و مستحب طاعات کے ساتھ) دوسرا جزء "باطن کو دوام ذکر میں مشغول رکھنا" ہی قرار دیا ہے۔ ذکر کی یہ کثرت و دوام خود قرآن و حدیث میں منصوص و متواتر ہے، اذکروا اللہ ذکراً کثیراً وغیرہ کے علاوہ "الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم" کی مشہور آیت ہی سے نہ صرف کثرت بلکہ دوام بھی ثابت ہے، اس لئے کہ آدمی کی کل تین ہی حالتیں ہو سکتی ہیں یا کھڑا رہے گا یا بیٹھا یا لیٹا، اور ان تینوں حالتوں میں ذاکر رہنے کے معنی سوتے جاگتے ہمہ وقت اور ہر حال میں ذاکر رہنے ہی کے ہو سکتے ہیں۔ محاورہ میں بھی کسی بات کا دھیان اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے رہنے کے معنی کثرت و دوام ہی کے ہوتے ہیں۔

نیز اس آیت سے ذکر قلب کا بھی استنباط فرمایا ہے اس لئے کہ کھڑے بیٹھے لیٹے آدمی بہت سے دوسرے کاموں یا باتوں میں لگا رہتا ہے، جن کے ساتھ لسانی کے بجائے قلبی ہی ذکر ممکن ہے، خصوصاً لیٹنے میں جبکہ اسمیں سونے کی حالت بھی داخل ہو۔ پھر "لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ" نے ذکر قلب کی منصوصیت کو اور بھی واضح فرما دیا ہے اس لئے کہ تجارت اور کاروبار کی مصروفیت کے اوقات میں بھی ذکر سے غافل نہ ہونا قلبی ذکر ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

راقم احقر کی فہم احقر میں تو جو ذکر قرآن و حدیث میں مامور و منصوص ہے وہ دراصل ذکر قلب ہی ہے جسکے بغیر

[1] ایضاً۔ ص ۲۲۵

ذکر کی لغوی و معنوی حقیقت متحقق نہیں ہو سکتی۔ ذکر کے لفظی و لغوی معنی یاد، یا یاد داشت کے ہیں، اور کسی شے کو جب یاد کیا جاتا ہے یا خود یاد آجاتی ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ذہن کو اس کی طرف متوجہ کیا گیا یا از خود متوجہ ہو گیا۔ جب آدمی کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کرنا چاہتا ہے تو اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہوتی یا ہو سکتی ہے کہ اس کی جانب ذہنی یا قلبی توجہ و التفات سے کام لے رہا ہے، بلکہ زبان سے اس کا نام لینا سرے سے ضروری نہیں ہوتا۔ لہٰذا یاد یا ذکر دراصل نام ہے مذکور کو دل سے یاد کرنے یا اس کی طرف قلبی توجہ کا نہ کہ محض لسانی تلفظ کا۔ البتہ زبان سے نام لینا یا لسانی تلفظ قلبی توجہ کا عام و آسان ذریعہ ہے۔ اسی لئے کسی بھولے بسرے یا مرے ہوئے دوست و عزیز کا نام ہمارے سامنے لے لیا جائے تو اس کی اور اُس کے تعلقات کی یاد دل میں تازہ ہو جاتی ہے، یعنی قلب ان بھولی ہوئی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ احادیث میں اُٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے کھانے پینے، ملنے جلنے، رنج و راحت، بیماری و صحت، عیادت و تعزیت، دعوت و رخصت، سواری و سفر وغیرہ غرض زندگی کے تمام چھوٹے بڑے احوال و مواقع پر اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت نعمت و مشیّت وغیرہ کی یاد دہانی کے لئے جو اذکار مامور و ماثور ہیں، ان کا منشا یہی ہے کہ دن رات ہر حال اور ہر موقع کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے خاص تعلق کی یاد دل میں تازہ ہوتی رہے مثلاً کھانے کے بعد یہ دعا کہ الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین اور پہنتے وقت یہ دُعا کہ الحمد للہ الذی کسانی ما اواری بہ سوئتی واتجمل بہ فی حیاتی۔ کا مدعا اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم دل سے یہ سمجھیں کہ کھلانے پلانے، پہنانے اُڑھانے والا، روزی و رزق عطا فرمانے والا حقیقۃً اللہ ہی ہے اور البتہ ظاہری اسباب و وسائل محض ظاہری ہیں۔

ایک طالب نے متعارف ذکر و شغل سے اپنی نامناسبت کے ساتھ عرض کیا کہ "اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و احسان ہے کہ زندگی کے تمام چھوٹے بڑے کاموں میں اس کے فعل و قدرت حکمت و مشیّت وغیرہ کا کسی نہ کسی طرح ادراک و استحضار رہتا ہے، اور اگر اس کی رویت کا بھی کچھ استحضار رہتا ہے تو اس سے قلب و جوارح سب کے اعمال میں بہت نفع محسوس ہوتا ہے"۔ جواب میں تحریر فرمایا:-

"کیا یہ تھوڑا انعام ہے یہی تو مقصودِ اعظم ہے۔ اذکار و اشغال متعارفہ اسی کا تو مقدمہ ہیں، اس کے ہوتے ہوئے مقدمات کی کاوش کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ کسی کو پکی پکائی روٹی مل گئی اور وہ پھر بھی تمنا کرتا ہے کہ خود پکاؤں"۔

(تربیۃ السالک لنور معز ۱۳۶۴ھ)

نیز قصد السبیل میں "باطن کو دوام ذکر میں مشغول رکھنا" تصوف کے اعلیٰ مرتبہ کا لازم جزء ٹھہرایا ہے اس سے مراد بھی دل ہی کی یادداشت اور توجہ ہے یعنی حق تعالیٰ کی یاد دل میں اس طرح بس جائے کہ زندگی کی ہر حرکت و سکون میں اس کی رضا و ناراضی، اس کی محبت و عظمت، اس کی سزا و جزا، عذاب و ثواب پیش نظر ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بجز بشری سہو و خطا یا غفلت کے عمداً و دانستہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی یا چھوٹے بڑے معاصی کے قریب جانا اس کے لئے عملاً ناممکن ہوگا۔ "اکبر الاعمال" نام ایک وعظ میں ذکر کو سب سے بڑا عمل قرار دے کر ذکر کی اس حقیقت و علامت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ ذکر حقیقی سارے معاصی سے بچنے اور تمام اوامر کے بجالانے کو مستلزم ہے۔

"لوگ سوالاکھ مرتبہ اللہ اللہ کہنے کو ذکر اللہ سمجھتے ہیں۔ گر یہ بھی حقیقتِ ذکر نہیں، صورتِ ذکر ہے، اور ذکر کے آثار سے ہے۔ ورنہ اگر اس کو حقیقتِ ذکر حاصل ہوتی تو یہ شخص دوسرے اعمال کا تارک نہیں ہو سکتا، حالانکہ بعضے سوالاکھ دفعہ اللہ اللہ کرنے والے بھی دوسرے اعمال سے معرا ہیں۔" (باقی)

ایمان و امان!

(از۔ جناب مولانا حکیم محمد اسحٰق صاحب سندیلوی اُستاذ دینیات و معاشیات دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

(۲)

دوسرا سوال آکسفورڈ یونیورسٹی کے کسی پروفیسر سے پوچھئے یا افریقہ کے کسی مردم خور وحشی سے دونوں انسان کو فانی بتائیں گے۔ نوعِ انسانی کا یہ متفقہ فیصلہ روزمرہ کے مشاہدہ پر مبنی ہے جس کا انکار غیر ممکن ہے مگر فطرت محض اس مشاہدہ اور فیصلہ سے مطمئن نہیں ہو جاتی اس کی نگاہیں موت کے پردے کو چاک کر کے اس کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہیں، موت کے بعد کیا ہے؟ کوئی نئی زندگی ہے یا محض فنا؟ اس کے بعد جو کچھ ہے اس کو ہمارے افعال و اعمال سے کیا تعلق ہے؟ کیا کوئی ایسا فعل بھی ہے جو اس سخت گھاٹی کے بعد بھی ہماری بقا کا ضامن ہو سکے؟ یہ سب سوالات ہیں جو ہر انسان کے ذہن و دماغ میں بالکل فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

پہلے سوال کی طرح اس کے جوابات میں بھی اختلاف پیدا ہوا ہے۔ یہ سب جوابات دو قسموں کے ذیل میں داخل ہیں اور سوال اوّل کے جوابات کے ساتھ گہرا ربط رکھتے ہیں۔

پہلا جواب موت کا پُل پار کرنے کے بعد ایک دوسری دنیا ہے جس کے دو حصّے ہیں ایک حصّہ میں ہمیشہ ہمیش باقی رہنے والا آرام ہے، ایسا آرام جس کی اصلی کیفیت کا تصور بھی یہاں محال ہے۔ دوسرا حصّہ وہ ہے جس میں ہمیشہ باقی رہنے والی تکلیف ہے، ایسی تکلیف جس کی شدت کا اندازہ بھی یہاں ناممکن ہے۔ دونوں کا حاصل کر لینا انسان کے اختیار میں ہے، اور دونوں کا تعلق اس کی اسی دنیاوی زندگی سے ہے۔ اس کا کردار ہی وہ چیز ہے جس کی اچھائی بُرائی اس کو دونوں میں سے کسی ایک ٹھکانے پر پہونچاتی ہے۔ پھر جو اس عالم کا خالق اور مالک ہے وہی اُس عالم کا بھی خالق و مالک ہے اس کے احکام پر چلنا ہی وہ راستہ ہے جو دائمی آرام کے ٹھکانے پر پہونچاتا ہے اور اس کی نافرمانی ہی وہ راستہ ہے جو دائمی تکلیف و مصیبت کی بھٹّی میں گراتا ہے وہ مالک ہمارے ہر کام کو جانتا اور دیکھتا ہے، اور ایک دن ایسا آئے گا جب ساری مخلوق کو جواب دہی کے لئے

اس کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا، اُس دن نہایت عدل و انصاف کے ساتھ منصفِ حقیقی ہر شخص کے متعلق اس کے ایک ایک ذرۂ اعمال کا حساب کرکے اچھے بُرے ٹھکانے اور جزا و سزا کا فیصلہ کرے گا۔

یہ ایک مفصل عقیدے کا مجمل بیان ہے جس کا مختصر عنوان "عقیدۂ آخرت" ہے۔

دوسرا جواب اس عالم کے علاوہ جس میں ہم رہتے سہتے ہیں کوئی دوسرا عالم موجود نہیں ہے۔ موت فنا کا نام ہے یا تغیر صورت کا۔ مرنے سے انسان ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل نہیں ہوتا۔ ہمارے افعال و کردار کو اگر ہماری فنا و بقا، راحت و مصیبت سے کوئی تعلق ہے تو وہ اسی دنیا تک محدود ہے۔ اس سے آگے نہ کوئی عالم ہے نہ ان کا اس سے کوئی تعلق ہے۔

یہ دو خیال ہیں جنھوں نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس وقت میں آپ کو منطقی استدلال کی پُرخار وادی میں نہیں لیجانا چاہتا بلکہ آپ کے سامنے انسانیت کی طرف سے صرف ایک سوال پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ان میں سے کون سا عقیدہ امن و امان سے مناسبت رکھتا ہے؟۔

انسانی زندگی متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے۔ خواہشوں کی تکلیف بھی اس میں موجود ہے اور تسکین کی راحت بھی، کامیابیاں بھی اور ناکامیاں بھی، رنج بھی، خوشی بھی۔ میخانۂ زندگی کا پیرِ مغاں ظرفِ قدح خوار کو خوب پہچانتا ہے، بچپن میں غفلت کا شیریں شربت پلا کر بے خود بنا دیتا ہے، شباب ایک شعلۂ جہانتاب ہے آتا ہے اور ساغر پر ساغر لنڈھاتا ہے۔ ہر ساغر میں سارے عالم کی رنگینیاں پیس کر ملا دی جاتی ہیں، انسان پیتا ہے اور غافل و بدمست ہو جاتا ہے، پھر اس شباب کا سایہ ڈھلنے پر جب کچھ ہوش آتا ہے تو پیری کا جرس قافلہ کے کوچ کی خبر سناتا ہے اور موت کی منزل آجاتی ہے۔ یہ ہے انسانی زندگی کی کہانی، مگر اس کے بعد میں اگر کہو کہ کچھ نہیں ہے اور بس یہی زندگی سب کچھ ہے تو اسے ماننے کے بعد کسی سے کیوں کہیں اور کیونکر کہیں کہ تم پاکباز رہو۔ لذتوں اور خواہشوں میں اعتدال پیدا کرو۔ تمناؤں کے بحرِ بیکراں پر بندھ لگاؤ۔ آرزوؤں کو اصلاح کے زنداں میں مقید کرو۔ اور کوئی مانے تو کیوں مانے؟ اگر اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، اگر اس عالم کے علاوہ کوئی دوسرا عالم نہیں ہے، اگر جزا و سزا کا کوئی وجود نہیں ہے، اگر آخرت کا خیال غلط ہے تو پھر عقل و خرد کا فیصلہ یہی ہے کہ انسان ادنیٰ سی ادنیٰ آرزو کو بھی منزلِ تکمیل تک پہونچائے بغیر نہ رہے اور مستی و شراب چنگ و رباب، قتل و خراب دنیا کی ہر برائی کا اکتساب اس کے لئے جائز ہی نہیں بلکہ ضروری و واجب ہو۔

انسانی طبیعتیں مختلف ہیں اس لئے ان کی خواہشیں اور لذتیں بھی مختلف ہیں ایک معمولی نوجوان اگر

آتشِ سیال سے تسکین حاصل کرتا ہی تو چنگیزی طبیعت رکھنے والوں کی بھی دنیا میں کمی نہیں ہی جن کے لئے تڑپتی ہوئی لاشیں خون پلکاں مجسمے جلتی ہوئی بستیاں، ڈھیتی ہوئی عمارتیں، یتیموں کے نالے، بیواؤں کی آہیں اور اسی طرح کے دلدوز مناظر کیف و سرور کی دنیا بساتے ہیں اگر ان میں طاقت ہی تو وہ اس ڈرامہ کو کھیل سکتے ہیں۔ اگر آخرت نہیں ہے تو ان کو کس دلیل کی بنا پر قابلِ نفرت مجرم سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ عالم جہاں خواہشات اور جذبات کی حکمرانی ہو، جہاں کے باشندے لذتوں کے خوابِ شیریں سے چونکنا نہ چاہتے ہوں، جہاں آرزوؤں کی ساری دنیا سمٹ کر صرف حیاتِ مستعار میں جمع ہو گئی ہو، جہاں تمناؤں کی تاریک رات انسان کے قلب و دماغ کو اپنے آغوش سے باہر نہ جانے دیتی ہو، جہاں دنیا اور دنیاوی زندگی کی ساری رعنائیاں اور رنگینیاں سمٹ کر انسانی نظروں میں سما گئی ہوں جہاں فنا کا دھڑکا اور فرصت کی کمی کا کھٹکا ہر وقت خواہشوں کو زیادہ کر رہا ہو وہاں امن و امان یا راحت و اطمینان کا کیا کام ہی؟ کیا ایسی جگہ خود غرضی، خود پرستی، حیوانیت، بہیمیت، خواہش پرستی، لذت پرستی کے علاوہ کوئی ایسی چیز بھی پائی جا سکتی ہی جو انسانیت کو طاقت دے۔ کیا ایسی جگہ فتنہ و فساد کی آتشیں بادِ سموم کے علاوہ امن و امان کی نسیمِ رُوح پرور کا کوئی بھونکا بھی آ سکتا؟۔

ایک تنکا ہے جس کا سہارا یہ مادہ پرست لیتے ہیں اس کو بھی ان کے ہاتھ سے کیوں نہ چھین لیا جائے؟ کہتے ہیں کہ فطرتِ انسانی اجتماع کی دلدادہ ہی اور اس کے لئے خواہشوں میں اعتدال پیدا کرنا نیز ان کو کسی قانون کے ماتحت رکھنا ضروری ہی۔ یہی پاکبازی کی راہ ہی، اور یہی امن و راحت کی کنجی ہی۔

فطرتِ انسانی کی اس غلط ترجمانی سے چشم پوشی کیجئے، معیارِ اعتدال کے مسئلے کو بھی اس وقت نظر انداز کیجئے، قانون سازوں کے ذاتی رجحانات کے سوال کو بھی چھوڑ دیجئے اور اجتماعی مفاد کے بارے میں اختلافِ خیال کا معاملہ بھی ایک طرف رکھئے مگر یہ سوال تو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ قانون کی نگاہ سے مخفی ہو کر فتنہ و فساد کی آگ سُلگانے میں کوئی رکاوٹ پیش آ سکتی ہی؟۔

جسمِ انسانیت کے وہ زہریلے پھوڑے جو جرائم اور بداعمالیوں کے نام سے موسوم ہیں، اگر قانون کی پٹیاں ان کے منھ کو بند بھی کر دیں تو بھی ان کا زہریلا مواد اس کو اندر ہی اندر کھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک دن پورا جسم سیکڑوں رِستے ہوئے ناسوروں کا مجموعہ اور سر سے پیر تک ایک زخم بن جاتا ہی۔ اجتماعی قائدوں کا خیال کچھ دنوں تک خواہشوں کو روکتا ہی پھر یہی خیال اجتماعی جرائم [illegible] بن جاتا ہی۔

کوئی مجھے بتائے کہ دنیا کا وہ کون سا جرم ہے جو اجتماعی مفاد کے نام پر آج نہ ہو رہا ہو؟ عقل و تجربہ کسی طرح باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ انسان آخرت کا عقیدہ چھوڑ کر محض اصول کے سوکھے ٹکڑوں کے لئے لذتوں اور کامرانیوں کے تر و تازہ لقموں سے منہ موڑ سکتا ہے۔ اور اس راہ میں کسی رکاوٹ یا پابندی کو برداشت کر سکتا ہے۔ صرف آخرت کا عقیدہ ہی وہ محتسب ہے جو ستر پردوں کے اندر بھی انسانی کردار کی نگرانی کر سکتا ہے اور اس کو فتنہ اور فساد سے روک سکتا ہے۔

واقعہ کی تصویر ایک دوسرے زاویئے سے دیکھئے! جس شخص کی آرزوئیں، خواہشیں، لذتیں اور کامرانیاں اسی کے ساتھ آغوشِ لحد میں ہمیشہ کے لئے سونے پر اصرار کر رہی ہوں، جس کی کوتاہ نظر موت کے بعد تاریکی کے سوا کچھ نہ دیکھ سکتی ہو، جس کے لئے موت کا بھیانک چہرہ فنا دائمی کی علامت ہو اس کی حسرت و یاس، قلبی بے چینی، دماغی کوفت و بے کلی کو دنیا کے کس پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے؟ سکون و راحت کی گنجائش اس کے دل کے کس گوشہ میں نکل سکتی ہے؟ غفلت اور عارضی لذتوں کا نشہ اگر اس کے دل سے چند لمحوں کے لئے بھی اُتر جائے تو روشن آفتاب، منور ماہتاب، جگمگاتے ہوئے ستارے اپنی انتہائی کوشش کے باوجود بالکل ناکام رہیں گے، اور اس کو سارا عالم تیرہ و تار ہی نظر آئے گا۔ یقین کیجئے کہ اس واجبی شعور کے وقت غم و حسرت کا جو جنون اس کے قلب پر ہوگا دنیا کی کوئی ترازو اُسے تول نہیں سکتی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو آخرت کا منکر ہے اور یہ انکار آخرت کی پہلی سزا ہے۔

ایک دوسرے شخص کی حالت پر بھی نظر کیجئے! جس کی آرزوؤں کی تکمیل موت پر موقوف ہے۔ فرشتۂ موت جس کے لئے پیامِ وصال لاتا ہے، دوسرے عالم کی بے پایاں وسعتیں جس کی نظر کے سامنے ہیں اور وہ دنیا کو باوجود وسعت اپنی تمناؤں کے لئے تنگ پاتا ہے۔ جو زندگی کی قدر و قیمت موت اور مابعد موت کی نسبت سے سمجھتا ہے جس کے لئے موت ابدی راحت کا ذریعہ، تکمیلِ زندگی کا وسیلہ، سکون و سرور کا زینہ اور کامیابی و کامرانی کا دروازہ ہے۔ اس کے لطفِ زندگی، سکونِ قلب و دماغ، راحت و اطمینان کو کس پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے۔ —— یہ وہ شخص ہے جس کے دل و دماغ عقیدۂ آخرت سے منور ہیں۔ بلاشبہ زندگی کے تلخ ترین جرعات کو جرعۂ کوثر و تسنیم بنا دینے والی چیز عقیدۂ آخرت ہے۔

تیسرا سوال

اب ہم فطرتِ انسانی کے تیسرے سوال کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ وہ پوچھتی ہے کہ جادۂ زندگی پر چلنے کے لئے انسان رہبر کسے بنائے؟ یہاں بھی اس کو دو جماعتوں

کی طرف سے دو جواب ملتے ہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ عقل رفیق سفر ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی رہبر کی احتیاج نہیں ہے۔

دوسری جماعت کہتی ہے کہ عقل خود خام کار ناتجربہ کار اور محتاج مددگار ہے، رہبری اسکی قبول کرو جو اس نقصان سے پاک ہے، جس نے زندگی کو بنایا ہے وہی اُس کا صحیح رُخ اور اُس کے پیچ وخم بھی بتا سکتا ہے۔ اس رہبر حقیقی نے اس مقصد کے لئے تحریری ہدایت نامے بھی ہم کو دیئے ہیں اور اپنے بہت سے خاص بندوں کو بھی اس کام کے لئے مقرر کیا ہے کہ وہ ان تحریری ہدایت ناموں کی عملی تشریح کریں، گویا وحی ربانی ہی وہ روشنی کا منارہ ہے جو زندگی کے طوفان خیز سمندر میں صحیح راستہ بتا سکتا ہے۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ان ہدایتوں کو سمجھے اور انسان کی عملی قوتوں کو ان کے ماتحت حرکت کرنے کے لئے اُبھارے۔

یہ دو رائیں ہیں دنیا کے دماغ ان دونوں کے درمیان تقسیم ہو گئے ہیں۔ دیکھنا صرف اتنا ہے کہ ان دونوں میں سے کون سا راستہ امن و سلامتی تک لیجاتا ہے اور کون فتنہ و فساد تک پہونچاتا ہے۔

عقل انسانیت کا تابناک جوہر، افق زندگی کا درخشاں ستارہ، اور زندگی کی رفیق شفیق ہے، اگر وہ ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے کافی ہو تو ہمیں اس کی رہبری کے قبول کرنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟ لیکن راہِ زندگی کے کسی اجنبی موڑ پر جب ہم تھک کر یا بھٹک کر بیٹھ جاتے ہیں اور آگے قدم بڑھانے کے لئے اس رہنما کو آواز دیتے ہیں تو اس جنسِ مانوس کے سیکڑوں نامانوس افراد مختلف اور متضاد ہدایتوں کے ساتھ آجاتے ہیں اور ہمیں شاہراہ سے ہٹا کر وادی حیرت میں پہونچا دیتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی معاشی خواہشوں کے قافلے کو کس راستے پر لے چلیں؟ سوال ختم نہیں ہو چکا کہ فضا متناقض جوابات سے گونج اٹھتی ہے۔ ایک طرف قارون، فورڈ وغیرہ کی عقلیں چیخ چیخ کر چاندی سونے کے راستہ کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ دوسری طرف مارکس، لینن وغیرہ کی عقلیں اشتراکیت کی تختی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کچھ گوشہ گیر راہب اور جنگل باسی سنیاسی ترکِ دنیا کا مشورہ دیتے ہیں کچھ بے بال کے سروں میں رہنے والی عقلیں کتابوں کے انبار میں اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ کچھ اس مقصد کے لئے اونچی اونچی چمنیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

یہ پھر بھی بعد کی بات ہے۔ شعوری زندگی کا اولین قدم سوالیہ جملہ کا نشان بنکر پوچھتا ہے کہ میں

کدھر جاؤں؟ میری منزل مقصود کیا ہونی چاہئے؟ قیام کہاں ہوگا؟ اور اس کے بعد کہاں جانا ہوگا؟ اتنا اہم، عام اور ضروری سوال اور عقل کا یہ حال کہ کسی بات پر نہ قیام ہے نہ اطمینان۔ قدم لرزاں، دل ترساں، آنکھیں بند اور زبان تناقص بیان کی ترجمان۔ جبراً قہراً ادھر ادھر قدم ٹٹول ٹٹول کر چلتی ہے، اور ٹھوکر کھا کر گرتی ہے تو کبھی وادی حیرت کے پُر پیچ راستہ میں ساری عمر بھٹک کر گذارتی ہے اور کبھی افکار کے غار میں گر کر ہلاک و برباد ہوتی ہے۔ تعجب نہ کیجئے تھوڑی دیر کے لئے افلاطون، ارسطو، سقراط، ہیگل، برکلے، برگساں، اسپنسر، لاک وغیرہ ان عجیب انسانی عقلوں کے کارناموں پر ایک نظر ڈال لیجئے جنھوں نے اس موضوع پر روشنائی اور کاغذ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ صرف کیا ہے ان کے متناقض اور متضاد مشوروں کو دیکھئے جن پر نظر کرنے سے حیرت و استعجاب بھی عالم تحیر میں راہ بھول جاتے ہیں۔

اخلاق اور کردار کے اقدار کا مسئلہ روزمرہ کا مسئلہ ہے۔ زندگی کے اس ضروری مسئلہ پر عقلوں کے متضاد بیانات کو سن کر انسان حیرت میں رہ جاتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ آج تک یہ بھی طے نہ ہو سکا کہ خیر اور بھلائی کس چیز کا نام ہے؟ اگر اس مسئلہ کے متعلق فلسفیانہ بیانات کی فہرست تیار کی جائے تو بلا مبالغہ عمر کا اکثر حصہ اسی میں صرف ہو جائے، اور غریب زندگی منزل تردد کے اندھیرے میں بھٹک بھٹک کر جان دیدے۔ تحیر خیزی کے لئے اتنا ہی کافی تھا مگر جب ہم فلاطون، اسپنوزا، لاک، کانٹ، بل وغیرہ کے پہلو بہ پہلو نیرو، زار، ہلاکو، چنگیز وغیرہ کو بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں تو ہماری حالت کو بیان کرنے کے لئے حیرت کا لفظ بھی ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی عقل نے تو دنیائے اخلاق کا تختہ ہی الٹ دیا اور اپنے نظریات پر عمل کر کے بھی دکھا دیا آخر ان کی عقل و فہم بھی تو انسانی عقل و فہم تھی؟۔

تمدن اور ارتقاء انسانیت کے لئے اجتماع ناگزیر ہے، حق اور فرض یہی دو پہلو ہیں جن کے تعین کے بغیر اس قصر اجتماع اور خزینۂ انسانیت کی حفاظت غیر ممکن ہے۔ مگر غریب عقل اس معاملہ میں بھی اسی کشمکش میں مبتلا ہے ذرا فلسفیوں اور ماہرین علم سیاست و دساتیر کی کتابیں ملاحظہ فرمائیے کہ اس بارے میں ان کے درمیان کتنے اختلافات ہیں۔ عملی دنیا میں تو عقلوں کا یہ اکھاڑا بہت وسیع ہے اور کشتی برابر جاری ہے۔ جب ایک جوڑ رخصت ہو جاتا ہے تو دوسرا جوڑ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ غریب زندگی آئینہ بن کر پہلوانوں کے داؤں پیچ کو دیکھتی ہے اور اس میں محو ہو جاتی ہے۔

یہ نمونے اور مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے یہ مشتے نمونہ از خروارے بھی نہیں ہیں،

لیکن اظہارِ حقیقت کے لئے بالکل کافی ہیں۔ اب میں دنیا کے ہر ایسے انسان سے پوچھتا ہوں جس کے سر پر عقل و فہم کا تاج رکھا ہوا ہو، جس کے دماغ کے پیچیدہ راستے اس نقطہ سے روشن ہیں، جس کا ذہن کسی جسمانی یا نفسانی مرض سے ماؤف نہیں ہو گیا ہے، خواہ وہ عالمِ تخیل و استدلال پر حکمرانی کرنے والا کوئی فلسفی ہو، یا خیالستان کی رُومانی دنیا میں بسنے والا شاعر، یا مادہ و قوت کا پرستار سائنسداں، یا طاقت و جبروت کا مظہر حکمراں، یا زریں دماغ سرمایہ دار، یا غربت و فلاکت کا شکار جاہل کاشتکار، میں دنیا کے ہر انسان سے پوچھتا ہوں اور خدا اور انسانیت کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ انسان کس عقل کو راہِ زندگی کا رہبر بنائے؟ اور کس کی سمجھ سے زندگی میں پیدا ہونے والی اُلجھنوں کو سُلجھائے؟۔

بعض اشخاص گھبرا کر کبھی یہ بھی کہنے لگتے ہیں کہ ہر انسان اپنی عقل پر بھروسہ کرے اور اسکے فیصلہ کو آخری فیصلہ سمجھے، مگر سوال یہ ہو کہ کتنی عقلیں اس قابل ہیں کہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی ہمت بھی کر سکیں؟۔

پھر کیا ہر عقل کی اس آزادی و خود رائی کے اصول پر دنیا کا کوئی نظامِ زندگی، اور کوئی اجتماع کبھی وجود میں آسکتا ہے؟ یا باقی رہ سکتا ہو؟ مسئلہ کے ہر پہلو سے یہاں بحث نہیں ہو، بات صرف اتنی کہنی ہو کہ عقلوں کے ان اختلافات کے پیشِ نظر ایسی زندگی ہرگز فتنہ و فساد، مصیبت و بدامنی سے خالی نہیں ہو سکتی جس کی رہنمائی محض انسانی عقل کر رہی ہو ——— جہاں انسانیت کو ہزاروں رہبر مختلف راہوں اور سمتوں کی جانب پوری قوت سے کھینچ رہے ہوں، وہاں اس کے جسم کے ٹکڑے گردِ کارواں کے ہمدوش تو ہو سکتے ہیں، مگر اس کا کسی راہ پر چلنا یا منزلِ مقصود پر پہونچنا محال ہے۔ دنیا کے وہ غلط اور زہریلے نظریات جو ساری دنیا میں فتنہ و فساد، قتل و خونریزی تکلیف و پریشانی کی آگ بھڑکا دیتے ہیں، اسی عقل پرستی کا نتیجہ ہیں یا کسی اور چیز کا؟ کیا عقل کو آخری حکم (FINAL AUTHORITY) اور رہبرِ کامل ماننے کے بعد ان نظریات کی پیداوار میں کوئی کمی پیدا کیجا سکتی ہو؟ عقل کی قوتِ رہبری سے انکار نہیں، اس کو معطل کر دینا یا اس کو بالکل غیر معتبر سمجھنا اللہ تعالیٰ کی اس عظیم الشان نعمت کا کفران ہو۔ یہ وہ جرم ہو جس کی سزا سے انسان کبھی نہیں بچ سکتا، لیکن اس سے وہ کام لینا جو اس کی قدرت سے باہر ہو، اس سے اس چیز کی طلب کرنا جس سے اس کی جیب خالی ہو اور اس پر ایسا وزن رکھنا جس کی برداشت سے اُسکے بازو عاجز ہیں۔ یہ بھی کفرانِ نعمت، ظلم اور ایسا جرم ہو جس کی سزا دنیا میں سفاہت و حماقت اور جہل کی صورت میں اور آخرت میں عذاب و مصیبت کی شکل میں ملنی ناگزیر ہے۔

جب عقل خود رہبر کی تلاش میں ہو اور اپنی اس احتیاج کا بار بار اقرار کر رہی ہو تو رہبری کا پورا بار اس پر ڈال دینا خلافِ عقل اور کھُلی ہوئی ناسمجھی ہے۔ عقلمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اس پر یہ ناقابلِ برداشت بوجھ رکھنے کے بجائے اس کے لئے رہبر تلاش کرے، اور اس کو رفیقِ سفر بنا کر راستہ کی وحشت و اجنبیت کو دور کرے۔

یہ رہبر کون ہو سکتا ہے؟ وہ رہنمائی جو دنیا کی سب سے بڑی طاقت یعنی عقل انسانی سے بھی برتر ہو صرف خدائی رہنمائی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ روشنی ہے جس سے جہالت کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں اور اسی کی مدد سے انسان کامل انسان بن سکتا ہے۔

وحئ ربانی کی پیروی امن عالم کی ضامن ہے۔ اس حقیقت کو بہت معمولی سی توجہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے وحئ ربانی وہ نقطے مقرر کر دیتی ہے جہاں افکار کے سب خطوط آ کر مل جاتے ہیں، افکار کے مختلف دھارے اسی سنگم پر آ کر مل سکتے ہیں جہاں ان کا تصادم ختم ہو کر امتزاج و اتحاد کی موجوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور انسانیت کی کشتی کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر امن و سلامتی کے ساحل تک پہونچا دیتا ہے۔ بدامنی شخصی ہو یا اجتماعی، ہمیشہ ذہنی تصادم سے شروع ہوتی ہے، یہ تصادم اس وقت ہوتا ہے جب افکار کے رُخ ایک دوسرے کے مقابل ہو جائیں اگر سمتیں باہم متصادم نہ ہوں تو خیالات مختلف ہونے کے باوجود تصادم پیدا نہیں ہو سکتا اللہ کے رسولوں کی رہنمائی سارے عالم کے افکار کو ایک ہی رُخ پر لے چلتی ہے، اس لئے ان میں تصادم تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے، اگر ساری دنیا وحئ الٰہی کی رہنمائی قبول کر لے، اور ہر چیز کا آخری فیصلہ اسی پر چھوڑ دے تو امن و راحت کی بہار کبھی خزاں کا منحوس چہرہ نہ دیکھ سکے۔

وحی کی روشنی کے بغیر انسانی زندگی کے بنیادی مسائل اندھیرے میں رہتے ہیں، عقلیں اس اندھیرے میں گھبرا کر باہم دست و گریبان ہو جاتی ہیں۔ بادشاہوں کی کشاکش پورے ملک کی کشاکش ہوتی ہے ان حکمران طاقتوں کے اُلجھتے ہی ساری زندگی کشمکش کا عنوان بن جاتی ہے اور انسان کی ساری طاقتیں میدانِ کارزار میں کود پڑتی ہیں۔ ربانی ہدایت ان بنیادی مسائل زندگی اور اس کی ناگزیر حقیقتوں کو روشن کر دیتی ہے جس سے ساری زندگی روشن ہو جاتی اور عقل کی الجھن دور ہو جاتی ہے۔ جب عقل صحیح راستہ پر چلے تو انسان کی سب طاقتیں ٹھیک راستہ پر چلتی ہیں اور جنگ و جدل کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

عقل و دل کی کشمکش دنیا کا ایک ناگزیر حادثہ ہے۔ یہی دو طاقتیں عالم انسانیت پر حکمرانی کرتی ہیں۔

جب دل غالب ہوتا ہے تو عالمِ افکار میں لاشوں کا انبار لگ جاتا ہے، عقل مجروح و شکستہ ہو کر نسیان و غفلت کے جنگلوں میں منھ چھپاتی پھرتی ہے، اور اگر عقل فتحیاب ہوتی ہے تو ارمانوں کے خون سے دل کی سرزمین لالہ زار ہو جاتی ہے، عقل دب جائے یا جذبات ختم ہو جائیں دونوں صورتوں میں انسانیت ناقص ہو جاتی ہے۔ وحیٔ ربانی اور اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی رہبری ہی وہ طاقت ہے جو ان دونوں طاقتوں میں امتزاج توافق اور اعتدال پیدا کرتی ہے اور انسانیت کے ان دونوں بازوؤں کو تناسب کے ساتھ طاقت پہونچاتی ہے، یہی معتدل فضا ہے جس میں راحت و آسائش امن و امان کا پودا نشو و نما پا کر اپنی سرسبزی و شادابی سے سارے عالم کو سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے۔

سوچنے کے ۲ دو طریقے

انسان کے جن فطری سوالات کے متعلق ہم اوپر گفتگو کر چکے ہیں انھیں سے انسان کی ذہنی تگ و دو کے لئے ۲ دو راستے مقرر ہو جاتے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات ہی درحقیقت ان راستوں کو پیدا کرتے ہیں اور ان کے درمیان مشرق و مغرب سے زیادہ مسافت اور اختلاف پیدا کر دیتے ہیں۔

مسائلِ زندگی کو سوچنے کے لئے ایک ایمانی طرزِ فکر ہے جو توحید، آخرت اور رسالت و نبوت کے عقیدوں سے مرکب ہوتا ہے اور پوری زندگی کا جوہرِ خیال، قوتِ محرکہ، اور فیصلہ کن عنصر ہوتا ہے۔ دوسرا طرزِ فکر مادیت، انکارِ آخرت اور عقل کی پرستش سے مل کر وجود میں آتا ہے، اور اول کی طرح پوری انسانی زندگی میں جاری و ساری ہوتا ہے۔

یہی وہ طرزِ فکر اور وہ ذہنیتیں ہیں جو اپنے مناسب نظریات و حالات پیدا کرتی ہیں۔ یہی زندگی کا رخ مقرر کرتی ہیں انسان ہزار کوشش کرے مگر نہ ضدین کو جمع کر سکتا ہے اور نہ ذہنیت کو تبدیل کئے بغیر نظریات و افکار، ذوق و رجحان، خواہش و میلان، عمل و کردار میں کوئی قابلِ التفات تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ دونوں ذہنیتوں کے اجزاء ترکیبی اور ان کے اثرات و خواص اوپر بیان کئے جا چکے ہیں، اب مجموعی طور پر بھی اجمالاً ان دونوں راستوں کی منزلوں سے تعارف حاصل کر لیجئے۔

اگر آپ لکھنؤ سے کلکتہ جانا چاہتے ہیں تو فیض آباد، مغلسرائے اور اسی طرح کے دوسرے اسٹیشن پڑینگے جن کی تعمیر اسی راستہ پر کی گئی ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ اس راستہ پر سہارنپور، مرادآباد وغیرہ اسٹیشنوں سے آپ کو گذرنا ہو، بالکل اسی طرح جب فکر کا مسافر خدا سے بغاوت کر کے آخرت سے منھ موڑ کر اور خود رائی کو

رفیق بنا کر سفر کرتا ہے تو اس کا ایسے نظریات کی منزلوں سے گذرنا ناگریز ہے جو امن عالم اور اطمینانِ قلب کے دشمن ہیں۔

وہ زندگی، وہ تمدن، وہ معاشرت جس کی بنیاد یہ غیر ایمانی طرزِ فکر اور باغیانہ ذہنیت ہو جس کی پوری عمارت مادیت کے کوہ آتش فشاں پر کھڑی کی گئی ہو جس میں افعال و کردار کی قدریں ہوا و ہوس، لذت و خواہش جاہ و مال کی نسبت سے مقرر کی جاتی ہوں، جس کی نظروں کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین اور مادیت کے پست میدان کے علاوہ کوئی بلند و برتر میدان نہ ہو، جس کی رگ رگ میں خود غرضی اور نفس پرستی کا زہر سرایت کر گیا ہو جس میں اچھائی برائی، روشنی و تاریکی، سیاہی و سپیدی میں امتیاز پیدا کرنے کا خاصہ بالکل معدوم ہو، جس میں موت کے بعد کچھ نہ ہو جو محض پست درجے کے حواس اور پابند حواس عقل فرومایہ کے اشاروں پر متحرک ہو، خالص مادی ذہنیت جس کی روح رواں ہو، جو توحید سے روگردانی اور وہمی و خیالی معبودوں کی بندگی کی فضا میں نشو و نما حاصل کرے؟ اسمیں ایسے ہی نظریات پیدا ہو سکتے ہیں جو انسانیت کے دشمن، چمنستانِ امن و اماں کے لئے پیامِ خزاں، اور خرمنِ آدمیت کے لئے شعلۂ جوالہ ہوتے ہیں۔

نظریۂ سرمایہ پرستی کا شجرۂ خبیثہ جس کی آبیاری خونِ دہقاں سے کی جاتی ہے اور جسکے تلخ و زہریلے پھل انسانیت کے گلے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اسی غیر ایمانی زمین کی سرزمین میں پیدا ہوتا ہے اشتراکیت کا امن سوز اور انسانیت کش نظریہ بھی اسی قسم کے دماغ سے نکلتا ہے، ہٹلر کی نازیت، مسولینی کی فسطائیت اور اسی قسم کے باطل، امن سوز، اور فتنہ بردوش نظریات و افکار جنھوں نے عالم کو جہنم ارضی بنا دیا تھا اسی طرزِ فکر اور اسی اصولِ زندگی کا نتیجہ تھے۔ جب تک یہ غیر ایمانی طرزِ فکر نہ بدلا جائے اور دنیا ایمانی طرزِ فکر کو نہ اختیار کرے اُس وقت تک اسی قسم کے نظریات و افکار برابر وجود میں آتے رہیں گے اور دنیا کی کوئی تدبیر ان کی پیدائش کو نہیں روک سکتی۔

جب زندگی کی روح اللہ اور اُس کے رسولوں اور آخرت پر یقین و ایمان کو بنا دیا جائے اور اس سفر کا نقطۂ آغاز و انجام اللہ کی رہنمائی سے مقرر کیا جائے۔ جب انسان اپنے افعال و کردار کیلئے ہر چیز کو جاننے اور دیکھنے والے تنہا معبود و مالک کے سامنے جواب دہ ہو۔ جب اس کے سامنے ایک اعلیٰ زندگی اعلیٰ نصب العین اور وسیع میدان ہو، جب اس کی عقل وحیِ ربانی کی اعانت اور امداد سے بے پناہ

طاقت و قوت حاصل کرے۔ جب اخلاق و کردار کی قدریں آخرت کی نسبت سے مقرر ہو کر اُن کے نرخ کو عقل کی رسائی سے بھی بالاتر کر دیں، جب اعلیٰ لذتوں کا یقین پست لذتوں کو انسان کی نظروں سے گرا دے، جب آدمی دوسروں کی بھلائی میں اپنی بھلائی دیکھتا ہو، جب حق تعالیٰ کے خوف اور اس کی امید کی مضبوط رسیاں انسان کے ہاتھوں میں ہوں، تو دنیا کا کوئی امن سوز نظریہ، کوئی باطل فکر، کوئی فتنہ انگیز تخیل ذہن میں داخل نہیں ہو سکتا، اور امن و امان، راحت و اطمینان کو عالم سے کوئی شخص جلاوطن نہیں کر سکتا۔

قیامِ امن و امان اور حصولِ اطمینان کی ساری موجودہ کوششیں فضول ہیں اس کی تدبیر ایک اور صرف ایک ہے کہ دنیا ایمانی طرزِ فکر اختیار کرے۔ ایمان ہی وہ چیز ہے جو اس اجڑی ہوئی بستی کو آباد کر سکتا ہے جو اطمینانِ قلب کا لٹا ہوا سرمایہ انسان کو واپس دلا سکتا ہے، جو جلاوطن کی ہوئی انسانیت کو پھر دنیا میں واپس لا سکتا ہے اور جو فتنہ و فساد کو مٹانے والا طرزِ فکر پیدا کر سکتا ہے۔ سارے فتنوں کا علاج ایمان اور محض ایمان ہے، ایمان سے امان ہے، بغیر ایمان کے امان ایسا لفظ ہے جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتا۔

(ص کا بقیہ) اور کہاں اُن سے نسبت رکھنے والوں اور عقیدت کا دم بھرنے والوں کا یہ تجدد اور توسع۔ ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

ہم سب کو سوچنا چاہئے کہ ہماری ہی کسی مسامحت اور مداہنت کا تو یہ نتیجہ نہیں ہے؟۔

قرآن و حدیث میں علماء بنی اسرائیل کے جو خاص موجبِ لعنت جرائم بیان کئے گئے ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ منکرات و ممنوعات کے بارے میں اغماض اور مسامحت کا رویہ اختیار کرنے لگے تھے اور شرعی احتساب کے فریضہ کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْکَرٍ فَعَلُوْهُ۔

اگلی امتوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جس اُمت میں جب کبھی بڑا فساد آیا وہ ہمیشہ یا تو امراء اور حکمراں طبقہ کی طغیانی اور فسق پسندی کی وجہ سے آیا ہے یا دینی پیشواؤں کی غفلت و مداہنت اور دنیا پرستی کی وجہ سے۔

وما بدل الدین الا الملوک   واحبار سوء و رهبانها

تمنّا

از حضرت صوفی صاحب ایم اے

[illegible] کے سلسلہ میں حضرت صوفی صاحب مدظلہ کی ایک نظم بعنوان "حسرت" نمبر [illegible] الفرقان میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں جو نظم بعنوانِ "تمنا" ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے یہ بھی اُسی سلسلہ کی [illegible] اس کو "حسرت" والی نظم کے بعد پڑھنا چاہیئے ———— مدیر

تمنا ہے کوئی اللہ والا پھر دعا کر دے
کہ مجکو ربِّ کعبہ دولتِ حج پھر عطا کر دے

وہی تیاریاں ہوں پھر علائق سے جدا ہو کر
یہ بندہ پھر خدا کا ہو کے ترکِ ماسوا کر دے

گلے سے اپنے بچوں کو لگاؤں اور جدا کر دوں
محبت اپنی غالب ہر محبت پر خدا کر دے

چلوں گھر چھوڑ کر جس دم، تو ربّ البیت کا ہاتف
نویدِ باریابی دل کے پردوں کو اُٹھا کر دے

وطن کے باغ سے جس وقت نکلوں راہِ غربت میں
مدینہ یاد آ کر بابِ جنت مجھ پہ وا کر دے

مجھے رخصت کریں رو رو کے جب دم آنسوؤں والے
جنونِ شوق بحرِ اشک میں طوفاں بپا کر دے

مسافر کہہ کے بسم اللہ مجراہا و مرسٰہا
جہازِ زندگی اپنا سپردِ ناخدا کر دے

کفن پہنائے جب مجکو خدا میقاتِ ہستی پر
فنا فی اللہ کر کے زندگی سر تا بپا کر دے

صدا لبیک کی یکبارگی جب چار سو گونجے
مجھے دیوانگی اُس وقت مصروفِ بکا کر دے

فغاں کے ساتھ نکلیں پے بہ پے لبیک کی چیخیں
تصور اُن کے گھر کا میری حالت کیا سے کیا کر دے

برہنہ پا، برہنہ سر، کفن بر دوش جا پہنچوں!
جہانِ شوق میں میرا جنوں محشر بپا کر دے

وہی صحرا، وہی دشت و جبل پھر آنکھ سے دیکھوں
غبار اُن کی گلی کا میری آنکھیں سرمہ سا کر دے

وہ دیکھوں میں بیاں سے جسکے عاجز ہو زباں میری
وہ اتنا دے کہ مجکو بے نیازِ مدعا کر دے

حدودِ پاک میں اس کے حرم کے۔ سر کے بل اُتروں
وہ سجدوں کو مرے قائم مقامِ نقشِ پا کر دے

تقاضائے ادب یوں آبلہ پائی کی خو ڈالے
نیازِ راحلہ کی قید سے مجکو رہا کر دے

نیازِ عاشقی لیکر گلی میں اُن کی یوں دوڑوں
کہ مجکو جذبِ معشوقانہ منزل آشنا کر دے

تڑپ کر جان دیدوں جب حریمِ پاک میں پہنچوں
مگر پھر جی اُٹھوں جب دامنِ [illegible] [illegible] کر دے

بہت روؤں لپٹ کر بیتِ کعبہ کے دامن سے
یہ بارش آنسوؤں کی [illegible] ہستی پھر ہرا کر دے

اُسے چوموں حبیبِ کبریا نے جس کو چوما ہے   کہ شاید لذتِ عشقِ نبیؐ سے آشنا کردے

عذارِ کعبہ کا اک خالِ دلکش سنگِ اسود ہے   نہیں، چشمِ سیہ ہے حسن جس کو سرمہ سا کردے

پیوں پھر سیر ہو کر آبِ زمزم چاہِ زمزم پر   مرا جامِ طلب لبریز یہ آبِ بقا کردے

شعائر پر خدا کے جاؤں ذوقِ ہاجرہ لیکر   مری توفیق شرح آیۂ اِنَّ الصَّفا کردے

جھکاؤں سر کو اسماعیلؑ ساں ہر سنگریزے پر   مجھے قسمت اگر آوارۂ دشتِ منا کردے

پیادہ پا چلوں پھر خیف سے میں سوئے مزدلفہ   کہ مشعر پر خدا پھر ذکر کی نعمت عطا کردے

بڑھوں رحمت کی جانب کہہ کے پھر ادنا منا سکنا   کہ اپنے پاک گھر کا مجکو حاجی پھر خدا کردے

منا میں جب کفن اُترے تو میرا فاطرِ ہستی   حیاتِ طیبہ کا خلعتِ تازہ عطا کردے

اُڑا لے جائے پھر سوئے حرم مجکو مری حسرت   کہ بلبل گُل کے آگے آخری مجرا ادا کردے

تمنا ہے مری چشمِ ارادت دل کا سرمایہ   نثارِ آستین شاہدِ مشکیں قبا کردے

گزر کر عشق و شورش کے منازل سے چلوں طیبہ   تو وہ حسن آفریں میری ادائیں دلربا کردے

حبیبِ کبریا کی بزمِ محبوبی میں جا پہنچوں!   کرم پھر مجھپہ اتنا وہ حبیبِ کبریا کردے

جہاں سے گنبدِ خضرا نظر آئے اِن آنکھوں کو   کوئی اپنے قصیدے کی وہیں سے ابتدا کردے

درودوں کے ترنم سے صدائے بازگشت اُٹھے   پہاڑوں کو، نبیؐ کا نعت خواں، محوِ ثنا کردے

نظر جس وقت آنکھوں کو مری بابُ السلام آئے   نکل کر جان قالب سے ادب کا حق ادا کردے

یہ وہ در ہے جہاں لاکھوں ملائک سر بسجدہ ہیں   دعا یہ ہے کہ توفیقِ ادب مولےٰ عطا کردے

کوئی مجھ سے بتاؤ میں وہاں پہنچوں تو کیا ہوگا   وہیں کا ہو رہوں بس یہ کرم مجھپر خدا کردے

گُلِ خوبی، نہیں، گلزارِ خوبی، بلکہ جو کچھ ہے   اُسی کا مجکو مولےٰ بلبلِ شیریں نوا کردے

درودوں کے تحائف پیش کر کے میں کہوں اس سے   کہ اے شاہِ دو عالمؐ مجکو طیبہ کا گدا کردے

ترے کوچے میں گو رہنے کے قابل میں نہیں لیکن   ترا جود و سخا، تیری دعا، تیری عطا کردے

بقیعِ پاک میں ڈھونڈا ہے میں نے خواب میں مدفن   خدا اس خواب کو اک واقعہ سرتاپا کردے

تمنا ہے کہ خاکِ پاک کا پیوند ہو جاؤں
تمنا صوفیٔ محتاج کی پوری خدا کردے

ایک اہم تاریخی حقیقت

(از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

دنیا میں کسی بڑی تعمیر و انقلاب کی کوئی جدوجہد اور کسی تخریبی تحریک کا مقابلہ دل و دماغ کی اعلیٰ طاقت و قابلیت کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے، کسی گرم و پُرجوش صاحب عزم و یقین دل کا مقابلہ افسردہ، شکست خوردہ اور مذبذب دل سے اور کسی روشن، بلند و فائق، ذکی و صاحبِ اجتہاد دماغ کا مقابلہ پست و سُست اور جامد دماغ سے نہیں ہو سکتا ہے۔ تاریخ ان مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ ایک گرم و پُرجوش دل نے لاکھوں افسردہ اور مذبذب دلوں پر فتح پائی ہے اور ایک بلند و فائق دماغ نے کروڑوں انسانوں کو اپنا محکوم بنا لیا ہے۔ قوموں، تہذیبوں اور دعوتوں کی معرکہ آرائی میں اور ایک قوم کی دوسری قوم پر ایک تہذیب کی دوسری تہذیب پر فتح حاصل کرنے میں شمشیر و سناں اور دست و بازو سے زیادہ قلب و دماغ کا حصہ رہا ہے۔

یونان و روما نے متمدن دنیا پر اپنی حکومت قائم کی، اور ایک وسیع و طاقتور شہنشاہی اور ایک مخصوص تہذیب کی بنیاد رکھی، یہ محض اس کے ہتھیاروں کی فوقیت، اس کی جنگی مہارت اور اس کی فوجی طاقت کا نتیجہ نہ تھا۔ آپ اگر تاریخ کے اس دور میں واپس جائیں گے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ یونان و روما کو اپنے اپنے وقت میں اپنی معاصر قوموں پر کھلی ہوئی فوقیت حاصل تھی، وہ گرم جوش اور بلند حوصلہ دل اور زندگی کے مسائل و مشکلات کے حل، وسائل کے اور زندگی کی نئی تنظیم پر قدرت رکھنے والا دماغ رکھتے تھے۔ ان کو اپنے عزم و یقین اور اپنی ذہانت اور قوتِ فکریہ میں اپنی گرد و پیش کی قوموں پر نمایاں امتیاز حاصل تھا۔ ان کے غیر ملکی معاصرین کے حالات اور زندگی پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو ہر طرف بجھا ہوا دل، تھکا ہوا دماغ، رکتی ہوئی زبان اور ٹوٹا ہوا قلم نظر آئے گا۔ ذہنی، علمی، ادبی، دینی، عسکری شعبے سب بے رُوح نظر آئیں گے۔ ذہن سے بلند پروازی، علم سے گہرائی، ادب سے

دل آویزی، شاعری سے جگر سوزی، مذہب سے روحانیت و عظمت، زندگی سے عزم اور ولولہ رخصت ہو چکا ہے، قومی زندگی کا ہر شعبہ اور علم و فن کی ہر شاخ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی عمر پوری کر چکی ہے اور اس میں نمو و ارتقا کی صلاحیت باقی نہیں رہی، ایسی کہن سال رو بزوال قوموں کا مقابلہ جب جیتے جاگتے یونان و روما سے ہوا تو ان کو اپنے جواں سال حریف سے مقابلے میں شکست کا اعتراف کرنا پڑا، اور اس کے لئے راستہ چھوڑنا پڑا۔

بعثت نبویؐ کے وقت روم و ایران کی حقیقی زندگی ختم ہو چکی تھی، ان کے قلب و دماغ میں نئے اور گرم خون کی آمد بند ہو چکی تھی، تہذیب و تمدن اور علم و فن میں بوسیدگی آ گئی تھی۔ ادبیات، عقلیات اور الٰہیات سب میں عام دماغی پستی اور فکر و خیال کی سستی کے آثار نظر آتے ہیں جس کا اندازہ آج بھی چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے ادبی نمونوں، منطق و فلسفہ اور ہیئت کے ذخیرے اور اسرائیلیات کے اس دفتر سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنے ترکہ میں چھوڑا ہے اس کے مقابلہ میں نبوت محمدیؐ اور وحی الٰہی نے عربوں کو نئی ایمانی، فکری اور اخلاقی زندگی عطا فرمائی تھی جس کا روم و ایران میں نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس ایمان و علم نے عربوں میں ایسا عزم و یقین ایسی قلبی قوت اور ایسی دماغی بلندی پیدا کر دی تھی کہ رومی و ایرانی باوجود اپنے ترقی یافتہ ہزار ہزار سالہ تمدن، اپنی شائستگی اور علوم و فنون کے ان کے مقابلے میں دماغی حیثیت سے پست، کند ذہن اور نااہل معلوم ہوتے ہیں۔ ہر شاہی دربار، ہر عام مجلس میں، ہر ذہنی معرکہ میں مسلمانوں کی ذہانت ایرانی اور رومی دماغ کو شکست دیتی نظر آتی ہے۔ مسلمان اپنی معاملہ فہمی، سلامتِ فکر، حقیقت رسی میں اپنے حریفوں سے بہت فائق نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس علمِ الٰہی اور وحیِ آسمانی کا وہ محفوظ ذخیرہ تھا جس نے ان کو تفکر و تدبر کی دعوت دی تھی اور عادت ڈالی تھی، اس معجز کتاب اور اس کے بلند مضامین نے دفعۃً ان کی عقلی سطح کو زمین سے آسمان تک پہونچا دیا، طریقۂ فکر کو بدل دیا، زبان و ادب کا معیار اونچا کر دیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت و تربیت میں انھوں نے ایسا علم حاصل کیا جس میں گہرائی اور پختگی تھی اور بے تکلفی و سادگی۔ اور جس نے ان میں حقیقت پسندی اور حق گوئی پیدا کر دی، اس کے مقابلے میں رومیوں اور ایرانیوں کے پاس نہ تو وحی کا کوئی محفوظ سرمایہ تھا، نہ انسانی عقل و دماغ کا کوئی زندہ و توانا ذخیرہ، علم و ادب اور فلسفہ و حکمت کا کرم خوردہ دفتر تھا جو پچھلے دورِ انحطاط کی یادگار تھا اور

جس میں تجربے سے زیادہ قیاس اور حقیقت سے زیادہ مفروضات و تخیلات سے کام لیا گیا تھا یہ بوسیدہ عمارت زندگی کے اُبلتے ہوئے چشمے اور بہتے ہوئے دھارے میں کیا ٹھہر سکتی تھی، اسلام کی ایک موج اس کو بہا کر لے گئی۔

کہا جاتا ہے کہ عرب جس ملک میں گئے اور انھوں نے کچھ مدّت وہاں قیام کیا انھوں نے اس ملک کی تہذیب، معاشرت اور زبان تک بدل دی اور اس ملک نے بغیر کسی جبر و اکراہ کے مسلمانوں کی تہذیب، معاشرت اور زبان اختیار کر لی، عراق و شام، مصر اور شمالی افریقہ اپنی تہذیب معاشرت اور زبان رکھتے تھے لیکن اسلامی فتوحات کے بعد عربوں کے اثر سے انھوں نے اپنی تہذیب معاشرت اور زبان بدل دی، اور آج سیکڑوں برس گذر جانے کے بعد بھی وہاں کی تہذیب و معاشرت اور زبان عربی ہے۔ یہ محض کوئی اتفاقی واقعہ نہیں اور نہ یہ صرف عربوں کے حُسنِ اخلاق، فراخ دلی، رواداری اور جذبۂ مساوات کا نتیجہ ہے۔ اس میں بہت کچھ دخل اس ذہنی برتری، دماغی تفوق، اور قلبی صلاحیتوں کو ہے جو فاتح عربوں اور ان کے دین و تہذیب کو حاصل تھیں۔ ایک فروتر تہذیب، ایک پست دماغ ایک بوسیدہ نظامِ زندگی، ایک بے روح ادب، اور ایک انحطاط پذیر زبان اپنے سے بلند زندہ و توانا حریف کے مقابلے میں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتی، خصوصاً جبکہ اسکے پاس کوئی دینی دعوت اور انسانیت کے لئے کوئی تازہ پیغام بھی نہ ہو۔ رومیوں اور ایرانیوں کو زندگی کے ہر موڑ اور علم و تہذیب زبان و ادب کی نمائندگی کے ہر موقع پر اپنی پستی اور کمتری اور عربوں کے تفوق اور برتری کا احساس ہوتا اس احساس کا وہ زیادہ دن تک مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور محض قومی عصبیت، مذہبی تنفر، اور نسلی تکبر کی بنا پر اس سے انکار اور گریز نہیں کر سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ عربی تہذیب و معاشرت اور زبان و ادب نے ان کی تہذیب و معاشرت اور زبان و ادب کو اور اسلام نے ان کے مذاہب کو متاثر اور مسخر کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ تھوڑی مدت میں ان ممالک میں عربی تہذیب و ادب اور اسلام کا کوئی حریف و رقیب باقی نہیں رہا اور ان قوموں نے برضا و رغبت اسلامی تہذیب و ادب کے اثرات قبول کر لئے۔

اس کے مقابلے میں جن فاتح قوموں کے پاس کوئی اعلیٰ تہذیب، قیمتی ادبی ذخیرہ، ترقی یافتہ اور وسیع زبان نہیں تھی اور جو دماغی صلاحیتوں میں اپنی مفتوح قوموں سے بھی فائق نہ تھیں جن کے پاس

نہ مذہبی ذخیرہ تھا نہ علمی سرمایہ، نہ سیاسی دستور، وہ بجائے اپنی مفتوح قوموں کو متاثر کرنے کے خود ان سے متاثر اور مغلوب ہو گئیں۔ انھوں نے ان کو اپنی فوجی طاقت یا نظم و اتحاد سے میدانِ جنگ یا میدانِ سیاست میں شکست دے دی مگر علم و تہذیب کے میدان میں ان سے مات کھائی، اور مفتوح قوموں نے اپنے دماغ، تہذیب اور دین و روحانیت سے اُن کو اپنا مفتوح بنا لیا۔ صدی میں تاتاریوں نے اپنی فوجی طاقت، جفاکشی اور نظم و اتحاد سے تمام اسلامی سلطنتوں کو شکست دے دی اور دنیائے اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح پامال کر دیا کہ ان کے مقابلے میں کوئی سر اُٹھانے والا نہ رہا۔ انھوں نے اسلام کے دار الخلافہ بغداد کو اپنی سلطنت کا مرکز بنایا اور ایک وسیع رقبۂ زمین پر اپنی سلطنت قائم کر دی لیکن ان کے پاس نہ کوئی تہذیب تھی نہ کوئی معقول مذہب، نہ کوئی سیاسی دستور، ان کے پاس ان کی قومی زبان تھی، وسط ایشیا کی قدیم ترین تہذیب تھی، اور بُت پرستی مذہب۔ ان میں سے کسی میں مسلمانوں کو متاثر کرنے کی اور ان کی تہذیب و مذہب اور زبان و ادب کو شکست دینے کی قابلیت نہ تھی، وہ دماغی حیثیت سے مسلمانوں سے پست، اور تہذیبی و علمی و سیاسی سرمایہ کے لحاظ سے بالکل بے مایہ، اور بے سروسامان تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سیاسی برتری اور حاکمانہ حیثیت بھی ان کی زبان و تہذیب کے لئے سفارش نہ کر سکی۔ مسلمانوں نے اپنی دماغی صلاحیتوں اور اپنے دین و آئین سے ان کے خواص کو اتنا متاثر و گرویدہ کر لیا کہ رفتہ رفتہ پوری تاتاری قوم نے اسلام اور اس کی تہذیب و معاشرت اور ادب و زبان کو اختیار کر لیا۔ اور اس میں بڑے بڑے عالم و فقیہ اور عربی کے مصنف پیدا ہوئے۔

ہندوستان میں جب مسلمان آئے تو اس ملک کی تہذیب و ادب اور اس کا قدیم مذہب بہت کچھ اپنی زندگی و توانائی کھو چکا تھا۔ یہاں کے علم و ادب میں تولید و انتاج کی قوت نہیں رہی تھی، سارا ملک مدت دراز سے علمی و ادبی اور فکری و ذہنی انحطاط کا شکار ہو رہا تھا، پورے ملک میں نہ کوئی اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا نہ ادیب، نہ مصنف نہ عالم، نہ کوئی ایسا صاحبِ دماغ جو سارے ملک اور قوم کو اپنی ذہانت و تفکیر سے متاثر کر سکے۔ ادب اپنی رُوح کھو چکا تھا، گیتا اور رامائن کے بعد کوئی ایسا طاقتور اور زندۂ جاوید ادبی نمونہ نہیں پیدا ہوا تھا جو اس مُلک کے ادب کی زندگی کو قائم رکھتا، زبان ہزاروں برس سے ہمالیہ کی دیواروں اور سمندر کے ساحلوں کے درمیان محصور رہ کر بہت محدود رہ گئی تھی۔

ایشیا کی قوموں اور ان کی تہذیبوں اور زبانوں نے اس عرصہ میں جو ترقی کی تھی اور فکر و ادا کے جو نئے اسالیب پیدا کئے تھے اور زندگی اور ذہن کی جولانی کے لئے جو نئے میدان دریافت کئے تھے ہندستانیوں کو ان کا کوئی علم نہ تھا۔ ذہنی اعصاب و قویٰ عرصے سے معطل رہنے کی وجہ سے سُست اور افسردہ ہو چکے تھے اس کے مقابلے میں وسط ایشیا سے جو مسلمان قومیں اس ملک میں داخل ہو رہی تھیں اُن کی رگوں میں زندگی کا نیا اور گرم خون دوڑ رہا تھا۔ وہ نئی ذہانت نئے علمی سرمایہ اور ایک عالمگیر اور وسیع مذہب کے حامل تھے، ان کی ذہانت اور ان کے علم و ادب کا شباب تھا، ان کی دماغی صلاحیتوں اور انکی مردم خیز نسلوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ (آٹھویں صدی ہجری) میں جبکہ مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کو قائم ہوئے ڈیڑھ سو برس ہوئے تھے۔ علاء الدین خلجی جیسا مقنن اور سیاسی، فیروز تغلق جیسا منتظم، شرف الدین احمد بن یحییٰ بہاری جیسا حکیم اور حقیقت شناس، ضیاء الدین برنی جیسا مؤرخ، اور امیر خسرو جیسا ذہین و طباع پیدا ہوا۔

درحقیقت اس ملک کو محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی تلوار ہی نے فتح نہیں کیا، بلکہ خواجہ معین الدین چشتی، شیخ علی بن الشہاب ہمدانی اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے رُوحانی تفوق اور قوت قلب کا بھی اس میں بڑا ہاتھ تھا، صرف فوجی افسر اور منتظم کسی ملک کو اس وقت تک قابو میں نہیں رکھ سکتے جب تک کہ ان کی پشت پر اعلیٰ دماغی قابلیت اور حاکم قوم کی ذہنی و اخلاقی برتری کا اثر نہو فاتح مسلمان قوموں نے اس مُلک کے رہنے والوں پر اپنی ذہنی، اخلاقی، روحانی اور علمی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا اور اس ملک میں حکومت کرنے اور اس کو اپنی نگرانی میں رکھنے کا استحقاق ثابت کر دیا تھا، اعتبار و اثر کا یہی ذخیرہ تھا جو صدیوں کام آتا رہا مسلمان اس میں وقتاً فوقتاً اضافہ بھی کرتے رہے اور ہر دور میں اپنی ذہنی، علمی، اخلاقی اور رُوحانی برتری کا تازہ ثبوت دیتے رہے۔ کسی قوم کا ماضی ذہنی و علمی اعتبار سے خواہ کتنا شاندار ہو جب تک وہ اپنی دماغی شادابی و زرخیزی اور اپنی دماغی صلاحیتوں کا ہر دور میں ثبوت نہ دے، اس کی برتری تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ مسلمانوں نے اس ملک میں پچھلی صدیوں میں ایسے باکمال اور اہل فضل پیدا کئے جن کی نظیر دوسری قوموں میں ملنی مشکل ہے۔ روحانیت اور قلبی کمالات میں دیکھئے تو شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی (م ۷۵۷) شیخ نور الحق پنڈوی (م ۸۱۰) سید محمد گیسو دراز (م ۸۲۵) شیخ احمد عبد الحق ردولوی (م ۸۳۶) علی عاشقاں سرائے میری (م ۹۵۵) شیخ کمال الدین کیتھلی (م ۹۷۱) خواجہ باقی باللہ

(م ۱۰۴۲)، سید آدم بنوری (م ۱۰۵۳) خواجہ محمد معصوم (م ۱۰۷۹) خواجہ محمد زبیر (م ۱۱۵۱) مرزا مظہر جان جاناں (م ۱۱۹۵) وغیرہ جیسے افراد نظر آتے ہیں جن کا اپنے کمال میں ثانی نظر نہیں آتا۔ معارف و حقائق اور عزم و یقین میں دیکھئے تو شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴) شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶) سید احمد شہیدؒ (م ۱۲۴۶) اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ (م ۱۲۴۶)۔ علم و تبحر و مطالعہ میں شیخ علی متقی (م ۹۷۵) شیخ محمد طاہر پٹنی (م ۹۸۶) شیخ عبد الحق دہلوی (م ۱۰۵۲) سید مرتضیٰ بلگرامی (م ۱۲۰۵) قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵) اور شاہ عبد العزیز دہلوی (م ۱۲۳۹)۔ علوم عقلیہ اور فلسفہ و حکمت میں ملا محمود جونپوری (م ۱۰۶۲) قاضی محب اللہ بہاری (م ۱۱۱۹) اور شاہ رفیع الدین دہلوی (م ۱۲۳۳)۔ ریاضی اور فنِ ہیئت میں میرک عبد الباقی ٹھٹوی (م ۹۸۲) مولانا فرید الدین دہلوی (م ۱۰۳۹) علامہ تفضل حسین لکھنوی (م ۱۲۱۵) قاضی القضاۃ نجم الدین کاکوروی (م ۱۲۲۹) وغیرہ۔ فنِ تعلیم اور کثرتِ درس و تدریس میں مولانا عبد اللہ طلسی (م ۹۲۲) علامہ وجیہ الدین گجراتی (م ۹۹۸) مفتی عبد السلام لاہوری (م ۱۰۳۷) مفتی عبد السلام دیوی، علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی (م ۱۰۶۷) مولانا احمد (ملا جیون) امیٹھوی (م ۱۱۳۰) اور ملا نظام الدین سہالوی (م ۱۱۶۱)۔ ادبیات و اصنافِ شاعری میں ابو الفیض فیضی (م ۱۰۰۲) غنی کشمیری (م ۱۰۷۹) ناصر علی سرہندی (م ۱۱۰۸) مرزا عبد القادر بیدل (م ۱۱۳۳) سید عبد الجلیل بلگرامی (م ۱۱۳۸) مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰)، انھوں نے جب بھاشا اور ہندی شاعری کی طرف توجہ کی تو ملک محمد جائسی (م ۹۴۷) رزق اللہ دہلوی (م ۹۸۹) رحمۃ اللہ بلگرامی (م ۱۱۱۸) مولانا برکت اللہ مارہروی (م ۱۱۴۲) شاہ قاسم دریابادی (م ۱۱۴۹) مولانا غلام نبی بلگرامی (م ۱۱۶۳) اور مولانا محمد ظاہر بریلوی (م ۱۲۷۸) جیسے شاعر پیدا کئے جن کی نظیر خود اہل زبان میں آسانی سے ملنی مشکل ہے۔ مرکزی سلاطین میں سکندر لودھی (م ۹۲۳) جیسا نیک نفس علم کا سرپرست و قدردان۔ شیر شاہ سوری (م ۹۵۲) جیسا منتظم و مدبر، اور اورنگ زیب (م ۱۱۱۸) جیسا صاحبِ دماغ اور فاضل بادشاہ نظر آتا ہے۔ صوبجات کی آزاد حکومتوں میں ابراہیم شرقی (م ۸۴۰) جیسا علم کا قدردان۔ احمد شاہ گجراتی (م ۸۴۵) جیسا منتظم۔ محمود (م ۹۱۷)، مظفر حلیم (م ۹۳۲) جیسے فرشتہ سیرت بادشاہ۔ محمود گاواں دکنی (م ۸۸۰)۔ خداوند خان، اختیار خاں عبد العزیز، آصف خاں، نواب فرید جیسے جیسے فاضل وزیر، اور عبد الرحیم خان خاناں جیسا باکمال، سعد اللہ اور نظام الملک آصف جاہ جیسے خوش تدبیر وزیر نظر آتے ہیں۔ جس قوم نے ہر شعبہ اور ہر صنف میں ایسے باکمال پیدا کئے اُس کا دماغی و علمی تفوق کس طرح تسلیم نہ کیا جاتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی طویل حکومت اور

ان کی بالاتری کا سبب محض ان کی فوجی طاقت اور ملکی انتظام نہ تھا، بلکہ ان کی ممتاز دماغی صلاحیت اور اُن کا ذہنی، علمی اور رُوحانی تفوق بھی تھا، جو زندگی کے ہر گوشہ میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

تقریباً بارھویں صدی سے مسلمانوں کا عام ذہنی اور علمی انحطاط شروع ہوا یا زیادہ صحیح الفاظ میں جو ذہنی اور علمی انحطاط عرصے سے شروع ہو چکا تھا وہ نمایاں طور پر نظر آنے لگا۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً اس صدی میں، بلکہ اس صدی کے بعد تک بعض ممتاز شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں، مگر عمومی طور پر علوم و فنون اور سیاست و انتظام ہر شعبہ میں آدمیوں کا بھی اور تصنیفات کا بھی معیار پست ہو گیا۔ صاحب تحقیق و صاحب اجتہاد ماہر فن اور مصنف پیدا ہونے بند ہو گئے۔ بجائے اصل کتابوں کے اہلِ علم کی ذہانت متون کی شرح و تحشیہ، اور بجائے اصولی مسائل کے جزئی مباحث اور دُور از کار مسائل میں صرف ہونے لگی۔ سارا ہندوستان ایران کے دورِ انحطاط کے متن نویسوں اور شرح نگاروں کا زخم خوردہ تھا۔ کتاب و سنت کے شفاف اور ہر دم تازہ چشمے کے بجائے جس نے عرب جیسی مردہ اور ناخواندہ قوم کو علم و تہذیب کے معراج پر پہونچا دیا تھا، یونان کے متروکات، بے بنیاد مفروضات اور لفظی موشگافیوں کا طلسم دماغوں پر قائم تھا، وہ حقیقت پسندی، سلامتِ فکر اور عملی قوت جس کی بنا پر عربوں کو رومیوں اور ایرانیوں پر فوقیت حاصل تھی، رخصت ہو چکی تھی۔ اور دقت پسندی، احتمال آفرینی، کج نگاہی پورے نظامِ تعلیم اور اس کے اثر سے نظامِ زندگی میں سرایت کر چکی تھی۔ تمام عالمِ اسلامی میں ایک عام ذہنی و علمی انحطاط نظر آتا تھا، اور ایشیا میں کسی ملک و قوم میں بھی نئی زندگی کے آثار دماغی بلندی اور فکری تازگی کی علامتیں نظر نہیں آتیں۔ سارا عالمِ اسلام جو ایشیا کی ذہنی و علمی قیادت کر رہا تھا مع ترکی کے جو یورپ میں واقع تھا، تھکا تھکا اور بجھا بجھا سا نظر آتا تھا۔ مسلمان اگرچہ (یورپ کو چھوڑ کر) اپنی تمام ہمسایہ قوموں اور ملکوں سے زیادہ ذکاوت اور دماغی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے غیر مسلم معاصرین کے مقابلے میں اس وقت بھی زیادہ ذہانت اور علمی صلاحیت کے مالک تھے، اب بھی ان میں جوہرِ قابل پیدا ہوتے رہتے تھے، اب بھی جب وہ کسی علم و موضوع کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کرتے تھے تو اپنی دماغی صلاحیت کا ثبوت دے دیتے تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ذہنی و علمی انحطاط عالمِ اسلام کا ایک عمومی و قومی حادثہ تھا جس میں بہت کم استثنا کی گنجائش ہے۔

اس کے بالمقابل یورپ بڑے جوش و ولولہ اور بڑے ساز و سامان کے ساتھ علم و تجربہ کے میدان میں

آیا تھا۔ اس کے سینے میں نئی زندگی اور تازہ فکر کے چشمے اُبل رہے تھے، اور وہاں اقبال مرحوم کی زبان میں "تاروں کی گردش تیز اور دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز" بلند تھا علم کے ہر میدان میں وہ تازہ دم حاضر دماغ اور مستعد تھا۔ وحی و نبوت کی تعلیمات اور ان سے ماخوذ علوم و حقائق تک تو اس غریب کی دسترس نہ تھی کہ اپنا سرمایہ تو وہ صدیوں پہلے کھو چکا تھا اور اسلام کے سرمایہ کی طرف اس کو اپنے مذہبی تنفر، خام خیالی اور کچھ قومی تعصب و تکبر کی بناء پر توجہ نہیں تھی، باقی ہر علم و فن میں وہ دماغی کاوش سے کام لے رہا تھا، تجربی علوم، ریاضیات و طبعیات کے انہماک اور منطق و فلسفہ سے بیزاری نے اس میں واقعیت پسندی اور مسئلہ کے عملی پہلو پر توجہ کی عادت پیدا کر دی تھی۔ یہ تھا وہ یورپ جس سے تھکے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کا واسطہ پڑا۔ یہاں اس کے مقابلے میں ایرانی نظامِ تعلیم اور وہ سیاسی ایرانی عنصر تھا جو دربارِ دہلی کی سیاست پر حاوی، اور ذہانت و دیانت دونوں سے عاری تھا۔ سیاسی میدان میں صرف ایک شہسوار تھا جو حالات کا مقابلہ کر سکتا تھا، اور وہ نظام الملک آصف جاہ کی ذات تھی۔ لیکن ایرانی جوڑ توڑ اور دربارِ دہلی کی ناقدری نے اس کا دل توڑ دیا، اور وہ مرکزی میدانِ سیاست سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ ایرانی عنصر نے روہیلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور نجیب الدولہ و حافظ رحمت خاں سے بھی میدان خالی کرا لیا تھا۔ آخر کار یورپ کا سیاسی تدبر ہندوستان کی بے تدبیری اور ناعاقبت اندیشی اور اس کا نظم و اتحاد یہاں کی بے نظمی اور پراگندگی پر غالب ہوئی۔ یہ دراصل یورپ کی دماغی فتح تھی جو اس نے ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں حاصل کی۔

۔۔۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے مسلمانوں کی قیادت میں ایک بار پھر جنبش کی، اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش بھی ناکام رہی، اور باقاعدہ انگریزی حکومت قائم ہو گئی۔ یہ انقلاب مسلمانوں کی قوتِ فکریہ اور فہم و فراست کا امتحان تھا۔ اب مقابلہ انگریزوں کی سنگینوں اور توپوں سے نہ تھا، بلکہ نئے دینی و علمی رجحانات، نئی خواہشات و ضروریات، نئی تعلیم و تہذیب سے تھا۔ اگر مسلمانوں میں اجتہاد کی قابلیت، ذہنی برتری، فکری استقلال، اور ایسا مرتب و مدون نظامِ تعلیم ہوتا جس میں ان خصوصیات کے ساتھ جو وحی و علوم نبوت کا نتیجہ ہیں، اور جن میں کوئی ایسی قوم شریک نہیں جو نبوت کی تعلیمات و حقائق سے محروم ہو چکی ہے۔ بدلے ہوئے زمانہ کی مناسب و معتدل رعایت ہوتی اور زمانہ کے جائز و فطری تقاضوں کی تسکین کا سامان ہوتا، جو علوم کے خدانا شناس

اور آخرت فراموش ضمیر کو بدل کر اور ان کی قلب و رُوح کو پاک کر کے ان کو خداشناس علوم میں تبدیل کر دیتا انہیں اصل دین پر قائم رہنے میں چٹان کی سی سختی اور سنگینی ہوتی اور ذہنی و علمی ترقی کرنے میں شاداب درختوں کا سا نمو، تو وہ اس انقلاب کو ایک اہم شعوری و ارتقائی تحریک میں تبدیل کر سکتے تھے اور اس گرتی ہوئی آبشار سے وہ قوت کہربائی پیدا کر سکتے تھے جو ان کے بہت کام آتی۔

لیکن گذشتہ علمی و ذہنی انحطاط کی بنا پر وہ ایسا نہ کر سکے، نہ تو ان کے قدیم نظامِ تعلیم میں دماغوں کو مطمئن کرنے اور دلوں کو گرویدہ بنانے کی قابلیت تھی اور نہ ان کے ذہن میں نئے نظامِ تعلیم کے مرتب کرنے کی صلاحیت ان میں سے ایک گروہ نے یورپ کے اسی نظامِ تعلیم کو جوں کا توں قبول کر لیا جس میں مادہ پرست منکرِ خدا یونان و روما کی علمی رُوح سرایت کئے ہوئے تھی اور جس کے قلب و دماغ دونوں کافر تھے۔ اور جو صرف معاشی جانور پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ انھوں نے اس میں ترمیم کرنے کی اور اس کو اپنے حسبِ حال بنانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے اسلامی ملک نے بھی اس موقع پر کسی اجتہاد اور فکری استقلال کا ثبوت نہیں دیا، بلکہ اتنی بھی دماغی سنجیدگی اور اعتدال کا مظاہرہ نہیں کیا جو ہندوستان میں دیکھنے میں آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ تمام اسلامی ممالک کے ذہن اور قوائے فکریہ پر چھا گیا، اور زندگی کے تمام شعبوں بلکہ سرچشموں پر حاوی ہو گیا۔ آج اسلامی ممالک اسی کے دماغ سے سوچتے ہیں، اسی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اسی کی اصطلاحات میں بولتے ہیں، معاشرت و اخلاق اور عادات و اطوار میں اسی کے نقشِ قدم پر چلنا اپنے لئے معراجِ ترقی سمجھتے ہیں۔ دنیا کی رہبری اور یورپ کی رہنمائی کرنا تو الگ رہا ان میں اس کے نظامِ معاشرت و اخلاق اور نظامِ حکومت و سیاست پر ادنیٰ تنقید کی بھی قابلیت نہیں ہے، جن ممالک سے اس کی زیادہ توقع کی جانی چاہیئے وہ اسی قدر اس کے سحر سے مسحور اور اس کی تقلید کے نشہ میں مخمور ہیں۔ ترکی نے ایک عرصے تک عالمِ اسلام کی قیادت و امامت کی ہے اور یورپ کے مقابلے میں محاذ قائم رکھا ہے، لیکن آج یورپ کے ایک عقیدت مند مرید اور ایک سعادت مند شاگرد سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں۔ ترکی کے محکمۂ اطلاعات نے اپنے ملک کی عورتوں کی ترقی اور مردوں سے پیش قدمی سے متعلق جو تازہ معلومات شائع کئے ہیں اُن میں دکھایا گیا ہے کہ جدید ترکی کی خواتین زندگی کے تمام راستوں پر مردوں سے آگے جا رہی ہیں۔ انتخابات، ملازمتوں، ہوا بازی، اور اس سے بڑھ کر قاضی، ڈراموں کی تمثیل، موسیقی اور فنون لطیفہ میں وہ مردوں سے پیش پیش ہیں۔ مصر و ایران براہِ راست یورپ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہیں۔

پاکستان میں جس طبقے کے ہاتھ میں اس وقت ذہنی وسیاسی باگ ہے، وہ ذہنی وعلمی طور پر اسی سانچہ کا ڈھلا ہوا ہے جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی نسلِ جدید کی تشکیل کے لئے بنایا گیا تھا۔ ہندوستان کے دین دار طبقے کا ذہن اب اس منزل پر نہیں ہے جو اس کے اسلاف نے تجدد کی تحریک کے مقابلے میں اختیار کی تھی، اور نہ الحاد وتحریف کے بارے میں اس میں وہ ذکاوت حس باقی ہے جو اسکے اسلاف میں تھی۔ بہت سے محظورات شرعی مباح کے درجہ میں آگئے ہیں، تصویر کشی اور اس کے خرید وفروخت کی قباحت اس درجہ کم ہو گئی ہے کہ غیر مسلم سیاسی رہنماؤں کی طرح علماء و بزرگانِ دین کی تصویریں اور مصور جنتریاں شائع کی جاتی ہیں اور ذمہ دار اخبارات کو اس کی تعریف وتشہیر میں بھی باک نہیں ہوتا۔ عرب ممالک اپنا مقام چھوڑ چکے ہیں، اور یورپ اور اسکے مقلد ممالک کی طرف رشک وحسرت سے دیکھتے ہیں مغربی افکار، مغربی تصورات حیات، مادی اقدار ان کی زندگی پر چھا چکے ہیں۔ غرض ساری دنیا پر یورپ کا ذہنی وعلمی استیلا ہے اور سارا عالم، بلکہ عالمِ انسانی ذہنی طور پر اس کے سامنے ہتھیار ڈال چکا ہے۔

یورپ کے اس طلسم سے نکلنے، دین کا پیغام پہونچانے اور مسلمان کے مقام پر باقی رہنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ عالمِ اسلام ذہنی وعلمی طور پر پھر ابھرے، علمی وعقلی سطح اور دماغی قوتے کے اعتبار سے وہ بلند ترین مقام حاصل کرے۔ زندگی پر اثر ڈالنے والی اور زندگی کو از سرِ نو ڈھالنے والی طاقتوں اور وسائل پر قبضہ کرے، علوم وافکار میں اجتہاد وتنقید کی قابلیت پیدا کرے، اپنی تعلیم کا ایسا نظام مرتب کرے اور علوم ومضامین کو اپنے ایمانی وذہنی سانچہ میں اس طرح ڈھالے کہ وہ لادینی نظامِ تعلیم کا مقابلہ کر سکے اور اس میں دماغوں کو جذب کرنے اور ان کو متأثر کرنے کی قابلیت ہو۔ دنیا کے ذہن پر اور اپنی ہی قوموں پر اپنی ذہنی برتری اور علمی تفوق کا نقش قائم کرے۔

عالمِ اسلام کے ذہن وفراست کا ایک بار پھر امتحان ہے۔ اسوقت عالمگیر پیمانے پر مادہ پرستی وشکم پروری کا جو سیلاب دنیا میں آرہا ہے اور مختلف ممالک میں مقامی حیثیت سے نئے سیاسی تغیرات کے بعد جس انقلاب سے مسلمانوں کو واسطہ پڑ رہا ہے غیر اسلامی اقتدار، غیر اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی اثرات سے جو تصادم درپیش ہے اس سے نکلنے اور اس معرکہ میں فتح حاصل کرنے اور کم از کم اپنی خصوصیات کو برقرار رکھنے کی صورت صرف یہ ہے کہ مسلمان اس دماغی صلاحیت، اس قلبی قوت، اس اخلاقی وروحانی فوقیت اور اس ضروری اجتہاد کا ثبوت دیں جو اس موقع پر ضروری ہے۔ اگر انھوں نے ایسا کر لیا تو انکے دین اور انکی مخصوص تہذیب کیلئے کوئی خطرہ نہیں، اور اگر وہ خدانخواستہ ایسا نہ کر سکے تو کوئی حفاظت کسی قوم اور حکومت کی ضمانت اور کوئی تدبیر ان کو اس انقلاب کی زد سے بچا نہیں سکتی۔

جلد ۱۶ نمبر (۸)   بابتہ ماہ شعبان سنہ ۱۳۶۸ھ

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مُدیر مسئول

مُحمد منظور نُعمانی عفا اللہ عنہُ

یاد رکھیے! "الفرقان" اور "کتبخانہ الفرقان" بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں لہذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھیے!

دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ (یو۔پی)

چندہ سالانہ چار روپیہ   نمونہ کا پرچہ چھ آنہ

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

جلد (۱۶) | بابتہ ماہ شعبان ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۹ء | نمبر (۸)

ناظرینِ کرام سے!

معذرت: "انتخاب" کے زیرِ عنوان جو سلسلہ الفرقان میں شروع کیا گیا تھا افسوس ہے کہ پچھلے پرچہ میں تو باوجود اس کے کہ کتابت بھی ہو چکی تھی ایک سخت مجبوری کی وجہ سے ہمیں روک لینا پڑا جس کی وجہ سے پرچہ کی روانگی میں کچھ تاخیر بھی ہوئی۔ اور اس پرچہ میں بھی باوجود صفحات میں کافی اضافہ کے اس کیلئے گنجائش نہیں رہی، ناظرین کرام اس بارہ میں ہمیں معذور سمجھیں، اس سلسلہ کی اہمیت اور افادیت کا ہمیں پورا احساس ہے انشاءاللہ وہ سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔"

یہاں سُرخ نشان ☐ اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے حساب سے آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے لہٰذا آئندہ کیلئے اپنا چندہ منی آرڈر سے روانہ فرما کر ممنون فرمائیے (اسی لئے منی آرڈر فارم بھی جناب کو بھیجا جا رہا ہے) اگر اگلے رسالہ کی اشاعت تک چندہ وصول نہ ہوا تو حسبِ قاعدہ اگلا پرچہ وی، پی

دفترِ الفرقان کا ایک غیر معمولی اعلان!

حج کے متعلق الفرقان کا جو خاص نمبر اس وقت تیار ہو رہا ہے
جس کی کچھ تفصیلات "نگاہِ اولیں" کے صفحات سے آپ کو معلوم ہونگی!

اس نمبر کی تیاری کے کُل مصارف کا اندازہ "ڈھائی ہزار روپیئے" کے قریب ہے جو ہمارے لئے مشکل ہے ہمارے مخلص احباب اس رقم کی فراہمی میں بغیر کسی زیر باری کے مندرجہ ذیل طریقوں سے ہماری مدد کر سکتے ہیں!

۱۔ الفرقان جن لوگوں کی نظر سے نہیں گذرتا اُن کو آپ اس نمبر کی اطلاع دیں، پھر وہ حضرات یا الفرقان کا سالانہ چندہ بھیج کر اسکے مستقل خریدار ہو جائیں یا صرف اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ (مع محصول رجسٹری عہ) اسوقت پیشگی بھیجدیں۔

۲۔ جو حضرات حجاج کو مفت دینے کیلئے یا بطور خود فروخت کرنے کیلئے کم از کم بیس کاپی منگوانی چاہیں وہ مطلوبہ کاپیوں کی رعایتی قیمت بحساب ۷۵ روپئے فیصدی اسوقت بھیج دیں (اس سے زیادہ کسی رعایت کی گنجائش نہیں ہے)۔

۳۔ کتب خانۂ الفرقان سے رعایتی قیمت پر کتابیں منگوالی جائیں۔

رعایتی اعلان! اگرچہ یہ زمانہ کتابوں کی قیمت پر رعایت دینے کا نہیں ہے لیکن چونکہ اس وقت ہم کو روپئے کی ضرورت ہے اسلئے ہم نے طے کیا ہے جو حضرات اسوقت کتابیں منگوائینگے انکو کتبخانۂ الفرقان کی مطبوعات پر ۲۵ فیصدی اور دوسرے اداروں کی مطبوعات پر بھی دس فیصدی رعایت کیجائیگی، لیکن یہ رعایت کم از کم دس روپئے کی کتابوں پر ہوگی ـــــــ جو حضرات صرف ہماری ہمدردی اور مدد کے خیال سے اس وقت کتابیں منگوائیں انھیں یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ہمیں زیادہ مدد اور سہولت اپنی مطبوعہ کتابوں کی فروخت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، کیونکہ دوسرے اداروں کی چھاپی ہوئی کتابیں تو ہم کو نقد قیمت ادا کر کے اکثر ۲۵ فیصدی ہی کے حساب سے اور بعض اس سے بھی کم کمیشن پر خریدنی ہوتی ہیں۔

فہرست کتب اس رسالہ کیساتھ کتبخانہ کی فہرست اسلئے شائع کیجا رہی ہے جو کتابیں اسمیں درج ہیں وہ سب اسوقت موجود ہیں اور جو قیمتیں لکھی گئی ہیں وہ اسوقت کی اصلی قیمتیں ہیں جن پر مذکورہ بالا رعایت دیجائیگی لیکن یہ رعایت صرف اُن آرڈروں پر ہوگی جو ۲۰ رمضان تک دفتر میں پہنچ جائیں گے۔

ضروری نوٹ:۔ خط و کتابت اور منی آرڈر میں اپنا پورا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے اور منی آرڈر کے کوپن میں منی آرڈر کی غرض بھی ضرور لکھئے۔　　ناظم:۔ "دفتر الفرقان" لکھنؤ

باسمہ سبحانہ حمداً و سلاماً

نگاہِ اوّلیں!

نماز روزہ سے لیکر جہاد تک تمام اسلامی عبادات بلکہ تمام دینی اعمال کا ایک تو ظاہر اور قالب ہوتا ہے اور ایک باطن اور قلب ـــــ ظاہر اور قالب ہر عمل کا وہ حصہ ہے جس کی ادائیگی کا تعلق انسان کے ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے۔ مثلاً نماز میں قیام، قرأت، رکوع، سجدہ، تکبیرات و تسبیحات وغیرہ یہ سب نماز کا ظاہر اور قالب ہے، اور نماز کا قلب اور اس کی رُوح وہ احسانی کیفیت اور حضور و خشوع اور خشیت و محبت، اور انقطاع و انابت کی وہ اندرونی حالت ہوتی ہے جو اللہ کے خاص بندوں کو نماز میں حاصل ہوتی ہے۔

نماز کا ذکر تو یہاں صرف مثالاً کر دیا گیا ہے ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا تمام اسلامی عبادات اور دینی اعمال میں ظاہر کے علاوہ یہ باطن ہوتا ہے اور وہی دراصل اس عمل کی رُوح اور اس کا قلب ہوتا ہے۔

عام مسلمانوں میں ایمانی طرزِ حیات کی تجدید اور حقیقی اسلامی زندگی پیدا کرنے کی تحریک و کوشش جو الفرقان کا موضوعِ دعوت ہے اس کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے جن طبقوں میں نماز روزہ وغیرہ دینی اعمال کا کچھ اہتمام اور اُن کی ادائیگی کا رواج بحمد اللہ باقی ہے لیکن ان اعمال کی رُوح و حقیقت سے وہ آشنا نہیں ہیں اور ان کے پیدا کرنے کا انھیں فکر و شوق بھی نہیں ہے اُن کو اس سے واقف و آشنا کرنے اور اللہ اگر توفیق دے تو ان میں اس کے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے ـــــ "دعوتِ اصلاح و تبلیغ" کے سلسلہ میں اس مقصد کے لئے جو عملی کوشش ہوتی ہے اور اس کا جو طریقۂ کار ہے (اور دیانت داری سے ہم اسی کو اصل اور زیادہ مؤثر سمجھتے ہیں) وہ تو پوری طرح اس جد و جہد میں عملی شرکت اور خاص تجربہ کار اور تربیت یافتہ کارکنوں اور جماعتوں کی رفاقت و معیت ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن اس سلسلہ میں ایسے مضامین اور مقالات کے مطالعہ سے بھی بہت کچھ فائدہ ہوتا ہے جو خاص اس مقصد

کے لئے لکھے جائیں، اور کم از کم اسکی طلب اور طمع تو ضرور ہی پیدا ہو جاتی ہے۔

اسلامی عبادات میں سے نماز اور روزہ پر ایسے مضامین الفرقان میں بار بار شائع ہوئے ہیں اور ان میں جو زیادہ جامع اور زیادہ نافع تھے وہ مستقل رسالوں کی شکل میں بھی شائع کئے جا چکے ہیں[1] ——— اور الحمدللہ طبیعت مطمئن ہے کہ اسلام کے ان دو رکنوں کے باطنی پہلو یعنی اُن کے قلب و رُوح کے متعلق جو کچھ ان رسالوں میں لکھا جا چکا ہے وہ انشاء اللہ بالکل کافی ہے اور اللہ تعالیٰ سے قوی اُمید ہے کہ اللہ کے جو بندے ان کو ایک دفعہ پڑھیں گے انشاءاللہ ان کے اندر یہ شوق اور جذبہ ضرور بیدار ہو جائے گا کہ ان کی نمازوں اور اُن کے روزوں میں حقیقت اور رُوح پیدا ہو اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ بھی اُمید ہے کہ اگر وہ ارادہ اور کوشش کریں گے تو اس رُوح و حقیقت کا کچھ نہ کچھ حصہ بھی انشاءاللہ ان کو ضرور حاصل ہو جائے گا۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

گذشتہ سال حج کو جانے والے چند قافلوں میں لکھنؤ ہی کے اسٹیشن پر کچھ تبلیغی کام کرنے کا اتفاق ہوا تھا اس وقت یہ دیکھ کر دل بہت دکھا تھا کہ ان جانے والوں میں ۵۰ فی صدی سے زیادہ تو ایسے تھے جو دین کی ضروری اور بنیادی باتوں سے بھی واقف نہ تھے اور عملی حالت ان کی یہ تھی کہ حج کے اس سفر میں وہ اپنی فرض نمازیں بھی فکر اور پابندی سے ادا نہیں کرتے تھے اور اس عاجز کے اندازہ میں بلا مبالغہ ۹۵ فیصدی سے زیادہ وہ تھے جو حج کی رُوح و حقیقت سے بے خبر تھے اور اس لئے انھیں اس کا مطلق احساس نہ تھا کہ حج میں آدمی کی اندرونی کیفیات کیا ہونی چاہئیں۔

ان بیچارے حاجیوں کی یہ حالت دیکھ کر بڑی شدت سے اس وقت دل میں یہ احساس پیدا ہوا تھا کہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں اللہ کے جو ایسے بندے حج کو جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے ہزاروں

---

[1] اس سے مراد نماز اور روزہ کے متعلق دو خاص مقالے ہیں جو پہلے الفرقان میں شائع ہوئے تھے اور بعد میں مستقل رسالوں کی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ایک[1] "نماز کی حقیقت" دوسرے[2] "فضائل صیام اور برکاتِ رمضان"۔ "نماز کی حقیقت" کے نسخے ختم ہو چکے تھے اس کا دوسرا اڈیشن چھوٹی تقطیع پر اس وقت زیر طبع ہے، انشاءاللہ رمضان میں تیار ہو جائے گا۔ "فضائل صیام"

روپے بھی خرچ ہوتے ہیں اور کم و بیش دو تین مہینے کا وقت بھی صرف ہوتا ہے ان کو کسی طرح حقیقتِ حج سے باخبر کیا جائے اور جو ان میں دین کی ضروری باتوں سے بھی ناواقف اور روزمرہ کے دینی فرائض سے بھی غافل ہوتے ہیں انھیں کسی طرح اس پر آمادہ کیا جائے کہ اگر بدقسمتی سے اب تک وہ دین سے ناواقف اور غافل رہے ہیں تو اس مقدس سفر کے دوران میں وہ اپنی یہ کمی ضرور پوری کر لیں ـــــ چنانچہ اس دوسرے کام کیلئے ایک عملی اسکیم تیار کر لی گئی ہے جو انشاء اللہ الفرقان کی اسی اشاعت کے آئندہ صفحات میں ناظرین کرام کی نظر سے گذرے گی۔ (اور الحمد للہ لکھنؤ اور بعض دوسرے مقامات پر اس اسکیم کے مطابق کوشش شروع بھی ہو گئی ہے اور خدا کے فضل سے نتائج کے متعلق بڑی اچھی امیدیں نظر آ رہی ہیں)۔

اور پہلے کام کے لئے یعنی عازمین حج کو حج کی حقیقت اور روح سے آشنا کرنے کے لئے جو چند کوششیں پیش نظر ہیں ان میں سے ایک یہ تجویز بھی ہے کہ ـــــ حج کی حقیقت ـــــ اعمال حج (احرام، طواف، سعی، وقوف اور قربانی وغیرہ) کے اسرار ـــــ کعبۃ اللہ، مقام ابراہیم، حجر اسود، زمزم، منیٰ، مزدلفہ، عرفات، بلد اللہ الحرام (مکہ معظمہ) اور بلد النبی الامین (مدینہ طیبہ) مسجد الرسول اور روضۃ النبی وغیرہ کی خصوصیات اور خاص تجلیات ـــــ گویا کہ حج و زیارت کے سلسلہ کے تمام مآثر و مشاہد اور تمام اعمال و افعال کے اسرار و کیفیات ـــــ پر اللہ کے چند ان مخصوص بندوں سے مضامین لکھائے جائیں جو ان امور میں صاحب ادراک بھی ہوں اور ان کا مجموعہ کتابی شکل میں تیار کرا کے اس کی کوشش کی جائے کہ جتنے پڑھے لکھے حضرات حج کو جانے والے ہوں کسی طرح (خواہ بہ قیمت یا بلا قیمت) یہ مجموعہ مضامین ان کے ہاتھوں تک پہونچا دیا جائے تاکہ وہ خود پڑھیں اور کم پڑھے لکھے حجاج کو پڑھ کر سنائیں۔

گذشتہ مہینے رجب میں یہ تجویز سوچی گئی تھی اور اس سلسلہ میں مضامین لکھنے کے لئے جن چند مخصوص حضرات پر نظر جا سکتی تھی ان کو اسی وقت خطوط لکھ دیئے گئے تھے۔ الحمد للہ سب حضرات سے اس تجویز کی تحسین فرمائی اور جن بزرگوں سے جن جن عنوانات پر مضامین لکھنے کی استدعا کی گئی انھوں نے میری استدعا منظور فرما کر مضامین لکھنے شروع فرما دیئے ـــــ پھر یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس مجموعۂ مضامین کو مستقل کتاب کی شکل میں شائع کرنے کے بجائے "الفرقان کے خاص نمبر" کی حیثیت سے شائع کیا جائے تاکہ ڈاک خانے کے خاص قواعد کے تحت محصول ڈاک بہت کم لگے اور الفرقان کے مستقل ناظرین کرام کو علیحدہ قیمت ادا کئے بغیر رسالہ کی مستقل خریداری ہی کے حساب میں یہ بیش بہا تحفہ بھی مل سکے، اور اس طرح

وسیع تر پیمانہ پر آسانی سے اس کی اشاعت ہوسکے۔

انشاء اللہ "الفرقان کا یہ خاص نمبر" آخر رمضان تک تیار ہوجائے گا اور رمضان کے بعد جانے والے حجاج اس سے فائدہ اُٹھاسکیں گے۔

اللہ کے جن بندوں کی نظروں سے یہ سطریں گذریں اُن سے استدعا اور توقع ہے کہ اُن کے علم میں امسال جو لوگ حج کو جانے والے ہوں وہ انھیں اس نمبر کی اطلاع دے دیں تاکہ وہ اس کو منگوا سکیں —— جو حضرات بہ قیمت نہ منگوا سکتے ہوں ہم کوشش کریں گے کہ اُن کو بلا قیمت ہی یہ نمبر کسی طرح پہنچا سکیں، بشرطیکہ کسی قابلِ اعتماد ذریعہ سے ہم کو علم ہوجائے کہ وہ اس سال حج کا عزم رکھتے ہیں اور حج نمبر سے وہ خود فائدہ اُٹھا سکتے اور دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

جو حضرات ثواب کی نیت سے اس نمبر کی کاپیاں منگوا کر عازمین حج کو قیمتہً یا ہدیتہً دیں گے، انشاء اللہ وہ ان کے حج کے ثواب میں پورے حصہ دار ہوں گے —— حج کو جانے والوں کے ساتھ اصلی محبت اور سب سے بڑی اُن کی خدمت یہی ہے کہ حج کی حقیقت اور رُوح سے ان کو آشنا کرنے میں ان کی مدد کی جائے۔ ایسے لوگ گھر بیٹھے سیکڑوں حج کرنے والوں کے اجر میں بڑا حصہ لے سکتے ہیں۔ وَفِیْ ذٰالِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۞

ہندوستانی مسلمانوں کا دینی مستقبل

(۲)

اس سلسلہ کی پہلی قسط گذشتہ سے پیوستہ اشاعت (جمادی الاخریٰ) میں شائع ہوئی تھی سلسلۂ کلام آگے بڑھانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابتک اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے ناظرین اسکی یاد پھر تازہ کرلیں ـــــ اسی لئے پہلے قسط اول کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ ہم نے عرض کیا تھا ـــــ کہ

سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گل ہونے کے بعد اس ملک میں جس وقت انگریزی حکومت قائم ہوئی تھی اُس وقت بہت سی خرابیوں کے باوجود یہاں کی مسلمان سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں چند ایسی صفات موجود تھیں جو انگریزی اثرات سے اُن کے دین اور اُن کی تہذیب کی دیر تک حفاظت کر سکتی تھیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے مندرجۂ ذیل چیزوں کا ذکر خاص طور سے کیا تھا۔

مسلمانوں کے عام و خاص طبقوں میں علم و عمل کی سیکڑوں کمزوریوں کے باوجود عقائد کی بنیادیں محفوظ تھیں، ہر دل میں دین کی عظمت و وقعت موجود تھی اور اپنے دین اور اپنی تہذیب کی برتری کا پورا پورا یقین تھا، فاسقوں فاجروں میں بھی دینی غیرت و حمیت اور کفر کی حقارت کا جذبہ پوری قوت کے ساتھ اس وقت موجود تھا، خانقاہوں میں خاصانِ خدا بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے، اور جو اس وقت کے علماء اور دینی پاسبان تھے جن کا قوم پر پورا اثر تھا اُن میں کافی تعداد ایسے حضرات کی تھی جن کا علم راسخ تھا اور جو اپنے نورِ علم سے حق و باطل کے درمیان یقین اور بصیرت کے ساتھ امتیاز کر سکتے تھے اور علم کی گہرائی کے علاوہ اُن کے دین میں پختگی اور سیرت میں مضبوطی بھی تھی، اور اسی کیساتھ انگریزی حکومت اور انگریزی تہذیب سے ان کو سخت نفرت و عداوت بھی تھی۔

در اصل یہی وہ چیزیں تھیں جنھوں نے مسلمانوں کے دین اور انکی تہذیب کو اس ملک میں کسی حد تک محفوظ رکھا ورنہ جو سرمایہ اب تک بچا ہوا ہے یہ بھی باقی نہ رہتا۔

لیکن انگریزی دورِ حکومت میں مسلمانوں کی ان صفات میں برابر انحطاط و زوال آتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں انگریزی حکومت کے خاتمہ کے وقت ہم نے اپنے کو اس حال میں پایا کہ موجودہ مسلمان قوم کے تعلیمیافتہ اور سربرآوردہ طبقے میں کافی تعداد ایسوں کی ہے جنھیں اسلام کے بنیادی عقیدوں پر بھی پورا یقین نہیں رہا ہے، بہت سے ہیں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں لیکن دین کی کوئی قدر و قیمت اُن کے دلوں میں نہیں ہے، اسی طرح دینی غیرت و حمیت بھی اُن کے دلوں سے نکل چکی ہے اور وہ معمولی معمولی فائدوں کیلئے اسلام کے خلاف جا سکتے ہیں، اغراض پرستی اور ابن الوقتی خصوصاً ہمارے پڑھے لکھے اور خوشحال طبقے کا عام مزاج بن چکا ہے اسلئے بڑے بڑے گناہوں اور بڑی سے بڑی منافقانہ حرکتوں پر اب سوسائٹی میں کوئی احتساب نہیں ہوتا اور ایسا کرنے والے کی عزت و شان میں ذرا فرق نہیں آتا، اور چونکہ یہ باتیں اُن لوگوں میں عام ہیں جو قوم میں بڑے اور تعلیمیافتہ سمجھے جاتے ہیں، اسلئے اب جاہلوں غریبوں کی نظروں میں بھی ان باتوں میں اب کوئی برائی نہیں رہی —— بلکہ امت کے جاہل اور غریب طبقوں میں خصوصاً دیہات کے رہنے والوں میں مذکورہ بالا برائیوں کے علاوہ ایک خطرناک چیز یہ بھی ہے کہ وہ دین کی اصولی اور بنیادی باتوں سے بھی ناآشنا ہیں اور نہیں جانتے کہ ہمارے مسلمان ہونے کا مطلب کیا ہے اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا حد فاصل ہے —— اور جس طرح امت کے ان عام طبقوں کی دینی حالت میں یہ انحطاط و زوال آیا ہے اسی طرح دین کے امینوں اور پاسبانوں یعنی خود علماء کے طبقے کی حالت میں بھی غیر معمولی فرق پڑ گیا ہے، علم میں رسوخ و بصیرت اور دین میں تفقہ کی شان رکھنے والے ہزاروں میں دو چار نکلنے بھی مشکل ہیں، اس طرح تقویٰ اور سیرت کی بلندی اور عزیمت و استقامت کی حفاظت رکھنے والے اہل علم عنقا کی طرح نایاب ہیں یا بہت ہی کمیاب ہیں۔

بہر حال یہ ہے اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف طبقوں کا دینی حال اور ان

کمزوریوں کے ساتھ ۴۷ء کے انقلاب اور نئی قومی حکومت کا ہم کو استقبال کرنا پڑا ہے۔

اس سلسلہ کی پہلی قسط میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا اسی کا یہ خلاصہ ہے جو مذکورہ بالا سطروں میں دہرایا گیا ہے اب سلسلۂ کلام آگے شروع کرنا ہے اور غور کرنا ہے کہ خود اپنے میں ان کمزوریوں کے ہوتے ہوئے اس نئے نظامِ حکومت کے اثرات ہمارے دین اور ہماری تہذیب پر کیا کیا اور کس کس طرح پڑ سکتے ہیں، اس کو سوچنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے حالات کا صحیح نقشہ ہمارے سامنے ہو اس لئے ناظرین کے سامنے ہم پہلے حالات کا نقشہ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

تقسیم کے بعد انڈین یونین میں مسلمانوں کی تعداد قریباً ۱۲-۱۳ فی صدی ہے یعنی کل آبادی کا تقریباً آٹھواں حصہ، گویا غیر مسلم آبادی سات گنی اکثریت میں ہے اسلئے حکومت کا سارا نظم و نسق جمہوریت کے اصول کے مطابق قدرتی طور پر اس اکثریت ہی کے ہاتھ میں رہے گا، جیسا کہ اس وقت ہے۔

ہندوستان کی اس غیر مسلم اکثریت میں مسلمانوں کے بارے میں کافی اختلاف رائے ہے۔۔۔ ایک عنصر ہے جسکی صاف اور کھلی ہوئی رائے یہ ہے کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کو اس ملک میں مسلمان رہ کر اور عزت کے ساتھ جینے اور رہنے بسنے کا کوئی حق نہیں رہا ہے اور اسلئے یہ گروپ یہاں کے مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کا جبر و تشدد استعمال کرنے کو اپنا حق سمجھتا ہے۔۔۔۔ اگرچہ موجودہ حکومتِ ہند اس طبقے کی عملی سرگرمیوں کو دبا دینے میں اس وقت کامیاب ہو گئی ہے (اور کچھ کشمیر کے مسئلہ نے بھی اس میں مدد کی ہے) لیکن جن لوگوں کو حقیقتِ حال کا کچھ بھی علم اور اندازہ ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ عنصر موجود ہے اور اچھا خاصا طاقتور ہے اور اس کے خیالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور یہاں کے غیر مسلم عوام کی ایک بڑی تعداد کی ہمدردی بھی اس کو ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے اور اسلئے اگر اس کو پھر کوئی مناسب موقع مل جائے تو اگست و ستمبر ۴۷ء کی طرح تشدد اور قتل و غارتگری کے طوفانوں کو مسلمانوں کے خلاف وہ پھر حرکت میں لا سکتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ عام پبلک کے علاوہ حکومت کے انتظامی عملہ میں بھی اس طرح کے خیالات رکھنے والے کافی تعداد میں موجود ہیں ـــــ پس اگر زمانہ نے کسی وقت کوئی ایسی کروٹ بدلی کہ اس عنصر کو اپنی سرگرمیاں پھر تیز کرنے کا موقع ملا

یا یہ طبقہ ہی کسی وقت برسرِ اقتدار آ گیا تو موجودہ مسلمان قوم کے جو طبقے دین میں پکے ہیں اور اس وقت بھی جن کا تعلق دین سے زیادہ پختہ اور گہرا انہیں ہے ان کا جو حشر و انجام ہو گا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

اس خطرناک اور سخت مسلم دشمن عنصر کے علاوہ یہاں کی اکثریت والی قوم میں جو اور عناصر اور گروپ ہیں، اگرچہ طرزِ حکومت اور نظامِ حکومت کے متعلق ان کے خیالات و نظریات میں بہت کچھ اختلافات ہیں اور ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے حقوق اور ان کے ساتھ برتاؤ اور سلوک کے بارے میں بھی ان کی رائیں اور تجویزیں مختلف ہیں لیکن اس خواہش اور چاہت میں قریب قریب وہ سب یکساں طور پر شریک ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں کو اب اپنی ملی انفرادیت اور تہذیبی و معاشرتی امتیاز کو ختم کر کے اکثریت کا ایک غیر متمیز جزو بن جانا چاہئے! ——— اس مقصد کے لئے ایک طرف تو ایسے قوانین بنائے جا رہے ہیں جن کے نفاذ کے بعد مسلمانوں کی ملی خصوصیات و امتیازات کے باقی رہنے کے امکانات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسری طرف "الناس علی دین ملوکھم" کے طبعی قانون کے مطابق خود مسلمانوں کے بعض طبقوں میں تہنّد (یعنی ہندوانہ تہذیب و معاشرت اور ہندوانہ طرزِ زندگی اختیار کرنے کا رجحان تیزی سے پیدا ہونے لگا ہے) ——— اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس وقت جو لوگ یہ رویہ اختیار کر رہے ہیں اُن میں سے زیادہ تر دلی کراہت کے ساتھ صرف غرض پرستی کے ماتحت ایسا کر رہے ہیں لیکن تھوڑے دنوں کے بعد یہی فیشن ہو جائے گا اور پھر شوق اور چاہت کے ساتھ عام طور سے اس کو اختیار کیا جانے لگے گا ——— تیسری چیز جو اس سلسلہ میں زیادہ اثر انداز ہو گی اور مسلمانوں کے طریقِ زندگی اور طرزِ فکر میں اس طرح کی تبدیلیاں پیدا کرنے میں سب سے زیادہ اثر جس کا پڑنے والا ہے وہ آئندہ کا تعلیمی نظام ہی۔ سارے ملک میں اب تعلیم عام اور لازمی ہو گی جس سے کسی قوم کا کوئی بچہ بھی مستثنیٰ نہ ہو گا ——— اور یہ مسئلہ اس زمانہ کا ایک بدیہی اور تجربی مسئلہ ہے کہ قوموں کے افکار و خیالات میں بڑی سے بڑی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تعلیم سب سے بڑا اور مؤثر ترین ذریعہ ہے، اور کوئی برسرِ اقتدار طاقت اگر کسی قوم کی پوری نسل کو اس کے آباء و اجداد کے عقائد اور طرزِ زندگی سے ہٹانا اور نئے خیالات اور نئے جذبات اور کسی نئی تہذیب کو اس میں رواج دینا چاہے تو اس زمانہ میں تعلیم ہی اس کا سہل ترین ذریعہ ہے ——— مرحوم اکبر نے اپنے خاص انداز میں بالکل سچ کہا تھا کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

انگریزوں نے جو نظامِ تعلیم قائم کیا تھا اگرچہ اس کا مقصد حکومت کی مشین چلانے کے لئے صرف سستے ملازم تیار کرنا تھا، ہندوستانیوں کو انگریز بنانا ان کے پیشِ نظر نہ تھا، لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی تمام قوموں میں یورپین تہذیب اور یورپین طرزِ فکر پیدا کرنے میں اُس نے جتنا کام کیا وہ ہم سب کے سامنے ہے ——— بس اسی تجربے کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے کہ اب جبکہ تعلیم عام اور لازمی ہوگی اور تعلیم کے مقاصد میں ایک خاص مقصد یہ بھی ہوگا کہ اس کے ذریعہ تمام ہندوستانیوں کے طرزِ فکر اور طرزِ زندگی میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا کی جائے اور ایک ملت سے دوسری ملت کو ممتاز کرنے والی چیزوں کو زیادہ سے زیادہ کمزور کیا جائے ——— "تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری" ——— تو ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے وہ دینی و ملی خصائص و امتیازات اور ان کی وہ ضروری تہذیبی و معاشرتی خصوصیات جو بعض حلقوں میں ابتک باقی ہیں مستقبل میں اُن کا کیا حشر و انجام ہوگا۔

ابھی یہ تعلیمی مہم پوری طرح شروع بھی نہیں ہوئی ہے لیکن خود مسلمانوں کے اپنے دین میں پختہ اور سیرت میں مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے اسکولوں میں تعلیم پانے والوں کے رنگ ڈھنگ ابھی سے بدلنے لگے ہیں ——— محکمۂ تعلیم ہی کے ایک سرکاری افسر نے خود راقم سطور سے نقل کیا کہ مشرقی یوپی کے ایک شہر میں لڑکیوں کے ایک اسکول کا انھوں نے معائنہ کیا انھیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ تعلیم پانے والی لڑکیوں کی اتنی بڑی تعداد میں کوئی ایک لڑکی بھی مسلمان نہیں ہے ——— اس کا سبب معلوم کرنے اور اپنا تعجب رفع کرنے کے لئے انھوں نے ہیڈ معلمہ سے دریافت کیا کہ شہر کی مسلمان لڑکیاں اسکول میں کیوں نہیں آتیں؟ ہیڈ معلمہ نے بتلایا کہ جو طالبات اس وقت آپ کے سامنے ہیں ان میں کافی تعداد مسلمان لڑکیوں کی ہے ——— ان افسر صاحب کا بیان ہے کہ یہ سُن کے میں حیرت میں رہ گیا ——— اسکول کی سب لڑکیوں کو میں نے جس صورت اور ہیئت میں دیکھا تھا اُس سے مجھے وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ان میں کوئی ایک لڑکی بھی مسلمان ہو سکتی ہے۔ وضع ہیئت، لباس اور ہر چیز سے ساری لڑکیاں ہندو گھرانوں ہی کی معلوم ہوتی تھیں، حتیٰ کہ سب نے یکساں طور پر ہاتھ جوڑ کے ہندوانہ طریقے پر مجھے نمسکار کیا تھا۔

ہمارے نزدیک اس میں نہ تعجب اور حیرت کی کوئی بات ہے اور نہ اسکول کے اسٹاف یا محکمۂ تعلیم پر الزام یا غصّہ کا کوئی موقع ہے، جب ہمارے بچوں اور بچیوں کی دینی تربیت کا گھر میں کوئی سامان نہ ہوگا اور دین سے تعلق اور اسلامی شعور اور ایمانی جذبہ پیدا کرنے کا کوئی انتظام ہم خود نہ کریں گے تو حکومت کا محکمۂ تعلیم اور

اساتذہ اور استانیاں اگر نہ بھی چاہیں جب بھی ہمارے بچے اور بچیاں اسکولوں کے عام ماحول سے یہی اثرات لیں گے، اور یہی رنگ ڈھنگ اختیار کریں گے۔

بہرحال اس وقت مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں دین سے بے پروائی اور بے خبری، آخرت کیطرف سے بے فکری اور ابن الوقتی و غرض پرستی کی جو بیماریاں اور کمزوریاں ہیں اُن کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کرنا ہر صاحب نظر کے لئے آسان ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کے لئے مستقبل میں اگر کوئی زیادہ بری صورت نہ بھی پیدا ہوئی اور حالات کی رفتار یہی رہی جو اسوقت ہی (اور جس کو غنیمت کہا اور سمجھا جارہا ہی) تب بھی خدانخواستہ یہ انجام یقینی ہے کہ ہمارے جن طبقوں میں ابتک دین سے کچھ تعلق باقی ہی اور ان کی زندگی کسی درجے میں اسلامی زندگی ہے (خدانکردہ) ان کی بھی آئندہ نسلوں میں یہ چیز باقی نہ رہ سکے گی ـــــ اور جیسا کہ عرض کیا گیا یہ نتیجہ تو اس وقت ہوگا جبکہ مسلمانوں کے دین کے لئے کوئی نیا اور زیادہ خطرناک فتنہ نہ پیدا ہوا ـــــ لیکن دو فتنے اور بھی ہیں جو منھ کھولے سامنے کھڑے ہیں ایک کمیونزم جس کا دھارا پوری تیزی سے ایشیا کی طرف آرہا ہی خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے حالات اس وقت کچھ ایسے ہیں کہ اکثر صوبائی حکومتوں اور ان کے عمال کے غلط رویہ کے ردعمل کے طور پر وہ آسانی سے ہر اس دعوت و تحریک کے ہمدرد بنائے جاسکتے ہیں جو موجودہ نظام کو الٹ کر حکومت کی نئی بساط بچھانے کے دعوی کیساتھ کھڑی ہو اور زندگی کے ہر شعبے میں کامل مساوات اس کا نعرہ ہو۔

جن حضرات کو واقعات کا کچھ گہرا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں خاصکر ان کے نوجوانوں میں اس وقت کمیونزم اور کمیونسٹوں سے ہمدردی تیزی کے ساتھ پیدا ہورہی ہے اور آگ کی رفتار سے پھیل رہی ہی۔ انتہا یہ ہے کہ بعض دینی حلقوں میں بھی اس لادینی تحریک کے لئے زمین تیار ہورہی ہی جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہی کہ کمیونزم کے متعلق ان کے معلومات محض سنے سنائے اور سطحی ہیں اور وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ کمیونزم موجودہ نظام سرمایہ داری کو ختم کر کے معاشی مساوات کی بنیاد پر ایک اشتراکی نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور اس دنیا کے عیش و سکھ میں جس پر مٹھی بھر سرمایہ دار قابض ہیں عام غریبوں کو بھی برابر کا شریک کرنا چاہتا ہے اور اس کے سوا انسانوں کے دوسرے مسائل سے خاصکر مذہب اور مذہبیات سے اسے کوئی سروکار نہیں ـــــ حالانکہ کمیونزم جس کا نام ہے وہ صرف اقتصادی اور معاشی نظام ہی نہیں ہے بلکہ ایک مستقل فلسفۂ حیات (گویا مستقل دین) ہی جو زندگی کے تمام شعبوں کی تنظیم اپنے خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر

سے کرنا چاہتا ہے — اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو بصیرت دی ہے اور عصرِ حاضر کے ان اجتماعی مسائل پر غور کرنے کے قابل بنایا ہے اور انھوں نے کمیونزم اور اس کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے دینِ حق کی حقیقت اور اس کے اصول و قواعد کو بھی اچھی طرح سمجھا ہے۔ انھیں ایک لمحہ کیلئے بھی اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ کمیونزم اپنی رُوح اور اپنے نظام کے لحاظ سے انبیاء علیہم السّلام کے لائے ہوئے اصولِ حیات سے بنیادی طور پر متصادم ہے، انبیاء علیہم السلام پوری انسانی زندگی کی تنظیم اسی بنیاد پر کرتے ہیں کہ انسان اللہ کا بندہ ہے اور اللہ اس کا واحد الٰہ اور ساری کائنات کا لاشریک مالک ہے، اور اس اللہ نے دنیا کی چیزیں انسانوں کے استعمال کرنے اور فائدہ اُٹھانے کے لئے پیدا کی ہیں اور اس کے لئے قوانین اور حدود مقرر کئے ہیں جن سے سرمو تجاوز کا حق نہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے نظامِ حیات کی یہ پہلی بنیاد ہے اور دوسری بنیاد یہ ہے کہ یہ دنیوی زندگی انسان کی پوری زندگی کا ایک مختصر سا ٹکڑا ہے، اصل زندگی اس دنیوی زندگی کے فنا ہونے کے بعد آنے والی ہے اس لئے ہر چیز اور ہر عمل کی قدر و قیمت اس آنے والی زندگی کے لحاظ سے ہے —— بہرحال انبیاء علیہم السلام ان دو بنیادوں پر پوری انسانی زندگی کی تنظیم کرتے ہیں، لیکن کمیونزم ان دونوں بنیادوں سے صرف بے پرواہ ہو کر نہیں بلکہ ان کی نفی کر کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم و تشکیل کرتا ہے۔ الغرض کمیونزم اور انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے دینِ حق میں بنیادی تضاد ہے اور کوئی واقف اور صاحبِ بصیرت ان میں سے کسی ایک سے اتفاق دوسرے سے اختلاف اور انکار کے بغیر نہیں کر سکتا۔

خیر یہ چند سطریں تو جملہ معترضہ کے طور پر بلا قصد قلم سے نکل گئیں ورنہ عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں اس وقت کمیونزم کے ساتھ ہمدردی اور دلچسپی تیزی سے پیدا ہو رہی ہے حتیٰ کہ جیسا کہ عرض کیا گیا بعض دینی طبقے بھی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے بظاہر اس کو خوش آمدید کہنے کیلئے تیار معلوم ہوتے ہیں ایسی صورت میں اس کا بڑا خطرہ ہے بلکہ ایک درجے میں یہ بات یقینی سی نظر آرہی ہے کہ اگر کمیونزم نے کسی وقت اس ملک میں ایک چلتی ہوئی عوامی تحریک کی شکل اختیار کی تو ہندی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اس سے وابستہ ہو جائے گی اور شروع میں چاہے ایک اقتصادی انقلابی تحریک ہی کی حیثیت سے اس کو اپنائے لیکن جیسا کہ بعض دوسرے اسلامی علاقوں کا تجربہ ہے، آخر کار کمیونزم اور مارکسزم ہی ان کے نزدیک دینِ حق ہوگا اور مارکس و لینن کے فلسفہ سے اتفاق کرنے والوں کو انجام کار انبیاء علیہم السلام

کے لائے ہوئے اصولِ حیات سے انکار کرنا پڑے گا، چاہے اپنے دل کو سمجھانے یا دنیا کو فریب دینے کیلئے اپنے اس انکار و انحراف کو وہ تاویل کے پردوں میں چھپائیں۔ [1]

بہرحال ہندوستانی مسلمانوں میں جن تبدیلیوں کے قریبی امکانات ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کمیونزم کے دھارے پر بہنے لگیں۔

اس کے علاوہ ہندی مسلمانوں کے دین و ایمان کے لئے اسوقت ایک اور فتنہ بھی بڑی اہمیت اور شدت اختیار کرتا جارہا ہے اور حالات ایسے ہیں کہ بہت سے مسلمانوں کے اس میں مبتلا ہونے کا قریبی خطرہ ہے —— اس سے ہماری مراد "نظریۂ وحدتِ ادیان" کی دعوت ہے۔ جو بعض ایسے حلقوں کی طرف سے اس وقت بڑے زور اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ دی جارہی ہے جن کی بات کے مسلمانوں میں مسموع و مقبول ہونے کے اس وقت کچھ خاص اسباب پیدا ہوگئے ہیں —— اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ جس مسلمان میں کچھ بھی دینی شعور ہو اور جو اسلام کی الف بے بھی جانتا ہو اُسے ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ اللہ کے نزدیک مقبول اور نجات دلانے والا دین صرف وہی ہے جس کی تعلیم اللہ کے رسولوں نے دنیا کو دی، اور آخری اور مکمل شکل میں جس کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لائے، جس کا بنیادی دستور قرآن مجید ہے اور جس کا مشہور و معروف نام اسلام ہے، اور اس کے سوا جو ادیان و مذاہب دنیا میں اس وقت رائج ہیں وہ حق نہیں ناحق ہیں، اور اللہ کی نظر میں مقبول نہیں نامقبول ہیں، اور اسی لئے ہمارا دینی اور انسانی فرض ہے کہ اللہ کے بندوں کو گمراہی کی اندھیریوں سے نکال کر اللہ کی بھیجی ہوئی اس ہدایت اور دینِ حق کی روشنی میں لائیں —— بہرحال اگرچہ توحید و رسالت کے عقیدے کی طرح اسلام ہی کا دینِ حق اور راہِ نجات ہونا ہر مومن و مسلم کا ایک بنیادی عقیدہ ہے لیکن چونکہ بدقسمتی سے مسلمان کہلانے والوں میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی اس وقت موجود ہے جن کا اپنے دین سے تعلق پہلے ہی سے بہت کمزور بلکہ برائے نام ہے اور جو اپنے دین کی بنیادی باتوں سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہیں، اور ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات نے اپنے مستقبل سے انھیں بالکل مایوس

---

[1] کمیونزم کے بارہ میں جن خیالات کا اظہار ان سطروں میں کیا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موجودہ نظامِ سرمایہ داری کو ہم اسلامی نظام یا قابلِ انگیز سمجھتے ہیں یہ حقیقت بالکل اپنی جگہ پر ہے کہ امریکن بلاک کا سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت بھی ایک ظالمانہ نظام ہے جس کو ختم ہو جانا چاہئے۔ لیکن اسکی جگہ کمیونزم کو لانے کی کوشش "فر من المطر و قام تحت المیزاب" کے مصداق ہے۔

اور دل شکستہ بھی کر دیا ہے، اور ایک بڑی تعداد مسلمان کہلانے والوں میں ایسے اغراض پرست اور ابن الوقت کی بھی موجود ہے جو اپنے اغراض اور منافع کے لئے ہر سانچہ میں اپنے کو ڈھال سکتے ہیں اور ہر تبدیلی کیلئے اُن کا ضمیر آمادہ ہو سکتا ہے اس لئے اس کا بہت کچھ امکان ہے کہ جن طبقوں میں دین سے جہالت، مایوسی یا نفاق کی یہ بیماریاں موجود ہیں وہ "نظریۂ وحدت ادیان" قبول کر لینے اور اپنے کو اس کے مطابق ڈھال لینے ہی کو اس ملک میں عزت و عافیت سے رہنے کا، اور سیاسی و معاشی منفعتیں حاصل کرنے کا "باعزت" ذریعہ سمجھیں اور اسی کو اپنا دین و مذہب بنا لیں۔

یہ فتنہ اس لئے اور زیادہ خطرناک ہے کہ اس وقت اس کی داعی اور علمبردار ہندو قوم کی بعض وہ شریف اور باوقار شخصیتیں ہیں جو بلاشبہ ہندی مسلمانوں کی دل سے ہمدرد و خیر خواہ اور بڑی محسن ہیں۔

گاندھی جی جنھوں نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ہندی مسلمانوں پر ناقابل فراموش احسان کیا (یہانتک کہ انھیں کی قوم کے بعض گمراہ نوجوانوں نے مسلمانوں کی اس ہمدردی ہی کے جرم میں اُن کی جان بھی لے لی) وہ خود اس نظریۂ وحدت ادیان کے قائل اور اپنے خاص رنگ میں اس کے داعی اور مبلغ تھے ــــــ حکومت ہند کے موجودہ گورنر جنرل راج گوپال اچاریہ جی، جو مسلمانوں کے ساتھ اپنی گہری ہمدردی اور خیر اندیشی ہی کی وجہ سے اپنے بلند کردار اور اعلیٰ صفات کے باوجود کٹر اور متعصب ہندوؤں کی نظر میں سخت مبغوض ہیں وہ بھی اس نظریہ کے خاص داعیوں میں ہیں ــــــ اور پنڈت سندر لال جی الہ آبادی (مسلمانوں کے ساتھ جن کے خلوص میں اور جن کی نیک نیتی میں کوئی واقف حال شبہ نہیں کر سکتا، اور جن کی انصاف پسندی اور صاف گوئی نے اُن کی پوری قوم کو اُن سے ناراض کر رکھا ہے یہانتک کہ بہت سے متعصب ہندو ان کو "مولانا سندر لال" کہتے ہیں) وہ اس وقت اس نظریہ وحدت ادیان کے خاص علمبردار ہیں۔ مسلمان ان کو اپنے جلسوں اور کانفرنسوں میں خاص طور سے مدعو کرتے ہیں اور جہانتک معلوم ہوا ہے ان کی ہر تقریر کا مرکزی نقطہ اور مین پائنٹ یہی ہوتا ہے کہ سب مذہب سچے ہیں اور بنیادی طور پر سب ایک ہی ہیں، اور گیتا اور قرآن میں ایک ہی تعلیم دی گئی ہے۔ موصوف کی جرأت اس معاملہ میں اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ مسلمان عوام کے سامنے ہی نہیں بلکہ اُن کے خواص اور علماء و ماہرین مذہب کے مجمعوں میں بھی بے تکلف اور پوری وضاحت و صراحت کیساتھ اپنی اس دعوت کو پیش کرتے ہیں اور اسی کو اصلی اسلامی عقیدہ اور قرآنی تعلیم کہتے ہیں ــــــ یہاں

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس بارہ میں وہ کس قدر سخت غلط فہمی میں (بلکہ صحیح تر لفظوں میں جہل مرکب میں) مبتلا ہیں (ہم اس مسئلہ پر گفتگو اس سے پہلے ایک مستقل مقالہ میں کر چکے ہیں[1])۔

یہاں تو صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ مسلمانوں کے بعض طبقے اپنے دین کی بنیادی باتوں سے بھی جاہل اور ناواقف ہیں، اور بعض میں مصلحت کوشی اور غرض پرستی اس درجہ آ چکی ہے کہ وہ حقیر مفادات کی خاطر ہر راستے پر چل پڑنے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں اور دین کے ذمہ داروں اور ایمان کے محافظوں کا حال یہ ہے کہ ان میں سے بہت سوں کے لئے وقتی مصلحتوں کی رعایت "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" کی تعمیل سے اس نازک ترین وقت میں بھی رکاوٹ بن گئی ہے یا مدارات اور مداہنت کی حدود ان کی نگاہوں میں ملتبس ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے اتنے سنگین معاملہ میں اور الحاد و ارتداد کی اس صریح دعوت کے مقابلے میں اُن کا رویہ وہ نہیں ہے جو اس سے بہت ہلکے درجہ کی گمراہیوں کے مقابلہ میں بھی دین کے محافظوں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نائبوں کا ہونا چاہیئے اور ہر زمانہ کے علماءِ ربانی کا ہمیشہ رہا ہے —— بہرحال ایسی حالت میں جبکہ مسلمانوں کے مختلف طبقات میں یہ کمزوریاں موجود ہیں، اجگوپال اچاریہ جی، اور پنڈت سندر لال جی جیسے مسلمانوں کے محسن و مخلص جب اس کے داعی اور مبلغ ہوں کہ سب مذہب یکساں طور پر سچے ہیں، اور ہر مذہب پر چل کر آدمی نجات کا مستحق ہو سکتا ہے، اور مسلمانوں کو یہ خیال ترک کر دینا چاہیئے کہ صرف دینِ اسلام ہی دینِ حق ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں ہندی مسلمانوں کے لئے یہ فتنہ کتنا بڑا "فتنۂ الحاد" بن سکتا ہے۔

ہندی مسلمانوں کے دین و ایمان پر جدید ہندوستان میں جو چیزیں اور جو تحریکیں اثر انداز ہونے والی نظر آ رہی ہیں یہاں تک ہم نے ان کا ذکر کیا ہے آگے ہم کو یہ عرض کرنا ہے کہ ان اثرات سے موجودہ مسلمانوں کو اور ان کی آئندہ نسلوں کو بچانے کے لئے کیا کیا کرنا ہے۔　　　(باقی آئندہ)

---

[1] اب سے کئی مہینے پہلے "اسلام اور نظریۂ وحدت ادیان" کے عنوان سے ایک مستقل مقالہ الفرقان میں شائع ہوا تھا جو بعد کو مستقل رسالے کی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے، کتب خانۂ الفرقان سے مل سکتا ہے۔ یہ رسالہ اس لائق ہے اور اس لئے چھپوایا گیا ہے کہ پڑھے لکھے مسلمانوں میں اس کو کثرت سے پھیلایا جائے۔ ۱۲

تصوّف وسلوک

(از- جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہ)

گذشتہ سے پیوستہ

ذکر کے متعلق ایک عام غلط فہمی دوسروں کا تو ذکر ہی کیا خود عام غیر محقق صوفیہ تک اسی میں مبتلا ہیں کہ کثرت ودوام ذکر محض اسی لفظی ولسانی یا زیادہ سے زیادہ اصطلاحی قلبی ذکر کو سمجھ لیا ہے جس کو قلب کا جاری ہونا کہتے ہیں - اس لئے ذکر کی اصل حقیقت ذرا اور توجہ وتفصیل سے سُن لینا ضروری ہے - اسی وعظ میں فرماتے ہیں، کہ

ذکر کی حقیقت بتلاتا ہوں - اس کو ایک مقدمہ سے سمجھئے، وہ یہ کہ آپنے دیکھا ہوگا کہ بعض مرتبہ شریف آدمی کے دل میں بعض جرائم کا تقاضا ہوتا ہے جیسے چوری وغیرہ - چنانچہ بعضے شریف آدمی بھی چوری کرنے لگتے ہیں، محض اسی وجہ سے کہ طبیعت کا تقاضا ہے - اور یہ تقاضا اس وجہ سے نہیں کہ ان کا پیشہ چوری کرنا ہے، بلکہ محض احتیاج کی وجہ سے - کیونکہ احتیاج بُری بلا ہے، یہ انسان کو بُری سے بُری جگہ لیجاتی ہے - ایک تو یہ منظر ہے اس کو سامنے رکھئے -

اب اس کے مقابل دوسری جماعت کو دیکھئے کہ باوجود تقاضا وافلاس کے چوری نہیں کرتے - چوری تو کیا کرتے سرکاری مالگذاری کو بھی نہیں ٹالتے، بلکہ اپنی زمین اور جانور بیچ کر مالگذاری ادا کرتے ہیں گو گھر میں فاقہ ہوجائے - اس میں غور کیجئے کہ پہلی جماعت چوری پر کیوں اقدام کرتی ہے اور دوسری جماعت مالگذاری تک کیوں ادا کرتی ہے حالانکہ احتیاج وافلاس میں دونوں برابر ہیں -

وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ ان کو ایک چیز یاد آتی ہے جو پہلی جماعت کو یاد نہیں آتی،

یعنی سزا و قید وغیرہ کی رسوائی اور بس۔ اب سمجھو کہ ذکر کی حقیقت بھی یہی ہے، ماور یاد بھی اسی کو کہتے ہیں محض علم کا نام یاد نہیں۔ کیونکہ چوری پر سزائے قید و سزائے تازیانہ کا مرتب ہونا پہلی جماعت کو بھی معلوم تھا، مگر یہ سزا و قید اس کے پیش نظر و مستحضر نہ تھی، اسلئے وہ جرائم سے نہ رک سکی، اور دوسری جماعت کے پیش نظر اور پوری طرح مستحضر تھی، اسلئے وہ اقدام نہ کرسکی۔

بہت بڑی غلطی

ایک اور بہت بڑی غلطی کا ازالہ فرمایا گیا ہے، کہ جنت و جہنم کی یاد کو حقیقی ذکر سمجھنا تو الگ رہا حقیقی تصوف کے درجہ سے اس کو فروتر خیال کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا جنت و جہنم پر نظر ہو۔ حالانکہ یہ عین عبدیت ہی اور انبیاء علیہم السلام تک اس کی یاد اور رغبت و رہبت سے بے نیاز نہ تھے، البتہ غلبۂ حال سے معذوری ہی۔ غرض اس شبہ کے ازالہ کیلئے ارشاد ہوا، کہ

اس پر شاید یہ سوال ہو کہ اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ جنت و دوزخ کی یاد ذکر اللہ ہی حالانکہ یہ تو ذکر جنت و نار کا ہوا، اللہ کی یاد نہ ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ ثواب کی یاد اللہ ہی کی یاد ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ قانون کو یاد کرو، اس کا یہی مطلب ہے کہ قانون کا یاد کرنا ہی ہتکڑی اور جیل کا یاد کرنا ہے۔

ذکر اللہ کے مراتب ہیں

ہاں یہ ضرور ہے کہ ذکر اللہ کے مراتب ہیں بعض کو محض ذاتِ حاکم کی یاد کافی ہوتی ہی، اور جرائم سے بچنے کیلئے سزائے جیل وغیرہ کی یاد کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ بعض کو یہ بھی کہدیتا ہے کہ تم جو چاہے کرو تم کو سزا نہ ہوگی، پھر بھی اس کو حاکم سے ایسا خاص تعلق ہوتا ہے کہ مخالفت نہیں کرسکتا۔ پھر بعض تو ایسے وقت میں ناراضی کے اندیشے سے مخالفت نہیں کرتے اور بعض کو یہ اندیشہ بھی نہیں ہوتا، بلکہ حیا و شرم مانع ہوتی ہی، اور بعض کو یہ مانع بھی نہیں ہوتا یعنی حیا و شرم پر بھی التفات نہیں ہوتا۔ اس تعلق کا نام کچھ نہیں۔ ~~

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

یا اس کا نام اگر کچھ ہے تو تعلق ذات۔ بہر حال مراتب ذکر میں تدریج ضرور ہے۔ اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہم کو کس قسم کا تعلق ہی، جیسا تعلق ہو اسی کے مناسب ذکر میں مشغول ہونا چاہیے۔

فرق مراتب پر قرآن سے استشہاد

آگے ذکر کے اس فرق مراتب پر قرآن سے استشہاد ہے جس سے ایک تفسیری مشکل بھی کیسی حل ہو جاتی ہے

فرماتے ہیں، کہ

اور یہ فرقِ مراتب ہی تو ہے، جس کی وجہ سے حق تعالیٰ نے ذکر کی تاکید فرماتے ہوئے کہیں تو ذکر اپنی ذات سے متعلق کیا ہے، جیسے (وَلَذِكْرُ اللهِ أَكْبَرُ) اور کہیں اسمائے حسنیٰ سے متعلق فرمایا ہے (وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا)، یہاں مفسرین نے لفظ اسم کو مقحم کہا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ زائد کہنے کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ تغیرِ عنوان مراتب ذاکرین کے اعتبار سے ہے۔

مولانا ذکر کے اس فرق مراتب پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ ؎

مست ولایعقل نہ از جام ہو

اے زہو قانع شدہ بر نام ہو

اس میں تنبیہ ہے کہ ذکر کا ایک درجہ وہ ہے، جو ذکر اسمی سے ارفع و اعلیٰ ہے، مگر دوسری جگہ بتلاتے ہیں کہ ذکر اسمی بھی بیکار نہیں بلکہ نافع و مفید ہے، جس کو پہلا درجہ حاصل نہ ہو اسی کو غنیمت سمجھے[۱] ؎

از صفت وز نام چہ زائد خیال

واں خیالش ہست دلال وصال

یہاں سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ذکر لسانی بھی بیکار نہیں گو دل متوجہ نہو، اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر

ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

یہ غلط ہے میں نے اس کے رد میں کہا کہ "ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر" صاحبو غضب یہ ہے کہ

---

[۱] اور کمال جامعیت یہ ہے کہ اپنے اپنے موقع اور محل کے اعتبار سے تمام مراتب حاصل ہوں، جیسے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام یا ان کے اقرب و اکمل غیر مغلوب الحال متبعین کو حاصل ہوتے ہیں۔

کھٹائی مٹھائی کا نام لینے سے تو اثر ہو کہ نام لینے سے منھ میں پانی بھر آئے، اور خدا کے نام میں اثر نہ ہو! (ص۲۳ و ص۲۴)۔

صوفیہ کا اصطلاحی ذکر قلبی

پھر آگے صوفیہ کے اصطلاحی ذکر قلبی کا ذکر ہے، کہ

ایک بات اور کہتا ہوں وہ یہ کہ متاخرین صوفیہ نے محض ذکر قلبی تجویز کیا ہے وہ بہت اچھی چیز ہے، مگر زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتا، دل ادھر اُدھر چلا جاتا ہے اور ذاکر سمجھتا ہے کہ میں ذکر میں مشغول ہوں، اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ذکر لسانی کرنا چاہئے اور اسمیں توجہ قلبی رکھنا چاہئے۔ اگر کچھ دیر ذکر قلبی نہ رہے گا تو لسانی تو باقی رہے گا، اور وقت ضائع نہ ہوگا۔

خصوصًا میری اس تحقیق کے بعد کہ جو عمل خاص نیت سے شروع ہو اسکی برکت و انوار مستمر رہتے ہیں گو وہ نیت مستحضر نہ رہے اور گو توجہ باقی نہ رہے۔ اب جو ہم لوگوں کے ذکر میں انوار نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو توجہ اور حصول نور کا قصد بھی نہیں۔ اگر قصد ہو تو انوار ضرور حاصل ہوں۔ پس اب یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ "ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر" یعنی جب حصول اثر کا قصد ہو (ص۲۶)

ذکر کے درجات

خلاصہ یہ کہ ذکر کا ایک درجہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کو یاد کرو۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ بواسطہ نام کے ذات کو یاد کرو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ نام کا واسطہ بھی نہ رہے محض ذات کے ذکر پر قادر ہو جائے۔ اسی طرح تعلق کا ایک درجہ یہ ہے کہ اگر اس سے یوں بھی کہدیا جائے کہ تم کو کسی گناہ پر سزا نہ ہوگی جو چاہو کرو، جب بھی احکام کی مخالفت نہ کرے۔ نیز اگر یوں کہدیا جائے کہ تیرا خاتمہ کفر پر ہوگا جب بھی اعمال میں کوتاہی نہ کرے۔ چنانچہ ایک بزرگ کو ذکر میں آواز آئی کہ جو چاہے کرلے کافر ہی ہو کر مرے گا۔ وہ پریشان ہو گئے، مگر ذکر اور نماز وغیرہ نہیں چھوڑی، بلکہ شیخ سے جاکر عرض کیا۔ شیخ نے کہا کام میں لگے رہو اس آواز سے پریشان نہو، یہ دشنام محبت ہے۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی   جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

محبت کا ایک رنگ | یہ بھی محبت کا ایک رنگ ہے۔ ؎

ما برو ریم دشمن و ما می کشیم دوست کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما

میرے والد صاحب بچوں کو گود میں کم لیتے تھے، جب زیادہ محبت کا جوش اُٹھتا بچوں کے گلے پکڑ کر دبا دیتے جس سے بچے مرو پڑتے، مستورات کہتیں یہ تمھاری محبت عجیب محبت ہے کہ بچوں کو گود میں لینا کھلانا تو نہیں آتا بس رُلانا آتا ہے۔ مگر اُن کو اسی میں لُطف آتا تھا، مجھ کو بھی بچوں سے مزاح کا شوق ہے، جس میں بعض دفعہ ان کو غصہ بھی آتا ہے، ان کی یہ ادائیں پسند آتی ہیں، ایسے ہی بلا تشبیہ یوں سمجھئے کہ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ محبت کی وجہ سے طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں، ان کا رُلانا چلانا ان کو پسند ہے کسی کا ہنسنا پسند ہے اُس کو ہنساتے ہیں، کسی کا رونا پسند ہے اُس کو رُلاتے ہیں۔ ؎

ذوق ہا دارم بہ یار ہستے کا تو خوش نماید گریۂ شبہائے تو

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ کہ خندان ست

بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست۔

اس تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ جنت و دوزخ عذاب و ثواب کو یاد کرنا بھی اللہ ہی کی یاد ہے، کیونکہ ذکر کے مراتب مختلف ہیں۔ پس ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ جیسے بعض لوگ باوجود تقاضا کے چوری نہیں کرتے مالگذاری ادا کرنے میں سُستی نہیں کرتے، کیونکہ ان کو ایک چیز یاد آتی ہے یعنی سزا و قید وغیرہ۔ اسی طرح ایسی چیز کو یاد رکھنا جو معاصی (اللہ کی نافرمانی) اسے روک دے اور طاعات (فرمانبرداری) پر کمر ہمت چست کر دے، ذکر اللہ (یا اللہ کی یاد) ہے۔ اب اگر کسی کو جنت و دوزخ کی یاد معاصی سے روکے اس کے لئے یہی ذکر اللہ ہے، اور کسی کو اللہ اللہ کرنا معاصی سے روکے اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے، اور جس کو مراقبۂ ذات معاصی سے روکے اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے۔

اور جس کو یہ چیزیں معاصی سے نہ روکیں، اس کے لئے یہ حقیقی ذکر اللہ نہ ہوں گی بلکہ ذکر کی صورت ہوں گی اس کو اپنے مناسب حال حقیقی ذکر کسی محقق سے تجویز کرانا چاہئے۔

مثلاً بعضوں کے لئے نفس پر مالی جرمانہ معاصی سے مانع ہوتا ہے، ان کے واسطے یہی ذکر ہے،

یہ حقیقت ہی ذکر کی، اور یہی جڑ ہے تمام طریق کی بلکہ تمام شریعت کی۔

ذکر ہی جڑ ہے تمام شریعت و طریقت کی

اس کے ثبوت میں مثالاً چند آیات مذکور ہیں۔

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں (اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ) اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ سے مقصود ذکر ہے۔ حج کے بارے میں ارشاد ہے (فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ) اور (فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْھَا صَوَآفَّ) اور اگر غور کیا جائے تو تمام اعمال میں ذکر موجود ملے گا۔ یہ تو اعمالِ ظاہری کی چند مثالیں تھیں اب اعمالِ باطنہ میں غور کیجئے تو وہاں بھی ذکر موجود ہے، چنانچہ ارشاد ہے (اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا) جس سے معلوم ہوا کہ خوف و خشیت وہی معتبر ہے جس کا منشا ذکر اللہ ہو۔ یہ مقامات کا بیان تھا کیونکہ اعمال ہی کو مقامات کہا جاتا ہے۔ اب احوال میں غور کیا جائے تو ان میں بھی ذکر کو دخل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے (اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ) کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے۔ اطمینان کے دو درجے ہیں، ایک تو مقام ہے جو تصدیق و اذعان کا درجہ ہے، اور ایک حال ہے، جس کو سکون و اُنس سے تعبیر کیا جاتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق اطمینان کے لئے ذکر اللہ کو سبب بتلایا ہے، اِس لئے اُس کے عموم میں مقام و حال دونوں داخل ہیں۔ اگر عموم سے استدلال ہو تو مشاہدہ خود اس کی دلیل ہے، کیونکہ واقعی دل کو راحت اور چین ذکر اللہ ہی سے نصیب ہوتا ہے۔ [1]

گر گریزی بہ اُمید راحتے ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بہ خلوتگاہِ حق آرام نیست

خلوتگاہِ حق سے مراد اللہ کے ساتھ تعلق ہے، جو ذکر کی اعلیٰ فرد ہے۔

ذکر کی حقیقت و صورت میں فرق و تمیز کے متعلق حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی تجدید و تحقیق کی یہ تفصیل باوجود کسی قدر تطویل کے ضروری و اہم تھی۔ اس لئے کہ غیر محقق درویشوں نے رسمی اذکار یا محض صورت ذکر پر اتنا زور

---

[1] اس وعظ کے ضمیموں میں ذکر کے متعلق اور بھی بہت سی آیات نقل فرما دی گئی ہیں۔

دے دیا ہے، کہ ذکر کی حقیقت گم ہو کر رہ گئی۔ ماحصل حضرت کی اس مجددانہ تحقیق کا یہ نکلا کہ حقیقی ذکر وہ ہی جسمیں بلاواسطہ (یا بواسطۂ عذاب و ثواب جنت و دوزخ وغیرہ) مذکور کا استحضار ہو۔ احقر نے اسی کو ابتدا میں یوں عرض کیا تھا کہ ذکر یا یاد کے معنی یہ ہیں کہ مذکور یعنی جس کی یاد آئے یا جس کو یاد کیا جائے قلب یا ذہن اس کی طرف متوجہ ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کی اس حقیقی یاد و ذکر، یا مذکور کی طرف توجہ اور اس کے استحضار کی علامت بلکہ لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ دیدہ و دانستہ نافرمانی یا معصیت کا ارتکاب یا فرمانبرداری و طاعت میں کوتاہی عملاً ناممکن ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، رضا و ناراضی، یا عذاب و ثواب ہمارے پیش نظر ہو، اور پھر ہم اس کی پروا نہ کریں۔ اس حقیقی یاد یا ذکر ہی کا نام حدیث میں احسان ہے، جو محققین کے نزدیک اسلامی تصوف کا منصوص نام ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طرح بجالاؤ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو دیکھ ہی رہا ہے۔ ظاہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی یاد نصیب ہو جائے کہ گویا بہمہ وقت اس کے سامنے اور حضوری میں ہے یا کم از کم اس کی رضا و ناراضی عذاب و ثواب ہی کا استحضار رہے، تو بشری بھول چوک کے علاوہ کسی چھوٹی بڑی نافرمانی کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔

اسی آیت میں جس پر "اکبر الاعمال" کا یہ وعظ ہے (وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ) کے بعد ہی دوسرا ٹکڑا (وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ) ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ جانتا ہے) اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی یاد حقیقی معنی میں ہو، تو کم از کم اتنا تو پیش نظر رہنا ہی چاہئے کہ ہمارا ہر فعل و عمل اللہ کے علم میں ہے اور وہ جان اور دیکھ رہا ہے، وہی (فَاِنَّهٗ يَرَاكَ) نیز ذکر اللہ کی حقیقت کو حاصل کرنے کا سہل طریقہ یہی ہے کہ اس کے حاضر و ناظر یا عالم و رائی ہونے کا مراقبہ رہے۔ اسی وعظ کے آخری ضمیمہ میں ہے کہ

ذکر اللہ کے حصول کا طریقہ اس جملہ (وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ) میں ذکر اللہ کی تحصیل کا طریقہ بتلایا گیا ہے، کہ اس مضمون کو پیش نظر رکھا جائے کہ اللہ کو میرے ہر عمل کا علم ہے۔ اس مراقبہ سے ذکر اللہ بسہولت حاصل ہو جائے گا، اور تمام اعمال کی تکمیل ہو جائے گی۔ کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی کوتاہی کا سبب یہی ہے کہ ہم اعمال کو بدون سوچے سمجھے ادا کرتے ہیں۔ اگر یہ سوچ کر عمل کریں کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے عمل کا علم ہو رہا ہے کہ ہم کیسے ادا کر رہے ہیں تو عمل اچھی طرح ہو۔ اور اگر یہ مراقبہ راسخ ہو جائے

تو معاصی سے اجتناب آسان ہو جائے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی حقیقت محض زبانی ذکر نہیں، بلکہ وہ دوسری چیز ہے جو مراقبۂ علم سے مثلاً حاصل ہوتی ہے پھر خواہ مراقبۂ علم اس طرح ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ہر عمل کو جانتے ہیں اگر کوتاہی ہوگی تو عذاب ہوگا یا اس طرح ہو کہ محبوب کو میری عبادت کا علم ہے وہ مجھ سے اس حالت میں ناراض ہوگا وغیرہ وغیرہ" (ص ۳۶)

غرض اگر حقیقی تصوّف کا حقیقی ذکر میسر ہو تو مومن و مسلم کی زندگی کی ہر ہر حرکت ہر ہر سکون اور ساری زندگی ذکر ہی ذکر اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہی یاد ہے، خواہ یہ یاد کسی درجہ اور کسی پیرایے میں ہو، خواہ اس کے ثواب و عقاب کی یاد ہو، خواہ اس کی رضا و ناراضی کی یاد ہو، خواہ اس کی ذات کی یاد ہو۔

باقی حضرات صوفیہ کے ہاں ذکر لسانی کا جو اتنا اہتمام ہے، اس کا بڑا مقصد بھی یہی ہے کہ اس ذریعہ سے قلب میں مذکور کی یاد رچ اور بس جائے۔ یہ نہ بھی ہو تو ادھر ادھر کی لغو و فضول باتوں اور گپ زنیوں کے بجائے نفس زبان ہی کا ذاکر رہنا کیا کم دولت ہے۔ اس کے علاوہ اگر لسانی ذکر کے ساتھ قلب مسلسل نہ بھی متوجہ رہے تو بھی اگر صوفیانہ طریقوں سے قلبی توجہ کے ساتھ ذکر لسانی کی مشق کی گئی ہے تو دنیا کے دھندوں میں انہماک کے باوجود زبان کی یاد کیساتھ وقتاً فوقتاً قلب بھی ضرور کچھ نہ کچھ متوجہ ہوتا رہتا ہے۔ یوں بھی اگر کسی کا نام زبان ہی سے ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے لیتے رہو تو دوسری مصروفیتوں کے باوجود درمیان درمیان دل میں بھی اس کا خیال آتا ہی رہے گا۔ اسی بنا پر حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ صوفیہ کے متعارف ذکر قلبی کے مقابلہ میں (جس میں قلب کے ذہول یا عدم توجہ کا اندیشہ رہتا ہے) ذکر لسانی کی ترجیح و فضیلت کے قائل تھے۔

ذکر قلبی افضل ہے یا لسانی

ایک مولوی صاحب نے بعینہ یہی سوال پیش کیا کہ ذکر قلبی افضل ہے یا لسانی؟ فرمایا، کہ

"ذکر کے متعلق مختلف احکام ہیں، بعض لفظ کے ساتھ متعلق ہیں، ان میں ذکر لسانی افضل ہے، باقی جو ذکر زبان سے نہ کیا جائے اجر اس پر بھی ہے، یہ ذکر قلبی ہی جس سے ہر وقت قلب میں یاد رہے۔ مگر اس میں قوی اندیشہ رہتا ہے قلب سے ذہول کا، اور ذکر لسانی میں یہ اندیشہ نہیں، اسی اعتبار سے قلبی سے لسانی افضل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر صرف قلب سے ذکر کرے گا تو زبان خالی رہے گی، اور اگر زبان سے

ذکر کرے گا تو اس کے ساتھ قلب بھی ادنیٰ توجہ کے ساتھ متوجہ رہے گا۔"[1]

یہاں ذکر قلبی سے مراد صوفیہ کا وہی متعارف واصطلاحی ذکر ہے جس کو قلب کا جاری ہونا کہا جاتا ہے اور جو اس طرح مشق سے ہو جاتا ہے کہ قلب کی طرف متوجہ ہو کر مثلاً یہ تصور کیا جائے کہ اس کی حرکات کے ساتھ اللہ اللہ یا لا الٰہ الا اللہ نکل رہا ہے، تو کچھ عرصہ کی مشق کے بعد قلب کی طرف توجہ سے ایسا ہی سنائی دینے لگتا ہے لیکن یہ اکثر خصوصاً دماغی مصروفیت کی حالت میں جاری نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ کسی طالب نے لکھا تھا، کہ "ذکر قلبی اکثر اوقات بآسانی جاری رہتا ہے، مشغولیِ کار کے ساتھ بھی جاری رہتا ہے، لیکن اکثر دماغی مصروفیت کے وقت بند ہو جاتا ہے، کوشش کرتا ہوں کہ ایسے وقت بھی بے تکلف جاری رہ سکے۔" جواب میں تحریر فرمایا، کہ

"نہیں رہ سکتا، کیونکہ ایک آن میں دو طرف توجہ نہیں ہو سکتی، لیکن اس جاری نہ رہنے سے کچھ ضرر نہیں۔ باقی ذکر قلبی سو اگر اس وقت ذکر لسانی دشوار ہو تو اس پر اکتفا کا مضائقہ نہیں، ورنہ محض قلبی پر اکتفا نہ کیا جائے، لسانی بھی اس کے ساتھ ضرور رہے، خواہ قلبی میں اس سے کچھ کمی ہو جائے۔"[2]

یہ وہی اصطلاحی ذکر قلبی ہے، کہ چونکہ اس کا دارومدار تصور پر ہے کہ قلب کی حرکت یا دھڑکن سے فلاں آواز نکل رہی ہے، اس لئے جب دماغ دوسرے تصورات میں مصروف ہوتا ہے تو یہ جاری نہیں رہ سکتا برخلاف لسانی کے کہ وہ اس صورت میں بھی جاری رہ سکتا ہے۔

"ایک شخص شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ حضرت میرا قلب جاری ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ دل دھڑکنے کو قلب کا جاری ہونا نہیں کہتے، قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت خداوند تعالیٰ کی یاد دل پر حاضر رہے۔

اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ کی بوٹیاں تھرکتی ہیں یہ بہت کامل ہیں، اور جن لوگوں میں یہ باتیں نہیں ہوتیں اُن کی نسبت کہتے ہیں کہ نیک بخت ہیں یعنے

---

[1] الافاضات الیومیہ ص۹۵ حصۂ ہفتم

[2] اشرف السوانح حصۂ سوم ص۱۵۴

ان میں کمالات باطنی نہیں، حالانکہ کمالاتِ باطنی بالکل مخفی ہیں اُن کو بوٹیوں کے تھرکنے سے کچھ تعلق نہیں۔" (الرفیق فی سواء الطریق ص۲)

ذکر کے باب میں ایک بڑی خطرناک غلطی جس میں بعضوں کو ابتلا ہے یہ ہے کہ نفس ذکر ہی کو تمام اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے کافی جانتے ہیں اور استدلال اس ابتلا سے بھی عجیب تر ہے کہ (اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ) سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اور اللہ سے قریب رہ کر اللہ کی نافرمانی یا معاصی میں کیسے مبتلا ہو گا، لہٰذا اور تدابیر کی ضرورت نہیں۔

"حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ذَکَرَنِیْ میں خود تدابیر اصلاح بھی داخل ہیں تو بدون معالجہ امراض کے ذکر ہی متحقق نہ ہوگا۔ دیکھو حصن حصین میں ہے بَلْ کُلُّ مُطِیْعٍ اللہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ۔ سنئے ذکر کے معنی ہیں یاد، تو یاد تو سب طریقہ سے ہوتی ہے نہ کہ محض زبان ہی سے نام لیلے۔ کیا یہ یاد ہے کہ جس کی یاد کا دعویٰ ہو نہ اس سے بات کرے، نہ اس کے خط کا جواب دے، نہ اس سے ملے، نہ اس کا کہنا مانے، یہ ہرگز یاد نہیں۔ تو جو ذکر بدون اصلاح کے ہو وہ ایسی ہی یاد ہے[1]۔"

یہ غلطی اچھے اچھے مشائخ میں اتنی عام ہے کہ مرید کر کے بس کچھ اذکار کی تعلیم فرما کر فارغ ہو جاتے ہیں اعمال و اخلاق کی کوتاہیوں یا امراض پر نہ کوئی روک ٹوک نہ علاج و تدبیر، بلکہ طالب اگر کسی مرض کو بیان کرے، تو اس کے لئے بھی اکثر کوئی ذکر یا وظیفہ ہی اور تجویز فرما دیا جاتا ہے، حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی رائج الوقت عامیانہ تصوف میں درحقیقت یہ بڑی اہم تجدید و اصلاح تھی کہ اعمال و اخلاق کے مواخذہ و معالجہ کے مقابلہ میں مروجہ اذکار و اشغال اور اوراد و وظائف کی حیثیت بالکل دوسرے اور تیسرے درجہ کی تھی۔ ان کا ذکر مجلس میں شاذ و نادر آتا، لیکن اعمال و اخلاق پر روک ٹوک دن رات رہتی۔

ایک طالب نے اپنے خط میں کوئی آسان وظیفہ یا طریقہ پوچھا جس سے طاعات میں ترقی اور معاصی سے اجتناب میسر ہو۔ جواب میں تحریر فرمایا، کہ

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص۱۹۵

"طاعت و معاصی دونوں امورِ اختیاریہ ہیں، جن میں وظیفہ کو کچھ دخل نہیں نہ ان کا طریقہ سوا امورِ اختیاریہ کا طریقہ استعمالِ اختیار کے سوا اور کچھ نہیں"

کسی اور موقع پر فرمایا، کہ

" نرا وظیفہ اصلاح کے لئے ہرگز کافی نہیں، نرے وظیفے والے پیروں سے واللہ ثم واللہ جو کبھی اصلاح ہو، اصلاح تو ہوتی ہے اصلاح کے طریقے سے"

(اشرف السوانح حصہ دوم صہ ۱۶)

غرض ذکر کی جو اصل حقیقت ہے، یعنی مذکور کی دل سے یاد اور اس سے غافل نہ ہونا یہ تو شریعت کا عین مقصود بلکہ عبادت و اطاعت کا اعلیٰ ترین مقام احسان ہے، کہ وہ مذکور کے اس طرح استحضار کے ساتھ ادا ہوگا کہ گویا ہم اس کے سامنے حاضر ہیں، اس کو دیکھ رہے ہیں، یا وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔ مسلمان کی ساری زندگی بندگی ہے۔ اسلام کے معنی ہی بالکلیہ اطاعت یا سرافگندگی و سپردگی کے ہیں۔ اور حضرت مجدد کی تجدید تصوف کا خلاصہ بھی یہی دو باتیں ہیں۔ طاعت[1] کا اہتمام اور دوام[2] ذکر یا معصیت[1] و غفلت[2] سے اجتناب تام، اور تصوف یعنی خدا کی اس کمالِ بندگی یا عبدیت خالصہ کی راہ کے قصد یا " قصد السبیل الی المولیٰ الجلیل" کے نام سے جو دستور العمل مرتب فرمایا گیا ہے اس میں تفصیلی تفہیم کے بعد ارشاد ہے، کہ

خلاصۂ طریق طاعت[1] و ذکر[2]

"میزان کل اور خلاصہ طریق الی اللہ کا کل دو[2] چیزیں ہیں طاعت اور ذکر۔ معصیت سے طاعت فوت ہو جاتی ہے، اور غفلت سے ذکر مختل ہو جاتا ہے۔ اسلئے اپنا اصلی کام طاعت و ذکر پر دوام رکھنے اور معصیت و غفلت سے بچنے کو سمجھے[1]"

سالک کے چار طبقات

باقی اشغال و مراقبات، احوال و کیفیات، کشف و کرامات، بیعت و نسبت وغیرہ کی جو حیثیت وحقیقت تصوف کے اس تن متین دستور العمل (پاکٹ بک) میں واضح فرمائی گئی ہے، اس کا اندازہ صرف اس سے فرمایا جا سکتا ہے کہ اس راہ کا قصد کرنے کو چار طبقات عامی مشغول[1]، عامی فارغ[2]، عالم مشغول[3]، عالم فارغ[4] میں تقسیم فرما کر عامی مشغول و فارغ دونوں کیلئے اشغال کی

---

[1] صہ ۱۷ مطبوعہ مطبع ہلال

سرے سے ممانعت فرمائی ہے، کہ

"اس میں طرح طرح کے خطرات ہیں، جن کا تحمل عامی سے نہیں ہو سکتا"۔ (صلا)

عالم مشغول تک کے دستور العمل میں یہ قید ہے، کہ

"شیخ سے دُور رہ کر شغل نہ کریں، البتہ چندے شیخ کے حضور میں اگر یہ کام کیا ہو، اور وہ اب بھی اس کو تجویز کرے تو مضائقہ نہیں"۔ (صلا)

ورنہ تصوف کے اس تجدیدی دستور العمل کی رو سے متعارف صوفی بننے کی اجازت صرف "عالم فارغ" یعنی ایسے علماء ہی کو ہے جو ایک طرف دین و شریعت کا پورا علم رکھتے ہیں اور دوسری طرف فکرِ معاش سے فارغ ہیں تاکہ نہ جاہل صوفیوں کی خلافِ شرع رسوم و بدعات کا شکار ہو سکیں اور نہ اشغال و مراقبات یا ان کے ثمرات و کیفیات وغیرہ کے عدم تحمل کی وجہ سے حدود سے تجاوز کر سکیں۔ چنانچہ "عالم فارغ" کے دستور العمل میں ان چیزوں کی حسب ضرورت اجازت کے باوجود ان کی حدود و حیثیت پر پوری طرح متنبہ فرمادیا گیا ہے مثلاً ذکر میں جہر و ضرب کی نسبت ارشاد ہی، کہ

"جہر مقصود بالذات اور قربت فی نفسہا نہیں، ایسا اعتقاد کرنا بدعت ہے۔ اور حدیث میں جو وارد ہی کہ (اربعوا علیٰ انفسکم انکم لاتدعون اصم ولاغائبا) میرے نزدیک اسی اعتقاد کی نہی پر محمول ہے، اور بعض نے اس جہر مفرط پر محمول کیا ہے جس سے دوسرے متاذی ہوں مثلاً سونے والوں کو تشویش ہو۔ اور امام ابوحنیفہ کے منع فرمانے کی بھی یہی توجیہات ہیں، ورنہ جہر فی نفسہ جائز ہے، جیساکہ بخاری میں حضرت ابنِ عباسؓ سے رفع الصوت بالتکبیر کا علامت انصراف عن الصلوٰۃ ہونا عہدِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اور سنن میں وتر کے بعد سبحان الملک القدوس مروی ہی۔ اور حکمت جہر میں یہ سمجھی گئی ہے کہ اس میں وساوس و خطرات کم آتے ہیں، کیونکہ اپنی آواز جو کان میں آتی رہتی ہے قلب آسانی سے ادھر متوجہ رہ سکتا ہی، سو یہ فائدہ خفیف جہر سے بھی حاصل ہی۔

اسی طرح ضرب میں بھی قربت نہیں، اس میں بھی ایسی طبی حکمت ہے۔ وہ یہ کہ حرکتِ عنیفہ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور حرارت سے رقت، اور رقت سے تاثر اور تاثر معین ہوتا ہے

اطاعت اور محبت میں، جو مقاصد ہیں پس ضرب ذریعہ مقصود ہونے کی بنا پر مقصود بالغیر ہی
لیکن زیادہ ضرب سے قلب میں خفقان پیدا ہونے کا ڈر ہے، لہٰذا اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔
یہ تو اس کے متعلق تحقیق علمی تھی، ایک اور امر عمل اس میں قابلِ تنبیہ ہی کہ اکثر کتب فن
میں اس ذکر کے ساتھ گردن کو داہنے بائیں لے جانے کو لکھا ہے، سو جان لینا چاہئے کہ
پہلے لوگوں کے مزاج ودماغ قوی تھے اس کے تحمل ہوتے تھے بلکہ بوجہ قوت مزاج بدون
اس کے متاثر نہ ہوتے تھے، اس لئے ان کو اس کی ضرورت تھی اب خود ہی ضعف
غالب ہے، تھوڑے مشاغل سے قلب متاثر ہو سکتا ہے، اس لئے ایسا نہ کیا جائے، ورنہ
دماغ کے ماؤف ہونے کا اندیشہ ہے[1]"۔

عالم فارغ کے لئے اس دستور العمل میں جو مراقبہ تجویز فرمایا گیا ہے وہ مراقبۂ موت ہے۔ یعنے موت کے
بعد سے حساب وکتاب وغیرہ کے واقعات کا اس طرح تصور کرنا کہ گویا وہ ہم کو پیش آ رہے ہیں، اس کی بھی
حکمت وغایت یہ ہے کہ

"کثرتِ ذکر سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس مراقبہ سے دنیا کی نفرت پیدا ہو گی،
یہی حب وبغض اس کا کام بنا دینے کے لئے انشاء اللہ کافی ہوں گے"۔

"بس تقویٰ کا التزام اور یہ ذکر اور یہ مراقبہ کافی ہی، عمر بھر اس پر مداومت رکھئے تو
آخرت میں تو ثمرہ یقینی ہے، اور اصل وعدہ عطائے ثمرات کا آخرت ہی میں ہے، لیکن
دنیا میں بھی اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا تو اس کے قلب پر علوم عجیبہ ومعارف جن کے
باب میں مولانا کا ارشاد ہے۔ ؎

بینی اندر خود علومِ انبیا
بے کتاب وبے معید واوستا

اور واردات غریبہ ومواجیہ مثل ذوق شوق، محبت وانس وہیبت وانکشاف اسرار احکام
وحُسنِ معاملہ فیما بینہ وبین اللہ وغیرہ فائض ہوں گے، جن کی لذت کے سامنے ہفت اقلیم کی

---

[1] ص ۵۔ وص۱۱

سلطنت گرد ہے، اور یہ امور حالات کہلاتے ہیں۔۔۔۔ یہی علوم کشف دہمی کہلاتے ہیں۔

کشف کوئی نہ لذت میں اسکی گرد کو پہنچتا ہے، نہ قرب میں اس کو اس کا سا دخل ہے" ۱۲۔

اصل میں تو تقویٰ وطاعت کے اہتمام کے ساتھ منصوص و ماموں کثرت و دوام ذکر ہی کو کافی قرار دیا گیا ہے، لیکن بعضوں کو مدت تک ذکر کرنے کے باوجود حضور قلب ویکسوئی میسر نہیں ہوتی، ان کے لئے کسی مناسب شغل میں مضائقہ نہیں۔ مثلاً ایک سہل شغل انحد ہے، جسمیں کچھ لذیذ آواز سنائی دیتی ہے۔

"بلکہ بعض اوقات نہایت دلربا و دلفریب آوازیں پیدا ہوتی ہیں جو شاغل کو محو کردیتی ہے، اور محسوس ولذیذ چیز کی طرف متوجہ ہونے سے طبعًا دوسرے خطرات کم ہوجاتے ہیں، تو اس سے ذہن کو ایک طرف پوری توجہ کرنے کی عادت ہوجاتی ہے"

لیکن چونکہ شغل خود مقصود نہیں ہوتا، اس لئے جب یہ عادت ہوجاتی ہے، تو

"اس کو چھوڑ کر توجہ کی عادت کو حقیقی مقصود کی طرف پھیر دیتے ہیں جس کی طرف اولاً بوجہ اس کے غائب عن الحواس ہونے کے متوجہ ہونا مشکل ہوتا تھا"

ساتھ ہی اس سلسلہ میں ایک اور بڑے خطرناک دھوکے پر متنبہ فرمایا گیا ہے، کہ اس شغل میں جو آواز سنائی دیتی ہے، وہ

"نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی کوئی صفت ہے جیسا کہ بعضوں کو دھوکا ہوگیا ہے، بلکہ عالم غیب میں سے کسی مخلوق کی بھی کوئی صفت نہیں، صرف اس کے دماغ میں ہوا بند ہوکر متموج ہونے لگتی ہے"

اشغال وغیرہ کے اس قسم کے آثار کو جو محض اپنے دماغ ہی کے آفریدہ تخیلات ہوتے ہیں جاہل صوفیہ یا اشراقیہ خدا جانے کیا کیا سمجھنے لگتے ہیں کہ عالم غیب کے اسرار ان پر کھل گئے ہیں اور انھیں مقصود بلکہ معبود بنا دیتے ہیں۔

"حالانکہ جس طرح اس آواز کا محل دماغ ہے اسی طرح کبھی دوسرے اشغال یا اذکار میں بھی مختلف الوان کے انوار جو نظر آنے لگتے ہیں، وہ اکثر اپنے ہی دماغ کی صورتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ غیر شاغل بھی اگر اسی طرح آنکھیں بند کرکے دیکھے تو بعض اوقات اس کو بھی مختلف رنگ نظر آیا کرتے ہیں اس سے کبھی دھوکا نہ کھائے، نہ ان چیزوں کی طرف التفات کرے، بلکہ اگر واقعی عالم غیب کی چیزوں کا کشف ہونے لگے جیسا کہ کبھی کبھی یکسوئی میں ہو بھی جاتا ہے

تب بھی ہرگز ادھر متوجہ نہ ہو، نہ اس سے لذت حاصل کرے، خواہ وہ مکشوفات ناسوتی کے ہوں یا ملکوت کے۔ لیکن ہیں سب غیر مطلوب حتیٰ کہ حسب ارشاد حضرت مرشد (حاجی امداد اللہ) علیہ الرحمۃ حجاب ظلماتی سے حجاب نورانی اشد ہے۔ طالب کو انکی نفی کرنا اور اس مضمون پر نظر رکھنا چاہئے۔ ع

عشق آں شعلہ ست چوں بر فروخت	ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند	در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت	مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

ص ۱۴

یہی نہیں کہ اشغال و مراقبات تصوف کے مقاصد نہیں، بلکہ چونکہ محض تدابیر ہیں اس لئے جن اشغال و مراقبات میں مضرت کا احتمال ہے، ان کو سرے سے عوام کیا خواص کے لئے ممنوع و متروک قرار دیا ہے۔ مثلاً

"اشغال میں شغل رابطہ و تصور شیخ اور مراقبات میں مراقبۂ وحدۃ الوجود بوجہ اس کے کہ اکثر خواص کو بھی مضر ہوتا ہے، متروک ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ فی الخمر والمیسر اذ کانا حلالین اِثمھما اکبر من نفعھما" ص ۱۵

تجدید تصوف کے دو اصل اصول

باقی حضرت کے تجدیدی و اصلاحی تصوف کی اصل الاصول دو ہی باتیں ہیں جن سے "بچنے کا ہر وقت اہتمام ضروری ہے"، ایک غفلت جس کا علاج ذکر ہے، جس کا اوپر بیان ہوا۔ دوسرے معصیت" البتہ معاصی میں چونکہ عام دیندار اور علمائے ظاہر زیادہ تر کبائر اور وہ بھی جوارح کے معاصی ہی کو معاصی خیال کرتے ہیں۔ صغائر اور قلب یا باطن کے معاصی کی بالکل چنداں پروا نہیں کرتے۔ اور صوفی کا خاص مقام احسان و حضور ہے، وہ صغائر و کبائر ظاہر و باطن ہر حال میں اور ہر جگہ حق تعالیٰ کو حاظر و ناظر رائی و مرئی مشاہدہ کرتا ہے۔ اسلئے معصیت صغیرہ ہو یا کبیرہ، قلب سے ہو یا زبان سے، یا ہاتھ پاؤں آنکھ کان سے، سب سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

"غفلت سے قلب کی نورانیت برباد ہو جاتی ہے، اور معصیت سے علاوہ نور قلب فوت ہونے کے مقبولیت عنداللہ بھی زائل ہو جاتی ہے، اور یہ بڑا خسارہ ہے"۔

لہٰذا اس کے اہتمام کی بہت زیادہ تاکید فرمائی گئی ہے کہ

"اگر احیاناً غفلت سے یا نفس کی شرارت سے کوئی قولی یا فعلی معصیت سرزد ہوجائے فوراً نہایت ندامت و عاجزی سے استغفار و توبہ کرے، بالخصوص بعض معاصی خصوصیت سے زیادہ مضر ہیں اُن سے بچنے کا اور زیادہ اہتمام رکھے۔ ایک[1] ریا، دوسرے[2] کبر، اور اسی سے لگا ہے تفاخر و کبر پیدا ہوتا ہے خواہ کمال دنیوی پر ہو یا کمال دینی پر، تیسرے[3] زبان سے کسی کی غیبت و شکایت یا کسی پر طعن و اعتراض، بلکہ اکثر فضول کلام بھی نورانیت قلب کو مضر ہوتا ہے اس لئے طالب حق کو لوگوں سے زیادہ میل جول نہ کرنا چاہئے، مگر بہ ضرورت۔ چوتھے[4] محل نامشروع میں رغبت و شہوت سے کسی کی طرف توجہ کرنا، خواہ آنکھ سے یا دل کے خیال سے۔ پانچویں[5] بیجا یا اعتدال سے زیادہ غصہ کرنا، یا بدخلقی و سختی کے ساتھ پیش آنا" صفحہ ۲۵

خالی اشغال و مراقبات کو تصوف اور مقصود تصوف سمجھنے والے صوفیہ اور محض ظاہری اور بڑے بڑے گناہوں کو گناہ سمجھنے والے "دیندار" علماء اور ارباب دعویٰ دونوں کا حال پیش نظر رکھ کر پھر ایک مرتبہ اوپر کی سطریں پڑھو تو معلوم ہوگا کہ تصوف کے معتقد و منکر دونوں نے نہ طریقت کو سمجھا نہ شریعت کو۔

نسبت باطن جس کو اس کے دعویداروں نے ایسا چھپایا کہ خود ان سے بھی چھپ گئی، اسکی حقیقت و علامت بھی سُن لیجئے کہ یہ ذکر و طاعت کے کمال کے سوا کچھ نہیں۔

"نسبت باطن کے حصول کی علامت دو[2] امر ہیں۔ ایک یہ کہ ذکر اور یادداشت کا ملکہ ایسا ہو جائے کہ کسی وقت غفلت و ذہول نہ ہو اور اس میں زیادہ تکلف نہ کرنا پڑے۔ دوسرے یہ کہ اطاعتِ حق یعنی اتباع احکام شرعیہ کی عبادات و معاملات، اقوال و افعال اور اخلاق میں ایسی رغبت اور منہیات سے ایسی نفرت ہو جاوے جیسی کہ مرغوبات و مکروہات طبعیہ کی ہوتی ہے، اور دنیا کی حرص قلب سے نکل جائے (کان خلقہ القرآن) اسکی شان بن جائے۔ البتہ عارضی کسل یا وسوسہ جس کے مقتضیٰ پر عمل نہ ہو اس رغبت و نفرت کے منافی نہیں"۔

لیکن خالی ملکۂ یادداشت بھی نسبت کا اصلی جزو نہیں، یہ ملکہ تو معصیت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے۔ اس لئے

اصل چیز حق تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی رضا ہے، رضا بھی وہ معتبر ہے جو جانبین سے ہو۔ یعنے صرف ہم ہی خدا سے راضی نہ ہوں، بلکہ خدا بھی ہم سے راضی ہو، جس کا ذریعہ ظاہر ہے کہ اطاعت و فرمانبرداری ہی ہو سکتا ہے۔ ارشاد ہے، کہ

"آج کل لوگ ملکۂ یادداشت کو نسبت سمجھتے ہیں جو صرف ذاکر کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے، اور جو معصیت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتی ہے۔ حالانکہ نسبتِ مطلوبہ نام ہے اس لگاؤ اور تعلق کا جو جانبین سے ہو یعنی عبد کی طرف سے حق تعالیٰ کے ساتھ اطاعت و ذکر کا تعلق اور حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے ساتھ رضا کا تعلق، یہ ہے نسبتِ مطلوبہ[1]

کسی طالب کے استفسار پر نسبت کی حقیقت یہ تحریر فرمائی، کہ

"نسبت کے لغوی معنی ہیں لگاؤ اور تعلق کے اور اصطلاحی معنی ہیں بندہ کا حق تعالیٰ سے خاص قسم کا تعلق یعنی اطاعت اور ذکر غالب کا، اور حق تعالیٰ کا بندہ سے خاص قسم کا تعلق یعنی قبول و رضا، جیسا کہ عاشق مطیع اور وفادار معشوق میں ہوتا ہے۔ جب نسبت کے یہ معنی معلوم ہو گئے تو ظاہر ہو گیا کہ فاسق و کافر صاحبِ نسبت نہیں ہو سکتا۔ بعضے لوگ غلطی سے نسبت کے معنی خاص کیفیات کے سمجھتے ہیں جو ریاضت و مجاہدہ کا ثمرہ ہوتی ہیں، مگر یہ اصطلاح جہلا کی ہوتی ہے[2]۔

ایک بے معنی بات یہ مشہور ہو گئی ہے کہ نسبت سلب کر لی جا سکتی ہے۔ اس کے متعلق ایک ملفوظ میں ہے، کہ

"ایک کام کی بات یاد آئی، یہ جو مشہور ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں بزرگ کی نسبت سلب کر لی حضرت مولانا رشید احمد صاحب (گنگوہی) نے فرمایا کہ نسبت قربِ الٰہی کا نام ہے، اس کو کوئی سلب نہیں کر سکتا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو چیز حق تعالیٰ بندہ کو عطا فرمائیں دوسرا کون ہے جو اس کو سلب کر لے، حقیقت اس سلب کی صرف یہ ہے کہ کسی تصرف سے کسی کیفیت نفسانیہ کو مضمحل کر دے جس سے نشاط کی جگہ غباوت ہو جاوے۔ مگر اس کا وہ مقابلہ کر سکتا ہے لیکن اگر مقابلہ نہ کیا تو عمل میں خلل پڑنے سے اس کا اثر نسبت تک پہنچ سکتا ہے"۔

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص۲۔ [2] اشرف السوانح حصہ دوم ص۱۵۲

خیر الامم!

(از جناب عبد الحمید صاحب بی، اے)

ذیل کا مقالہ اگرچہ ایک تخیلی کاوش ہے مگر سراسر حقیقت اور حقیقت نما ہے ——— مدیر

ایک رات عالمِ خواب میں جب تخیل حرص و ہوا کی بندھنوں سے کسی حد تک آزاد ہوتا ہے، میرا اور شبیر[1] صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ جن کو طیارۂ شوق خیر الامم کی تلاش میں چاند کی دنیا سے یہاں لے آیا تھا۔ یہ صاحب اسی کوششِ ناتمام میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ گذار چکے تھے، مگر انھیں، اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی جستجوئے ناکام کا فسانہ مجھے سنایا کہ کس طرح انھوں نے ہر سیارہ کے رہنے والوں میں ایسی امت کی جستجو کی ہے جس میں تمام وہ صفات موجود ہوں جو متمدن اور مہذب کہلانے کے لئے ضروری ہیں، مگر ان کو پے در پے مایوسی کا شکار ہونا پڑا، اور ہمیشہ ترقی یافتہ اور شائستہ اقوام کے بھیس میں آدم نما بھیڑیوں کے غول ملے۔

میں ان ستم ظریف حضرت کی طبیعت سے تناسا نہ تھا بظاہر نہایت سیدھے سادے مردِ معقول معلوم ہوتے تھے۔ میں نے بغیر انجام کو سوچے اُن سے کہا، شاید آپ کو بدقسمتی سے صحیح معنوں میں شائستہ قومیں نہیں ملیں، لیکن ہمارے اس کرۂ ارض پر ان کی کمی نہیں، ایک نہیں کئی ایسی قوموں سے آپ آشنا ہو سکتے ہیں جن میں خیالات و نظریات کے اختلاف کے باوجود تہذیب کی گوناگوں خوبیاں ہیں، وہ مسکرائے اور راضی ہو گئے، اور میں نے حماقت یہ کی کہ ان کی رہنمائی کا فرض اپنے ذمے لے لیا۔ میں نے سوچا کہ شبیر صاحب کو ادھر اُدھر کیوں پھرایا جائے، کیوں نہ انھیں سب سے پہلے ایسی قوم میں لیجایا جائے جو اس وقت کی متمدن قوموں کی امام ہے۔ چنانچہ میں انھیں ہوا کے دوش پر سوار کر کے "جدید دنیا[2]"

---

[1] یہ صاحب میسکر نہایت ہی عزیز دوست ہیں۔ [2] یعنی امریکہ۔

میں لے گیا۔ دوران سفر میں شبیر صاحب میرے طوفانِ تکلم میں برابر گرفتار رہے۔ میں انھیں یہ بتاتا رہا کہ کس طرح یہ ملک کبھی وحشی حبشیوں کا مسکن تھا، تہذیب کے نام تک سے یہ لوگ نا آشنا تھے، لیکن جس روز سے سفید فام یہاں آباد ہوئے، تاریکی کافور ہوگئی ہے، ملک نے دن دُوگنی رات چوگنی ترقی کی ہے، یہاں ہر شخص آزادی کی فضا میں سانس لیتا ہے، یہاں ہر ایک کے حقوق دوسرے سے مساوی ہیں، یہاں ہر شخص کو ترقی کرنے کے مواقع برابر میسر ہیں، سائنس کی ہوش ربا ایجادات میں جس کا ایک کرشمہ یہ طیارہ ہے جس میں میں اور آپ جا رہے ہیں، یہ ملک سب پر بازی لے گیا ہے —— شبیر صاحب میری باتوں کو نہایت ہی طمانیت اور یکسوئی سے سُن رہے تھے، اور میرے پیش کردہ وجوہِ ترقی کو غالباً حقیقت کے آئینہ میں دیکھ رہے تھے۔ میں برابر اس کوشش میں تھا کہ وہ وہاں جانے سے پیشتر ہی اس ملک اور قوم سے مرعوب ہو جائیں، اور حقائق سے دوچار ہونے سے پہلے ہی میرے دعویٰ کا اعتبار کرلیں۔

جس رفتار سے صبح تباشیر اڑاتی آئی اُسی سرعت کے ساتھ ہم وہاں پہنچے۔ ملک کا دل مشینوں سے دھڑک رہا تھا، گاڑیاں رگوں کے خون کی طرح ہر دم رواں دواں تھیں، ہر قدم پر چہل پہل نظر آتی تھی، ہر شخص دولت کی پیدائش میں مصروف تھا۔ عورت گھر کی چار دیواری میں محصور نہیں تھی وہ زندگی کے ہر میدان میں مرد کی مدِ مقابل تھی، اور اس کے علاوہ اس کے حُسن و جمال کا افسوں غیر محسوس طریقے سے انسان کو مسحور و مجبور کر رہا تھا۔ لوگوں کا ہر کام میں شغف و انہماک یہ بتا رہا تھا کہ وہ موجودہ حالات پر قانع نہیں ہیں، ان کا لبِ تشنگی اس سے زیادہ سیرابی کے سامان ڈھونڈھنا چاہتا تھا۔ وہ مضطرب نظر آتے تھے کہ کل کا دور لب ریز ہو یا نہ ہو، مگر آج کا جام کیوں خالی رہ جائے۔ میں نے شبیر صاحب سے کہا دیکھئے یہاں کتنی آزادی ہے، جو جس قدر چاہے اور جس طرح چاہے کمائے اور خرچ کرے۔ وہ اس معاملہ میں بالکل مختار ہے، کوئی رکاوٹ بھی اس کی راہ نہیں روک سکتی۔ اس مسابقت اور رقابت نے لوگوں کے مندِ شوق پر تازیانہ کا کام کیا ہے۔ طریقۂ پیدائش کی نئی نئی گرہیں کھل رہی ہیں۔ ایجادات کی دنیا میں ہر آن محیر العقول ترقی ہو رہی ہے۔ یہی وہ انسان ہیں جنھوں نے زمین کے کلیجے کو چاک کر کے اس میں حیرت انگیز فراوانی کے ساتھ اناج اُگایا، زمین کی گہرائیوں میں اتر کر معاون کو ڈھونڈا اور پھر اس کو استعمال کیا۔ انسان کے ہوا میں اُڑنے، سمندر کے اندر جانے، بجلی کو قابو میں کرنے، ہوا کے تموج اور ذرات کو اپنے نامہ و پیام کا ایلچی بنانے اور خود بخود بجنے والے باجوں اور ہوش ربا سرعت سے

پہ چلنے والی سواریوں کے جو کرشمے آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں وہ اس آزادی اور مسابقت کے نتائج ہیں۔ اس دولت کی زیادتی سے آرٹ میں ترقی ہوئی ہے، فنونِ لطیفہ کو کمال حاصل ہوا ہے، انسان کے جمالیاتی ذوق کو ہر قسم کی تسکین کا سامان ملا ہے۔ شبیر صاحب! دیکھئے تو سہی کہ اس آزادی نے سازندوں اور آلاتِ موسیقی تیار کرنے والوں کی کتنی کثیر فوج تیار کر رکھی ہے، لوگوں کے لئے کتنی قیمتی تفریحات میسر ہوئی ہیں۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں، داستان گوؤں، مصوروں اور نقاشوں کی قابلیت سے دنیا اور اہلِ دنیا کتنے مستفید ہوئے ہیں، کیا چاند کے مکیں بھی اس نعمت سے آشنا ہیں؟ شبیر صاحب دنیا کے مصائب نے اس زندگی کو دار العذاب بنا رکھا تھا، لیکن آج شراب پی کر غم غلط کر لیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کام کی تھکن کو دور کرنے کے لئے مسکرات اور مخدرات یعنی کوکین، افیون وغیرہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے مادی سرمایہ کو بھی نہایت ہی بہتر طریق پر صرف کیا۔ یہ محلات، یہ کوٹھیاں، یہ تفریح گاہیں، یہ ناچ گھر سب اسی آزادی کا نتیجہ ہیں۔ اور برادرم! یہ عیش اس دنیاوی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ مرنے کے بعد ایکڑوں زمین میں اور عالیشان عمارتوں میں ان لوگوں کو آرام ملتا ہے۔ ہمارے آباواجداد ان زیوروں، نفیس لباسوں، اعلیٰ درجہ کے آلات و ظروف، زینت و آرائش کے سامانوں کے نام تک سے ناواقف تھے، لیکن آج ایک ایک دیوار زبانِ حال سے انسانی ذوقِ جمال کی شہادت دیتی ہے۔ انسانوں کا تو ذکر ہی کیا، یہاں کے کتوں کو بھی مخمل کے گدے اور سونے کے پٹے میسر ہیں، کیا چشمِ فلک نے کبھی خواب میں بھی یہ ترقیاں اس سے پہلے دیکھی تھیں؟ درحقیقت اے میرے چاند کے مکیں! اس ساری کامیابی کی علت صرف ایک ہی ہے کہ ہم سے پہلے لوگ اپنی جد و جہد کا محرک ایک خیالی زندگی سمجھتے تھے۔ ان کا ایقان تھا کہ اس زندگی کے بعد ایک ابدی زندگی آنے والی ہے جس میں انسان کے نیک اعمال کی جزا اور مذموم افعال کی سزا ملے گی۔ اس عقیدے نے ان کے فکر و عمل کا رُخ بالکل بدل رکھا تھا۔ انسان نے جس دن سے اس توہم پرستی سے آزادی حاصل کی ہے، تہذیب و شائستگی نے اسی روز سے اس کی قدم بوسی کی ہے۔ شبیر صاحب! کاش ہمارے آباواجداد بھی اس حقیقت کو جانتے، اور ان دنیاوی فوائد و لذائذ کو نظر انداز نہ کرتے۔ محترم رفیق! آج ان مہذب لوگوں کے پیشِ نظر سب سے بڑا اصول انسانی راحت کا حصول ہے، ہر وہ طریق جس سے دنیا کے عیش و آرام میں اضافہ ہو سکتا ہے حق ہے، اور ہر وہ رویہ جو اس میں کمی کا باعث بنتا ہے باطل ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ

اس مادی ارتقاء کے ساتھ ساتھ رُوح کو بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا ہے بلکہ جائز روحانی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ یہ سر بفلک خوبصورت عمارتیں جو آپ کو نظر آرہی ہیں یہ سب عبادت گاہیں ہیں، ان کے اندر خداوند تعالیٰ کی پرستش بھی ہوتی ہے اور ہفتہ میں ایک دن بہت سے انسان اپنی جبینِ نیاز ان معابد میں آکر اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے بھی جھکاتے ہیں، لیکن یہ یاد رہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کی طرح مذہب کو دنیا کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ یہاں پر الجھن عقل کے ناخنِ تدبیر سے سلجھتی ہے۔ ہر کام میں عقل ہی مشعلِ ہدایت بن کر سامنے آتی ہے۔ ان لوگوں نے نہایت دیانتداری سے خدا کا حصہ خدا کو دے دیا ہے، اور سیزر کا حصہ اس کے حوالے کر دیا ہے۔ مذہب کو اپنی جائز حدود میں مقید کر دیا گیا ہے۔ یہ اب ایک پرائیوٹ رشتہ ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان دراصل یہی وہ بابرکت دور ہے جس میں انسان کو بالاتر خدا کی بادشاہی سے بھی آزادی میسر آئی ہے، اور اب عوام کی حاکمیت کا دور دورہ ہے۔ یہ لوگ اپنی مرضی کے مختارِ کل ہیں۔ ان کی مجموعی خواہش کو پابند کرنے والی اب کوئی چیز نہیں۔ اخلاق ہو یا تمدن، معاشرت ہو یا سیاست، ہر چیز کیلئے برحق اصول وہ ہیں جو قومی خواہش سے طے ہوں، اور جن اصولوں کو قوم کی رائے عام رد کر دے وہ باطل ہیں قانون قوم کی مرضی پر منحصر ہے، قوم جو قانون چاہے بنائے اور جس قانون کو چاہے بدلے، حکومت قوم کی رضا کے تابع ہے۔ دیکھئے اس قوم کا دائرۂ اختیار اب کتنا وسیع ہو گیا ہے، انسانیت نے اپنے ہاتھ میں کتنے غیر محدود اختیارات لے لئے ہیں۔ انسانیت کی اس قدر سربلندی یقیناً قابلِ رشک ہے کیا وہاں چاند میں بھی انسان کا یہی حال ہے؟ اس تہذیب نے یہاں کے بسنے والوں کو بنیان مرصوص بنا رکھا ہے اور سب مل کر ترقی کی منازل طے کئے جا رہے ہیں یہ "سامانی بم" جس کا غلغلہ شاید آپ نے آسمانوں میں بھی سنا ہو، اسی تگ و دو کا نتیجہ ہے۔ آج سے چند سال بیشتر ایک ظالم قوم دنیا کے حسین دامن پر برقِ خاطف بن کے گری، مگر اس مہذب قوم کو یہ ظلم و ستم کب گوارا تھا، اس نے ایک بم گرا کر اس کا نشہ ہرن کر دیا اور اس بم کی اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ چشم زدن میں لاکھوں انسانوں کے چیتھڑے اُڑ گئے اور سیکڑوں میل تک آبادیاں کھنڈر بلکہ راکھ کا ڈھیر بن گئیں، ظالم قوم کو اپنی ناعاقبت اندیشی کا نہایت ہی تلخ مزا چکھنا پڑا۔

شبیر صاحب نے نہایت ہی شفقت سے پوچھا تو کیا یہ ظلم دفن ہو گیا ہے؟ میں نے کہا، کیوں نہیں!

اب کوئی یہ امن سوز جرأت نہیں کرے گا۔ انھوں نے کہا، اگر ظلم مٹ گیا ہے تو اب یہ سیلماتی قوت کیوں اکھٹی کی جا رہی ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دل کا چور ابھی نہیں نکلا۔ تشدد کی آندھی تلی کھڑی ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ دنیاوی فوائد و لذائذ تو باہم ایک دوسرے سے متحارب رہیں مگر ان کے حاصل کرنے والے ایک دوسرے سے دست و گریباں نہ ہوں۔ فرمانے لگے طاقت و لذت کی اس ہوس اور کبھی نہ ختم ہونے والی بھوک کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر گروہ سامانِ جنگ کی تیاری میں دیوانہ وار منہمک اور مصروف ہے۔ یہ ایک ایسی بین حقیقت ہے جو کسی دلیل کی محتاج نہیں، ہم چاند کے رہنے والے جو کوئی منطق نہیں جانتے، کسی فلسفہ کا علم نہیں رکھتے، وہ بھی اس کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اے میرے بھائی! یاد رکھو، تم جو اس قوم کو مہذب کہتے ہو اس کی تہذیب پسندی اس ڈاکو کی سی شرافت ہے جو اپنا قدیم پیشہ ترک کر چکا ہو، اور اپنے سابقہ مالِ غنیمت سے عزت و جاہ حاصل کر چکا ہو، وہ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو اس کے قدیم پیشہ کو اختیار کرنا چاہتے ہیں، اور دولت میں اس کے شریک بننے کے آرزو مند ہیں۔ یہ لوگ ہر کام کرنے کے لئے تیار ہیں جس سے ان کی ذاتی غرض وابستہ ہو۔ قومی مفاد کے تحفظ کے لئے جو عدیم المثال قربانیاں دی جاتی ہیں، ان کے اندر بھی ذاتی غرض ہی پوشیدہ ہوتی ہے ـــــ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے شبیر صاحب نے باآواز بلند کہا، کہ اس کے ثبوت کے لئے ایک نہیں بے شمار واقعات یہاں دیکھنے میں آئے ہیں۔ افسوس! اس تہذیب کی ظاہری ٹیپ ٹاپ نے آپ کی نظروں کو خیرہ کر دیا ہے۔ میں جب حقیقت کے پردوں سے جھانک کر دیکھتا ہوں تو مجھے اس غازۂ تہذیب کے پیچھے حرص و ہوس اور خود غرضی ہی نظر آتی ہے۔ کیا فورڈ اپنی ساری دولت و ثروت کے باوجود انتہائی حریص، بخیل، خود غرض اور بد اندیش اور نفس پرست نہیں ہے ــــ شبیر صاحب کی اس تیز کلامی سے میں جھلا سا گیا، مگر ان کے جذبات کے دھارے کو روکنا میرے لئے مشکل تھا۔ تاہم میں نے ان کی گفتگو کی لہروں میں الفاظ کے یہ چند خس و خاشاک چھوڑ ہی دیئے، کہ وہ حریص و بخیل کس طرح ہے، اس نے جو دولت کمائی ہے خرچ بھی کی ہے۔ شبیر صاحب نے ذرا غصہ سے کہا، اس نے اپنے ذاتی آرام و آسائش کے علاوہ کسی اور پر ایک کوڑی تک بھی خرچ کی ہے؟ اگر کچھ روپیہ صرف بھی کیا ہے تو ایک "تاجرانہ نقطۂ" نظر سے، جس طرح ایک ہوشیار تاجر منڈی میں خام مال خرید کر اس پر کچھ رقم لگا کر اس سے دُگنے اور تگنے دام حاصل کرتا ہے، بالکل اس طرح یہاں کے دولت مند غریب عوام پر

اگر کچھ خرچ بھی کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ان سے مزید خون نکالا جا سکے۔ کیا تم اس قوم کو مہذب کہتے ہو جس میں تھوڑے آرام، آسائش، لطف تفریح اور خوش باشی کی زندگی بسر کر رہے ہوں، اور دوسرے نانِ جویں تک کے لئے سسکیاں لیں۔ یہ ظالم اپنی لذتوں کی خاطر غربا کو فاقہ کشی اور خستہ حالی میں مرنے دے رہے ہیں۔ ان کی تنگ نظری یہ نہیں دیکھتی کہ اس رویہ کی وجہ سے انسانی جماعت کے بہت سے افراد جرائم پیشہ بن رہے ہیں۔ جہالت اور دنائتِ اخلاق میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ جسمانی کمزوری اور امراض کا شکار ہو رہے ہیں۔ آج ان عالیشان عمارتوں کے گرد و نواح میں ایسے ایک نہیں ہزاروں، بلکہ لاکھوں کروڑوں انسان موجود ہیں جن کو سر چھپانے کے لئے ایک کٹیا بھی میسر نہیں۔ ان دیبا و حریر میں ملبوس لاشوں کے عین پہلو میں ایسے بھی ہیں جن کے پاس برہنگی تک کو چھپانے کیلئے کوئی کپڑا نہیں، ان کے کتوں تک کو جو مخمل کے گدے اور سونے کے پٹے میسر آتے ہیں وہ صرف غربا کی کھالوں سے ہی بنتے ہیں، ان کی برق رفتار کاروں میں جو تیل جلتا ہے وہ دراصل عوام کا خون ہوتا ہے، پھر اگر یہ غریب ان کے اس ظلم کے خلاف اور اپنے جائز حق کے مطالبے کے لئے کوئی آواز بھی اٹھائیں تو گولیوں کی بوچھار ان کے سینوں کو چھلنی کر کے ان سے جذبات کی بھاپ خارج کر دیتی ہے، اور کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، کیونکہ عنانِ قانون ان شائستہ ڈاکوؤں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ گندم کے جہاز جو ہم نے ساحلِ سمندر پر دیکھے، کیا اس لئے باہر جا رہے ہیں کہ یہاں ان کی مانگ نہیں ہے، نہیں! ایسا نہیں، یہاں یقیناً ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے ہیں جو شب بھوک سے تڑپ تڑپ کر گذار دیتے ہیں ان کے فاقہ کش بچوں کی سینہ شگاف آہیں ان کی اذیت میں ناقابلِ برداشت اضافہ کرتی ہیں، دراصل وہ جیتے نہیں بلکہ محض سانس لیتے ہیں، اور ان کی ہر سانس میں سے ایک ٹھنڈی آہ نکلتی ہے، انکے سینے مایوسیوں کے مدفن ہیں، وہ ضرورت مند ہونے کے باوجود اپنے ملک کی فاضل اشیاء کو خریدنے کی قوت نہیں رکھتے۔ ان کے سامنے کھڑی فصلیں جلا دی جاتی ہیں، مبادا کہیں قیمت گر جائے اور وہ بیچارے پیٹ بھر کھانا کھا سکیں۔ اس کے برعکس ضرورت سے زیادہ مال رکھنے والے اس فکر میں مضطرب رہتے ہیں کہ جتنی آمدنی ہو اس میں سے ایک حصہ پس انداز کر کے نفع آور کاموں میں لگائیں۔ یہ چکر جب چلتا رہتا ہے تو لامحالہ مختلف قوموں کو اس مال کی کھپت کے لئے منڈیوں کی تلاش لاحق ہوتی ہے، پھر ہر قوم اسے سستے سے سستے داموں بیچنا چاہتی ہے، تاکہ منڈی میں اس کی قیمت کم سے کم ہو، اس غرض سے

کارکنوں کے معاوضے بہت کم رکھے جاتے ہیں، اوران ظالموں کی ہوس دہوا کی بھینٹ وراصل غریب ہی چڑھتے ہیں۔ اس عالمگیر محاربہ میں بینکروں، آڑھتیوں، اورصنعت وتجارت کے اجارہ داروں کی ایک مٹھی بھر جماعت تمام دنیا کے معاشی اسباب ووسائل پر اس طرح حاوی ہو جاتی ہے کہ ساری نوعِ انسانی ان کے مقابلہ میں بالکل بے بس ہوتی ہے، اور پھر یہ گروہ اپنی انانیت وتکبر میں کمزور قوموں کو ہضم کرنے کے لئے اپنی قوم کا واسطہ دے کر انھیں لڑنے مرنے پر ابھارتا ہے۔ خطرہ دراصل اس ملک اور قوم کو نہیں ہوتا ہے بلکہ بڑوں کے مفاد کو ہوتا ہے۔ یہ ہزاروں بے بس انسان وطن اور قوم کی خاطر خون کے سمندر میں کود پڑتے ہیں، اور آگ سے کھیل جانے تک سے گریز نہیں کرتے کیونکہ زندگی کے بازار میں قوم کے چند عیار ذی رُوح انسانوں کی قیمت گرا کر بے جان دھاتوں اور جمادات کی قیمت بڑھا دیتے ہیں، جس کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیر سکوں کی یافت کے لئے قیمتی سے قیمتی جانیں تلف کردی جاتی ہیں، کوئی اخلاقی اصول بھی ان کی راہ نہیں روکتا، اور وہ بے لگام ہو کر جس طرح چاہتے ہیں قوم کے کمزور افراد کو لوٹتے اور لٹاتے ہیں۔ ملک کا قانون نہ صرف ان کو اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ الٹی ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ کیا یہی وہ تہذیب ہے جس سے آپ مجھے روشناس کرانا چاہتے ہیں، کیا یہی وہ خیرالامم ہے جس کی تلاش میں میں نے عمر گنوادی —— دیکھئے یہاں مساوات کا کتنا گھناؤنا تصور ہے، ایک شخص ہر حق سے محروم ہے، محض اس لئے کہ وہ قدرتی طور پر کالے رنگ کا ہے۔ کیا ابلیس کی یہ اختراع یہاں موجود نہیں۔ غور تو فرمائیے کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل رنگ یا جغرافیائی حدود پر ہے کس طرح انسانیت کے لئے موجبِ راحت ہو سکتا ہے۔ دنیا کے تمام انسان انسانیت کے لحاظ سے یکساں ہیں، مگر حیف ہے اس قوم پر کہ اس نے اس ملک کی معتد بہ جماعت کو جو اس کے پیٹ کی دوزخ کے لئے ایندھن اکٹھی کرتی ہے، آدمیت کے ابتدائی حقوق تک دینے سے انکار کر دیا ہے۔ خیرالامم کہلانے کی مستحق تو دراصل وہ ملت ہے جس کے تمدن کی بنیاد مساوات، آزادی، اور عدل کے اصولوں پر ہو۔ آپ چاہے اسے برا ہی مانیں، میں تو اسے نہایت جابر اور ظالم قوم خیال کرتا ہوں جس قوم کے چہرے پر استبداد اور عدوان کے شکن ہوں وہ مہذب نہیں کہلائی جا سکتی۔ مذہب جو حرص وہوا کے شعلوں کو سرد کرانے کا واحد ذریعہ ہے یہاں بے جان لاشہ ہے۔ آخر اس مذہب میں کیا سکت ہے، جو اپنے پیروں کو سوائے کلیسا کی پوجا پاٹ کے زندگی کے کسی میدان میں بھی دعوتِ عمل نہ دے سکے۔ یہ مذہب کی پیروی نہیں بلکہ اس سے استہزاء اور اسکی تضحیک ہے۔ رفیقِم! خدا کی یاد اور

یوم آخرت کا احساس کچھ بھی نہاں خانۂ دل میں موجود ہو تو یہ ناممکن ہے کہ ایک انسان جو کلیسا کے اندر انتہائی ایماندار، نیک، اور رحیم ہو، کلیسا سے باہر نکلتے ہی ان خوبیوں کو خیرباد کہہ دے اور کاروبارِ حیات میں پرلے درجے کا خائن، بدمعاش اور سنگدل ثابت ہو۔

شبیر صاحب کی یہ باتیں سن کر میں بہت گھبرا سا گیا، مگر میں نے سوچا کہ شائد اس قسم کی تہذیب کی وہ صحیح قدر نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے انھیں غربت کی ٹھوکروں نے پیدائشِ دولت اور تقسیمِ دولت کے نئے اشتراکی نظریہ کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہو، اور خدا کی پرستش اور کلیسا سے وابستگی جیسی مذہبی باتیں ان پر گراں گذرتی ہوں۔ اس لئے میں نے بہت صبر و ضبط سے کام لے کے اُن سے نہایت ہی نیازمندی سے عرض کیا۔ جناب! گھبرائیے نہیں! جس خاص قسم کی مساوات اور آزادی کی علمبردار سوسائٹی کے آپ متلاشی ہیں وہ بھی یہاں موجود ہے، اور آج کل تو عوام واقعی اسی کے زاویۂ نگاہ سے مسائلِ زندگی پر غور کرنے کے زیادہ عادی ہو رہے ہیں۔ جس طرح سماج کا تجزیہ آپ نے کیا ہے، وہ آج کل دُنیا میں بہت مقبول ہے، اور یہ تہذیب دنیا میں سیلاب کی طرح بڑھ رہی ہے۔ یہ الفاظ کہہ کر میں نے اُن کی ڈھارس بندھائی، اور پھر وہ میرے ساتھ چلنے لگے ——— سورج اپنے طلائی سکوں کو نچھاور کر کے عروسِ شام کو شفق کی پالکی میں بٹھا کر سرپٹ واپس لے جا رہا تھا۔ اس عروس کی جدائی پر لوگوں کی آنکھوں میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ اسی فضا میں ہم نے وہاں قدم رکھا۔ میرا دل اپنی ناکامی پر بیٹھ رہا تھا، مگر میرے چہرے پر ایک غیر فطری سی مسکراہٹ تھی، مگر یہ صرف ظاہرداری تھی جس سے میرے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیل رہا تھا، اور کھیل بھی صرف اس لئے رہا تھا کہ میرے دامنِ فتح مندی اور کامرانی پر ناکامی و نامرادی کا دھبہ نہ لگ جائے۔ شبیر صاحب ایک گہری سوچ میں پڑے رہے اور پھر سو گئے۔ میں نے تمام رات کروٹیں بدل بدل کر گذاری۔ صبح ہوئی تو ہم وہاں سیر کو نکلے۔ ہمارے ساتھ دو تنومند جوان ہو لئے۔ وہ ہماری ہر حرکت کو نہایت ہی مشکوک اور متجسسانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ شبیر صاحب نے پوچھا آخر ہم پر کڑی نگرانی کیوں کی جا رہی ہے۔ میں نے کہا کہ یہاں کے عوام سب سے زیادہ خوش حال ہیں، حکومت کو [illegible] ہے کہ کہیں کوئی غیر ملکی آکر انھیں سیدھے راستے سے بھٹکا نہ دے۔ اس لئے ہر غیر ملکی کی حرکت پر پہرہ بٹھایا جاتا ہے۔ میں نے کہا دیکھئے شبیر صاحب! یہاں دولت کی لامحدود پیدائش نہیں ہو سکتی، بلکہ یہاں ہر چیز ایک منصوبے کے تحت کی جاتی ہے۔ یہاں تمام وسائلِ ثروت سوسائٹی کے

درمیان مشترک ہیں اسلئے افراد کو فرداً فرداً ان پر مالکانہ قبضہ کرنے اور اپنے حسب منشا ان میں تصرف کرنے اور ان کے منافع سے متمتع ہونے کا کوئی حق نہیں۔ اشخاص کو جو کچھ ملے گا وہ محض ان خدمات کا معاوضہ ہوگا جو سوسائٹی کے مشترک مفاد کے لئے وہ انجام دیں گے۔ سوسائٹی پر فرض عائد ہوگا کہ وہ انکے لئے ضروریات زندگی فراہم کرے، اور وہ اس کے بدلہ میں کام کریں۔ اس طریقے سے سرمایہ دار غریب اور بے بس انسانوں کے گاڑھے پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو اپنے ذاتی آرام و آسائش کے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ یہاں کوئی شخص بیکار نہیں ہے۔ یہاں کوئی شخص بھوکا نہیں ہے۔ اگر تہذیب و تمدن سے مراد عوام کی یکساں خوشحالی اور بہتری ہے تو پھر یہی ملک درحقیقت مہذب اور متمدن کہلانے کا صحیح معنوں میں مستحق ہے۔ یہ ملک سرمایہ داروں کا خوانِ یغما نہیں، بلکہ مزدوروں کی جنت ہے۔ مذہب جو سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک کامیاب ہتکنڈہ رہا ہے، یہاں دفن کر دیا گیا ہے، اور خوش قسمتی سے اس کی متعفن لاش کی بدبو سے یہ ملک بالکل محفوظ ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ غریب انسانوں پر جس قدر ظلم و ستم کی قیامتیں ٹوٹ رہی ہیں سب مذہب کے وجود سے ہیں اور ان مصائب و آلام کا استیصال اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک لوگوں کے دلوں سے خدا کے وجود کا خیال مٹا نہ دیا جائے۔ دیکھئے موجودہ صدر کے پیش رو نے خدا کے تصور کی ابتدا کی وجہ کس حیرت انگیز قابلیت کے ساتھ بیان کی۔

> "سرمایہ داری کی غیر مرئی قوتوں نے ذہنِ انسانی میں ایک ڈر کی صورت پیدا کر دی ہے جس سے ایک حاکمِ اعلیٰ کے تخیل کی بنیاد پڑی اسے انسان نے خدا کے نام سے پکارنا شروع کر دیا، سو جب تک خدا کا تخیل ذہنِ انسانی سے فنا نہ ہو جائے، یہ لعنت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔ مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے، لہٰذا مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہر اشتراکی کے لئے ضروری ہے۔"

چنانچہ یہاں تمام ان قیود کو توڑ دیا گیا ہے جو کسی مابعد الطبعی عقیدہ کا نتیجہ ہیں۔ یہاں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ کے لئے جماعت کے مفاد کی جنگ کے تابع کر دیا گیا ہے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے خلاف مزدور کی تنظیم کی تائید میں استعمال کیا جائے عین اخلاق ہے۔ اور جو چیز اس مقدس جنگ کے راستہ میں مزاحم ہو وہ حرام و ناجائز ہے۔ پھر دیکھئے مذہب و اخلاق کی حدود و قیود کو پھاندنے کے بعد سب سے پہلے مرد و عورت کے جنسی تعلقات کو تمام بوسیدہ اغلال و سلاسل سے آزاد کیا گیا ہے، کیونکہ

خواہشاتِ نفسانی کو بلا قیود و پابندی فرد کرنا ہی عین منشائے فطرت ہے۔ اس کے لئے نہ ضمیر کی آواز کی پروا کرنی چاہئے اور نہ ہی خدا اور انسانوں کے وضع کردہ اصولوں سے خائف ہونا چاہئے۔ بادہ نوشی اور حرامکاری میں آخر کوئی ایسی معیوب بات تو نہیں ہے جس سے انسان خوامخواہ شرماتا پھرے۔ تند و تیز مے نوشی اور جذبات فحش کاری فطری جذبات ہیں۔ آخر شبیر صاحب جو چیز فطری ہو وہ ناجائز کیسے ہو سکتی ہے یہاں ابھی اشتمالیت کے طرز کی حکومت ہے، جو اپنی اصلی شکل میں نہیں ہے بلکہ یہ ارتقا کی پہلی کڑی ہی۔ اس لئے یہاں ابھی اتنی بندش ضرور ہے کہ جب کسی جوڑے کا جی چاہے کہ وہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہے، تو اسے اعداد و شمار کی سہولت اور قانون کی دیگر شقوں میں آسانی کی خاطر اتنا ضرور کرنا پڑتا ہے کہ وہ کسی مجسٹریٹ کے سامنے جا کر اپنے تعلقات کی اطلاع کر دیں۔ یہ محض ایک رسمی سی بات ہی ورنہ رجسٹری شدہ اور غیر رجسٹری شدہ میاں بیوی کی اولاد میں قانوناً و عرفاً کسی قسم کا امتیاز نہیں ہی، البتہ جو شادیاں مذہب کے دقیانوسی قواعد کے مطابق سرانجام پاتی ہیں حکومت انھیں قانوناً تسلیم نہیں کرتی۔ مذہب کے ساتھ یہاں منافقت نہیں برتی جاتی۔ جو چیز لوگوں کے لئے افیون ہے اس کا علانیہ یہاں سے استیصال کیا گیا ہے، اور زندگی کے ہر معاملہ کو خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھا اور جانچا گیا ہے۔ شبیر صاحب ان لوگوں کی یہ کتنی بڑی کامیابی ہے کہ انھوں نے عوام کو سرمایہ داروں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی۔ انسان کے فطری جذبات کی تسکین کے لئے راستہ کی ہر مزاحمت کو ہٹا دیا۔ اور زندگی کا ساز خالص عمرانی عدل کی تاروں پر چھیڑا، یہ دلکش آواز اب ہر صاحبِ دل کے اندر اترتی جا رہی ہے۔

شبیر صاحب کو میری باتیں سن کر یارائے ضبط نہ رہا، اور نہایت طنز آمیز لہجہ میں کہا کہ اس تہذیب کی انتہائی کامیابی یہ ہے کہ اس نے انسان کو خالص حیوان بنا دیا ہے۔ میں یہ بات سن کر دم بخود سا ہو گیا اور حیرت سے ان کے چہرے کی طرف تکنے لگا۔ ان کے جذبات پھر موجزن ہوئے اور گفتار کا ایک سیل بے پناہ امنڈ پڑا۔ میں اپنی ناکامی پر پشیمان اور وہ مجھ سے خفا ہو رہے تھے۔ اُن کی بلند آواز سے مجھے خطرہ لاحق تھا کہ کہیں سی آئی ڈی ان کی باتوں کو سن کر ہمیں گرفتار نہ کرا دے، مگر شدتِ جذبات کی وجہ سے وہ ہر خطرہ سے جانے بوجھے بے خطر ہو رہے تھے۔ انھوں نے کہا حمید! کیا تم اس قوم کو مہذب کہتے ہو؟ جس کا ابتدائی فلسفہ ہی انسانیت کے پورے کنبہ کو انتہائی بیوقوف اور خود غرض خیال کرتا ہے۔ اس تہذیب کا تو سنگ بنیاد ہی یہ ہے کہ انسان ایک ناقابل اصلاح جانور ہے، اور اگر اس کے ہاتھوں میں سرمایہ و وسائل کی طاقت

سونپ دی گئی تو وہ لازماً اسے اپنی نوعی برادری کو نقصان پہنچانے میں ہی استعمال کریگا۔ نفع پہنچانے اور خدمت و ایثار بلکہ عدل و انصاف سے کام لینے کی توقع اس سے قطعاً نہیں کی جاسکتی۔ ایسی حیوان سے انسان دشمنی سے بلند تر کسی اخلاق کی آس نہیں لگائی جاسکتی۔ یہ دو پاؤں پر چلنے والا حیوان، امانت میں خیانت کے بغیر کبھی نہیں رہ سکتا۔ اس بنا پر جانوروں کے اس غول کا علاج صرف ایک ہی ہے کہ اس سے ملکیت کا حق صلب کرلیا جائے اور اسے قانون ریاست کے اقتدار، سی، آئی، ڈی اور منصوبہ بندی کی زنجیروں میں جکڑ کے رکھا جائے، پھر اس کے ہر فرد کی ناک میں سٹیٹ کی نکیل ہو، تب کہیں یہ ممکن ہو کہ انسان انسان کے شر سے بچا رہے۔ یہاں کے انسانوں کی حیثیت، اگر آپ برا نہ مانیں تو دھوبی کے بیل، گاڑی بان کے گھوڑے، اور کمہار کے گدھے سے کسی صورت بھی بہتر نہیں، کہ دن کو مالک کے اشارہ ابرو پر محنت و مشقت کی، اور شام کو اپنا نپا تلا چارہ پیٹ میں بھر لیا۔ درحقیقت یہ انتہائی ذلیل کارروائی ہے جو آج تک آسمان کے نیچے کسی انسانی سوسائٹی کے ساتھ روا رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ افراد کو وسائل پیدائش سے محروم کر کے بالکل جماعت کے ہاتھ میں بے بس بنا دینا نہ صرف معیشت کے لئے تباہ کن ہے بلکہ زیادہ وسیع پیمانے پر انسان کی پوری تمدنی زندگی کے لئے مہلک ہے، کیونکہ یہ معاشی کاروبار اور نظام تمدن سے اس کی روح رواں اس کی اصلی قوت محرکہ کو نکال دیتی ہے۔ آپ کا تجربہ ہوگا کہ کسب و ہنر کے ملکات اپنی انتہائی وسعتوں کے ساتھ صرف اسی صورت میں رونما ہو سکتے ہیں جبتک کہ لوگوں میں کوئی جذبہ یا کشش موجود ہو۔ یہ چیز انسان کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ اپنی محنت کے حاصل کا خود مالک اور مختار ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مساعی کی پیداوار کو میری کہنا چاہتا ہے۔ "میں" اور "میرا" ہی وہ اسم سم ہے جس سے تمام مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں، اور ہر مشکل کا طلسمی باب خود بخود کھل جاتا ہے۔ کارگہ حیات میں جتنی جدوجہد، جس قدر تگ و دو ہے سب اسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ نبض حیات میں تموج ہے تو اسی کے دم سے ہے، اور نظام عالم کے عروق مردہ میں خون زندگی دوڑ رہا ہے تو اسی کی حرارت سے۔

پھر ان لوگوں کی عقلمندی ملاحظہ کیجئے کہ جس انسان کے متعلق اتنا گھناؤنا تصور ہے کہ اس کے ہاتھ میں معمولی حقوق ملکیت دے دینے بھی دراصل ظلم و تعدی کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ دے دینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے، اسی انسان کے ہاتھوں میں پوری قوم کے وسائل سونپ دیئے جاتے ہیں فلسفہ کی دنیا میں

یہ اعجوبہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار تو نہایت مبتلا ور جابر ہوں، مگر جب ریاست ان چھوٹے چھوٹے سانپوں کو نگل کر ایک بہت بڑا اژدہا بن جائے تو اس میں ہر نیکی حلول کر جائے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ انسان یہاں بالکل مشین بن کے رہ گیا ہے۔ جو ظالمانہ ذہنیت محدود پیمانہ پر ایک سرمایہ دار کی تھی، اس سے کہیں زیادہ جابرانہ ذہن کا یہ بڑا سرمایہ دار مالک ہے۔ یہاں بھی کوشش یہی کی جاتی ہے کہ غربا کا جس قدر خون چوسا جا سکے چوس لیا جائے۔ اس "معاشی عدل کی دنیا" میں غریب انسان کا یہ حال ہے کہ غلہ بونے اور غلہ کاٹنے والے کسان بھوکے مر رہے ہیں، حالانکہ حکومت کے برآمدی ذخائر اَٹے پڑے ہیں۔ اس منصوبہ بندی کا اعجاز یہ ہے کہ غیر ممالک کو بھیجنے کے لئے مکھن کی مقررہ مقدار پوری کرنے کے لئے گوالوں کے اپنے بچے دودھ کے ایک ایک قطرے کے لئے بلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسٹیٹ ایک بڑے اور مرکزی سرمایہ دار کی پوزیشن میں آنے کے بعد مجبور ہے کہ کم از کم صرف سے زیادہ آمدنی کے اصول پر عمل کرے۔

یاد رکھئے! جب انسان انسان کو صرف مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو لا محالہ اہمیت کے پلڑوں میں رُوح کے مقابلہ میں سکوں کا وزن ہی زیادہ نکلتا ہے ــــــــ حمید! تم نے ان دونوں تہذیبوں میں ایک بعد محسوس کیا ہے مگر یہ صرف تمھاری نظر کا دھوکہ ہے، حقیقت میں یہ دونوں ایک ہی زنجیر کے حلقے ہیں اور وہ زنجیر مادہ پرستی ہے۔

شبیر صاحب کا یہ وعظ سُن کر میں تاڑ گیا کہ یہ کوئی مذہبی آدمی معلوم ہوتے ہیں، اس لئے بار بار تحقیر کے ساتھ مادہ کا ذکر کر رہے ہیں اس لئے میں نے سوچا کہ انھیں کسی ایسی بستی میں لے جایا جائے جہاں لوگوں کو مادہ پرستی سے کوئی تعلق نہ ہو! اور جہاں صرف روحانی لوگ ہی رہتے ہوں۔ چنانچہ میں نے انھیں ایک اور سہارا دے کر سرگرمِ عمل کیا، اور وہ میرے ساتھ بادلِ نخواستہ ہو لئے۔ وہاں جا کر ہم نے دیکھا کہ ہر نفس ریاضت و عبادت میں مشغول ہے۔ کوئی ایک ٹانگ پر کھڑا نہایت ہی تفرع سے بارگاہِ ایزدی میں دعائیں مانگ رہا ہے! کوئی اس طرح سربسجود ہے کہ اس کی زندگی پر موت کا دھوکہ ہوتا ہے۔ کوئی چلّہ کھینچ رہا ہے، غرض سب کے سب اس بزمِ ہستی سے متنفر نظر آتے ہیں، اور اس فانی زندگی سے قطعاً بیزار اور کنارہ کش ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو ان مادی فوائد و لذائذ کی دلدل میں پھنسنے ہی نہیں دیا۔ شبیر صاحب کو میں نے اشارہ کر کے کہا کہ بہت سے بڑے اور بزرگ لوگوں کا خیال ہے کہ منشائے ایزدی یہی ہے کہ زندگی کو رنج و محن کا گھر سمجھ کر دنیا کی دلچسپیوں میں

ملوث نہ ہونے دیا جائے۔ وہ مسکرائے اور کہنے لگے کہ یہ منشاء خداوندی ہرگز نہیں ہے، بلکہ اُس مالکِ ارض و سموات کی یہ تو ناشکری ہے کہ اس نے انسان کو ہر نعمت سے مالا مال کیا۔ عقل و فہم، تدبر و شعور کی قوتیں عطا کیں، مگر اس انسان نے ان میں سے کسی سے بھی فائدہ نہ اٹھایا اور ایک راہبانہ زندگی اختیار کر لی۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کے سر پر اشرف المخلوقات کا تاج رکھ کر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ وہ اس رزم گاہِ حیات میں ایک متصرف اور فعال کی حیثیت سے شریک ہو، لیکن دیکھو ان لوگوں نے فرار کی راہ تلاش کی ہے اور خود میدان خالی کر کے قوت و طاقت چوروں اور راہزنوں کے ہاتھ میں دے دی ہے، آخر یہ زندگی ہے یا موت ——

کہنے لگے حمید صاحب! مجھے کوئی فعال انسانی زندگی دکھایئے۔ میں کھسیانا سا ہو گیا، کیونکہ میرے ترکش کے اندر جتنے تیر تھے اُن کو ایک ایک کر کے چلا چکا تھا مگر بدقسمتی سے کوئی بھی نشانہ پر نہ بیٹھا۔ میری پیشانی پر عرقِ ندامت ٹپک رہا تھا اور شبیر صاحب کی کڑوی کسیلی باتیں خاموشی سے سنتا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں ہمارا گذر ایک ایسی وادی سے ہوا جس سے میں اس سے پہلے قطعاً نا آشنا تھا۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا مگر آرام کی خواہش مجھے بادل ناخواستہ وہاں کھینچ لے گئی۔ میں اپنے خیالات میں مستغرق چلا جا رہا تھا۔ شبیر صاحب کی باتوں کا مجھ پر بہت اثر پڑ چکا تھا۔ انسان کی ناکامی مجھ پر شاق گذر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ انسان آخر کتنا بے نصیب ہے کہ اس نے قیامت خیز ہواؤں کو غلام اور تلاطم خیز سمندروں کو مسخر کر کے بھی فلاح نہیں پائی۔ دنیاوی آسائش کے ناقابلِ اندازہ سامان فراہم کر کے اور مادی ذرائع کو حیرت انگیز حد تک بڑھانے کے بعد بھی اسے آسودگی نہ ملی۔ پیدائش دولت کی کثرت ہوئی مگر بھوک، فاقہ، اور افلاس کا دیو برابر لوگوں کو نگل رہا ہے۔ قدرت کے سربستہ راز منکشف ہوئے لیکن انسانوں کی اکثریت علم سے محروم ہے۔ انسان کے کمندِ ہمت سے یہ دنیا تو درکنار دوسری دنیائیں بھی نہ بچ سکیں، مگر وہ اپنے نفس پر کوئی قابو نہ پا سکا۔ اس کی کوششوں کی وسعت ہفت افلاک تک پہنچ گئی مگر اس کی ہمدردی کا افق برابر تنگ ہوتا چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ دنیا جن سہاروں پر جی رہی ہے وہ نہایت ہی خطرناک اور مہلک ہیں۔ وہ یا تو انسان کے اعصاب پر صرف معدے کے تقاضے کو مسلط کر رہے ہیں، یا ان تقاضوں کو حرفِ غلط کی طرح میٹ دینے کے درپے ہیں۔ ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں میں بستی کے دل میں جا پہنچا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں "تہذیب" کا کوئی نشان نہیں، نہ وہاں کوئی سربفلک عمارت ہے، نہ سینما ہال، نہ فضول سامانِ تعیش کی بڑی بڑی دکانیں، عورتیں چلتی پھرتی دکھائی تو دیتی تھیں مگر ان کے جسم زرق برق پوشاکوں سے محروم تھے، اور میری

حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ اس ترقی کے دور میں بھی وہ اپنی نگاہیں نیچی کر کے گذر جاتی تھیں۔ حسن و نظر میں شرم و حیا کا ایک پردہ حائل تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے زمانہ نے مجھے گرد رہوار کی طرح بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے، اور میں ایک ایسی بستی میں سانس لے رہا ہوں جو عہدِ حاضر کی "ترقی" اور "شائستگی" کی ہر علامت سے عاری ہے۔ میں نے بڑھ کر ایک شخص سے استفسار کیا کہ یہاں کا حاکم کون ہے، وہ میری بات کو سمجھ نہ سکا۔ لہٰذا اس نے سوال کے اعادہ کے لئے کہا۔ میں نے سمجھا کہ یہ لوگ ناخواندہ ہیں اسلئے ہماری باتیں ان کے ذہن کی رسائی سے بالاتر ہیں۔ تاہم میں نے پھر یہی کہا۔ تھوڑی دیر تامل کے بعد اس نے مجھ سے بہ نظر استعجاب پوچھا کہ کیا انسان کا حاکم اس کے پیدا کرنے والے کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے وہ کہنے لگا کہ ہم سب کا حاکم خدا ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں، البتہ تقسیم کار کے طور پر ہم نے ایک شخص کو اپنا نگراں بنا رکھا ہے، اور ہم سب اس کے نگراں ہیں، ہم سب اپنے رب کے احکام کی پیروی کرتے ہیں اور اسی پیروی نے ہم سب کو باہم ایک دوسرے سے پیوست کر رکھا ہے۔ یہاں ساری وابستگی ان اصولوں سے ہے جو ہمیں خدا کے پیغمبروں کے ذریعے ملے ہیں۔ یہاں ادنیٰ، اعلیٰ، امیر، غریب، متمول اور مفلس میں کوئی امتیاز نہیں۔ فرق جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ان اصولوں کی کون سب سے زیادہ پیروی کرتا ہے۔ ہم دونوں اس کی یہی باتیں سنتے جا رہے تھے کہ ہم اچانک ایک جگہ پر جا پہنچے جہاں عدالت منعقد تھی، مگر وہاں کوئی وکیل نہ تھا اور عدل ہوا کی طرح مفت تقسیم ہو رہا تھا۔ عدالت کے سامنے ایک دلچسپ مقدمہ تھا۔ مدعی نے دعوےٰ دائر کیا کہ میں نے اپنے پڑوسی سے چند دن ہوئے زمین خریدی۔ جب میں نے اس میں تعمیر کے لئے ایک بنیاد کھودی تو دفینہ دستیاب ہوا۔ اس دفینہ پر میرا کوئی حق نہیں، میں اپنے پڑوسی کو واپس کرتا ہوں مگر وہ لیتا نہیں۔ مدعا علیہ کہہ رہا تھا کہ قاضی صاحب! میں نے جب زمین دی تو جو کچھ اس کے اندر تھا وہ بھی دے دیا، لہٰذا اس پر میرا کوئی حق نہیں۔ یہ ماجرا سن کر میں بہت حیران ہوا۔ ہمارا دوست کہنے لگا کہ آپ حیران کیوں ہوتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ زندگی ایک عارضی زندگی ہے، اس کے بعد ہمیں ایک ابدی زندگی عطا ہونے والی ہے جس میں ہمیں ہر کام کی جزا و سزا ملے گی، آخر وہ کون سا بیوقوف ہے جو ابدی زندگی کی راحت کو سیم و زر کی حقیر مقدار کے بدلے ضائع کرنے کے لئے تیار ہو۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک آواز آئی اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ تمام لوگ کاروبار ختم کر کے عبادت گاہ کی طرف تیزی سے جانے لگے، میں بھی اُٹھ کھڑا ہو لیا۔

دیکھا کہ امیر، غریب، کالے اور گورے سب صفیں باندھے اللہ کے حضور میں کھڑے ہیں۔ اس پرستش کو وہ نماز کہتے تھے، اور اس طرح کی پانچ نمازیں ان میں سے ہر ایک ہر روز ادا کرتا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ مسجد سے نکل کر اس میثاقِ عبودیت کو جو انھوں نے خدا سے باندھا ہے نہایت ہی جانفشانی کے ساتھ کاروباری زندگی میں پورا کرنے کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ ان کے تمام اعمال و افکار نہایت ہی فطری انداز میں قطب نما سوئی کی طرح صرف اس مرکزی نقطے کے گرد گھومتے تھے اور زندگی کا کوئی گوشہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں تھا جس پر اس کا گہرا اثر نہ ہو۔ یہ باتیں دیکھ کر مجھے اس قوم کے سردار سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ شبیر صاحب بھی میرے ساتھ ہو لئے۔ ہمارے راہبر نے ہماری رہنمائی کی اور وہ ہمیں ایک مکان میں لے گیا جو ہر قسم کی آرائش و زینت سے پاک تھا۔ وہاں میں نے ایک بوریا نشین کو دیکھا جو عام لباس میں ملبوس باتیں کر رہا تھا، اس کے چہرے سے جلال ٹپکتا تھا۔ میں نے کئی بار ہمت کی کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ سکوں، مگر نہیں دیکھ سکا۔ اس سردار کے ارد گرد اسی جیسے کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ طرزِ گفتار ظاہر کر رہا تھا کہ معاملہ کوئی اہم درپیش ہے۔ ان کے حلقے میں بیٹھنے والے ہر شخص کی ایک نرالی شان تھی۔ ہر ایک کی پیشانی پر وقار کے آثار اور سچائی و بے لوثی کے انوار تھے، اور سب سے زیادہ حیران کن بات تو یہ تھی کہ وہاں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ ایک سیاہ فام جب بات شروع کرتا تو سب تن گوش ہو کر سنتے، اور اس کی رائے کا وزن محسوس کرتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مساوات ایک مہم کا آغاز کرنے سے متعلق تھی، مگر سردار ہدایت یہ دے رہا تھا خبردار! اگر تم نے کسی غیر مذہب والے پر ظلم کیا، یا اس کے مذہب کی تنقیص کی تو تم پر خدا ناراض ہوگا۔ دیکھنا! راہبوں، عورتوں، اور بچوں پر ہاتھ نہ اٹھانا جو لوگ پناہ مانگیں انھیں بلا چون و چرا امان دے دینا۔" سردار کے یہ چند الفاظ میرے سینے میں اتر گئے۔ سوچنے لگا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہ میدانِ جنگ میں جہاں دنیا بھر کے متمدن قوت کے ہر قسم کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہیں، وہاں بھی اصولوں پر پابندی کا حکم دیا جا رہا ہے اور وقتی مصلحت کی کوئی کشش انھیں اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکتی۔ اس دنیا میں عورت اپنا پورا پورا حصہ ادا کر رہی تھی، وہ مرد کی ہوس رانی کا ایک کھلونا نہیں تھی، تقسیم کار نے اس پر صرف نصف بوجھ ڈالا تھا، وہ نہایت ہی خوشی سے اولاد کی تربیت میں منہمک نظر آتی، خاندانی نظم کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں تھی، وراثت میں وہ شریک تھی، اور دنیا کا کوئی قانون اس سے یہ حق سلب نہیں کر سکتا تھا۔

ضمیمہ الفرقان

عازمین حج کو چند اہم مشورے

آپ کو حج کی اصلی برکتیں کس طرح حاصل ہو سکتی ہیں؟

گذشتہ سال (۱۳۶۷ھ) حج کو جانے والے بعض بڑے بڑے قافلوں میں کچھ تبلیغی کام کرنے کا اتفاق ہوا تو اپنی عمر میں پہلی مرتبہ یہ اندازہ کر کے بڑا دکھ ہوا کہ فی زماننا جو لوگ حج کو جاتے ہیں اُنمیں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو دین کی ضروری اور بنیادی باتوں سے بھی ناواقف ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان کو صحیح طور پر کلمہ پڑھنا بھی نہیں آتا اور عملی حالت بھی اُن بیچاروں کی یہ ہوتی ہے کہ حج کے سفر میں بھی وہ نماز کے پورے پابند نہیں ہوتے، بلکہ بہت سوں کو صحیح طور سے نماز پڑھنا آتا بھی نہیں —— اور چونکہ ان لوگوں کو اپنی اس حالت کا احساس بھی نہیں ہوتا اور صحیح طور سے اپنی اصلاح کی کوئی فکر نہیں ہوتی اس لئے یہ بیچارے جیسے جاتے ہیں ویسے ہی محروم اور کورے واپس آجاتے ہیں —— گویا ہزاروں روپئے حج کے نام پر خرچ کرنے اور ۲-۳ مہینے خشکی اور تری کے سفر کی تکلیفیں اُٹھا کے راستہ کے مناظر کی سیر کرنے اور مکہ مدینہ کی عمارتیں دیکھنے اور حاجی کہلانے کے سوا اُن بیچاروں کو اس سفر سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، اور حج و زیارت کی برکتوں میں سے کوئی ذرہ بھی اُن کو نصیب نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہزاروں حج کو جانے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دین سے اگرچہ اتنے ناواقف نہیں ہوتے، اور ان کی عملی حالت بھی اتنی خراب نہیں ہوتی بلکہ دینی معلومات بھی ان کو حاصل ہوتے ہیں اور ان کی زندگی بھی کسی درجہ میں دیندارانہ زندگی ہوتی ہے لیکن حج کا زمانہ جس طرح اور جن مشاغل میں اور جن احتیاطوں کے ساتھ گزرنا چاہئے چونکہ وہ اُن کا پورا اہتمام نہیں کرتے اور پہلے سے حج کی برکات کیلئے اپنے کو تیار نہیں کرتے، اسلئے حج کی خاص برکات اور کیفیات سے وہ بھی محروم رہ جاتے ہیں، اور ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؎

بطواف کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندادند ۔ کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

حالانکہ حج و زیارت کا یہ سفر ایسا مبارک سفر ہے اور اللہ تعالیٰ جن بندوں کو نصیب فرمائے اُن کے لئے یہ ایسا بہترین موقع ہے کہ اگر اس مقدس سفر میں اپنی اصلاح و درستی کا پہلے سے ارادہ کر لیا جائے، اور مندرجۂ ذیل مشوروں ہی پر عمل کیا جائے تو انشاء اللہ بڑی آسانی سے اتنا ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنی عمر میں دین سیکھنے اور اپنی زندگی کو دینی زندگی بنانے کا موقع نصیب نہیں ہوا وہ صرف اس سفر ہی میں ضروری درجہ کی دینی تعلیم و تربیت حاصل کر کے اپنے کو ایک خداخاص اور سچا مسلمان بنا سکتے ہیں —— اور جو لوگ پہلے سے بحمداللہ دین سے واقف اور کسی درجہ کے دیندار ہیں وہ دین میں ایسی ترقیاں اور وہ مقامات حاصل کر سکتے ہیں جن کا وہ تصور بھی نہیں رکھتے ہیں

وہ مشورے یہ ہیں!

۱- ایک شہر یا ایک ضلع یا ایک علاقہ سے جانے والے حجاج اپنا ایک جماعتی نظام بنالیں اور اُن میں جو شخص دین کا زیادہ جاننے والا اور نیک صالح ہو اُس کو اپنا معلم بنالیں —— اور اگر بالفرض اپنے ساتھیوں میں کوئی اس قابل نہ ہو تو دوسرے مقامات کے حاجیوں میں سے کسی ایسے شخص کو اپنا معلم بنالیں یا کسی دوسری جگہ کے حاجیوں کے تعلیمی و تربیتی نظام میں شریک ہو جائیں اور پورے سفر میں دینی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھیں۔

(اس تعلیم و تربیت کا طریقہ وہ ہے جو "تبلیغی جماعتوں" کا ہوتا ہے کیونکہ مختلف درجہ کے لوگوں کی عمومی اور ضروری دینی تعلیم و تربیت کا وہی بہترین اور سہل ترین طریقہ ہے)۔

۲- ہندوستان اور پاکستان سے جانے والے حاجیوں کو بمبئی اور کراچی میں تبلیغی کام کرنے والی جماعتیں انشاء اللہ برابر ملیں گی اور اُمید ہے کہ ہر جہاز میں بھی کوئی نہ کوئی جماعت اس کام کی کرنے والی، اور اسکے اصول اور طریقے کے جاننے والی ان کے رفیقِ سفر ہوگی۔ بس ان جماعتوں سے آپ ربط و تعلق رکھیں اور اُن کے ساتھ رہ کر دینی فائدہ حاصل کریں، یہ جماعتیں محض لوجہ اللہ اس سلسلہ میں آپ کی پوری خدمت کریں گی، اور یہ لوگ آپ کے اچھے رفیق ثابت ہوں گے۔

۳- حج کو جانے والوں میں جو حضرات ایسے ہوں جن سے عام جانے والوں کو دین کی تعلیم و تربیت کا فائدہ پہنچ سکتا ہے اُنھیں چاہئے کہ وہ اس کو اعلیٰ درجے کی عبادت سمجھتے ہوئے اللہ کے بندوں کو

زیادہ سے زیادہ دینی فائدہ پہنچانے کی کوشش فرمائیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے وارثوں کی خوشی عبادت ہے جس کا ثواب اکثر حالات میں نفلوں سے اور اوراد و اذکار سے زیادہ ہوتا ہے۔

۴۔ ہر عازمِ حج کو چاہئے کہ اس مقدس سفر میں گناہ کے سب کاموں سے بلکہ فضول اور بے کار باتوں سے بچنے کی پوری کوشش کرے، اور جو وقت اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہو وہ یا تو دین سیکھنے سکھانے میں (خصوصاً حج کے ارکان اور زیارت کے آداب کی تعلیم و تعلّم میں صرف کرے، یا اللہ کی عبادت اور اس کے ذکر و فکر میں مشغول رہے۔

۵۔ بار بار دھیان کر کے اللہ کی عظمت و محبت اور اس کا خوف دل میں بٹھانے کی کوشش کیجائے۔

۶۔ تمام جائز اور اچھے مقاصد کے لئے اس سفر میں کثرت سے دعائیں کیجائیں، اللہ سے دعا کرنا اعلیٰ درجے کی عبادت ہے، اور اس پاک سفر میں دعاؤں کی قبولیت کی اُمید بھی زیادہ ہے۔

۷۔ ہر جانے والے کو اچھی طرح خیال رکھنا چاہئے کہ میرا یہ سفر اللہ کے واسطے ہے اور اُسکے مقدس گھر کی حاضری اور حضورِ انور کی مسجد شریف اور آپ کے روضۂ اطہر کی زیارت کیلئے ہے، اور میرے ساتھ جو اور جانے والے ہیں وہ سب بھی اسی مقصد سے جا رہے ہیں اور یہ سب اللہ و رسول کے مہمان ہیں، لہذا میری ذات سے ان میں سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، بلکہ جہانتک ہوسکے میں دوسروں کو آرام پہنچاؤں، چاہے مجھے تکلیف اُٹھانی پڑے۔ شائد اللہ اسی عمل سے راضی ہو جائے کہ میں نے خود تکلیف اُٹھا کے اس کے مہمانوں کو آرام پہنچایا، اور شائد اسی عمل کی برکت سے میرا حج قبول ہو جائے ——— حاجیوں سے اس معاملے میں عموماً بڑی کوتاہی ہوتی ہے اور ہر شخص نفسی نفسی میں گرفتار ہو کر اپنے آرام اور اپنے فائدہ کیلئے دوسروں کو دکھ اور نقصان پہنچانے سے پرہیز نہیں کرتا ——— یہ چیز حج کیلئے زہر ہے اور اس سے حج کے برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے، لہذا ہر شخص کو چاہئے کہ وہ پہلے سے اپنے نفس کو اس کیلئے تیار کرلے کہ میں اپنے آرام کیلئے دوسروں کو تکلیف نہیں دوں گا۔ یہ بات ذرا مشکل ضرور ہے لیکن اللہ کے یہاں اس کا درجہ بہت بلند ہے اور اللہ کے جو بندے اس سفر میں ایسا کرینگے اُن کے متعلق پوری اُمید ہے کہ حق تعالیٰ اُنکے حج کو خاص طور سے قبول فرمائے گا، اور انھیں دین کی بڑی دولتوں اور برکتوں سے نوازے گا۔

"دل بدست آور کہ حج اکبر است"

۸۔ اور سب سے اہم اور آخری بات یہ ہے کہ ریل میں، جہاز میں، اور مکہ معظمہ یا مدینہ طیبہ میں اللہ کے

جو ایسے بندے ملیں جن کے پاس بیٹھنے سے اور جنکی بات سننے سے دینی فائدہ ہوتا ہو یعنی اللہ یاد آتا ہو اور دل میں اسکی محبت اور اُس کا خوف اور عبادت کا شوق پیدا ہوتا ہو تو اُنکی صحبت کو اکسیر و کیمیا سمجھیں اور کچھ دیر کیلئے اُنکے پاس جا کر ضرور بیٹھا کریں۔

اگر حج کو جانے والوں نے ان چند باتوں کا اہتمام کرلیا تو انشاء اللہ وہ بڑی دینی برکتوں کے ساتھ واپس ہونگے، اور اُن کا حج خدا نے چاہا تو بڑا مبارک اور مقبول حج ہوگا —— کیا عرض کیا جائے، حج کا سفر تو ایسی کیمیا ہی کہ اگر اللہ توفیق دے تو ایک جاہل اور عامی بھی دو تین مہینے کے اس سفر میں ولی بن کر آسکتا ہی، مگر افسوس! لاپروائی سے یہ مقدس سفر بالکل ضائع ہو رہا ہی۔

ناظرین کرام سے گذارش!

اللہ کے جن بندوں کی نظر سے یہ مضمون گذرے اُنسے گذارش اور توقع ہی کہ وہ جتنے عازمین حج تک اس کو پہنچا سکتے ہوں پہنچائیں اور صرف اسکے دکھلانے یا پڑھ کر سنا دینے پر بس نہ کریں بلکہ زبانی انھیں اس کی اہمیت سمجھائیں اور ان مشوروں پر عمل کرنے کیلئے انھیں آمادہ کریں —— جسکی زیادہ مفید اور مؤثر صورت یہ ہے کہ اپنی بستی، اور اپنے شہر یا علاقے کے جن لوگوں کے متعلق یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اس سال حج کا ارادہ رکھتے ہیں اُنکے اجتماعات کئے جائیں اور اُنکے سامنے ان مشوروں کو عملی تجاویز کے طور پر پیش کیا جائے اور صحبت میں ان سب میں ایک جماعتی نظم قائم کر کے یہ بھی طے کر دیا جائے کہ جماعت میں دینی تعلیم کی خدمت فلاں صاحب کے ذمہ رہیگی —— یہ بھی ضروری ہی کہ یہ کام ان لوگوں کی روانگی حج سے کافی پہلے کیا جائے اور روانگی کے قریب اس کو پھر تازہ کر دیا جائے۔ ہمارا تجربہ ہی کہ روانگی کے وقت ان لوگوں کو اتنا ہوش نہیں رہتا کہ کسی بات پر اطمینان اور سنجیدگی کیساتھ غور کر سکیں، اور اسکی کوئی فکر کر سکیں۔

اس کام کا اجر اللہ کے جو بندے اس مقصد کیلئے کچھ محنت اور کوشش کرینگے اگر انکی کوشش کے نتیجہ میں دو چار بندگان خدا کو بھی ان مشوروں پر عمل کرنے کی توفیق ہوگئی اور سفر حج میں انکی کچھ دینی اصلاح ہوگئی اور حج کی خاص برکتوں کا کوئی ذرہ ان کو نصیب ہوگیا تو اس کا جو اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کوشش کرنیوالوں کو انشاء اللہ ملے گا اس پر بڑے بڑے عابد زاہد رشک کرینگے۔ حج کو جانا تو کسی کسی ہی کو اور عمر میں ایک دو دفعہ ہی نصیب ہو سکتا ہی لیکن عازمین حج میں یہ تبلیغی کوشش کر کے ہر غریب سے غریب بھی ہر سال ایک نہیں بہت سے

بندوں کے حج کے ثواب میں شریک ہو سکتا ہی —— کاش! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی ان حقیقتوں پر

(بقیہ صفحہ ۴۸) میں نے وہاں کوئی بھوکا نہیں دیکھا۔ ایک بیت المال موجود تھا جس سے ہر صاحب حاجت بغیر کسی احسان مندی کے اپنا حصہ لے سکتا تھا۔ صدقہ و خیرات کی تحریص کا نتیجہ یہ تھا کہ اغنیا محتاجوں کے گھروں پر جا جا کر روپیہ تقسیم کرتے تھے، اور قانون وراثت کی رو سے جائداد چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوتی رہتی جس کی وجہ سے دور دور کے انسان بھی اس سے فائدہ اٹھاتے، اور دولت کسی ایک طبقہ کے لوگوں میں محدود اور دائر نہیں ہو سکتی تھی۔

ہر شخص اپنے رجحانِ طبع کے مطابق بجز عیاشی اور فحاشی کے جو چاہتا کرتا، مگر ملک کا قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے عیش و تنعم کی زندگی کو سہارا ملے، جس سے اخلاق پر مضر اثرات پڑیں اور جس سے غریب، مفلوک الحال حصوں اور امرا و غربا کی جائز کمائی کو اپنے ذاتی آرام و آسائش پر استعمال کریں۔ اسلئے شراب خوری اور اسکی تجارت حرام تھی، جوا، سٹہ ناجائز تھا، سود جو سرمایہ داری کی جڑ ہے وہاں بالکل ناپید تھا۔ الغرض میں نے لوگوں کو وہاں طمانیتِ قلبی کی نعمت سے مالا مال ہونے کے علاوہ معاشی خوش حالی کے ثمرہ سے بھی لطف اندوز ہوتے دیکھا۔ وہاں کامل عدل، انصاف، اور مساوات کا دور دورہ تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر دل خود بخود گواہی دے رہا تھا کہ یہی وہ خیر الامم ہے جس کی تلاش میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں آدمی آوارہ و سرگرداں ہیں۔ میرے پردۂ ذہن پر یہ فلم ابھی دکھایا ہی جا رہا تھا کہ فضا میں ایک آواز سنائی دی۔ ؎

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

میں بیدار ہوا اور اپنے آپ کو اسی ظلم و استبداد کی دنیا میں پایا۔ تاہم اس خواب نے میرے خیالات کے اندر ایک تلاطم سا برپا کر دیا، پھر میں گہری سوچ میں پڑ کر اپنے گرد و پیش پر غور کرنے لگا۔

میرے ذہن نے بار بار اپنے آپ سے یہی سوال کیا کہ اللہ اکبر کی آواز تو ہمارے کان میں دن میں ایک نہیں کئی بار پڑتی ہے، مگر ہم اس کی برکات سے آخر کیوں محروم ہیں؟ دل نے بڑھ کر ہر بار یہی جواب دیا کہ تم نے اس آواز کو برحق مان کر اس کے مطابق اپنی زندگی کو کب بدلنے کی کوشش کی!۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ط

حج نمبر

الفرقان (لکھنؤ)

مرتبہ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۲ گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

الفرقان

قیمت

"حج نمبر" (فی کاپی) — ڈیڑھ روپیہ (عہ/)

سالانہ چندہ "الفرقان" - چار روپئے (للعہ/)

عام کاپی الفرقان "فی" - چھ آنے (۶/)

خط کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

ناظم - دفتر الفرقان گوئن روڈ - لکھنؤ

ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

جلد (۱۶) | بابتہ ماہ رمضان و شوال ۱۳۶۸ھ مطابق جولائی و اگست ۱۹۴۹ء | نمبر ۹ و ۱۰

خریدارانِ "الفرقان" سے!

( ) یہاں [illegible] نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے لہذا آئندہ کیلئے اپنا چندہ منی آرڈر سے روانہ فرما کر ممنون فرمائیے [illegible] فارم [illegible] جواب [illegible] رسالہ کی اشاعت تک آپ کا چندہ یا خدانخواستہ انکاری اطلاع دفتر میں نہ پہنچی تو حسب قاعدہ [illegible] وی پی [illegible] خدمت ہوگا۔

ناظم "الفرقان" لکھنؤ

شکر و دعا!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی لعزتہ وجلالہ تتم الصّٰلحٰت

حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور اُسکی مدد و توفیق سے "الفرقان" کا یہ "حج نمبر" صرف چھ سات ہفتے کی مُدّت میں مضامین کی تیاری و ترتیب اور کتابت و طباعت کے سارے مرحلوں سے گزر کر ناظرین کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے۔ فللہ الحمد شکراً ولہ المنۃ فضلاً۔

جس ربِّ کریم نے اپنے ایک حقیر بندہ کے دل میں پہلے اس کا خیال پیدا کیا، پھر اس خیال کو عزم اور فیصلہ بنا دیا، پھر اپنی خاص مدد سے اس کو عمل میں لانے کی توفیق دی۔ اُسی سے دُعا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے بندوں تک اس کو پہنچانا ہمارے لئے آسان فرمائے اور اسکے مطالعہ کے ذریعہ اُن کے قلوب میں حج و زیارت کا شوق و ذوق اور وہ خاص کیفیات اور جذبات پیدا فرمائے جو سیّدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور سیّدنا حضرت محمّد رسُول اللہؐ کی خاص میراث ہیں۔ (علیہما وعلیٰ آلہما الصّلوات والتسلیمات)

اللّٰھم ھٰذا الدعاء ومنک الاجابۃ وھٰذا الجھد وعلیک التکلان

باسمہٖ سبحانہٗ حمداً و سلاماً

نگاہِ اوّلیں*!

بعض اہل تجربہ سے سُنا تو پہلے بھی تھا کہ حج کو جانے والوں میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو حج کی عظمت اور اس مقدس سفر کی خصوصیت کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا بلکہ دنیا کے عام سفروں کی طرح وہ یہ سفر بھی کرتے ہیں ؛ گرچہ احرام باندھتے حج کے دوسرے ارکان بھی ادا کرتے ہیں اور مدینۂ طیبہ بھی حاضر ہوتے ہیں لیکن ایک حج کرنے والے کی جو حالت ہونی چاہیئے عظمت وادب، شوق و ذوق اور فدائیت و فنائیت کی جو کیفیات جس طرح اس پر طاری ہونی چاہئیں، اُن کا کوئی اثر بھی اُن پر معلوم نہیں ہوتا۔

بہ حال یہ بات سنی پہلے بھی تھی لیکن چونکہ کبھی خود اس کا تجربہ اور مشاہدہ نہیں کیا تھا اس لئے دل کو کبھی اس کا غیر معمولی احساس نہیں ہوا۔

گزشتہ سال (۱۳۶۷ھ) شوال کے مہینہ میں حج کو جانے والے بعض بڑے بڑے قافلوں میں کچھ تبلیغی کام کرنے کا اتفاق ہوا تو جو کچھ سنا تھا اُس سے بہت زیادہ آنکھوں سے دیکھ لیا ——— بیسیوں حج کو جانے والے ایسے دیکھے جن بیچاروں کو کلمہ بھی صحیح طور سے یاد نہیں تھا اور بیسیوں سے زیادہ شاید سیکڑوں ایسے نظر آئے جن کی عملی حالت یہ تھی کہ حج کو جا رہے تھے مگر اپنی فرض نمازوں کی بھی فکر نہ تھی، بے تکلف قضا ہو رہی تھیں ——— اور (بس دس پانچ بندگانِ خدا کو مستثنیٰ کر کے) یہ حالت تو سب ہی کی تھی کہ سچے حاجیوں کی جو ظاہری و باطنی کیفیات ہونی چاہئیں اُن لوگوں میں اس کی کوئی جھلک بھی محسوس نہ ہوتی تھی، اور غضب یہ کہ انھیں اپنی اس حالت پر کوئی افسوس بھی نہ تھا بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اس بارہ میں کوئی احساس ہی نہیں ہے۔

حج کو جانے والے ان بیچارے سیکڑوں مسلمانوں کو اس حال میں دیکھ کر دل پر بڑی چوٹ لگی،

اور مسلمانوں کی دینی اصلاح اور عمومی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں جو کچھ کام ہو رہا ہے (الفرقان جس کا خاص داعی ہے اور جس کے متعلق اس کے صفحات میں برابر لکھا جاتا رہتا ہے) اسکی ضرورت کا احساس اور یقین اور زیادہ بڑھا! اسی وقت دل نے دو فیصلے کئے ---- ایک یہ کہ اصلاح و تبلیغ کے سلسلہ میں جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کو زیادہ وسیع و منظم کرنے اور زیادہ موثر بنانے کے طریقوں پر غور کیا جائے اور اس کے لئے ہر وہ تدبیر استعمال کی جائے جو ہمارے امکان میں ہو۔ بقول رفیق محترم مولٰنا سید ابو الحسن علی کے "اب وہ گھڑی آگئی ہے کہ اپنے ترکش میں جو بھی تیر ہو وہ نشانہ پر پھینک دیا جائے اور اپنی امکانی کوششوں کے صرف کر دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے"؛
دوسرا فیصلہ دل نے حج کے جانے والوں کے بارہ میں یہ کیا کہ اللہ کے یہ بندے جو ہر سال ہزارہا ہزار کی تعداد میں دین کا ایک مقدس رکن ادا کرنے ہی کے لئے جاتے ہیں انکی ضروری درجہ کی دینی تعلیم و تربیت کی کوشش کی طرف آئندہ سے خصوصی توجہ کی جائے اور ان کے اس سفر کے دوران ہی میں (جبکہ یہ لوگ کم از کم دو تین مہینے کے لئے اپنے دنیوی مشاغل سے فارغ اور خانگی افکار سے بالکل آزاد ہو جاتے ہیں) ان میں اصلاح و تعلیم کا کام خاص اہتمام اور نظام سے کیا جائے۔

اگرچہ یہ کام بھی الحمد للہ کئی سال سے ہو رہا ہے اور گذشتہ چند سالوں میں اللہ کے بہت سے باتوفیق بندوں نے اس سعادت میں حصہ لیا اور جہازوں میں آتے جاتے مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام میں بھی حجاج میں دین کی دعوت اور اصلاح و تعلیم کا کام اپنی بساط کے مطابق بعض تبلیغی جماعتوں نے کیا اور الحمد للہ اس کے نتائج بھی بہت اُمید افزا نکلے، لیکن گذشتہ سال حاجیوں کی ایک بڑی تعداد کو دین اور اس کے فرائض و واجبات سے اس قدر ناواقف اور غافل دیکھ کر راقم سطور نے اسکی خاص ضرورت محسوس کی کہ کام کے خاص اس شعبہ کی طرف غیر معمولی توجہ کر کے اس کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور منظم کیا جائے ۔۔ یہ کام جس طریقہ پر ہونا چاہیئے اس کا مختصر خاکہ زیر عنوان

حجاج میں اصلاحی و تبلیغی کام کی ضرورت اور اس کا طریقہ

اس نمبر کے آخری صفحات میں آپ کی نظر سے گذرے گا۔

حجاج میں اس عمومی اصلاحی کام کے علاوہ خاص حج سے متعلق جس خصوصی کام کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ حج کی حقیقت اور اس کی عظمتوں سے ان کو واقف کیا جائے اور ذوق و شوق کی والہانہ کیفیات اور عشق و محبّت کے وہ جذبات ان میں پیدا کرنے اور ابھارنے کی کوشش کی جائے جو در اصل حج کی رُوح اور اس کا خاص سرمایہ ہیں۔

اس مقصد کے لئے مناسب معلوم ہوا کہ خاص اہلِ تجربہ اور اہلِ دل حضرات سے ایسے مضامین لکھائے جائیں جن کے مطالعہ سے عازمین حج پر حج کی حقیقت منکشف ہو اور حج اور متعلقات حج کا احساس دل میں پیدا ہو اور عشق و محبّت اور ذوق و شوق کے جذبات برافروختہ ہوں ——— اسی تجویز اور خیال کی عملی شکل یہ "حج نمبر" ہے۔ معلوم نہیں کہ مقصد کے لحاظ سے ہماری یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہو، اور اصل کامیابی تو قبول عند اللہ ہے، اور اپنی ہزار ہا نااہلیتوں اور گندگیوں کے باوجود اُس کریم سے اچھی ہی اُمید ہے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ۞

اس نمبر کی تیاری اور ترتیب کا کام بہت ہی جلدی اور رواروی میں ہوا ہے۔ رجب کا مہینہ قریباً آدھا آچکا تھا کہ اس کا ارادہ کیا گیا، مضامین و مقالات کے لئے جن حضرات پر نظر گئی رجب کی آخری تاریخوں میں اُن سے استدعا کی گئی کہ صرف ایک دو ہفتے میں اگر وہ مضمون تیار فرما سکتے ہوں تو تیار فرمادیں۔ جن حضرات نے ازراہِ عنایت اس استدعا کو قبول فرمالیا اور مقررہ وقت تک مضامین مرحمت فرمادیئے بس انھیں حضرات کے مضامین اس میں شامل ہو سکے ہیں ——— افسوس ہے کہ بعض حضرات جن کے مضامین کی خاص توقع تھی وقت کی تنگی کی وجہ سے آخر میں انھوں نے معذرت فرمادی اور اس لئے موضوع کے بعض وہ گوشے باقی رہ گئے جن پر لکھنے کی اُن حضرات سے توقع تھی اور الفرقان کے گذشتہ پرچہ میں اُمید کی بنا پر جن کا تذکرہ بھی کردیا گیا تھا۔ اگر اللہ نے کیا اور اس نمبر کے دوسرے اڈیشن کی نوبت آگئی تو انشاء اللہ اس وقت یہ کمی پوری کردی جائیگی۔

علی ہذا اس کی کتابت اور طباعت بھی بہت ہی عجلت اور تیزی کے ساتھ ہوئی ہے اسی لئے مختلف کاتبوں سے کام لینا پڑا اور یہ سب کچھ اس لالچ میں کیا گیا کہ کسی طرح آخر رمضان یا شروع شوال میں شائع ہو سکے تاکہ رمضان کے بعد سے جہاز سے جانے والے حجاج تک بھی ہم

اس کو پہنچا سکیں۔

بہرحال اس جلدی اور روا روی میں جیسا کچھ تیار ہو سکا ہے اللہ کے بندوں کی خدمت میں پیش ہے —— اگر اس کے مطالعہ سے چند بندگانِ خدا کے دل میں بھی حج و زیارت کا شوق پیدا ہو جائے یا اللہ و رسول کے ساتھ ان کی محبت میں ایک لہر کا بھی اضافہ ہو جائے یا چند حج کو جانے والوں کو اس سے وہ فائدہ پہنچ جائے جو اس کاوش کا اصل مقصد ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنی شانِ کرم سے اس کوشش کو اپنی راہ کی کوشش قرار دے لیں اور کسی مخلص کے اخلاص کی برکت اور دعا سے اس کو قبول فرما لیں تو پھر یہ کوشش کامیاب ہے اور ہم بامراد ——
ورنہ اپنا تو کوئی عمل بھی اس دربار میں قبول ہونے کے لائق نہیں، سارا بھروسہ ان کی شانِ کریمی ہی کا ہے۔

اللھم اصنع بنا ما انت اھلہ ولا تصنع بنا ما نحن اھلہ انت اھل التقویٰ واھل المغفرۃ واھل الجود واھل الکرم واھل الاحسان ۝

نمبر کے مندرجات کے متعلق چند کلمات :-

اس نمبر کے مضامین گنتی میں بہت تھوڑے ہیں لیکن الحمدللہ بعض مضامین معنویت اور افادیت کے علاوہ صفحات کے لحاظ سے بھی کئی کئی مضمونوں کے برابر ہیں۔

خصوصاً رفیقِ محترم مولٰنا سید ابوالحسن علی کا مقالہ جو اس نمبر کا سب سے بڑا اور سب سے اہم مقالہ ہے وہی تنہا کئی مقالوں کے برابر ہے، اور یہ عرض کیا جائے تو انشاءاللہ بیجا نہ ہوگا کہ اگر صرف یہی ایک مقالہ اس نمبر میں ہوتا تو مقصد کے لئے بالکل کافی تھا —— اس مقالہ کے متعلق یہ ظاہر کر دینا بھی میرے لئے ضروری ہے کہ مولٰنا موصوف نے بڑے اصرار کے ساتھ مجھ سے فرمائش کی تھی کہ یہ مقالہ نام کی تصریح کے بغیر گمنام شائع کیا جائے —— لیکن اوّل تو الفرقان کے ناظرین مولٰنا سے اور ان کے طرزِ تحریر سے اتنے واقف اور مانوس ہیں کہ نام ظاہر نہ کرنے کی صورت میں بھی میرے خیال میں اُن میں سے اکثر سمجھ لیتے کہ کون صاحب اس مضمون میں بول رہے ہیں —— علاوہ ازیں

جس تواضع اور انکسار اور اپنے نفس کے ساتھ جس بدگمانی کے ماتحت مولنا نے مجھ سے یہ فرمائش کی تھی، بلا شبہ وہ مولنا کے حق میں تو فضیلت اور کمال ضرور ہیں لیکن دوسروں کا فائدہ تو عقیدت اور حُسنِ ظن ہی میں ہے ـــــ بہر حال مولنا کی اس فرمائش پر پورے ہمدردانہ غور کے باوجود میں اس بارے میں اُنکی رائے سے متفق نہ ہو سکا، اُمید ہے کہ وہ مجھے معاف فرمائینگے۔

مولنا کے اس مقالہ کے متعلق ناظرین سے خاص طور سے گذارش ہے کہ وہ اسکو بار بار پڑھیں انشاء اللہ ہر دفعہ قند مکرر کا لُطف پائیں گے ـــــ خاصکر حج کو جانے والے حضرات سے گذارش ہو اور ان کو نہایت مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ پورے سفر میں برابر اس کو مطالعہ میں رکھیں، انشاء اللہ غیر معمولی نفع اور بڑی لذتیں محسوس فرمائیں گے۔

مولنا علی کے مقالہ کے بعد "آداب حج و زیارت" کے عنوان سے جو مضمون ہے ـــــ (جو درحقیقت شیخ الحدیث حضرت مولنا محمد زکریا مدظلہ، کے رسالہ "فضائل حج" کی دو فصلوں کا اختصار اور خلاصہ ہے) ـــــ وہ بھی حج کو جانے والوں کے لئے نہایت اہم ہو۔ حجاج اگر اس کو برابر مطالعہ میں رکھیں اور ہر موقع پر اس سے رہنمائی حاصل کرتے رہیں تو انشاء اللہ بڑی دولتیں حاصل کر سکیں گے۔

اس نمبر کا تیسرا اہم اور مبسوط مقالہ ہمارے محترم مولنا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کا ہو۔ موصوف ایک خاص طرز نگارش کے مالک ہیں جو عجلت پسندوں اور مضمون کے مقصود مدعا کو جلدی معلوم کرنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے بسا اوقات بڑا صبر آزما ہوتا ہے لیکن جن میں یہ بے صبری نہ ہو اور مولنا کے خاص طرز سے واقف اور کچھ مانوس ہو جائیں تو پھر مولنا کے اس طرز میں وہ بڑی لذت اور بڑا کیف پاتے ہیں۔ مولنا کا یہ مقالہ بھی اس خصوصیت کا حامل ہے۔ ناظرین ابتدائی چند صفحے اگر صبر و اطمینان سے پڑھ لیں گے تو بیت اللہ اور حج بیت اللہ کے متعلق مولنا نے جن اسرار کو اپنے مضمون میں کھولنا چاہا ہے اُن سے وہ آشنا اور لذت اندوز ہو سکیں گے۔

بہر حال اس نمبر میں یہ تین مقالے اہم بھی ہیں اور اتنے بڑے بھی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں کئی کئی مقالے بن سکتے ہیں۔

مقالات کے علاوہ اس نمبر میں چند نظمیں بھی ہیں صفحہ ۱۴۳ و ۱۴۴ کی ایک نظم کے علاوہ یہ سب نظمیں ہمارے مخدوم و محترم حضرت صوفی سید عبدالرب صاحب مدظلہ (ایم اے) اور محب مکرم زائرِ حرم حضرت حمید صدیقی کی ہیں۔ جن کو ان دونوں حضرات سے کچھ تعلق و واقفیت حاصل ہے وہ جانتے ہوں گے کہ ان حضرات نے اپنی نظموں میں جو کچھ کہا ہے وہ بزری "شاعری" نہیں ہے بلکہ یہ ان کی واردات اور قلبی کیفیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان میں برکت اور ترقی عطا فرمائے اور ان کی نظموں کی برکت سے پڑھنے والوں میں بھی یہی سوز و گداز پیدا فرمادے ـــــ کہ یہی سب کچھ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

واخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین

(صفحہ ۱۴۲ کا بقیہ) آمادہ کریں ـــــ جس کی زیادہ مفید اور مؤثر صورت یہ ہے کہ اپنی بستی اور اپنے شہر یا علاقے کے جن لوگوں کے متعلق یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اس سال حج کا ارادہ رکھتے ہیں اُنکے اجتماعات کئے جائیں اور اُن کے سامنے ان مشوروں کو عملی تجاویز کے طور پر پیش کیا جائے اور اسی صحبت میں ان سب میں ایک جماعتی نظم قائم کر کے یہ بھی طے کر دیا جائے کہ جماعت میں دینی تعلیم کی خدمت فلاں صاحب کے ذمہ رہے گی ـــــ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ کام ان لوگوں کی روانگیِ حج سے کافی پہلے کیا جائے، اور روانگی کے قریب اس کو پھر تازہ کر دیا جائے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ روانگی کے وقت ان لوگوں کو اتنا ہوش نہیں رہتا کہ کسی بات پر اطمینان اور سنجیدگی کیساتھ غور کر سکیں اور اسکی کوئی فکر کر سکیں۔

اس کام کا اجر اللہ کے جو بندے اس مقصد کیلئے کچھ محنت اور کوشش کرینگے اگر انکی کوشش کے نتیجہ میں دو چار بندگانِ خدا کو بھی ان مشوروں پر عمل کرنے کی توفیق ہو گئی اور سفرِ حج میں اُنکی کچھ دینی اصلاح ہو گئی اور حج کی خاص برکتوں کا کوئی ذرہ ان کو نصیب ہو گیا تو اس کا جو اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کوشش کرنے والوں کو انشاء اللہ ملے گا اس پر بڑے بڑے عابد زاہد رشک کرینگے۔ حج کو جانا تو کسی کسی ہی کو اور عمر میں ایک دو دفعہ ہی نصیب ہو سکتا ہے لیکن عازمینِ حج میں یہ تبلیغی کوشش کر کے ہر غریب سے غریب بھی ہر سال ایک نہیں بہت سے بندوں کے حج کے ثواب میں شریک ہو سکتا ہے ـــــ کاش! رسول اللہ صلعم کی فرمائی ہوئی ان حقیقتوں پر پورا یقین ہم کو نصیب ہو جاتا۔

مکہ و مدینہ اور حج و زیارت

اینجا بیا کہ مہبطِ انوار ایزدی است
اینجا بیا کہ مشرقِ نورِ محمدیؐ است

سب جانتے ہیں کہ مکہ معظمہ ہی دنیا کا وہ مقدس اور محترم شہر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی خاص تجلی گاہ کعبہ مکرمہ واقع ہے، جس کو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل (علیہما السلام) نے اللہ کے امر و حکم سے کبھی اپنے پاک ہاتھوں سے بنایا تھا، اسی میں حجرِ اسود ہے، اسی میں مقامِ ابراہیمؑ ہے، اسی میں زمزم کا وہ چشمہ ہے جو حضرت اسمٰعیل و حضرت ہاجرہؑ کے لئے معجزانہ طور پر جاری کیا گیا تھا، اور وہی رب العزت کی وہ تجلی گاہ اور انوارِ الٰہی کا وہ مرکز ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے گھر (بَیْتِیْ) ہونے کا شرف بخشا اور قیامت تک کے لئے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال میں رہنے بسنے والے اپنے سب پرستاروں کا اس کو قبلہ بنایا۔ (اَیْنَمَا کُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ)۔

پھر یہی وہ شہر ہے جس میں ہمارے ہادی و آقا سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، اسی میں پلے بڑھے جوان ہوئے، اسی میں آپ کو نبوت عطا ہوئی، اسی میں قرآن کی بہت سی سورتیں نازل ہوئیں، اسی میں آپ نے دین کی دعوت کا کام شروع کیا، اور دس بارہ سال مسلسل اسی کی گلیوں اور بازاروں میں آپ دین کی دعوت دیتے رہے، اور "یٰاَیُّهَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا" کی پیغمبرانہ صدا سے اس کی فضا گونجتی رہی، پھر اسی میں آپ کو معراج ہوئی، بہرحال دعوت اسلام کے ابتدائی دس بارہ سال اسی شہر میں گذرے اور اسی بلد اللہ الحرام میں دین کی بنیاد قائم ہوئی۔

(زادہ اللہ تشریفاً و تعظیماً)

اسی طرح سب جانتے ہیں کہ مدینۂ طیبہ ہی وہ پاک اور پیارا شہر ہے جس کی طرف اللہ کے آخری رسُول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے رب کے حکم سے ہجرت فرمائی اور یہیں پہونچ کر آپؐ کو اور آپؐ کے مخلص دینی رفیقوں (مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم) کو دین اور دعوت کی آزادی نصیب ہوئی۔ پھر اسی شہر کو آپ نے اور آپ کے ان رفقاء نے اپنا مستقل وطن بنایا اور حیاتِ طیبہ کے آخری دس سال (جہاد اور حج کے سلسلہ کے سفروں کے علاوہ) اسی پیارے شہر میں گذارے، اور قرآن مجید کا زیادہ تر حصّہ اور اسلام کے تفصیلی احکام یہیں نازل ہوئے، اور دعوت و جہاد اور تعلیم و تربیت کا جو کام اس عرصہ میں ہوا وہ اسی پاک شہر سے ہوا —— نیز اسی میں حضورؐ نے اپنی خاص مسجد بنائی جو اس دنیا میں سب سے آخری وہ مسجد ہے جو اللہ کے کسی پیغمبر نے اللہ کے حکم سے بنائی ہو' اسی لئے اس کا ایک نام "خاتم مساجد الانبیاء" بھی ہے۔ اسی مسجد میں حضورؐ نمازیں پڑھتے تھے، خطبے دیتے تھے اور اسی میں بیٹھ کر دین کے دوسرے مہمات انجام دیئے جاتے تھے' اسی مسجد سے تبلیغی وفود روانہ ہوتے تھے، اور اللہ کا نام بلند کرنا اور دنیا کو گمراہیوں کی اندھیری سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کے لئے مجاہدینِ حق کے لشکر بھی اسی مسجد سے روانہ ہوتے تھے۔ الغرض حیاتِ نبویؐ کے آخری دس سالوں میں اعلاءِ کلمۃ اللہ، مخلوق کی ہدایت اور تعلیم و تربیت کا جو کام ہوا' وہ اسی مقدس شہر میں اور اسی مسجد کے صحن سے ہوا۔ پھر یہیں آپؐ کا وصال ہوا اور اسی کے ایک گوشہ میں آج بھی آپ آرام فرما ہیں۔

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم وشرف وکرم

جب مکہ معظمہ اور مدینۂ طیبہ کو اللہ کے تعلق اور رسُولؐ کے تعلق کی یہ خصوصیتیں اور عظمتیں حاصل ہیں —— جو دنیا کے کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں —— تو بالکل قدرتی بات ہے کہ اللہ و رسُولؐ پر ایمان رکھنے والوں کی نظر میں یہی دو مقدّس شہر دنیا کے سارے شہروں اور ملکوں سے زیادہ معظم و محترم اور زیادہ محبوب ہوں گے۔ جس کے دل میں ذرّہ بھر بھی ایمان ہوگا اس کو دنیا کے بڑے سے بڑے ترقی یافتہ اور پُر رونق شہروں سے زیادہ دلچسپی اور اپنے وطن سے بھی زیادہ پیار اور محبت مکہ اور مدینہ سے ہونا لازمی ہے —— محبّت کی نگاہ میں وہی شہر سب سے زیادہ پیارا، بارونق اور دل آویز

ہوتا ہے جس کو محبوب سے نسبت ہو، خصوصاً جہاں اس کا وصال میسّر ہوا ہو یا وصال کی اُمید ہو۔ ؎

گفت معشوقے بعاشق کے فتا — تو بغربت دیدۂ بس شہرہا
پس کدامے شہر از انہا خوشتر است — گفت آں شہرے کانجا دلبر است

پس اگر بالفرض حج کو اسلام کا رکن قرار نہ بھی دیا گیا ہوتا اور نہ حج و زیارت پر کسی ثواب کا وعدہ کیا گیا ہوتا تب بھی آئینِ محبت کا تقاضا تھا کہ اللہ و رسولؐ سے تعلق و محبت رکھنے والے وہاں جائیں اور سر کے بل جائیں۔ ؎

برزمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ اربابِ نظر خواہد بود

عشاق کا مذہب تو یہ ہے کہ محبوب اثناءِ راہ میں کسی منزل پر تھوڑی دیر کے لئے اگر ٹھہرا بھی ہو تو وہاں کی خاک بھی اس کی مستحق ہے کہ اُس کو سر پر رکھا جائے۔ ؎

در منزلے کہ جاناں روزے رسیدہ باشد
باخاک آستانش داریم مرحبائے

بہر حال اگر حج و زیارت پر کچھ بھی اجر و ثواب ملنے والا نہ ہوتا تب بھی اللہ کے وہ بندے جن کو محبت کا کوئی ذرہ بخشا گیا ہے صرف محبت کی کشش سے وہاں جاتے اور اُن کو ضرور جانا چاہئے تھا —— لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اُس نے حج و زیارت پر (جس کے لئے خود ہمارے اندر خواہش اور طلب و تڑپ کے اسباب موجود ہیں) اتنے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حج و زیارت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت و رحمت کی اور اپنی طرف سے شفاعت کی ایسی بشارتیں سنائی ہیں جن کی طمع میں اللہ کے بندے جانِ عزیز بھی کھو دیں تو سودا گراں نہیں۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:-

"من حج للّٰہ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ امہ"

جس شخص نے خالص اللہ کے لئے (یعنی صرف اُسکے حکم کی تعمیل اور اسکی رضا طلبی کی نیت سے) حج کیا، اور اُس حج میں نہ رفث اُس سے سرزد ہوا نہ فسق (یعنی کوئی فحش بات نہیں کی اور نہ اللہ کی کوئی نافرمانی کی) تو وہ شخص گناہوں سے ایسا پاک ہوکر واپس ہوگا جیسا کہ اپنی پیدائش کے دن وہ بالکل بے گناہ تھا۔ (صحیح بخاری و مسلم)

اور حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) ہی سے صحیح بخاری اور مسلم ہی میں یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:-

الحج المبرور لیس لہ جزاءٌ الا الجنۃ ۔

خالص حج (جسمیں حج کی شان کے خلاف کوئی حرکت نہ ہوئی ہو) اُسکی جزا بس جنت ہی ہے۔

اور حضرت عمرو بن العاصؓ راوی ہیں کہ حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں فرمایا:-

اِنّ الحج یھدم ما کان قبلہ (مسلم)

حج پہلے سارے گناہوں کو ڈھا دیتا ہے یعنی ان کا صفایا کر دیتا ہے۔

ان حدیثوں میں صاف صریح وعدہ ہے کہ حج اگر اخلاص کے ساتھ اور صحیح طریقہ پر ادا ہو اور کوئی نافرمانی اور بے عنوانی اُس میں سرزد نہ ہو تو حاجی کے سارے گناہوں کی بخشش کا وہ ذریعہ بن جاتا ہے اور اس کو جنت کا مستحق بنا دیتا ہے۔

اور زیارت کے متعلق مثلاً دارقطنی وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:-

من زار قبری وجبت لہ شفاعتی

جس نے میری قبر کی زیارت کی اُس کیلئے میری شفاعت واجب ہوگئی

اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ

من حج فزار قبری بعد موتی کان کمن زارنی فی حیاتی ۔ ( )

جو شخص حج کو گیا اور میری قبر کی اُس نے زیارت کی تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کہ اُس نے زندگی میں میری زیارت کی۔

غور کیجئے ایک مومن کی اس سے بڑی چاہت اور سعادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کے گناہ معاف کردیئے جائیں، جنت کو اس کا مسکن بنادیا جائے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے شفیع ہوں اور روضۂ اقدس پر اس کی حاضری حضورؐ کی نگاہِ کرم میں زندگی کی ملاقات کے برابر ہو۔ع

"بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست"

لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ جنت اور مغفرت (بلاشبہ جن کے ہم ہر چیز سے زیادہ محتاج ہیں) یہ تو بالکل انعام ہی انعام ہے اور علیٰ ہذا شفاعت کا وعدہ حضورؐ کا کرم ہی کرم ہے، ورنہ ان مقدس دیار کی حاضری اور اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوبوں کی مقدس یادگاروں کی زیارت سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرنا اور دل کی لگی آگ کو بجھانا خود ہماری اپنی خواہش اور طلب ہے۔ آخر مسلمان کہلانے والوں میں کون ایسا بدنصیب ہوگا جس کے سینہ میں اس کی تڑپ موجود نہ ہو۔ ؎

امر علی الدیار دیار لیلیٰ[1] اقبّل ذا الجدار وذا الجدار

وما حب الدیار شغفن قلبی ولکن حب من سکن الدیار

اللہ تعالیٰ جن بندوں کو یہ سعادت نصیب فرمائے اُن کو سب سے اہم مشورہ یہی ہے کہ وہ مکہ معظمہ و بیت اللہ اور مدینہ طیبہ و روضۂ اقدس کی ان خصوصیتوں اور عظمتوں کا دھیان اور فکر کرکرکے شوق و ذوق کی کیفیات اور عشق و محبت کا سوز و گداز اپنے اندر پیدا کریں ـــــ لیکن خبردار دونوں دربار کے لئے ادب کی جو حدود مقرر کردی گئی ہیں اُن سے بھی سرِ مو تجاوز نہ ہو کہ یہاں عشق کو ادب سے بے نیاز ہونے کی اجازت نہیں۔ ؎

بار کا پاسِ ادب اور دلِ ناشاد رہے نالہ تھمتا ہوا رُکتی ہوئی فریاد رہے

•

---

[1] میں لیلیٰ کی بستی پر گذرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں کبھی اس دیوار کو، اور دراصل بستی اور اُسکے در و دیوار کی محبت نے میرے دل کو فریفتہ نہیں کیا ہے بلکہ اس بستی میں جو میرا محبوب رہتا ہے بس اُسی کی محبت مجھ سے یہ سب کچھ کراتی ہے ۱۲۔

ایک ناتجربہ کار اور نااہل جو خود اس سعادت سے ابتک محروم بھی ہے اتنا ہی اجمالی مشورہ دے سکتا ہے، تفصیلی رہنمائی اور مفصل مشورے اُن ہی کو زیبا ہیں جو اس کے اہل ہیں اور جو اس سعادت سے بہرہ اندوز کئے جا چکے ہیں۔ چنانچہ اگلے صفحات سے ناظرین کرام کو وہ سب مشورے مل جائیں گے جن کی اس راہ کے رہرو کو ضرورت ہو سکتی ہے ——— اگلے مقالات کو توجہ اور ذوق شوق سے پڑھئے اور انشاء اللہ اُن میں عشق و ادب کی ساری تفصیلات آپ پالیں گے۔

عازمینِ حج سے ایک التجا!

حج کو جانے والے اللہ کے جن خوش نصیب بندوں تک "الفرقان" کا یہ حج نمبر پہنچے اُن سے اس نامۂ سیاہ کی التجا اور استدعا ہے کہ دونوں درباروں میں دعاؤں کے خاص اوقات میں اگر کبھی کبھی وہ اس بندہ کو بھی یاد رکھ سکیں تو ضرور یہ کرم فرمائیں، اور روضۂ اقدس پر حاضری کے وقت جب وہ اپنے دوستوں کا سلام پہنچائیں تو سب سے آخر میں حضورؐ کے اس سیاہ کار اور تباہ حال غلام امتی کا بھی سلام عرض کردیں، بڑا کرم اور بڑا احسان ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور آپ کو اس کا اجر دے گا۔

آپ کا مخلص

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

اپنے گھر سے بیت اللہ تک

(از- جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

اللہ اللہ کر کے روانگی کی تاریخ آئی۔ ؎

"دن گنے جاتے تھے جس دن کیلئے"

جس دن کی آرزو لیکر لاکھوں اللہ کے نیک اور مقبول بندے دنیا سے چلے گئے، ہزاروں اولیاء اللہ عمر بھر اسی حسرت و اشتیاق میں رہے، وہ ایک ظلوم و جہول بندہ کو نصیب ہو رہا ہے۔ ؎

"برایں مژدہ گر جاں فشانم رواست"

بہت چاہا کہ سوائے چند مخصوص دوستوں کے کسی کو خبر نہ ہو، ایسے موقع پر ریا و عجب (خود پسندی) سے حفاظت، اور اخلاص کامل بڑا اونچا مقام اور اللہ کے مخلص بندوں کا کام ہے، اگر سفر کی بسم اللہ ہی غلط ہوئی، اور اخلاص میں فرق آیا تو بڑا خطرہ ہے۔ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

لیکن ایک سے دوسرے کو دوسرے سے تیسرے کو خبر ہو ہی گئی، اے اللہ دل کا نگہبان تو ہی ہے اپنی ناکارگی، گناہوں اور شامت نفس کا پورا استحضار اور تیرے بے استحقاق احسان کا مراقبہ رہے، ایک لمحہ کیلئے بھی اپنی اہلیت و مقبولیت کا وسوسہ اور ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی آنے نہ پائے۔

اللھم ان قلوبنا ونواصینا وجوارحنا بیدک لم تملکنا منھا شیئا فاذا فعلت ذلک بنا فکن انت ولینا واھدنا الی سواء السبیل۔

اے اللہ ہمارے دل ہماری پیشانی کے بال ہمارے اعضاء وجوارح سب تیرے ہاتھ میں ہیں، تونے ان میں سے کوئی چیز بھی ہمارے اختیار میں نہیں دی جب ایسا ہے تو پھر تو ہی ہمارا کارساز اور ر

تجربہ کاروں کا کہنا ہے کہ سفر میں سامان کم سے کم اور بس ضروری چیزیں لیجئے، زیادہ سامان کی وجہ سے بہت سی نعمتوں سے محروم ہونا پڑتا ہے، آزادی نہیں رہتی اور بعض اوقات غلط کام کرنے پڑتے ہیں، جن کا ہمیشہ افسوس رہتا ہے۔

لیجئے دیکھتے دیکھتے چلنے کا وقت آگیا، گروہ وقت نہیں ہے، ہر سفر کا آغاز دو رکعت نفل اور دعاء سفر سے مسنون ہے، نہ کہ اتنا طویل، مبارک اور نازک سفر جس میں ہر آن خطرہ پونجی کے ڈوب جانے اور قلب و نیت کے قزاقوں کی رہزنی کا ہے، ساری عمر کا خشوع اگر اس ایک نماز میں اور زندگی بھر کا تضرع اگر آج کی دعا میں آجائے تو بڑی بات نہیں۔ جسم و جان، قلب و ایمان، بر و بحر کے خطرے اس ایک سفر میں جمع ہیں، ہار جیت کا سفر ہے، ہار بھی ایسی کہ اس کے برابر کوئی ہار نہیں، اللہ کے گھر جائے اور اپنی شامتِ اعمال سے خالی ہاتھ آئے بلکہ گناہوں کی گٹھری اور الٹی پیٹھ پر لاد کر لے۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے

اور جیت بھی ایسی کہ کوئی فتح اور کامرانی اس کے برابر نہیں، گناہوں سے پاک صاف دھویا دُھلایا جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا

من حج للہ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ امہ۔ (بخاری و مسلم)	جس شخص نے محض اللہ کی خوشنودی کیلئے حج کیا اور بے حجابی اور گناہ سے محفوظ رہا تو وہ پاک ہو کر ایسا لوٹتا ہے جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے روز تھا۔

وہ سفر جس کا انعام جنت ہے

الحج المبرور لیس لہ الجزاء الا الجنۃ (بخاری مسلم)	حج مقبول کی جزا جنت ہی ہے۔

اس سفر کے لئے جو کچھ بھی مانگا جائے اور جس طرح دل کھول کر مانگا جائے کم ہے، مگر ناتجربہ کار عقل، پریشان دماغ، مضطرب دل، تھکا ہوا جسم، وقت تھوڑا کہنا بہت، کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر ضروری باتیں زبان پر آجائیں اور ضروری باتیں رہ جائیں، لیکن قربان رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کہ جیسے ہر دینی و دنیاوی ضرورت کے لئے جچی تلی دعائیں اور ہر شعبۂ زندگی کے لئے منتخب دعائیہ الفاظ

امت کو عطا کر گئے، سفر کی بھی ایسی مکمل دعا تعلیم کر گئے جس میں نہ کسی اضافہ کی ضرورت ہے نہ کسی ترمیم کی۔ اور ان احسانات کے ساتھ اس احسان کا بھی استحضار کر کے محبت و عظمت کے ساتھ درود پڑھ کر یہ مسنون و ماثور الفاظ کہے:۔

اللھم انا نسالک فی سفرنا ھذا	اے اللہ ہم تجھ سے اس سفر میں نیکی اور احتیاط کے
البر والتقوی ومن العمل ما ترضی	طالب ہیں اور ایسے اعمال کے جو تجھے پسند ہوں اے اللہ ہمارے سفر
اللھم ھون علینا سفرنا ھذا	کو ہمارے لئے آسان اور ہلکا بنا دے اور اس کی
واطوعنا بعدہ اللھم انت	مسافت کو لپیٹ دے۔ اے اللہ تو سفر میں بھی ہمارے
الصاحب فی السفر والخلیفۃ	ساتھ ساتھ ہے اور گھر میں بھی ہمارے پیچھے نگراں
فی الاھل اللھم انی اعوذ بک	اور خیال رکھنے والا ہے۔ اے اللہ میں تجھ سے
من وعثاء السفر وکآبۃ المنظر	سفر کی کلفت اور ایسی چیز سے پناہ چاہتا ہوں جس کے
وسوء المنقلب فی المال والاھل	دیکھنے سے کوفت ہو اور مال و اہل و عیال کی طرف
والولد۔ (مسلم)	بری واپسی سے۔

گھر سے رخصت ہوئے سب کو اللہ کے حوالہ کیا، اور اللہ کے حفظ و امان میں دیا، رخصت کرنے والوں نے بھی مسنون الفاظ میں اللہ کے گھر کے مسافر کو اللہ کی ودیعت و حفاظت میں دیا، اور کہا:۔

استودع اللہ دینک وامانتک	میں اللہ کی امانت میں دیتا ہوں تمہارا دین
وخواتیم اعمالک۔	اور تمہاری امانت اور تمہارے اعمال کا انجام۔

جس وقت گھر سے نکلے سفر شروع ہو گیا اور زبان پر یہ مسنون الفاظ آ گئے، جو بالکل مناسب حال ہیں،

اللھم بک انتشرت والیک	اے اللہ میں تیرے سہارے چل کھڑا ہوا ہوں اور
توجھت وبک اعتصمت وعلیک	تیری طرف رخ کر دیا ہے اور تجھے مضبوط پکڑ لیا ہے اور
توکلت انت ثقتی و	تجھ پر بھروسہ کیا ہے۔ تو ہی میرا سہارا ہے
انت رجائی اللھم اکفنی ما اھمنی	تو ہی میری آس ہے جس کی مجھے فکر ہے اور جس کی مجھے
وما لا اھتم بہ وما انت	فکر نہیں اور جس کو تو ہی خوب جانتا ہے سب تو خود ہی
اعلم بہ منی عز جارک	انتظام فرما دے ... تیری پناہ میں آنے والا غالب ہو گیا

وجل ثنائك ولا اله غيرك	تیری مدح و توصیف بلند ہے، تیرے سوا کوئی
زودنی التقوىٰ واغفرلی	معبود نہیں، تقویٰ کو میرا زاد راہ بنا، میرے
ذنوبی ووجهنی للخير اينما	گناہوں کو معاف فرما، اور جس طرف رُخ کروں
توجهت۔	خیر ہی کی طرف میرا رُخ کر۔

گاڑی آگئی، مسافروں کو ایذا دیئے بغیر سوار ہوئے، سامان کو قرینہ سے رکھا، بقدرِ ضرورت جگہ گھیری، وضو اور نماز کا انتظام کر لیا، سفر کے اس ہنگامہ اور شور و غل میں بھی اپنے سفر کی عظمت اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف توجہ، اپنی بے بسی کا احساس قائم ہے، لوگوں سے محبت کے ساتھ رخصت ہوئے اور سفر کی کامیابی اور مقبولیت کے لئے خود ان سے دعا کی درخواست کی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اللہ کے ان سادہ دل بندوں میں کتنے مقبول بارگاہ ہوں گے، اور کتنوں کے جسم یہاں اور دل وہاں ہوں گے، اور کتنے بہت سے حجاج سے افضل ہوں گے۔

گاڑی روانہ ہوئی اپنے ہم سفروں سے تعارف حاصل ہوا، اُن کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ سفر کی سنّت اور حکم ہے کہ ساتھیوں میں سے ایک کو سفر کا امیر بنا لیا جائے، سب نے اتفاق کیا اور ایک صاحب علم اور منتظم رفیق کو امیر بنایا، انھوں نے سب کی خدمت و راحت کا عزم کیا، حج کے رفیقوں کو مخاطب کر کے اس سفر کی عظمت اور اس کے آداب و حقوق مختصر طریقے پر بیان کئے نماز کا وقت آیا، ساتھیوں کو نماز کی طرف متوجہ کیا اور اعلان کیا کہ انشاء اللہ نماز جماعت کیساتھ ہوگی، گاڑی جنکشن پر پہونچنے والی ہے، گاڑی ٹھہری، اپنی جگہ کے محفوظ رہنے کا انتظام کیا، سب نے وضو کیا، پلیٹ فارم پر اذان ہوئی، امام نے وقت کا خیال کرتے ہوئے مختصر نماز پڑھائی، لوگ اپنی اپنی جگہ آ گئے، موقع ہوا تو سنّتیں اور نوافل کھڑے بیٹھے پڑھ لئے، اگلی نماز کے وقت اتر کر پڑھنے کی مہلت نہ تھی، گاڑی کے اندر ہی جماعت کا اہتمام ہوا، مسافروں سے کہہ سُن کر جگہ کی، اور فرض کھڑے ہو کر ادا کئے، بعض نمازوں میں سب نے ایک ہی جماعت سے نماز پڑھی، بعض اوقات دو دو تین تین نے مل کر ایک ایک جماعت کر لی، رات کو سونے میں، اُترنے اور چڑھنے میں کسی چیز میں [illegible] کی نوبت نہیں پیش آئی (لاجدال فی الحج [illegible] جھگڑا نہیں) کی مشق یہیں سے شروع ہو گئی، الحمد للہ رفیقوں کو اعتماد اور مسافروں کو انس ہو گیا اس سے خود کو بھی

راحت ملی اور دوسروں کو بھی عافیت ہوئی، اور زیادہ خرچ کرنے سے بھی جو آرام نہ ملتا وہ ایثار و خدمت سے ملا، کم خرچ و بالانشیں اسی کو کہتے ہیں۔

راستہ میں دین ہی کا تذکرہ اور دین ہی کا مشغلہ رہا، شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی "فضائل حج" مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کی "زیارۃ الحرمین" مفتی صاحب مظاہر العلوم کی "معلم الحجاج" مولانا عبدالماجد دریابادی کا "سفر حجاز" شیخ عبدالحق دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی "جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب" ساتھ ہے۔ راستہ میں خواہ مخواہ کی وقت گزاری اور لایعنی گفتگو کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مولوی احتشام الحسن کاندھلوی کی "رفیق حج" کے متعدد نسخے ساتھ ہیں، ساتھیوں کو دیدئے کہ ایک دوسرے کو پڑھ کر سنائیں۔

بات کرتے کرتے آخری اسٹیشن آگیا، مسافر اترے، سامان اترا، سب کو اتار کر اور سب کچھ دیکھ بھال کر امیر صاحب اترے، قافلہ مسافر خانے پہونچا، سب اپنی اپنی جگہ مقیم ہوئے، مستورات کے پردہ کا پورا انتظام کیا، ابھی جہاز کی روانگی میں ایک ہفتہ باقی ہے، اکثر ضروریات سفر ہمراہ ہیں، پاسپورٹ بن چکا ہے، اگر نہیں بنا تو آسانی سے بن جائے گا، ٹکٹ کا مرحلہ بھی مشکل نہیں، سب کی صلاح ہوئی کہ یہ ہفتہ اپنی تیاری اور حجاج کی خدمت گذاری میں صرف ہو، سنا ہے کہ جس نوع کی خدمت مسلمانوں کی کی جائے اسی نوع کی مدد اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، جو مسلمان کو روٹی کھلائیگا اللہ اس کی روٹی کا انتظام فرمائے گا، جس کو مسلمانوں کی نماز کی فکر ہوگی اللہ اس کی نماز کی حفاظت اور اس کی ترقی کا انتظام فرمائے گا، اس لئے اگر حجاج کے حج کی صحت اور اس کی روح کی فکر کی جائے گی تو ہمیں بھی اپنے حج کی مقبولیت اور اس کی روحانیت کی امید کرنی چاہیئے، اللہ فی عون العبد ماکان العبد فی عون اخیہ (جبتک ایک شخص اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد میں رہتا ہے) قرار یہ پایا کہ حجاج کا دائرہ بہت وسیع ہے کسی ایک کے بس کی بات نہیں، اس لئے جماعتیں بنائی جائیں اور اجتماعی طور پر نظم و انتظام سے کام شروع کیا جائے خوش قسمتی سے تبلیغی جماعت کے افراد موجود ہیں جو حجاج کی دینی ضروریات کی تکمیل اور حج کے مسائل و فضائل لوگوں تک پہونچانے کی سعی کرتے ہیں ان کی جماعت کو تلاش کرکے ان میں شرکت کی جو معلومات کتابوں کے مطالعہ سے مشکل سے حاصل ہوتے وہ ان کے ذریعہ ان کے تجربوں سے آسانی سے

حاصل ہو گئے۔ مسافر خانہ اور حاجی کیمپ میں حجاج کی حالت دیکھ کر سخت قلق ہوتا ہے، حج کا سا عظیم الشان اور مقدس سفر جو سراسر عشق و محبت کی تکمیل اور ایمان و تقویٰ کی تصویر ہو اور حالت یہ کہ فرض نمازوں تک کا اہتمام نہیں، پیچ مسافر خانہ میں مسجد بنی ہوئی ہے جہاں پانچ وقت باآواز بلند اذانیں ہوتی ہیں، وضو و غسل کا اہتمام ہے مگر ذرا ذرا سی حقیقی و خیالی ضرورتوں کی وجہ سے بے تکلف جماعت چھوڑی جاتی ہے اس سے زیادہ تکلیف دہ منظر یہ ہے کہ بغیر کسی مشغولیت کے بھی بیسوں آدمی نمازیں قضا کرتے ہیں۔ وقت مقرر ہوا، جماعتیں بنیں، حجاج کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، سامان کی تیاری میں سخت انہماک ہے مگر اصل تیاری سے پوری غفلت، ضرورت کی کوئی چیز (جس کی ممکن ہے پورے سفر میں ضرورت نہ ہو) رہ نہ جائے مگر دین کے مبادی اور ارکان کی طرف بھی توجہ نہیں۔ سب سے اہم مسئلہ زندگی کی سب سے بڑی ضرورت اور حج کی بنیاد، مگر خدا معاف کرے ہمارے دوستوں کو بات سننے کی بھی فرصت نہیں، بہرحال خوشامد درآمد سے متوجہ ہوئے، دیکھ کر عقل حیران ہو گئی کہ کئی صاحبوں کا کلمہ تک درست نہیں۔ اور مفہوم سے تو بہت کم آشنا، جماعتوں کی حاضری کی طرف توجہ دلائی اور عرض کیا کہ مسافر خانہ کی مسجد میں فلاں وقت حج کے متعلق روزانہ کچھ عرض کیا جاتا رہے گا آپ ضرور تشریف لائیں یہ تیاری ہر تیاری پر مقدم ہے۔ ہمارے امیر صاحب نے اور دو ایک اور عالموں نے صبح اور عشاء کے بعد کچھ بیان کرنا بھی شروع کیا اور معلوم ہوا کہ حجاج میں احساس و توجہ کی ایک لہر پیدا ہوئی اور بہت سے لوگ گویا سوتے سوتے چونک پڑے۔ "الفرقان" میں کام کا جو نقشہ دیا گیا ہے اس کے مطابق تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا گیا، اور الحمد للہ بہت مفید و موثر ثابت ہوا۔

لیجئے جہاز کی روانگی کا دن آ پہونچا۔ آج بڑے ہنگامہ کا دن ہے، میدان حشر کا ایک نمونہ ہے نفسی نفسی کا عالم ہے، ہر ایک کو اس کی فکر ہے کہ اس کو اچھی سے اچھی جگہ ملے اور سامان محفوظ رہے قانونی مراحل سب طے ہوئے سامان جہاز پر پہونچا اب سوائے اللہ پر بھروسہ کے کوئی چارہ نہیں، جہاز پر داخلہ شروع ہو گیا، اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے یہ دن دکھایا، خدا وہ دن بھی دکھائے کہ سرزمین مقدس پر اترنا ہو، سفر عشق میں سامان راحت کا کیا سوال، پھر بھی اللہ کے احسان کے صدقے کہ ہم ضعیفوں کو امتحان میں نہیں ڈالا اور راحت و عافیت کی جگہ عطا فرمائی، لیجئے وہ سیٹی ہوئی،

وہ لنگر اٹھا، وہ ہاتھ سلام کے لئے اٹھے، وہ رومال وداع کے لئے ہلے، ان سب کو سب نے دیکھا، مگر بہتے ہوئے آنسوؤں کو کس نے دیکھا، اور گلوگیر آواز کو کس نے سنا۔ جانے والو! حج وزیارت تم کو مبارک، مومن کی معراج تم کو مبارک، ہم مہجوروں کو نہ بھولنا۔ ع

"ہمیں بھی یاد رکھنا ذکر جب دربار میں آئے"

جہاز روانہ ہوا، سامان قاعدے سے لگایا، نئی جگہ کا جائزہ لیا، اب بڑی فکر اس کی ہے کہ نمازوں کا انتظام کیا ہوگا، یہ بارہ چودہ دن جن سے زیادہ فرصت کے اوقات برسوں میں نصیب نہ ہوئے ہوں گے کس طرح گزریں گے، تیاری کی ایک مہلت اور عمر بھر کی غفلتوں کی تلافی کا ایک موقع ملا ہے، شامتِ اعمال سے یہ بھی کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ مشورہ کیا، چل پھر کر دیکھا معلوم ہوا کہ جہاز کی بالائی منزل پر نماز کے لئے ایک وسیع جگہ ہے، سمت قبلہ بتلانے کے لئے (جو جہاز پر ایک مشکل مسئلہ ہے) جہاز کی طرف سے انتظام ہے، چنانچہ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا گیا کہ اذانیں انشاء اللہ وقت پر ہوں گی، حاجی صاحبان نماز کے لئے اذان کا انتظار کریں ورنہ اس کا خطرہ ہے کہ بے وقت نماز پڑھ لی جائے، بالائی منزل پر نماز جماعت سے ہوگی، قبلہ بتلانے کے لئے جہاز کی طرف سے انتظام ہوگا، بغیر تحقیق کے نماز نہ پڑھی جائے۔ الحمدللہ جماعت شروع ہو گئی، امام و مؤذن کا تعین ہو گیا۔

خیال ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے اور حاجیوں کو ان کی قیام گاہوں پر مفید اور ضروری باتیں پہونچائی جائیں، چنانچہ ایسے اوقات میں جو کھانے اور ناشتہ اور سونے سے فراغت کے ہیں تقاریر کا انتظام کیا گیا، یہ کوشش کی گئی کہ دین کا عام احساس اور حج کی عظمت اور اس کے لئے تیاری کا خصوصی خیال پیدا کرنے والی اور دینی جذبات اور احساسِ ذمہ داری کو بیدار کرنے والی تقریریں کی جائیں، چنانچہ یہ سلسلہ شروع ہوا اور ہر مسافر نے بیٹھے بیٹھے لیٹے لیٹے اپنی اپنی جگہ اس سے فائدہ اٹھایا، مستورات بھی اس سے مستفید ہوئیں۔

جہاز کے دن بڑی فراغت و فرصت کے ہیں، زندگی کی سب سے بڑی صفت نقل و حرکت تھی، مکان، دکان، کارخانہ، دفتر، سڑک، باغ، شہر [illegible] کچھ نہیں۔ نیچے نیلا سمندر اور پر نیلا آسمان، ان دونوں کے درمیان لکڑی کے ایک تختہ پر انسانوں کی [illegible] آنا جانا چاہئے بھی

تو کہاں جائے، گھوم پھر کر وہی ایک محلہ، وہی لکڑی اور لوہے کا چھوٹا سا تیرتا ہوا گاؤں، نقل و حرکت کی جو کچھ عمر بھر کی عادت اور ہوس تھی چکر اور دردِ سر نے اس کو بھی پابند کر دیا، گویا سارے شوقین و بدشوق طالب علم امتحان سے پہلے مطالعہ کے ایک کمرے میں بند کر دیئے گئے، حیف ہے اگر اب بھی امتحان کی تیاری نہ کریں! خیال ہوا کہ جماعتوں کے گشت، انفرادی تبلیغ اور تعلیم و تلقین کا اس سے بہتر وقت اور مقام نہیں ہو سکتا، ناشتہ اور چائے کے بعد مسجد میں تعلیم کا اعلان ہوا، اور عصر کے بعد گشت کا نظام بنا، یہاں بھی وہی انکشاف جو پہلے ہوا تھا، دین کے مبادی و ارکان سے ناواقفیت، حج کے حقوق و آداب سے غفلت، آخر مسلمانوں کی یہ آبادی سمندر کے کسی جزیرہ سے تو نہیں آئی، اسی ہندوستان سے تو آئی ہے جہاں جہالت و غفلت عام ہے، حجاج مسلمانوں کی عام آبادی ہی کا جز ہیں، ان سے کسی چیز میں ممتاز اور عام حالات سے مستثنیٰ کس طرح ہو سکتے ہیں خصوصاً جبکہ ان کا بڑا حصہ علمی و دماغی حیثیت سے پسماندہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتا ہے[1]۔

حج کو جہاد کی ایک قسم کہا گیا ہے اور افضل قسم، افضل الجہاد حج مبرور، حضرت عمرؓ نے فرمایا شدوا الرحال فی الحج فانہ احد الجہادین "حج میں اپنے کجاوے مضبوط کسو اس لئے کہ وہ بھی ایک جہاد ہے" جہاز کا سفر اس سفرِ جہاد کا ایک مستقل شعبہ ہے۔ دردِ سر، چکر، امتلائی کیفیت اور اس میں نمازوں کی ادائی اچھا خاصا جہاد ہے، اس جہاد میں کامیابی بغیر دینی تربیت اور پختہ عزیمت کے ممکن نہیں، جو لوگ بغیر کسی عذر کے بھی نماز کے پابند نہیں اُن سے ایسی آزمائشوں کے ساتھ نماز و جماعت کا اہتمام بہت مشکل ہے، اس کے لئے بڑی ایمانی قوت کی ضرورت ہے اور اس ایمانی قوت کے پیدا کرنے کا ہمارے موجودہ نظامِ سفر میں کوئی اہتمام نہیں۔ الحمد للہ وعظ و تبلیغ سے کسی حد تک نفع ہوا، اور بہت سے لوگوں نے نمازوں کا اہتمام رکھا، جو لوگ دردِ سر و امتلائی کیفیت میں مبتلا تھے اور نقل و حرکت سے معذور تھے وہ اپنی جگہ پڑے پڑے بھی

---

[1] اگر خوش قسمتی سے تبلیغی جماعت موجود ہو تو فبہا اور اگر کسی جہاز پر نہ ہو تو مولانا محمد منظور صاحب نے حج کے سفر کے سلسلہ میں کام کا جو نقشہ شائع کیا ہے اُسی تشکیل کے مطابق جماعت بنائی جائے، اور کام شروع کر دیا جائے۔ ۱۲

اللہ کا ذکر زبان اور دل سے کرتے رہے۔

حج کے دو بڑے مستقل شعبے ہیں، ایک ضوابط و قوانین کا جس میں مومن کی اطاعت و انقیاد کا امتحان اور مظاہرہ ہے۔ ایک محبت و عشق کا جس میں اس کی عاشقانہ کیفیت اور والہانہ محبت کا ظہور مطلوب ہے، اور سچ پوچھئے تو حج کی رُوح اور حضرت ابراہیمؑ کی میراث یہی عشق و محبت ہے، حج میں انھیں دبی ہوئی چنگاریوں کا اُبھارنا اور اسی محبت کی تربیت و ترقی مقصود ہے۔ بعض طبیعتوں کے خمیر میں عشق و محبت داخل ہوتی ہے اُن کو حج سے فطری مناسبت ہوتی ہے، اس کے سب مشکلات ان کے لئے آسان اور اس کے سب مناسک و ارکان ان کی روح کی غذا اور ان کے درد کی دوا ہوتے ہیں۔ اگر یہ محبت و عشق فطری نہیں اور طبیعت خشک اور قانونی محض واقع ہوئی ہے تو مناسب ہے کہ اکتسابی طریقہ سے کسی نہ کسی درجہ میں محبت کی حرارت پیدا کی جائے، اس لئے کہ اس کے بغیر بعض اوقات حج ایک قالبِ بے رُوح ہو کر رہ جاتا ہے۔ محبت میں اکتساب کو بھی اچھا خاصا دخل ہے اس کے دو آزمودہ طریقے ہیں، ایک محبوب کے جمال و کمال اور اسکے محاسن و کمالات کا مطالعہ و مراقبہ، دوسرے اہلِ محبت کی صحبت اور اگر وہ میسر نہ ہو تو ان کے عاشقانہ واقعات، حج سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے یہ دونوں راستے ممکن ہیں، پہلے کا ذریعہ تلاوت اور ذکر و تفکر ہے دوسرے کا ذریعہ عشاق و محبین اور شہیدانِ محبت کے پراثر واقعات ہیں جس میں صدیاں گذر جانے کے بعد بھی تازگی اور گرمی باقی ہے۔ اور اب بھی وہ دلوں کی سرد انگیٹھیاں گرما دیتے اور بجھے ہوئے دلوں کو تڑپا دیتے ہیں۔ شیخ دہلوی کی "جذب القلوب" اور شیخ الحدیث سہارنپوری کی "فضائل حج" نیز حضرت جامی و خسرو کی عاشقانہ غزلیں اور نعتیہ کلام اس مقصد کے لئے بہت مفید ہے۔

اگر محبت کی یہ گرمی اور سوز فطری یا کسی طور پر موجود ہے تو روز بروز منزل کی کشش بڑھے گی، جب اس سرزمین مقدس کی جلی ہوئی پہاڑیاں اور تپتی ہوئی ریت دور سے کہیں کہیں دکھائی دے گی جس میں کوئی مادی کشش اور کوئی ظاہری حسن نہیں، تو سُبحان سے اس پر قربان ہو جانے کا جی چاہے گا اور اس کے ذرہ ذرہ میں دل آویزی اور محبوبیت معلوم ہو گی۔

لیجئے اعلان ہو رہا ہے کہ فلاں وقت ہمارا جہاز ہندوستانیوں کے میقات یلملم کے محاذات میں

پہونچے گا، حجاج احرام باندھنے کے لئے تیار رہیں۔ آج کئی دن سے تلبیہ کی مشق اور لبیک لبیک کی صدا گونج رہی ہے، دیکھتے دیکھتے وہ وقت آگیا، لوگ پہلے سے غسل کئے ہوئے نماز پڑھ کر احرام کی دو بے سلی چادریں ایک اوپر ایک نیچے باندھے تیار تھے، بعض کے سر پہلے سے کھلے اور بعض کے ڈھکے تھے کہ ایک دم سے سیٹی بجی، سر کھل گئے، اور ہر طرف سے صدا بلند ہوئی

لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے پہلے مدینۂ طیبہ کا عزم کیا ہے انھوں نے ابھی احرام نہیں باندھا، وہ مدینۂ طیبہ سے چل کر ذوالحلیفہ" سے جس کو آج کل "بیر علی" کہتے ہیں احرام باندھیں گے جو اہل مدینہ کا میقات ہے اور جہاں سے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے احرام باندھا تھا۔

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی، اب جدہ پہونچنے کی باتیں ہونے لگیں، تیر کی طرح ایک کشتی آئی، ارکانی عرب جہاز پر چڑھا اور حجاج یورپین کپتان کی ناخدائی سے نکل کر ایک باخدا جہاز ران کی رہنمائی میں آئے، بات کرتے کرتے جہاز لنگر انداز ہوا، ملاحوں کا لشکر غریب حجاج پر ٹوٹ پڑا، حجاج بادبانی کشتیوں اور موٹر لانچ کے ذریعہ جدہ کے پلیٹ فارم پر یعنے عرب کی سرزمین پر پہونچ گئے۔ ۵

هذا الذی کانت الایام تنتظر

فلیوف للہ اقوام بما نذروا

دل سینہ سے نکلا جاتا ہے، کیا واقعی ہم عرب کی سرزمین پر ہیں، کیا ہم اب دیارِ محبوب میں ہیں، کیا ہم مکۂ معظمہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہیں؟ ۔ ۶

آنچہ می‌بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

سامان کا انتظام کیا اور اپنا پاسپورٹ دکھاتے اور معلم کا نام بتاتے پلیٹ فارم سے باہر آئے، اللہ اللہ در و دیوار سے عاشقیت ٹپکتی ہے۔ مکۂ معظمہ ابھی دور ہے اور مدینۂ طیبہ اس سے بھی دور، جدہ کوئی مقدس مقام نہیں، نہ یہاں بیت اللہ نہ یہاں مسجد نبوی، نہ یہ حرم ابراہیمؑ نہ یہ حرم رسولؐ، لیکن محبت کا آئین نرالا ہے اس کو کیا کیجئے کہ جدہ کی گلیوں سے بھی انس اور محبت معلوم ہوتی ہے، غریب الدیار مسافر کو یہاں پہونچکر بوئے انس آئی، برسوں کی محبت نے

اپنی پیاس بجھائی۔ محبت فلسفہ اور قانون سے آزاد ہے، یہاں کے قلی اور مزدور، سیاہ فام سوڈانی، اور پیراہن دریدہ بدو بھی دل کو اچھے لگتے ہیں، یہاں کے دکانداروں، خوانچہ فروشوں کی صدائیں، معصوم بچیوں اور بچوں کی گیتیں جن میں وہ حجاج سے سوال کرتے ہیں، دل میں اتری چلی جاتی ہیں۔ محبت عقل کو تنقید کی فرصت ہی نہیں دیتی، اور اچھا ہے کہ کچھ دن اس کو فرصت نہ دے۔ ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

قافلہ کو پہلے مدینۂ طیبہ جانا ہے، دو تین دن حکومت کے مطالبات ادا کرنے میں اور موٹر کے انتظار میں گزرے، لیجئے انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں، موٹر آ گئی، موٹر پر سوار ہوئے، سامان بار کیا، اچھا ہے کہ ایک عربی داں سمجھدار ساتھی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ جائے تاکہ نماز پڑھنے اور ضروریات کے لئے رکنے میں آسانی ہو، بہتر ہے کہ ڈرائیور کے ساتھ کچھ سلوک کر دیا جائے راستہ میں بڑی راحت ملے گی، موٹر روانہ ہوئی، راستہ میں درود شریف سے بہتر کیا وظیفہ اور مشغلہ ہے، نمازوں کے اوقات میں موٹر رک گئی، اذان و جماعت کے ساتھ نماز ہوئی، منزلیں آئیں اور گزر گئیں، غربت کے مارے نیم برہنہ عرب بچے اور بچیاں جن کے جسم پر کپڑوں کے تار اور دھجیاں تھیں موٹر کا دور تک تعاقب کرتیں اور آخر تھک کر رہ جاتیں، ان کی غربت کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں کتنے صحابۂ کرام رض کی اولاد اور عراق و شام کے فاتحین کی نسل میں سے ہیں، ایمانی اور مادی حیثیت سے اگر کوئی شہزادہ کہلانے کا مستحق ہے تو ساری دنیا کے یہ شاہزادے اور دنیائے اسلام بلکہ عالمِ انسانیت کے محسنوں اور مخدوموں کی اولاد ہیں، بے حقیقت سکوں کے ساتھ جو آپ اپنی حقیر خواہشات میں بے دریغ خرچ کرتے رہتے ہیں، اگر آنسو کے چند قطرے بھی آپ بہا دیں تو شاید گناہوں کا کچھ کفارہ ہو جائے۔

نظر اٹھا کر دیکھئے یہ دونوں طرف پہاڑوں کی قطاریں ہیں، کیا عجب ہے کہ ناقۂ نبوی اسی راستہ سے گذری ہو، یہ فضا کی دلکشی یہ ہوا کی دل آویزی اسی وجہ سے ہے۔ ؎

الا ان وادی الجزع اضحی ترابہ ‫ ‫ من المسک کافوراً و اعوادہ رندا

الصلوٰة والسلام عليك يا
مخرج الناس باذن الله من الظلمت
الى النور الصلوٰة والسلام عليك
يا مخرج الناس من عبادة العباد
الى عبادة الله وحده
الصلوٰة والسلام عليك يا
مخرج الناس من جور الاديان
الى عدل الاسلام ومن ضيق الدنيا
الى سعة الدنيا والاخرة
الصلوٰة والسلام عليك يا صاحب
النعمة الجسيمة الصلوٰة والسلام
عليك يا صاحب المنة العظيمة
الصلوٰة والسلام عليك يا من
خلق الله على خلق الله اشهد
ان لا اله الا الله وحده وانك
عبده ورسوله قد بلغت الرسالة
واديت الامانة ونصحت الامة
وجاهدت فى الله حق جهاده
وعبدت الله حتى اتاك اليقين
فجزاك الله عن هذه الامة
خير ما جزى نبيا عن امته ورسولا
عن خلقه اللهم آت محمدا الوسيلة والفضيلة
وابعثه مقاما محمودا الذى وعدته انك

آپ پر صلوٰۃ و سلام اے لوگوں کو بندوں کی
بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل
کرنے والے، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے لوگوں کو
مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف
میں داخل کرنے والے اور دنیا کی تنگی سے نکال کر
دنیا اور آخرت کی وسعت میں پہونچانے والے
آپ پر صلوٰۃ و سلام اے انسانیت کے سب سے
بڑے محسن اے انسانوں پر سب سے بڑھ کر شفیق
اے وہ جس کا اللہ کی مخلوق پر اللہ کے بعد سب سے
بڑا احسان ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ
کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ کہ
آپ اللہ کے بندے اور اس کے پیغمبر ہیں،
آپ نے اللہ کا پیغام پوری طرح پہونچا دیا
امانت کا حق ادا کر دیا، امت کی خیرخواہی میں
کسر نہیں رکھی، اللہ کے راستے میں پوری پوری
کوشش کی اور وفات تک اللہ کی عبادت
میں مشغول رہے، اللہ آپ کو اس امت اور اپنی
مخلوق کی طرف وہ بہترین جزا دے جو کسی نبی.
اور رسول کو اس کی امت اور اللہ کی مخلوق
کی طرف سے ملی ہو، اے اللہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
کو قرب و بلندی اور وہ مقام محمود عطا فرما جس کا
تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے تو اپنے وعدے کے خلاف
نہیں کرتا، اے اللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور

لاتخلف المیعاد اللھم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم و علیٰ آلِ ابراھیم انک حمید مجید اللھم بارک علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما بارکت علیٰ ابراھیم و علیٰ آل ابراھیم انک حمید مجید۔

ان کی آل پر اپنی رحمتیں نازل فرما جیسی تونے ابراہیم (علیہ السلام) اور آل ابراہیمؑ پر نازل فرمائیں، تو حمید و مجید ہے۔ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آلِ محمدؐ پر برکتیں نازل فرما جیسی تونے ابراہیمؑ و آلِ ابراہیمؑ پر نازل فرمائیں بیشک تو حمید و مجید ہے۔

اس کے بعد دونوں رفیقوں اور وزیروں کو محبت کا خراج اور عقیدت کا نذرانہ سلام و دُعا کی شکل میں ادا کیا، اور قیام گاہ پر آئے۔

اب آپ ہیں اور مسجدِ نبویؐ، دل کا کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے، درود شریف پڑھنے کا اس سے بہتر زمانہ اور اس سے بہتر مقام کون سا ہو سکتا ہے، اب بھی شہود و حضور نہ ہو تو کب ہو گا، جنت کی کیاری (روضة من ریاض الجنة) میں نمازیں پڑھئے مگر دیکھئے کسی کو تکلیف نہ دیجئے، مزاحمت جگہ کو اپنے لئے محفوظ کرنا مسجد میں دوڑنا سب جگہ بُرا ہے مگر جہاں سے یہ احکام نکلے اور دنیا میں پھیلے وہاں ان کی خلاف ورزی تو بہت ہی مکروہ ہے، یہاں آواز بلند نہ ہو "ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون" یہاں دنیا کی باتیں نہ ہوں، مسجد کو گزرگاہ نہ بنایا جائے، بے وضو داخل ہونے سے حتی الامکان احتراز کیا جائے، خرید و فروخت سے اجتناب کیا جائے۔

دن میں جتنے مرتبہ جی چاہے حاضری دیجئے اور سلام عرض کیجئے آپ کے نصیب کھل گئے، اب کیوں کمی کیجئے، مگر ہر بار عظمت و ادب اور اشتیاق و محبت کے ساتھ دل کی ایک حالت نہیں رہتی، وہ بھی سوتا اور جاگتا ہے جاگے تو سمجھئے کہ نصیب جاگے حاضری دیجئے اور عرض کیجئے۔ ؎

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

کبھی اس کا جی چاہے گا کہ غلاموں کے وفود کے ساتھ ملا جلا حاضر ہو، عشاق کی آنکھوں سے جنھوں نے مہجوری کے دن کاٹے اور فراق کی راتیں بسر کیں جب آنسوؤں کا مینھ برسے گا تو شائد کوئی چھینٹا اس کو بھی تر کر جائے، رحمت کی ہوا جب چلے گی تو شائد کوئی جھونکا اس کو بھی لگ جائے، کبھی دبے پاؤں لوگوں کی نظر بچا کر تنہائی میں حاضر ہونے کا جی چاہے گا اس باب میں دل کی فرمائشیں سب پوری کیجئے کوئی حسرت باقی نہ رہے، کبھی صرف آنسوؤں سے زبان کا کام لیجئے، کبھی ذوق و شوق کی زبان میں

عرض کیجئے، درود شریف طویل بھی ہیں اور مختصر بھی جس میں جی لگے اور ذوق پیدا ہو اس کو اختیار کیجئے مگر اتنا خیال رکھئے کہ توحید کے حدود سے قدم باہر نہ جائے، آپ اس کے سامنے کھڑے ہیں جس کو ماشاء اللہ وشئت اور من یعصھما سننا گوارا نہ ہو سکا[1]، سجدہ کا کیا ذکر[2] خدا کی صفات میں، اس کی قدرت و تصرف میں، اس کی مشیئت و اختیار میں شرکت کا شائبہ بھی آنے نہ پائے، چاہے جامی کا کلام پڑھئے چاہے حالی کی دعا سنائیے، بس اتنا خیال رکھئے کہ آپ توحید کے سب سے بڑے اور آخری پیغمبر کے سامنے کھڑے ہیں جس کو شرک کا واہمہ بھی گوارا نہ تھا۔

اب ہم مدینۂ منورہ میں مقیم ہیں جہاں کی خاکروبی کو اولیاء و سلاطین سعادت سمجھتے تھے وہاں آپ ہر وقت حاضر ہیں، ایک ایک دن اور ایک ایک گھڑی کو غنیمت سمجھئے، پانچوں نمازیں مسجد نبوی میں جماعت کے ساتھ پڑھئے، اگر کہیں باہر جائیے بھی تو ایسے وقت کہ کوئی جماعت فوت نہ ہو، تہجد میں حاضر ہوئیے، یہ وقت سکون کا ہوتا ہے، لوگ روضۂ جنت کی طرف دوڑتے ہیں، وہاں تو بغیر دوڑے اور بغیر کشمکش جگہ پانی مشکل ہے، آپ پہلے مواجہ میں آئیے اس وقت شاید آپ کو صرف پہرہ دار (عسکری) ہی ملے، اطمینان سے سلام عرض کیجئے پھر جہاں جگہ ملے نوافل پڑھئے، اور صبح کی نماز پڑھ کر اشراق سے فارغ ہو کر باہر آئیے۔

آئیے آج بقیع چلیں جو انبیاء علیہم السلام کے مقابر کے بعد صدق و اخلاص کا سب سے بڑا مدفن ہے۔

"دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز"

---

[1] حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے کہا ماشاء اللہ وشئت (جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں) آپ نے ارشاد فرمایا اجعلتنی للہ ندا (کیا تم نے مجھے اللہ کے برابر کر دیا) ماشاء اللہ وحدہ جو اللہ ہی چاہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصھما فقد غوی (جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے راہِ راست پر ہوا اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے وہ گمراہ ہوا) حضورؐ نے اسکو ناپسند کیا کہ اللہ تعالیٰ کا اور آپؐ کا ذکر اس طرح ایک لفظ میں کیا جائے جس سے دونوں کی برابری محسوس ہو، آپ نے فرمایا بئس خطیب القوم انت تم بہت برے مقرر ہو۔ [2] حضورؐ نے حضرت قیس بن سعد صحابی سے فرمایا بھلا تم اگر میری قبر کے پاس سے گزرو تو سجدہ کرو گے؟ قیس نے کہا نہیں۔ فرمایا تو پھر مجھے (زندگی میں) بھی نہ کرو۔ (ابوداؤد کتاب النکاح)

اگر آپ کی سیرت نبوی، صحابۂ کرام رضؓ کے احوال و مراتب پر نظر ہے تو آپ کو وہاں صحیح احساس ہوگا آپ ہر قدم پر رکیں گے اور ایک ایک خاک کے ڈھیر کو اپنے آنسوؤں سے سیراب کرنا چاہیں گے، یہاں چپہ چپہ پر ایمان و جہاد اور عشق و محبت کی تاریخ کندہ ہے، ایک ایک ڈھیر میں اسلام کا خزانہ دفن ہے، اب آپ بقیع میں داخل ہو گئے، مزور آپ کو سیدھا اہل بیت اطہار کے مقابر پر لیجائے گا یہاں عم رسول سیدنا عباس بن عبد المطلب، سیدۃ نساء اہل الجنۃ فاطمہ بنت الرسول، سیدنا حسن بن علیؓ سیدنا علی بن الحسین زین العابدین، سیدنا محمد الباقر، سیدنا جعفر الصادق آرام فرما ہیں۔ وہاں سے چلئے تو حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت خدیجہ و میمونہ کے علاوہ تمام ازواج مطہرات پھر بنات طاہرات کے مقابر ملیں گے، پھر دار عقیل بن ابی طالب جہاں ابو سفیان بن الحارثؓ بن عبد المطلب دعبد اللہ بن جعفر وغیرہ مدفون ہیں۔ پھر آپ کو ایک ٹکڑہ ملے گا جس میں امام دار الہجرۃ سیدنا مالک بن انس صاحب المذہب اور ان کے استاد نافع آرام فرما ہیں۔ وہاں سے بڑھئے تو ایک بقعۂ انوار ملے گا، یہ ایک مہاجر کا پہلا مدفن ہے یہاں وہ عثمان بن مظعون دفن ہیں جن کی پیشانی کو حضورؐ نے بوسہ دیا تھا، یہی فرزند رسول سیدنا ابراہیم بن محمدؐ کی خواب گاہ ہے، یہیں فقیہ صحابہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود، فاتح عراق سعد بن ابی وقاص، سیدنا سعد بن معاذ جن کی وفات پر عرش الٰہی جنبش میں آگیا تھا، سیدنا عبد الرحمن بن عوف اور دوسرے اکابر صحابہ مدفون ہیں۔ وہاں سے آگے چلئے تو شمالی مغربی جانب دیوار سے متصل وہ ستر شہداء صحابہ و اہل مدینہ جن کو واقعہ حرہ میں یزید کے دورِ حکومت میں ۶۳ھ میں شہید کیا گیا تھا مدفون ہیں، اس کے بعد بقیع کے بالکل کونہ پر مشرقی شمالی جانب امام مظلوم شہید الدار سیدنا عثمان بن عفانؓ آرام فرما رہے ہیں، یہاں پر کچھ دیر ٹھہریئے اور محبت و عظمت کے جو آنسو سیدنا ابو بکرؓ و سیدنا عمرؓ کے مرقد پر بہنے سے بچ رہے تھے ان کو ان کے تیسرے ساتھی کی خاک پر بہائیے۔ ؎

آسماں اسکی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اس کے آگے سیدنا ابو سعید خدری، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی والدہ فاطمہ بنت الاسد کے مقابر ہیں سب کو سلام عرض کیجئے اور سب پر فاتحہ پڑھئے۔

پھر ایک لمحہ ٹھہر کر پورے بقیع پر عبرت و تفکر کی ایک نظر ڈالئے۔ اللہ اکبر کتنے سچے تھے یہ اللہ کے بندے،

جو کچھ کہتے تھے کر دکھایا رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللهَ عَلَيْهِ. مکہ میں جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا مدینہ میں اسی کے قدموں میں پڑے ہیں۔ ؎

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

گنبدِ خضرا پر ایک نظر ڈالئے پھر مدینہ کے اس شہرِ خموشاں کو دیکھئے صدق و اخلاص استقامت و وفا کی اس سے زیادہ روشن مثال کیا ملے گی، آیئے بقیع میں اسلام کی خدمت کا عہد کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اسلام ہی کے راستہ پر زندہ رکھے اور اسی کے ساتھ وفاداری میں موت آئے، جنت البقیع کا یہی پیغام اور یہاں کا یہی سبق ہے۔

مدینہ طیبہ کی زندگی کا ایک شعبہ اور ہے اور وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہمسایوں کی خدمت ہے اصل خدمت تو یہ تھی کہ ان کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا، ان کو فارغ البال بنانے کی تدبیریں کیجاتیں، لیکن اس تھوڑے سے وقت میں یہ بھی بڑی سعادت ہے کہ جن لوگوں کو زمانہ کے انقلاب اور زندگی کی گرانی نے مفلوک الحال بنا دیا ہے اپنا شرف سمجھ کر ان کی خدمت کی جائے لیکن اس طرح کہ اصل محسن ان کو سمجھا جائے کہ وہ ہم کو اس سعادت کا موقع دیتے ہیں، یہ انصار و مہاجرین کی اولاد ہیں، آستانۂ نبوی پر پڑے ہوئے ہیں کوشش کی جائے کہ واقفینِ حال اور قدیم باشندوں کے ذریعہ ان لوگوں تک پہونچا جائے جن کی صفت قرآن مجید میں بیان کی گئی، لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا۔

قبا میں بھی حاضری دیجئے، یہ وہ بقعۂ نور ہے جو حضور اکرم صلعم کے قدوم سے مدینہ سے بھی پہلے مشرف ہوا وہاں اس مسجد کی بنیاد رکھی گئی جس کو لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ کا خطاب ملا، محبت و عظمت کے ساتھ حاضر ہوئیے، اس زمین پر نماز پڑھئے پیشانی خاک پر رکھئے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا کے قدموں سے پامال ہوئی ہے، اس فضا میں سانس لیجئے جس میں وہ انفاسِ قدسیہ اب بھی بسے ہوئے ہیں۔ ؎

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ اربابِ نظر خواہد بود

آج جبل احد اور اس کے شہدا میں (جس کو یہاں عرف عام میں سیدنا حمزہ کہتے ہیں) حاضری کی باری ہے، دو تین میل کی مسافت کیا بات کرتے کرتے پہونچ گئے، یہ وہ زمین ہے جو اسلام کے سب سے قیمتی خون سے سیراب ہوئی، سب سے سچے سب سے اچھے سب سے اونچے عشق و محبت اور وفا کے واقعات جو دنیا کی پوری تاریخ میں نہیں ملتے اسی زمین پر پیش آئے، سید الشہداء حمزہؓ کے رسول اللہؐ کی محبت اور اسلام کی وفاداری میں یہیں اعضا کاٹے گئے اور جگر کھایا گیا، عمارۃ بن زیاد نے قدموں سے آنکھیں مل مل کر یہیں جان دی، انس بن النضر کو جنت کی خوشبو اسی پہاڑ کے درے سے آئی، اور اسّی سے اوپر زخم کھا کر یہیں سے رخصت ہوئے، دندان مبارک یہیں شہید ہوئے، سر پر زخم یہیں آئے، عشاق نے اپنے ہاتھوں اور پیٹھ کو محبوب کے لئے سپر یہیں بنایا، مکہ کا ناز پروردہ مصعب بن عمیرؓ یہیں ایک کمل میں شہید اور ایک کمل میں دفن ہوا، یہاں اسلام کے شیر سوتے ہیں، یہ پوری زمین شمع نبوت کے پروانوں کی خاک ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عشاق اور اسلام کے جاں نثاروں کی بستی ہے۔

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے!
قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں!

یہاں کی فضا اور یہاں کے پہاڑ سے اب بھی موتوا علی مامات علیہ رسول اللہ (اسی پر جان دے دو جس پر رسول اللہؐ دنیا سے گئے)[1] کی صدا لئے بازگشت آتی ہے، آئیے اسلام پر جینے اور جان دینے کا عہد پھر تازہ کریں۔

مدینۂ طیبہ کے ذرہ ذرہ کو محبت و عقیدت کی نگاہ سے دیکھئے، تنقید کی نگاہ اور اعتراض کی زبان کے لئے دنیا پڑی ہوئی ہے۔ زندگی کے چند دن کانٹوں سے الگ پھولوں میں گذر جائیں تو کیا حرج ہے، پھر بھی اگر آپ کی نگاہ کہیں رکتی اور اٹکتی ہے تو غور سے کام لیجئے وہ ہماری

---

[1] یہ قول حضرت انس بن النضر کا ہے، انھوں نے بعض صحابہ کو میدان احد میں بیٹھا ہوا دیکھا پوچھا کیوں بیٹھے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ختم ہو گئے اب لڑ کر کیا کریں گے؟ کہا تو پھر اسی پر تم بھی جان دے دو جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان دی۔

کوتاہی کے سوا اور کیا ہے، ہم نے دین و دنیا کی خیرات یہیں سے پائی، آدمیت یہیں سے سیکھی، یہاں کی دستگیری نہ ہوتی تو ہم میں سے کتنے (معاذ اللہ) بتخانہ، آتش کدہ اور کلیسا میں ہوتے، لیکن ہم نے اس کا کیا حق ادا کیا، یہاں کے بچوں کی تعلیم و تربیت، یہاں کے لوگوں میں دین کی رُوح اور مقصد کا احساس پیدا کرنے کی کیا کوشش کی، فاصلہ کا عذر صحیح نہیں، ان کے بزرگوں نے سمندر اور صحرا عبور کر کے اور پہاڑوں کو طے کر کے دین کا پیغام ہم تک پہونچایا، ہم نے بھی اپنے فرض کا کبھی احساس کیا؟ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ دین کے احسان کا بدلہ ہم چند سکوں سے ادا کر دیں گے جو ہمارے حجاج اپنی کم نگاہی سے احسان سمجھ کر مدینہ کی گلیوں میں بانٹتے پھرتے ہیں۔

ہم صدیوں غافل رہے اور اب بھی ہمارے اہلِ استطاعت غافل ہیں، اس عرصہ میں جہالت، بے تربیتی، اور یورپ کی تہذیب و تمدن اور اس کی جاہلیت جس کا جال ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے یہاں بھی اپنا کام کرتی رہی، ان کے نوجوانوں کو متاثر کرتی رہی، بجائے خوبیوں اور محاسن کے تمام عالم اسلام کے حجاج و زائرین اپنی اپنی مقامی کمزوریاں اپنے ساتھ لاتے رہے اور یہاں چھوڑ کر جاتے رہے، دینی دعوت و تذکیر جو ایمانی زندگی کے لئے ہوا اور پانی کی حیثیت رکھتی ہے عرصہ سے مفقود، صحیح تعلیم و تربیت معدوم، ایسا ادب جو ایمان کو غذا اور دماغ کو روشنی عطا کرے نایاب، تزکیہ نفس تہذیب اخلاق اور روحانیت پیدا کرنے والے مرکز غیر موجود، مختلف راستوں سے مریض و مدقوق ادب، فاسد و خام افکار و مضامین اخبارات و رسائل ادب و اجتماع کے نام سے گھر گھر پھیلے ہوئے، زہر موجود تریاق مفقود، اگر اب بھی اہلِ مدینہ میں دین کی اتنی عظمت و محبت، رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تعلق، مدینہ سے اُنس اخلاق میں لینت و تواضع فرائض کی پابندی، شعائر اسلامی کا رواج ہے تو یہ محض جوارِ رسُولؐ کی برکت، اس خاکِ پاک کی تاثیر اور اہلِ مدینہ کی فطری خوبی کی دلیل ہے۔

اب بھی اغنیاءِ امت اور عالمِ اسلام کے اہل ثروت اس ضرورت کی طرف متوجہ نہیں، کہ اہل حجاز کی صحیح تعلیم و تربیت اور ان میں دعوت و تذکیر کا انتظام کریں جو ان میں دینی روح، مقصدیت، بلند نظری، اور اسلام کے داعی بننے کا جذبہ اور ولولہ پیدا کر دے اور "معمارِ حرم" کو "تعمیرِ جہاں" کیلئے دوبارہ آمادہ کرے اِنَّمَا اَشْکُوْ بَثِّیْ وَحُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ۔

آپ اگر مدینہ طیبہ کے مضافات اور بدوؤں کی ان عارضی نو آبادیوں میں چل پھر کر دیکھیں گے جو

کھجوروں کی فصل میں اپنے پہاڑی مقامات سے اتر کر چشموں اور باغات میں اپنے خیمے ڈال کر مقیم ہوجاتے ہیں، تو آپ کو ان کی دینی حالت کا احساس ہوگا، اور اگر ہمارا ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا ہے تو ہم اپنی اس غفلت و کوتاہی پر شرم محسوس کریں گے جو ہم نے اپنے "مرشد زادوں" کے حق میں صدیوں سے اختیار کر رکھی ہے۔ آپ کا اگر تھوڑا وقت نظم و انضباط کے ساتھ مدینہ کی آبادی اور اس کے اطراف میں دینی دعوت و اصلاح میں گذر جائے گا تو وہ مدینہ طیبہ کی فضا سے انتفاع کی بڑی موثر صورت ہوگی، مگر ان کی عظمت اور ان کے مرتبہ کی رعایت ضروری ہے ان کو تحقیر کی نگاہ سے ہرگز نہ دیکھیں۔

مدینہ دعوتِ اسلامی کا معدن ہے اس دعوت کو اس معدن سے اخذ کیجئے اور اپنے اپنے ملک کے لئے یہ سوغات لیکر آئیے، کھجوریں، گلاب دیو دینہ، خاکِ شفا، محبت کی نگاہ میں سب کچھ ہیں مگر اس سرزمین کا اصلی تحفہ اور یہاں کی سب سے بڑی سوغات دعوت اور اسلام کے لئے جدوجہد اور جان دیدینے کا عزم ہے، مدینہ مسجد نبویؐ کے چپہ چپہ، بقیع شریف کے ذرہ ذرہ، احد کی ہر ہر کنکری سے یہی پیغام دیتا ہے، مدینہ آکر کوئی یہ کیسے بھول سکتا ہے کہ اس شہر کی بنیاد ہی دعوت و جہاد پر پڑی تھی، یہاں وہی لوگ مکہ سے آکر آباد ہوئے تھے جن کے لئے مکہ میں سب کچھ تھا مگر دعوت و جہاد کے مواقع نہ تھے، یہاں کی آبادی دو ہی حصوں پر منقسم تھی ایک وہ جس نے اپنا عہد پورا کر دیا اور اسلام کے راستہ میں جان جان آفرین کے سپرد کر دی، کوئی خوف کوئی ترغیب اس کو اپنے مقصد سے باز نہ رکھ سکی، دوسرا وہ جس نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی لیکن اللہ کو ابھی ان سے اور کام لینا منظور تھا، ان کا جو وقت گذرتا حالت انتظار میں گزرتا، شہادت کے اشتیاق میں گزرتا "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا" یہی عالم اسلام کا حال ہونا چاہئے، یہاں بھی یا تو وہ ہونے چاہئیں جو اپنا کام پورا کر چکے، یا وہ جو وقت کے منتظر ہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی جو زندگی کے حریص اور دنیا پر راضی، موت سے خائف اور خدمت سے گریزاں ہوں، معاش میں سرتاپا منہمک اور عارضی مشاغل میں ہمہ تن غرق ہوں انکی گنجائش نہ مدینہ میں تھی نہ عالم اسلام میں ہونی چاہئے۔

مدینہ طیبہ کے قیام میں درود شریف تلاوت قرآن اور اذکار سے جو وقت بچے اگر حدیث اور سیرت و شمائل کے مطالعہ میں گذرے تو بہت پر تاثیر اور بابرکت ہوگا، اسی پاک زمین پر یہ سب واقعات

پیش آئے۔ یہاں ان واقعات کا مطالعہ اور کتب شمائل میں مشغولیت بہت کیف آور اور موجب ترقی ہوگی۔ اُردو خواں حضرات قاضی سلیمان صاحب منصور پوریؒ کی "رحمۃ للعالمین" اور شیخ الحدیث سہارنپوری کی "خصائل نبویؐ" (ترجمہ شمائل ترمذی) کو حرز جان بنائیں۔ اہل عربیت حافظ ابن قیمؒ کی "زاد المعاد" اور "شمائل ترمذی" سے اشتغال رکھیں۔ جن کو آثار مدینۂ منورہ کی زیارت و تحقیق کا ذوق ہو اُن کے لئے سمہودیؒ کی "وفاء الوفا باخبار دار المصطفٰے" اور "آثار المدینۃ المنورہ" کا مطالعہ مفید ہوگا۔

لیجئے قیام کی مدّت ختم ہونے کو آئی، کل کہتے ہیں کہ قافلہ کا کوچ ہے۔ ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اب رہ رہ کر اس قیام کے سلسلہ کی کوتاہیاں اور یہاں کے حقوق کی ادائی میں اپنی تقصیر دل میں چٹکیاں لیتی ہے، اب استغفار و ندامت کے سوا کیا چارہ ہے۔

آج کی رات مدینہ کی آخری رات ہے، ذرا سویرے سے مسجد میں آجایئے۔ ؎

تمتع من شمیم عرار نجد

فما بعد العشیۃ من عرار

لیکن دل کو ایک طرح کا سکون بھی حاصل ہے، آخر جا کہاں رہے ہیں؟ اللہ کے رسولؐ کے شہر سے اللہ کے شہر کی طرف، اللہ کے اس گھر سے جس کو محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنے پاک ہاتھوں سے بنایا، اللہ کے اس گھر کی طرف جس کو ان کے جد ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور انکے فرزند نے اپنے پاک ہاتھوں سے بنایا، اور جا کیوں رہے ہیں؟ اللہ کے حکم سے اور اللہ کے رسولؐ کی مرضی اور ہدایت سے، یہ دوری دوری کب ہوئی۔ ؎

نہ دوری دلیلِ صبوری بود

کہ بسیار دوری ضروری بود

آخری سلام عرض کیا، مسجدِ نبویؐ پر حسرت کی نگاہ ڈالی، اور باہر نکلے غسل کر کے احرام کی تیاری کر لی تھی، ذوالحلیفہ میں جانے موقع ملے نہ ملے، موٹر پر بیٹھے، محبوب شہر پر محبت کی نگاہ ڈالتے چلے احد کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، اب مدینہ سے باہر ہو گئے جو لمحہ گذرتا ہے مدینہ دُور اور مکہ قریب

ہوتا جاتا ہے۔ الحمد للہ کہ ہم حرمین کے درمیان ہی ہیں۔

"صد شکر کہ ہستم میان دو کریم"

ذوالحلیفہ آگیا، مسجد میں دو رکعت نماز احرام کی نیت سے پڑھی، سلام پھیرتے ہی سر کھول دیا اور ہر طرف سے آواز آئی۔

لبیك اللهم لبیك لبیك لا	حاضر ہوں، اے اللہ حاضر ہوں، تیرا کوئی
شریك لك لبیك ان الحمد	شریک نہیں حاضر ہوں، سب تعریف، سارا
والنعمة لك والملك لا	احسان تیرا ہی ہے، سلطنت تیری ہی ہے،
شریك لك ه	تیرا کوئی شریک نہیں۔

مستورات نے تمتع کی نیت کی، ہم نے قراں کی نیت کی، مستورات کے لئے چہرہ نہ ڈھکنے کی پابندی سخت ہے اس لئے وہ عمرہ کر کے احرام کھول دیں گی، پھر آٹھ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھیں گی۔ ہم مردوں کے لئے کچھ زیادہ دشواری نہیں اس لئے ہم نے عمرہ اور حج کا احرام ساتھ باندھا، ہم دس ذی الحجہ کو حج سے فارغ ہو کر ہی احرام کھولیں گے۔

ہمارے امیر حج صاحب نے حج کی ذمہ داری اور اس کے حقوق و آداب کے متعلق مختصر تقریر کی، تلبیہ (لبیک لبیک) کی کثرت، حج کی عظمت، حسنِ رفاقت، باہمی الفت، ایثار و خدمت کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا، اور لبیک لبیک کی صدا کے ساتھ قافلہ روانہ ہوا۔

راستہ میں الحمد للہ نماز و جماعت کا پورا اہتمام رہا، تلبیہ زبانوں پر جاری رہا، لڑائی جھگڑے کی نوبت ہی نہ آنے پائی، منزلوں پر ٹھہرتے، نمازیں پڑھتے، کھاتے پیتے نہایت لطف و مسرت اور محبت و الفت کے ساتھ چلتے رہے۔

جدہ آیا اور گذر گیا، اب شہنشاہ ذوالجلال کا شہر اور اس کا گھر قریب ہے، باادب و ہوشیار! مدینہ اگر مرکز جمال تھا تو یہ مرکز جلال ہے، مدینہ کی در و دیوار سے اگر محبوبیت ٹپکتی ہے تو یہاں کے در و دیوار سے عاشقی نمایاں ہے، یہاں عاشقانہ آنے کی ضرورت ہے۔ برہنہ سر، کفن بردوش پریشاں بال یہی یہاں کے آداب میں سے ہیں۔

ذرا اٹھا ئیے نگہ سامنے نظر آرہا ہے۔

اللھم اجعل لی بھا قرارًا وارزقنی فیھا	اے اللہ مجھے اپنے شہر میں ٹھکانا عطا فرما، اور
رزقًا حلالاً ؕ	مجھے اس میں رزق حلال نصیب فرما۔

لیجئے اب ہم اللہ کے شہر بلد اللہ الحرام، البلد الامین میں داخل ہو گئے، جس شہر کا نام تسبیح کی طرح بچپن سے ہر مسلمان کی زبان پر جاری رہتا ہے، جس کا اشتیاق جنت کی طرح ہر مومن کے دل میں رہتا ہے جو ہر مسلمان کا ایمانی اور دینی وطن ہے، جس کی کشش ہر زمانے میں ہزاروں میل کی مسافت، پہاڑوں کی چوٹیوں اور وادیوں کی گہرائیوں سے مشتاقانِ زیارت کو کھینچتی رہی۔ لیجئے مسجد حرام پر پہونچ گئے، باب السلام سے داخل ہوئے، یہ سیاہ غلاف میں ملبوس مسجد حرام کے بیچوں بیچ بیت اللہ نظر آ رہا ہے۔

اللھم زد ھٰذا البیت تشریفا وتعظیما	اے اللہ اس گھر کی عزت و عظمت، شرافت و ہیبت
وتکریما ومھابۃ وزد من شرفہ وکرمہ	میں ترقی فرما، اور حج وعمرہ کرنے والوں میں بھی
ممن حجہ او اعتمرہ تشریفا وتکریما وتعظیما	جو اس کی تعظیم و تکریم کرے اسکو بھی شرافت و عظمت
وبرًا اللھم انت السلام ومنک السلام	اور نیکی عطا فرما، اے اللہ تیرا ہی نام سلام ہے اور
فحینا ربنا بالسلام ؕ	سلامتی تیری ہی طرف سے ہے، ہم پر سلامتی بھیج۔

یہی بیت اللہ ہے جس کی طرف ہزاروں میل کے فاصلہ سے ساری عمر نمازیں پڑھتے رہے، جس کی طرف نماز میں منھ کرنا فرض تھا، آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، ہمارے اور اس کے درمیان چند گز سے زیادہ فاصلہ نہیں، ہم اپنے گنہگار ہاتھوں سے اس کے غلاف کو چھو سکتے ہیں، اس کو آنکھوں سے لگا سکتے ہیں، اس کی دیواروں سے چمٹ سکتے ہیں۔ عمر میں بڑی بڑی حسین و جمیل عمارتیں اور فن تعمیر کے بڑے بڑے نمونے دیکھے، لیکن اس سادہ سے چوکور گھر میں خدا جانے کیا حُسن و جمال اور کیا دل کشی و محبوبیت ہے کہ آنکھوں میں کھپا جاتا ہے اور دل میں سمایا جاتا ہے، کسی طرح نظر ہی نہیں بھرتی۔ تجلیاتِ الٰہی اور انوار کا ادراک تو اہل نظر کر سکتے ہیں لیکن جلال و جمال کا ایک پہلو ہم جیسے بے حسوں اور کم نظروں کو بھی نظر آتا ہے اور یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دیکھنے سے آنکھوں کو سیری اور دل کو آسودگی نہیں ہوتی؛ جی چاہتا ہے کہ دیکھتے ہی رہئے۔ اس کی مرکزیت و موزونیت، اس کی زیبائی و رعنائی، جلال و جمال کی آمیزش الفاظ سے بالاتر ہے۔ ؎

محاسنہ ھیولے کل حسن ومغناطیس افئدۃ الرجال

اس کا دیکھتے رہنا دل کا سرور، آنکھوں کا نور، رُوح کی غذا اور نظر کی عبادت ہے، دل کی کلفت اس سے کافور، دماغ کا تکان اس سے دور ہوتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے عجیب نعمت عطا فرمائی ہے سارے عالم کی دل کشی اور دل آویزی اس میں سمٹ کر آگئی ہے۔

ذی الحج کا مہینہ شروع ہو چکا ہے، حجاج کا ہجوم ہے، بیت اللہ کے گرد طواف کرنے والوں کا چکر چل رہا ہے، سیاہ غلاف کے چاروں طرف سفید احرام میں ملبوس انسانوں کی گردش، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ کعبہ کے گرد دودھ کی ایک نہر بہہ رہی ہے، ہم بھی آدمیوں کے اس بہتے ہوئے دریا میں داخل ہوگئے، ہمارے معلم ہمارے ساتھ تھے انھوں نے ہمیں طواف کرایا، وہ طواف کی دعائیں پڑھتے جاتے تھے ہم اس کو دُہراتے تھے۔ پھر ہم کو محسوس ہوا کہ اس طرح نہ تو طواف کا لُطف آرہا ہے نہ دُعاؤں کا اس لئے جو مسنون دعائیں یاد تھیں ہم نے وہ پڑھنی شروع کر دیں۔ چونکہ ہم کو اس طواف کے بعد سعی بھی کرنی تھی اس لئے ہم نے رمَل و اضطباع بھی کیا، ہجوم کی وجہ سے استلام (حجر اسود کو بوسہ دینے) کی نوبت نہیں آتی تھی، حجر اسود کے سامنے پہونچ کر ہاتھ کا اشارہ کر دیتے تھے۔ طواف کے بعد ہم مقام ابراہیمؑ پر آئے، اور دو رکعت واجب الطواف پڑھی، پھر ملتزم پر آئے، یہ حجر اسود اور باب کعبہ کے درمیان کا حصہ ہے یہاں اللہ کے بندے بیت اللہ کی دیوار اور اس کے غلاف سے چمٹے ہوئے[1] اس طرح بلک بلک کر رو رہے تھے اور اللہ کے گھر کا واسطہ دے کر اس کی چوکھٹ سے لپٹ کر اللہ سے مانگ رہے تھے جس طرح ستائے ہوئے بچے اپنی ماں سے چمٹ کر روتے اور بلبلاتے ہیں، جس وقت وہ

یا رب البیت یا رب البیت — اے گھر والے، اے گھر کے مالک

کہتے، تو ایک کہرام مچ جاتا، سخت سے سخت دل بھی بھر آتا، آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور دعاؤں کی

---

[1] عبد الرحمٰن بن صفوان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کو بیت اللہ سے نکلتے ہوئے دیکھا انھوں نے بیت اللہ کو ملتزم کی جگہ پر بوسہ دیا، انکے رخسار کعبہ پر تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انکے درمیان میں تھے۔ (ابوداؤد باب الملتزم)

محمد بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد عبد اللہ بن عمرو کو دیکھا کہ انھوں نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور ملتزم پر ٹھہرے اور اپنا سینہ اور چہرہ اور اپنی دونوں بانہیں اور ہتھیلیاں اس پر رکھ دیں اور ان کو اچھی طرح پھیلا دیا یعنی چمٹ گئے، پھر فرمایا کہ میں نے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ہے۔ (ابوداؤد باب الملتزم)

قبولیت کا ایک اطمینان سا ہونے لگتا، خدا کی طرف رجوع و انابت کا یہ ایک ایسا منظر تھا کہ دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس امت کو اس گئی گزری حالت میں بھی اپنے مالک سے جو تعلق ہے اس کا عشر عشیر بھی کہیں نظر نہیں آتا معلوم ہوتا تھا کہ دل سینہ سے نکل جائیں گے قلب و جگر آنسو بن کر بہہ جائیں گے، لوگ غش کھا کر گر جائیں گے۔ ان دعاؤں میں بڑا حصہ مغفرت و عفو، رضاء الٰہی، حسن خاتمہ اور جنت کی دعاؤں کا تھا، اللہ سے کسی مادی سے مادی چیز کا مانگنا بھی عبدیت نہیں سراسر روحانیت و عبادت ہے لیکن ان دعاؤں میں آخرت اور روحانیت کا حصہ اس عالم مادی کی چیزوں سے بہر حال زیادہ تھا، افکار و پریشانیوں کے اس دور میں اللہ کے بہت سے بندے صرف اللہ کی محبت، توفیق اطاعت، شان عبودیت، اخلاص، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت، عشق کامل اتباع سنت، دین کی خدمت اور اسلام پر جینے اور مرنے کی دعا کر رہے تھے۔ بہت سے اللہ کے بندے اپنی دنیاوی ضروریات کو بے تکلف مانگ رہے تھے کہ وہ کریم ہے اس کے دروازہ اور اس کے آستانہ پر نہ مانگی جائیں گی تو کس سے اور کہاں مانگی جائیں گی۔ بہت سے اللہ کے بندے کعبہ کے پردہ میں منھ ڈالے ہوئے گریہ و بکا اور مناجات و دعا میں مشغول تھے، غرض یہاں سائلوں کا ہجوم اور فقراء کا جمگھٹا تھا، رب کریم کا دروازہ کھلا تھا، اور بے صبر و مضطر سائل سوال و طلب میں بالکل کھوئے ہوئے تھے۔

ملتزم سے ہم زمزم پر آئے، پہلی مرتبہ آسودہ ہو کر زمزم شریف پیا، اس کے اصل مقام پر پیا، پھر باب الصفا سے نکل کر ہم سعی کے لئے مسعیٰ میں آئے۔ ہمیشہ سے یہ تصور تھا کہ صفا اور مروہ دو پہاڑ ہیں ان کے درمیان ایک غیر آباد سا راستہ ہوگا طول طویل، اس پر لوگ دوڑتے ہوں گے، یہاں کچھ اور ہی نظر آیا، پہاڑ کھد کر اس سے بڑی بڑی عمارتیں بن گئی تھیں، پختہ سڑک کے کنارہ ایک ذرا سی بلندی تھی چند سیڑھیوں کا ایک زینہ تھا اس پر چڑھ کر سعی کی نیت کی اور کہا أبدأ بما بدأ الله به ان الصفا والمروة من شعائر الله (جس چیز کو اللہ نے مقدم رکھا ہے اس کو میں بھی مقدم رکھتا ہوں) ان الصفا والمروة من شعائر الله (بیشک صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں)۔ بیت اللہ کی طرف منھ کر کے ہاتھ اٹھا کر حمد و ثنا و تکبیر و تہلیل کی دعا کی، پھر اترے اور مروہ کی طرف چلے میل کے سبز نشانوں کے درمیان (جہاں حضرت ہاجرہ اسمٰعیل علیہ السلام کے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے بیقرار ہو کر دوڑتی تھیں) ذرا دوڑ کر چلے پھر معمولی چال سے چلنے لگے۔ ادھر مروہ کی طرف جانے والوں اور مروہ سے صفا کی طرف آنے والوں کے قافلے

قطار اندر قطار ملتے رہے۔ کبھی جاوی پاس سے گذر جاتے، کبھی مصری چھیلتے ہوئے نکل جاتے، کبھی مراکشی وجزائری سامنے سے آتے نظر آتے، کبھی ترکی و بخاری راستہ میں ساتھ ہو جاتے، کبھی تکرونی و سوڈانی قدم بڑھا کر آگے ہو جاتے، ہر ایک احرام میں ملبوس، ننگے سر ننگے پاؤں، عاشقانہ حال، مستانہ چال، دنیا سے بے خبر اپنی دُھن میں مست" رب اغفر وارحم انك انت الاعز الاکرم " کی صداؤں سے فضا گونجتی ہوئی، دونوں طرف پر رونق دُکانیں، مسعیٰ کا بازار اپنے پورے شباب اور بہار پر، موٹریں اور کاریں ہارن بجاتی ہوئی اور آدمیوں کو بچاتی ہوئی نکلتی رہتی ہیں، دُکانوں پر سودے بک رہے ہیں شربت کے گلاس کے دور چل رہے ہیں، صرّافوں کی دُکانوں پر روپیہ گننے اور سکّوں کے گرنے کی آواز کانوں میں آرہی ہے، لیکن عشاق کا مجمع سر جھکائے نظر بچائے، اپنی دھن میں چلا جارہا ہے۔ عشق کی پوری تصویر، دنیا میں مومن کے رہنے کی مکمل تفسیر، خلوت در انجمن کا پورا منظر، دنیا کے بازار میں چلتی پھرتی مسجدیں اور گونجتی ہوئی اذانیں یہی کیا ہے، مومن کی پوری زندگی بھرے بازار پھولوں سے لدے گلزار میں رہنا اور دل نہ لگانا، مقصد کو پیش نظر رکھنا، مبدا و منتہیٰ کو نہ بھولنا، اپنے کام سے کام رکھنا، صفا سے چل کر نہ مروہ کو فراموش کرنا نہ مروہ سے چل کر صفا کو بھول جانا، کہیں نہ اٹکنا کہیں نہ الجھنا پیہم گردش مسلسل عمل، سعی میں دونوں طرف دکانوں کے ہونے نے اور سعی کے اس محل وقوع نے سعی میں ایک خاص معنویت اور لطف پیدا کر دیا ہے۔

آپ کو اس راستہ پر عالم اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ کے مسلمان ایک لباس میں ملبوس، ایک ترانہ بلند کرتے ہوئے، ایک عشق و سرمستی کی کیفیت میں آتے جاتے نظر آئیں گے، تیز قدم بڑھاتے ہوئے ننگا سر اللہ کے سامنے جھکائے ہوئے چلے جارہے ہیں، ان میں امیر بھی ہیں غریب بھی، سرخ سفید شامی و مغربی بھی اور سیاہ فام حبشی و تکرونی بھی، مرد بھی اور عورت بھی، لیکن کسی کو کسی کے دیکھنے اور توجہ کرنے کی فرصت نہیں، بعض اوقات اس مجمع عشاق کو دیکھ کر قلب پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے اور بے اختیار ان عشاق کے پاؤں پڑنے اور انکی بلائیں لینے کا جی چاہتا ہے، اسلام کی محبّت جوش مارتی ہے، وطن و قوم کی حد بندیاں ٹوٹنے لگتی ہیں اور دینی وحدت کا احساس ابھرنے لگتا ہے۔

لیجئے مروہ پر سعی ختم ہوئی، ساتواں پھیر اتمام ہوا، دعا کیجئے، حجام کے پاس جاکر بال بنوایئے

اور اب اگر آپ متمتع یا مفرد ہیں تو احرام کھول دیجئے، اور اگر قارن ہیں تو نہ حجامت بنوائیے نہ احرام کھولئے۔

اب روزانہ کا معمول یہ ہے کہ صبح صادق سے پہلے حرم میں آگئے، کبھی رکن یمانی کے سامنے مصلی مالکی کے پاس، کبھی حطیم کے سامنے مصلی حنفی کے نزدیک، کبھی مصلی حنبلی سے ملے ہوئے اور کبھی قسمت سے مقام ابراہیم کے پاس یا مصلی شافعی کے دائیں بائیں نوافل پڑھے، کبھی ہر دو رکعت کے بعد ایک طواف کیا، کبھی نوافل کے بعد اکٹھا کئی طواف کر لئے غرض جس طرح موقع ملا نوافل وطواف میں وقت گذارا، صبح کی اذان ہوئی، نماز پڑھی، اس وقت طواف کرنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے، خدا جانے کتنے اولیاء اللہ اور مقبولین بارگاہ ہوتے ہیں، عامہ مومنین بھی کیا کم ہیں، طلوع آفتاب تک طواف کئے، پھر اکٹھا طواف کی رکعتیں پڑھیں، اشراق پڑھی اور قیام گاہ پر آگئے۔

مکہ معظمہ میں طواف سے بہتر مشغلہ اور وظیفہ کیا، سارے دن آدمی طواف کر سکتا ہے۔ بعض اہل ہمت بیس بیس تیس تیس طواف دن بھر میں کر لیتے ہیں۔ فضائل حج میں ہے کہ کرز بن وبرۃ کا معمول تھا کہ ستر طواف دن میں، اور ستر طواف رات میں کرتے اور دو قرآن روزانہ پڑھ لیتے (بحوالہ احیاء) آخر شب میں اور گرمیوں میں ٹھیک دوپہر کو مجمع کم ہوتا ہے، بعض اہل ذوق ان اوقات کا انتظار کرتے ہیں، بعض ہر نماز کے بعد کرتے ہیں، بعض مجمع ہی کو پسند کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کس کی برکت سے ہمارا طواف اور ہماری دعائیں بھی قبول ہو جائیں، رحمتِ الٰہی کسی کی طرف متوجہ ہو اور ہم کو بھی نہال کر جائے۔

"وللناس فی مایعشقون مذاہب"

لیکن کسی وقت آئیے، دن ہو یا رات، پچھلا پہر ہو یا ٹھیک دوپہر، شمع پر پروانوں کا وہی ہجوم ہے، مطاف کسی وقت خالی نہیں، اگر اس کے انتظار میں رہے گا کہ دو چار آدمی ہوں اور پورے سکون و طمانیت کے ساتھ طواف کریں تو یہ حسرت کبھی پوری نہ ہو گی، جس کو اللہ تعالیٰ نے مثابۃ للناس (لوگوں کے لوٹ لوٹ کر آنے کی جگہ) بنایا، اور جس کو سب سے بڑی محبوبیت و مرکزیت عطا فرمائی اور دل کشی کوٹ کوٹ کر بھر دی، وہ عشاق سے خالی کب رہ سکتا ہے، رات کو عشا کے بعد سے صبح صادق تک

ہر ہر گھڑی میں آکر دیکھا دربار بھرا ہی ہوا پایا۔

ادھر ملتزم کا حال یہ ہے کہ وہ دعا کرنے والوں اور مچل مچل کر مانگنے والوں اور لپٹ لپٹ کر فریاد کرنے والوں سے کسی وقت خالی نہیں کوئی عربی میں، کوئی فارسی میں، کوئی ترکی میں، کوئی سوڈانی میں، کوئی جاوی میں، کوئی اُردو میں، کوئی بنگالی میں، کوئی نثر میں، کوئی نظم میں، کوئی زبانِ بے زبانی میں عرضِ حال کر رہا ہے، دل کھول کھول کر مانگ رہا ہے، پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے، کوئی پردہ میں منھ ڈالے بڑے درد سے پڑھ رہا ہے۔ ؎

بردر آمد بندۂ بگریختہ آبروئے خود بعصیاں ریختہ

یارب البیت، یارب البیت کی صدا بلند ہے۔

حرم میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے اس لئے اس سے بڑھ کر کیا خسارہ ہوگا، کہ کوئی فرض نماز حرم میں نہ ہو۔ حرم کے باہر اور آدمی کہیں جائے بھی تو کہاں جائے؟ بس ہم ہیں اور حرم ہے، نمازیں بھی یہیں، نوافل بھی یہیں، طواف بھی یہیں، تلاوت واذکار بھی یہیں۔

بات کرتے کرتے ذی الحجہ کی ابتدائی تاریخیں ختم ہوگئیں، لیجئے آج ۷، ذی الحجہ ہوگئی، رات بیچ میں ہے کل منیٰ جانا ہے، سواریوں کے انتظامات ہو رہے ہیں، احرام کی تیاریاں ہیں، کوئی موٹر طے کر رہا ہے، کوئی کار اور ٹیکسی کی بات چیت کر رہا ہے، کوئی اونٹ کا انتظام سوچ رہا ہے کوئی پیدل جانے ہی کی ٹھان رہا ہے۔ رات گذری صبح ہوئی، حج کی اصل مشغولیت شروع ہوگئی، کوئی دن چڑھے سواری آگئی، سوار ہوئے، لبیک لبیک کی صداؤں کے ساتھ منیٰ کا رُخ کیا، جو پاس سے گذرتا لبیک ہی سے سلام کرتا۔ تین میل کا فاصلہ ہی کیا بات کرتے پہونچ گئے، ڈیروں اور خیموں کا ایک عظیم الشان شہر، جہاں تک نظر کام کرتی رنگ برنگ کے خیمے اور چھولداریاں ہی نظر آتیں۔ سارا عالمِ اسلام یہاں سمٹا ہوا نظر آتا ہے وہ بھی حدود کی تقسیم کے بغیر، یہاں ہندی ہیں وہاں جاوی، یہ مصری ہیں وہ شامی، ذرا آدمی بھٹک جائے پھر قیام گاہ کا پتہ لگانا مشکل، اپنے معلم کے جھنڈے کے نیچے اپنے خیمہ میں مقیم ہوئے، آج کا سارا دن اور پوری رات یہاں بسر کرنی ہی کل ۹ کو عرفات کی طرف کوچ ہے۔ یہاں اللہ کا نام لینے، نمازیں پڑھنے، ذکر و دعا میں مشغول رہنے کے سوا کام ہی کیا ہے لیکن انسان کی ضروریات اور اُسکی دل چسپیوں نے یہاں بھی بازار لگا رکھا ہی۔ دکانیں کھلی ہوئی ہیں،

ضرورت کی چیزیں ڈیرے ڈیرے خیمے خیمے بک رہی ہیں، پانی والے دروازے دروازے پانی لئے پھر رہے ہیں۔ ظہر کی نماز کے لئے منیٰ کی مشہور تاریخی مسجد "مسجدِ خیف" گئے، نہایت وسیع اور پرفضا میدان، بیچوں بیچ ایک قبہ جس کے متعلق اہل خبر کہتے ہیں کہ بیسیوں پیغمبروں نے یہاں نمازیں پڑھیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خیمہ یہاں نصب ہوا، نہایت بابرکت اور پُرانوار جگہ ہے، زیادہ وقت یہیں گذرے تو بہتر ہے مگر ساتھیوں کو تکلیف اور کسی قسم کی کلفت نہ ہو۔

عشا پڑھ کر تبلیغی جماعت کے علماء نے ذوق و شوق اور حج کی عظمت پیدا کرنے والی تقریریں کیں جن میں عرفات و مزدلفہ اور باقی ایام منیٰ کے آداب و ذمہ داریاں یاد دلائیں، کچھ دیر بعد سو گئے کہ کل حج کے نچوڑ کا دن ہے، آج رات کی مکمل شب بیداری کل کے دن پر اور صحت پر اثر انداز نہ ہو، پچھلے پہر اللہ نے توفیق دی آنکھ کھل گئی، منیٰ کا عجیب منظر تھا، سارا شہر بقعۂ انوار بنا ہوا تھا، عالمِ اسلام کچھ سوتا تھا کچھ جاگتا تھا، ہر طرف تجلیات و انوار کا ہجوم معلوم ہوتا تھا، اپنی جگہ پر رہا نہ گیا، مسجد خیف کی طرف چلے، حضرت ابراہیمؑ کی قربانی اور حضرت اسمٰعیلؑ کے صبر و استقامت کی یاد بڑی شدت سے پیدا ہوئی۔ خداوندا! عشقِ ابراہیمؑ کا ایک ذرہ عطا ہو، الٰہی مردہ دل کو اپنے عشق و محبت سے زندہ کردے، محبت کا سوز عطا ہو جو ماسویٰ کو جلادے۔ عالمِ اسلام اس وقت ابراہیمؑ کی آواز پر جمع ہے اس میں محبت کی حرارت پیدا کردے کہ پھر زندہ ہو جائے، پھر تیرے لئے اپنی جان و مال کی قربانی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ عجب سرور و حضور کا عالم تھا، عجب ذوق و شوق کا وقت تھا، مسجد خیف میں تھوڑے لوگ جاگ رہے تھے، اطمینان سے نمازیں پڑھیں، بڑی سکینت معلوم ہوتی تھی۔ صبح کی اذان ہوئی، نماز ہوئی، اور اپنی قیام گاہ پر آئے۔ اب منیٰ سے چل چلاؤ ہے، سب کا رُخ عرفات کی طرف ہے، دن چڑھے یہاں سے چلنا ہے، ہر ایک جانے کے اہتمام میں ہے سواریوں کی بھی کشمکش ہے، یہی حج کے امتحان کے مواقع ہیں۔

•

لبیک لبیک کی صداؤں کے ساتھ عرفات کی طرف روانہ ہوئے، چھ میل کا فاصلہ ہے، تین میل پر مزدلفہ ملا، جہاں رات واپس آنا ہے اور شب گذاری کرنی ہے، مگر ابھی ٹھہرنا نہیں، گذرتے چلے گئے۔ لیجئے عرفات آگیا، اللہ غنی انسانوں کا ایک جنگل، جنگل میں منگل، کئی لاکھ انسان ڈوبے سلی چادروں میں، شاہ و گدا ایک لباس میں، جہاں تک نظر کام کرتی ہے خیمے اور شامیانے ہی نظر آتے ہیں،

جو نظر آتا ہے دو سفید چادروں میں، معلوم ہوتا ہے آج فرشتوں نے اللہ کی یہ زمین بسائی ہے۔ سفید براق لباس، نورانی صورتیں، ذکر سے تر زبانیں، لبیک لبیک کی صدا گونجتی ہوئی اور پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی۔ انسانوں کا اتنا بڑا مجمع، لیکن نہ چپقلش نہ کشاکش، روحانیت و انابت کی فضا چھائی ہوئی۔ اپنے خیمہ میں اُترے۔ جو لوگ مسجد النمرہ گئے انھوں نے امام کے ساتھ ظہر اپنے وقت میں اور عصر ظہر کے وقت میں جمع کر کے پڑھی، یہاں کا یہی حکم ہے، جو لوگ نہیں گئے انھوں نے تنہا ظہر کی نماز جماعت سے پڑھی، اور ذکر و دعا میں مشغول ہو گئے۔

"الحج عرفہ" حج عرفہ کا نام ہے، عرفہ حج کا نچوڑ ہے، یہی حج کی قبولیت کے فیصلہ کا دن ہے، یہی دعاؤں کے مقبول ہونے کا وقت ہے، یہی دل کھول کر مانگنے کی جگہ اور زمانہ ہے، اللہ کے بندے ذکر و دعا میں مشغول ہو گئے، کسی نے قرآن مجید کھولا، کسی نے حزب الاعظم شروع کی، کوئی سجدہ میں گر گیا، کسی نے اپنی منتخب دعائیں اپنی یادداشت سے پڑھنی شروع کیں، جن تمناؤں کو چھپا چھپا کر رکھا تھا آج اُن کو کھول کر پیش کر دیا، جن کو پہلے سے دعا کا سلیقہ تھا آج وہ کام آیا۔ ذکر و سلوک صحبت سب قوت دعا اور توجہ الی اللہ کو بڑھانے ہی کے لئے ہیں۔

سورج ڈھلا، دھوپ ہلکی ہوئی، کوتاہ ہمت بھی جبل رحمۃ کی طرف بڑھے معلم کا جھنڈا ساتھ کہ اگر چھوٹے تو شائد مکہ ہی میں ساتھیوں سے ملنا ہو۔ خیمہ سے جبل رحمت کا فاصلہ میلوں کا نہیں، مگر پورے عالم اسلام میں سے گذر کر پہونچے۔ خدا جانے کتنے ملکوں کے علاقے راستے میں آئے، ان سفید پوش، کفن بردوش مہمانان دربار پر کیسا پیار آتا ہے۔ محبت کا جوش اُٹھتا ہے، اپنے حج کا پتہ نہیں، مگر دل سے یہی نکلتا ہے کہ الٰہی سب کا حج قبول ہو، آج تیری رحمت سے کوئی محروم نہ رہ جائے۔ مصریوں کا بھی، شامیوں کا بھی، مغربیوں کا بھی، یمنیوں کا بھی، ترکوں کا بھی، افغانوں کا بھی، چینیوں کا بھی اور حبشیوں کا بھی، اور ان سیاہ فام روشن دل تکرونیوں کے طفیل ہم غریب ہندیوں کا بھی۔

جبل رحمۃ پر سائلوں کا ہجوم ہے گویا بڑے پیمانے پر ملتزم کا نقشہ ہے۔ سوال و دعا کا غلغلہ بلند ہے، بھرائی ہوئی آوازیں اور گلوگیر صدائیں بیچ بیچ میں بے حس و سخت دل لوگوں کے دل میں بھی رقت اور گداز پیدا کرتی ہیں، سب اپنی اپنی دلی مراد مانگ رہے ہیں، ہر قوم و ملک کے لوگ اپنی اپنی دعا میں مشغول ہیں، ہندوستانی مسلمان جن کے دل ہندوستان کے واقعات سے چوٹ کھائے ہوئے ہیں

نرالی شان رکھتے ہیں، انھوں نے جب اپنے بھائیوں کے لئے اور اپنے اس ملک کیلئے دُعا شروع کی جس نے سیکڑوں اولیاء، محدثین وفقہا، مجاہدین وشہدا اور اپنے اپنے وقت کے امام ومجدد پیدا کئے جس نے اس پچھلے دور میں حدیث کی امانت کی حفاظت کی، جس کے بعض بعض فرزند خدمتِ اسلام فہم کتاب وسنّت میں سارے عالمِ اسلام میں امتیاز رکھتے تھے تو ایک سناٹا چھا گیا اور سب کی نگاہیں اس لٹے ہوئے ہندی قافلہ کی طرف اُٹھ گئیں۔

آفتاب غروب ہوا جبل رحمۃ سے اپنے خیمہ کی طرف واپسی ہوئی، حج مبارک! اللہ تبارک وتعالیٰ حج مقبول کے برکات ثمرات انوار وآثار عطا فرمائے، اور اس میدان میں پھر آنا نصیب کرے۔ سورج ڈوب گیا، جہاں جہاں سورج ڈوبا سب جگہ مغرب کی نمازیں ہو رہی ہوں گی، اور جو نہ پڑھتا ہوگا، وہ تارک صلوٰۃ ہوگا، گنہگار ہوگا، لیکن اس میدان میں جہاں اللہ کے بُلائے ہوئے مسلمان جمع ہیں جنھوں نے آج حج کا رکن اعظم ادا کیا ہے، وہ سب یہاں مغرب کی نماز چھوڑ رہے ہیں، لاکھوں میں سے کوئی نادان ہوگا جو مغرب کی نماز پڑھ رہا ہوگا۔ اللہ اکبر! یہی شہنشاہی کی شان ہے، جہاں چاہا حکم دے دیا، جہاں چاہا روک دیا، اور یہی بندگی ہے۔ نماز سے بھی ذاتی تعلق نہیں، آقا کے حکم کی اطاعت مقصود ہے، آج حکم ہے کہ مغرب کی نماز عشا کے ساتھ پڑھی جائے۔ جنھوں نے کبھی ایک وقت کی نماز نہیں چھوڑی وہ آج خوشی خوشی چھوڑ رہے ہیں، عرفات والوں کے لئے آج نماز کی جگہ مزدلفہ اور مغرب کی نماز کا وقت عشا کو ہے یفعل اللہ مایشاء ویحکم مایرید۔

اب لاکھوں انسانوں کی یہ بستی یہاں سے تین میل پر منتقل ہو جائے گی، شہر کا اُجڑنا اور بسنا کچھ ہنسی کھیل نہیں، ایک شور قیامت برپا ہو، ایک طوفان بے تمیزی، لیکن یہاں کچھ نہیں حکم لایا تھا حکم لے جا رہا ہے، غلاموں کی طرح آئے تھے غلاموں کی طرح جانا ہے، لیجئے خیمے اکھڑ رہے، طنابیں ڈھیلی ہوئیں، شامیانے تہہ ہوئے، دیکھتے دیکھتے یہ جیتا جاگتا شہر لق ودق میدان بن گیا، جو جوان ہمت اور سواری کے پابند نہ تھے وہ آزادی سے وقت مسنون پر روانہ ہو گئے، جو ضعیف اور عورتوں کی وجہ سے مجبور تھے ان کو سواری کی وجہ سے دقت پیش آئی اور انتظار کرنا پڑا۔ سواری کے آنے میں دیر ہوئی، ایک گھنٹہ گذرا، دوسرا، تیسرا، رات کے ۸ بجے، ۹ بجے، ۱۰ بجے، سواری نہ اب آتی ہے نہ تب، اب میدان میں جہاں تک نظر کام کرتی ہے ہمارے چھوٹے سے قافلہ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

لاریاں آتی ہیں اور نکل جاتی ہیں کوئی ادھر کا رُخ نہیں کرتی، رات گذری چلی جارہی ہے، مزدلفہ میں بسر ہونے والی رات کا خاص حصہ عرفات میں گذرا جارہا ہے، یا الٰہی کیا ہوگا، کیا ہم یہیں رہ جائینگے، کیا ہم مزدلفہ سے محروم رہیں گے، مستورات کا ساتھ، دن بھر کے تھکے ماندہ، معلم صاحب بھی عاجز ومجبور، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا، ڈرائیور پر غصہ، معلم پر خفگی، سب بے سود۔ آدھی رات ہونے کو آئی، خدا خدا کرکے لاری آئی، تیوری چڑھی، تلخ وتند لہجہ میں ڈرائیور سے محاسبہ کیا کہ کہاں اتنی دیر لگائی، کیا حجاج کو اذیت دینا تم لوگوں کے نزدیک کارِ ثواب ہے؟ اس نے آسانی سے کہدیا کہ راستہ صاف نہ تھا، گھنٹوں میں پہلی کھیپ پہونچی اور بہ مشکل واپسی ہوئی، کہکر افسوس ہوا، کاش زبان سے کچھ نہ کہا ہوتا، اللہ کا شکر ادا کیا ہوتا کہ اس نے آخر پہونچادیا، اب بھی اگر لاری نہ آتی تو کیا کرتے، یہی فرق ہے بڑوں اور چھوٹوں میں!۔

عرفات اور مزدلفہ کے درمیان خدا کی شان نظر آتی ہے، موٹروں اور لاریوں کا ایک سیلاب، اتنا بڑا سیلاب زندگی بھر نہیں دیکھا، سب کو پہونچنے کی جلدی مگر کوئی حادثہ نہیں، لیجئے مزدلفہ پہونچ گئے، ایک میدان میں کئی لاکھ مسافر اُترے ہوئے، اطمینان کی جگہ کا کیا سوال، جہاں موقع مل جائے غنیمت ہے، ایک جگہ سامان جمع کرکے درمیان میں لیٹ رہے، کچھ دیر کے بعد آنکھ کھلی سارا میدان جگمگا رہا تھا، مزدلفہ ہنستا ہوا معلوم ہوتا تھا، کیا خیر وبرکت کی رات ہے، جو وقت ملجائے غنیمت ہے۔ لوگوں نے صبح سے پہلے ہی روانہ ہونا شروع کردیا، ناواقفیت اور جہالت اور اسی کے ساتھ جلد بازی بھی ایک مصیبت ہے، یہاں کی سنّت صبح ہونے کے بعد یہاں سے چلنا ہے، مگر لوگوں کو منیٰ میں جلد پہونچنے کی ہیبت اور لاری والوں کو بیگار ٹالنا، تاریکی اور ناواقفیت میں مشعرِ حرام کا تو پتہ نہ چل سکا جہاں دعا کرنا مسنون ہے اور قرآن مجید میں صاف طور پر ہے: "فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام" جب اُجالا ہوگیا تو پتہ چلا اور اس مسجد میں جاکر جو جبل قزح کے پاس ہے کچھ دیر دُعا کی، پھر کنکریاں چنیں اور ساتھ لیں، اور منیٰ کیطرف روانہ ہوئے۔

ایک دن کا اُجڑا منیٰ اللہ کے حکم سے پھر آباد ہے، آج دسویں ذی الحجہ ہے یعنے عین عید الاضحیٰ، آج تمام روئے زمین پر جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں یہیں کی یادگار کے طور پر عید کی نماز پڑھی جارہی ہوگی لیکن اللہ کی شان یہاں عید کی نماز نہیں۔ کسی کو خیال بھی نہیں منیٰ کی

عید یہی ہے کہ رمی کی جائے، قربانی کی جائے، بال منڈائے یا کترائے جائیں، احرام کھول دیا جائے، طواف زیارت کیا جائے، لیجئے حج تمام ہوا اللہ قبول کرے۔

منیٰ پہونچ کر پہلا مرحلہ یہ تھا کہ جمرۃ العقبہ کی رمی کی جائے یعنے کنکریاں ماری جائیں، روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) جب حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے چلے، تو شیطان سب سے پہلے اس جگہ ملا اور اس نے ان کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا، حضرت ابراہیمؑ نے اس کو سات کنکریاں ماریں، یہاں تک کہ وہ زمین میں دھنس گیا۔ آگے بڑھ کر پھر دوسرے جمرہ کی جگہ نظر آیا، وہاں بھی سات کنکریاں ماریں یہاں تک کہ وہ زمین کے اندر گھس گیا، پھر جمرۂ اولیٰ کی جگہ نظر آیا، پھر اس کے سات کنکریاں ماریں یہاں تک کہ زمین میں گھس گیا[1]۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہر عمل پیغمبرانہ اخلاص اور عاشقانہ کیفیت کے ساتھ کیا تھا، وہ اللہ سے پہلے مانگ چکے تھے کہ

وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ — میرا ذکر خیر پچھلوں میں باقی رکھ۔

اور فرما دیا گیا تھا

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ - (والصٰفٰت ـ ع ـ ۳) — ہم نے ان کا ذکر خیر پچھلے لوگوں میں باقی رکھا سلام ہو ابراہیمؑ پر۔

اس لئے اللہ نے ان کے ہر فعل کو زندگی جاوداں بخشی اور اس کی یادگار باقی رکھی۔ آج ان افعال کی نقل میں بھی عشق کی کیفیت اور زندگی و تازگی ہے بشرطیکہ دل محبت و عظمت اور ایمانی کیفیات سے بالکل خالی نہ ہو، حج کی ہر چیز میں عاشقانہ کیفیت اور محبوبانہ ادا ہے، سعی و طواف تو عشق و جذب کی کھلی نشانیاں ہیں مگر یہ رمی (کنکری مارنا بھی) عجب پیاری ادا ہے، عاشقیت و محبوبیت توام ہیں سچے عشق کے ساتھ جو چیز کی جائے گی اس پر اہل دل کو پیار ہی آئے گا۔ رمی کرتے وقت اگر دل میں سیدنا ابراہیمؑ کی محبت، اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کا جذبہ اور اپنے دشمن حقیقی سے نفرت کا جوش ہو تو رمی عجب بہار کی چیز ہے، عجب عبادت ہے، اور اگر یہ کیفیات اتفاقاً نہ ہوں، یا ان کا استحضار نہ ہو تو بھی حکم الٰہی کی اطاعت کسی حال میں فائدہ سے خالی نہیں۔

---

[1] صحیح ابن خزیمہ۔

رمی جمرات کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں پڑھی تھی اس کے مقاصد و حکم حج کے سفرناموں میں دیکھے تھے لیکن اس کا صحیح تصور اور نقشہ ذہن میں بالکل نہ تھا۔ جمرات کی کیا صورت ہے؟ رمی کس طرح ہوتی ہے کچھ اندازہ نہ تھا۔ منیٰ پہونچ کر رمی کی فکر ہوئی، دوستوں میں جو لوگ پہلے سال حج کر چکے تھے ان کو لیکر جمرہ اخری پر پہونچے، آج دسویں کو صرف اسی جمرہ کی جو سب سے آخر میں ہے رمی کرنی ہے، رمی کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ ایک حوض سا بنا تھا اس کے اوپر ایک لکڑی لگا رکھی گئی تھی تاکہ دور والوں کو اندازہ ہو سکے، حوض میں کنکریوں کا ڈھیر تھا بعض لوگوں نے غصہ میں جوتے بھی مارے تھے بعض سادہ دل لوگوں میں شیطان سے نفرت و عداوت کا وہی جذبہ تھا جو اپنے دشمن سے ہوتا ہے بعض مصریوں کو سنا گیا کہ بڑے غصہ سے مارتے تھے اور کہتے تھے کہ پھر پریشان کرے گا، پھر گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا!۔

مجمع بہت تھا، اگر کوئی نظم کیا بھی جاتا تو مشکل تھا، کام صرف کنکریاں پھینکنا تھا مگر اس عمل میں بھی ایک خاص سنجیدگی اور عبادت کی شان تھی، اہلِ ذوق کو اس میں بھی خاص حظ اور کیف محسوس ہو رہا ہوگا۔

زوال سے پہلے پہلے الحمدللہ رمی سے فارغ ہو گئے تلبیہ موقوف ہو گیا، اب قربانی کا مرحلہ باقی تھا، احرام کھولنا اس پر موقوف تھا۔ مذبح میں جانور کا تلاش کرنا، طے کرنا اور قربانی کرنا آسان کام نہ تھا، یہ بھی حج کے مجاہدات میں سے ہے، الحمدللہ یہ مرحلہ بھی آسان ہوا، بال منڈائے اور احرام اُتار دیا۔

ابھی حج کا ایک رکن باقی تھا، وہ طوافِ زیارۃ ہے، دسویں ہی کو عصر کے وقت مکہ معظمہ گئے مکہ معظمہ کی بڑی آبادی آج منیٰ میں تھی اور ابھی دو تین دن رہے گی، جو لوگ نظر آ رہے تھے اکثر طوافِ زیارۃ کے لئے حاضر ہوئے تھے پھر بھی مطاف خالی نہ تھا اگرچہ پہلے کا سا ہجوم نہ تھا، ہم نے سعی طوافِ قدوم کے ساتھ کرلی تھی اس لئے آج سعی کرنی نہ تھی[1] طواف سے فارغ ہو کر منیٰ واپس آ گئے۔

اب یہاں کی راتیں اور یہ دن حاصل عمر ہے، خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ایک ایک گھڑی

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہوں کتب مناسک۔

غنیمت سمجھیں اور غفلت کا کوئی لمحہ گذرنے نہ دیں۔ یہی دن ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں صراحۃً حکم ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (البقرہ-ع-۲۵)	پھر جب پورے کر چکو اپنے حج کے کام تو یاد کرو اللہ کو جیسے یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے زیادہ یاد

اور آگے فرمایا کہ

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ (البقرہ-ع-۲۵)	اور یاد کرو اللہ کو کئی دن گنتی کے

اس لئے یادِ الٰہی میں جتنا انہماک اور عبادت میں جتنی مشغولیت ہو کم ہے، مگر افسوس کہ اس کا حق بالکل ادا نہ ہو سکا اور اس میں شدید کوتاہی رہی، بے تکلف دوستوں کا مجمع، کھانے پینے کی بہتات، عمر بھر کی غفلت کی عادت، بڑا وقت ہنسنے بولنے اور کھانے پینے میں گذر جاتا، ناظرین کرام سے کہنے کا جی چاہتا ہے، کہ ؎

من نکردم شما حذر بکنید

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بہت سے حجاج نے ... قیمتی اور مختصر وقت کے اندر ہی جہازوں کی تحقیقات اور سفر کے منصوبے شروع کر دیئے، جو وقت تمام سے فائدہ اٹھانے میں گزرنا چاہئے تھا وہ سفر کے دھیان اور تصور میں گزرنے لگا۔

ان دنوں میں کھانا پینا اور خصوصاً قربانی کا گوشت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعوت سمجھ کر اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد کو پیش نظر رکھ کر کہ "هذه ايام اكل وشرب" یہ کھانے پینے کے دن ہیں، ثواب اور عبادت سے خالی نہیں، یہ بھی اچھی طرح مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے کہ اس ارشاد کو سامنے رکھ کر کھانے پینے سے کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی۔

تیرھویں تک ٹھہرنا ہے، دن میں حج کے سلسلہ کا ایک ضروری کام یہ ہے کہ رمی روزانہ کیجائے پہلے دن (دسویں کو) صرف جمرۂ عقبہ کی رمی کی گئی تھی، اب جمرات ثلٰث کی رمی روزانہ ہوگی، دسویں کو زوال سے پہلے پہلے مسنون ہے، اور گیارھویں، بارھویں، تیرھویں کو (اگر تیرھویں کو ٹھہرنا ہو) زوال کے بعد ظہر کی نماز پڑھ کر رمی کا حکم ہے، اوّل جمرۂ اولیٰ کی (جو مسجد خیف کے متصل ہے) پھر جمرۂ وسطیٰ کی پھر جمرۂ اخریٰ کی۔[۱]

---

[۱] رمی کے مفصل احکام و آداب کتب مناسک میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

تیرھویں کو منیٰ سے جانے کا عزم ہے، ان دنوں میں بشدت اس کا احساس ہوتا ہے کہ منیٰ کے کم سے کم یہ تین دن دینی دعوت اور تعلیم و تربیت کے مغتنم ترین دن ہیں جو مجموعی طور پر عالم اسلام کو اتنے بڑے پیمانے پر کبھی میسر نہیں آسکتے، عالم اسلام کا ایک بہترین نمائندہ مجمع جو راہِ خدا میں نکلا ہوا ہوتا ہے جس میں اتنے دنوں کے مجاہدہ، تعلقات و مشاغل سے انقطاع، فاسد ماحول سے بے تعلقی، حج کے انوار و تاثیرات کی وجہ سے دین کے جذب و قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو چکی ہوتی ہے اور دین و عبادت ہی کے لئے اس کا قیام ہوتا ہے اگر اس وقت سے فائدہ اٹھایا جائے تو برسوں کا کام چند دنوں میں، اور ہزاروں میل کا سفر ایک مختصر سے رقبہ میں طے ہو جائے۔ ایک جہاز پر اگر ایک ملک یا چند صوبوں کا قافلہ ہوتا ہے اور اس کے اوقات دین اور علم دین کیلئے فارغ ہوتے ہیں تو منیٰ کے میدان میں پورے عالم اسلام کا کارواں اترا ہوا ہوتا ہے اور دین کیلئے فارغ۔

مگر صد حیف کہ ایسی فرصت سے دینی تعلیم و تربیت اور اسلامی دعوت کا فائدہ قطعاً نہیں اٹھایا جاتا، ہماری دینی زندگی کی چول اپنی جگہ سے ایسی ہٹی ہوئی ہے کہ کسی چیز سے بھی ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ صرف منیٰ کے قیام کے یہ دن اور حجاج کا یہ مجمع ایسا تھا کہ اس سے پورے عالم اسلام میں دین کی روح پھونکی جا سکتی تھی اور دعوت کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا تھا۔ یہ مجمع ایک بادِ بہاری تھا جو سارے عالم میں دینی دعوت و اصلاح کے بیج بکھیر سکتا تھا اور دین کے ہزاروں چمن کھلا سکتا تھا پچاس حکومتیں، ہزار انجمنیں، سیکڑوں اخبارات و رسائل، لاکھوں مبلغ و داعی وہ کام نہیں کر سکتے جو منیٰ کی ایک منظم دعوت اور ایک تربیت یافتہ جماعت کر سکتی ہے پہلے یہ سب حج کے ثمرات و منافع میں داخل تھا "لیشھدوا منافع لھم" کا مفہوم اتنا تنگ نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے امت کو جو آخری عالمگیر وصیت فرمائی ہے وہ عرفات و منیٰ کے میدان ہی میں فرمائی، عرفات و منیٰ کا مخاطب مجمع ہی اس کی صلاحیت رکھتا تھا کہ فرمایا جاتا:۔

فلیبلغ الشاھد الغائب
فرب مبلغ اوعیٰ من سامع

دیکھو جو موجود ہے وہ میری یہ باتیں اُن تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو بالواسطہ سنتا ہے وہ اپنے براہِ راست سننے والے سے زیادہ سمجھنے والا اور یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔

حج ہی کے موقع پر سورۂ برأت کی ابتدائی آیات اور مشرکین کے احکام کا اعلان ہوا، حج ہی کے موقع پر ایک خلقت نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے براہ راست دین کی تعلیم حاصل کی، حج ہی کے موقع پر بلاد و امصار کے طالب علم دین سیکھنے، احکام معلوم کرنے، حدیث سننے جمع ہوا کرتے تھے، حج آج بھی عالم اسلام میں زندگی کی لہر پیدا کر سکتا ہے، مسلمانوں میں دینی شعور اور اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا کر سکتا ہے، حج ہی کے ذریعہ اس بھٹکے ہوئے قافلہ کو اپنی گم کردہ منزل نظر آسکتی ہے اور معمارِ حرم کو "تعمیرِ جہاں" کا بھولا ہوا کام یاد آسکتا ہے، حج اصلاح و انقلاب کی ایک عظیم الشان طاقت ہے مگر ہماری کاہلی اور نادانی سے یہ طاقت بہت کچھ ضائع ہو رہی ہے، ہر سال ضائع ہوتی ہے اور برسہا برس سے ضائع ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات میں کمی نہیں مگر ہماری طرف سے ناقدری میں بھی کمی نہیں، اگر کسی زندہ اور صاحبِ عمل قوم کو یہ موقع حاصل ہوتا اور اس کو ہر سال بلا کسی جدوجہد اور مادی ترغیب کے محض دینی کشش اور اخروی نفع کی بناء پر یہ عالمگیر اجتماع میسر ہوتا تو وہ تمام عالم میں انقلاب کر سکتی تھی اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں اپنا پیغام پہونچا سکتی تھی، دنیا کی بہت سی قومیں جو نبوت اور وحی الٰہی کی عطا کی ہوئی دولتوں سے محروم ہیں، حج کے اس بین الاقوامی اجتماع کو جس میں ہر حصۂ زمین سے آئے ہوئے لاکھوں مسلمان اپنا خرچ کر کے اور راستہ کی صعوبتیں برداشت کر کے اپنے شوق سے جمع ہوتے ہیں، رشک و حسد کی نگاہوں سے دیکھتی ہیں ان کو اپنی چھوٹی چھوٹی مجلسوں کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پڑتے ہیں، طاقت و پروپیگنڈا کرنا پڑتا ہے، پھر بھی کامیابی نہیں ہوتی، اس لئے کہ ان کے ساتھ دینی کشش اور روحانی جذب نہیں، لیکن مسلمانوں کو اس مفت کی دولت کی قدر نہیں۔

تعلیم و تربیت، دینی تذکیر و دعوت، حج کا ضمنی اور ثانوی فائدہ ہے لیکن کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، خصوصاً اس عہد میں کہ اس کی ضرورتیں بے حد بڑھ گئی ہیں۔ اگر کسی ایک ملک کے مسلمانوں میں بھی کسی درجہ کا عزم اور نظم پیدا ہو جائے، اور اس کام کے لئے وہ ضروری تیاری کر لیں۔ مخلص، دردمند، صاحبِ علم داعی کسی تعداد میں بھی فراہم ہو جائیں اور عالمِ اسلام کی دو چار زبانوں خصوصاً عربی پر اتنی قدرت حاصل ہو کہ وہ اس میں دعوت کا کام انجام دے سکیں، ان کے پاس دعوت کا ضروری سامان بھی ہو، عالمِ اسلام کے لئے پیغام، اس کے اصل امراض و مصائب اور

ان کا صحیح علاج، دین کی طرف بازگشت کی دعوت، امت کی نشأتِ ثانیہ کا راستہ، امت کا اصل محل و مقام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت اور اس امت کے ظہور کا مقصد، اسلام اور عالمِ انسانی کا رشتہ، آخرت کی دنیا پر ترجیح، صحابۂ کرامؓ اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے حقیقی اوصاف واخلاق۔

ان مضامین پر خود بھی تیار ہوں اور ان کے پاس ان حقائق کو ذہن نشیں کرنے کے لئے اور بعد تک یاددہانی کرتے رہنے کے لئے مختصر رسائل و مطبوعہ مضامین بھی ہوں، ایک ایسی جگہ بھی ہو (عارضی) جہاں وہ منتخب لوگوں کو بیٹھنے، گفتگو کرنے اور مطالعہ کرنے کی دعوت دے سکیں اس لئے کہ اتنے وسیع اجتماع میں وہ ہر جگہ نہیں پہونچ سکتے، دینی زندگی پیدا کرنے کے لئے اُن کے پاس ایک نظامِ عمل بھی ہو جس کا تجربہ ہر ملک میں کیا جا سکے، تو منیٰ کے اس سہ روزہ قیام سے محیر العقول فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

دوسرے ممالک کے علاوہ خود ہندوستانی حجاج کی ہزاروں کی تعداد ملے گی جس کے پاس وقت گذارنے کے لئے لایعنی باتوں یا فرائض کے بعد کھانے پینے کے سوا کوئی مشغلہ نہیں، ان میں بہت بڑی تعداد دین کے ابتدائی اصول و ارکان سے اگر ناواقف نہیں تو غافل ضرور ہو گی، اور کم سے کم انکی دعوت و تذکیر اور ان کے احیاء و ترویج کے لئے جدوجہد سے ضرور غافل ہے، ان سب کو اس کی طرف متوجہ کرنا بہت بڑا کام ہے، اور اس کام کے لئے منیٰ اور مکہ معظمہ سے بہتر موقع نہیں مل سکتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس کام میں سو فی صدی بلکہ شائد پچاس فی صدی کامیابی بھی یقینی نہیں، داعیوں اور کارکنوں کی کمی، اُن کی بے سروسامانی، مجمع کا پھیلاؤ، وقت کی قلت، انتشار و پراگندگی، ناواقفیت و اجنبیت، یہ اور بہت سی چیزیں جو تجربہ کے بعد علم میں آئیں گی کامیابی کے راستے میں حائل ہیں، لیکن اگر اس عظیم الشان کام میں دس فی صدی کامیابی کا بھی امکان ہو بلکہ سرے سے کوئی امکان نہ ہو تو بھی ہر قیمت پر یہ سودا سستا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا کی اس میں قوی امید اور جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مکی زندگی سے قریبی نسبت ہے۔ ع

گر ایں سودا بجاں بودے چہ بودے

کاش اس کو مسلمان اپنی ضروریات کی فہرست میں شامل کر لیتے، کاش! اس کے لئے کچھ اہلِ ہمت کچھ اہلِ توفیق تیار ہو جاتے، کاش! ہمارے یہ کلمات دلوں میں کچھ آمادگی پیدا کر سکتے۔

آیئے منیٰ کے اس قیام سے فائدہ اُٹھائیں اور ذرا دیر کے لئے عقبہ چلیں جہاں مدینہ کے انصاریوں نے پہلے پہل حضورؐ کے دستِ مبارک پر اسلام کی بیعت کی اور اس کی حمایت و نصرت کا عہد کیا، اور جہاں حقیقۃً ہجرت اور مدنی زندگی کی داغ بیل پڑی، اسلام کی تاریخ میں اور عالمِ اسلامی کے طویل و عریض رقبہ میں یہ چند گز زمین بڑی حرمت و قیمت رکھتی ہے، سچ پوچھئے تو بدر کی فتح کا سنگ بنیاد یہیں رکھا گیا، تاریخ اسلام کا افتتاح یہیں ہوا، عالمِ اسلام کی تاسیس یہیں عمل میں آئی، یہی وہ موقع ہے جہاں اللہ کے نبیؐ سے جو سارے حج کے مجمع سے مایوس ہو رہا تھا یثرب کے بارہ آدمیوں نے چھپ کر بیعت کی اور اپنی خدمات پیش کیں، اگلے سال اسی جگہ ۷۳ مرد اور ۲ عورتوں نے بیعت کی اور حضورؐ کو اہلِ مدینہ کا پیامِ شوق پہونچایا اور مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا تم دین کی اشاعت میں میری پوری پوری مدد کرو گے اور جب میں تمھارے شہر میں جا بسوں کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل و عیال کی مانند کرو گے۔ مدینہ والوں نے پوچھا، ایسا کرنے کا معاوضہ ہم کو کیا ملے گا۔ فرمایا، بہشت! ۔ اہلِ مدینہ نے دریافت کیا کہ اے خدا کے رسولؐ ہماری تسلی فرما دیجئے کہ حضور ہم کو کبھی چھوڑ تو نہ دیں گے۔ فرمایا، نہیں، میرا جینا مرنا تمھارے ساتھ ہوگا۔ اس پر ان حضرات نے بڑے جوش و سرور کے ساتھ بیعت کی۔

یہ جگہ منیٰ اور مکہ کے راستہ میں ہے اور جمرۂ اخریٰ سے کچھ دور نہیں، آپ اس سے آتے جاتے گزرے ہوں گے، اب اس جگہ مسجد بنی ہوئی ہے، مکروہ وقت نہیں ہے آیئے ہم بھی دو چار رکعت نفل پڑھیں، اس جگہ اللہ کے بہت سے مخلص بندوں نے اپنے مالک سے بندگی کا عہد و پیمان تازہ کیا اور اپنے رفیقوں کے ساتھ اسلام کی خدمت و نصرت کا عہد کیا۔[1] آیئے ہم بھی اللہ سے دعا کریں کہ ہم کو اسلام کی خدمت، اعلاء کلمۃ اللہ کی کوشش اور سنتِ نبویؐ کے احیاء کی جد و جہد کیلئے قبول فرمائے، اور ان صادقین کے طفیل صدق و اخلاص کی دولت سے کوئی حصہ عطا فرمائے۔

آج ذی الحجہ کی تیرھویں ہے اور منیٰ کے قیام کا آخری دن، عارضی آبادی کا ایک حصہ کل جا چکا باقی آج جا رہے ہیں، خیمے اکھڑ رہے ہیں، شامیانے لپیٹے جا رہے ہیں، سامان بار ہو رہا ہے،

---

[1] حضرت سید احمد شہیدؒ نے بھی اپنے حج کے موقع پر اس جگہ دین کیلئے سرفروشی و جانبازی پر اپنے ساتھیوں سے بیعت لی تھی اور ✲ ✲ اللہ سے عہد کیا تھا۔ ۱۲

منیٰ پر آخری نگاہ ڈالئے، اور مکہ معظمہ کا رُخ کیجئے۔ رہے نام اللہ کا۔

کل شئی ھالک الا وجھہ لہ الحکم والیہ ترجعون۔

مکہ معظمہ میں داخل ہوگئے، حرم میں نماز پڑھئے اور طواف کیجئے، بیت اللہ کو دیکھئے اور دیکھتے رہیئے ہر وقت اس کا نیا جمال اور نئی شان ہے۔ ؎

کعبہ را ہر دم تجلّی می فزود
ایں ز اخلاصات ابراہیم بود

اتنے دن سے اس کو دیکھ رہے ہیں مگر جی نہیں بھرتا، نگاہ نہیں تھکتی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اُس ذاتِ عالی کے جمالِ جہاں آرا کا کیا حال اور اس دید کی کیا مسرّت و لذّت ہوگی۔

آپ بے شک حج سے فارغ ہوگئے، اللہ تعالیٰ آپ کے لئے اور آپ کے اعزّہ و دوستوں اور سب مسلمانوں کے لئے مبارک فرمائے اور آپ کو بار بار لائے، مناسک حج میں سے کوئی رکن، کوئی فریضہ اور واجب باقی نہیں رہا، آپ آج اگر حرم سے چلے جائیں تو کوئی فقیہ آپ کو ٹوک نہیں سکتا۔ آپ کا حج مکمل، مناسک سب تمام، لیکن یہاں سے جانے کی ایسی عجلت کیوں ہے، یہاں کا قیام آپ پر خدانخواستہ بار کیوں ہونے لگا۔ اعزّہ کی یاد مسلّم، وطن کی کشش برحق، دوستوں اور عزیزوں کی ملاقات سر آنکھوں پر، لیکن یہاں جو لمحہ گزر جائے غنیمت اور حاصلِ زندگی، مجبوری کی بات اور ہے مگر اپنی طرف سے جلد سے جلد چلے جانے کا اہتمام اور وطن کا اتنا شوق کہ پَر لگ جائیں اور اُڑ کر پہونچ جائیں، اتنی بے مروتی سمجھ میں نہیں آتی۔ اپنے لئے طواف کیجئے، اپنے مرحوم عزیزوں، دوستوں، استادوں، محسنوں، رفیقوں اور ساتھیوں کے لئے کیجئے۔ تنعیم جائیے اور عمرہ لائیے، زمزم سے خوب سیراب ہوجئے، حرم شریف میں نمازیں پڑھئے اور ہر نماز پر لاکھ نمازوں کا ثواب پائیے، قرآن مجید کی تلاوت کیجئے، ہمت ہو تو غارِ حرا کی زیارت کیجئے۔ فرصت ہو تو غریب محلوں اور تکرونیوں کی آبادیوں میں جاکر ان کی دینی حالت دیکھئے ان سے خود استفادہ کیجئے اور اگر آپ سے کوئی دینی فائدہ پہونچ سکے تو اس سے دریغ نہ کیجئے، مکہ معظمہ کے اہلِ علم و فضل سے ملاقاتیں کیجئے۔ حرم میں اب حجاج کا ہجوم نہیں، حجر اسود کا باطمینان استلام کیجئے، رکن یمانی کے پاس حطیم کے اندر مقام ابراہیمؑ پر شوق سے نوافل پڑھئے، غرض جتنے ارمان باقی رہ گئے ہوں سب نکالئے اور سب شوق پورے کیجئے۔

اب اگر صدائے رحیل بلند ہو گئی اور جانا ٹھہر گیا تو طوافِ وداع کر لیجئے اور بیت اللہ اور حرم شریف سے رخصت ہو جئے۔ جدہ میں اگر جہاز میں اتفاقاً دیر ہو اور آپ مکہ معظمہ واپس نہ آسکیں تو ان حجاج میں جو جہازوں کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور کسی طرح وقت گزاری کر رہے ہیں چل پھر کر اور مل جل کر پھر دینی ضروریات واحکام کی طرف متوجہ کیجئے، اور خصوصیت کے ساتھ حج کے برکات کی حفاظت اور اس کے حقوق کی ادائگی کی طرف متوجہ کیجئے مگر خود ان کے حقوق اور ان کے احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے، آپ اگرچہ حج میں ان کے شریک ہیں مگر اس سے ان کے حج کا احترام آپ کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوتا کسی کلمہ سے ان کی تنقیص یا ان کی دل آزاری نہ ہو۔

جہاز تیار ہے بسم اللہ کر کے سوار ہو یئے، واپسی ضرور ہے، سفر بے شک وطن کی طرف ہی لیکن یہ یاد رہے کہ واپسی اللہ کے گھر سے ہے اور آپ حج کی ذمہ داریوں کے ساتھ واپس ہو رہے ہیں۔ نمازوں کا اہتمام ذکر میں مشغولیت، رفیقوں کا خیال، ساتھیوں کے لئے ایثار کا جذبہ، اپنی کوتاہیوں پر ندامت و استغفار، پہلے سے زیادہ ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی دینی خدمت و رفاقت کا موقع دوبارہ عطا فرمایا ہی پھر اس موقع سے فائدہ اُٹھایئے اور اپنے حج کو قیمتی بنایئے۔

اچھا اب رخصت، یہ نوشتہ کیا عجب ہے کہ ہم سے زیادہ خوش قسمت ہو کہ سفرِ حج میں آپکے ساتھ ہو، اور حرمین میں اس کو آپ کی رفاقت کی سعادت حاصل ہو، اور خدا کی قدرت و رحمت سے بعید نہیں کہ آپ کو اس سے کچھ کام کی بات ہاتھ آجائے۔ اگر یہ نہ ہو تو بھی ایک ادنیٰ و نااہل رفیق کا یہی حق ہوتا ہے، حجاج کو اپنے اس سامان سے بھی انس ہو جاتا ہے جو اس سفرِ سعادت میں ساتھ ہو، یہ بھی نہیں، تو اخوت اسلامی کا حق ضرور ہے، ان حقوق کی بنا پر اور بغیر کسی حق کے موجہ اللہ یہ درخواست ہے کہ راقم سطور، اس کے والدین، اعزہ واحباب محسنین، اور اس نمبر کے مرتب و معاونین کے لئے مواقع قبولیت پر دُعا فرمائی جائے۔ ؎

غرض نقشیست کز ما یاد ماند | کہ ہستی مانمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے زرحمت | کند بر حالِ ایں مسکیں دعائے

نامۂ شوق

یہ ایک صاحبِ دل کے خطوط اپنے ایک خادم کے نام ہیں جو مدینۂ طیبہ حاضر ہوا تھا، ان سے اندازہ ہوگا کہ اہلِ محبت وہاں کی حاضری کو کیسی دولت سمجھتے ہیں اور اپنے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ "مدیر"

(۱)

بعد سلام مسنون! پرچہ پہنچا۔ روانگی سے قبل ملاقات کو تو بندہ کا بھی دل چاہتا ہے مگر وقت تنگ رہ گیا۔ یہاں تشریف لانا ایسے تنگ وقت میں دشوار ہوگا۔

آپ نے یہ نہیں لکھا کہ روانگی کس وقت ہے۔ بہر حال اگر ملاقات نہ ہو سکے تو اولاً اپنی تمام تقصیرات و بے ادبیوں کی معافی چاہتا ہوں۔ شعر ہے ؎

جاتے ہو تو جاؤ پیا اتنا تو سن جاؤ!
یاد جو آجائیں تو مرنے کی دعا کرنا

بارگاہِ رسالت پر پہونچکر اگر یاد آجائے تو یہ الفاظ بھی عرض کر دینا" ایک روسیاہ ہندی کتّے نے بھی سلام عرض کیا تھا" اگر ایک دو طواف بھی اس ناکارہ کی طرف سے کر دیں تو آپ جیسے کریم جفا کش حضرات سے اُمید ہے کہ بار نہ ہوگا۔ یہی چیزیں اس ناکارہ اور نااہل کے لئے اعلےٰ تبرکات ہیں۔ کسی تبرک کے لانے کا ہرگز ہرگز ارادہ نہ کریں۔ اس کا نعم البدل میں نے تعلقات کی قوت کے زور میں خود ہی تجویز کر دیا کہ مجھے زمزم وغیرہ تبرکات کی بہ نسبت دُعا اور طواف کی مسرت بھی زیادہ ہوگی اور احتیاج بھی زیادہ ہے۔ (والسلام)

ملہ کس پر یہ کیا بتاؤں -م

(۲)

ہمارا نام لیکر آہ بھی ایک کھینچیو قاصد!

جو وہ پوچھیں تو کہدینا یہ پیغام زبانی ہے

بعد سلام مسنون! کراچی سے دو گرامی نامے پہونچے اوّل مفصل نامہ لفافہ اور پھر مختصر کارڈ، مگر وہاں جواب کا وقت نہ تھا۔ آپنے اس ناپاک کی بیعت و رفاقت کی آرزو لکھی مگر یہ نجس العین اس پاک خطہ کے قابل کہاں، دو مرتبہ حاضری ہوئی مگر ایک طاہر و مطہر ہستی تھی جسکے پیچھے تطہیر بھی لگ گیا بلکہ حکماً لگا لیا گیا، اب کوئی پاک ہستی ایسا سمندر نظر نہیں آتا جس میں ہر قسم کی غلاظت مغلوب ہوجائے۔ فیا حسرتا! آپ نہ معلوم کس مغالطہ میں ہیں، اپنی حالت ؎

وکان ظنی بان الشیب یرشدنی اذا اتی فاذا غیتی بہ کثرا

بلکہ ؎

کنت امرأ من جند ابلیس فارتقی بی الدھر حتی صار ابلیس من جندی

فلومات قبلی کنت احسن بعدہٗ طرائق فسق لیس یحسنہا بعدی

ہے۔ اس تعلق اور محبت کے واسطے سے جو آپ کو اللہ رب العزت کی ستاری کی وجہ سے اس ناپاک سے محض مغالطہ کی وجہ سے رہا ہے درخواست ہے کہ مبارک مہینہ میں، مبارک راتوں میں، مبارک جگہ میں، اگر دعا سے دستگیری فرمادیں تو وہ پاک ذات وہ مقلب القلوب قادرِ مطلق جو مُجَلِّح کو عمر بنادے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ ایک ناپاک کو پاک بنادے اور بدکار کو نیک کار کردے۔ ؎

چشمۂ فیض سے اگر ایک اشارا ہوجائے

لُطف ہو آپ کا اور کام ہمارا ہوجائے

عمر ختم ہوتی جارہی ہے ظاہری طور پر وقت قریب آتا جارہا ہے، اور حالت یہ ہے۔ ؎

آئی تھی کچھ لین کیلئے اور بھول چلی کچھ اور

کیا دکھاؤں گی اپنی پیہہ نے میری خالی دونوں ہاتھ

دیتے ہیں موئے سفید افسوس پیغامِ اجل

نفس سنتا ہی نہیں ہر چند کہتا ہوں سنبھل

اپنی حالت کو کہاں تک روؤں اور اس منافقانہ تحریر سے آپ کے مبارک اوقات کو کہاں تک ضائع کروں، یہ سطریں اس اُمید پر لکھی ہیں کہ آپ کے دل پر کچھ چوٹ لگے تو آپ اس پاک دربار میں کچھ عرض کر سکیں جس کی پاک جوتیوں کے ذرّے لو اقسم علی اللہ لابرہ کے مصادیق ہیں بہت ادب سے صلوٰۃ و سلام کے بعد عرض کر دیں کہ اس ناپاک کا سلام اس پاک دربار کے ہرگز قابل نہیں لیکن تم رحمۃ للعالمین ہو اس ناپاک کیلئے تمہاری نظر رافت کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ ؎

نہ آخر رحمۃ للعالمینی

ز محروماں چرا غافل نشینی

یہ بھی عرض کر دیں کہ کچھ عرض کرنے کا منہ نہیں اس لئے کیا عرض کروں۔ رفقاء سفر سے بھی یہی درخواست ہے والدہ ماجدہ کی خدمت میں بھی سلام مسنون کے بعد دعا کی درخواست کر دیں۔ حضرت اقدس سہارنپوری نور اللہ مرقدہ کی قبر پر بھی سلام کے بعد عرض کر دیں۔ ؎

مضی زمن والناس یستشفعوننی

فهل لی الی لیلی الغداة شفیع

آخر میں مکرر دُعا کی درخواست ہے، رسمی بات نہیں بڑا ضرورت مند ہوں۔

---

(۳)

روضہ اقدس واطہر پر ایک ناپاک کی طرف سے صلوٰۃ و سلام!

ہر چند کہ ماہِ مبارک میں خط لکھنے کا نہ تو وقت ہی ملتا ہے نہ معمول ہے۔ مگر یہ چند سطور محض اس وجہ سے کہ اگر ماہ مُبارک میں آپ حضرات تک پہونچ گئے اور کسی کے دل سے کوئی کلمۃ الخیر کسی جذبہ سے نکل گیا تو وہ بہت سی مشغولیتوں سے بڑھ کر ہو جائے گا آپ حضرات بھی اسوقت سخت ترین مشغول ہوں گے کہ یہاں اس مبارک مہینہ کی ابتدا ہے اور وہاں عریضہ پہونچتے پہونچتے مہینہ کا اختتام و احاق شروع ہو جائے گا اور آپ کے لئے ایسے وقت میں کسی اجنبی کا بولنا بات کرنا بھی گراں ہو رہا ہو گا ایسے وقت میں اتنا بھی بہت زیادہ ہے جو میں لکھ چکا۔ کس قدر قابلِ رشک ہے ایسے مبارک اوقات میں آپ حضرات کا وہاں کا قیام ایسی حالت میں دو افتادوں کو

اگر آپ شریک فرما سکتے ہیں تو دعا سے کیا اس میں بھی آپ حضرات کو بخل ہوگا۔ روضۂ اطہر پر صلوٰۃ وسلام کی ہر صاحب کی خدمت میں مستقل درخواست ہے اور کم از کم ماہ مبارک کے ختم تک جس کے چند ہی ایام اب باقی ہوں گے، روزانہ ایک مرتبہ اگر عرض کر دیا کریں تو بڑا کرم ہے۔
سب حضرات کی خدمت میں روضۂ اطہر پر سلام کی مستقل درخواست ہے، فرض کفایہ نہیں ہے۔

---

(۴)

روضۂ اقدس پر صلوٰۃ وسلام!

ایک مختصر پرچہ ۴ر رمضان المبارک کو یہ خبر سن کر کہ حجاز کا خط جا رہا ہے لکھ کر دیا تھا، کل جناب کا ۲۵ر شعبان کا لکھا ہوا گرامی نامہ عدن و کامران کے درمیان سے پہونچا، خط سے حجاز کے تمام مناظر نظر کے سامنے کو دفعتہً گذر کر جس قلق اور رنج کا سبب ہوئے کیا عرض کروں خوش قسمت ہیں وہ حضرات جن کو یہ سعادتیں میسر آرہی ہیں حق تعالیٰ شانہٗ قبول فرمائیں۔

جہاز کے تلاطم اور طغیانی کی خبروں سے بڑا قلق ہوا۔

آپ حضرات نہ بھلائے جا سکتے ہیں نہ بھلانے کی چیز ہیں حق تعالیٰ شانہٗ آپ کی مساعی کو مثمر فرما کر باعثِ ترقی درجات بنائے اور آپ کے حسنِ ظن سے اس ناپاک کو نوازے۔

بخدمت ۔۔۔ ۔۔۔ بعد دعوات تم بہت متساہل اور معمولات میں مجھ سے بھی بڑھ کر گئے گذرے ہو وقت کو غنیمت سمجھنا۔ تم ۔۔۔ ۔۔۔ کو فارغ رکھنے کے لئے گئے ہو اس کا ضرور لحاظ رہے کہ ان کو گھر والوں میں مشغولی کی نوبت نہ آئے یہی آپ کی تبلیغی خدمت ہے۔ اور اس سے جو وقت بچے وہ مدینۂ پاک کے قیام میں درود شریف کی کثرت میں، اور وہاں سے واپسی پر تا رمی، جمرہ، تلبیہ کی کثرت میں، اور اس کے بعد سے وطن پہونچنے تک اپنی اور اعزہ اور احباب کیلئے استغفار کی کثرت میں۔

۔۔۔ ۔۔۔ کی خدمات میں سلام مسنون۔

فقط والسّلام

---

(۵)

روضۂ اطہر پر دست بستہ صلوٰۃ وسلام!

بعد سلام مسنون گرامی نامہ مورخہ ۱۳؍رمضان ۲۰؍ ماہ مبارک کو پہونچا، ہر چند کہ ماہ مبارک میں خط لکھنے کا وقت ارادہ سے بھی نہیں ملتا لیکن آپ کے انتظار نے مجبور کیا کہ چند سطور تو لکھ ہی دوں۔

گرامی نامہ نے گرمی کے رمضان میں ایک شعلہ سا بدن میں پیدا کر دیا، اسکے سوا کیا عرض کروں (ھنیئاً لارباب النعیم نعیمھم) آپ نے راستہ کی کیفیت اور مناظر تحریر فرما کر سابقہ حالات اور پرانے واقعات یاد دلا دیئے۔

آپ نے یہ تحریر نہیں فرمایا کہ مدینۂ طیبہ کا قیام کب تک ہے؟ تاکہ عید کے بعد کے عرائض کے متعلق رائے قائم کرسکوں، ماہ مبارک اب قریب الختم ہے اس میں تو دوسرا عریضہ بظاہر نہ جاسکے گا اس کے بعد تقریباً ایک عشرہ مسلسل مختلف اسفار ... میں صرف ہوگا۔

روضۂ اطہر پر صلوٰۃ وسلام کی درخواست سب حضرات نے مستقل ہی۔

صبح مدینہ

(از۔ حضرت صوفی ایم۔اے)

اے صبح مدینہ صلِ علیٰ، سبحان اللہ سبحان اللہ
سبحان اللہ سبحان اللہ سبحان اللہ سبحان اللہ

الصبح بدا من طلعتہ واللیل دجیٰ من وفرتہ
جاتی ہے جدھر پُرشوق نظر، جلوہ جلوہ جلوہ جلوہ

کیا موسم ہے کیا عالم ہے، تسبیح میں ٹھنڈے جھونکے ہیں
اک وجد میں ہے ڈالی ڈالی، اک کیف میں ہے پتہ پتہ

کوہ و وادی، صحرا، بستی، ہر چار طرف مستی مستی
کہتی ہے سانسیں لے لے کر ہر موجِ ہوا اللہ اللہ

تاروں پر مستی چھائی ہے، بیہوشی ہے، رعنائی ہے
بیداری ہے، بینائی ہے، نورانی ہے ذرہ ذرہ

کیا شبنم نے چھڑکاؤ کیا، نیساں کے نتھرے بوندوں کا
زندہ سیپی، سچا موتی، پتی پتی، قطرہ قطرہ

زلفیں لہرائیں حوروں کی، یا شاخیں سبز کھجوروں کی
ہیں موجِ ہوا کی سانسیں، یا معصوم فرشتوں کا نغمہ

کس حسرت سے بیدار ہوئے، کس عجلت سے تیار ہوئے
پھر نور کی جالی دیکھیں گے اے شوقِ نظر تیرا رتبہ

اب مسجد کے میناروں پر رہ رہ کے پپیہے بولیں گے
اب رحمت کا در کھولینگے، وا ہوگا جنت کا روضہ

خاموش فضائیں سوتی ہیں، پُرکیف اذانیں جگتی ہیں
اُڑتی ہے ہوا میں گنبد سے ٹکرا کے صدائے الا اللہ

آنسو کیوں اُبلے پڑتے ہیں، یہ دل کیوں دہلا جاتا ہے
ہم اور مدینہ کی بستی، اپنی پستی کا یہ درجہ

واللیل اذا یغشیٰ پڑھ کر، شب نے زلفیں لہرائی تھیں
والشمس ضیاءٗ کہہ کہہ کر، کرنوں نے کھولدیا چہرہ

گنبد کا نور دمک اُٹھا، روضہ کا حسن چمک اُٹھا!
دل کا گلزار لہک اُٹھا، ماشاء اللہ ماشاء اللہ

رحمت کی گھٹا چھائے تم پر، اے گنبدِ خضرا کے جلوو!
بارش ہو درودوں کی تم پر، اے صلِ علیٰ محبوب اللہ

صوفی اک حسرت لایا ہے، ظلمت سے نور میں آیا ہے!
یہ دل بھی نورانی کردے، انوارِ مدینہ کا صدقہ

حج و زیارت کے آداب

(از حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہم العالی، شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور)

(اللہ کے جن بندوں کو حج و زیارت کی سعادت نصیب ہو ان کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ حج و زیارت کے آداب کا علم حاصل کریں اور ان کی پابندی کی پوری کوشش کریں۔

ذیل میں جو آداب درج کئے جا رہے ہیں یہ مخدومنا حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہم العالی کی بابرکت تصنیف "فضائل حج" سے ماخوذ ہیں جو حضرت ممدوح کی اجازت سے یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔ ان آداب میں جو کچھ ہے سراسر مقصد اور مغز ہی مغز ہے خوش نصیب ہیں وہ حضرات جو ان سے پورا فائدہ اٹھائیں۔

صفحات میں گنجائش کی کمی اور ناظرین کے لئے استفادہ کی سہولت کے خیال سے جابجا عبارت میں تلخیص بھی کی گئی ہے یعنی بعض آداب کے سلسلہ کی علمی تفصیلات کو حذف کر دیا گیا ہے لیکن کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی گئی ہے جو ہمارے نزدیک ناظرین کے لئے ضروری تھی۔ اس اختصار اور تلخیص کے عمل کی وجہ سے اگر کہیں کچھ فرق پڑ گیا ہو تو اس کی ذمہ داری خاکسار مرتب پر ہے — مدیر)

آداب حج

(۱) جب اللہ جل شانہ کسی خوش نصیب کو اس سعادت کی توفیق عطا فرمائے مثلاً حج فرض ہو جائے۔ یا حج نفل کے اسباب پیدا ہو جائیں تو پھر ارادہ کی تکمیل میں

عجلت کرنا چاہئے بالخصوص حج فرض کو معمولی اعذار کی وجہ سے ہرگز مؤخر نہ کرنا چاہئے کہ شیطان ایسے مواقع پر لغو خیالات اور بے محل ضروریات دل میں جمع کر دیتا ہے اور طرح طرح کے وسوسے دل میں ڈالتا ہے اس لئے موانع کو شیطانی اثر سمجھکر حتی الوسع ان کے دفع کرنے کی اور اُن کو غیر اہم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

(۲) مناسب ہے کہ جب سفر کا ارادہ ہو تو مسنون استخارہ کرے نفس حج کے لئے استخارہ کی ضرورت نہیں مثل مشہور ہے "در کار خیر ہیچ حاجت استخارہ نیست" لیکن چونکہ اہم سفر ہے راستہ دشوار گذار ہے ان امور کے متعلق استخارہ کرے کہ کب چلے کس راستہ سے جائے کس جہاز میں جائے وغیرہ وغیرہ

(۳) حج کے مسائل معلوم کرنے کی سعی کرے بہت سے رسائل اُردو میں اس موضوع پر شائع ہوچکے ہیں اُن کو بالاستیعاب دو چار مرتبہ سفر سے پہلے پڑھ لے تاکہ ناواقفیت کی وجہ سے اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں نقصان نہ رہ جائے اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ کسی عالم کی رفاقت سفر میں اختیار کرے اور ہر چیز کو اس سے تحقیق کرتا رہے تین رسالوں کے مطالعہ کا بندہ ناکارہ خصوصیت سے مشورہ دیتا ہے۔ ایک زبدۃ المناسک مؤلفہ قطب عالم حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ دوسرے زیارت الحرمین مؤلفہ مولانا عاشق الہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تیسرے معلم الحجاج مؤلفہ مولانا سعید احمد صاحب زاد مجدہم مفتی مظاہر علوم اُن کے علاوہ اور جو رسائل معتمد علماء کے مل سکیں

(۴) جب سفر کرے تو نیت خالص اللہ کی رضا ہونا چاہیئے لوگوں کا دکھلاوا یا حاجی کہلانیکا شوق، یا سفر تفریح وغیرہ فاسد ارادے ہرگز نہ ہونا چاہئیں۔

(۵) ایک یا اس سے زیادہ رفیق سفر ایسے لوگ تلاش کئے جائیں جو دیندار صالح نیک ہوں دین کے کاموں میں دلچسپی اور شوق رکھنے والے ہوں تاکہ اس راستے میں معین و مددگار ہوں اگر یہ کسی کام کو بھول جائے تو وہ یاد دلائیں اور نیک کاموں کی ترغیب دیتے رہیں اگر کسی کام میں سستی پیدا ہو تو وہ ہمت بندھائیں کوئی پریشانی پیدا ہو تو صبر دلائیں کوئی عالم ہو تو اور بھی بہتر ہے کہ مسائل میں بھی مدد دیتا رہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ رشتہ دار کی بہ نسبت اجنبی زیادہ بہتر ہے کہ راستہ میں بسا اوقات طبائع کے اختلاف کیوجہ سے آپس میں خشکر رنجی پیدا ہوجاتی ہے جس سے قطع تعلق کی نوبت آجاتی ہے اگر رشتہ دار کے ساتھ ایسی نوبت آئے گی تو قطع رحمی کا

گناہ ہوگا البتہ اگر اپنے اوپر یا رفیق پر اس کا اطمینان ہو کہ ایسی نوبت نہ آئیگی تو مضائقہ نہیں۔

(۶) حج کے لئے حلال مال تلاش کرے جس میں شبہ نہ ہو حرام مال سے خواہ رشوت کا ہو یا ظلم سے کسی سے حاصل کیا ہو ایسے مال سے فرض تو ادا ہو جاتا ہے لیکن وہ حج مقبول نہیں ہوتا۔ اگر مال مشتبہ ہو تو بعض علماء نے اسکی یہ صورت تجویز کی ہے کہ قرض لیکر حج کرلے اور پھر اس مال سے قرض ادا کر دے۔

(۷) اپنے سب پچھلے گناہوں سے توبہ کرے اور کسی کا مال ظلم سے لے رکھا ہو تو اس کو واپس کرے اور کسی اور قسم کا کسی پر ظلم کیا ہو تو اس سے معاف کرائے جن لوگوں سے اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہو ان سے کہا سنا معاف کرالے اگر کچھ قرضہ اپنے ذمہ ہو تو اسکو ادا کرے یا ادائیگی کا کوئی انتظام کر دے جو امانتیں لوگوں کی اپنے پاس ہوں انکو واپس کرے یا کوئی مناسب انتظام امانت رکھنے والوں کی اجازت سے کر دے جن لوگوں کا خرچ اپنے ذمہ ہے جیسے بیوی چھوٹی اولاد وغیرہ ان کے خرچ کا بند و بست اپنی واپسی کے زمانہ تک کر دے۔

(۸) حلال و طیب مال سے اتنا خرچ اپنے ساتھ لے جو بغیر تنگی کے پورے سفر کی آمد و رفت کو کافی ہو جائے بلکہ احتیاطاً کچھ زائد لے تاکہ راستہ میں غرباء کی کچھ اعانت کر سکے کھلانے میں سے اہل ضرورت کی تواضع کر سکے جو لوگ ضرورت کی مقدار سے بھی کم لیکر جاتے ہیں وہ اکثر دوسروں پر بوجھ بنجاتے ہیں اور سوال کے مرتکب ہوتے ہیں۔

(۹) جب سفر شروع کرے تو دو رکعت نفل پڑھے جس میں پہلی رکعت میں قل یا اور دوسری میں قل ہو اللہ پڑھنا اولیٰ ہے اور بہتر یہ ہے کہ دو رکعت گھر میں پڑھے اور دو رکعت محلہ کی مسجد میں

(۱۰) چلنے سے پہلے اور چلنے کے بعد کچھ صدقہ کرے اور اپنی وسعت کے موافق کرتا رہے کہ صدقہ کرنے کو بلاؤں اور مصیبتوں کے دفع کرنے میں خاص دخل ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ صدقہ کرنا اللہ کے غصہ کو دور کرتا ہے اور بری موت سے حفاظت کا سبب ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص کسی کو کپڑا پہنائے جب تک اس کے بدن پر کپڑا رہیگا پہنانے والا اللہ کی حفاظت میں رہے گا۔ (مشکوٰۃ)

(۱۱) جب سفر شروع کرنے لگے تو اس وقت کی مخصوص دعائیں جو احادیث میں کثرت سے آئی

ہیں پڑھ کر نکلے۔

(۱۲) چلتے وقت مقامی رفقاء اعزہ احباب سے ملاقات کر کے انکو الوداع کہے اور ان سے اپنے لئے دعا کی درخواست کرے کہ انکی دعائیں بھی اسکے حق میں خیر کا سبب ہونگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے جب کوئی آدمی تم میں سے سفر کرے تو اپنے بھائیوں کو سلام کر کے جائے انکی دعائیں اس کی دعا کے ساتھ ملکر خیر میں زیادتی کا سبب ہو نگی۔ الوداع کہتے وقت مسنون یہ ہے کہ یوں کہے اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَاَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيْمَ اَعْمَالِكُمْ (اتحاف)

(۱۳) جب گھر سے روانہ ہونے سے نکلے تو اس وقت کیلئے بھی متعدد دعائیں احادیث میں آئی ہیں ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب آدمی گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھے بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ تو اس سے کہا جاتا ہے کہ تو اپنے مقصد کی طرف راستہ پائیگا اور راستہ میں تیری حفاظت کی جائیگی اور شیطان اس سے دور ہو جاتا ہے (اتحاف)

(۱۴) جب سفر شروع ہونے لگے تو قافلہ میں کسی دیندار سمجھدار تجربہ کار متحمل مزاج جفاکش متواضع شخص کو امیر قافلہ بنالینا چاہیئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ جب تین آدمی بھی سفر کریں تو چاہیئے کہ ایک کو اپنے میں سے امیر قافلہ بنالیں (مشکوٰۃ) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول تھا کہ جب کوئی قافلہ روانہ ہوتا تو کسی ایک شخص کو ان میں سے امیر بنادیتے اور جو شخص امیر بنے اس کو بارت سے متوقع ادب کے آداب کی رعایت کرنا چاہیئے رفقا کے احوال کی خبر گیری انکے سامان کی نگرانی کے اسباب پیدا کرنا انکو آرام و راحت پہونچانا امیر کے ذمہ ہے

(۱۵) بہتر یہ ہے کہ سفر کی ابتدا پنجشنبہ کے دن صبح کے اوقات میں ہو ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پنجشنبہ کے روز سفر کی ابتداء کو پسند فرماتے تھے (مشکوٰۃ) دوسری حدیث میں ہے کہ حضور کسی لشکر یا قافلہ کو روانہ فرماتے تو دن کے اول حصہ میں روانہ فرماتے۔

(۱۶) سواری پر سوار ہونیکی اور اترنے کی دعائیں بھی احادیث میں متعدد وارد ہوئی ہیں اُن کو معلوم اور محفوظ کرنا اولٰے ہے کہ ہر منزل پر اترتے چڑھتے پڑھتا رہے۔

(۱۷) سفر میں جب کسی اونچی جگہ چڑھے تو علاوہ دوسری دعاؤں کے اللہ اکبر تین مرتبہ اور جب نیچے کی جگہ اترے تو علاوہ اور دعاؤں کے سبحان اللہ تین مرتبہ کہنا اولیٰ ہے اور جب سفر میں کسی جگہ

وحشت سوار ہو اور گھبراہٹ ہونے لگے تو سبحان الملک القدوس رب الملٰئکۃ والروح جللت السمٰوات بالعزۃ والجبروت پڑھنا اولیٰ بھی اور مجرب بھی ہے۔

(۱۸) اگر کوئی شخص بلا مشقت کے پیدل حج کرے تو کیا ہی کہنا، بشرطیکہ کسی دوسرے مکروہ میں مبتلا نہ ہو جائے لیکن اگر سواری پر حج کرے تب بھی اولیٰ یہ ہو کہ اپنی ہمت اور وسعت کے موافق جتنا بسہولت تحمل ہو سکے پاؤں چلے بالخصوص مکہ سے عرفات کے درمیان کہ ہر ہر قدم پر سات سو نیکیاں حرم کی نیکیوں میں سے شمار ہوتی ہیں اور حرم کی نیکی ایک لاکھ کے برابر ہوتی ہے اکابر کا اکثر معمول تھا کہ اونٹوں کے سفر میں جب عصر کی نماز کیلئے اترتے تو مغرب تک پاؤں چلکر مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر سوار ہوتے کہ یہ وقت مختصر بھی ہوتا ہے اور گرمی دھوپ یا اندھیرا بھی نہیں ہوتا۔ علماء نے لکھا ہے کہ مکہ سے عرفات اور منیٰ تک پیدل جانا زیادہ پسندیدہ اور بہتر ہے کہ جو لوگ قوی چلنے کے عادی ہوں ان کو اس حصہ کیلئے سواری کا پابند نہ ہونا چاہئے کہ بسا اوقات سواری کی مجبوری سے بہت سے مستحبات ترک ہو جاتے ہیں۔

(۱۹) سواری کے جانور کی رعایت اور اسکے حقوق کی حفاظت بھی ضروری ہے اسکے تحمل سے زیادہ مشقت اس پر ڈالنا جائز نہیں اسلاف میں سے متقی اور پرہیزگار حضرات اس پر لیٹ کر سونے سے بھی احتراز کرتے تھے کہ اس سے اس پر بوجھ بڑھ جاتا ہے علماء نے لکھا ہے کہ جانور کو اذیت پہونچانے اور بے وجہ تکلیف دینے کا بھی قیامت میں مطالبہ ہوگا۔ حضرت ابو درداء صحابی رضی اللہ عنہ اپنے انتقال کے وقت اپنے اونٹ سے خطاب کرکے فرماتے تھے کہ اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں مجھ سے جھگڑا نہ کیجیو میں نے تیری طاقت سے زیادہ کام تجھ سے کبھی نہیں لیا۔ (اتحاف)

(۲۰) اسی طرح سواری کے مالک کے حقوق کی بھی رعایت ضروری ہے اسکی اجازت سے زیادہ سامان رکھنا جائز نہیں جتنی مقدار کرایہ میں طے ہو چکی ہے اتنی ہی رکھنا جائز ہے اسی میں ریل وغیرہ کا سفر بھی یہی حکم رکھتا ہے کہ چھپا کر استحقاق سے زیادہ سامان بلا محصول ادا کئے رکھنا جائز نہیں اپنے اسلاف کا معاملہ تو اس میں اس قدر احتیاط کا تھا کہ وہ اب سمجھ میں بھی مشکل سے آتا ہے حضرت عبداللہ بن مبارک جو مشہور محدث اور مشہور امام ہیں ایک مرتبہ سفر میں تشریف لیجا رہے تھے کسی نے ان کو ایک خط دیا کہ یہ بھی لیتے جائیں انہوں نے فرمایا کہ میں اونٹ والے کو اپنا سامان دکھا چکا ہوں اب اس کو پہلے اطلاع کردوں کہ یہ اور لیتا ہوں وہ اجازت دیدیگا تو لے لونگا (اتحاف)

(۲۱) سادات سفر میں تنعم اور زیب و زینت کے اسباب سے بچے کہ یہ سفر عاشقانہ سفر ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے الحاج الشعث التفل (پراگندہ بال اور میلا حاجی افضل حاجی ہے) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ جب حجاج کو دیکھتے تو فرماتے کہ حاجی کم ہوتے جاتے ہیں اور سفر کرنے والے بڑھتے جا رہے ہیں اس پر ایک شخص کو دیکھا کہ معمولی ہیئت اور معمولی لباس میں ہے فرمایا اس پر حجاج میں سے ہے (اتحاف)

(۲۲) سفر میں جو کچھ خرچ کرے وہ نہایت بشاشت اور فراخدلی سے خرچ کرے دل تنگی اس مبارک سفر کے اخراجات میں ہرگز نہ ہونا چاہئے حدیث میں آیا ہے کہ ایک روپیہ کا ثواب اس سفر میں سات سو روپیہ کے برابر ہے ایسی حالت میں جو پیسہ اس مبارک سفر میں خرچ ہو جائے وہ اجر ہی اجر ہے اس سے مقصود یہ نہیں کہ اسراف کیا جائے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہر خرچ کی زیادتی اسراف نہیں بلکہ اسراف بے محل خرچ کرنا ہے۔ یہاں کے مزدور، نوکر اونٹ والوں پر کفارت کے کرایوں میں جو خرچ کیا جائے اور اس میں ان لوگوں کی اعانت کی نیت بھی شامل کر لی جائے تو پھر کوئی بھی خرچ بار نہیں۔

(۲۳) البتہ رشوت دینے سے حتی الوسع احتراز کرے اور جہاں تک مجبوری نہ ہو جائے رشوت نہ دے کہ وہ حرام ہے۔

(۲۴) اس سفر میں جو مشقتیں تکلیفیں پہنچیں ان کو نہایت خندہ پیشانی اور بشاشت سے برداشت کرے ہرگز ان پر ناشکری اور بے صبری کا اظہار نہ کرنا چاہئے کہ اس سفر میں پہنچنا کوئی قسم کی تکلیف پہونچے بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے قائم مقام ہے (اتحاف) جیسا مال خرچ کرنا مالی صدقہ ہے یہ جانی صدقہ ہے۔

(۲۵) معاصی سے بچنے کی بہت اہتمام سے کوشش کرے قرآن پاک میں خاص طور سے اس کو ذکر فرمایا ہے فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ جل شانہ تک وصول اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک لذتوں سے احتیاط اور شہوتوں سے حفاظت نہ ہو اسی وجہ سے پہلے لوگ رہبانیت اختیار کیا کرتے تھے جس کا بدل حج میں یہ رکھا گیا کہ بیوی سے صحبت بھی ناجائز کر دی گئی۔ (اتحاف)

(۲۶) نماز وں کا نہایت اہتمام رکھے بہت سے حاجی سفر کی مشقت اور کاہلی سے اس میں سستی کر دیتے

ہیں یہ بہت بڑا گناہ ہے ابو القاسم حکیم کہتے ہیں جو شخص جہاد میں جائے اور اسکی وجہ سے اسکی ایک نماز فوت ہو جائے تو اس کو اس کے کفارہ میں نئو جہاد کرنے کی ضرورت ہے۔

(۲۷) سارے سفر کو ذوق و شوق اور عاشقانہ و والہانہ جذبہ سے کرے۔ کہ یہ عبادت ساری ہی مظہر عشق ہے یہ سمجھتے کہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو رہا ہے اور ایسا ہے گویا شہنشاہ نے کوئی دربار مقرر کیا ہے اور خوش قسمتی سے دعوتی کارڈ اسکے نام کا بھی آگیا اسلئے کہ بغیر اللہ جل شانہ کی توفیق کے کچھ بھی نہیں ہوتا اسی کی طرف سے حاضری کی طلب ہوتی ہے جب ہی کوئی شخص جا سکتا ہے ؎

مری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے قدم یہ خود نہیں اٹھتے اٹھائے جاتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید رکھے کہ جب دنیا میں اس نے اپنی اس تجلّی گاہ کی زیارت کی سعادت نصیب فرمائی تو آخرت میں اپنی زیارت سے بھی محروم نہ فرمائیگا۔

(۲۸) اپنی ہر عبادت میں اللہ کے لطف و کرم سے قبول کی امید واثق رکھے وہ بڑا کریم ہے اور اس کے کرم کا ہر شخص کو امیدوار رہنا چاہئے ع کہ شیوہ کریموں کا نبھانا اپنے چاکر کا ہے مگر اس امید میں گھمنڈ کا شائبہ ہرگز نہ آئے اپنے اعمال کے قصور کی وجہ سے اس کو اس کا مستحق سمجھے کہ قابل قبول نہیں۔

آداب زیارت

(۱) جب زیارت کی نیت سے سفر کرے (خواہ قبر اطہر کی زیارت کی نیت ہو یا مسجد کی زیارت کی تو اپنی نیت کو خالص اللہ کی رضا کیلئے خالص کرے اسمیں کوئی شائبہ ریا کا تفاخر کا شہرت کا سیر و سیاحت کا یا کسی اور دنیوی غرض کا ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ اس صورت میں نیکی برباد گناہ لازم ہے۔

(۲) ملا علی قاری نے شرح لباب میں لکھا ہے کہ نیت کے خالص ہونے کی علامت یہ ہے کہ فرائض اور سنن نہ چھوٹ پائیں ورنہ زیارت سے مشقت اور مالی نقصان کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوا بلکہ تو بہ اور کفارہ ذمہ ہو گیا۔ بندۂ ناکارہ کے خیال میں سنن کا اس سفر میں خاص اہتمام رکھے اگرچہ سفر کیوجہ سے سنتوں میں خفت آجاتی ہے اور سفر میں سنتوں کا وہ حکم نہیں رہتا جو حضر میں ہے لیکن مدینہ پاک کی حاضری میں حتی الوسع زیادہ اہتمام مناسب ہے بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات عادات شریفہ کی تحقیق کرکے انکے اتباع کی سعی کرے تو اس سفر کی شان کے زیادہ مناسب ہے۔

(۳) اس سفر میں درود شریف کی خصوصیت سے کثرت رکھے اور نہایت توجہ سے پڑھے تمام علماء نے اسکی بہت تاکید لکھی ہے کہ اس سفر میں درود شریف کی نہایت کثرت کرے جتنی کثرت ہوگی اتنا ہی مفید ہوگا بلکہ ملا علی قاری نے تو شرح لباب میں یہاں تک لکھا ہے کہ فرائض اور ضروریات معاش سے جتنا وقت بچے وہ سب درود شریف کے پڑھنے میں خرچ کرے

(۴) ذوق شوق پیدا کرے اور جتنا قریب ہوتا جائے شوق و اشتیاق میں زیادتی پیدا کرے۔

وعدۂ وصل چون شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد

کبھی کبھی اس شوق کو پیدا کرنے کے واسطے نعتیہ اشعار بھی پڑھ لیا کرے حضور کی سیرت کی کوئی کتاب ساتھ ہو یا مل جائے تو اس کو پڑھ لیا کرے یا سن لیا کرے آپس کی مجلسوں میں بھی حضور ہی کے حالات کا تذکرہ رہا کرے اور جو دن مدینہ پاک کے قرب کا آتا جائے اس میں خوشی اور اشتیاق بڑھتا جائے۔

(۵) راستہ میں جو مسجدیں یا مواقع ایسے آئیں جن میں حضور اقدس یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قیام یا نماز پڑھنا معلوم ہو انکی زیارت کرتا جائے اور وہاں نوافل پڑھے یا ذکر و تلاوت وغیرہ کرے اسی طرح جو کنویں راستہ میں ایسے آئیں اُن کا پانی برکت کے حصول کی نیت سے پئے معلم الحجاج اور زیارت الحرمین (جن کا شروع میں ذکر آچکا ہے) اُن میں بھی بہت سے مواقع ذکر کئے گئے ہیں انکو غور سے پڑھے اور مواقع کی تحقیق کرے ان سب میں معرس جو ذوالحلیفہ کے قریب ہے وہاں نماز پڑھنا زیادہ اہم ہے کہ شافعیہ اس کو سنت مؤکدہ کہتے ہیں اور بعض علماء سے اس کا واجب ہونا نقل کیا گیا ہے (شرح مناسک نووی)

(۶) جب مدینہ طیبہ قریب آجائے تو بہت زیادہ ذوق و شوق میں غرق ہو جائے کثرت سے درود شریف بار بار پڑھے اگر سواری پر ہو تو اس کو تیز چلانے کی کوشش کرے حدیث میں آیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے واپس تشریف لاتے اور مدینہ طیبہ قریب ہوتا تو اپنی سواری کو تیز چلاتے۔

وابرح مایکون الشوق یوماً ÷ اذا دنت الخیام الی الخیام

(سب سے بڑھا ہوا شوق اس دن ہوتا ہے جب عشاق کے خیمے معشوق کے خیمہ کے قریب ہو جائیں)

(۷) جب مدینہ طیبہ کی دیواروں پر نظر پڑ جائے اور اس کے معطر باغ نظر آنے لگیں جو بیر علی کے بعد سے نظر آنے لگتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ سواری سے نیچے اُتر جائے اور روتا ہو ننگے پاؤں چلے سے

ولما رأینا رسم من لم یدع لنا فؤادا لعرفان الرسوم ولا لبا
نزلنا عن الاکوار نمشی کرامة لمن بان عنه ان نلم به رکبا

(یعنی) جب ہم نے اس محبوب کے شہر کے نشانات دیکھے جس نے نشانات کے پہچاننے کے واسطے نہ ہمارے پاس دل چھوڑا نہ عقل چھوڑی تو ہم اپنی سواریوں سے اتر گئے اور اس کے اکرام میں پیدل چلنے لگے اسلئے کہ اسکی شان سے یہ بہت بعید بات تھی کہ اس کے پاس سوار ہو کر جائیں۔)

پہلے امراء وزراء کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ذوالحلیفہ سے جو تقریباً چھ مل ہے پیدل چلنے لگتے تھے اور حق یہ ہے کہ اس جگہ پاؤں کے بجائے سر کے بل بھی چلے تو اس جگہ کے حق کا کوئی حصہ بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ ؎

لو جئتکم قاصداً اسعی علی بصری لم اقض حقا وای الحق ادیت

(یعنی) اگر میں تمھاری خدمت میں پاؤں کے بجائے آنکھوں سے چلکر آتا تب بھی میں حق ادا نہ کرسکتا تھا اور میں نے آقا تمھارا اور ہی کونسا حق ادا کیا جو یہی ادا کرتا) ؎

ولما رأینا من ربوع حبیبنا بطیبة اعلاماً اثرن لنا الحبا
وبالترب منها اذ کحلنا جفوننا شفینا فلا باساً نخاف ولا کربا

(جب مدینہ پاک میں محبوب کی منزل کے آثار نظر آنے لگے تو انھوں نے محبت کو بھڑکا دیا اور جب وہاں کی مٹی کو آنکھوں کا سرمہ بنایا تو ساری بیماریوں سے شفا ہوگئی کہ اب نہ کسی قسم کا مرض ہے نہ تکلیف)

(۸) جب فصیل مدینہ آجائے تو درود شریف کے بعد یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ هٰذَا حَرَمُ نَبِیِّكَ فَاجْعَلْهُ لِیْ وِقَایَةً مِّنَ النَّارِ وَاَمَانًا مِّنَ الْعَذَابِ وَسُوْءِ الْحِسَابِ (اے اللہ یہ تیرے نبی کا حرم آگیا اس کو تو میرے لئے آگ سے بچنے کا ذریعہ بنا دے اور عذاب سے بچنے کا ذریعہ بنا دے اور حساب کی برائی سے بچنے کا سبب بنا دے) اس کے بعد اس پاک شہر کی خیر و برکت حاصل ہونیکی دعا کرے اور اس کے آداب بجالانے کی توفیق کی دعا کرے اور کسی نامناسب حرکت میں ابتلا سے بچنے کی دعا کرے اور خوب دعائیں کرے۔

(۹) بہتر یہ ہے کہ شہر میں داخل ہونے سے پہلے غسل کرے اور پہلے میسر نہ ہو تو شہر میں داخل ہونے کے بعد مسجد میں داخل ہونے سے پہلے کرے اور غسل نہ ہو سکے تو وضو کم از کم ضرور کرلے اسکے بعد بہتر لباس

پہنے اور خوشبو لگائے جیسا کہ عیدین یا جمعہ کے لئے کرتا ہو مگر تواضع اور انکسار ملحوظ رہے تفاخر پاس نہ آئے۔

(۱۰) بعض علماء نے اسوقت کچھ صدقہ کرنا بھی آداب میں لکھا ہے یعنی مسجد میں داخل ہونے سے پہلے پہلے کچھ صدقہ کردے ابن حجر لکھتے ہیں کہ مسنون یہ ہے کہ کچھ صدقہ کرے چاہے قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۱) جب شہر میں داخل ہو تو اسوقت کی خصوصی دعائیں پڑھتا ہوا نہایت خشوع خضوع سے داخل ہو اب تک کی عدم حاضری کا قلق ہو دنیا میں حضور کی زیارت نصیب نہ ہونے کا رنج ہو آخرت میں زیارت نصیب ہونیکی آرزو اور تمنا ہو اور اس کا خوف ہو کہ نہ معلوم مقدر ہے یا نہیں اور جیسا کہ کسی بڑے سے بڑے دربار میں حاضری کیوقت رعب و جلال کا اثر ہوتا ہے وہی منظر یہاں ہو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور قدر و منزلت ملحوظ ہو درود شریف لگاتار زبان پر جاری ہو۔ (لباب)۔

(۱۲) جب قبہ خضرا پر نظر پڑے تو عظمت و ہیبت اور حضور کی علو شان کا استحضار کرے اور یہ سوچے کہ اس پاک قبہ میں وہ ذات اقدس ہے جو ساری مخلوقات سے افضل ہے انبیاء کی سردار ہے فرشتوں سے افضل ہے۔ قبر شریف کی جگہ ساری جگہوں سے افضل ہے۔

(۱۳) شہر میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے مسجد نبوی میں حاضر ہو اگر مستورات کی یا سامان وغیرہ کی مجبوری ہو تو دوسری بات ہے ورنہ سب علماء نے لکھا ہے کہ شہر میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے مسجد میں حاضر ہونا افضل ہے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا عام معمول بھی احادیث میں یہی آیا ہے کہ جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو اول مسجد میں تشریف لیجاتے۔

(۱۴) عورتوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ اگر شہر میں دنکو داخل ہونے کی نوبت آوے تو وہ رات تک انتظار کریں اور رات کیوقت میں مسجد میں حاضر ہوں اسلئے کہ انکے لئے ہر وہ چیز مقدم ہے جو پردہ میں معین ہو۔

(۱۵) مسجد میں داخلہ کے وقت اس جگہ کے آداب کی رعایت رکھے کہ دایاں پاؤں پہلے مسجد میں رکھے پھر بایاں پاؤں رکھے اور مسجد میں داخل ہونے کی دعائیں پڑھے اور اعتکاف کی نیت کرے۔

(۱۶) مسجد میں داخل ہونے کے بعد خشوع خضوع عجز و انکسار میں بہت اہتمام کرے وہاں کی زیب

زینت فرش فروش جھاڑ فانوس قالین قمقموں میں نہ لگ جائے نہ ان چیزوں کی طرف التفات کرے
نہایت ادب اور وقار سے نیچی نظر کئے ہوئے نہایت ہی ادب اور احترام سے جائے بے ادبی اور
لاابالی پن کی کوئی حرکت نہ کرے بڑے اونچے دربار میں پہونچ گیا ہے ایسا نہ ہو کہ بے ادبی کی کوئی
حرکت حرمان وخسران کا سبب بن جائے۔

(۱۷) مسجد میں جانے کے بعد سب سے پہلے روضۂ مقدسہ میں جائے "روضہ" وہ حصہ کہلاتا ہے جو منبر
شریف اور قبر شریف کے درمیان میں ہے اس کو روضہ اسلئے کہا جاتا ہے کہ حضور کا پاک ارشاد ہے کہ میری
قبر اور میرے منبر کا درمیانی حصہ جنت کے روضوں میں سے ایک روضہ ہے "روضہ باغ کو کہتے ہیں"

(۱۸) روضۂ مقدسہ میں پہونچکر اول تحیۃ المسجد پڑھے مسجد میں حاضری کے بعد حضور کی خدمت میں
حاضری سے قبل تحیۃ المسجد کا پڑھنا اولیٰ ہے اسلئے کہ یہ اللہ کا حق ہے جو رسول کے حق پر مقدم ہے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں سفر
سے آیا تھا حضور کی خدمت میں حاضر ہوا حضور اسوقت مسجد میں تشریف فرما تھے حضور نے دریافت فرمایا کہ تحیۃ المسجد پڑھلی میں نے
عرض کیا کہ نہیں فرمایا جاؤ پہلے تحیۃ المسجد پڑھکر بعد میں میرے پاس آنا (شرح مناسک نووی)۔

(۱۹) تحیۃ المسجد سے فارغ ہونے کے بعد اللہ جل شانہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرے کہ اس نے یہ نعمت
جلیلہ عطا فرمائی اور اس پاک ذات سے حج وزیارت کی قبولیت کی دعا کرے اور چاہے سجدۂ شکر
کرے چاہے دو رکعت شکرانہ پڑھے بہت سے علماء نے اسوقت سجدہ شکر کرنے کو لکھا ہے۔

(۲۰) نماز سے فراغت کے بعد قبر شریف کی طرف چلے اس حال میں کہ دلکو سب کدورات اور
آلائشوں سے پاک رکھے اور ہمہ تن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کیطرف پوری توجہ کرے
علماء نے لکھا ہے کہ جس قلب میں دنیا کی گندگیاں اور لہو ولعب شہوتیں اور خواہشیں بھر رہی ہوں
اس دلربا کی برکات کا کچھ اثر نہیں ہوتا بلکہ ایسے دل والوں پر حضور کے غصہ اور اعراض کا اندیشہ
ہے اللہ ہی اپنے فضل سے اس سے پناہ دے۔

(۲۱) جب کسی قبر پر حاضری ہو تو میت کے پاؤں کی طرف سے جائے تاکہ میت کو اگر حق تعالیٰ شانہ
آنے والے کا کشف عطا فرمائے تو دیکھنے میں سہولت رہے اسلئے کہ جب میت قبر میں دائیں کروٹ
لیٹتی ہے تو اسکی نظر قدموں کی طرف ہوتی ہے اگر کوئی سرہانے کیجانب سے آئے تو میت کو دیکھنے میں
تعب اور مشقت ہوتی ہے (فتح القدیر) اسی ضابطہ کے موافق اس جگہ بھی بعض علماء نے لکھا ہے کہ قدم مبارک

کی جانب سے حاضر ہو جیسا کہ ابن حجر نے شرح مناسک میں نقل کیا ہی مواہب میں لکھا ہے کہ زائر کے لئے مناسب یہ ہے کہ قبلہ کی جانب سے ہو کر مواجہ شریف پر حاضر ہو لیکن اگر پاؤں کی طرف سے حاضر ہو تو یہ ادب کے لحاظ سے اولیٰ ہے۔

(۲۲) جب مواجہ شریف پر حاضر ہو تو سرہانے کی دیوار کے کونہ میں جو ستون ہے اس سے تین چار ہاتھ کے فاصلہ سے کھڑا ہو اور پشت قبلہ کیطرف کرے اور بائیں طرف کو ذرا مائل ہو تاکہ چہرہ انور کے بالکل سامنے ہو جائے (زبدہ)

(۲۳) دیوار سے تین چار گز کے فاصلہ پر کھڑا ہو زیادہ قریب نہ ہو کہ ادب کے خلاف ہی اور نگاہ نیچی رہنا چاہیئے ادہر ادہر دیکھنا اسوقت سخت بے ادبی ہے ہاتھ پاؤں بھی ساکن اور وقار سے رہیں۔ یہ خیال کرے کہ چہرۂ انور اسوقت میرے سامنے ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو میری حاضری کی اطلاع ہی حضور کی علو شان اور علو مرتبت کا استحضار پوری طرح سے دل میں ہو اور یہ سمجھے گویا میں زندگی میں آپ کی مجلس میں حاضر ہوں۔

(۲۴) اسکے بعد حضور پر سلام پڑھے مناسک کے رسائل میں سلام کے الفاظ بہت سے نقل کئے گئے ہیں اس میں سلف کا معمول مختلف رہا ہے بعض اکابر مختلف عنوان اور مختلف الفاظ کے ساتھ سلام پڑھتے تھے اور ذوق وشوق کا تقاضا یہی ہے ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں ۞ واں ایک خموشی تیری سب کے جواب میں

اور بعض حضرات نہایت مختصر الفاظ میں سلام پڑھتے تھے ادب اور ھیبۃ کا تقاضا یہی ہی ؎

بے زبانی ترجمان شوق بے حد ہو تو ہو ۞ ورنہ پیش یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ بعض اکابر جیسے کہ حضرت ابن عمرؓ صرف السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پر اکتفا کرتے تھے اور بعض حضرات طویل سلام کو اختیار کرتے تھے اور احادیث میں مختلف الفاظ اور مختلف عنوانوں سے درود شریف وارد ہونے سے اسکی تائید ہوتی ہی حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ نے زبدہ میں سلام کے الفاظ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ سلام میں جسقدر چاہے الفاظ زیادہ کرے مگر ادب اور عجز کے کلمات ہوں لیکن سلف یہاں مختصر الفاظ کہنے کو پسند کرتے ہیں جہانتک بھی اختصار ہو سکے مستحسن رکھتے ہیں۔ امام نووی نے اپنے مناسک میں سلام کے طویل الفاظ

لکھنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ وغیرہ سے غایت اختصار نقل کیا گیا حضرت ابن عمرؓ تو اتنا ہی کہتے تھے السلام علیک یا رسول اللہ السلام علیک یا ابابکر السلام علیک یا ابتاہ۔ اس ناکارہ کے ناقص خیال میں جو شخص سلام کے الفاظ کا ترجمہ اور مطلب سمجھتا ہو اور ان الفاظ کے بڑھانے سے ذوق میں اضافہ ہوتا ہو اسکو تو تطویل مناسب ہے اور اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو طوطے کی طرح سے مزدورین کے الفاظ دہرانے کی ضرورت نہیں انتہائی ذوق وشوق اور غایت سکون اور وقار سے آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پڑھتا رہے اور جبتک شوق میں اضافہ پاوے انھیں الفاظ کو یا اور کسی سلام کو بار بار پڑھتا رہے۔

(۲۵) یہ نہایت اہم اور ضروری بات ہے کہ سلام پڑھتے وقت شور شغب ہرگز نہ کرے نہ زور سے چلائے بلکہ اتنی آواز سے کہے کہ اندر تک پہونچ جائے ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ نہ تو زیادہ جہر ہو اور نہ بالکل اخفا ہو بلکہ متوسط اور معتدل آواز ہو اور بانی بداعمالیوں کیوجہ سے شرم وحیا لئے ہوئے ہو۔ بخاری شریف میں ایک قصہ لکھا ہے حضرت سائب کہتے ہیں کہ میں مسجد میں کھڑا تھا ایک شخص نے میرے ایک کنکری ماری میں نے ادھر کو دیکھا تو وہ حضرت عمرؓ تھے انھوں نے مجھے (اشارہ سے بلاکر) کہا کہ یہ دو آدمی جو بول رہے ہیں انکو بلا کر لاؤ میں ان دونوں کو حضرت عمرؓ کے پاس لایا حضرت عمرؓ نے انسے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو انھوں نے عرض کیا کہ طائف کے رہنے والے ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر تم اس شہر کے رہنے والے ہوتے تو تمھیں مزہ چکھاتا تم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں چلا کر بول رہے ہو۔ محمد بن مسلمہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو بھی یہ نہیں چاہئیے کہ مسجد میں زور سے بولے (شرح شفاء) حضرت عائشہؓ جب کہیں قریب کیل میخ وغیرہ کے ٹھوکنے کی آواز سنتیں تو آدمی بھیجکر اُن کو روکتیں کہ زور سے نہ ٹھوکیں حضور کی تکلیف کا لحاظ رکھیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنے مکان کے کواڑ بنوانے کی ضرورت پیش آئی تو بنانے والوں کو فرمایا کہ شہر کے باہر بقیع میں بنا کر لائیں انکے بنانے کی آواز کا شور حضور تک نہ پہونچے علامہ قسطلانی مواہب میں لکھتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادب کا وہی معاملہ ہونا چاہئیے جو زندگی میں تھا اسلئے کہ حضور اپنی قبر میں زندہ ہیں (شرح مواہب)

(۲۶) سلام کے بعد اللہ جل شانہ سے حضور کے وسیلہ سے دعا کرے اور حضور سے شفاعت کی

درخواست کرے۔

(۲۷) اس کے بعد اگر کسی اور شخص نے اپنی طرف سے حضور کی بارگاہ میں سلام عرض کرنیکی فرمائش کی ہو تو اسکی طرف سے بھی اس طرح سلام عرض کرے السلام علیک یا رسول اللہ من فلان بن فلان یستشفع بک الی ربک آپ پر سلام اے اللہ کے رسول فلاں کیطرف سے جو فلاں کا بیٹا ہے اور وہ آپ سے اللہ کی پاک بارگاہ میں سفارش چاہتا ہے پہلے فلاں کی جگہ اس شخص کا نام لے دوسرے فلاں کی جگہ اس کے باپ کا نام لے اگر عربی میں کہنا مشکل ہو تو اردو میں عرض کردے کہ فلاں فلاں آدمیوں نے آپکی بارگاہ میں سلام عرض کیا اور شفاعت کی درخواست کی ہے علامہ زرقانی کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے کسی سے سلام پہونچانے کی درخواست کی ہو اور اس نے اس درخواست کو قبول کرلیا ہو یعنی وعدہ کرلیا ہو کہ میں سلام پہونچادوں گا تو اسپر اب اس سلام کا پہونچانا واجب ہوگیا اسلئے کہ یہ بمنزلہ اسکی امانت کے ہے جس کو یہ قبول کرچکا۔ صاحب اتحاف لکھتے ہیں کہ سلف خلف سب کا معمول دوسروں کی معرفت سلام بھیجنے کا رہا ہے اور سلاطین تو مستقل قاصد مدینہ طیبہ حضور کی خدمت میں سلام پہونچانے کیلئے بھیجا کرتے تھے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ بھی حضور کی خدمت میں سلام عرض کرنے کیلئے مستقل قاصد بھیجا کرتے تھے ناظرین رسالہ سے یہ روسیاہ بھی درخواست کرتا ہے کہ اگر اس مبارک وقت میں یہ سیہ کار کسی کو یاد آجائے تو اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْ ذَكَرِيَّا بْنِ يَحْيَى الْكَانْدَهْلَوِيِّ يَسْتَشْفِعُ بِكَ إِلَى رَبِّكَ عرض کردیں احسان ہوگا اور یہ الفاظ یاد نہ رہیں تو اردو ہی میں اس ناکارہ کا سلام عرض کردیں۔

(۲۸) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھنے کے بعد تقریباً ایک ہاتھ دائیں طرف ہٹکر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر سلام پڑھے مشہور قول کے موافق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک حضور کی قبر اطہر کے پیچھے اس طرح سے ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا سر مبارک حضور کے شانہ کے مقابل ہے اسلئے ایک ہاتھ دائیں جانب کو ہو جانے سے حضرت صدیق اکبر کا سامنا ہو جاتا ہے۔

(۲۹) حضرت صدیق اکبرؓ پر سلام سے فراغت کے بعد ایک ہاتھ دائیں جانب ہٹکر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر سلام پڑھے اسلئے کہ مشہور قول کے موافق حضرت فاروق کی قبر مبارک حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک کے پیچھے اسی طرح ہے کہ حضرت عمرؓ کا سر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے شانہ کے

مقابل ہے۔

(۲۰) ان دونوں حضرات کی خدمت میں بھی اگر کسی نے سلام عرض کرنے کی درخواست کر دی ہو تو ہر ایک کی خدمت میں اپنا سلام پڑھنے کے بعد اس کا سلام عرض کر دے اور یہ سراپا خطا و قصور بھی درخواست کرتا ہے کہ اگر ناظرین کو کسی وقت یاد آجائے تو اس ناپاک کا سلام بھی دونوں بارگاہوں تک پہونچا دیں اللہ جل شانہ آپ کو اس احسان کا اپنے لطف سے اجر عطا فرمائے۔

(۲۱) بہت سے علماء نے لکھا ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما پر علیحدہ علیحدہ سلام پڑھنے کے بعد پھر ان دونوں حضرات کے درمیان میں کھڑا ہو یعنی جس جگہ کھڑے ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر سلام پڑھا ہے اس سے تقریباً نصف ہاتھ بائیں جانب کو کھڑا ہو تا کہ دونوں کے درمیان میں ہو جائے اور پھر دونوں پر مشترک سلام پڑھے جس کے الفاظ زبدہ میں یہ لکھے ہیں۔

السلام علیکما یا ضجیعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورفیقیہ ووزیریہ جزاکما اللہ احسن الجزاء جئناکما نتوسل بکما الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیشفع لنا ویدعو لنا ربنا ان یحیینا علی ملتہ وسنتہ ویحشرنا فی زمرتہ وجمیع المسلمین۔

تم دونوں پر سلام اے حضور کے پہلو میں لیٹنے والو تم پر سلام اے حضور کے دونوں ساتھیو تم پر سلام اے حضور کے دونوں وزیرو تمھیں حق تعالیٰ شانہ (ہماری طرف سے) بہترین بدلہ (تمھارے احسانات) کا عطا فرمائے ہم تمھارے پاس اسلئے حاضر ہوئے کہ تم سے حضور کی بارگاہ میں اس بات کی سفارش چاہتے ہیں کہ حضور ہمارے لئے اللہ پاک کی بارگاہ میں شفاعت فرما دیں اور اللہ سے دعا فرما دیں کہ وہ ہمیں حضور کے دین پر اور حضور کی سنت پر زندہ رکھے اور ہمارا اور تمام مسلمانوں کا حشر حضور کی جماعت میں ہو۔

بعض حضرات نے اس سلام کے الفاظ بھی کم و بیش لکھے ہیں جیسا کہ سب سلاموں میں بعض حضرات نے مختصر الفاظ نقل فرمائے ہیں اور بعض نے زائد تحریر فرمائے ہیں اور بعض نے اس مشترک سلام کو ذکر ہی نہیں کیا کہ جب علیحدہ علیحدہ سلام عرض کر چکا ہے پھر مشترک کی کیا ضرورت باقی رہی لیکن جن حضرات نے اس کو ذکر فرمایا ہے غالباً اسی وجہ سے کہ یہاں اب دوبارہ سلام تو بمنزلہ تمہید اور ادب کے ہے صل مقصود ان دونوں حضرات کی خدمت میں سفارش کی درخواست ہے کہ یہ حضور کی بارگاہ میں دعا

کی درخواست اور سفارش کردیں اسی لئے اسکا ترجمہ لکھا ہے کہ اس سے یہ اندازہ ہوسکے کہ اس مکرر سلام کی غرض کیا ہے۔

(۳۲) اس کے بعد پھر بائیں طرف آکر دوبارہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوکر ہاتھ اٹھاکر اول اللہ جل شانہ کی خوب حمد وثنا کرے اس نعمت جلیلہ کا اور اسکی تمام نعمتوں کا شکر ادا کرے پھر خوب ذوق شوق سے حضور پر درود شریف پڑھے پھر آپ کے وسیلہ سے اللہ جل شانہ سے اپنے لئے اپنے والدین کے لئے اپنے مشائخ کے لئے اپنے اہل وعیال کیلئے اپنے عزیز واقارب کیلئے اپنے دوستوں اور ملنے والوں کیلئے اور ان لوگوں کیلئے جنھوں نے دعا کی درخواست کی ہو اور تمام مسلمانوں کیلئے زندوں کیلئے اور مردوں کیلئے خوب دعا کرے اور اپنی دعا کو آمین پر ختم کرے (شرح لباب) اور یاد آجائے تو ناکارہ زکریا کو بھی اپنی اس مبارک دعا میں شامل کرلے۔

(۳۳) اس کے بعد اسطوانہ ابو لبابہ کے پاس آکر دو رکعت نفل پڑھ کر دعا کرے (زبدہ)

(۳۴) پھر دوبارہ روضہ میں جاکر نفلیں پڑھے اور دعا درود وغیرہ میں خضوع خشوع سے مشغول رہے۔

(۳۵) اس کے بعد منبر کے پاس آکر دعا کرے علما نے لکھا ہے کہ منبر کی اس جگہ پر جس کو رمانہ کہتے ہیں ہاتھ رکھکر دعا کرے اسلئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے وقت اسپر دست مبارک رکھتے تھے رمانہ منبر کی وہ موٹھ کہلاتی ہے جو انار کی شکل کناروں پر بنی ہوئی ہوتی ہے۔

(۳۶) اس کے بعد اسطوانہ حنانہ کے پاس جاکر درود شریف اور دعا اہتمام سے کرے (زبدہ)

(۳۷) اس کے بعد باقی مشہور ستونوں کے پاس جاکر دعا کرے (لباب)۔

(۳۸) اور اس کی کوشش کرے کہ وہاں کے قیام میں کوئی نماز مسجد نبوی کی جماعت سے فوت نہ ہونے پائے (فتح القدیر) کہ قیام تھوڑا ہے اور ثواب بہت زیادہ نہ معلوم پھر حاضری میسر ہوسکے یا نہ ہوسکے۔

(۳۹) اس کا خیال رکھے کہ زیارت کے وقت نہ دیواروں کو ہاتھ لگاوے کہ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے اور نہ دیواروں کو بوسہ دے کہ یہ حجر اسود ہی کا حق ہے نہ دیواروں کو چمٹے نہ طواف کرے اسلئے کہ طواف بیت اللہ شریف کے ساتھ خاص ہے قبر کا طواف حرام ہے ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ جاہلوں کے فعل کا اتباع نہ کرے چاہے وہ صورت سے مشائخ معلوم ہوتے ہوں نہ قبر کے سامنے جھکے نہ زمین کو بوسہ

دے نہ قبر کیطرف منھ کرکے اس نیت سے کہ ادھر قبر ہے نماز پڑھے ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ اگر قبر کی تعظیم کے لحاظ سے اس طرف منھ کرکے نماز پڑھے تو اسکے کفر کا فتوی دیا جائیگا البتہ حجرہ کی پشت پر چونکہ دیوار حائل ہے اسلئے قبر شریف کا ارادہ کئے بغیر اسطرف نماز پڑھنا جائز ہے (شرح لباب)

(۳۹) بلا ضرورت شدیدہ قبر شریف کی طرف پشت نہ کرے نہ نماز میں نہ بغیر نماز کے (شرح لباب)

(۴۰) اس کا لحاظ رکھے کہ جب قبر شریف کے مقابل سے گذرنا ہو تو کھڑے ہو کر سلام کرکے آگے بڑھے حتی کہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر مسجد سے باہر بھی قبر شریف کے مقابل سے گذرے تو کھڑے ہو کر سلام کرکے آگے بڑھے حضرت ابو حازم صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آئے اور بیان کیا کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی حضور نے ارشاد فرمایا کہ ابو حازم سے کہدینا کہ تم میرے پاس سے اعراض کرتے ہوئے گذر جاتے ہو کھڑے ہو کر سلام بھی نہیں کرتے اس کے بعد سے ابو حازم کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب ادھر سے گذرتے تو کھڑے ہو کر سلام کرکے آگے بڑھتے (شرح لباب)۔

(۴۱) مدینہ پاک کے قیام میں قبر شریف پر کثرت سے حاضری کا اہتمام رکھے امام اعظم امام شافعی امام احمد تینوں حضرات کے نزدیک کثرت سے حاضر ہوتے رہنا پسندیدہ ہے البتہ امام مالک رضؓ نے کثرت حاضری کو پسند نہیں کیا جس کی وجہ علماء یہ فرماتے ہیں کہ مبادا بار بار کی حاضری سے جوش محبت میں کمی نہ آجائے

(۴۲) مسجد شریف میں رہتے ہوئے حجرہ شریف کیطرف اور مسجد سے جب باہر ہو تو قبہ شریف جہاں سے نظر آتا ہو بار بار ان کو دیکھنا ان پر نظر جمائے رکھنا بھی افضل ہے اور انشاء اللہ موجب ثواب (شرح لباب شرح مناسک نووی)

(۴۳) مدینہ منورہ کے قیام میں جتنا زیادہ سے زیادہ وقت مسجد نبوی میں گذر سکے غنیمت سمجھے قرآن پاک کم از کم ایک تو ختم کر ہی لے اور مستقل اعتکاف بھی جے دن کا نصیب ہو سکے نعمت ہے راتوں کو جتنا زیادہ عبادت میں گذر سکے بہتر ہے کہ یہ مبارک راتیں پھر کہاں ملیں گی۔ (شرح لباب)

(۴۴) احیاء میں لکھا ہے اور اولیٰ زیارت قبر مبارک کے ہر روز یا جمعہ کو زیارت مزارات بقیع کی بھی کرے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت عباس اور حضرت حسن اور حضرت ابراہیم اور ازواج مطہرات اور جماعت کثیر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وہاں تشریف رکھتے ہیں۔

(۴۵) امام غزالی نے لکھا ہے مستحب یہ ہے کہ ہر پنجشنبہ کو شہداء احد کی زیارت کرے صبح کی نماز مسجد نبوی میں پڑھ کر چلا جائے تاکہ ظہر تک واپسی ہو جائے اور کوئی نماز مسجد نبوی کی فوت نہ ہو۔ اور وہاں جاکر سب سے اول سید الشہداء حضرت حمزہ کے مزار پر حاضر ہو حضور کا ارشاد ہے کہ میرے سب چچاؤں میں حضرت حمزہ افضل ہیں دوسری حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن سب شہداء کے سردار حضرت حمزہ ہونگے وہاں جاکر حضرت حمزہ کی قبر مبارک پر نہایت ادب اور سکون سے انکی عظمت و احترام کی رعایت کرتے ہوئے کھڑا ہو اسکے بعد پھر دوسرے مزارات پر۔

(۴۶) امام نووی نے لکھا ہے کہ قبا کی حاضری کا استحباب بہت موکد ہے اور اولیٰ یہ ہے کہ شنبہ کے دن حاضر ہو اس حاضری میں اسکی زیارت کی نیت ہو اور اسکی مسجد میں نماز پڑھنے کی نیت ہو اسلئے کہ ترمذی شریف وغیرہ میں صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مسجد قباء میں نماز پڑھنا بمنزلہ عمرہ کرنیکے ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر شنبہ کے دن مسجد قبا تشریف لیجاتے تھے۔ ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ مسجد مکہ مسجد مدینہ مسجد قصیٰ کے بعد سب مساجد سے افضل مسجد قبا ہی

(۴۷) انکے بعد مدینہ پاک کے دوسرے متبرک مقامات کی زیارت اولیٰ ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ مستحب ہے یہ کہ مدینہ منورہ کے متبرک مقامات کی زیارت کرے جو تقریباً تیس مواضع ہیں اہل مدینہ ان کو جانتے ہیں اور اسی طرح سے ان سات کنووں کا پانی پئے جن سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو کرنا یا غسل کرنا وارد ہوا ہے۔

(۴۸) وہاں کے قیام میں صدقات کی کثرت رکھے بالخصوص مدینہ پاک کے رہنے والوں پر صاحب لباب نے لکھا ہے کہ مدینہ کے مستقل رہنے والے ہوں یا باہر کے لوگ جو وہاں آکر مقیم ہو گئے ہوں وہ باہر کے رہنے والوں پر مقدم ہیں اسلئے کہ مدینہ کے رہنے والوں سے محبت واجب ہے، امام نووی نے لکھا ہے کہ مدینہ کے قیام میں جتنے زیادہ سے زیادہ روزے رکھ سکے رکھے اور جتنا زیادہ ممکن ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسیوں پر صدقہ کرے کہ یہ بھی حضور ہی کی خدمت گزاری میں داخل ہے۔

(۴۹) سب اہل مدینہ کے ساتھ ہر بات میں حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کرے کہ وہ حضور کے پڑوسی ہیں علامہ زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں کہ وہاں کے رہنے والوں کا اکرام کرو اور اگر ان میں سے بعض کے متعلق کوئی ایسی بات کہی گئی ہے یعنے کوئی نامناسب حرکت ان کی معلوم بھی ہو تب بھی وہ حضور کے

پڑوسی ہونے کے شرف سے تو بہرہ اندوز ہیں ہی حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد کہ جبرئیل علیہ السلام مجھے پڑوسی کے بارہ میں بار بار وصیت کرتے رہے ہر پڑوسی کو شامل ہے اس میں اچھے برے کی تخصیص نہیں۔ ھ

فیا ساکنی اکناف طیبۃ کلکم ؛؛ الی القلب من اجل الحبیب حبیب

(اے طیبہ کے رہنے والو تم سب کے سب میرے دل کو محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے محبوب ہو)

حضرت امام مالکؒ جب امیر المومنین مہدی کے پاس تشریف لیگئے تو بادشاہ نے درخواست کہ مجھے کچھ وصیت فرما دیجئے حضرت امام نے فرمایا سب سے اوّل اللہ جل شانہ کا خوف اور تقویٰ اختیار کرنا اسکے بعد اہل مدینہ پر مہربانی کہ وہ حضور کے شہر کے رہنے والے حضور کے پڑوسی ہیں مجھے حضور کا یہ ارشاد ہو نچا ہے کہ مدینہ میری ہجرت کی جگہ ہے اسی میں میری قبر ہوگی اسی سے میں قیامت کے دن اٹھوں گا اسکے رہنے والے میرے پڑوسی ہیں میری امت کے ذمہ ضروری ہے کہ انکی نگہبانی کریں جو میری وجہ سے انکی خبر گیری کرے گا میں اسکے لئے قیامت میں شفیع یا گواہ بنوں گا اور جو میرے پڑوسیوں کے بارہ میں میری وصیت کی رعایت نہ کرے حق تعالیٰ شانہ اس کو طینۃ الخبال پلائے دوسری حدیث میں ہے کہ طینۃ الخبال جہنمی لوگوں کا نچوڑ ہے یعنی پسینہ لہو پیپ وغیرہ (وفاء اول)

(۵۰) امام نووی نے لکھا ہے کہ آداب میں سے یہ بھی ہے کہ مدینہ طیبہ کے پورے قیام میں اس شہر کی عظمت اور بزرگی کا استحضار رہے اور یہ بات تصور میں رہے کہ اللہ جل شانہ نے اس پاک شہر کو اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کیلئے پسند فرمایا اور یہاں حضور کا قیام اور اس کو وطن بنانا مقدر فرمایا اور سوچا کرے کہ اس کے گلی کوچوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تھے پھرتے کتنے صحابہ کرام کی جماعت کے ساتھ بیٹھتے تھے اور اسی سرزمین میں حضرات صحابہ آپ کی صحبتوں سے مشرف ہوتے اور دیدار و مشاہدہ سے سعادت حاصل کرتے تھے۔ ھ

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا ؛؛ ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اک شور تھا غل تھا
جب آئے دن خزاں کے کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں ؛؛ بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

اسکے بعد اسپر افسوس اور رنج و غم کرے کہ میں حضور کی اور صحابہ کرام کی بھی زیارت سے محروم رہ گیا اور دنیا میں تو یہ محرومی ہو ہی گئی آخرت کا حال معلوم نہیں کیا ہو کہیں دربار سے ہٹا نہ دیا جاؤں اور ابھی

بداعمالیاں حاضری میں مانع نہ بنجائیں اسلئے کہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ قیامت میں بعض آدمی میرے پاس سے ہٹادئے جائیں گے میں کہوں گا کہ یہ تو میرے ساتھی ہیں تو جواب ملیگا کہ تمھیں معلوم نہیں کہ تمھارے بعد انھوں نے کیا کیا بس اگر تم نے حضور کی شریعت مطہرہ کے احترام کی خلاف ورزی کی تو اس سے بیفکر نہ رہو کہ کسی وقت یہ بے ادبی تمھارے اور حضور کے درمیان حائل نہ ہو جائے اور اسکے ساتھ ہی اللہ کی پاک ذات سے امیدیں وابستہ رکھو کہ جب اس نے دنیا میں اتنے دور وطن سے اس بار کی حاضری کی سعادت نصیب فرمائی تو اسکے لطف و کرم سے بعید نہیں کہ آخرت کی بابرکت زیارت سے محروم نہ فرمائیگا۔ حق تعالیٰ شانہ اس سعادت سے اس سیہ کار کو بھی نوازدے۔ آمین یا رب العالمین بوسیلۃ نبینک سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۵۱) جب زیارت سید الانس والجان فخر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور زیارت مشاہد متبرکہ سے فراغت کے بعد واپسی کا ارادہ ہو تو ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ مستحب یہ ہے کہ مسجد نبوی میں دو رکعت نفل الوداعی پڑھے اور روضہ میں ہو تو بہتر ہے اسکے بعد قبر اطہر پر الوداعی سلام کے لیئے حاضر ہو۔ صلوٰۃ و سلام کے بعد اپنے ضروریات کیلئے دعائیں کرے اور حج و زیارت کی قبولیت کی دعائیں کرے اور خیر و عافیت کے ساتھ وطن پہونچنے کی دعا کرے اور یہ دعا کرے کہ یہ حاضری آخری نہ ہو پھر بھی اس پاک دربار کی حاضری نصیب ہو اور اس کی کوشش کرے کہ رخصت کے وقت کچھ آنسو نکل آئیں کہ یہ قبولیت کی علامات میں سے ہے اگر رونا نہ آوے تب بھی رونے والوں کی سی صورت کے ساتھ حسرت و رنج و غم ساتھ لئے ہوئے واپس ہو اور چلتے وقت بھی کچھ صدقہ جو میسر ہو کرے اور سفر سے واپسی کے وقت جو دعائیں احادیث میں وارد ہوئی ہیں وہ پڑھتے ہوئے اور واپسی سفر کے آداب کی رعایت کرتے ہوئے واپس ہو۔

اٹھ کے ثاقب گو چلا آیا ہوں اسکی بزم سے ؛ دل کی تسکین کا مگر سامان اسی محفل میں ہے

اپنی نا اہلیت سے حاضری کے آداب پورے نہ لکھ سکا نمونہ کے طور پر چند آداب لکھدیئے ہیں ناظرین اس سے اندازہ لگائیں اور دو اصول کے تحت میں شریعت مطہرہ کے دائرہ کے اندر رہ کر جو کچھ کر سکتے ہوں کمی نہ چھوڑیں اول ادب و احترام دوسرے شوق و ذوق اسکے بعد زائرین کے چند واقعات پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ انکے حالات بھی نمونہ اور اسوہ ہیں۔

(۱) حضرت اویس قرنی مشہور تابعی ہیں سید التابعین ان کا لقب ہے حضور کا زمانہ انھوں نے پایا ہے مگر ماں کی خدمت کیوجہ سے حضور کی خدمت میں حاضری سے قاصر رہے حضور سے انکے متعلق نقل کیا گیا کہ بہترین تابعی اویس قرنی ہیں ایک روایت میں انکے متعلق آیا ہے کہ اگر وہ کسی بات پر قسم کھالیں تو اللہ جل شانہ اسکو پورا کریں ایک حدیث میں انکے متعلق آیا ہے کہ جو تم سے ملے ان سے اپنے لئے مغفرت کی دعا کرائے۔ ایک حدیث میں حضرت عمرؓ اور حضرت علی رضؓ کو حضور نے ارشاد فرمایا کہ ان سے اپنے لئے استغفار کرائیں بڑے فضائل انکے احادیث میں وارد ہیں جب حج کیا اور مدینہ طیبہ کی حاضری پر مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو کسی نے اشارہ سے بتایا کہ یہ ہی قبر اطہر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے تو بیہوش ہو کر گر پڑے جب غشی سے افاقہ ہوا تو فرمانے لگے کہ مجھے لیچلو مجھے اس شہر میں چین نہیں ہے جس میں حضور مدفون ہوں۔ (اتحاف)

(۲) ایک بدو قبر اطہر پر حاضر ہوئے اور کھڑے ہو کر عرض کیا یا اللہ تو نے غلاموں کے آزاد کرنے کا حکم دیا ہے یہ تیرے محبوب ہیں اور میں تیرا غلام ہوں اپنے محبوب کی قبر پر مجھ غلام کو آگ سے آزادی عطا فرما۔ غیب سے ایک آواز آئی کہ تم نے اپنے تنہا کے لئے آزادی مانگی تمام آدمیوں کیلئے آزادی کیوں نہ مانگی ہم نے تمھیں آگ سے آزادی عطا کی (مواہب)۔

(۳) اصمعی کہتے ہیں کہ ایک بدو قبر شریف کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا اللہ یہ آپ کے محبوب ہیں اور میں آپ کا غلام اور شیطان آپ کا دشمن اگر آپ میری مغفرت فرمادیں تو آپ کے محبوب کا دل خوش ہو آپ کا غلام کامیاب ہو جائے اور آپ کے دشمن کا دل تلملانے لگے اور اگر آپ مغفرت نہ فرمائیں تو آپ کے محبوب کو رنج ہو اور آپ کا دشمن خوش ہو اور آپ کا غلام ہلاک ہو جائے یا اللہ عرب کے کریم لوگوں کا دستور یہ ہے کہ جب ان میں کوئی بڑا سردار مرجائے تو اسکی قبر پر غلاموں کو آزاد کیا کرتے ہیں اور یہ پاک ہستی سارے جہانوں کی سردار ہے تو اسکی قبر پر مجھے آگ سے آزادی عطا فرما اصمعی کہتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا کہ اے عربی شخص اللہ جل شانہ نے تیرے اس بہترین سوال پر (انشاء اللہ) تیری ضرور بخشش کر دی (مواہب)

(۴) حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ حضرت حاتم اصم بلخی جو مشہور صوفیہ میں ہیں کہتے ہیں کہ تیس برس تک ایک قبہ میں انھوں نے چلہ کیا تھا کہ بے ضرورت کسی سے بات نہیں کی جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ

وسلم کی قبر اطہر پر حاضر ہوئے تو آنا ہی عرض کیا اے اللہ ہم لوگ تیرے نبی کی قبر شریف کی زیارت کو حاضر ہوئے تو ہمیں نامراد واپس نہ کیجیو۔ غیب سے ایک آواز آئی کہ ہم نے تمھیں اپنے محبوب کی قبر کی زیارت نصیب ہی اسلئے کی کہ اس کو قبول کریں جاؤ ہم نے تمھاری اور تمھارے ساتھ جتنے حاضرین ہیں سب کی مغفرت کردی۔ (زرقانی علی المواہب) بعض اوقات الفاظ چاہے کتنے ہی مختصر ہوں جب اخلاص سے نکلتے ہیں تو وہ سیدھے پہونچتے ہیں۔

(۵) شیخ ابراہیم بن شیبان فرماتے ہیں کہ میں حج سے فراغت پر مدینہ منورہ حاضر ہوا اور قبر اطہر پر حاضر ہو کر میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام عرض کیا تو حجرہ شریف کے اندر سے میں نے وعلیک السلام جواب میں سنا (قول بدیع)۔

(۶) سید احمد رفاعی مشہور بزرگ اکابر صوفیہ میں ہیں انکا قصہ مشہور ہے کہ جب ۵۵۵ھ میں حج سے فارغ ہو کر زیارت کیلئے حاضر ہوئے اور قبر اطہر کے مقابل کھڑے ہوئے تو یہ دو شعر پڑھے ؎

فی حالۃ البعد روحی کنت ارسلہا	دوری کی حالت میں اپنی روح کو خدمت اقدس میں
تقبل الارض عنی وھی نائبتی	بھیجا کرتا تھا وہ میری نائب بنکر آستانہ مبارک
وھذہ دولۃ الاشباح قد حضرت	چومتی تھی۔ اب جسموں کی حاضری کی باری آئی ہے
فامدد یمینک کی تحظی بھا شفتی	اپنا دست مبارک عطا کیجیے تاکہ میرے ہونٹ

اس کو چومیں اس پر قبر شریف سے دست مبارک باہر نکلا اور انھوں نے اس کو چوما (الحاوی للسیوطی) کہا جاتا ہے کہ اس وقت تقریباً نوے ہزار کا مجمع مسجد نبوی میں تھا جنھوں نے اس واقعہ کو دیکھا اور حضور کے دست مبارک کی زیارت کی جن میں حضرت محبوب سبحانی قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی نور اللہ مرقدہ کا نام نامی بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ (البنیان المشید)

(۷) سید نورالدین ایجی شریف عفیف الدین کے والد ماجد کے متعلق لکھا ہے کہ جب وہ روضۂ مقدسہ پر حاضر ہوئے اور عرض کیا السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ تو سارے مجمع نے جو وہاں حاضر تھا سنا کہ قبر شریف سے وعلیک السلام یا ولدی کا جواب ملا۔ (الحاوی)

(۸) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن سے فارغ ہوئے تو ایک بدو حاضر ہوئے اور قبر اطہر پر پہونچکر گر گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے جو کچھ

ارشاد فرمایا وہ ہم نے سنا اور جو اللہ جل شانہ کیطرف سے آپ کو پہونچا تھا اور آپنے اس کو محفوظ فرمایا تھا اس کو ہم نے محفوظ کیا اس چیز میں جو آپ پر اللہ جل شانہ نے نازل کی (یعنی قرآن پاک) یہ وارد ہے۔ ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاؤک فاستغفروا اللّٰہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللّٰہ توابا رحیما (اگر یہ لوگ جب اُنھوں نے اپنے نفس پر ظلم کر لیا تھا آپ کے پاس آجاتے اور اللہ جل شانہ سے معافی مانگ لیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُن کے لئے معافی مانگتے تو ضرور اللہ جل شانہ کو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا پاتے) اسکے بعد اس بدو نے کہا بیشک میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے اور اب میں آپ کے پاس مغفرت کا طالب بنکر حاضر ہوا ہوں اسپر قبر اطہر سے آواز آئی کہ بیشک تمھاری مغفرت ہو گئی (حادی)۔

(۹) مکہ مکرمہ میں ایک بزرگ جنکو ابن ثابت کہا جاتا تھا رہتے تھے ساٹھ سال تک ہر سال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے بھی حاضر ہوا کرتے تھے اور زیارت کرکے واپس آجاتے ایک سال کسی عارض کیوجہ سے حاضر نہ ہوسکے کچھ غنودگی کی حالت میں اپنے حجرہ میں بیٹھے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی حضور نے ارشاد فرمایا ابن ثابت تم ہماری ملاقات کو نہ آئے اسلئے ہم تم سے ملنے آئے ہیں (حادی)

(۱۰) ایک عورت حضرت عائشہ رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور درخواست کی کہ مجھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر کی زیارت کرادو حضرت عائشہ رضؓ نے حجرہ شریفہ کے اس حصہ کو جس میں قبر شریف تھی پردہ ہٹا کر کھولا وہ عورت قبر شریف کی زیارت کرکے روتی رہیں اور روتے روتے وہیں انتقال کر گئیں رضی اللہ عنہا وارضاہا (شفاء)

پیامِ حمید

(از مرحوم حمید صدیقی لکھنوی)

بہت ہے تجھ سے اُمیدِ تعاون　　　لگی ہے اک مدت سے یہی دُھن
سُن اے جانِ محبت آشنا، سُن!　　　نسیما جانبِ بطحا گذر کُن
زاحوالم محمدؐ را خبر کُن

کہاں تک کاہشِ غم یا محمدؐ　　　کہاں تک اشکِ پیہم یا محمدؐ
کہاں تک دامنِ نم یا محمدؐ　　　توئی سُلطانِ عالم یا محمدؐ
زراہِ لُطف سوئے من نظر کُن

بہت مُدت سے اے شوقِ سراپا　　　مری نظریں بھی ہیں بیتابِ جلوہ
کہاں تک آہ یہ امروز و فردا　　　برایں جانِ مشتاقم درانجا
فدائے روضۂ خیر البشرؐ کُن

بجانِ دردمندانِ محبت　　　بپاسِ گوشۂ دامانِ رحمت
حمیدِ خستہ پر ہو پھر عنایت　　　مشرف گرچہ شد جامی زلُطفت
خدایا ایں کرم بارِ دگر کُن

حج کیا ہے؟

(از - جناب مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

کثرتوں کا ارتکازی مجموعہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہاتھی کا کوہ پیکر جثہ ہو یا برگد کے پھلوں کا خشخاشی تخم وجہ ہر ایک میں دیکھا جا رہا ہے کہ ان کے بکھرے ہوئے اجزا کی پیوستگی اور باہمی ارتباط کو قائم رکھنے کیلئے بھی اور اپنے اپنے نوعی کمالات کو نشو و نما ارتقاء و بالیدگی کے آخری نقاط تک پہونچانے کیلئے بھی ایک ایسا مرکزی نقطہ ہر ایک میں پایا جاتا ہے کہ اس مرکزی نقطہ کے وجود کو اس سے اگر نکال لیا جائے تو ایک طرف سارے سمٹے ہوئے اجزا، بکھر جائیں گے اور دوسری طرف بیرونی فیوض کو جذب کر کے ارتقاء و نشو و نما کے جس عمل کو یہ مرکزی نقطہ جاری رکھے ہوئے تھا یہ عمل بھی رُک جائے گا۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کو مثال سے سمجھئے آم کی گٹھلی یا اسی قسم کے پھلوں کے تخم کو آپ نے دیکھا ہوگا، آپ جانتے ہیں کہ آم کا درخت اسی گٹھلی سے برآمد ہوتا ہے، پتے، شاخیں، پھول، پھل کا ایک طوفان ہوتا ہے جو اسی گٹھلی کی راہ سے اپنی اپنی شکلوں کے ساتھ باہر نکل نکل کر آم کے درخت کا جز بنتا رہتا ہے۔ لیکن آم کی اسی گٹھلی کو چیرئیے اس میں ایک چیز آپ کو نظر آئے گی جسے تخموں اور گٹھلیوں کا انکھوا کہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ گٹھلی سے اس انکھوے کو نکال لینے کے بعد خواہ کتنی ہی اچھی نرم اور پاکیزہ زمین میں اس کو بو یا جائے اور چشموں کے کیسے ہی صاف و شفاف پانی سے اس کی آبیاری کی جائے لیکن بجائے اس کے کہ اس گٹھلی سے پودا نکلے آپ دیکھیں گے کہ گٹھلی سڑتی چلی جا رہی ہے تا اینکہ بالآخر سڑ سڑا کر اس کے اجزا مٹی میں مل کر ادھر ادھر غائب ہو جائینگے۔

حاصل یہی ہے کہ گٹھلیوں کا یہی مرکزی نقطہ وہ نقطہ ہے کہ دیکھنے میں خواہ کتنا بھی بے حیثیت اور معمولی چیز نظر آتا ہو لیکن کسی درخت کے شجری نظام اور اس کے سارے آثار و نتائج کا حصول

یقیناً اسی مرکزی نقطہ کے ساتھ وابستہ ہے اس کو نوچ کر گٹھلی سے اگر الگ کر لیا جائے تو سارے فیوض جن سے درخت کا تنہ، اس کی ڈالیاں، شاخیں، پتے، پھول، پھل جو مستفید ہوتے رہتے ہیں ان کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔

الغرض حیوانی و انسانی اجسام میں جو حیثیت قلب کی ہے اور نباتی حقائق کے لحاظ سے جو اہمیت گٹھلیوں کے اس مرکزی نقطہ کی ہے جسے عوام گٹھلیوں کا انکھوا کہتے ہیں، دل یہ پوچھتا ہے کہ مٹی کا یہ تودہ جس کا نام زمین اور دھرتی ہے، جس سے علاوہ عناصر اور معدنی مرکبات کے نباتی، حیوانی، انسانی ہستیوں کی بے پناہ موجیں ابل رہی ہیں، ان ساری پیداواروں کے لئے زمین بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسی چیز رکھتی ہے جسے ارضی فیوض و برکات کا مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے؟ کیا اس کا بھی کوئی دل ہے؟ جس سے مختلف ارضی پیداواروں کی رگوں میں نشو و نما اور ارتقا و بقا، کا خون دوڑ رہا ہے، یا یوں پوچھئے کہ یہ خاکی گٹھلی بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسا انکھوا رکھتی ہے کہ اسی کے ساتھ ان ساری چیزوں کا قیام وابستہ ہو جو زمین سے پیدا ہو رہی ہیں اور تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس خاکی کرے کی پشت پر نمایاں ہو ہو کر جسد ارضی پر اپنے اقتضائی کمالات کو حاصل کرتی چلی جا رہی ہیں، نہ ماننے والوں سے ابھی بحث نہیں، لیکن جنھوں نے مانا ہے، کہ

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ ؕ (المائدہ)	بنایا اللہ نے الکعبہ کو جو البیت الحرام (حرم گھر) ہے سارے انسانوں کے قیام کا ذریعہ۔

یہ اُسی کی خبر ہے جو زمین کا اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا پیدا کرنے والا ہے، اب خود بتائیے کہ اس صورت میں ان سوالوں کے جواب میں ایک مومن بالقرآن کی نظر "کعبہ" کے سوا کیا کسی دوسری چیز پر پڑ سکتی ہے "وہی الکعبہ البیت الحرام" جس کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی قرآن میں قیام و بقا سے بھی آگے بڑھ کر۔

اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ (البقرہ)	اور دیکھو جب بنایا ہم نے اسی "البیت" (گھر) کو انسانوں کیلئے مثابہ اور امن (کا ذریعہ)

کی بھی جب تصریح کر دی گئی ہو مثابۃ کی لغوی و اصطلاحی تشریح کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانی اپنے مفردات میں لکھتے ہیں:-

سمی مکان المستقی علی فم البیر	پینے والوں کیلئے کنویں کے منہ پر جو جگہ ہوتی ہے
مثابۃ (	) اسی کو مثابہ کہتے ہیں۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ پینے والوں کو کنویں کا پانی جس خاص جگہ سے پلایا جاتا ہے، اسی کو عربی میں "مثابہ" کہتے ہیں' اب سوچئے کہ یہی حیثیت "مثابہ" ہونے کی جب "الکعبہ" کو حاصل ہے تو حاصل اس کا بجز اس کے اور کیا ہوا کہ سارے فیوض و برکات جو زمین کے اس کرے پر تقسیم ہو رہے ہیں ان کے گذرنے کا مرکزی نقطہ یہی "الکعبہ" ہے' اور صرف "مثابہ" ہی نہیں بلکہ اسی آیت کے لفظ "امنا" سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ امن و اماں کی بھی ساری ذمہ داری قدرت نے اسی "البیت الحرام" کے ساتھ وابستہ فرما دی ہے۔ الغرض یہاں[1] جس کسی کو جہاں کہیں جو کچھ بھی مل رہا ہے اسی "الکعبہ" کی راہ سے مل رہا ہے' یہ قرآن کے نصوص صریحہ کا اقتضاء ہے' گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ ساری کائنات کے ساتھ "العرش" کی نسبت قرآن نے جو بیان کی ہے' کہ الرحمٰن اسی "العرش" کو مرکز بنا کر اپنی رحمتیں دنیا میں تقسیم فرما رہا ہے' یہی نسبت زمین کے خاص کرے کے ساتھ الکعبہ بھی رکھتا ہے' روائتوں میں "الکعبہ" کے متعلق اس قسم کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں' مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب کر کے رب العزت نے فرمایا' کہ

یا آدم اھبطت لک بیتاً تطوف	اے آدم اتارا ہے میں نے تیرے لئے ایک گھر' تو اس گھر
بہ کما یطاف حول العرش وتصلی عندہ	کا اسی طرح طواف کریگا جیسے "العرش" کے گرد طواف
کما یصلی عند عرشی ۃ	کیا جاتا ہے' اور تو اس گھر کے آگے اسی طرح نماز
(تاریخ الخمیس عن قتادۃ وعطاء ص ۸۹/۱)	پڑھے گا جیسے میرے عرش کے سامنے نماز پڑھی جاتی ہے۔

---

[1] مجھے تعجب ہوتا ہے کہ بعض لوگ قرآن کے بعض الفاظ مثلاً "الناس" ہی کے معنے جو لغت میں ہیں' اسکو چھوڑ کر من مانے معنی لکھ دیتے ہیں مثلاً "الناس" سے مراد اہل مکہ لیتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ لغوی معنے کو چھوڑنے کی وجہ کیا ہوئی' جبکہ کافۃ للناس'، رب الناس' ملک الناس وغیرہ میں یہی لوگ "الناس" کے وہی معنی بیان کرتے ہیں جسکے سوا لغۃ اس لفظ کا دوسرا ترجمہ صحیح نہیں ہو سکتا جہانتک میرا خیال ہے' غیر شعوری طور پر یہ اس قسم کا احساس ان لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ قرآن جس ماحول میں نازل ہوا ہے اسکے لحاظ سے زیادہ وسیع معانی پر قرآنی الفاظ کا اطلاق کچھ ان کیلئے ناقابل برداشت سی بات ہوتی ہے' کاش! وہ سمجھتے کہ اس قسم کا احساس انکے ایمانی دعوے کی تکذیب تو نہیں ہے' بے شک جس ماحول میں قرآن نازل ہوا وہ جاہلی ماحول تھا لیکن جو نازل کر رہا تھا کیا اس کا علم نعوذ باللہ جاہلی ماحول کا تابع تھا!

اور ایک یہی روایت نہیں بلکہ اسی قسم کے الفاظ دوسری روائتوں میں جو پائے جاتے ہیں اُن سے بھی اسی مسئلہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ کرہ ارض کا "قلب" اور وہ مرکزی نقطہ جس سے سارے برکات و فیوض اس زمین پر بنٹ رہے ہیں وہ یہی "الکعبہ" ہے۔ اور روائتوں کو تو جانے دیجئے، میں پوچھتا ہوں کہ مشہور قرآنی آیت

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	سب سے پہلا گھر جو لوگوں کیلئے بنایا گیا وہ قطعاً
لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّ	وہی ہے جو "مکہ" میں ہے جو سارے جہانوں کیلئے
هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ	مبارک بھی ہے اور اُنکی ہدایت کا سرچشمہ بھی۔

کے بعد تو اس قسم کی روائتوں سے تائید حاصل کرنے کی بھی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی، آخر روائتوں سے اور کیا معلوم ہوتا ہے، یہی تو کہ زمین کے کرے پر سب سے پہلا نقطہ جو متعین کیا گیا یہی حصہ ہے جسے "الکعبہ" کی دیواریں اس وقت تک گھیرے ہوئے ہیں، روائتوں پر تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کا مشاہدہ کرنے والا اس وقت کون موجود تھا؟ لیکن قرآن کی خبروں کو جو یقین کرتے ہیں کہ خالقِ کائنات کی دی ہوئی خبریں ہیں ان کے لئے تو اس شبہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی کیونکہ یہ تاریخی شہادت تو اسی کی ہے جو اس وقت بھی موجود تھا، جب نہ زمین پھیلائی گئی تھی اور نہ آسمانوں کے خیمے تانے گئے تھے اور اس وقت بھی وہ غائب نہ تھا جب "الناس" یعنی نسلِ انسانی کے لئے یہ سب سے پہلا گھر بنایا جا رہا تھا، بلکہ اس واقعہ کی خبر دینے والا ہی جب وہ ہے جس نے حد بندی کے اس عمل سے زمین کے اس خاص حصہ کو امتیاز بخشا ہے تو اس سے بڑھ کر یقینی خبر اور کس کی ہو سکتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ آگے "مُبَارَكًا" کے لفظ کا اضافہ جو اس آیت میں کیا گیا ہے اس کا مطلب آپ خود سوچئے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ برکتوں کا خزینہ اور فیوض کا حقیقی دفینہ بھی زمین کے اسی حصہ کو بنایا گیا یہی وہ قدرتی سرچشمہ ہے جس سے برکتیں اُبل رہی ہیں اور وہیں سے چھلک چھلک کر ساری دنیا میں تقسیم ہو رہی ہیں اور یہ میں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ "العالمین" یعنی سارے جہانوں کے لئے راہ نمائی اور ہدایت کا توحیدی نظام جب قائم کیا گیا اور نبوت کو ختم کر کے "العالمین" کی ہدایت کا مرکزی مقام مکہ منتخب ہوا جیسا کہ "ھدی للعالمین" کے الفاظ کا اقتضا ہے تو یہ اتفاقی واقعہ نہ تھا، بلکہ مادی برکتوں کا سرچشمہ جو مقام تھا اُسی کو دینی و اخلاقی تعلیمات کی اشاعت کا مرکز بھی

مقرر کیا گیا، آخر "للعالمین" کے لفظ کا تعلق صرف "ھدی" ہی کے لفظ سے کیوں سمجھا جائے، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ "مُبَارَکًا" کے لفظ کو بھی "للعالمین" سے مربوط سمجھنا چاہئیے۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان صریح نصوص اور واضح بینات کی روشنی میں بھی "ام القریٰ" (جو مکہ کا قرآنی نام ہے) اس کے سمجھنے یا سمجھانے سے لوگ کیوں گریز کرتے رہے ۔ "القریٰ" کا لفظ یقیناً ایک عام اور مطلق لفظ ہے ان ساری آبادیوں کو حاوی ہے جو بسیط زمین کے کسی گوشہ میں شرقاً و غرباً شمالاً و جنوباً پہلے پائی گئی ہوں یا اب پائی جاتی ہوں، یا آئندہ پائی جانے والی ہوں، وہ ایشیا میں ہوں یا افریقہ میں امریکہ میں ہوں یا یورپ میں۔ قرآنی الفاظ کے مستند شارح علامہ راغب نے بھی "ام القریٰ" کی یہی تشریح کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ان الفاظ کو نقل کیا ہے، کہ

ان الدنیا دحیت من تحتھا ساری دنیا اسی کے نیچے سے پھیلائی گئی

اشارہ اسی برکاتی مرکزیت کی طرف ہی جسے قرآن میں "مبارکا" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

بلکہ بجائے "مکہ" کے اسی آبادی کے دوسرے نام یا تلفظ یعنی "بکۃ" کے لفظ کو قرآن نے یہاں جو اختیار کیا ہے میرے خیال میں یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں ہے نزول قرآن سے صدیوں پہلے "الکعبۃ" کی اسی عالمگیر اہمیت کا انکشاف کرتے ہوئے پیغمبر داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور میں ان والہانہ تمہیدی فقرات کے بعد، کہ

"اے لشکروں کے خداوند تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں، میری روح خداوند کی بارگاہ کے لئے آرزو مند بلکہ گداز ہوتی ہے۔ میرا من، میرا تن زندہ خدا کے لئے للکارتا ہے۔"

پھر اس کی مثال دیتے ہوئے کہ ہر چیز ایک مرکز رکھتی ہے فرماتے ہیں:۔

"گوریئے نے بھی اپنا گھونسلا، اور ابابیل نے بھی اپنا آشیانہ پایا ہے جہاں وہ اپنے بچے رکھیں۔"

آخر میں زبور کا یہ مشہور فقرہ ہے، کہ

"مبارک وہ انسان ہیں جن میں قوت تجھ سے ہے، اور ان کے دل میں تیری راہیں ہیں۔ وے بکہ کی وادی میں گذر کرتے ہیں، اور اسے ایک کنواں بناتے ہیں،

پہلی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی ہے۔"

یہ داؤدؑ کی کتاب "زبور" کے مزبور ۸۴ کے فقرے ہیں جس میں چاہ زمزم ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ قرآنی لفظ "مبارک" کے مفہوم کو بھی خاص پیرایہ میں ادا کر دیا گیا ہے، پہلی برسات الرحمٰن کی پہلی توجہ ہے جو کرہ زمیں کی آبادی کے سلئے کی گئی۔

میں جانتا ہوں کہ آج کل زبور کے جو تراجم شائع ہو رہے ہیں اُن میں "بکہ" کے لفظ کو اپنی اصلی صورت پر چاہا گیا ہے کہ باقی نہ رکھا جائے بعض نسخوں میں بجائے "وادیٔ بکہ" کے "وادیٔ بقا"[1] اور بعضوں میں "وادیٔ بکا" کے الفاظ پائے جاتے ہیں، لیکن دور جانے کی ضرورت نہیں، مسلمانوں میں آج کل سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں جو کتاب سب سے زیادہ قبول اور عموماً ہر جگہ مل سکتی ہے، اس میں آپ مشہور عیسائی عالم جو نسلاً یہودی تھا یعنی پروفیسر مارگولیوتھ کی یہ شہادت پڑھ سکتے ہیں جس میں اس نے بیان کیا ہے کہ بجز مکہ معظمہ کے زبور کا یہ "بکہ" اور کوئی دوسرا مقام نہیں ہو سکتا۔ اور یہی میرا خیال ہے کہ بجائے عام اور مشہور نام "مکہ" کے یہ بتاتے ہوئے کہ یہی سب سے پہلا گھر ہے۔ مندرجۂ بالا آیت میں "بکہ" کے نام اور تلفظ کو جو اختیار کیا گیا ہے تو یہ اشارہ غالباً اسی مزبور (۸۴) کی طرف ہے جس میں داؤد علیہ السلام نے "بکہ" ہی کے لفظ سے اس کو یاد کیا ہے جو "الکعبہ" کی قدامت کے لئے یقیناً ایک اہم تاریخی وثیقہ ہے موجودہ زمانہ کے حساب سے تین ہزار سال سے کم پرانی شہادت یہ نہیں ہے، لیکن داؤد علیہ السلام کا زمانہ تو نسبتاً بعد کا زمانہ ہے اُن سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب نوشتے جو بائبل کے موجودہ مجموعہ میں پائے جاتے ہیں، اس میں "الکعبہ" کے متعلق آپ کو مسلسل تاریخی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی تورات کا فقرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق، کہ

"اس نے بیت ایل کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ قائم کیا،"

---

[1] افسوس ہے کہ زبور کا وہ نسخہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے جس میں بجائے "وادی بکا" کے "وادی بقا" کا لفظ چھپا ہوا تھا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۲۲ء کا یہ مطبوعہ نسخہ تھا۔ دیوبند سے آتے ہوئے لکھنؤ کے اسٹیشن پر فقیر نے کسی عیسائی کتب فروش سے زبور کا یہ نسخہ لیا تھا، یہ الگ چھپا ہوا تھا۔ لوح اسکی سبز رنگ کی تھی کاش! کسی صاحب کی نظر سے اس اڈیشن کا نسخہ گذرا ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ ۱۲

یم (یعنی سمندر) اس کے پچھم اور عی اس کے پورب تھا" (تکوین باب ۱۲)

توارت کے جو عالم ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بیت ایل یعنی بیت اللہ جس کے پورب طرف ابراہیمؑ نے اپنا ڈیرا گاڑا تھا۔ یہ وہی "الکعبہ" (بیت اللہ الحرام) کا مرکزی نقطہ تھا جہاں بعد کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ گھر اٹھایا تھا، یم یعنی سمندر کا الکعبہ کے مغربی سمت میں ہونا تو ایک عام کھلی ہوئی حقیقت ہے، رہا "عی" قدیم جغرافیہ عرب کا مطالعہ اس کے لئے کرنا چاہئے کم از کم مقدمہ تفسیر غایتہ البرہان ہی کو پڑھ لیا جائے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السلام کی کتاب استثنا یا ثنی کا مشہور فقرہ

"خداوند سینا سے آیا، اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے
وہ جلوہ گر ہوا، دس[1] ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا" (باب ۳۳، درس ۲)

بائبل کی جغرافیائی تحقیق بھی اسی نتیجہ تک پہونچاتی ہے کہ فاران یا پاران سے اسی خطے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں "الکعبہ" واقع ہے، اور بخاری کی روائت بھی بتاتی ہے کہ کعبہ والے شہر مکہ میں دس ہزار صحابیوں کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) داخل ہوئے تھے، فاران کی پوری تحقیق خطبات احمدیہ مولفہ سرسید مرحوم میں پڑھی جا سکتی ہے۔

بہرحال اگرچہ بگاڑنے اور چھپلنے مشتبہ کرنے کی مسلسل کوششوں کی آماجگاہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے یہ نوشتے صدیوں سے بنے ہوئے ہیں، لیکن بچی کھچی جو چیزیں اس وقت تک ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں جن میں کرۂ زمین کے اس مرکزی "مقام مبارک" کا تذکرہ کیا گیا ہے اگر سب کو جمع کیا جائے تو وہ کافی ضخیم رسالہ بن سکتا ہے ایسا رسالہ جسے دیکھ کر اضطراراً اس قرآنی دعویٰ یعنی

یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم[2]۔ (اہل کتاب) جانتے ہیں اس الکعبہ کو اسی طرح جیسے پہچانتے ہیں وہ اپنے بچوں کو۔

---

[1] عجیب لطیفہ یہ ہے کہ ابھی تازہ اڈیشن بائبل کا زبان اردو جو شائع ہوا ہے، اس میں "دس ہزار" کی جگہ "ہزار با ہزار" کے الفاظ بدل کر دیئے گئے ہیں۔"

[2] اہل کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، یہ دعوے قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کیا ہے اور الکعبہ کے متعلق بھی۔"

کی تصدیق و اعتراف پر آدمی مجبور ہو جاتا ہے، کاش! کسی کو توفیق ہوتی کہ اس قرآنی اشارے کی توضیح کے لئے بائبل کی ان گواہیوں کو جمع کر دیتا۔

سر دست مذکورۂ بالا چند شہادتوں پر قناعت کرتے ہوئے میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ "الکعبہ" کے متعلق اسلامی کتابوں میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں اُن کے متعلق خواہ کچھ بھی کہا جائے لیکن عہدِ اسلامی سے پہلے بنی اسرائیل کے ان نوشتوں کے متعلق بھی کیا اس شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے ان الفاظ کا اسرائیلی کتابوں میں اضافہ کر دیا ہے اور یہ کتابیں تو خیر مذہب و دین سے تعلق رکھتی ہیں مگر مسلمانوں سے پہلے بہت پہلے یونان و روم کے مورخوں کی کتابوں میں سرزمین عرب کے اس پرانے معبد (الکعبہ) کا ذکر جن الفاظ میں پایا جاتا ہے، یونانیوں کے قدیم مورخ ہیروڈوٹس یا رومی مورخ سیس لس کی تاریخوں سے لوگوں نے جو فقرے نقل کئے ہیں مولانا شبلی مرحوم کی سیرت میں بھی آپ کو وہ مل سکتے ہیں اُن کو دیکھنے کے بعد یہ دعویٰ کیا غیر تاریخی یا بے بنیاد ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ پشت زمین پر آج جتنے مکانات پائے جاتے ہیں ان میں کوئی مکان یا گھر قرآن کے اس "اول البیت" کے مقابلہ میں اس حیثیت سے اپنے آپ کو نہیں پیش کر سکتا کہ اس وقت تک مسلسل نہ صرف اپنے وجود کو بلکہ احترام و عزت کی مرکزیت کو باقی رکھتے ہوئے موجودہ عہد تک چلا آیا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ بعض شہر یا دنیا کی بعض آبادیاں بہت پرانی ہیں، لیکن سوال کسی شہر اور آبادی کے متعلق نہیں بلکہ ایک مختصر سے گھر جیسا کہ "الکعبہ" ہے، اس کے متعلق میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اتنا پرانا گھر کیا اس وقت زمین کے اس کرے پر مل سکتا ہے، ہیروڈوٹس جو حضرت مسیحؑ سے چھ سو سال پہلے گذرا ہے اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ عرب کے اس معبد کا بہت قدیم زمانے سے لوگ احترام کرتے چلے آئے ہیں، سوچئے تو اس کا مطلب کیا ہوا؟ ولادت مسیح علیہ السلام کی طرف جو سن منسوب ہے قریب ہے کہ دو ہزار سال تک وہ پہونچ جائے، جس کے معنے یہ ہوئے کہ ہیروڈوٹس کی شہادت ہی تقریباً ڈھائی ہزار سال کی ہے، خیال کرنا چاہئے کہ ڈھائی ہزار سال پہلے بھی جس گھر اور مکان کے متعلق یہ خبر دیجاتی ہو کہ بہت قدیم زمانے سے لوگ اس کا احترام کرتے چلے آئے ہیں، تو اس کی قدامت کی تاریخ کتنی طویل ہو جاتی ہے، خصوصاً اسی کے ساتھ جب اس کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے کہ دنیا کے عام شہروں اور آبادیوں کے متعلق جن معلومات کو صحیح تاریخی معلومات قرار دیا جا سکتا ہے، ان کی مدت ڈھائی تین ہزار

سال سے آگے نہیں بڑھتی، کار تھیج ہو یا ایتھنز، یا مستی ہو یا روما سب ہی کا حال یہی ہے بلکہ مشرق کے موجودہ شہروں یا قصبوں میں بعض کے متعلق قدامت کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے اگر خرافاتی روایات اور اساطیری قصص و حکایات سے قطع نظر کر لیا جائے تو ان کی تاریخ بھی دو ڈھائی ہزار سال سے آگے متجاوز نہیں ہوتی۔

اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن نے اسی "الکعبہ" کا ذکر کرتے ہوئے منجملہ دوسرے صفات کے بعض مقامات میں اس کو "البیت العتیق" (پرانے گھر) کے نام سے جو موسوم کیا ہے یہ صفت "الکعبہ" کی صرف اضافی ہی نہیں ہے بلکہ تاریخی تحقیقات کے سلسلے کو لوگ اگر جاری رکھیں تو اُن پر واضح ہوتا چلا جائے گا کہ اس مکان کی "حقیقی صفت" یہی ہے، یعنی ثابت ہوگا کہ دنیا کے تمام پرانے گھروں میں جو کبھی پائے گئے یا اب بھی کہیں پائے جاتے ہیں، سب کے مقابلے میں یہی مکان کرہ زمین کا قدیم ترین پرانا گھر ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ بائبل کا "بیت ایل" اور قرآن کا "بیت اللہ" جس آبادی میں پایا جاتا ہے اُس کو، اور جس ملک سے اس آبادی کا تعلق ہے اُس کو، الغرض ان سب کے متعلقہ تاریخی شہادتوں کے علاوہ ان کے جغرافیائی پوزیشن پر بھی اگر توجہ کی جائے تو اس قرآنی اشارے کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے جسے سورۃ البقرہ میں ہم پاتے ہیں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "اُمتِ اسلامیہ محمدیہ" کو خطاب کرتے ہوئے جو یہ فرمایا گیا ہے، کہ

وکذلک جعلنٰکم اُمّۃ	اور اسی طرح بنایا ہم نے تم لوگوں کو
وسطاً	وسط اور بیچ والی امت۔

ظاہر ہے کہ اس سے پیشتر جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے "الکعبہ" ہی کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے، کہ

---

[1] آج کل یہ کھنڈر ہی اس راکھ کے نیچے دبا ہوا تھا جو اٹنا کے آتش فشانی دہانے سے نکلی تھی حال میں راکھ ہٹائی گئی پورا شہر نکل آیا، بڑے دردناک مناظر اس کھنڈر میں سیاحوں کی نظر سے گذرتے ہیں۔ میرے ایک دوست کہتے تھے کہ چوراہوں پر راہگیروں کی ہدایت کیلئے دیواروں پر بجائے ہاتھ کے انسانی شرمگاہ کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، عیاشی کی یہ آخری حد ہے۔ فاکثروا ✻

فیہا الفساد فصب علیہم ربک سوط عذاب - ۱۲

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا	قریب ہے کہ فرومایہ لوگ یہ کہیں کہ کس چیز نے
وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا	مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ
عَلَيْهَا قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ	پہلے تھے، کہدو کہ مشرق بھی اللہ ہی کیلئے ہے اور
يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ	مغرب بھی اسی کا ہے، راہ نمائی فرماتا ہے جسے
صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝	چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف۔

بس حاصل یہی ہوا کہ بجائے مشرقی خطوں اور مغربی اقلیموں کے مسلمانوں کو زمین کے اس حصّہ میں قبلہ جو عطا کیا گیا ہے جسے پانے والے خطِ مستقیم اور اس راہ پر پائے ہیں جو نہ مشرق سے زیادہ دور ہے اور نہ مغرب سے، تو یہ خدا کا فضل اور اس کی حکمت کا اقتضاء ہے۔

بہرحال اس آیت کی صحیح تفسیر کا یہاں موقع نہیں ہے بلکہ اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو وسط اور بیچ میں واقع ہونے والی درمیانی امت قرار دیتے ہوئے اُن کے اس حال کو اس قبلہ سے جب تشبیہ دی گئی ہے جو ان ہی مسلمانوں کا آخری قبلہ ٹھہرایا گیا، تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے قرآن مطلع کرتا ہے کہ ان کا قبلہ بھی وسط اور ایسے علاقہ میں واقع ہے جو دنیا کے معمور اور آباد علاقوں کے درمیانی حصّہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے معنی یہی ہوئے کہ روائتوں میں "الکعبہ" یا "مکہ" کو سرۃ الارض (ناف زمین) کے لفظ سے جو موسوم کیا گیا ہے دراصل اسی قرآنی خبر کی یہ تعبیر اور توضیح ہے، اور آج ہم جو یہ دیکھ رہے ہیں کہ مشرق و مغرب کے سارے مواصلاتی ذرائع خواہ اُن کا تعلق خشکی سے ہو یا تری سے یا فضا اور ہوا سے، تقریباً عام حالات میں ہر ایک کو اسی علاقے سے گذرنا پڑتا ہی جس میں "الکعبہ" واقع ہے، اسی طرح شمالی اور جنوبی حصّوں کے آباد علاقے جو کرہ زمین پر واقع ہیں جب اُن کا حساب کیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ شمال میں اسّی درجہ تک، اسی طرح اس کے بالمقابل جنوب میں چالیس درجے تک عموماً انسانی آبادیاں پائی جاتی ہیں، مجموعی طور پر گویا سمجھنا چاہیئے (۱۲۰) درجے تک دنیا کی آبادی شمالاً و جنوباً پھیلی ہوئی ہے، اب حساب کیجئے اسّی سے (۲۰) کو گھٹائیے تو وہ بھی ساٹھ ہوگا، اور چالیس میں بیس کا اضافہ کیجئے تو اس کی جمع بھی ساٹھ ہی ہوگی، پس معلوم ہوا کہ معمورہ کے درمیانی علاقے وہی ہو سکتے ہیں جو ۲۰ اور ۲۱ درجے پر واقع ہیں، اب اطلس اٹھا کر دیکھ لیجئے۔

وہی آپ کو جواب دے گا کہ عرب کا ملک جس میں "الکعبہ" واقع ہے اس کا محل وقوع اس سلسلے میں کہاں ہے۔

اسی کے ساتھ کیا کم اچنبھے کی بات ہے کہ رنگ اور قد و قامت شکل وصورت کی خصوصیتوں کے لحاظ سے بنی آدم چار قسموں میں جو بنٹے نظر آرہے ہیں، مثلاً یورپ کے بے رنگ اور پھیکی جلد والے لوگ، اور ان ہی کے ساتھ کالے حبشی اور افریقہ کے عام باشندے، ان دونوں قسموں کو اگر ہم ان حصّوں میں پاتے ہیں جو "الکعبہ" سے بجانب مغرب واقع ہیں تو ٹھیک اسی کے بالمقابل چین کے زرد رو، اور ہندوسندھ کے گندم گوں سانولے لوگ ان علاقوں میں آباد ہیں جو "الکعبہ" کے مشرق میں واقع ہیں۔ گویا اس طریقہ سے بھی "الکعبہ" اپنے آگے پیچھے دو دو قسموں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے اس "اول البیت" کا تذکرہ کرتے ہوئے جہاں یہ بتایا ہے کہ "العالمین" کی ہدایت و ارشاد کا نظام اسی مقام میں قائم ہوگا یعنی "ھدی للعالمین" کا مرکز ساڑھے تیرہ سو سال سے یہ جگہ جو بنی ہوئی ہے اور اس سے پہلے اسی عالمگیر تبلیغی نظام کی تمہید میں یہ ابراہیم کا مقام بنا، اسی کے ساتھ "فیہ آیات بینات" (یعنی اس گھر میں اور بھی کھلی کھلی نشانیاں ہیں) ان آیات بینات اور کھلی کھلی نشانیوں کو آپ تلاش کرتے چلے جائیے۔ راز کے بعد راز کا مسلسل انکشاف آپ پر ہوتا چلا جائے گا۔ تاریخ کے اوراق بھی اس باب میں آپ کی مدد کریں گے جغرافیہ کے اطلسوں سے بھی آپ اس سلسلے میں اعانت حاصل کر سکتے ہیں، اقوام و امم کے آسمانی رہنماؤں کے کلام میں بھی اس "البیت العتیق" کے متعلق اتے پتے ملتے چلے جائیں گے، اور یہ ساری نشانیاں آپ پر واضح کریں گی کہ اس گھر کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق نری خوش اعتقادی پر مبنی نہیں ہے بلکہ قدرت کے مقرر دطبعی قوانین کا یہ منطقی نتیجہ ہے۔ مسلمان اگر سمجھتے ہیں کہ نسلِ انسانی کا پہلا ابتدائی قبلہ بھی "الکعبہ" ہی تھا پھر مختلف علاقوں کے بکھرے ہوئے انسانوں کو باہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو جانے کی صورت جب نکل آئی تو پھر مختلف مقامی قبلوں[۵] سے ہٹا کر سب کو اسی پرانے

---

[۵] تاریخ کا ایک نیا دور یعنی نسل انسانی پراگندہ ہی جب قوموں کے قبلے مقامی بھی تھے یہ ایک مسئلہ ہے جس کی طرف خود قرآن میں بھی اشارے ملتے ہیں۔ "ما انت بتابع قبلتہم وما بعضہم بتابع قبلۃ بعض" سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ پر)

روائتوں کا جو حاصل ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام وادی بکہ کے اس اول البیت سے تعلق رکھتے تھے، آخر اس کو مشتبہ قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، رہا یہ مسئلہ کہ زمین کے اس خاص حصہ کی تحدید و تعین کیلئے ابتدا میں کیا صورت اختیار کی گئی تھی، یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی تحقیق میں سر کھپایا جائے، پتھر لگائے گئے تھے یا صرف مٹی کی دیواریں اٹھائی گئی تھیں، پھر پتھر اگر استعمال کئے گئے تھے تو کس قسم کے پتھر سے اس کی تعمیر ہوئی تھی، قرآن میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور یہی اس کا عمومی دستور ہے کہ غیر ضروری امور سے اعراض کر کے مسلمانوں کو بھی گویا سکھاتا ہے کہ ان لایعنی مشاغل سے جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

بہر حال یہ ہو سکتا ہے کہ قیمتی پتھر استعمال کئے گئے ہوں جن کا کوہستانوں میں میسر آنا چنداں دشوار نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ الکعبہ کے مثالی وجود کو ان قیمتی پتھروں کی شکل میں دیکھا گیا ہو جن کا ذکر روایتوں میں آیا ہے، بہر حال نہ یہ روائتیں ہی چنداں اہم ہیں نہ ان کے مفاد پر زیادہ زور دینا چاہئے۔ البتہ حجر اسود کے ساتھ جو خصوصی برتاؤ کیا جاتا ہے اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ "الکعبہ" کی تعمیر میں اس پتھر کو کسی نہ کسی قسم کی اہمیت ضرور حاصل ہے[1]، مگر اسی کے بالمقابل آپ دیکھ رہے ہیں کہ "الکعبہ" کی مرکزیت کے اظہار کے لئے ان تمام حقائق سے اس نے پردہ اٹھا دیا ہے جن کے متعلق ممکن ہو کہ غیر ایمانی عامیانہ فطرتوں میں ہچکچاہٹ پیدا ہو۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ "الناس" کے قیام و بقا کا تعلق بھی اسی "الکعبہ" سے ہے۔ وہی الناس کے لئے "مثابہ" (پن گھٹ) ہے اور ان کا امن و امان بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے، العالمین یعنی سارے جہانوں کے لئے وہ مبارک بھی ہے اور ان میں ہدایت کی عمومی روشنی کی تقسیم کا مرکز بھی یہی گھر بنے گا، اسی بنا پر ایسی روایتوں کو مثلاً آیا ہے، کہ

---

[1] ہماری پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت آدم اس پتھر کو ہندوستان سے لے گئے تھے (دیکھو عینی شرح بخاری) بعض مغربی سیاح جو بھیس بدل کر مکہ گئے تھے یہ خبر لائے ہیں کہ "حجر اسود" شہابی نوعیت کا پتھر معلوم ہوتا ہے، گویا ان لوگوں نے اتنا تو مان لیا کہ یہ زمینی پتھر نہیں ہے اور روشن ہونے کے بعد سیاہ ہو گیا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان روایتوں کی گویا وہ تائید کر رہے ہیں جن میں آیا ہے کہ یہ زمین کا نہیں بلکہ جنت کا پتھر تھا اور ابتداء میں اس کا رنگ سفید تھا پھر سیاہ ہو گیا۔ ۱۲

انزل اللہ خیمۃ من خیام الجنۃ فوضعہا بمکۃ موضع البیت۔ (الخمیس ص۹۱/ج۱)	اتارا اللہ نے جنت کے خیموں میں سے ایک خیمہ پھر خدا نے اس کو رکھا اُس جگہ پر جہاں "البیت" یعنی الکعبہ واقع ہے۔

میں ان کو مذکورۂ بالا قرآنی حقائق کی تعبیر و تفسیر سمجھتا ہوں، مآل ان روایتوں کا بھی وہی ہے کہ انسان کو خلیفہ بنا کر زمین پر آباد کرنے کا خالقِ کائنات نے جب فیصلہ فرمایا تو اس کے قیام و بقاء، نشو و نما، امن و ارتقاء کے لئے "الکعبہ" کو مرکز قرار دیا گیا، اور جیسے سارے عالم میں اپنی رحمتوں کو تقسیم کرنے کے لئے "العرش العظیم" پر الرحمٰن مستوی ہوا اُسی طرح کرۂ زمین کی رحمتوں کی تقسیم کے لئے "الکعبہ" کو اس نے اپنی تجلّی کی فرودگاہ خاص ٹھہرایا، اور بقول حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز اگرچہ آفتاب آئینے میں نہیں اُترتا لیکن خاص قسم کی تجلّی آفتاب کی آئینے میں جو ہوتی ہے اسی کا نتیجہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہو بہو کامل آفتاب آئینے میں جھلکتا اور چمکتا نظر آرہا ہے، کچھ اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ جو آسمان و زمین میں بھی نہیں سما سکتا، وہی خالقِ ارض و سماوات "الکعبہ" کی "تجلّی گاہ خاص" میں کچھ اس طرح نمایاں ہے کہ آئینے کو جیسے بیت الشمس کہہ سکتے ہیں اسی طرح "الکعبہ" پر بھی "بیت اللہ" کا اطلاق ایک صحیح مشاہداتی یافت ہی کا یہ اعتراف ہوگا، ذاتِ حق کی یہی تجلّیِ کامل درحقیقت بنیاد ہے اُن سارے دینی اور رُوحانی تعلقات کی جن کو "الکعبہ" کے ساتھ اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔

---

(۲)

کیسی عجیب بات ہے کہ مختلف قطعاً دو مختلف نوعیت کے تعلقات اسی ایک تجلّی گاہ ربانی کے ساتھ اسلام نے قائم کئے ہیں یعنے ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ "الصلوٰۃ" (نماز) کے لئے دن کے چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں پانچ پانچ دفعہ سارے جہان کے مسلمانوں کا رُخ اسی "الکعبہ" کی طرف پھیرنے کو اسلام ضروری قرار دیتا ہے، مسلمانوں کو دن کے ان پانچ وقتوں میں اسلام جب "الکعبہ" کے سامنے لاکر کھڑا کرتا ہے تو اس وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ زور جسم کی صفائی اور لباس کی صفائی، بلکہ ہر اُس عضو کی صفائی اور پاکیزگی پر دیتا ہے جو عام حالات میں گرد و غبار، گندگی، میل کچیل سے

محفوظ نہیں رہ سکتے، باضابطہ کامل وردی میں پھر حکم دیا جاتا ہے کہ کمال متانت اور سنجیدگی کیساتھ دربارِ الٰہی کی حاضری کی سعادت حاصل کریں، عرض و معروض میں بھی لجاجت و سماجت کے آخری حدود تک پہونچنے کی کوشش کریں، الغرض اپنی اپنی ایک ایک حرکت اور ایک ایک سکون سے اس احساس کو اپنے اندر زندہ اور بیدار کریں کہ اقتدار و اختیار کے آخری قاہرانہ قوتوں کے سرچشمے کے آگے اپنے آپ کو وہ ذلت و مسکنت کی ممکنہ شکلوں کے ساتھ ڈالے ہوئے ہیں۔ الغرض بجائے شور اور ہنگامے کے ہر قول اور ہر عمل کو نظم و ضبط کے انتہائی دباؤ کے نیچے رکھنا نماز کی جان اور حقیقی رُوح ہے۔

پس "الکعبہ" کے سامنے آنے کی ایک شکل تو یہ ہے جس کا نظارہ ہر مسجد میں پانچوں وقت کیا جاتا ہے، لیکن یہی "الکعبہ" اور "خدا کی بارگاہ" "تجلی گاہِ ربانی" ہے۔ اسی کے آگے اسلام ہی ان ہی مسلمانوں کو لاتا ہے جنھیں وہ مسجد میں لے جاتا ہے پر کس شان کے ساتھ؟ تمدن و تہذیب کے ماحول کا سارا لباس اتروالیا جاتا ہے، سلی ہوئی معمولی دوپلی ٹوپی تک سر پر رکھنے کا اب وہ روادار نہیں ہے، جو سب کچھ پہنتے تھے اور اسلام ہی اُن کو سب کچھ پہنارہا تھا، اچانک آج وہی اصرار کر رہا ہے کہ بجز ان دو کفنیوں یا لنگیوں کے جنھیں حاجی احرام کے نام سے گلے میں ڈالے رہتے ہیں، کسی دوسرے کپڑے کا اضافہ اُن کے لئے اس حال میں درست نہ ہوگا، حد یہ ہے کہ ان کفنیوں کے پلوں کو جوڑنے کے لئے گرہ تک ڈالنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے[1]۔

اب ذرا مسجد کے ان ہی نمازیوں کو دیکھئے جو قبا در بر، عمامہ بر سر، وقار و متانت کی انتہائی سنجیدگیوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں اسی "الکعبہ" کے سامنے کھڑے ہوئے تھے، آج حج کے میدانوں میں ان ہی نمازیوں کا کیا حال ہے۔ سر کھلا ہوا ہے، بال بڑھے ہوئے ہیں، ناخنوں کی درازی حد سے گذری ہوئی ہے، گرد میں سارا جسم اٹا ہوا ہے، وہی اسلام جو دن کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ دفعہ اگر غسل نہیں تو ہر نمازی کو تیمم غسل (وضو) کا حکم دیا کرتا تھا آج ان پر اصرار کر رہا ہے کہ اُلجھے ہوئے بالوں کو سلجھانے کے لئے کنگھے کے استعمال کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ بضرورت نہانے پر

---

[1] فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی کانٹے یا اسی قسم کی چیزوں سے ان کو جوڑ لیا جائے ۱۲۔

مجبور بھی ہوں تو جس اسلام کو مسجدوں میں دیکھا جاتا تھا کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایک ایک عضو سے میل کچیل کے ازالہ کو فرض ٹھہرا رہا تھا البراجم[۱] والمغابن تک کو ملوا تا تھا، وہی فتویٰ دے رہا ہے کہ

ازالۃ التفث حال الاحرام حرام — احرام کی حالت میں میل کچیل اور بدن سے گندگیوں کا دور کرنا ناجائز ہے۔

(مناسک ملا علی قاری)

"قُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ" (کھڑے رہو (نماز میں) چپ چاپ) کے قرآنی مطالبہ سے جس اسلام کی مسجدیں گونج رہی ہیں، جماعت تک میں شریک ہونے کے لئے تیز قدمی اور لپک کر جھپٹنے تک کو دربارِ الٰہی کی ادب شناسی سے محرومی قرار دیا گیا ہے، وہی اسلام اعلان کر رہا ہے کہ حج کی راہ میں جتنا زیادہ چیخ سکتے ہو، چیختے چلے جاؤ۔ پیغمبر کا بیان ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ "افضل الحج العج" (بہترین حج وہ ہے جس میں غل شور مچایا جائے) یعنی لبیک الخ کے کہنے میں جتنا زور لوگ لگا سکتے ہوں لگائیں۔

جمعہ کی نماز کے سلسلے میں خطبہ کے وقت کنکریوں سے کھیلنے والوں تک کو لغویت کا مرتکب قرار دیا گیا ہے، لیکن حج کے میدان میں وہی اسلام حکم دیتا ہے کہ چلاتے اور چیختے ہوئے ایک وادی سے دوسری وادی کی طرف، ایک پہاڑ کے دامن سے دوسرے پہاڑ کے دامن تک دوڑتے ہوئے آؤ بھی اور دوڑتے ہوئے جاؤ بھی، انتہا یہ ہے کہ ان ہی حاجیوں سے ایسا فعل بھی کرایا جاتا ہے جس پر رقص کا شبہ اگر کیا جائے تو یہ بے محل شبہ نہیں ہو سکتا۔ آخر طواف جو حج کا ایک رکن رکین ہے اس میں ایک ٹولی کے بعد دوسری ٹولی "الکعبہ" کے چاروں طرف جو گھومتی رہتی ہے، اصطلاحاً رقص کا اطلاق اس پر صحیح نہ ہو لیکن جو نہیں جانتے ہیں وہ مسلمانوں کے اس طریقۂ عمل کو آپ خود سوچئے کہ کیا سمجھیں۔ بعضوں نے اس پر تعجب بھی کیا ہے لیکن اسی تعجب میں تو سارا راز چھپا ہوا ہے، سچ تو یہ ہے کہ انسانی شائستگی کے معیار کو اسلام نے اتنا بلند کر دیا ہے کہ طواف خواہ واقعہ کے لحاظ سے کچھ بھی ہو، لیکن رقص یا ناچ کے لفظ کے اطلاق پر اپنے تو اپنے شائد دل پر جبر کئے بغیر غیر بھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسجدوں کے برعکس حج کے میدانوں میں جو کچھ کیا جاتا ہے، دوڑایا جاتا ہے،

---

[۱] انگلیوں کی پشت کی گرہوں کے سامنے سکڑی ہوئی کھال کے جو حصے ہیں اُن ہی کو براجم کہتے ہیں، اور مغابن جسدِ انسانی کے اُن حصوں کو کہتے ہیں جو عمیق اور پوشیدہ رہتے ہیں مثلاً بغل، بُنِ ران وغیرہ - ۱۲

گھمایا جاتا ہے، کنکریاں چنوائی جاتی ہیں، اور اُس حال میں رہنے کا حکم دیا جاتا ہے جس حال میں دیوانوں اور سرگشتوں کو دیکھا جاتا ہے، سر کھلے ہیں، ناخن بڑھے ہوئے ہیں، بال اُلجھے ہیں، بدن میل کچیل میں ڈوبا ہوا ہے۔ کیا بات ہے کہ ایک ہی اسلام اچانک سنجیدگی و متانت و وقار کے سارے قصوں کو ختم کر کے مسلمانوں پر اس حال کو کیوں طاری کراتا ہے۔ ان کے کانوں میں اس نے کیا پھونک دیا ہے کہ دیوانوں کی طرح کبھی ادھر جاتے ہیں اُدھر جاتے ہیں، کبھی دوڑتے ہیں کبھی روتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں چلاتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر کبھی اس تودے پر کنکریاں پھینکتے ہیں، کبھی اُس پتھر پر سنگریزے برساتے ہیں۔ چکر کاٹتے ہوئے ان ہی کو دیکھا جاتا ہی کہ ناچ بھی رہے ہیں گا بھی رہے ہیں، رہ رہ کر بوسہ کے لئے لبوں کو بھی کسی چیز پر ملتے ہیں۔ نہ سر پر ٹوپی ہو نہ پاؤں میں جوتا ہے، ایک بن سلی چادر پیٹھ پر پڑی ہوئی ہے، اور دوسری ٹانگوں کے ساتھ لپٹی ہوئی رہے، اس کے سوا کوئی دوسرا لباسی سامان ان کے پاس نہیں ہے۔ آخر اُن ہی کپڑوں کو وہ کیوں استعمال نہیں کرتے جن کے بغیر وہ سجدوں میں جانا پسند نہیں کرتے تھے، اپنے بدن کو کثافتوں سے پاک کیوں نہیں کرتے۔ ناخن کیوں نہیں ترشواتے، بال کیوں نہیں سنوارتے، خوشبو کیوں نہیں لگاتے، بربریت اور وحشت کی بچی کھچی یادگاروں کو مٹا کر اسلام ہی نے تو مسلمانوں کو تہذیب و شائستگی کی راہوں پر ڈالا تھا۔ پھر آگے بڑھانے کے بعد اسی اسلام نے اُن کو پیچھے کیوں ڈھکیل دیا، اور ڈھکیل دینا کیا معنے؟ اس نے تو مسلمانوں کی دینی زندگی کا ایک جوہری عنصر حج ہی کو قرار دیا ہے۔

بلاشبہ یہ ایک سوال ہے اور بڑا اہم سوال۔ مگر "الکعبہ" کیا ہے۔ ارضی کائنات کیساتھ اس کا جو بنیادی رشتہ ہے جن کے لئے یہ راز راز باقی نہیں رہا ہے، کیا نماز اور حج کے اعمال و افعال، آداب و فرائض کے ظاہری تناقض و تعارض کی یہ بوالعجبی اُن کیلئے بھی بوالعجبی باقی رہتی ہے؟۔

بلاشبہ فطرت انسانی قدرت کے حاکمانہ اقتدار کے آثار کو اپنے اوپر طاری کرنا چاہتی ہے، اس میں یہ جبلی جستجو پائی جاتی ہے کہ قدرتی قوانین کی پابندیوں سے ساری کائنات، شجر حجر، پرندے درندے وغیرہ اپنے نوعی کمالات تک پہونچنے میں جیسے کامیاب ہو رہے ہیں اسی طرح اس کی کامیابیوں کا راز بھی ان ہی پابندیوں میں پوشیدہ ہے۔ اور یہ جو دیکھا جا رہا ہے کہ عموماً بنی آدم مذہب کے نام سے احکام و قوانین کے کسی مجموعہ کی پابندی کو اپنے لئے ناگزیر قرار دیئے ہوئے ہیں،

درحقیقت اسی اندرونی سوال کا یہ جواب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پیدا کرنے والے کی طرف احکام و قوانین کے جس مجموعہ کو منسوب کیا جاتا ہے، واقعی وہ خالقِ کائنات کی مرضی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے یا نہیں، لیکن ہر پیدا ہونے والا آدمی باور یہی کرتا ہے کہ مذہب کے نام سے وہ اپنے خالق کی مرضی ہی کے پانے میں کامیاب ہوا ہے۔ بہرحال یہ ایک مستقل علیحدہ بحث ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذاہب و دیانات کے متعلق جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدائی احکام و قوانین کی پابندی کا ان میں مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کو بھی اسی مطالبے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی کے مطابق اس کے نافذ کردہ احکام و قوانین کی تعمیل و امتثال میں زندگی بسر کرنا، بندوں کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین ہے۔ نشو و نما کی جو قدرتی صلاحیتیں فطرتِ انسانی میں پائی جاتی ہیں ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ان کو بار آور کرانے کی قدرتی راہ یہی ہے کہ خالقِ کردگار کو اپنا حاکم تسلیم کرکے بندہ اسی کا محکوم بن جائے۔ بندگی اور عبدیت اسی فرض کو طبعاً ہم پر عائد کرتی ہے اس فرض سے عہدہ برا ہونا اور عہدہ برا ہونے کی کوشش یہی ہمارے وجود کا حاصل اور آخری غایت ہے۔

سچ پوچھئے تو بار بار ہر چوبیس گھنٹے میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد "حیّ علی الصلوٰۃ" کی پکار، لاہوتی ادب گاہوں اور ان کے بلند میناروں سے فضا میں جو گونجتی رہتی ہے درحقیقت محکومیت اور بندگی، غلامی، اور عبدیت کے اسی فرض کو یاد دلانے اور اس کے احساس کو قلب میں مسلسل جگائے رکھنے کی یہ عملی تدبیر ہے۔ آپ دیکھئے ان کو جنھوں نے اس لاہوتی پکار سے بہرے بنے رہنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے ——— جب پکارنے والے کی پکار پر چل پڑنے کے لئے وہ آمادہ ہوتے ہیں، وہ اپنی وردی درست کرتے ہیں، اس کی دیکھ بھال کرلیتے ہیں کہ صفائی اور پاکیزگی کے برخلاف ان کے لباس کے کسی حصے میں گندگی اور نجاست کا کوئی داغ اور دھبہ تو نہیں ہے۔ سکینت و وقار کی تصویر بن کر انتہائی اطمینان اور سنجیدگی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے پہلے اس مقام میں آتے ہیں جہاں کپڑوں سے آگے بڑھ کر اپنے جسد اور بدن کی کثافتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ کم از کم تین تین بار بدن کے ان حصوں کو دھوتے ہیں جن کی آلودگی کا عام حالات میں اندیشہ کیا جاسکتا ہے۔ شست و شو کے اس شغل سے فارغ ہونے کے بعد دیکھئے وہ اپنے پیدا کرنے والے

خالق و حاکم کے سامنے کھڑے ہیں، تجزیہ کیجئے ان اعمال اور مشاغل کا جن میں اب وہ منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں۔ دست بستہ قیام، قیام کے اسی حال کے بعد سر کو جھکا دینا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنا ماتھا ٹیک دینا، یہ اور اسی کے ساتھ دوسرے قولی و فعلی اجزاء و عناصر جن کی ترکیب سے مسلمانوں کی "نماز" کا قوام تیار ہوتا ہے۔ ان سب میں بتائیے کہ احکم الحاکمین، آقائے علی الاطلاق کے حاکمانہ شئون اور اقتداری تجلیوں کے سوا کیا کوئی اور چیز بھی جھانک رہی ہے؟ عقیدت و نیاز یا احساس محکومیت و بندگی کو تصویری پیکر میں لانے کی جو آخری شکل ہو سکتی ہے، کیا الصلوٰۃ یا نماز اس کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ فقر و مسکنت، احتیاج و تذلل کے جذبات کے اظہار کا زندہ قالب یہی ہو سکتا تھا، میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں اور بھی کچھ سوچا جا سکتا ہے۔

الصلوٰۃ اسلام کے چار اہم ستونوں میں ایک بڑا ستون ہے، اسی طرح الزکوٰۃ کے نام سے جس محصول کو امراء اور تونگروں سے وصول کر کے غرباء اور نامستطیع باشندوں میں اسلام تقسیم کراتا ہے، تو کیا یہ وہی فرض نہیں ہے جسے ہر حکومت اپنے باشندوں پر عائد کر کے اپنے حاکمانہ اقتدار کو ظاہر کرتی ہے ——— اور الصلوٰۃ و الزکوٰۃ تو دینی اسلامی رکن ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے سوا بھی اسلامی مطالبات کے بڑے، بہت بڑے ذخیرے کی بنیاد مطالبہ کرنے والے کے حاکمانہ اقتدار ہی پر قائم ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

مگر سوال یہی ہے کہ ہستی کی اس تجلی گاہ کے آخری سرچشمے کے متعلق جن جستجوؤں کو انسانی فطرت اپنے اندر پاتی ہے کیا حاکم و محکوم کے ان تعلقات اور ان تعلقات کے اقتضاؤں کی تکمیل کے بعد ہمارے اندر کی ڈھونڈھ کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، ہماری پیاس کیا بجھ جاتی ہے، آخر سے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں! عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے

بلا وجود کے ان توجہات، اور لہروں کی توجیہ میں کیا کہا جائے؟ کیا پایا تھا ایران کے کج کلاہ اور خراسان کے آہن گر نیاہ نے گوشت و پوست، چربی اور استخواں کے اُس مجموعہ میں جس کا نام شیریں تھا کہ آہن گر نے تو سر پھوڑ لیا، اور خسرو خود سر اپنے ہوش و حواس، عقل و خرد، شوکت و ابہت کے سرمائے کو کھو بیٹھا۔

اُس خلش اور تپش تعلق اور بے چینی، اضطراب والتہاب کے اسباب کا سُراغ کیسے لگایا جائے اور کہاں لگایا جائے جو عامری دیوانے کو بن بن میں پھراتے تھے اور بیابانوں کے پتھروں کی ٹھوکروں کے ساتھ اس کو راضی کئے ہوئے تھے، وادیٔ نجد کی ہرنیوں کی لمبی گردنوں اور بڑی بڑی آنکھوں میں وہ کیسے ڈھونڈھ رہا تھا، وہ کتوں کے منھ کو اس لئے کیوں چومتا تھا کہ اس کی لہریں اُس چوکھٹ تک پہونچ جائیں گی جس کا بوسہ اس کی زندگی کا آخری مقصود تھا۔

بہرحال آپ اس کا نام حُسن رکھئے یا جمال، یا جو جی میں آئے جس لفظ سے بھی اس کی تعبیر کیجئے، لیکن وجود کے اس تلاطم میں ایسی لہریں بھی یقیناً گھلی ملی، رسی بسی ہیں جنکے غیر معمولی دباؤ کا فطرت انسانی انکار نہیں کرسکتی، دباؤ اور عجیب وغریب دباؤ، جس کے نیچے بسا اوقات حکومت اور سلطنت کا اقتدار بھی کھوکھلا بن کر رہ گیا ہے، مطلق العنان جباروں کو بھی اس کی گرفت کے اندر تڑپتے اور پھڑکتے دیکھا گیا ہے۔

انسانی قالب اور بشری پیکر میں حُسن وجمال کے ظہور کے بعد جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں اُنکے متعلق تو ایک حد تک "جنسی میلانات" کے شعوری یا غیر شعوری اشاروں کو بھی دخیل ٹھہرایا جاسکتا ہے لیکن بہتی ہوئی نہروں، لہلہاتے ہوئے مرغزاروں، چہچہاتی ہوئی چڑیوں، کھلے ہوئے شگفتہ ونیم شگفتہ پھولوں، وادیوں کے نشیب وفراز، دامنِ کوہ کی اُبھرتی ہوئی بلندیوں اور ڈھلتی ہوئی پستیوں، الغرض انسانی پیکروں سے ہٹ کر جمادی، نباتی وحیوانی سانچوں میں حُسن وجمال کی تجلیاں ڈھل ڈھلا کر جب سامنے آتی ہیں تو اس وقت گدھوں اور بکروں کو نہیں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو نہیں، بلکہ صرف آدمؑ کے بچوں اور حوّا کی بچیوں ہی کو بہجت ونشاط، سرور ووجد کے گردابوں میں چکر کھاتے ہوئے کیوں پایا جاتا ہے؟۔

پس واقعہ یہ ہے کہ جمال پرستی کہئے یا حُسن پسندی، یہ انسانی سرشت کا ایسا جوہری عنصر ہے کہ اسی پر اس کے نوعی امتیاز کی بنیاد قائم ہے۔ وہ حُسن کی جستجو اور جمالی تجلیوں کی تلاش کے جذبہ کو لیکر پیدا بھی ہوتا ہے اور جب مرتا ہے تو اسی جذبہ کو ساتھ لئے ہوئے مرتا ہے[1]۔

---

[1] بہشتی حقائق اور "الجنۃ" کی جن پیداواروں کی خبر قرآن میں دی گئی ہے، یورپ کے "رہبان زادوں" کا (بقیہ صفحہ ۱۰۹ پر)

بہرحال جستجوئے حسن یا تلاشِ جمال کا جو جذبہ انسانی فطرت میں پایا جاتا ہے نہ اس کا انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ مانا جا سکتا ہے کہ جمال و حسن کی جو تجلیاں برگِ گل اور نغمۂ بلبل سے جھلک رہی ہیں اور جن کی روشنی سے جمادی و نباتی، حیوانی و انسانی مظاہر سے بھری ہوئی یہ کائنات جگمگا رہی ہے، ان کے وجود کے اس بحر متلاطم میں کوئی آخری سرچشمہ نہیں ہے۔ ہمارا ابتدائی لاہوتی سبق ہی الحمد للہ سے شروع ہوتا ہے۔ کمال ہو یا جمال، الغرض وجود کا ہر وہ پہلو جو مستحقِ مدح و ستائش ہو، ہم مان ہی نہیں سکتے کہ وہ نہ تھا پھر ہوا ہے۔ "ہستی نیستی سے بھی پیدا ہو سکتی ہے" عقل بھی اس تجویز سے جھنجھلاتی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ "الاسماء الحسنیٰ" نص قطعی کے رو سے جس ذات میں منحصر ہیں ان کے مسمیٰ کے سوا بتایا جائے کہ "حسن" کے سرچشمے کو اور کہاں ڈھونڈا جائے۔

(ص۱۰۶ کا بقیہ) مادہ پرست طبقہ اس پر معترض ہے کہ انسانی نہیں بلکہ حیوانی مطالبوں کی تسکین کا سرمایہ تو یہ چیزیں بن سکتی ہیں لیکن انسانی فطرت کیلئے یہ کچھ نہیں ہے، اسی لئے ان میں سے بعضوں نے قرآنی "الجنة" کا نام "حیوانی جنت" بھی رکھ دیا ہے لیکن ان رہبان زادے مادہ پرستوں سے کون پوچھے کہ انسانی فطرت کے آگے قرآن نے جنت کی جن جمالی تجلیوں کے پیش ہونے کی خبر دی ہے بقول حضرت شیخ اکبر کیا جانوروں، بھیڑوں اور بکریوں، چوپاؤں، گدھوں اور بیلوں کو بھی ان سے متاثر اور لذت اندوز ہوتے اس دنیا میں کبھی دیکھا گیا ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ باشندگانِ مغرب کی موجودہ نسلیں جن اگلی نسلوں سے پیدا ہوئی ہیں وہ تو دنیا کے مظاہر جمال و حسن سے بھی بے زاری کو اپنا مذہب ٹھہرائے ہوئے تھیں، پھر "جنت" میں ان کے وجود کو وہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔ اور ان ہی رہبانوں سے جو نئی نسلیں نکلی ہیں ان کی مادی ذہنیت کی کثافتوں نے حسن و جمال کے ان کثیف و غلیظ مظاہر کے ساتھ ان کو قانع بنا دیا ہے جن کی ہر بھلائی میں برائی گندھی ہوئی ہے اور اس کے کسی خیر کو شر کی آلودگیوں سے قطعی طور پر پاک کرنا ناممکن ہے۔

مادی مذاق کی یہی فطری نلاظت ہے جس نے حسن و جمال کے ان لطیف و جمیل پیکروں کے تصور کی بھی گنجائش [illegible] باقی نہیں [illegible] میں سامنے آئیں گے جب خیر کو شر سے قطعی طور پر جدا کر دیا جائے گا۔ [illegible] نام جنت [illegible] کی قرآنی تعبیر جہنم ہے۔

(۳)

ان تمہیدی مقدمات کے بعد اب سوچئے کہ ناقص انسانوں کے ناقص عقول کا گڑھا اور تراشا ہوا دستور و آئین نہیں، بلکہ عالم الغیب والشہادہ خدائے کامل کا بخشا ہوا دین کیسے کامل ہو سکتا تھا جب تک فطرتِ انسانی کی جستجوئے جمال اور تلاشِ حُسن کے جذبہ کی تسکین کا سامان بھی اس میں نہ کیا جاتا۔ مجھے دنیا کے دوسرے مذاہب و ادیان سے اس وقت بحث نہیں لیکن اپنے اسلامی اسلاف سے جو دین ہم تک پہونچا ہے اور جن لوگوں نے ہم تک اس کو پہونچایا ہے، اُن کا بیان ہے، محدث الدیار الهندیہ، استاذ الکل فی الکل حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فارسی زبان کی اپنی تفسیر میں حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے حج کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:۔

"باز ایشاں را حکم شد کہ در ہر سال یک بار خود را والہ و شیدا ساختہ دیوانہ وار وعاشق کردار، برائے گردشتن خانۂ محبوب خود برہنہ سر و برہنہ تن، و برہنہ پا، ژولیدہ مو، پریشاں حال و گرد آلودہ از شام بہ زمینِ حجاز رسیدہ گاہے بر کوہ و گاہے بر زمیں رو بہ سوئے خانہ کردہ استادہ شوند"	پھر حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے آپ کو سرگشتہ و شیدا بنا کر دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وطیرہ اختیار کر کے محبوب کے گھر کے گرد ننگے سر ننگے پاؤں، اُلجھے ہوئے بال، پریشان حالی کے ساتھ گردیں اَٹے ہوئے سرزمینِ حجاز میں پہنچیں اور وہاں پہونچکر کبھی پہاڑ پر کبھی زمین پر محبوب کے اسی گھر کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں۔

اسی قسم کے تفصیلات کے بعد بیان کو ان فقروں پر ختم کرتے ہوئے، کہ

"گرد خانہ تجلی آشیانۂ او طواف کنند و بار بار کنجہائے آں خانہ را بہ بوسند و بہ لیسند"	اسی تجلی خانہ کے اِرد گرد گھومیں، اور اس کے گوشوں کو چومیں چاٹیں۔

حج کا جو مقصد ہے اس کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"تا معنیٔ عشق و محبت کہ در باطن ایشاں کامن ست در لباس صورت جلوہ گر شود، و مشہور خاص و عام گردد و دریں بین	تاکہ عشق و محبت کا جو جذبہ ان کے باطن میں پوشیدہ ہے، وہ ظاہری شکل و صورت کا قالب اختیار کرے اور انکے اس حال کا چرچا دنیا میں پھیلے۔

"باواز بلند لبیک گویاں نعرہ ہا زنند و آتشِ محبت اندرونی را بآں نعرہا برافروزند"

اسی سلسلہ میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ بلند آواز کیساتھ لبیک کہتے ہوئے نعرے لگائیں اور ان نعروں کی راہ سے محبت کی چھپی دبی آگ کو بھڑکائیں۔

آخر میں شاہ صاحب نے لکھا ہے، کہ

"ایں کیفیت مناسکِ حج برائے ایشاں مقرر شد و طواف و سعی بین الصفا والمروہ و آمد و رفت مزدلفہ و عرفات و اقامت در منیٰ و ذبح و قربانی و تلبیہ و احرام مشروع گشت"

حج کے مناسک میں یہی کیفیت ان کے لئے مقرر ہوئی اور اسی بنیاد پر طوافِ کعبہ، مروہ و صفا کے درمیان تگ و دو سعی، مزدلفہ کی آمدورفت، عرفات میں قیام، منیٰ میں ذبح و قربانی احرام وغیرہ اعمال کا حکم دیا گیا۔

اور ایک یہی کیا، آپ کو اسلامی بزرگوں کی مختلف کتابوں میں یہ اور اسی قسم کی ملتی جلتی باتیں مل سکتی ہیں اُردو میں سیدنا قاسم العلوم والخیرات بانی دارالعلوم دیوبند کی کتابوں خصوصاً "حجۃ الاسلام" میں حج کے ایک ایک جزء کی تشریح اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے جو کی گئی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے، اور قربانی اگرچہ میرے نزدیک دینی نظام میں اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے، تاہم حج کے موقع پر جو قربانی کی جاتی ہے صاحبِ "غائۃ الشعور" نے لکھا ہے:-

"قربانی نمودن مخبر ست کہ خود را براہِ دوست ایں چنیں فدیہ نمودن شائد"

حج کے موقع پر قربانی کا مطلب یہ ہے کہ دوست کیلئے چاہئے قربانی کرنے والا اسی طرح اپنے آپ کو تیار کرے کہ وہ بھی قربانی کے جانور کیطرح ہر وقت اپنی جان فدا کرنے کیلئے تیار رہے۔

بہرحال حُسنِ ازل اور جمالِ مطلق کی جستجو و تلاش یہی الحج کی رُوح ہے، اگرچہ حج کے اعمال اور مناسک کے تجزیہ و تحلیل ہی سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف اس نتیجہ تک پہونچے ہیں جیسے الصلوٰۃ یعنی نماز میں جو کچھ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے انہی سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق کائنات کے حاکمانہ اقتدار اور اس کے آثار کو بندے اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، ان اسلامی ارکان کے پھل ہی ایسے ہیں جن کو دیکھ کر معمولی عقل کا آدمی بھی درختوں کو پہچان سکتا ہے، لیکن نئی بات یہ ہے کہ حج کے مطالبہ کا

ذکر جن الفاظ میں قرآن کے اندر پایا جاتا ہے قرآنی طرز کے ادا شناسوں کے لئے ان ہی میں کافی اشارے ہیں، خصوصاً آخری الفاظ جن پر یہ آیت ختم ہوئی، یعنی

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ — اور حج کے مطالبہ کا ناشکری کیساتھ جس نے انکار کیا تو اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ سارے جہانوں سے بے نیاز ہیں۔

عشق و محبت کی راہ و رسم کا جو تجربہ رکھتے ہیں اور سوز و ساز سے کچھ حصہ جنھیں میسر آیا ہو اُن ہی کے چوٹ کھائے قلوب اس طریقۂ بیان کے اثر کو محسوس کر سکتے ہیں۔ سیدنا الامام الحاج امداد اللہ المہاجر المکی قدس اللہ سرہ العزیز قرآن کی دھمکی

لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۝ (آل عمران) — نہ حق تعالیٰ اُن سے بات کرینگے اور نہ اُنکی طرف دیکھیں گے قیامت کے دن۔

کا جب ذکر فرماتے، تو کہتے کہ ساری دھمکیوں میں سب سے زیادہ جانگداز، رُوح گسل دھمکی میرے لئے تو یہی ہے، عمیق حکیمانہ نفسیاتی نکتہ۔ اس کے بعد یہ ارشاد فرماتے کہ کسی چیز سے محرومی کی دھمکی اُسی وقت دی جا سکتی ہے جب اس کا مطالبہ ہمارے اندر موجود ہو، مجنوں ہی کو لیلےٰ دھمکا سکتی ہو کہ میں تجھ سے نہ بولوں گی، تجھے نہ دیکھوں گی، ورنہ جو مجنوں نہیں ہے اُس کے لئے لیلیٰ کی ان دھمکیوں کی کیا قیمت ہو سکتی ہو۔ حاجی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق میں نے سنا ہے کہ آب دیدہ ہو جاتے اور فرماتے کہ آدمی کی فطرت میں اگر کسی کی ہم کلامی اور نظرِ لطف و کرم کا مطالبہ پوشیدہ نہ ہوتا تو یقین کرو کہ اس کو یہ دھمکی کبھی نہ دی جاتی۔

اسی نفسیاتی نکتہ کو پیشِ نظر رکھ کر اب سوچئے کہ حج کی قدر و قیمت کے نہ پہچاننے والوں اور اس کی اہمیت کے انکار کرنے والوں کی طرف رُخ کر کے بجائے اِس قسم کی باتوں کے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم میں ہوگا، یا اُن کو آگ میں جھونکا جائے گا۔ یہ یا اسی قسم کی مادی سزاؤں کی جگہ

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ — اور جس نے ناشکری کیساتھ انکار کیا (اسکو معلوم ہونا چاہیئے) کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے۔

کے چند قرآنی الفاظ کیا اس ساری داستان کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے نہیں ہیں جو اس سلسلہ میں اب تک آپ ہم سے اور بزرگوں کے حوالہ سے سُن چکے، ہم جو کچھ کہنا چاہتے تھے شائد نہ کہہ سکے۔ لیکن قرآن نے

ان چند ہی لفظوں میں سب کچھ کہہ دیا، اُن سے کہہ دیا جو سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن بے نیازی اور لاپروائی کی یہ دھمکی ان کو ان کی رُوح اور جان کو پگھلا دینے کے لئے کافی ہے۔ "چشم لاپروا" اور "نظر تغافل" کی بھڑکائی ہوئی آگ اور بکھیرے ہوئے انگاروں میں لوٹنے کا موقع جنھیں خدانخواستہ کبھی مل چکا ہے، وہی کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ "اِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ" کی دھمکی کس مہیب جگر خراش منظر کو سامنے لاکر (العیاذ باللہ) کھڑا کر دیتی ہے۔

صحاح کی مشہور حدیث جس میں جتلایا گیا ہے کہ "قابو رکھنے کے باوجود حج کی سعادت سے جو محروم رہا اور اسی حال میں مرگیا، خدا کی اس کو کوئی پروا نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرا یا نصرانی ہو کر" اس میں بھی حج کی وہی "رُوح" جھانک رہی ہے جس کے بغیر یہ تو ممکن ہے کہ "حج" کا قالب تیار کر لیا جائے لیکن اس "رُوح" سے بے گانگی، "قلب" سے اس "قالب" کو محروم ہی رکھے گی۔

"رُوحِ حج" سے بے گانگی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جماعت اور جمعہ و عیدین کی نمازوں کیساتھ "حج" کا رشتہ جوڑتے ہوئے آج کل پھیلایا جا رہا ہے کہ روزانہ اور ہفتہ واری، سالانہ کمیٹیوں کی شکل میں اسلام نے مسلمانوں کے اجتماع عام کی کمیٹی یا کانفرنس کی تشکیل کی ایک عملی صورت حج کے ذریعہ سے نکالی ہے۔ ریسمان بافوں نے تو نہ جاننے کی وجہ سے اس لال بجھکڑانہ توجیہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا، پر حیرت ہے کہ آسمان والوں نے بھی جاننے کے باوجود ان ہی کے ساتھ اپنی آواز ملانی شروع کی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ انسانیت کا جو بے نظیر طوفان ہر سال حجاز کے ریگستانوں میں ٹھاٹھیں مارتا ہے یقیناً بے نظیر ___ کہ زمین کے کسی حصے میں مختلف ممالک و امصار سے بھانت بھانت کی بولیوں کے بولنے والے مرد و زن اس خاص شان کے ساتھ کہیں بھی جمع نہیں ہوتے، حج ہی کا موسم ایک واحد موسم ہے جس میں ایک ہی میدان میں آپ کو مشرق بعید چین و جاوہ، ملایا کے باشندوں کیساتھ مغرب اقصیٰ کے گورے چٹے آدمی ملی جلی شکلوں میں ہر سال مل سکتے ہیں، ان ہی میں آپ کو ہندی و سندی، بخاری و تاتاری، مصری و طرابلسی، الغرض ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کے ساتھ یورپ اور امریکہ کے مسلمانوں کو بھی آپ پا سکتے ہیں اور ان سب کو جمع کر کے کسی خاص نصب العین تک پہونچنے کی دعوت بھی دے سکتے ہیں۔ بغیر کسی اشتہار و اخبار پروپاگنڈا، شور و شغب کے بکھری ہوئی

انسانیت ہر سال ایک نقطہ پر جمع ہو جاتی ہے آپ چاہیں تو معاشرتی، تمدنی، بلکہ ضرورت ہو تو سیاسی الجھنوں کے سلجھانے کا ذریعہ بھی اس اجتماع کو بنا سکتے ہیں، لیکن کام لینا، یا لے سکنا، یہ دوسری بات ہے اور جس کام کے لئے حج کی عبادت مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے یہ الگ مسئلہ ہے، آپ آم کی گٹھلی جب بوتے ہیں، تو اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ درخت بن جانے کے بعد آپ اس درخت کے پتوں، اور لکڑیوں سے ایندھن کا کام بھی لے سکتے ہیں لیکن بجائے پھلوں کے ایندھن میں پتوں اور لکڑیوں سے کام لینے کو گٹھلی بونے کی غائت ٹھہرانا، آپ ہی بتائیے کہ جنون کے سوا اور کیا ہے، سیدنا المعنوی نے سچ فرمایا ہے۔

ہر کہ کارد قصد گندم بائدش
کاہ خود اندر تبع می آیدش

گیہوں کی کاشت تو دانۂ گندم کے فراہم کرنے ہی کے لئے کی جاتی ہے۔ اور طفیل میں اس کے پتوں اور ڈنٹھلوں کو چور کر کے بھوسہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن بھوسہ ہی حاصل کرنے کیلئے آجتک کسی نے گیہوں کی کاشت کی ہے؟ بقول حکیم الامت تھانوی نور اللہ ضریحہ "اسلامی عبادات" کی فلاسفی نکالنے کا عصری طریقہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ عرق گلاب کے قرابوں کا بھی استعمال استنجا بتایا جائے، فرمایا کرتے تھے کہ اپنی مائیت اور صفت سیلان کی وجہ سے ازالۂ نجاست کا کام یقیناً گلاب کے اس عرق سے بھی اگر چاہا جائے تو لیا جا سکتا ہے لیکن اسی کو عرق گلاب کے وجود کی غائت ٹھہرانا، عقلی گندگی اور ذہنی غبارت کے سوا اور کیا ہے۔؟

اور میں تو کہتا ہوں کہ دین میں ان عباداتی عناصر کے شریک کرنے کی جو واقعی غرض و غائت ہے اسکے ساتھ اپنی من مانی خود غرضیوں کے حصول کا ذریعہ ان کو بنا لینا، ممکن ہے کہ بعض حالات میں مضر نہ ہو بلکہ مفید ہی ہو مگر مشاہدہ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ اس قسم کی بے احتیاطیوں اور بے باکیوں نے کبھی کبھی خطرناک نتائج کو بھی پیدا کر دیا ہے

خیر میں کیا کہنے لگا، ذکر یہ ہو رہا تھا کہ "حج" اور اسکے اعمال و اشغال کی تجزیہ و تحلیل ہی سے نہیں بلکہ خود قرآنی الفاظ کے اشاروں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ فطرت انسانی میں حسن و جمال کی جستجو و تلاش کا جو جبلّی جذبہ ہے اسی جذبہ کے صحیح استعمال کی راہ "حج" کے ذریعے کھولی گئی ہے

اسی حسن وجمال کے لازوال سرچشمہ سے ربط قائم کرنے کی یہ حکیمانہ تدبیر ہے، پچھتانا ان کو پڑتا ہے جو بجائے چشمۂ آفتاب کے دیوار و در شجر و حجر پر پڑنے والی چلتی پھرتی دھوپ کے دھبوں سے دل لگا کر سمجھتے ہیں کہ آفتاب کا نور انکو مل گیا، سورج کی روشنی انھوں نے پالی، امیر مرحوم کا شعر

چھیڑتے کیوں ہو جوانی میں حسینوں کو امیرؔ
رات ہی بھر کا یہ جوبن ہے سحر ہونے تو دو

حقیقت بن کر ان ہی کے سامنے آتا ہے جنھوں نے دین کے اس مشورے کو قبول کر کے ندائے ابراہیمی پر لبیک کہا ہو اور حج جیسے اس راہ کے ایجابی عمل کی قدرتی شکل ہے، اسی طرح بقول حضرت قاسم العلوم والخیرات رحمۃ اللہ علیہ الصوم یعنی روزہ اسی راہ کے سلبی عمل کا نام ہے، جس میں ان چند جو ہری مرغوبات ومالوفات سے معتد بہ وقفہ تک دست بردار ہونے کی مشق بہم پہونچائی جاتی ہے جس کی کرفت اور دباؤ کو نسبتاً انسانی فطرت زیادہ محسوس کرتی ہے اپنے اس سلبی ومنفی عمل میں ہر مومن کو اس کا موقعہ ملتا ہے کہ اپنا امتحان وہ خود لے، پتہ چلائے کہ عشق و محبت کی وادی کے ایجابی اعمال کی صلاحیت کس حد تک اس میں پیدا ہو چکی ہے وہ ولولہ و سرمستی کے اس میدان میں کہاں تک چل سکتا ہے جس میں چلنے والوں کو مخلوقات سے رشتہ توڑ کر خالق ہی کے حسن وجمال کی جستجو میں غرق کر دیا جاتا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں "خود امتحانی" کی بہترین شکل روزہ ہی ہے یہی ایک ایسا عمل ہے جس میں نفس کی شعبدہ بازیوں، اور عربدہ جوئیوں کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، جو مومن نہیں ہے، اور اپنے دین کو خالص بنانے میں جو کامیاب نہیں ہوا ہے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ روزہ اور روزے کے اقتضاؤں کی تکمیل پر کیوں مجبور ہو گا بقول شیخ کے

ملحد گرسنہ خانہ خالی بر خوان
عقل باور نکند کز رمضان اندیشہ

بہر حال یہ تو ایک ذیلی بات تھی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ الحج ہی کا سمجھنا چاہئیے کہ الصوم یعنی روزہ بھی مقدمہ ہے، گویا جیسے الصلوٰۃ والزکوٰۃ خالق کے حاکمانہ اقتدار کی تسلیم واعتراف کے عملی توالب ہیں، اسی طرح الصوم والحج حسن ازل، سرچشمہ جمال کی جستجو وتلاش کے عملی مظاہر

ہیں زکوٰۃ حقیقت صلوٰۃ کی تصدیقی شہادت ہے اسی لئے اسی کی تعبیر "الصدقہ" سے بھی کی ہے، کہ بقول شخصے ؎

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

زر طلبی کے مطالبہ کی تکمیل وفاداری کے زبانی دعوے کی دلیل بنجاتی ہے اسی طرح الصوم حج کا خدا للہ و مقدمہ ہے، بس حقیقی مطالبہ بندوں پر جو عائد کیا گیا ہے وہ "الصلوٰۃ" و الحج ہی ہے جیسا کہ تفصیلاً آپ سن چکے کہ انسانیت کے لئے "مستقر الی حین" یعنی وقتی قیام گاہ زمین ہی کا یہ خاکدانی کرہ جب کہ بنایا گیا، اور اس کرے پر خالق عالم کی کامل تجلی گاہ، جو بارگاہ ربانی یا بیت اللہ کے لفظ کے اطلاق کا جائز حقدار ہے، وہ "الکعبہ" اور وادی بکہ کا وہی حصہ چونکہ ہے جس کے ساتھ الناس کا قیام وابستہ ہے اور وہی ان کے لئے مثابہ (تقسیم رحمت کا مرکزی نقطہ) ہے اور خاک کے اس تودے کی ساری چہل پہل امن وامان کا ضامن بھی چونکہ وہی ہے، اس لئے تلاش حق کی ان دونوں راہوں کا رشتہ بھی اسی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، اور جب تک "الکعبہ" ان خصوصیتوں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے اسوقت تک مرکزیت کا یہ اعزاز و اکرام اسی کے ساتھ وابستہ رہے گا اس کی اسی اہمیت مطلقہ کا یہ نتیجہ تھا کہ اسی کی فتح کو قرآن نے "الفتح" قرار دیا کہ ہر ملک کی کشورکشائی میں پایہ تخت ہی کی فتح کا مسئلہ اصل مسئلہ ہوتا ہے اس کی غیر معمولی اہمیت ہی کا اقتضا تھا کہ نسل انسانی کے سب سے بڑے سردار اور "کافۃ للناس کے بشیر و نذیر" کو اس مہم کی سرانجامی کے لئے ازل ہی سے قدرت کی نظر انتخاب چن چکی تھی، اور اپنے اسم "تواب" کو پیش کرتے ہوئے اسی الفتح کے بعد خالق نے فاتح علیہ السلام کو اپنی طرف

لہ تواب کا مادہ توبہ ہے پلٹنا اور بازگشت یہی توبہ کا لفظی ترجمہ ہے سورہ النصر کو سن کر صدیق اکبر کے متعلق جو بیان کیا جاتا ہے کہ رونے لگے اور دریافت پر لوگوں سے فرمایا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے، اس صدیقی استنباط کا مخرج میں اسی لفظ تواب کو قرار دیتا ہوں، باقی سورہ نصر اور سورہ فتح دونوں میں فتح کی بشارت کے ساتھ پیغمبر کو استغفار و تسبیح کا حکم جو دیا گیا اور یہ کہ خدا نے اگلے پچھلے ذنوب آپ کے معاف کر دیئے تو بظاہر خیال گذرتا ہے کہ شاید اس کا تعلق فطرت انسانی کے اس اقتضا سے ہے کہ شاہد سے پہلے اطمینان کلی کی کیفیت اس میں پیدا نہیں ہوتی ایسے موقعوں پر غیر اختیاری وساوس و خیالات کا پیدا ہونا طبعی امر ہے

(بقیہ ۔۔۔ پر)

بازگشت اور پلیٹ جانے کا اشارہ سورہ نصر میں جو کیا تو اس کا یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ کہ کرۂ زمین کے "پایہ تخت" کی فتح کا مسئلہ جب طے ہو گیا تو آپ کا کام پورا ہو گیا باقی ام القریٰ کے چاروں طرف "القریٰ" یا آبادیوں کا جو طویل و عریض سلسلہ پھیلا ہوا ہے، ان کا کام "امت" کے سپرد کر دیا گیا حتّٰی لا یبقٰی بیت مدر ولا وبر الا دخلہ الاسلام

اور یہ جو صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب چھوٹے چھوٹے پنڈلی والے حبشی "الکعبہ" کے ایک ایک پتھر کو اکھاڑ کر اس سے جدا کر دیں گے اور یوں "الکعبہ" کا قصہ ختم ہو جائے گا تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ خود "الکعبہ" کے در و دیوار اور زمین کے جس حصہ پر وہ واقع ہے بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ یہ سارا زور و شور اور ساری ہنگامہ آرائیاں اس رشتہ کے ساتھ وابستہ ہیں، جو خالق تعالیٰ و تقدس کی ذات کے ساتھ اس مکان اور اس جگہ کا قائم ہے۔ گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ اپنے قلمرو کے کسی خاص علاقہ یا صوبہ میں بادشاہ جب آتا ہے اور شاہی بارگاہ وہاں قائم کی جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس شاہی بارگاہ کی اسی وقت تک اہمیت رہتی ہے جب تک فرودگاہ شاہی ہونے کی عزت اسے حاصل ہے۔ لیکن کس نے نہیں دیکھا کہ اس نسبت کے ختم ہونے کے ساتھ ہی، وہ سارا میدان جس میں شاہی بارگاہ کھڑی کی گئی تھی ہو کا میدان بن کے رہ جاتا ہے پھر مزدور آتے ہیں اور اسی شاہی خیمہ کو اکھاڑ پچھاڑ کر ختم کر دیتے ہیں۔ اب نہ اسکے ارد گرد پہرہ پڑتا ہے نہ لاؤ لشکر کا ہجوم ہوتا ہے، نہ حاجت مندوں کی آمد و رفت کا سلسلہ باقی رہتا ہے، کسی موقعہ پر میں نے ایک روایت درج کی تھی جس کا حاصل تھا کہ جب زمین کی آزادی کا ارادہ کیا گیا تو آج جہاں پر "الکعبہ" کی عمارت ہے عالم علوی سے ایک خیمہ آیا اور اسی مقام پر نصب کیا گیا میرے نزدیک قرآنی آیت اِنَّ اوّل بیتٍ وُضعَ للنّاس الاٰیۃ۔ ہی کی یہ تفسیر تھی، الکعبہ کی یہی اصل حقیقت ہے، جسے صرف خواص ہی نہیں بلکہ ہر عامی مسلمان بھی جانتا ہے، یہی وجہ تو ہے کہ بخاری کی مذکورہ بالا اکذا[illegible]

(بقیہ) [illegible] فتح کے بشارت کے بعد [illegible] متعلقہ [illegible] وغیرہ [illegible] استغفار کا حکم اگر دیا گیا ہو اور حق تعالیٰ کی ذات ایسی [illegible] تسبیح کا حکم ہو تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

یعنی "الکعبہ" کے ایک ایک پتھر کو آخر زمانہ میں جب دنیا کے ختم ہونے کا وقت آئے گا چھوٹے چھوٹے پاؤں والے حبشی اکھاڑ ملکر پھینک دینگے "۔ تو اس روایت کو سن کر کبھی بھی "الکعبہ" کی اہانت و تحقیر کا احساس پیدا نہیں ہوتا ہر مسلمان جانتا ہے کہ "الکعبہ" کے ساتھ جو لاہوتی نسبت اسوقت قائم ہے یہ حادثہ اس نسبت کے ختم ہوجانے کے بعد پیش آئیگا۔ ظاہر ہے کہ اسکے بعد "الکعبہ" الکعبہ ہی کب باقی رہتا ہے بلکہ چند پتھروں کا ایک مجموعہ بن کر رہ جائے گا، اب اسکے پتھروں کا نکالنا یا کسی عام معمولی مکان کی اینٹ سے اینٹ کا بجا دینا دونوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، حجر اسود کو خطاب کر کے روایتوں میں جو آیا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "تیری حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ تو ایک پتھر ہے، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے ہوئے میں نے دیکھا ہے اسلئے میں بھی تجھے بوسہ دیتا ہوں" حاصل عمر فاروق کے الفاظ کا یہی ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ "بجد اللہ" "الکعبہ" کے ہر ہر پتھر کے متعلق اسی ایمانی بصیرت سے مسلمانوں کی عام جماعت، سرفراز ہے، ان میں ہر ایک نقاب حجر لبجہ "اکھاڑ دے گا کعبہ کے ایک ایک پتھر کو" والی روایت کو ہمیشہ سنتا ہے، اور اسکی پیشانی کی شکنوں میں ہلکی سے جنبش بھی نہیں ہوتی بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ خصوصیت کے ساتھ حجر اسود ہی کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایمانی احساس کا جو اعلان فرمایا تو شاید اسکی وجہ یہی ہے۔ کہ دیوار کعبہ میں شریک ہونے کی صفت تو ان سارے پتھروں میں پائی جاتی ہے جو اس مکان کی تعمیر میں استعمال کئے گئے ہیں جنمیں ایک حجر اسود بھی ہے لیکن علاوہ اس عام وصف کے حجر اسود ہی ایک ایسا تاریخی پتھر اس مکان میں رہ گیا ہے جو کعبہ کی ابتدائی تعمیر سے اسوقت تک مسلسل چلا آرہا ہے ممکن ہے کہ بعض دوسرے پتھروں کی نوعیت بھی یہی ہو لیکن عرب کی موروثی روایات جو نسلاً بعد نسل ان میں "الکعبہ" کے متعلق منتقل ہوتی چلی آتی تھیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پرانا پتھر کعبہ کی دیواروں میں حجر اسود ہی رہ گیا ہے گویا خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جن جن روحانی ہستیوں، اللہ کے دوستوں کا "الکعبہ" سے تعلق پیدا ہوتا رہا جس نے ایک ایسا امتیاز حجر اسود کو بخش دیا ہے جس کا دعویٰ اسی "الکعبہ" کی دیواروں کے دوسرے پتھروں کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ ایسی چیز جو خدا کے برگزیدہ ترین بندوں یعنی حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام کے لمس و مس کے شرف و سعادت سے قطعی طور پر سرفراز ہوئی ہو، اگر ڈھونڈھی جاوے تو عرب ہی نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ زمین کے اس پورے کرے پر "الکعبہ" کے

اس سیاہ پتھر کے سوا صحیح تاریخ کی روشنی میں کوئی دوسری چیز ڈھونڈھنے والوں کو نہیں مل سکتی، کم از کم اتنا تو بہرحال یقینی اور قطعی ہے کہ سید الانبیاء والرسل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک لبوں کے ساتھ اتصال کا شرف اس پتھر کو ضرور حاصل ہوا ہے، اور قرآنی خبروں کو جو مانتے ہیں کہ وہ خدائی خبریں ہیں ان کو بہرحال یہ تسلیم ہی کرنا چاہیئے کہ معماران کعبہ ابراہیم خلیل، اور اسماعیل صدیق و ذبیح کی مقدس انگلیوں نے بھی اس پتھر کو ضرور چھوا ہے۔

شائد یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا ہے کہ حجر اسود یمین اللہ یعنی خدا کا داہنا ہاتھ ہے) آخر قرآن ہی میں جب ہمیں بتایا گیا ہے کہ جنکے ہاتھوں پر پیغمبر اپنا ہاتھ رکھتے ہیں، ان کو سمجھنا چاہیئے کہ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے ید اللہ فوق ایدیھم جب قرآنی نظریہ ہے، تو جس پتھر کو خدا کے پیغمبروں کے ہاتھوں نے چھوا ہے، اگر خدا کا ہاتھ اسی پتھر میں ہمیں نظر آتا ہے تو آپ ہی بتایئے کہ قرآن کی بخشی ہوئی روشنی میں ہماری ایمانی آنکھ آخر اسکے سوا اور کیا دیکھے اسی لئے تو سمجھا جاتا ہے کہ حجر اسود کا استلام اور تقبیل یعنی اس پتھر کو طواف کرتے ہوئے چھونا اور بوسہ دینا، گویا توحید کے ان دعاۃ اور منادیوں کے ہاتھوں پر بیعت کرنا اور ان بزرگوں کے ہاتھوں کو بوسہ دینا ہے، جنکے ہاتھوں کو خدا نے اپنا ہاتھ نص صریح میں قرار دیا ہے۔

بہرحال کچھ بھی ہو، الکعبہ ہو یا الکعبہ کی دیواریں ہوں، ان دیواروں کے پتھر ہوں، بجائے خود ان کی حیثیت کچھ نہیں ہے، مگر با ایں ہمہ خدا کے نائندوں میں اسی کو مرکز بنا کر سارے جہان کے مسلمان اسی کی طرف جو اپنا رخ پھیر دیتے ہیں یا طواف کا فریضہ اسی کے گرد چکر لگا کر جو ادا کیا جاتا ہے تو یہ سارا کرشمہ اس انتساب خصوصی کا ہے۔ جو خالق کائنات اور اسکے نائندوں دوستوں کے ساتھ یہ عمارت رکھتی ہے، واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی (یعنی ابراہیم کے قیام کی جگہ (الکعبہ) سے رشتہ قائم کر کے، نماز کی جگہ بناؤ) اس میں اللہ کے ایک دوست ہی کی نسبت کا تو حوالہ دیا گیا ہے، اور یہ ایک ایسی ظاہر و باہر بین حقیقت ہے جس سے مسلمان تو مسلمان میں سمجھتا ہوں کہ جو مسلمان نہیں ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے دین کی بنیاد ہی خالق پرستی پر مبنی ہے۔

اسلئے کسی قسم کی مخلوق ہو، مسلمانوں کی نہ وہ معبود بن سکتی ہے اور نہ مسجود، جیسے مسجد کی دیواروں کے آگے سجدہ کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلمان ان دیواروں کو سجدے کرتے ہیں بلکہ ہر ایک جانتا ہے

کہ دیواریں مسجود لہ نہیں بلکہ مسجود الیہ ہونے سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتیں بالفاظ دگر دیواروں کے لئے سجدہ نہیں کیا جاتا، بلکہ سجدہ تو خالق کائنات ہی کے لئے کیا جاتا ہے البتہ رخ نمازیوں کا مسجد کی دیواروں کی طرف ہوتا ہے، استقبال کعبہ کا لغۃً و اصطلاحاً ہر لحاظ سے یہی مطلب ہے اپنے تو اپنے غیر بھی یہی جانتے ہیں،

مگر باوجود سب کچھ جاننے اور پہچاننے کے غالباً ستم ظریفیوں کی تاریخ میں یہ لطیفہ اپنی نظیر آپ ہی ہوگا کہ بازاریوں کو نہیں بلکہ اچھے خاصے بھاری بھرکم سنجیدہ علمی طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کو دیکھا گیا ہے کہ مخلوق پرست قوموں کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے مسلمانوں پر اس تہمت کے جڑنے کی جرات کرتے ہیں کہ آخر "الکعبہ" کے پرستار وہ بھی تو ہیں اور "الکعبہ" چند مخلوق پتھروں کے سوا اور کیا ہے پھر مسلمان "الکعبہ" کو جب پوجتے ہیں، تو بالواسطہ پتھروں کے پوجنے کے مرتکب کیا وہ بھی نہیں ہو رہے ہیں؟ معذرت ہی سہی لیکن اس قسم کی لچر پوچ چھچھوری باتوں پر انصاف اور حقیقت کی آنکھوں سے اگر خون ٹپک پڑے تو جس قسم کی یہ حرکت ہے، بتایا جائے کہ اس کا نتیجہ اور کیا ہو سکتا ہے،

یہ کہنا کہ بت پرست بھی تو پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کو نہیں پوجتے بلکہ حقیقی توجہ ان کی اس مخفی نادیدہ قوت کی طرف ہوتی ہے جسکی نمائندگی بت کرتے ہیں عجیب ہی، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مخلوق پرستوں میں جن جن ناموں کے ساتھ بت پوجے جاتے ہیں آپ ان کی فہرست بنا لیجئے آپ دیکھیں گے ان کے سارے معبود خالق نہیں بلکہ مخلوقات ہی کے کسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً وہ کسی مرتے ہوئے انسان یا حیوان، یا ملائکہ، جن، بھوت پریت وغیرہ کے نام ہوں گے ظاہر ہے کہ "الکعبہ" کو جس ذات کے ساتھ انتساب کا شرف مسلمانوں کے نزدیک حاصل ہے وہ مخلوق نہیں بلکہ خالق کائنات کی ذات ہے پھر مخلوقات کی نمائندگی کرنے والی مورتیوں کو "الکعبہ" پر قیاس کرنا کس حیثیت سے صحیح ہو سکتا ہے اور مان بھی لیا جائے اگرچہ قطعاً یہ ایک ایسی بات کو تسلیم کر لینا ہے جو واقعہ نہیں ہے، اگر مان لیجئے جیسا کہ اس زمانہ میں بعضوں کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا ہے کہ پتھر کی کھودی جن مورتیوں کو وہ پوجتے ہیں ان کے نزدیک وہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی نمائندگی کا کام انجام دیتی ہیں کہتے ہیں کہ نادیدہ خالق کے دھیان کو ان ہی دیدہ مورتیوں کو سامنے رکھ کر ہم جاتے ہیں، بت پرستی کی یہ تازہ توجیہ جو قطعاً ایک غیر واقعی توجیہ ہے، بہرحال جب کبھی اس توجیہ کا ذکر میرے سامنے آیا تو دل نے ہمیشہ یہ فیصلہ کیا کہ کچھ اور ہو یا نہ ہو لیکن مخلوق پرستی کے طرفدار

کی شکست فاش کا یہ کھلا ہوا اعتراف ہے، کیونکہ واقعہ خواہ کچھ ہی ہو توجیہہ کرنے والوں نے تو یہ مان ہی لیا کہ مخلوق پرستی کو وہ بھی ایک غلط مسلک سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کے بھی انسانیت کے ارتقار کا طبعی طریقہ یہی ہے کہ خالق تعالیٰ جل مجدہٗ اور اس کے کمالات وصفات سے ربط پیدا کیا جائے۔ اختلاف جو کچھ بھی باقی رہ جاتا ہے وہ صرف خالق کے طریقہ عبادت میں، یعنی مورتی پوجا کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک خالق پرستی کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ ایک دیکھی بھالی مورتی کو سامنے رکھکر خالق کا دھیان جمایا جائے لیکن خالق پرستی کے اس طریقہ پر اصرار کرنے والوں سے جب پوچھا جاتا ہے کہ آخران مورتیوں سے خالق کے دھیان کو جو آپ جماتے ہیں، اس کی منطقی توجیہہ کیا ہے؟ یعنی ان دیکھے خالق کی طرف دیکھی ہوئی مورت سے آپ کا خیال کس علاقہ کی پشت پناہی میں منتقل ہوتا ہے؟ تصویر میں اور جسکی وہ تصویر ہو، دونوں میں صوری مشابہت ہونی چاہیئے گدھے کی تصویر کو سامنے رکھکر اپنی بیوی کی تصور کو آدمی کیا اپنے اندر تازہ کرسکتا ہے؟ سوال یہی ہوتا ہے کہ مورتیاں جن میں عموماً مردوں یا عورتوں کی ہیئت شکل وصورت قائم کی جاتی ہے، اب خواہ مردانی صورت ان کی ہو یا زنانی اسکو سامنے رکھکر اس ذات بے ہمتا کا دھیان کیسے جمایا جاسکتا ہے جو نہ مردوں کی جیسی صورت رکھتا ہے اور نہ عورتوں جیسی شکل اسکی ہے۔ آخر اس کا "نرنکار" اور برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ہونا یہ تو فطرت انسانی کا ایک متفقہ جبلی شعور ہے۔

اور اگر یہ مطلب ہے کہ خالق کی کسی مخلوق کو سامنے رکھکر آپ چاہتے ہیں کہ خالق کی یاد کو تازہ کریں، تو اسکے لئے کیا آسمان وزمین شجر وحجر بلکہ کائنات کا ایک ایک ذرہ کافی نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تراشی ہوئی مورتیوں اور ڈھالے ہوئے بتوں میں انسانی صنعت کاری، اور کاریگری کے آثار ونتائج بھی چونکہ شریک ہوجاتے ہیں اسلئے خالق کی یاد کی تجدید میں بجائے مدد ملنے کے اس کا زیادہ اندیشہ ہے کہ راہ کے وہ روڑے نہ بنجائیں۔ خصوصاً جب روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کسی اسٹیچو یا مجسمہ کو دیکھکر ذہن عموماً اس بت تراش اور مجسمہ ساز کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جو اپنی صنعتی مہارت اور چابکدستی کے کمالات کو پتھر یا لکڑی وغیرہ کے ٹکڑوں میں نمایاں کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ گہرا یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ مورتیوں کے سامنے

جاکر یہ دیکھا جاتا ہے کہ پجاریوں کی تشفی ہو جاتی ہے، بتوں کے آگے حضوری اسی کو وہ سب کچھ سمجھ لیتے ہیں، گویا پتھر کی کھودی ہوئی کسی مورتی کے سامنے چند پھول یا پھل وغیرہ کو رکھدینے کے بعد یقین کر لیتے ہیں کہ ان کو سب کچھ مل گیا اسکے بعد قدرتاً "تلاش حق" کا جو فطری جذبہ انسانی سرشت میں گندھا ہوا ہے اس جذبہ کے تقاضے اس عمل کے بعد سرد پڑ جاتے ہیں، برخلاف اسکے "الکعبہ" میں پہونچنے کے بعد بھی جب کسی "سین خکل" میں مومن کا خدا سامنے نہیں آتا تو بجائے دھیمی ہونے کے یہ واقعہ ہے روزمرہ کا تجربہ ہے کہ محبوب ازلی کی جستجو کا شعلہ سینے میں زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتا ہے، ان ہی کھدی اور ڈھلی ہوئی مورتیوں یعنی الاصنام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جیسا کہ قرآن میں نقل کیا گیا ہے، امام الموحدین سیدنا ابراہیم خلیل علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والتسلیم خدا کے سامنے ان الفاظ کے ساتھ جو گڑگڑائے تھے کہ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاس اے پروردگار ان بتوں نے بہتوں کی راہ ماری۔ اس دعائیہ فقرہ کا ایک بڑا تفسیری پہلو یہی نفسیاتی مسئلہ ہو سکتا ہے ھذا ما عندی۔ واللہ اعلم بالصواب، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

مدینۂ طیبہ میں رمضان مبارک کے چند دن

(از مولوی محمد ثانی صاحب حسنی)

(مندرجۂ ذیل مضمون الحاج مولوی محمد ثانی صاحب کے غیر مطبوعہ سفرنامہ کے چند صفحات ہیں، آپ کو مدینۂ طیبہ میں رمضان گزارنے کا شرف حاصل ہوا اور آپ نے وہاں کے مشاہدات و تاثرات میں قیام حجاز کے پورے واقعات کو روزنامچہ کی شکل میں مفصل قلمبند کیا۔)

آج رمضان المبارک کی آٹھویں شب ہے۔ دیر ہوئی کہ مسجد نبوی میں تراویح ختم ہو چکی ہے، رات کا کافی حصہ گزر چکا ہے لیکن حرم نبوی کے ہر کونہ اور ہر سمت میں سیکڑوں آدمی نماز، درود، سلام، تلاوت قرآن، قیام و قعود میں مشغول نظر آ رہے ہیں، مختلف سمتوں میں چھوٹی بڑی جماعتیں ذکر اللہ میں مصروف ہیں، اس طرف دیکھیے تو ایک بخاری عالم بڑی خوش الحانی سے تیز آواز کے ساتھ قرآن سنا رہے ہیں، ان کے پیچھے چند جوان اور بوڑھے بخاری بڑی توجہ سے سن رہے ہیں۔ دوسری طرف نظر ڈالیے تو ایک حجازی خوش الحان حجازی لہجہ میں پورے نشاط سے قرآن پڑھ رہے ہیں، ان کے پیچھے ایک اچھی خاصی بڑی جماعت ہے جس میں عربی ہندی اور دوسرے ملکوں کے مہاجرین اور حجاج ہیں۔

حرم نبوی کا صحن اور دالان ان قرآن پڑھنے والوں کی (جن میں کچھ نماز میں مشغول ہیں اور چند تلاوت میں مصروف ہیں) آوازوں سے گونج رہا ہے محراب عثمانی سے باب مجیدی تک یہی سماں ہے۔ ان کے علاوہ گلیوں اور نکڑوں تک پیچھے، اور بوڑھے ہاتھوں میں حمائل اور قرآن لیے مشغول تلاوت ہیں۔ مسجد نبوی کے دالان خصوصاً روضۂ جنت اور اس سے زائد محراب نبوی میں نوافل ادا کرنے والوں کا تانتا لگا ہے۔ بلکہ محراب نبوی پر تو لائن لگی ہے اور ایک کے پیچھے ایک کھڑا ہے کہ کس طرح اس کو جگہ مل جائے۔

خدایا یہ تیرے بندے عجیب غریب ہیں کئی گھنٹے گزر گئے مگر جو قیام میں ہو وہ قیام ہی میں ہو جو تلاوت میں ہو وہ ویسا ہی تلاوت میں مشغول ہو، بازار میں چہل پہل ہو، رونق ہو، دلچسپی کے تمام سامان ہیں مگر ان کو سوائے تیری حضوری کے اور کسی کام سے دلچسپی نہیں، نہ یہ تھکتے ہیں اور نہ اکتاتے ہیں "لا تلہیہم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ" اے اللہ مجھے بھی ان جیسا شوق عطا فرما۔

(۲) آج جمعہ کا دن ہو۔ مدینہ منورہ میں میرا یہ پہلا جمعہ ہو، ہر طرف چہل پہل ہو۔ اذان جمعہ سے بہت پہلے لوگ مسجد پہونچ چکے ہیں، پہلی صف تو گھنٹوں پہلے ہی پُر ہو چکی، میں اذان سے ایک گھنٹہ پہلے اس نیت سے پہونچا کہ مجھے بھی آگے امام کے قریب جگہ مل جائے۔ بڑی کوششوں اور کاوشوں کے بعد مجھے جگہ ملی تو اکیسویں صف میں، وہ بھی ستونوں کے درمیان (یہ واضح رہے کہ یہ حالت اس وقت ہوتی ہو جب حجاج آ رہے ہوں یا آچکے ہوں)

اذان ہوتے ہی تمام دروازے نمازیوں سے پُر ہو گئے۔ ان کے قدموں کی آوازیں گھروں تک آرہی ہیں۔ تسبیحوں کا عام رواج ہو، ہر شخص کے ہاتھ میں تسبیح نظر آئے گی۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد و عورت سکون و وقار سے چلتے نظر آئیں گے۔ عامی ہو یا عالم، ایک معمولی سا سپاہی ہو یا بڑے سے بڑا عہدہ دار سب بارگاہِ نبوی میں ایک ہی لباس میں نظر آرہے ہیں۔

امام صاحب ایک مرد صالح اسم با مسمیٰ بزرگ ہیں عمر تقریباً ۷۰ سال ہو، نجدی عالم ہیں۔ ضعیف و نحیف، نورانی صورت، نہایت خلیق و متواضع۔ جمعہ کے دن حرم نبوی کے قمقمے اور بجلیاں یہاں کے خاص خدام (اغوات) صاف کرتے ہیں۔

امام صاحب اثناء خطبہ میں جب بھی حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لیتے ہیں تو اپنا منھ سرور عالم صلی اللہ وسلم کی جانب پھیر دیتے ہیں، وہ عجب منظر ہوتا ہو جس وقت اس کا تصور کیا مشاہدہ ہوتا ہو کہ حضور یہیں آرام فرما ہیں اور آپ کے دونوں خلفا جن کے یکے بعد دیگرے خطبہ میں نام لیے جاتے ہیں یہیں محو خواب ہیں۔ اور خطبۂ ثانیہ میں جن کے نام لیے جاتے ہیں ان میں سے اکثر یہیں چند گز کے فاصلے پر بقیع میں آسودۂ خاک ہیں۔ یہی وہ مسجد نبوی ہو جہاں حضور ستون کے سہارے اور منبر نبوی پر خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ ان سب باتوں کا خیال کر کے دل پر عجب اثر ہوتا ہو اور جمعہ اور اس کے خطبہ میں ایک نئی روح اور نیا کیف پیدا ہو جاتا ہو۔

(۳) حرم نبوی میں قاعدہ ہو کہ ہمیشہ تہجد کی بھی اذان ہوتی ہو۔ رمضان المبارک میں پوری رات حرم نبوی کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ اور باقی دنوں میں نماز عشا کے بعد دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ آج کل عربی وقت کے لحاظ سے سات بجے تہجد کی اذان ہوتی ہو۔ اور پانچوں مناروں پر پرسکون فضا میں قریباً ۸۔۱۰ منٹ تک خوش الحان موذنوں کی اذانیں جو ترنم کے ساتھ دی جاتی ہیں ہوتی رہتی ہیں یہ اذان رمضان المبارک میں سحری کی علامت ہو، اس کے علاوہ سحری کی دوسری علامت جو دور کے بسنے والوں کے لیے ہو وہ منارۂ بلالی پر ایک روشنی ہوتی ہو۔ نماز فجر کے بعد عام طور سے لوگ اسی حرم نبوی کے صحن و دالان میں سو جاتے ہیں۔

(۴) ادھر عصر کی نماز ختم ہوئی اُدھر روزے داروں نے افطار کا سامان مہیا کرنا شروع کیا۔ اگرچہ عصر اور مغرب کے درمیان تین گھنٹے کا فصل ہوتا ہو مگر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہو۔ بازار میں خرید و فروخت شباب پر ہو، کھجور اور انگور کے سڑکوں کے کنارے دوکانوں پر خوشے کے خوشے نظر آرہے ہیں دہی اور دودھ ہر سمت بکتا نظر آرہا ہو۔ مسجد نبوی روزے داروں سے پُر ہوتی جارہی ہو۔ ہزاروں مٹی کی نازک صراحیاں جن کو یہاں "شربہ" کہتے ہیں لکڑی کے بکسوں میں رکھی ہیں۔ مغرب سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے خوش پوشاک، شریف صورت، نوعمر بچے کاندھوں پر لانبے تولیے ڈالے، انگلیوں میں صراحیاں تھامے، ایک ایک ہاتھ میں پانچ پانچ، چھ چھ صراحیاں انگلیوں میں پروے ہوئے آتے ہیں اور بکسوں کے اندر رکھ جاتے ہیں۔ روزہ دار حسب مرضی دو دو ایک ایک صراحی اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔

مغرب کا وقت قریب سے قریب تر آتا جاتا ہو اور مسجد بھرتی جاتی ہو؛ صحن و دالان میں ٹولیاں بیٹھی ہیں، افطار کا سامان جس میں عام طور پر انگور و کھجور ہی ہوتے ہیں، رکھا ہو۔ اور سامنے وہی ٹھنڈے شربے جس کا پانی برف کے مانند ہوتا ہو۔

دن بھر کا روزہ، دن بہت بڑا، گرمی کی شدت، مغرب کا قرب، سامنے ٹھنڈے شربے، دو تین منٹ باقی ہیں، ہر شخص بے چینی سے منتظر ہو، آنکھیں مناروں پر، اور کان موذن کی آواز پر، ادھر اذان ہوئی اُدھر ایک ہاتھ میں شربہ، دوسرے میں کھجور و انگور، جو لذت اس وقت محسوس ہوتی ہو وہ تحریر میں نہیں آسکتی۔

(۵) آئیے آج آپ کو مسجد نبوی کی زیارت کرائیں۔ آپ باب مجیدی سے جو گنبد خضرا کے عین سامنے ہے داخل ہوں، عصر کا وقت ہو، نماز ہو چکی ہو، جانے والے جا چکے ہیں، اپنے دائیں طرف سے چلنا شروع کیجیے، دیکھیے یہ سامنے ایک عمر رسیدہ عالم صاحب بیٹھے علم و ادب و معانی کا درس دے رہے ہیں۔ ان کے اردگرد پچیس تیس طلبہ مختلف ملکوں اور شہروں کے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح ان کے آگے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف دینی مجلسیں گرم ہیں، وہ دیکھیے تھوڑے فاصلے پر ایک صاحب وعظ کہہ رہے ہیں اور بہت سے لوگ وعظ سُن رہے ہیں۔ کہیں الگ الگ لوگ بیٹھے ہوئے ذکر اللہ میں مشغول ہیں۔ اور آگے بڑھیے وہ سامنے ایک وسیع حلقہ ہو جس میں بچے اور بوڑھے، ہر عمر اور علم والے لوگ بیٹھے ہیں۔ اس میں ہندی بھی ہیں، حجازی بھی، مصری بھی، اور ترکی بھی، مختلف ملکوں کے تاجر بھی، کتابیں کھلی ہیں اور تقریر ہو رہی ہو۔

وہ دیکھیے معتکفین کے ڈیرے لگے ہیں۔

لیجیے باب الرحمۃ آگیا، یہ دیکھیے سامنے جالیوں سے ملے ہوئے بہت سے غرباء اور فقراء میلے اور بوسیدہ کپڑے پہنے اپنے سامنے چادریں اور برتن رکھے بیٹھے ہیں، ان کے دوسری طرف یتیم بچے (دار الیتامیٰ کے)، ایک لباس میں ملبوس کتنے سکون اور ترتیب سے بیٹھے ہیں اور اپنے مربی کے حکم کے منتظر ہیں۔ ادھر مربی کا حکم ہوا ادھر وہ ترتیب وار چلنا شروع ہو گئے۔

دالان میں وہ دیکھیے جہاں سیدنا ابو بکرؓ کا خوخہ (چھوٹا دروازہ) ہو۔ اس کے قریب ایک حجازی قاری کس درد بھرے لہجے سے قرآن کریم پڑھ رہا ہو اس کے اردگرد ہندستانی، حجازی، جاوی، ترکی و شامی اور مصری گھیرا ڈالے قرآن شریف سُن رہے ہیں، اور وہ بیخودی میں مست ہو ہو کر تلاوت میں مشغول ہو۔ ترکی حجاج رقت و تاثر میں ممتاز ہیں۔ ایک ترکی تو دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے۔

اچھا آگے بڑھیے، وہ سامنے کتنا وسیع حلقہ ہو، یہ حدیث کا درس ہو۔ یہ حلقہ تمام حلقوں میں زیادہ وسیع اور ممتاز ہو، یہ درس عام فہم ہو، ہر شخص اس سے مستفید ہو رہا ہو۔ یہاں افریقہ کے ایک عالم عبد الرحمٰن السودانی جو مدرسۂ دار الحدیث میں مدرس ہیں ریاض الصالحین کا درس دے رہے ہیں۔ ۲۵۔۳۰ طلبہ زیر درس ہیں، ان کے علاوہ بہت سے عام لوگ بھی سُن رہے ہیں،

ان کی تقریر سلجھی ہوئی واعظانہ طرز پر ہے، آسان مسائل، عام فہم باتیں، صحابہ کے حالات، تقریر پرجوش آواز تیز ہے۔

ان سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے استاد محمد الحرکانی النجدی درس دے رہے ہیں۔ ان کا درس پہلے درس سے مختلف، علمی مذاق رکھنے والے اور ذی استعداد حضرات کے قابل ہے۔ مسائل بلند اور اختلافی ہیں، جس کی وجہ سے سوائے طلبہ کے دوسرے لوگ کم سمجھتے ہیں۔

یہ دونوں حلقے سب سے بڑے حلقے ہیں۔ انھیں دو حلقوں میں، روضۂ جنت تو عبادت گزاروں سے بھرا ہے۔ آوازیں آرہی ہیں منبر نبوی سے لے کر حجرۂ شریفہ تک جگہ نہیں، پوری جگہ پر ہے۔

وہ دیکھیے سامنے باب النساء ہے، اس پر عورتوں کا اچھا خاصا اجتماع ہے عربی و ہندی و جاوی عورتیں قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہیں بہت سی عورتیں کھڑے بیٹھی تلاوت کر رہی ہیں اور تسبیحوں میں مشغول ہیں اصحاب صفہ کا چبوترا باب النساء سے ملا ہے اس پر قطار در قطار اغوات (خوجے) اپنے مخصوص لمبے لباس، چوڑی اور لمبی آستین والے خاص طرز کے جبے، ایک خاص قسم کی پگڑی باندھے بڑی بڑی تسبیحیں لیے بیٹھے ہیں، یہ سب روضۂ نبوی کی جانب متوجہ ہیں اور بڑے منکسر مزاج و دیندار خدمتگار ہیں کسی سے سوال نہیں کرتے بلکہ سوال نہیں کیا اگر کوئی ان کی خدمت میں کچھ پیش کرنا چاہے تو منع کیا نہ قبول کر لیتے ہیں۔

اچھا آئیے اطراف الحظیرا اصحاب صفہ کے چبوترے کے قریب ایک صاحب زبانی احادیث زور زور سے پڑھ رہے ہیں ان کے ارد گرد بیسیوں آدمی کھڑے ہیں۔ بڑے غور سے ان کو دیکھتے ہیں معلوم ہوا کہ ان صاحب کو قریباً ڈیڑھ ہزار حدیثیں مع سند کے یاد ہیں اور یہ صاحب پانچوں نماز کے بعد یاد رکھنے کی خاطر اسی طرح پڑھتے رہتے ہیں۔

اچھا اب آئیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہ شریف میں چلیے۔ یہ دیکھیے کتنا ازدحام ہے کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں، دور دور تک آدمی کھڑے ہیں، آوازوں کا عالم یہ ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کوئی تنہا سلام پڑھ رہا ہے کہیں مجمع ہے کوئی خود پڑھ رہا ہے کسی کو معلم پڑھوا رہے ہیں، کوئی خاموش کھڑا ہے، کوئی بلک بلک کر رو رہا ہے، کسی کے صرف آنسو رخسار پر ڈھلک رہے ہیں، سب کی نظریں جھکی ہوئی ہیں، دو شرطی اپنا ہی کھڑے ہیں کہ اگر کوئی خوش اعتقادی میں حد ادب سے تجاوز نہ کرے حضور کے ساتھ ساتھ شیخین، حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ پر بھی سلام پڑھا جا رہا ہے اور قیامت تک پڑھا جاتا رہے گا، دن رات یہاں یہی شغل رہتا ہے، ان نظاروں کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر ہے ؎

واہ اس محفل رنگیں کی جھلک سب کو　　　　اور اسی بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو

(۶) انھیں دیکھ کر بے ساختہ ... مدینہ منورہ کی عید، عید تو آپ نے نہ معلوم کتنی بار کی ہوگی اور کس طرح

کی ہوگی، اب مدینہ منورہ کی عید دیکھیے۔ رات ہی سے دکانیں کھل گئی ہیں، گھر گھر، در در خوشیاں منائی جارہی ہیں کھجور کی دکانوں پر میلا لگا ہو، فطرے کیلیے سیکڑوں آدمی کھجور خرید رہے ہیں، صرافوں کی دکانیں کھلی ہیں، نوٹوں سے روپے اور روپوں کی ریزگاری بھنائی جارہی ہو، بازار مٹھائیوں، پھلوں سے بھرا پڑا ہو، سورج نکلنے سے قریباً ۲۰ منٹ بعد نماز عید ہوتی ہو، نماز فجر ہی سے مسجد بھر جاتی ہو، نماز عید عربی وقت سے الساعۃ ۴۴ منٹ پر ہوتی ہو۔

مسجد نبوی آج لوگوں سے اتنی پُر ہو کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں، زرق برق لباسوں سے ملبوس عرب اور غیر عرب، غریب و امیر آتے جاتے نظر آرہے ہیں، عطر اور خوشبو کی مہک سے گلیاں معطر، باب السلام سے باب النساء اور محراب عثمانی سے باب مجیدی تک سرہی سر دکھائی دے رہے ہیں، اس اژدہام کے باوجود سکون و سکوت طاری ہو۔

مواجہ شریف چلیے اور سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دیجیے معلوم ہوتا ہو کہ ہم سب عیدی لینے آئے ہیں، اس وقت کا سلام جس درد اور خوشی سے پڑھا رہا ہو اس کی کیفیت اسی در پر نظر آسکتی ہو جسے دیکھیے آنکھوں میں آنسو بھرے سلام کا گلدستہ پیش کر رہا ہو۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

جی چاہتا ہو کہ کسی طرح جالیوں سے لپٹ لپٹ کر روئیں اور قربان ہوں ؎

فدا ہوں آپ کی کس کس ادا پر
ادائیں لاکھ اور بیتاب دل ایک

نماز ختم ہو چکی ہو، مبارکبادیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہو، جسے دیکھو خوشی و مسرت کا پیام دوستوں اور احباب، چھوٹوں، بڑوں، کو دے رہا ہو، خوشی و مسرت سے تمام چہرے کھلے ہیں، خوشبو سے گلی گلی مہک رہی ہو۔ مواجہ شریف کا اژدہام بڑھتا جارہا ہو، آج عجیب حال ہو ایک پر ایک ٹوٹا پڑتا ہو، شعرا نعت پڑھ رہے ہیں، کسی زبان پر سلام کا ایسا سلسلہ ہو جو ختم ہونے میں نہیں آتا، کوئی ٹوٹے پھوٹے سیدھے سادے الفاظ میں مگر بڑے اخلاص اور سوز کے ساتھ سلام عرض کرتا ہو، کوئی بلک بلک کر رو رہا ہو اور کوئی صرف آنسو گراتے ہوئے خاموشی کی زبان سے اپنی بپتا سنا رہا ہو ؎

سلام علی انوار طلعتک التی
اعیش بہا شکراً وافنی بہا وجدا

چند تجربے اور مشورے

(از جناب مولانا الحاج محمد اویس صاحب ندوی نگرامی)

(۱) اللہ تعالیٰ جس مسلمان کو حج بیت اللہ اور زیارت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توفیق نصیب فرمائے اس کو چاہیے کہ اس مبارک سفر کے لیے ایسے مال کا انتظام کرے جو حلال، پاکیزہ ہو اور زکوٰۃ ادا کی جا چکی ہو جو مال طیب اور حلال نہ ہو کسی وقت میں بھی اس کو اپنے استعمال میں لانا درست نہیں ہے، بالخصوص ایسے مبارک سفر میں اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، پچھلے سال مجھکو اسلامی جہاز پر دو ایسے دوستوں سے ملاقات کا اتفاق ہوا جو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ حرمین شریفین کے لیے سفر کر رہے تھے، لیکن انھوں نے اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں ادا کی تھی۔ بعد کو سمجھانے سے کم از کم اس رقم کی زکوٰۃ کی ادائیگی کا ارادہ کرلیا تھا جس کو وہ سفر حج کے لیے لے کر گھر سے نکلے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ سے زکوٰۃ کا باقاعدہ انتظام رکھیں گے۔

(۲) سفر حج کے لیے مصارف سفر کے انتظام میں، سامان سفر کی درستگی میں اعزا اور احباب سے ملنے میں، دعوتوں کے کھانے میں، عازمین بیت اللہ کا بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ کاش اس کا آدھا وقت بھی وہ مسائل حج کے سیکھنے اور اس کے سمجھنے میں صرف کرتے تو ان کے حق میں بہت مفید ہوتا! عموماً حجاج یہاں اس بھروسے پر جاتے ہیں کہ حجاز میں معلمین حج کرادیں گے۔ حالانکہ معلمین موسم حج میں اس قدر مشغول ہوتے ہیں کہ ان کے لیے یا ان کے رفقا کے لیے آسان نہیں ہے کہ وہ ہر حاجی کو مسنون طریقہ پر ارکان حج ادا کرادیں۔ اس لیے جب تک حاجی خود صحیح طریقہ پر ارکان حج کی ادائیگی کا اہتمام نہ کرے گا اسکو سنت کے مطابق حج کرنا مشکل ہے۔ پچھلے سال حج کے موقع پر متعدد ایسے واقعات میرے سامنے آئے جن سے اندازہ ہوا کہ یا تو معلمین اور ان کے رفقا مسائل حج سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے ہیں، یا اگر واقف ہوتے ہیں تو ان کے ادائیگی میں اس درجہ تساہلی اور غفلت سے کام لیتے ہیں جو انتہائی دردناک ہوتا ہے۔ اس لیے میری گذارش ہے کہ ارکان حج کی ادائیگی میں محض معلمین

پر ہرگز ہرگز بھروسہ نہ کیا جائے بلکہ خود ہی حج کے مسائل کو پوری طرح سیکھ لیا جاوے اور اگر حاجی تعلیم یافتہ ہے تو مناسک حج پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو بار بار پڑھ لے۔ اردو تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے مناسک حج میں **معلم الحجاج** بہترین کتاب ہے۔

معلمین کی ضرورت ارکان حج کی ادائیگی میں بہرحال پڑے گی، مثلاً یہ کہ اگر آپ کو مسائل حج معلوم ہیں تب بھی مقامات نہیں معلوم ہیں۔ اس لیے ایسے موقعوں پر معلمین یا ان کے رفقا کے بغیر چارہ کار نہیں، مگر نفس مسائل کی ادائیگی میں آپ کو مضبوطی سے ان طریقوں پر جمنا چاہیے جو آپ نے مستند کتابوں میں پڑھا ہے۔ یا مستند عالموں سے سیکھا ہے۔ معلمین یا ان کے رفقا خواہ کتنا ہی آپ کی روش پر برافروختہ ہوں۔

(۳) سفر حج کی ابتدا سے لے کر انتہا تک یہ منظر انتہائی اندوہناک ہوتا ہے کہ عموماً حجاج آداب سفر کا لحاظ نہیں فرماتے ہیں، جو باتیں عام حالات میں بھی نامناسب ہوتی ہیں اس مبارک سفر میں بھی وہ باتیں عادت کی بنا پر برملا ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

پچھلے سال لکھنؤ اسٹیشن پر جبکہ حجاج کا بڑا قافلہ بمبئی کے لیے روانہ ہو رہا تھا، یہ واقعہ دیکھنے میں آیا کہ ایک قافلہ نے ریل کا ڈبہ رزرو کرالیا تھا۔ لیکن جیسے ہی ریل اسٹیشن پر پہونچی تو ان حجاج نے اس ڈبہ پر قبضہ کرلیا جنھوں نے ریزرو نہیں کرایا تھا۔ بار بار بتلانے پر بھی ان لوگوں نے ان جگہوں کو نہیں چھوڑا، اس پر کافی تلخی بھی پیدا ہوگئی تھی۔ اسی طرح واپسی میں جدہ میں علوی جہاز پر جگہ حاصل کرنے کے لیے حجاج میں اس قدر سخت ہنگامہ ہوا کہ مارپیٹ کی نوبت آگئی اس جنگ میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شریک تھیں۔

بمبئی میں مسافر خانوں میں، اور آمد و رفت میں جہاز میں جگہ حاصل کرنے کے لیے، اور حجاز میں موٹروں اور اونٹوں پر اور منیٰ اور عرفات میں جگہوں پر قبضہ کرنے کے موقع پر، نیز دوسرے ایسے مواقع پر اس قسم کی بدعنوانیاں عموماً ہوتی رہتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر حجاج بار بار سفر حج کے آداب اور حج کی عظمتوں کو ذہن نشین کرتے رہیں۔ اور حج کے مفہوم اور مقصد پر برابر غور کرتے رہیں تو انشاء اللہ یہ مبارک سفر اپنے آداب کے ساتھ طے ہو جائے گا اور اس کی برکتیں نصیب میں آئیں گی۔

(۴) جہاز جس وقت جدہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوگا اسی وقت سے حجازیوں کا اور حجاج کا

ایک دوسرے سے سابقہ پڑنا شروع ہو جائے گا اور پھر آخر میں واپسی کے وقت جدہ کے ساحل ہی پر یہ ساتھ ختم ہوگا۔

حجازیوں میں جن لوگوں سے عموماً حاجیوں کا سابقہ پڑتا ہے وہ کشتی والے، مزدور، اونٹ والے یا موٹر والے، ڈرائیور، معلم، مزور، وکیل، اور ان لوگوں کے کارندے، اور سائل ہوتے ہیں۔ حاجیوں کو چاہیے کہ وہ ان سب کو بھی اپنا ہی جیسا انسان سمجھیں۔ اور خواہ مخواہ کے لیے ضرورت سے زیادہ حسن ظن کو دخل نہ دیں، ان میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی، نرم مزاج بھی ہیں اور سخت مزاج بھی ہیں، بے غرض بھی ہیں اور لالچی بھی! حجاج عام طور پر یہ خیال لے کر جاتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ میں سب اولیاء اللہ ہی بستے ہیں۔ مگر جب معاملات پڑتے ہیں تب وہ حیرت زدہ ہو جاتے ہیں اور بعض وقت نہایت مکروہ فقرے زبان سے نکال ڈالتے ہیں۔ اگر وہ شروع ہی سے اس قدر حسن ظن کو دخل نہ دیں تو یہ صورت حال نہ پیدا ہو۔ نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ محض ان طبقوں پر بقیہ دوسرے مکہ مدینہ والوں کو ہرگز نہ قیاس کرنا چاہیے۔ ہم لوگ جن کو اپنی تہذیب، تمدن، اور معاشرت و اخلاق پر بڑا ناز ہے۔ وہ اہل مکہ اور اہل مدینہ کی تہذیب، معاشرت اور ان کی اخلاق و تمدن کو پا نہیں سکتے! عام حاجیوں کو اس طبقہ کے لوگوں سے سابقہ ہی نہیں پڑتا ہے۔ وہ تو چند مخصوص لوگوں کے درمیان گھرے رہتے ہیں۔ یہ بات اس لیے کھول کر بیان کرنا پڑی تاکہ عام حجاج عام اہل مکہ اور اہل مدینہ کے حقوق اور ان کے مراتب کا لحاظ رکھ سکیں اور اس معاملہ میں ان سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔

(۴) حجاج کو خصوصیت کے ساتھ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ وہ عام اہل مکہ، اہل مدینہ یا اسی طرح دوسرے ممالک اسلامیہ سے آئے ہوئے عام حجاج کی ہر بات میں تقلید کی کوشش نہ کریں۔ جس طرح ہمارے ہندوستان میں عوام دین سے ناواقف ہیں اور عموماً ان کا ہر عمل شریعت کے مطابق نہیں ہوتا ہے اس لیے بے سمجھے ہوئے ان کی ہر بات کی نقل اتارنا کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ اس لیے نماز، مناسک حج، وضع قطع، صورت شکل، اور دوسرے معاملات میں ان طریقوں کو چھوڑنا درست نہیں ہے، جن کو ہم نے مستند کتابوں میں پڑھا ہے، یا مستند علماء سے سیکھا ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ حج کے موقع پر دنیائے اسلام کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ان کے مسلک مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی حنفی ہوتا ہے کوئی شافعی، کوئی مالکی، کوئی حنبلی، کوئی ظاہری،

شیعہ صاحبان بھی ہوتے ہیں، اب اگر ہم خواہ مخواہ سب کی نقل اتارنا شروع کریں تو بس اسی کے ہو رہیں گے اس لیے ان معاملات میں بہت احتیاط چاہیے۔

(۵) مکۂ معظمہ کے زمانۂ قیام میں عموماً لوگ سیر و تفریح میں پڑ جاتے ہیں۔ بے شبہ جو متبرک مقامات ہیں ان کی زیارت سے نفع اندوز ہونا چاہیے۔ مگر زیادہ وقت مسجد حرام میں اور خانۂ کعبہ کے طواف میں صرف کرنا چاہیے۔ یہ دولت ہر شخص کو بار بار نہیں ملتی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ کعبہ صفا، مروہ، زمزم، منیٰ، عرفات، اور مزدلفہ کی عظمتوں، برکتوں اور ان کے فضائل کا جس قدر خیال غالب رہے گا، اور دینی اعتبار سے ان مقامات کی تاریخ جس قدر معلوم ہوگی اسی قدر کیفیت پیدا ہوگا، مناسک صحیح طور سے ادا ہوں گے۔ اور ان شاء اللہ برکات معنوی سے انسان بہرہ اندوز ہوگا۔ اس لیے اس وقت کو ضائع نہ کرنا چاہیے اور قلب و قالب کو حق تعالیٰ کی یاد میں لگانا چاہیے۔ جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں وہ مستند کتابوں کے ذریعہ ورنہ پڑھے لکھے لوگوں سے ان مقامات کی بلندی کا حال معلوم کر کے ان کی پوری قدر کرنا چاہیے۔

اسی طرح مدینۂ طیبہ میں حاضری کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل مناقب حضور کی عظمتوں اور امت کے حال پر حضور کی شفقتوں کا استحضار رہنا چاہیے، مسجد نبوی کے آداب کا دھیان رہنا چاہیے۔ جس قدر ان امور کا خیال غالب رہے گا ان شاء اللہ حقوق میں کوتاہی نہ ہوگی اور برکات محسوس طور پر حاصل ہوں گے۔

ایک بڑی کوتاہی روضۂ مبارک پر حاضری کے وقت لوگوں سے یہ ہوتی ہے کہ مزدور کے ساتھ زور و شور سے صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں اور ان تمام آداب جو اس موقع پر برتنا چاہئیں ان سے غفلت کرتے ہیں۔ خوب سمجھنا چاہیے یہ بڑے ادب کا مقام ہے۔ ایسا کوئی فعل جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء کا باعث ہو اس سے قطعی پرہیز کرنا چاہیے۔

(۶) حجاج کی خدمت میں میری آخری معروضات یہ ہیں کہ سامان سفر کم، مگر اپنی ضرورت کے اعتبار سے پورا ضرور لینا چاہیے۔ عمارت میں نہ تو فضول خرچی کی جائے اور نہ جز رسی سے کام لیا جائے میں نے دیکھا ہے کہ لوگ بے موقع بہت خرچ کرتے ہیں اور موقع پر خست سے کام لیتے ہیں۔ جس کی وجہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح اگر لوگ اپنے کو صبر کا عادی بنائیں اور بہت جلد پریشان نہ ہو جایا کریں،

تو بڑی حد تک وہ آرام پا سکیں گے۔ جہاز میں چڑھنے کے وقت اور اترنے کے وقت عجب سراسیگی کا عالم ہوتا ہے۔ حالاں کہ خوب معلوم ہے کہ جہاز تمام حجاج کو لیے بغیر اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے گا۔ اسی طرح جدہ سے مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کے سفر کے وقت نیز منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کی روانگی کے وقت لوگ اپنے کو قابو میں رکھیں اور خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں تو انشاء اللہ کوئی مشکل پیش نہ آئے گی، بحمد اللہ کہ مجھے کسی موقع پر کوئی زحمت نہیں پیش آئی۔ صرف ایک وقت ایسا ضرور آیا کہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے مجھ کو تھوڑی دیر کے لیے الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ وہ موقعہ مزدلفہ کی رات کا تھا۔ عرفات سے مغرب کے وقت تمام حجاج آکر مزدلفہ میں قیام کرتے ہیں۔ چند گھنٹوں کے لیے لاکھوں آدمیوں کا مجمع ایک مقام پر جمع ہو جاتا ہے۔ رات کا وقت اجنبی مقام، پانی کہاں ملے؟ کھانا کہاں ملے؟ کسی طرف جانے کا راستہ نہیں، اور اگر آپ چلے بھی گئے تو اپنے رفقاء تک واپس آجانا اور ان کو اس مجمع میں تلاش کر لینا مشکل! اگر ہم لوگ عرفات ہی سے اونٹ یا لاری پر اپنے ہمراہ پانی لیتے آتے تو کوئی زحمت نہ ہوتی، خدا کے فضل و کرم سے پانی ملا، مگر کافی انتظار اور زحمت کے بعد! اس لیے میرا مشورہ ہو کہ حجاج مزدلفہ کے لیے عرفات ہی سے تیار ہو کر جایا کریں۔

اسی طرح سفر حج میں اچھے رفقاء ضرور تلاش کریں، اچھے رفقاء خدا کی بڑی نعمت ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس دولت سے پوری طرح سرفراز کیا گیا تھا، اول سے آخر تک میرے سفر کے رفیق حاجی محمد نسیم صاحب نگرامی اور حاجی عبدالمجید صاحب نگرامی تھے۔ ان حضرات نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ میرے ذمہ ان لوگوں کا کوئی حق نہیں ہو۔ البتہ ان کے ذمہ میرے تمام حقوق ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم لوگوں کے تعلقات بحمد اللہ بڑھتے ہی گئے غالباً ایسی رفاقت کی مثالیں کم ملیں گی۔ الحمد للہ علیٰ ذالک!

بہرحال اچھے رفقاء تلاش کیے جائیں نیز ان کے جذبات کا ہر دم احترام کیا جائے اور اپنے ذمہ بھی ان کے حقوق سمجھے جائیں۔ تو انشاء اللہ سفر میں بہت آسانی ہو گی۔

عازمین حج کو چند مشورے

اور

ضروری اطلاعات

(از جناب حاجی احمد عبد اللہ صاحب چیرمین پورٹ حج کمیٹی بمبئی)

حج کا ارادہ کرنے والے ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ پہلے سے اپنے ٹکٹ کا انتظام کرے، اس کے لیے مغل لائن لمیٹڈ بنک اسٹریٹ فورٹ بمبئی، اور سندھیا اسٹیم نیوی گیشن بلارڈ اسٹیٹ بمبئی، یہ دو کمپنیاں ہیں، ان میں سے کسی ایک کو درخواست بھیجنی چاہیے۔ درخواست میں نام، ولدیت، عمر اور پورا پتہ تحریر کرنا ضروری ہے (احتیاطاً اس درخواست کی ایک نقل پورٹ حج کمیٹی بمبئی متصل کرافرڈ مارکیٹ کو بھیجی جائے تو بہتر ہے)، کمپنی کی طرف سے جواب آنے پر حسب تصریح بمبئی آجانا چاہیے۔ بمبئی میں حجاج کے قیام کے لیے دو مسافر خانے ہیں۔ ایک صابو صدیق مسافر خانہ متصل کرافرڈ مارکیٹ اور دوسرا واڑی بندر مسافر خانہ جعفر سلیمان۔ اول الذکر مسافر خانہ میں حج کمیٹی اور جہاز راں کمپنی کے دفتر ہیں، ٹیکہ اور انجکشن کے ڈاکٹر بھی یہاں ہوتے ہیں۔ احرام و کفن کا کپڑا اور غلہ بھی اسی مسافر خانہ میں سرکاری دام سے دستیاب ہو سکتا ہے، موسم حج میں یہ دونوں مسافر خانے ناکافی اور تنگ ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے حجاج کو دیگر جماعت خانوں میں جو میمن قوم کے ہیں نیز قیصر باغ وغیرہ میں ٹھہرانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بہت سے حجاج اپنے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس بھی ٹھہرتے ہیں، (اگر حجاج کے ساتھ غیر حاجی کم آئیں تو بہتر ہے)

اس سال نئے بین الملی قانون کے ماتحت ٹیکہ پندرہ روز قبل کا ہونا چاہیے۔ آپ اپنے ہاں کے لوکل بورڈ یا سرجن کے دفتر سے ٹیکہ لگوائیں اور مستند ڈاکٹر جو ایم، ڈی M.D یا کم از کم ایم، بی، ایس M.B.B.S. ہو اس ڈاکٹر سے ہیضہ کی سوئی لگوائیں، دوسرے ڈاکٹر سے

لگوائی گئی تو وہ تسلیم نہیں کی جائے گی اور پھر سے دوبارہ لگوانی پڑے گی۔ ٹیکہ اور سوئی لگ جانے کے بعد آپ کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ اگر ہو سکے تو اپنے ہاں سے حج کا پاسپورٹ بھی حاصل کر لیجیے۔ پاسپورٹ میں تصویر کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ان سب کاموں سے آپ فارغ ہو گئے ہیں تو جہاز کے روانہ ہونے سے صرف دو تین روز قبل آپ بمبئی تشریف لے آئیں۔ اور کپڑا و غلہ خرید لیں۔ سامان ٹھیک کر لیں ٹکٹ حاصل کر لیں، اس سال سعودی ٹیکس بھی یہاں بمبئی ہی میں وصول کر لیا جائے گا۔ اور جب تک سعودی ٹیکس ادا نہیں ہو گا آپ کے پاسپورٹ پر "ویزا" نہیں ہو گی اور ٹکٹ نہیں ملے گا۔

حج کمیٹی نے اس کے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ نیدرلینڈ بنک والے اپنے نمائندہ کو حج کمیٹی بمبئی کے دفتر میں بٹھا دیں گے جو روپیہ وصول کر کے رسید دے گا۔

فی حاجی ڈیک کلاس کا ٹکٹ ساڑھے چار سو روپیہ ہو اور تین سو تہتر چھ آنہ سعودی ٹیکس ادا کرنے کے بعد صرف ۱۴۰۰ (چودہ سو) روپیہ نقد ساتھ لے جانے کی اجازت ہے، مزید برآں چار ہزار تک کا بنک ڈرافٹ بھی لے جا سکتے ہیں۔ اگر ٹکٹ نصف ہو گا تو دو ہزار کا بنک ڈرافٹ لے جا سکتے ہیں۔ یہ ڈرافٹ بھی بذریعہ حج کمیٹی بنک والوں سے آپ کو بآسانی حاصل ہو جائے گا۔ آپ کو بنک تک جانے کی ضرورت نہ ہو گی۔

فرسٹ کلاس کا ٹکٹ جن کا ہو گا انھیں اپنے ساتھ نقد ۲۲۰۰ (دو ہزار دو سو) روپیہ لے جانے کی اجازت ہو اور بنک ڈرافٹ حسب مذکور مزید برآں لیجا سکتے ہیں۔ البتہ نقدی زیادہ نہیں لے جا سکتے۔

جب آپ بمبئی میں ان تمام امور سے فراغت حاصل کر لیں تو اب اپنے سامان پر اپنا نشان یا پورا نام و پتہ لکھیے اور پکے رنگ سے لکھیے تاکہ کہیں گم ہو جائے تو آپ کے پتہ پر پہونچ جائے۔ غلہ کی بوریوں پر پورا نام بڑے حروف میں لکھیے۔ حجاج کو الوداع کہنے کے لیے جہاں تک ہو سکے کم سے کم لوگ آئیں اولاً تو اس لیے کہ یہاں مسافر خانہ میں غیر حاجی کو ٹھہرانے کی اجازت نہیں ہو۔ دوسرے یہ کہ آنے والوں کی وجہ سے آپ بہت سے اپنے کام وقت پر انجام نہیں دے سکتے۔ قلت مکان کی وجہ سے بھی آپ اور وہ پریشان ہی ہوں گے۔ آپ کے کام میں مدد کرنے کے لیے انجمن خدام النبی بمبئی کے اراکین ہر وقت مسافر خانہ میں کمربستہ تیار رہتے ہیں وہ آپ کو آپ کے کاموں میں ہر ممکن سہولت پہونچائیں گے۔

حج کمیٹی کی نگرانی میں جہاز پر جگہ حساب سے تقسیم ہوتی ہو۔ جو حاجی کو ان کے مزدور کے

ذریعہ ملتی ہے۔ فی حاجی پانچ روپیہ مزدوری کی شرح مقرر ہے اور اس میں فی حاجی پانچ چیزیں شمار کی جاتی ہیں۔ صندوق، بستر، ٹوکرا، کھٹیا اور غلہ کی بوری۔

جہاز میں ایک صاحب کو امیر الحجاج بنایا جاتا ہے جس کا تقرر حج کمیٹی کرتی ہے اور وہ عام حجاج اور کپتان کے درمیان سفیر کا کام کرتا ہے۔ آپ اپنی شکایات امیر الحجاج کے پاس پہونچائیں کیوں کہ وہ اپنی رپورٹ تیار کر کے ہندوستان قونصل مقیم جدہ کے حوالہ کرتا ہے۔ وہاں سے بذریعہ حج کمیٹی وہ حکومت ہند کو پہونچائی جاتی ہے۔

بعض حجاج ناواقفی کی بنا پر اپنے ساتھ سونا یا اشرفیاں لے جاتے ہیں اس میں انہیں کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ حکومت کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہے دوسرے یہ کہ وہاں حجاز میں سونے کا بھاؤ کم ہے مثلاً اشرفی کا ہندوستان میں ۷۵، پچھتر روپیہ ہے تو وہاں اس کا ساٹھ روپیہ ہے۔

جدہ میں کسٹم کی کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن اگر کسٹم والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کے پاس کوئی تجارتی مال ہے تو علاوہ ڈیوٹی کے آپ پر جرمانہ ہوگا۔

جدہ میں جہاز بالکل بندر پر کنارہ نہیں لگتا بلکہ موٹر بوٹ، لانچ اور کشتیاں جہاز کے پاس آتی ہیں اور سامان اتارنے والے مزدور بھی آتے ہیں، پہلے ڈاکٹر آجاتے ہیں۔ ان کے پاس کرنے کے بعد انڈین قونصل، جہاز راں کمپنی والے، مزدوروں کے ٹھیکہ دار اور مزدور آتے ہیں، اور سامان اور حجاج کو کشتی یا لانچ میں بٹھا کر لے جایا جاتا ہے۔ کشتی کے کرائے کے پیسے ٹکٹ کے ہمراہ لے لیے جاتے ہیں پھر بھی وہاں وصول کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر موٹر لانچ کے فی کس ڈھائی روپے لیے جاتے ہیں پوری لانچ کے سوا سو روپے لیے جاتے ہیں اور کشتی کے پندرہ بیس روپے لیتے ہیں۔ جدہ میں معلمین کے وکیل رہتے ہیں وہ کسٹم پر یعنی گودی میں آپ کو لینے کے لیے آتے ہیں۔ آپ سے پاسپورٹ لیکر آپ کو اپنی جگہ پر لے جاتے ہیں۔ وہاں سے موٹر کا انتظام کیا جاتا ہے۔ گذشتہ سال تو ٹیکس کے پیسے لینے دینے میں کافی وقت صرف ہوتا تھا مگر اب اس سال تو یہ روپیہ بمبئی ہی میں وصول کر لیا جائے گا اس لیے وہاں یہ خرخشہ باقی نہیں ہوگا۔

موٹر چار قسم کے ہیں (۱) چھوٹی موٹر جس میں چار سواری آسکتی ہیں۔ (۲) موٹر بس (۳) لاری

اور (۴) کھلی لاری۔ اگر آپ پوری موٹر یا لاری ریزرو کرنا چاہیں تو پوری موٹر یا لاری کے روپے ادا کر دینے سے ایسا ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح منیٰ و عرفات کے لیے بھی موٹر کا انتظام وہاں مکہ میں کیا جا سکتا ہے۔ جدہ سے مکہ پہونچنے پر معلم کے ذریعہ طواف سعی سے فارغ ہونے کے بعد مکان کا انتظام کیا جائے گا۔ کرایہ موٹر کی شرح حسب ذیل ہے۔

	جدہ سے مکہ تک	عرفات	مدینہ
چھوٹی موٹر کے	۶۰ روپیہ	۹۰	۲۴۰
موٹر بس	۳۰ ؍	۴۵	۱۲۰
لاری	۲۰ ؍	۳۰	۸۰
کھلی لاری	۱۰ ؍	۱۵	۴۰
اونٹ مع شغدف	۲۱ ؍	۹۶	۸۲

جدہ، مکہ، اور مدینہ میں حکومت سعودیہ کی طرف سے حج کمیٹی مقرر کی گئی ہے، اگر کوئی شکایت ہو تو ان تک پہونچانی چاہیے۔ انڈین قونصل کے پاس بھی شکایت پہونچانے سے فائدہ ہوگا، ان کو ٹیلیفون سے بھی خبر کر سکتے ہیں۔ جدہ میں اترتے وقت اور واپسی کے وقت حجاج منزل سے بھی کافی مستفید ہو سکتے ہیں۔ والسلام۔

حجاج میں تبلیغی و تعلیمی کام کی ضرورت

اور

اُس کا طریقِ کار

(از۔ محمد منظور نعمانی)

گذشتہ سال (۱۳۶۷ھ) حج کو جانے والے بعض بڑے بڑے قافلوں میں کچھ تبلیغی کام کرنے کا اتفاق ہوا تو اپنی عمر میں پہلی مرتبہ یہ اندازہ کر کے بڑا دکھ ہوا کہ فی زمانناً جو لوگ حج کو جاتے ہیں اُن میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو دین کی ضروری اور بنیادی باتوں سے بھی ناواقف ہوتے ہیں، حتیٰ کہ اُن کو صحیح طور پر کلمہ پڑھنا بھی نہیں آتا، اور عملی حالت بھی اُن بیچاروں کی یہ ہوتی ہے کہ حج کے سفر میں بھی وہ نماز کے پورے پابند نہیں ہوتے، بلکہ بہت سوں کو صحیح طور سے نماز پڑھنا آتا بھی نہیں —— اور چونکہ اُن لوگوں کو اپنی اس حالت کا احساس بھی نہیں ہوتا اور اپنی اصلاح کی کوئی فکر نہیں ہوتی، اس لئے یہ بیچارے دین سے جیسے ناواقف جاتے ہیں ویسے ہی واپس آجاتے ہیں۔

اسی طرح ہزاروں حج کو جانے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دین سے اگرچہ اتنے ناواقف نہیں ہوتے، اور ان کی عملی حالت بھی اتنی خراب نہیں ہوتی بلکہ دینی معلومات بھی اُن کو حاصل ہوتے ہیں اور اُن کی زندگی بھی کسی درجے میں دیندارانہ زندگی ہوتی ہے، لیکن چونکہ حج کا زمانہ جس طرح اور جن مشاغل میں اور جن احتیاطوں کے ساتھ گزرنا چاہئے چونکہ وہ اُن کا پورا اہتمام نہیں کرتے اور پہلے سے حج کی برکات کیلئے اپنے کو تیار نہیں کرتے، اس لئے حج کی خاص برکات اور کیفیات سے وہ بھی محروم رہ جاتے ہیں اور اُن کا حال یہ ہوتا ہے، کہ ؎

بطوافِ کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندادند		کہ بروںِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

حالانکہ حج و زیارت کا یہ سفر ایسا مبارک سفر ہے اور اللہ تعالیٰ جن بندوں کو نصیب فرمائے اُن کے لئے یہ ایسا بہترین موقع ہے کہ اگر اس مقدس سفر میں اپنی اصلاح و درستی کا پہلے سے ارادہ کرلیا جائے اور اس کے لئے مندرجۂ ذیل طریقہ پر کوشش کی جائے تو انشاء اللہ بڑی آسانی سے اتنا ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنی عمر میں دین سیکھنے اور اپنی زندگی کو دینی زندگی بنانے کا موقع نصیب نہیں ہوا وہ صرف اس سفر ہی میں ضروری درجہ کی دینی تعلیم و تربیت حاصل کر کے اپنے کو ایک خدا شناس اور سچا مسلمان بنا سکتے ہیں ——— اور جو لوگ پہلے سے بحمد اللہ دین سے واقف اور کسی درجہ کے دیندار ہیں وہ دین میں ایسی ترقیاں اور وہ مقامات حاصل کر سکتے ہیں جن کا وہ تصور بھی نہیں رکھتے ہیں۔

طریقۂ کار!

(۱) ایک شہر یا ایک ضلع یا ایک علاقہ سے جانے والے حجاج اپنا ایک جماعتی نظام بنالیں اور اُن میں جو شخص دین کا زیادہ جاننے والا اور نیک صالح ہو اُس کو اپنا دینی معلم بنالیں ——— اور اگر بالفرض اپنے ساتھیوں میں کوئی اس قابل نہ ہو تو دوسرے مقامات کے حاجیوں میں سے کسی ایسے شخص کو اپنا معلّم (یعنی دینی باتیں بتلانے اور سکھانے والا) بنالیں، یا کسی دوسری جگہ کے حاجیوں کے تعلیمی و تربیتی نظام میں شریک ہو جائیں اور پورے سفر میں دینی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھیں۔

(اس تعلیم و تربیت کا طریقہ وہ رہے جو "تبلیغی جماعتوں" کا ہوتا ہے، کیونکہ مختلف درجہ کے لوگوں کی عمومی اور ضروری دینی تعلیم و تربیت کا وہی بہترین اور سہل ترین طریقہ ہے[1])۔

(۲) ہندوستان اور پاکستان سے جانے والے حاجیوں کو بمبئی اور کراچی میں تبلیغی کام کرنے والی جماعتیں انشاء اللہ برابر ملیں گی اور اُمید ہے کہ ہر جہاز میں بھی کوئی نہ کوئی جماعت

---

[1] تبلیغی جماعتوں کا طریقۂ کار اور اُنکے تبلیغی کام کے مقاصد اور اصول سے تفصیلی واقفیت کیلئے رسالہ "دعوتِ اصلاح و تبلیغ" دیکھنا چاہئے۔ اور پوری واقفیت کسی تجربہ کار اور سلیقہ رکھنے والی جماعت کیساتھ کام میں شریک ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کام کی کرنے والی اور اس کے اصول اور طریقے کے جاننے والی ان کے رفیقِ سفر ہو گی پس ان جماعتوں سے آپ رابط و تعلق رکھیں، اور اُن کے ساتھ رہ کر دینی فائدہ حاصل کریں۔ یہ جماعتیں محض لوجہ اللہ اس سلسلہ میں آپ کی پوری خدمت کریں گی، اور یہ لوگ آپ کے اچھے رفیق ثابت ہونگے۔

(۳) حج کو جانے والوں میں جو حضرات ایسے ہوں جن سے عام جانے والوں کو دین کی تعلیم و تربیت کا فائدہ پہنچ سکتا ہے، اُنھیں چاہئے کہ وہ اس کو اعلیٰ درجہ کی عبادت سمجھتے ہوئے اللہ کے بندوں کو زیادہ سے زیادہ دینی فائدہ پہنچانے کی کوشش فرمائیں، یہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے وارثوں نائبوں کی خاص عبادت ہے جس کا ثواب اکثر حالات میں نفلوں سے اور اوراد و اذکار سے زیادہ ہوتا ہے۔

(۴) ہر عازم حج کو چاہئے کہ اس مقدس سفر میں گناہ کے سب کاموں سے بلکہ فضول اور بے کار باتوں سے بچنے کی پوری کوشش کرے، اور جو وقت اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہو وہ یا تو دین سیکھنے سکھانے میں (خصوصاً حج کے ارکان اور زیارت کے آداب کی تعلیم و تعلم میں) صرف کرے[1] یا اللہ کی عبادت اور اُس کے ذکر و فکر میں مشغول رہے، یا اچھی دینی کتابوں کے پڑھنے یا دوسروں کو اُن کے مضامین سنانے میں اپنا وقت صرف کرے۔

[ضروری دینی معلومات حاصل کرنے اور دین کے جذبات پیدا کرنے کے لئے مندرجۂ ذیل چند کتابوں کا مشورہ خصوصیت سے دیا جا سکتا ہے]۔

"حیات المسلمین" "ارکان اسلام" "اسلام کیا ہے؟" "فضائلِ نماز"
"فضائلِ حج" "فضائلِ ذکر" "فضائلِ قرآن" "حکایاتِ صحابہؓ"

(۵) بار بار دھیان کر کے اللہ کی عظمت و محبت اور اُس کا خوف دل میں بٹھانے کی کوشش کی جائے۔

(۶) تمام جائز اور اچھے مقاصد کے لئے اس سفر میں کثرت سے دعائیں کی جائیں، اللہ سے

---

[1] حج و زیارت سے متعلق مسائل و آداب پر اردو میں بہت سی اچھی اچھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ فضائلِ حج[1] اور معلم الحجاج[2] یا رفیقِ حج[3] اگر کسی کے پاس ہوں تو وہ کافی ہیں۔ پڑھے لکھے حضرات کو کم از کم یہ کتابیں اپنے ساتھ ضرور رکھنی چاہئیں۔

دعا کرنا اعلیٰ درجے کی عبادت ہے، اور اس پاک سفر میں دعاؤں کی قبولیت کی امید بھی زیادہ ہے۔

(۷) ہر جانے والے کو اچھی طرح خیال رکھنا چاہئے کہ میرا یہ سفر اللہ کے واسطے ہے اور اس کے مقدس گھر کی حاضری اور حضورِ انور کی مسجد شریف اور آپ کے روضۂ اطہر کی زیارت کے لئے ہے، اور میرے ساتھ جو اور جانے والے ہیں وہ سب بھی اسی مقصد سے جا رہے ہیں اور یہ سب اللہ و رسول کے مہمان ہیں لہٰذا میری ذات سے ان میں سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، بلکہ جہاں تک ہو سکے میں دوسروں کو آرام پہنچاؤں چاہے مجھے تکلیف اٹھانی پڑے۔ شائد اللہ اسی عمل سے راضی ہو جائے کہ میں نے خود تکلیف اٹھا کے مہمانوں کو آرام پہنچایا، اور شائد اسی عمل کی برکت سے میرا حج قبول ہو جائے ——
حاجیوں سے اس معاملہ میں عموماً بڑی کوتاہی ہوتی ہے اور ہر شخص نفسی نفسی میں گرفتار ہو کر اپنے آرام اور اپنے فائدے کے لئے دوسروں کو دکھ اور نقصان پہنچانے سے پرہیز نہیں کرتا ——
یہ چیز حج کے لئے زہر ہے اور اس سے حج کے برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے، لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ وہ پہلے سے اپنے نفس کو اس کے لئے تیار کر لے کہ میں اپنے آرام کے لئے دوسروں کو تکلیف نہیں دوں گا۔ یہ بات ذرا مشکل ضرور ہے لیکن اللہ کے یہاں اس کا درجہ بہت بلند ہے اور اللہ کے جو بندے اس سفر میں ایسا کریں گے اُن کے متعلق پوری امید ہے کہ حق تعالیٰ اُن کے حج کو خاص طور سے قبول فرمائے گا اور انھیں دین کی بڑی دولتوں اور برکتوں سے نوازے گا۔ ع

"دل بدست آور کہ حج اکبر ست"

(۸) اور سب سے اہم اور آخری بات یہ ہے کہ ریل میں، جہاز میں، اور مکہ معظمہ یا مدینہ طیبہ میں اللہ کے جو ایسے بندے ملیں جن کے پاس بیٹھنے سے اور جن کی بات سننے سے دینی فائدہ ہوتا ہو یعنی اللہ یاد آتا ہو اور دل میں اُس کی محبت اور اُس کا خوف اور عبادت کا شوق پیدا ہوتا ہو تو اس کی صحبت کو اکسیر اور کیمیا سمجھیں اور کچھ دیر کیلئے اُس کے پاس ضرور بیٹھا کریں۔

(۹) اس پورے سفر میں عام انسانی اور مادی ضروریات کھانے پینے اور خرید و فروخت وغیرہ میں کم سے کم اور صرف بقدر ضرورت وقت صرف کیا جائے، باقی سارا وقت عبادات میں اور دوسرے دینی کاموں میں صرف کرنا چاہئے۔ اس معاملہ میں بہت سے حجاج سے بڑی کوتاہی ہوتی ہے وہ مکہ مدینہ میں بھی بڑی بے فکری اور بے دردی سے اپنا وقت دنیوی کاموں میں

برباد کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بڑے گھاٹے میں رہتے ہیں اور ایک طرح مکہ مدینہ کی اور اس مقدس سفر کی ناقدری کرتے ہیں۔

(۱۰) بعض لوگ حج و زیارت سے فارغ ہو کر گھر کی واپسی کے لئے ایسے بیتاب ہوتے ہیں گویا کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار تھے، بہت سے وقت سے بہت پہلے جدہ آکر پڑ جاتے ہیں۔ یہ بات بڑی خطرناک ہے، حاجی کی کیفیت یہ ہونی چاہئے کہ وہاں سے آنے کو اُس کا جی نہ چاہے اور واپسی سے غم ہو۔ الغرض حج و زیارت سے فارغ ہو کر جتنے دن وہاں کے قیام کی سعادت کسی کو نصیب ہو اُس کو نعمت اور غنیمت سمجھے اور شکر کرے کہ اس کو اس کا موقع دیا جا رہا ہے۔

(۱۱) اہلِ حرمین کو مکہ یا مدینہ کے ساکن ہونے کی حیثیت سے جو شرف حاصل ہے اُس کو نہ بھولا جائے اور اُس نسبت کا پورا پورا احترام کیا جائے، اور اسی نسبت کی وجہ سے اُن کے ساتھ محبت اور عظمت کا معاملہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ سفر عشق و محبت کا سفر ہے، اور سچا عاشق محبوب کی گلی کے کتوں سے بھی محبت کرتا ہے۔ ؎

پائے سگ بوسیدہ مجنوں خلق گفتہ ایں چہ بود
گفت گا ہے گا ہے ایں در کوئے لیلیٰ رفتہ بود

اگر حج کو جانے والوں نے ان چند باتوں کا اہتمام کر لیا تو انشاء اللہ وہ بڑی دینی برکتوں کے ساتھ واپس ہوں گے اور اُن کا حج خدا نے چاہا تو بڑا مبارک اور مقبول حج ہو گا —— کیا عرض کیا جائے حج کا سفر تو ایسی کیمیا ہے کہ اگر اللہ توفیق دے تو ایک جاہل اور عامی بھی دو تین مہینے کے اس سفر میں ولی بن کر آسکتا ہے، مگر افسوس! لاپروائی سے یہ مقدس سفر بالکل ضائع ہو رہا ہے۔

ناظرین کرام سے گذارش!

اللہ کے جن بندوں کی نظر سے یہ مضمون گذرے اُن سے گذارش اور توقع ہے کہ وہ جتنے عازمینِ حج تک اس کو پہنچا سکتے ہوں پہنچائیں اور صرف اس کے دکھلانے یا پڑھ کر سنا دینے پر بس نہ کریں بلکہ زبانی انھیں اس کی اہمیت سمجھائیں اور ان مشوروں پر عمل کرنے کے لئے انھیں

روضۂ اطہر کے سامنے

از جناب سید انیس الدین احمد صاحب رضوی امروہوی
ایم، اے، ایل، ایل، بی "علیگ"

اے جذبۂ دل لے چل ، للّٰہ وہیں لے چل

داد از غم مہجوری، اے قلب حزیں لے چل — اے سازِ یقیں لے چل، اے سوزِ یقیں لے چل
اے ذوقِ نظر لے چل، اے شوقِ جبیں لے چل — اُس روضۂ اقدس کے، اس در کے قریں لے چل

اے جذبۂ دل لے چل، للّٰہ وہیں لے چل

وہ سامنے آنکھوں کے روضہ نظر آتا ہے — فردوسِ محبت کا نقشہ نظر آتا ہے
آنکھوں سے کچھ اٹھتا سا، پردہ نظر آتا ہے — خورشیدِ محبت کا جلوہ نظر آتا ہے

اے جذبۂ دل لے چل ، للّٰہ وہیں لے چل

غرقابِ مصیبت کو ساحل نظر آتا ہے — مجنونِ طریقت کو محمل نظر آتا ہے
اس در سے کہیں جانا مشکل نظر آتا ہے — یہ سر انھیں قدموں کے قابل نظر آتا ہے

اے جذبۂ دل لے چل ، للّٰہ وہیں لے چل

پوچھے کوئی اس دل سے جو کشتۂ فرقت ہے — ناکامِ تمنا کیوں بیتابِ زیارت ہے
وہ بارگہِ انور عشاق کی جنت ہے — تسکینِ تمنا ہے، تقدیسِ محبت ہے

اے جذبۂ دل لے چل، للّٰہ وہیں لے چل

دنیائے محبت پر رحمت کی گھٹا چھائی میخانۂ وحدت پر ہیں جمع تماشائی
پھر ساقیٔ طیبہ نے کی انجمن آرائی بیتاب ہے اس سر میں پھر شوقِ جبیں سائی

اے جذبۂ دل لے چل، للہ وہیں لے چل

گلزار بداماں ہو ہر نخل گلستاں کا صد مہر درخشاں ہو ہر ذرہ خیاباں کا
ہر گوشہ میں منظر ہو دربار سلیماں کا واللہ ہو عجب عالم بزم شہ ذیشاں کا

اے جذبۂ دل لے چل، للہ وہیں لے چل

اے جذبۂ دل تو ہی اس دل کی نشانی ہے اس در کے قریں لے چل جو قیصر معانی ہے
ہو ایک خلش دلمیں جو ان کو دکھانی ہے اک غم کی کہانی ہو جو ان کو سنانی ہے

اے جذبۂ دل لے چل، للہ وہیں لے چل

اس درگہ والا پر باچشم تر آیا ہوں اپنے دلِ مفتوں کی لے کر خبر آیا ہوں
اک ٹوٹے ہوئے دل کا میں نوحہ گر آیا ہوں آنکھوں کے بل آیا ہوں خاکم بسر آیا ہوں

اے جذبۂ دل لے چل، للہ وہیں لے چل

کہتا ہو کہ آیا ہوں اس در پہ میں فریادی کہتا ہو کہ لایا ہوں اک محضرِ بربادی
کہتا ہو کہ قسمت نے کیا کی ستم ایجادی کہتا ہو کہ اک میں ہوں اور بخت کی ناشادی

اے جذبۂ دل لے چل، للہ وہیں لے چل

کہتا ہو انیسؔ ان سے دورانِ جبیں سائی اے مظہر محبوبی اے شانِ دل آرائی
کن بر سر تابوتم یک جلوہ بہ رعنائی اے در لبِ لعل تو اعجازِ مسیحائی
اے بادشہ خوباں داد از غم تنہائی دل بے تو بجاں آمد وقت است کہ باز آئی

اے جذبۂ دل لے چل، للہ وہیں لے چل

شوقِ حرمین

(از حضرت صوفی ایم۔ اے)

خیز و بسم اللہ مجرہا و مرسٰہا بخواں
کشتی تو باد خود ہر موج بحرِ بیکراں

یہ لبِ ساحل! یہ میں! یہ سطحِ دریا! یہ جہاز!
دیر کیا ہے ناخدا؟ اے ناخدا عمرت دراز!

دیکھئے وہ کب پکاریں! گوش بر آواز ہوں!
گرچہ میں بے بال و پر ہوں، مائلِ پرواز ہوں!

بے سر و ساماں ہوں یارب سوز رکھتا ہوں نہ ساز
کھینچ لے اپنی کشش سے مجکو اے ارضِ حجاز!

آستاں سائی کے قابل میری پیشانی نہیں
میرے مولا عفو و بخشش میں تری ثانی نہیں!

دل ہے پہلے ہی سے اے آلامِ دنیا چور چور
دیکھ کر مجھ کو کہیں وہ بھی نہ کہہ دیں "دور دور"

وہ بلاتے ہیں یہ کہتا ہو کے خوش با چشمِ نم
خوش رہو اے دوستو! میں تو چلا سوئے حرم!

کیا کہوں میں! دل تو کہتا ہے بلائیں گے ضرور
آہ یہ بیم و رجا! یہ شوق! اُف میں ناصبور!

لیجئے منشورِ احسان و کرم آ ہی گیا
اے دلِ بے صبر لے! اذنِ حرم آ ہی گیا

لو چلا میں الفراق! اے میرے پیارو الفراق!
الفراق اے محسنو! اے میرے یارو الفراق!

میرے مخدومو! عزیزو! غمگسارو! الفراق!
میرے چھوٹو! چارہ سازو! جاں نثارو! الفراق!

سب کی ہمدردی کا میں محتاج ہوں اُمیدوار
میں سراپا عجز ہوں سر تا قدم ہوں افتقار

جا رہا ہوں میں خدا کے گھر کفن پہنے ہوئے
موت کی پوشاک ہے زندہ بدن پہنے ہوئے

رحم مجھ میت نما مسکین پر فرمائیے
میری مٹی بھی ٹھکانے ہو اگر فرمائیے

اے مسافر کوئی حق العبد اب تجھ پر نہیں!
دادگیرِ روزِ محشر سے نہ ہو اندوہگیں

دست بستہ آپ سب سے ہے یہ میری التجا
بخش دیجئے ساری تقصیریں مری بہرِ خدا

میری جانب سے کسی کے دل میں رہ جائے خلش
ہے سرِ تسلیم خم، فرمائیے گر سرزنش

جس کا جی چاہے سزا دے یا کرے مجھ پر عتاب
سہل ہو جائے مگر مجھ پر قیامت کا حساب

میں دُعاگو ہوں کہ یارب سب رہیں آباد و شاد
آپ سب مجھ کو دُعا دیں، میں نہ لوٹوں نامراد

وہ مجھے اپنا بنالیں سب سے کرکے بے نیاز
جان ہو اُن پر فدا، ہو جسم پیوندِ حجاز

آؤ اے بچو! تمہیں بھی پیار کرلوں ایک بار
اس دلِ بیتاب کو بھی شاید آجائے قرار

دل کے ٹکڑو اے مری آنکھوں کے تارو الفراق!
اے مری بچھڑی ہوئی کی یادگارو الفراق!

دل پھٹا جاتا ہے اے اللہ اس دل کو سنبھال!
حُبِّ غیر اللہ کے جنجال سے مجھ کو نکال!

شوقِ حج کے سامنے اب منزلِ میقات ہے
اے خدا میرا سہارا ایک تیری ذات ہے

دل پہ یارب عظمتِ کعبہ کا پرتو ڈال دے
گنبدِ خضرا کی اک تابندہ تر ضَو ڈال دے

مجھ پہ بھی کعبہ کی پنہانی حقیقت کھول دے
لیلیِ کعبہ مجھے دیکھے تو منہ سے بول دے

میں خلیلؑ و مصطفےٰؐ کی یادگاریں دیکھ لوں
میں ترے اسلام کی زندہ بہاریں دیکھ لوں

جاگ اُٹھے خوابیدہ دل لبیک کی آواز سے
آشنا ہو جاؤں میں حقانیت کے راز سے

مجکو، میرے حج کو، میرے عجز کو کرلے قبول
تا دمِ آخر نہ ہو تیری اطاعت سے ذہول

معصیت میں ایسی ناپاکی نظر آئے مجھے
نفس یا شیطاں ملوث پھر نہ کر پائے مجھے

مجکو اے مولا غذائے رُوح تیرا نام ہو
تیرے نامِ پاک پر اس زیست کا انجام ہو

ہو مری اولاد یارب باقیات الصالحات
ہو عطا ان کو صلاحِ زندگی خیرِ حیات

اُمتِ مرحوم پر ہو تیری رحمت کا نزول
خاص کر بر آل و بر اصحابؓ و ازواجِ رسُولؐ

صوفیِ ناچیز پر بھی ہو کریمی کی نظر
خاتمِ ہر مُدعا ہے یہ دُعائے مختصر

حاصلِ سرمایۂ اعزاز ہے نذرِ سجود
آبروئے ہر دُعا و ہر عبادت ہے درود

السلام علیک منّی والصلوٰۃ یا رسُولؐ
لیس لی حسن العمل کیف النجاۃ یا رسُولؐ

عزم ← "روانگی کے وقت"

(از۔ حضرت صوفی ایم، اے)

بدن کو میں مدینہ کی گلی کی خاک کر دوں گا
انھیں مژگان و ابرو کو خس و خاشاک کر دوں گا

کہا میقات ہے نزدیک کب احرام باندھے گا
کہا احرام کیسا میں بدن بھی چاک کر دوں گا

ملوں گا اپنے مولیٰ سے مجرد ہو کے قالب سے
اگر اپنی چلی خاکی بدن کو خاک کر دوں گا

مرے دل میں نہیں کچھ بھی سوا داغِ محبت کے
یقیں اُن کو نہ آیا ——— اپنا پہلو چاک کر دوں گا

اگر نکلی مرے دل میں کہیں آلائشِ دُنیا
شرابِ ناب سے دھو کر یہ ساغر پاک کر دوں گا

جو دیکھوں گا مری جانب نہیں ہی التفات اُن کو
محبت کی نظر کو دیدۂ نمناک کر دوں گا

ترے ہوتے کسی کو کوئی کہہ دے گیسوؤں والا
قیامت مَیں ابھی برپا تہہِ افلاک کر دوں گا

ابھی سے اُن کے کوچہ میں نہیں جوش و خروش اچھا
وہ چاہیں گے تو اے صوفی تجھے بیباک کر دوں گا

"حج کے بعد!"

حسرت اور تمنّا

حسرت:-

یہ حسرت رہ گئی پہلے سے حج کرنا نہ سیکھا تھا
کفن بر دوش جا پہونچا مگر مرنا نہ سیکھا تھا

نہ رہبر تھا، نہ رہرو تھا، نہ منزل آشنا تھا میں
محبّت کا سمندر، دل کی کشتی، ناخدا تھا میں

ہوائیں تھیں، تلاطم تھا، سفینہ ڈگمگاتا تھا!
بڑا گہرا سمندر تھا، جدھر نظریں اُٹھاتا تھا

وہ موتی تہہ نشیں تھے، میں مُسافر جن کا جویا تھا
کہاں موتی، کہاں میں! خود سفینہ ہی ڈبویا تھا

اگر فضلِ الٰہی دستگیر اپنا نہ ہو جاتا
تو ایک ادنیٰ تھپیڑا موجِ عصیاں کا ڈبو جاتا

تسلسل وارداتِ عشق کا حج ہے خبر کیا تھی
جہاں ہو شرطِ یکسوئی یہ آوارہ نظر کیا تھی

یہ کیا معلوم تھا اُن کی تجلّی کیسی ہوتی ہے
خبر کیا تھی کہ دل کیسا، تسلّی کیسی ہوتی ہے

یہ کیا معلوم تھا کیا چیز خود لیلائے کعبہ ہے
خبر کیا تھی کہ کس رفعت کے اوپر پائے کعبہ ہے

اسے لے دے کے ابراہیمؑ کی تعمیر سمجھا تھا
جو خود ہی جان و قالب ہے اسے تصویر سمجھا تھا

زمیں سے عرشِ اعظم تک کبھی دیکھا نہ تھا میں نے
غضب ہے اپنا پرچم تک کبھی دیکھا نہ تھا میں نے

فقط اک نام سے معمور کے کچھ آشنائی تھی
یہ کیا معلوم تھا کعبہ اسی کی رونمائی تھی

سمجھتا تھا صدا لبیک کی آواز ہے خالی
وہاں پہونچا تو حسرت تھی کہ اپنا ساز ہی خالی

کوئی نغمہ نہ تھا شایانِ محفل سازِ ہستی میں
خدا کا نام بھی لینا نہ سیکھا خود پرستی میں

ہزاروں منزلیں آئیں گئیں، میں رہ گیا سوتا
دلِ بیدار ہی لے کر نہ پہونچا تھا تو کیا ہوتا

زہے وہ آنکھ جو وَا از پئے دیدار ہو جائے
زہے وہ دل وہاں جو مہبطِ انوار ہو جائے

صفا[1] مروہ[2] مقام[3] سعی زمزم[4] خیف[5] جنا[6] نیں
میں ششدر تھا اُڑاتے تھے یہ سب عرفان کی تانیں

دلِ ہر ذرّہ سے تھی چھوٹ انوارِ الٰہی کی
مگر کچھ فکر میں نے کی نہ تھی دل کی سیاہی کی

خبر کیا تھی کہ کیا ہیں بو قبیس و طور کے جلوے
یہ کیا معلوم تھا ہوتے ہیں کیسے نور کے جلوے

یہ کیا معلوم تھا اُن کی کرم فرمائیاں کیا ہیں
حرا کی خلوتیں، یا ثور کی یکجائیاں کیا ہیں

مری چشمِ محبت خونِ حسرت اب بھی روتی ہے
خبر اے کاش یہ ہوتی کہ حج کیا چیز ہوتی ہے

وہ منزل قربِ باری کی، وہ رفعت کوہِ رحمت کی
خبر کیا تھی کہ یہ سیڑھی ہے معراجِ محبت کی

گیا، حج کر کے لوٹ آیا تو اب حسرت یہ ہے طاری
کہ پہلے سے نہ کی افسوس حج کرنے کی تیاری

حرم سطحِ زمیں پر مرکزِ عشق و محبت ہے
جسے کہتے ہیں صحرائے عرب بحرِ حقیقت ہے

جسے کہتے ہیں حاجی غیرتِ صد قیس ہوتا ہے
پکڑ کر دامنِ لیلائے کعبہ خوب روتا ہے

نہ جانے سحر کیا کرتی ہے یہ کالی رداوالی
کہ لاکھوں قیس آکر چومتے ہیں عتبۂ عالی

نہ سیریں ہیں، نہ تفریحیں، تجارت ہے، نہ میلے ہیں
مگر اس دشت میں یہ جذب و مستی ہے، یہ ریلے ہیں

اگر فولاد کے کانٹے بچھائے جائیں صحرا میں
بجائے موج زنجیریں اگر تن جائیں دریا میں

تو ابراہیمؑ نے جن خوش نصیبوں کو پکارا تھا
پکارا گیا! جنونِ عشق کا ایک نقش ابھارا تھا

وہ مجنونِ محبت، وہ سراپا عشق دیوانے
چلے آئیں گے کانٹے توڑنے، زنجیر کھڑکانے

یہ دیوانے اگر پہلے سے کچھ ہشیار ہو جاتے
حرم میں بن کے محرم صاحبِ اسرار ہو جاتے

جسے کہتے ہیں اہلِ منزلِ عشقِ الٰہی ہے
یہاں شاہی فقیری ہے، فقیری رشکِ شاہی ہے

کفن پہنے، پریشاں حال، وہ ژولیدہ مو راہی
چلا آتا ہے آنکھیں پونچھتا سرمستِ جاں کاہی

یہ جاں کاہی حقیقت میں حیاتِ جاودانی ہے
وگرنہ گوشت، ہڈی، کھال، مٹی، خون، پانی ہے

فضاؤں میں یہیں کی عشق کا پودا پھیلتا ہے
ہوا یہ کھا کے گلزارِ دلِ مومن لہکتا ہے

منور کر کے قندیلِ حرم سے اپنے سینے کو
چلا جاتا ہے ہنستا کھیلتا حاجی مدینے کو

ملائک راہ میں پیروں کے نیچے پر بچھاتے ہیں
زہے عشاق جو محبوب کی گلیوں میں جاتے ہیں

یہ وہ دربار ہے روح الامیں دربان ہیں جس کے
سمجھ میں کاش آجائے یہ رتبے اُن کی مجلس کے

ہزاروں بار مجھ پر اے مدینہ میں فدا ہوتا
جو بس چلتا تو مر کر بھی نہ میں تجھ سے جدا ہوتا

یہیں ہاں دادگانِ عشق کی بزم [illegible]
[illegible] دامن [illegible] شہیداں ہے

[illegible] شہادت کی [illegible]
تو [illegible] لیتے ہیں

[illegible] کی حامل [illegible]
یہاں [illegible] اب تک [illegible] کی صدائیں ہیں

فضا خاموش ہو جاتی ہے جب [illegible] میں
تو ہنگامہ [illegible] افزا فضاؤں میں

نبیؐ کا نطق دل میں نور سینہ بن کے آتا ہے ۔۔۔ صحابہؓ کا تکلّم اک سکینہ بن کے آتا ہے
یہاں کا ذرّہ ذرّہ کھینچتا ہے دل کے دامن کو ۔۔۔ کہ او طائر کہاں؟ اب چھوڑ کر اپنے نشیمن کو

کہیں ایسا نہ ہو مر کر کہیں برباد ہو جائیں
چلو طیبہ چلیں صوفیؔ وہیں آباد ہو جائیں

تمنّا:-

تمنّا ہے کوئی اللہ والا پھر دُعا کر دے ۔۔۔ کہ مجکو ربِّ کعبہ دولتِ حج پھر عطا کر دے
وہی تیاریاں ہوں پھر علائق سے جدا ہو کر ۔۔۔ یہ بندہ پھر خدا کا ہو کے ترکِ ماسوا کر دے
گلے سے اپنے بچّوں کو لگاؤں اور جُدا کر دوں ۔۔۔ محبّت اپنی غالب ہر محبّت پر خدا کر دے
چلوں گھر چھوڑ کر جس دم تو ربّ البیت کا ہاتف ۔۔۔ نویدِ باریابی دل کے پردوں کو اُٹھا کر دے
وطن کے باغ سے جسوقت نکلوں راہِ غربت میں ۔۔۔ مدینہ یاد آ کر بابِ جنّت مجھ پہ وا کر دے
مجھے رخصت کریں رو رو کے جس دم آنسوؤں والے ۔۔۔ جنونِ شوق بحرِ اشک میں طوفاں بپا کر دے
مُسافر کہہ کے بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا ۔۔۔ جہازِ زندگی اپنا سپردِ ناخدا کر دے
کفن پہنائے جب مجکو خدا میقاتِ ہستی پر ۔۔۔ فنا فی اللہ کر کے زندگی سر تا بپا کر دے
صدا لبیک کی یکبارگی جب چار سو گونجے ۔۔۔ مجھے دیوانگی اُس وقت مصروفِ بکا کر دے
فغاں کے ساتھ نکلیں پے بہ پے لبیک کی چیخیں ۔۔۔ تصوّر اُنکے گھر کا میری حالت کیا سے کیا کر دے
برہنہ پا، برہنہ سر، کفن بردوش جا پہنچوں! ۔۔۔ جہانِ شوق میں میرا جنوں محشر بپا کر دے
وہی صحرا، وہی دشت و جبل پھر آنکھ سے دیکھوں ۔۔۔ غبار اُن کی گلی کا میری آنکھیں سرمہ سا کر دے
وہ دیکھوں میں بیاں سے جسکے عاجز ہو زباں میری ۔۔۔ وہ اتنا دے کہ مجکو بے نیازِ مدّعا کر دے
حدودِ پاک میں اُسکے حرم کے سر کے بل اُتروں ۔۔۔ وہ سجدوں کو مرے قائم مقامِ نقشِ پا کر دے
تقاضائے ادب یوں آبلہ پائی کی خو ڈالے ۔۔۔ نیازِ راحلہ کی قید سے مجکو رہا کر دے
نیازِ عاشقی لیکر گلی میں اُن کی یوں دوڑوں ۔۔۔ کہ مجکو جذبِ معشوقانہ منزل آشنا کر دے
تڑپ کر جان دے دوں جب حریمِ پاک میں پہنچوں! ۔۔۔ مگر پھر جی اُٹھوں جب دامنِ کعبہ ہوا کر دے
بہت روؤں لپٹ کر لیلیِ کعبہ کے دامن سے ۔۔۔ یہ بارش آنسوؤں کی نخلِ ہستی پھر ہرا کر دے

اُسے چوموں حبیبِ کبریا نے جس کو چوما ہے　　کہ شاید لذّتِ عشقِ نبیؐ سے آشنا کر دے

عذارِ کعبہ کا اک خالِ دلکش سنگِ اسود ہے　　نہیں چشمِ سیہ ہے، حُسن جس کو سُرمہ سا کر دے

پیوں پھر سیر ہو کر آبِ زمزم چاہِ زمزم پر　　مرا جامِ طلب لبریز یہ آبِ بقا کر دے

شعائر پر خدا کے جاؤں ذوقِ ہاجرہ لیکر　　مری توفیق شرحِ آیۂ اِنَّ الصَّفا کر دے

جھکاؤں سر کو اسماعیلؑ ساں ہر سنگریزے پر　　مجھے قسمت اگر آوارۂ دشتِ منا کر دے

پیادہ پا چلوں پھر خیف سے میں سوئے مزدلفہ　　کہ مشعر پر خدا پھر ذکر کی نعمت عطا کر دے

بڑھوں رحمت کی جانب کہہ کے پھر ارنا مناسکنا　　کہ اپنے پاک گھر کا مجکو حاجی پھر خدا کر دے

منا میں جب کفن اُترے تو میرا فاطرِ ہستی　　حیاتِ طیبہ کا خلعتِ تازہ عطا کر دے

اُڑا لے جائے پھر سوئے حرم مجکو مری حسرت　　کہ بلبل گُل کے آگے آخری مجرا ادا کر دے

تمنا ہے مری چشمِ ارادت دل کا سرمایہ　　نثارِ آستینِ شاہدِ مشکیں قبا کر دے

گزر کر عشق و شورش کے منازل سے چلوں طیبہ　　تو وہ حُسن آفریں میری ادائیں دلربا کر دے

حبیبِ کبریا کی بزمِ محبوبی میں جا پہنچوں!　　کرم پھر مجھ پہ اتنا وہ حبیبِ کبریا کر دے

جہاں سے گنبدِ خضرا نظر آئے اِن آنکھوں کو　　کوئی اپنے قصیدے کی وہیں سے ابتدا کر دے

درودوں کے ترنم سے صدائے بازگشت اُٹھے　　پہاڑوں کو نبیؐ کا نعت خواں، محوِ ثنا کر دے

نظر جس وقت آنکھوں کو مری بابُ السلام آئے　　نکل کر جان قالب سے ادب کا حق ادا کر دے

یہ وہ در ہے جہاں لاکھوں ملائک سر بسجدہ ہیں　　دُعا یہ ہے کہ توفیقِ ادب مولیٰ عطا کر دے

کوئی مجھ سے بتاؤ میں وہاں پہنچوں تو کیا ہوگا　　وہیں کا ہو رہوں بس یہ کرم مجھ پر خدا کر دے

گلِ خوبی نہیں، گلزارِ خوبی، بلکہ جو کچھ ہے　　اُسی کا مجکو مولیٰ بلبلِ شیریں نوا کر دے

درودوں کے تحائف پیش کرنے میں کہوں اُس سے　　کہ اے شاہِ دو عالم مجکو طیبہ کا گدا کر دے

ترے کوچے میں گو رہنے کے قابل میں نہیں لیکن　　ترا جود و سخا، تیری دعا، تیری عطا کر دے

بقیعِ پاک میں ڈھونڈا ہے میں نے خواب میں مدفن!　　خدا اس خواب کو اک واقعہ سرتاپا کر دے

تمنا ہے کہ خاکِ پاک کا پیوند ہو جاؤں

تمنا صوفیؔ محتاج کی پوری خدا کر دے

"بہار در بہار"

زائرِ حرم
حمیدؔ صدیقی، لکھنوی

نسیم مشکبار ہے، شمیم خوشگوار ہے
چمن چمن بہار ہے، بہشت در کنار ہے

نظر کے سامنے زہے نصیب وہ دیار ہے
لطافتوں پہ جس کی جانِ عاشقاں نثار ہے

نہ کوئی اضطراب ہے، نہ کوئی انتشار ہے
سکون ہی سکون ہے، قرار ہی قرار ہے

مری نگاہ تیز تر، دلِ سُرور خیز تر
ہوائے عطر بیز تر، فضائے نور بار ہے

نظر نظر پہ چھا گئی، دلوں میں یہ سما گئی
مدینہ کی بہار کیا بہار در بہار ہے

پہاڑیوں کے سلسلے، جدا جدا، ملے ملے
کہیں یہ جوئبار ہے، کہیں پہ آبشار ہے

کمالِ ذوق و شوق سے رواں ہیں اہلِ کارواں
پیادہ چل رہا ہے کوئی اور کوئی سوار ہے

قدم بڑھائے ساریاں چلا ہے جھومتا ہوا
ترانۂ حدی زباں پہ، ہاتھ میں مہار ہے

بگولے راہِ شوق کے بلند ہو کے بول اُٹھے
خزاں نہیں، خزاں نہیں بہار ہے بہار ہے

یہی وہ ارضِ پاک ہے، شرف دیا گیا جسے
یہی ہے وہ دیار جس پہ دو جہاں نثار ہے

ضیا فگن ہے کہکشاں، زمیں سے تا بہ آسماں
حدِ نگاہ تک ملائکہ کی یا قطار ہے

لگاؤ بڑھ کے شوق سے تم اپنی آنکھ میں اسے
مدینۃ الرسول کا یہ زائرو غبار ہے

زمیں پہ ہوں کہ عرش پر مجھے نہیں ہے اب خبر
کسی کی بارشِ کرم ہے، اور بار بار ہے

کمالِ حس ہے بے حسی، خودی ہے عین بے خودی
جو خود سے بے خبر رہے یہاں وہ ہوشیار ہے

قدم نہ جو بڑھا سکا، نہ تابِ دید لا سکا
یہیں کہیں پہ اس شہیدِ عشق کا مزار ہے

نظر بجانبِ حرم، بشوقِ دل، بچشمِ نم
کھڑے ہیں اس طرح کسی کا جیسے انتظار ہے

اُحد کا عالم سحر ہے کتنا جاذبِ نظر
اِدھر بھی لالہ زار ہے اُدھر بھی لالہ زار ہے

جھکا ہوا ہے سبز گنبدِ حضور کی طرف
قبائے چرخِ نیلگوں اگرچہ زرنگار ہے

نظر فروز و دلنواز، عام بارشِ کرم
شعاعیں یہ کلس کی ہیں کہ نور کی پھوار ہے

یہ اپنی اپنی نسبتیں، یہ اپنا اپنا اعتبار
جو کوئی شاد شاد ہے، تو کوئی اشکبار ہے

نگاہیں فرشِ راہ ہوں حمیدؔ سر کے بل چلو
ادب، ادب، یہ کوچۂ حبیبِ کردگار ہے

حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت (عا)	اسلام کیا ہے مسلمان کسے کہتے ہیں (عہ)	مسلمانان عالم کی کمزوری کا بنیادی سبب (۶ر)	مسلمان قوم کی حالت اور حاملان دین کا فریضہ (۶ر)
دعوت اصلاح و تبلیغ ... (۶ر)	اسلام اور موجودہ مسلمان قوم ... (۴ر)	مسلمانوں کی اصلی طاقت ... (۶ر)	اسلام اور نظریہ وحدت ادیان ... (۲ر)
ہندستانی مسلمانوں کے لیے دو راستے ... (۲ر)	کلمۂ طیبہ ... (زیر طبع)	نماز کی حقیقت ... (زیر طبع)	برکات رمضان و فضائل صیام ... (۵ر)
میری زندگی کے تجربے ... (۶ر)	تحقیق مسئلہ ایصال ثواب ... (۶ر)	اسلامی ہند کے شوکت [illegible] میں خدا کا ایک وفادار بندہ ... (عہ)	امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف ... (عہ)
منصب تجدید کی حقیقت ... (۸ر)	تدوین اصول فقہ ... (عہ)	اسلام کا نظریہ سیاسی ... (۳ر)	اسلام اور نظام سرمایہ داری ... (۸ر)
جدید تعلیم اور علماء کا جرم عظیم ... (۴ر)	نماز اور خطبہ کی زبان ... (۳ر)	بوارق الغیب (حصہ اول) کاغذ قسم دوم ... (عہ)	بوارق الغیب (حصہ دوم) کاغذ اعلیٰ (عہ) کاغذ رف (۱۲ر)
شیخ بریلی کا عکس نظارہ کاغذ عمدہ (۸ر) رف (۶ر)	ہدایت ربانی (۸ر) دو داد مناظرہ گیا	مناظرہ علم غیب کاغذ عمدہ ... (۸ر)	حضرت مجدد الف ثانی اور زمانہ حال کے اہل بدعت ... (۴ر)
نوائے بمبئی ... (۳ر)	شارع حقیقی ... (۲ر)	تذکرۂ نقش و تفضیلیت کیخلاف حضرت مجدد الف ثانی کا جہاد ... (۴ر)	مباحثہ سماج بریلی ... (۳ر)
	سبیل خدا شناسی ... (۲ر)	عدم انجیل ... (۴ر)	

خاص اور اہم کتابوں کا تعارف صفحہ [illegible] پر ملاحظہ فرمائیے

تذکرۂ امام ربّانی

مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا کتابی اڈیشن

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح و خصائص اور آپ کے اہم تجدیدی کارناموں کا تفصیلی بیان، اکبر اور اسکے منافق و ملحد حواریوں کے گڑھے ہوئے "دین الٰہی" کی تفصیلات، اس زمانہ کے علماء سوء اور نام نہاد صوفیوں کی تحریفات و تلبیسات اور ان سب گمراہیوں کے اثرات سے اسلام کو اور ہندستانی مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کے لیے حضرت امام ربانی کی مجددانہ جد و جہد اور بارگاہ خداوندی میں چیخ پکار اور اصلاح و تجدید کے اس مشن میں آپ کی محیر العقول کامیابی، اور مغلیہ سلطنت کے رویہ اور مسلک پر آپ کی مساعی تجدید کا اثر۔

ان تمام چیزوں کی پوری تفصیل آپ کو "تذکرہ امام ربانی" کے مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔

قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ/

مولانا محمد الیاسؒ

اور ان کی دینی دعوت

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

عصر حاضر کی مشہور دینی شخصیت اور عارف و مصلح مولانا محمد الیاسؒ اور انکی کامیاب دینی جد و جہد کی تاریخ ایسے شخص کے قلم سے جسکو ذاتی مطالعہ و مشاہدہ و استفادہ کا موقع ملا ہے، مولانا کے ذاتی حالات و کمالات اخلاق و عادات اور ان کی دعوت کے ارتقائی مدارج کی مستند تاریخ اور دین کے بہت سے اہم مباحث اسلامی اصلاح و انقلاب کے بہت سے اصول جو دوسری جگہ نہ ملیں گے، اس زمانہ میں دین کا کام کرنے والوں کیلیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری اور بصیرت افروز ہے۔

قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ/

اِسلامی ہند کے طوفانی عہد میں

خدا کا ایک وفادار بندہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ

(از۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

شاہ ولی اللہ کا دور، اسلامی ہند کا سخت طوفانی دور تھا، مغلیہ سلطنت کا زوال و انحطاط، ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا آغاز، سکھ اور مرہٹہ تحریکوں کا زور اور ان کے غارتگرانہ ہنگامے، نادر شاہ کا خونی سیلاب، اور احمد شاہ ابدالی کی تاریخی جنگ، یہ سارے واقعات شاہ صاحبؒ ہی کے زمانہ میں ہوئے اور خود شاہ صاحب ان سے غیر متعلق بھی نہ تھے اسلیے اس مقالہ میں ان تمام واقعات اور انکے اسباب و اثرات کا ذکر بھی اچھی خاصی تفصیل سے آگیا ہے، پھر بتلایا گیا ہے کہ شاہ صاحب نے فتنوں کے اس طوفانی دور میں اسلام کی خدمت کیا اور کیسے کی، اور ان کے طرز عمل سے موجودہ حالات میں ہمیں کیا روشنی ملتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاغذ سفید چکنا (قیمت عہ/)

اِمام وَلی اللہ دہلویؒ

اور اُن کا فلسفہ

(از حضرت مولانا عبید اللہ سندھی)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف اور ان کے فلسفہ پر یہ نہایت گہرا علمی مقالہ بلاشبہ نوادر میں سے ہے، اور ان کی علمی خصوصیات اور ان کے فلسفہ کی بنیادوں کو سمجھنے کے لیے یہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اس میں پانچ باب ہیں پہلے باب میں شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت اور ہند و حرمین کے اساتذہ و مشائخ سے استفادہ و تحصیل کا بیان ہے، دوسرے اور تیسرے باب میں علوم قرآن و حدیث میں ان کی تجدیدات اور خاص نظریات کی تشریح کی گئی ہے، اور چوتھے اور پانچویں باب میں علی الترتیب فقہ اور تصوف کے بارہ میں ان کے خاص مجتہدانہ نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن صرف اہل علم اور عربی داں حضرات کے مطالعہ کے لائق ہے۔

کاغذ سفید چکنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (قیمت: عہ/)

دعوت اِصلاح و تبلیغ

اسلام کی نشأۃ ثانیہ کیلئے جدّوجہد!

اس وقت مسلمانانِ عالم کی اکثریت دعوائے اسلام کے باوجود اسلامی زندگی اور ایمانی رُوح سے خالی ہو، یہ حالت ہر حیثیت سے بڑی خطرناک ہو ــــــ اللہ تعالیٰ ہماری اس حالت سے سخت ناراض ہو، نیز رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلّم) کی رُوحِ پاک اس سے سخت متفکر اور بے چین ہو، یہ اُمّت اور اس کا ایمان و اسلام حضور کا لگایا ہوا وہ باغ ہو جس کو آپ نے اور آپکے اصحاب (رضی اللہ عنہم) نے بڑی بڑی محنتوں سے سینچا تھا، اور انہی انتھک محنتوں کے نتیجے میں یہ سرسبز اور شاداب تھا اسلیے اس کے اُجاڑ اور اس کی بربادی سے رُوحِ پاک کو تکلیف ہونا بالکل قدرتی بات ہو۔

اس وقت اللہ تعالیٰ کو راضی اور روحِ محمدیؐ (علیہ الصّلوٰۃ والسّلام) کو مسرور اور مطمئن کرنے اور مسلمانوں کے دنیا و آخرت میں کامیاب ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہو کہ ہر مسلمان سچا مسلمان بننے کی، اور دوسروں کو بنانے کی کوشش کرے ــــــ "دعوتِ اصلاح و تبلیغ" کا مقصد یہی ہے۔

ہر مسلمان سے ہم استدعا کرتے ہیں کہ اس تحریک کی حقیقت، اس کی اہمیت، اس کے اُصول اور طریقِ کار و پروگرام معلوم کرنے کے لیے وہ ذیل کے رسالوں کا مطالعہ فرمائیں۔

اسلام اور موجودہ مسلمان قوم	۴ر	دعوتِ اصلاح و تبلیغ	۶ر
مسلمانانِ عالم کی کمزوری کا بنیادی سبب	۶ر	مسلمان قوم کی حالت اور حاملانِ دین کا فریضہ	۶ر
ایک اہم دینی دعوت	۶ر	مسلمانوں کی اصلی طاقت	۶ر
مردِ خدا کا یقین	۳ر	اسلام کیا ہو اور مسلمان کسے کہتے ہیں؟	عہ/

مولٰنا محمد الیاس اور انکی دینی دعوت ۱ع

ماہنامہ الفرقان "لکھنؤ" سالانہ چندہ للعہ/

کتب متعلقہ قرآن مجید!

قصص القرآن - (از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی) پیغمبروں اور انکی امتوں کے جو واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں انکے متعلق چار جلدوں کی یہ کتاب اس زمانہ کی فاضلانہ اور محققانہ تصنیف ہے!

جلد اول:- حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰ تک کے واقعات۔ صہ

جلد دوم:- حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک کے واقعات۔ سعہ

جلد سوم:- انبیاء علیہم السلام کے ظاہر باقی تمام قصص قرآن کا بیان۔ صہ

جلد چہارم:- حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات۔ لعہ

لغات القرآن - اردو میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح کی گئی ہے اپنے موضوع میں بے نظیر اور محققانہ کتاب ہے - ابھی صرف تین جلدیں تیار ہوئی ہیں۔

جلد اول:- للعہ

جلد دوم:- للعہ

جلد سوم:- للعہ

احادیث نبوی پر ایک بہترین کتاب

"ترجمان السنۃ" - (جلد اول)

اردو زبان میں ارشادات نبوی کا نہایت جامع اور مستند و بے مثل ذخیرہ ہے

شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں احادیث کی اہمیت اور فن حدیث کے جملہ اطراف جوانب پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے

اور بتلایا گیا ہے کہ سنت یعنی حدیث نبوی کو نظر انداز کر کے نہ قرآن پر عمل ہو سکتا ہے اور نہ دین کی کوئی متعین حقیقت باقی رہتی ہے ——— یہ مقدمہ بجائے خود مبسوط کتاب ہے اور علماء تک کو اسکے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

کتاب کی پوری خوبیاں مطالعہ ہی سے واضح ہو سکتی ہیں!

(سائز $\frac{29 \times 22}{8}$) (صفحات ۵۹۲)

قیمت:- دس روپئے

فہم قرآن - (از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔اے) قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اور قرآن اور سنت کا باہم کیا تعلق ہے۔ (۱۲)

قرآن اور تصوف - (جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب) جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو منطقی ترتیب اور وضاحت کے ساتھ ایک خاص اسلوب میں پیش کیا گیا ہے (قیمت - عار)

رہنمائے قرآن - ایک فاضلانہ انگریزی کتاب کا ترجمہ - جدید تعلیم یافتہ حضرات ضرور پڑھیں۔ (قیمت - ۸ر)

کائنات روحانی - از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی - اسکو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ قرآن مجید جو بظاہر ایک کتاب ہے در حقیقت وہ روحانی کائنات ہے جو انسانی روح کی تمام ضروریات کی کفیل ہے۔ (قیمت - ۸ر)

مناجات مقبول جدید

(مع شرح اردو) (قیمت عہ)

(از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی)

مناجات مقبول!

(مع ہفت سورہ مترجم و شجرات)

مجلد - (عار)

تفسیر سورۂ شمس اردو (۵ر) تفسیر سورۂ لہب اردو (۶ر) تفسیر سورۂ عبس اردو (۶ر)

تفسیر سورۂ مرسلات (اردو) ۶ر تفسیر سورۂ قیامہ (اردو) ۵ر

تفسیر عزیزی (پارۂ تبارک الذی) اردو للعہ

" " " " فارسی [illegible]

ملنے کا پتہ - کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ - لکھنؤ

حکایاتِ صحابہ ۔ از حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدظلہٗ ۔ عار

امتِ محمدیہ کا پہلا مجذوب یعنی حضرت ابوذر غفاریؓ کی قابلِ دید سیرت (از مولانا سید مناظر احسن گیلانی) کتاب کیا ہے اللہ و رسولؐ کے اس سرگشتہ عاشق کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ (قیمت عہ)

معارف الکتاب المبین فی فضائل سید المرسلین ایک تقریظ نگار کی رائے میں کتاب کیا ہے قرآن کریم کے حقائق و معارف کا ایک بحر زخار جناب مؤلف نے نکات و اسرار قرآنی کو کھولنے اور آنحضرت صلعم کے فضائل ذہن نشین کرانے میں جس اچھوتے اور دلنشیں طریقے سے کام لیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ (قیمت ۱۲)

سفرنامہ اسیر مالٹا (از مولانا حسین احمد صاحب مدنی) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی اور انکے رفقاء سفر کے قید و بند کے حالات جدید اڈیشن، چھوٹا سائز، مجلد مع خوبصورت گردپوش ۔ عار

ابوالکلام آزاد تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں! (از ابوسعید بزمی ایم اے) قیمت مجلد مع گرد پوش (عہ)

غدر کے چند علماء ۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں علماء کا کارنامہ جس قدر شاندار ہے اُس کی مثال کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی مگر افسوس! کہ ان بزرگوں کے سیاسی حالات سے تذکرہ نویسوں نے چشم پوشی کی۔ ملک کی آزادی کے بعد جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بڑی خوبی سے یہ چھوٹا سا تذکرہ مرتب فرمایا ہے۔ (قیمت مجلد مع حسین گرد پوش عہ)

علماء حق اور انکی مظلومیت کی داستانیں (از مفتی صاحب موصوف) حضرات صحابہؓ سے لیکر ہندوستان کے علماء متاخرین تک کی حق گوئی اور صداقت پروری کی صفت اور جرأت و بیباکی کے متعدد کارناموں کو یاد کرنے کیلئے اور اپنے اندر اُن اوصاف کو زندہ کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ (قیمت مجلد مع خوبصورت گرد پوش عہ)

ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء (از مفتی صاحب موصوف) مغلیہ حکومت کے کمزور ہوتے ہی ملک کا شیرازہ کس طرح بکھر گیا، اور ہندوستان جنگ کا آماجگاہ کیونکر بن گیا؟ جنگ پلاسی کمپنی کو کیسے سازگار ہوئی؟ کمپنی نے کیسی کیسی تدبیروں سے ہندوستان پر تسلط کیا؟ ان سوالات کے جوابات کیلئے اس خوشنما کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ (قیمت عار)

دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا؟ اشاعت اسلام مکمل و مدلل:۔ تالیف حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند عہدِ نبویؐ اور دورِ صحابہ کرامؓ میں دین الٰہی کی تبلیغ و اشاعت کی مفصل اور مستند تاریخ ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد کسی معاند کیلئے بھی یہ کہنا مشکل ہوگا کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا! (قیمت سے)

کتب فقہ اسلامی بزبان اُردو

بہشتی زیور ۔ ابتک کے سارے اڈیشنوں میں ہر حیثیت سے اعلیٰ اور مکمل، گویا دین کی مستند ترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔ (قیمت ۵ روپے)

فتاویٰ محمدیؐ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ کے فتاوے اور مسائل کے جوابات۔ (قیمت عہ)

الجواب المتین فقہی مسائل کا جواب صرف احادیث نبوی سے۔ ۸ر

ارکانِ اسلام ۔ ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے فضائل اور ضروری مسائل کا بیان۔ (قیمت عہ)

آئینۂ نماز ۔ نماز اور طہارت وغیرہ کے معتبر اور ضروری مسائل ۔ ۸ر

مقادیر شرعیہ در اوزان ہندیہ (قیمت ۳ر)

مالابد منہ (فارسی مع حاشیہ) عہ ۔ **مالابد منہ** (اُردو) عہ

سلسلہ تعلیم الاسلام ۔ (از حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مدظلہ العالی) بچوں کیلئے بہترین مذہبی و فقہی نصاب تعلیم ہے

قاعدہ تعلیم الاسلام ۔ تعلیم الاسلام نمبر اول، نمبر ۲، نمبر ۳، نمبر ۴ (مکمل سٹ کی قیمت عہ)

نوٹ:۔ حضرت تھانویؒ کی اکثر مشہور تصانیف نیز حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی و مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی تمام تصانیف نیز مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی کتب خانہ "الفرقان" لکھنؤ سے طلب فرمائیے۔ تعارف بارہا کرایا جا چکا ہے۔

اسلام اور اسلامی نظام پر بہترین کتابیں

اسلامی معاشیات (از مولانا سید مناظر احسن گیلانی)، اس موضوع پر ان چند سالوں میں اگرچہ متعدد چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئیں لیکن مولانا گیلانی کی یہ تصنیف جامعیت اور علمی و تحقیقی حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتی ہے، اس کی دو جلدیں ہیں ایک جلد میں کتاب و سنت سے اخذ کرکے اسلامی معاشیات کے اصول و کلیات لکھے گئے ہیں، اور دوسری جلد میں فقہاء اسلام کے مرتب کئے ہوئے تفصیلی اور جزوی قوانین کو بڑے استیعاب سے پیش کیا گیا ہے، دراصل یہ کتاب وقت کے ایک بہت بڑے مطالبہ کا اسلام کی طرف سے شافی جواب ہے۔

جو لوگ معاشیات و اقتصادیات کی گتھیوں کو واقعی سلجھانا چاہتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس کتاب کو ضرور دیکھیں۔

قیمت مجلد ۱۲ روپے

اسلام کا نظام حکومت

(از حامد الانصاری غازی) اس مسلم کتاب میں اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور، اساسی اور مستند ضابطۂ حکومت پیش کیا گیا ہے۔

صفحات ۶۰۰ بڑی تقطیع

قیمت مجلد ... ۱۲ روپے

مولانا مودودی کی تالیفات

اور

جماعت اسلامی کا لٹریچر

الجہاد فی الاسلام (طبع جدید)، تفہیمات ، تنقیحات ، خطبات کامل ، پردہ ، رسالہ دینیات ، تعلیمات (مسلمانوں کی نظام تعلیم کے متعلق مولانا مودودی کے چند مضامین) اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر ، اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر ، دعوت اسلامی اور اسکے مطالبات ، تصریحات ، جہاد فی سبیل اللہ ، شہادت حق ، دین حق ، راہ عمل ، سلامتی کا راستہ ، نشان راہ ، انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل ، مسئلہ قومیت ، اسلام اور جاہلیت ، اسلام اور ضبط ولادت ، معرکۂ اسلام و جاہلیت ، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ...... ، اسلام کا نظام حیات مکمل ، تنقیحات علم اور عقل کی روشنی میں ، زندگی بعد موت ، مسلمان کا بنیادی عقیدہ ، عبادت ، اسلام کا تقاضا ، ایک اہم استفتاء ، نظام نو ، اسلامی سیاست از ضیاء ، نظام اطاعت کی کڑیاں ، نیا نظام تعلیم ، مسلمانوں کی ثقافت کا اصلی منبع ، مذہب کا انقلابی تصور ، اور علم خواتین ، ہندوستان میں اسلامی تحریک کا لائحہ عمل ، شیطانی تحفہ ۱۰

مسلمانوں کا نظم مملکت:- ایک مصری فاضل کی جدید کتاب کا اردو ترجمہ جس نے مختلف زبانوں کی کم و بیش ایک سو اہم کتابوں کی مدد سے اپنی اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور مسلمانوں کے نظم مملکت سے متعلق ہر گوشہ پر مبصرانہ نظر ڈالی ہے،

بڑی تقطیع ، ۴۸۰ صفحے

قیمت ... للعہ

مجلد ... صہ

اسلام کا اقتصادی نظام (از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)، فاضل مصنف نے اس کتاب میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ داری کا توازن قائم کرکے اعتدال کی راہ پیدا کی۔ (تیسرا ایڈیشن) بڑی تقطیع ۴۰۰ صفحے

قیمت ... للعہ

مجلد ... صہ

اسلامی نظریہ سیاست

اپنے موضوع پر اچھی مختصر کتاب ہے۔ شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی کا فاضلانہ مقدمہ ہے ...... عہ

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۶ نمبر (۱۱)
باہتہ ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۶۸ھ

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مُدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھئے! الفرقان اور کتبخانہ الفرقان بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں
لہٰذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھئے!
دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ (یو-پی)

چندہ سالانہ چار روپیہ
نمونہ کا پرچہ چھ آنہ

ماہنامہ

جلد ۱۶	بابتہ ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۹ء	نمبر ۱۱

اپنے ناظرین سے

دوسرے صفحہ پر آپ رسالہ کے صفحات میں زیادتی کا اعلان دیکھیں گے جسکی وجہ سے سالانہ چندہ میں بھی ایک روپیہ بڑھا دیا گیا ہے، لہٰذا یہ بات اچھی طرح یاد رکھئے کہ ذی الحجہ سے آپکے الفرقان کا سالانہ چندہ "پانچ روپیہ" ششماہی "تین روپیہ" اور قیمت فی پرچہ "آٹھ آنہ" ہے۔ آپ میں سے جن حضرات کو چندہ بھیجنا ہو وہ پانچ روپیہ کا منی آرڈر ارسال فرمائیں۔ آئندہ ماہ سے وی۔ پی بھی صہ کا بھیجا جائے گا۔

یہاں سرخ نشان ☐ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے لہٰذا آئندہ کیلئے اپنا چندہ منی آرڈر سے روانہ فرما کر ممنون فرمائیے۔ اگر آئندہ رسالہ کی اشاعت تک آپ کا چندہ سالانہ یا کوئی اطلاع وصول نہ ہوئی تو اگلا پرچہ وی۔ پی حاضرِ خدمت ہوگا۔

ناظم "الفرقان" لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بعض ضروری اطلاعات

حج نمبر کے ساتھ ناظرین کرام سے رسالہ کے پندرہ روزہ کر دینے کے متعلق استصواب رائے کیا گیا تھا بہت سے احباب اور خریداروں نے اس کے حق میں رائے دی تھی کہ رسالہ پندرہ روزہ کر دیا جائے لیکن مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بجائے پندرہ روزہ کرنے کے رسالہ میں ۸ صفحات کا اضافہ کر دیا جائے اس طرح رسالہ ۵۶ صفحات کا ہو جائے گا، اور مواد و مضامین میں معتدبہ اضافہ اور وسعت ہو سکے گی۔

صفحات کے اس اضافہ کی وجہ سے موجودہ گرانی کے پیشِ نظر ایک روپیہ کا اضافہ بھی ضروری ہوگا، اس لئے اب الفرقان کا چندہ سالانہ صہ رہو گا، لیکن جن اصحاب کا چندہ سالانہ جمع ہے ان کی مدت میں کوئی کمی نہ ہوگی نیا حساب ختم مدت پر شروع ہوگا۔

غیر مستطیع اصحاب کیلئے العہ ہی چندہ رہے گا، اکثر بہت سے حضرات دفتر میں غیر مستطیع اصحاب کے نام رسالہ جاری کرنے کیلئے کچھ رقمیں بھیجدیا کرتے تھے، ان رقوم سے ان غیر مستطیع اصحاب کے چندہ کی تکمیل کر دی جائے گی۔ —— یہ تبدیلی ذی الحجہ ہی کے پرچہ سے ہوگی کیونکہ ایک اچھی خاصی تعداد کا نیا سال ذی الحجہ سے شروع ہوتا ہے۔

ناظرین کرام کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ جناب مدیر الفرقان اسی مہینہ حج کو روانہ ہوگئے ہیں، احباب بخیریت سفر و واپسی کیلئے دعا فرمائیں، کیا عجب ہے کہ کسی قریبی اشاعت میں ہم انکے بعض افادات و تاثرات شائع کر سکیں۔ ہم نے مولنا سے چلتے وقت درخواست کی تھی کہ وہ اپنے اس سفر کے فوائد و فیوض میں ناظرین الفرقان کو ضرور شریک کریں، اور جہاں سے ممکن ہو وہ اپنے سفر کے مشاہدات و تاثرات قلمبند کرکے بھیجتے رہیں امید ہے کہ مولنا اس کیلئے ضرور وقت نکالیں گے، اور الفرقان کے ان سیکڑوں ناظرین کو مستفید فرمائینگے جو انکے سفر کے مشاہدات سننے کے مشتاق ہونگے —— ناظرین کرام کیلئے یہ خبر یقیناً باعث مسرت ہوگی کہ حضرت مدیر کی عدم موجودگی میں رسالہ کی ادارت و ترتیب کی ذمہ داریاں حضرت مولنا سید ابو الحسن علی ندوی نے قبول فرمالی ہیں۔

ناظم "الفرقان" لکھنؤ

باسمہ سبحانہ   حمداً وسلاماً

نگاہِ اوّلیں

ایک بہت مشہور اور صحیح حدیث کا مضمون ہے ——— کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بطور پیشین گوئی کے صحابہؓ سے ایک دن فرمایا کہ اگلی اُمتوں میں جو خرابیاں اور برائیاں آئی تھیں وہ سب میری اُمت میں بھی آئیں گی اور میرے امتی وہ ساری حرکتیں کریں گے جو اگلوں نے کی ہوں گی ——— حدیث کے الفاظ یہ ہیں "لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ" ——— اسی حدیث کی ایک روایت میں آگے یہ بھی ہے کہ بعض صحابہؓ نے یہ سُن کر عرض کیا یا رسول اللہؐ کیا آپ کا مطلب یہود و نصاریٰ سے ہے؟ ——— حضورؐ نے ارشاد فرمایا "فَمَنْ؟" (اور کون)۔

حضورؐ کی اس پیشین گوئی کا حاصل یہ ہوا کہ اگلی امتوں خصوصاً یہودیوں اور عیسائیوں میں جو برائیاں اور گمراہیاں آئیں وہ اس امت میں بھی آئیں گی ——— اللھمّ احفظنا ——— البتہ چونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے اور اب کوئی نبی آپ کے بعد آنے والا نہیں ہے اور دین کی حفاظت و دعوت کے کام میں امت ہی کو قیامت تک حضورؐ کی نیابت اور نمائندگی کرنی ہے اس لئے یہ کبھی نہیں ہوگا کہ آپ کی ساری امت دین سے بے تعلق یا گمراہ ہو جائے ——— اسی لئے دوسری حدیثوں میں صریحی طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ امت میں اللہ کے ایسے کچھ وفادار بندے ہمیشہ رہیں گے جو دینِ حق اور صراطِ مستقیم پر قائم رہیں گے اور دین کی حفاظت و خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنی خاص مدد و توفیق سے اُن سے یہ کام لیتا رہے گا ——— چنانچہ ایک حدیث میں ہے۔

لا یزال من امتی امۃ قائمۃ بامر اللہ لا یضرھم من خذلھم ولا من خالفھم	میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم، اور اُسکے قائم کرنے کی کوشش میں لگی رہے گی۔

حتے یاتی امر اللہ وھم علیٰ ذالک۔
(بخاری ومسلم)

انکی مخالفت کرنے والے اور انکی مدد نہ کرنے والے انکو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے وہ قیامت تک برابر دین پر قائم اور جد وجہد میں مصروف رہے گی۔

ایک دوسری حدیث میں ہے

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین۔
(رواہ البیھقی فی المدخل)

ہر آنے والے زمانہ میں کچھ ثقہ اور متقی لوگ اس علم (دین) کے حامل اور امین رہینگے جو حد سے بڑھنے والوں کی تحریفات اور اہلِ باطل کے باطل دعاوی اور جاہلوں کی جاہلانہ تاویلات کو رد کرتے رہیں گے اور دین کو ان سے بچاتے رہیں گے۔

بہرحال یہ اور ان کے علاوہ اور بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایسے ارشادات حدیث کی کتابوں میں مروی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ کے کچھ ایسے صادق اور وفادار بندے ہر زمانے میں رہیں گے جو خود دینِ حق پر قائم رہتے ہوئے تحریفات اور باطل تاویلات سے اُس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ دونوں پیشین گوئیاں صدیوں سے ایسے کھُلے طور پر ظاہر ہو رہی ہیں جس کو ہر آنکھوں والا دیکھ سکتا ہے — اگلی امتوں میں خصوصاً یہود و نصاریٰ میں عقائد میں، اعمال میں، اخلاق میں، جذبات میں، جو جو خرابیاں پیدا ہوئی تھیں — جن کی نشان دہی قرآن مجید نے بھی جا بجا کی ہے اور تاریخ بنی اسرائیل کے مطالعہ سے جن کی پوری تفصیلات معلوم کی جاسکتی ہیں — وہ سب خرابیاں اس امت کے مختلف طبقوں میں آچکی ہیں — نصاریٰ کے غلو اور افراط کے نمونے بھی موجود ہیں اور یہود کی تفریط کے بھی۔ علیٰ ہذا دنیا میں انہماک، آخرت سے بے فکری، موت سے گریز، احکام کی نافرمانی، فرائض سے روگردانی، حدود کی پامالی، جان و اقتدار اور مال و دولت کے بتوں کی پرستش، باہم بغض و حسد اغراض و خواہشات کے لئے اللہ کی کتاب اور اس کی ہدایت کو پس پشت ڈالدینا، وقت کے

فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کے کروفر، ٹھاٹھ باٹھ، کوٹھیوں موٹروں اور مال و دولت کے ڈھیروں کو دیکھ کر اُن پر ریجھنا اور ان چیزوں کو انسانیت کی معراج اور فلاح و کامیابی کا معیار سمجھنا، اسی طرح دنیوی اور مادی مصیبتوں کو دینی اور ایمانی مصائب سے زیادہ محسوس کرنا، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور احتساب میں مداہنت سے کام لینا، یہ سب چیزیں وہ ہیں جو (قرآن و حدیث کے بیان کے مطابق) یہود و نصاریٰ میں پیدا ہوئی تھیں —— اور موجودہ مسلمان قوم کے حالات سے جن کو واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ صرف عوام ہی میں نہیں بلکہ مختلف حلقوں سے تعلق رکھنے والے ہمارے بہت سے "خواص" میں بھی یہ برائیاں اس درجہ میں نفوذ کر چکی ہیں کہ خدا نہ کرے اس سے زیادہ ہماری آنکھیں دیکھیں —— یہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک پیشین گوئی (لتر کبن سنن من کان قبلکم الخ) کا ظہور ہے۔

اسی طرح دوسری پیشین گوئی بھی اسی زور اور قوت کے ساتھ پوری ہو رہی ہے خیر القرون گذرنے کے بعد سے اب تک کتنے انقلابات آئے، کتنے مد و جزر ہوئے، کیسے کیسے فتنے اُٹھے اور بعض اوقات مختلف ممالک کے مسلمانوں پر کیسے کیسے قیامت خیز مصائب و شدائد آئے لیکن اس امت کی تاریخ گواہ ہے کہ کوئی صدی تو کیا، کوئی سال و مہینہ اور کوئی دن ایسا نہیں گذرا کہ اللہ کے کچھ وفادار بندے دین کی حفاظت و دعوت اور امت کی اصلاح و ہدایت کی جدوجہد میں مصروف نہ رہے ہوں، اور بیشک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیشین گوئی کے مطابق یہ سلسلہ قیامت تک یوں ہی رہے گا۔ حتیٰ کہ دین سے محبت کرنے والے اور اُس کے قدر شناس جب کم سے کم رہ جائیں گے اور غربت و کس مپرسی کے لحاظ سے جب مقدس اسلام کا وہی حال ہو جائے گا جو اب سے چودہ سو برس پہلے دعوتِ اسلامی کے بالکل آغاز کے وقت تھا تو (حدیث میں ہے کہ) اُس وقت بھی اللہ کے کچھ بندے دین کی خدمت و دعوت اور امت کی اصلاح و ہدایت کے لئے اسی طرح سرگرمِ عمل رہیں گے، اور اللہ کے خاص الخاص لطف و کرم کے وہ مستحق ہونگے —— بہت مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرامؓ سے ایک دن فرمایا:۔

بدء الاسلام غریباً وسیعود غریباً کما بدء فطوبیٰ للغرباء وھم الذین یصلحون ما افسد الناس من بعدی (او کما قال)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا آغاز بڑی کس مپرسی کی حالت میں ہوا، یعنی اُس وقت لوگوں کو اس سے کوئی مناسبت اور اس کی طرف کوئی رغبت نہ تھی، وہ اس دنیا میں ایک ایسے پردیسی کی طرح تھا جس کا کوئی شناسا اور پُرسانِ حال نہ ہو، اور مستقبل میں اُس پر پھر ایک ایسا دور آئے گا کہ لوگوں میں اس کی جو قدر اور مقبولیت و محبوبیت پیدا ہو گئی ہے یہ باقی نہیں رہے گی اور اس وقت وہ پھر ایک پردیسی کی طرح کس مپرسی کی حالت میں ہو گا۔ پس اسلام کی غربت کے اُس دور میں جو لوگ اُس کے وفادار اور حامل رہیں، اور امت میں آئی ہوئی خرابیوں اور برائیوں کی اصلاح کی کوششوں میں لگے رہیں، انھیں مبارک باد اور بشارت ہو کہ اللہ تعالیٰ کے خاص لطف و کرم کے وہ مستحق ہوں گے۔

بہرحال یہ دونوں پیشین گوئیاں صدیوں سے پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہو رہی ہیں، اُمت میں یہود و نصاریٰ اور دوسری جاہلی قوموں کی برائیاں اور گمراہیاں بھی زور سے پھیل رہی ہیں اور پھیلائی جا رہی ہیں اور اللہ کے کچھ بندوں کی طرف سے دین کی حفاظت، شریعت کی ترویج اور امت کی اصلاح و ہدایت کے لئے کوششیں بھی جاری ہیں —— گویا ایک طرف شیطان اور اس سے تعاون کرنے والی طاقتیں ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے فکر و عمل اور نظامِ زندگی کو غیر ایمانی اور غیر اسلامی بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور ایمان و ہدایت سے محروم قوموں کی برائیاں اور گمراہیاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امتیوں میں پھیلانے کے لئے سرگرم ہیں۔ اس گروہ کے ساتھ جذب و کشش کے سارے سامان اور ناعاقبت بینوں کے لئے ہزاروں قسم کی ترغیبیں ہیں —— حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ۔
دوسری طرف اللہ کے کچھ بندے ہیں جو اپنے کو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو اللہ کی ہدایت اور دینِ حق پر قائم رکھنے کے لئے اور امت کے غفلت زدہ طبقوں میں ایمانی شعور پیدا کرنے اور اللہ کے بچھڑے ہوئے بندوں کو اُس سے قریب کرنے کیلئے اپنی سی کوششیں کر رہے ہیں —— یہ گروہ اپنے پیش رو انبیاء علیہم السلام کی طرح ظاہری ساز و سامان اور اسبابِ ترغیب سے خالی ہاتھ ہے، بلکہ اس کی دعوت قبول کرنے اور اس کا ساتھ دینے میں لوگوں کو

جہد و مشقت اور نفس کشی کی مسلسل تکلیفوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ___ حُفَّتِ الجَنَّۃُ بِالمَکَارِہِ۔
لیکن کوئی شبہ نہیں کہ پہلے گروہ کا ساتھ دینے والے اللہ و رسول اور بنی آدم کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ خبیث دشمن یعنی شیطان کے مددگار اور اُس کے لشکری ہیں ___ اُولٰئِکَ حِزْبُ الشَّیطَانِ اَلَا اِنَّ حِزْبَ الشَّیطَانِ ھُمُ الخٰسِرُونَ۔
اور دوسرے گروہ کا ساتھ دینے والے اللہ و رسول کے وفادار سپاہی اور بنی آدم کے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں اور دنیا کے لئے ان کا وجود سراپا خیر و برکت ہی اور فلاح و کامیابی انھیں کے لئے ہے ___ اولئک حزب اللہ الا انّ حزب اللہ ھم المفلحون ۔
اللہ کے یہ بندے اگر اپنی اصلاحی کوششوں میں بظاہر کامیاب نہ بھی ہوں اور فرض کیجئے کوئی ایک شخص بھی ان کی بات نہ مانے جب بھی یہ کامیاب اور بامراد ہیں کیونکہ اللہ کی طرف سے ان کو اجر و انعام نتائج پر نہیں بلکہ صرف کوشش پر ملنے والا ہی ___ لیس للانسان الا ما سعیٰ وان سعیہ سوف یریٰ ثم یجزاہ الجزاء الاوفیٰ۔

آپ اپنے دل سے پوچھئے کہ دعوتِ خیر اور دعوتِ شر کی اس کشمکش اور اصلاح و افساد کی کوششوں کے اس معرکہ میں وہ کس فریق کا ساتھ دینا چاہتا ہے؟ اور ابتک کی اپنی عملی زندگی کا بھی جائزہ لیجئے کہ آپ کے طرزِ زندگی سے کس گروہ کے ساتھ آپ کی مناسبت اور موافقت معلوم ہوتی ہی، آیا شیطان اور اُس کے مددگاروں کی تائید ہو رہی ہی یا اللہ و رسولؐ کے وفاداروں اور دینِ حق کے خدمت گذاروں کی؟۔
شیطان چاہتا ہے اور اس کی کوشش ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اُمتیوں میں یہود و نصاریٰ اور ایمان و ہدایت سے محروم دوسری جاہلی قوموں کی بُرائیاں پیدا کرے اور ان کو اُن کے قدم بقدم چلائے ___ اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بڑی گہری خواہش ہی کہ اُن کے اُمتی پوری استقامت کے ساتھ دینِ حق اور صراطِ مستقیم پر قائم رہیں، اور ان کی زندگی خالص ایمانی و اسلامی زندگی رہے ___ سوچئے کہ آپکے طرزِ عمل سے شیطان کا منشاء پورا ہو رہا ہی یا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا، اور فیصلہ کیجئے کہ آپ کی

زندگی کے جو دن باقی ہیں اُن میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مُبارک خواہش کی تکمیل کیلئے آپ کو کوئی کوشش کرنی ہے یا نہیں۔

کاش ہمارے اور آپ کے کان سُن سکتے، محمد رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رُوحِ پاک کی طرف سے "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللہِ؟" کی پُکار، اور "هَلُمُّوا اِلَیَّ هَلُمُّوا اِلَیَّ" کی صدا آج بھی بلند ہو رہی ہے۔

اکابر جمعیۃ العلماء اور الفرقان

(از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ)

جب کسی بستی کی آب و ہوا خراب ہوتی ہے اور کوئی وبائی مرض پھیل جاتا ہے تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کی طبیعت معمولی طور پر بھی خراب ہو تو اچھے خاصے حاذق حکیموں اور ڈاکٹروں کا خیال بھی اُس وبائی مرض ہی کی طرف جاتا ہے اور وہ اسی کا علاج شروع کر دیتے ہیں —— علیٰ ہذا جب کسی جگہ کوئی اخلاقی جرم کثرت سے ہونے لگتا ہے تو بہت سے غیر مجرم بھی صرف شبہ کی بناء پر پکڑ لئے جاتے ہیں، اسلئے دانشمندوں کا کہنا ہے کہ ایسے وقتوں میں آدمی کو بہت زیادہ محتاط رہنا چاہئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کل خیر خواہی و خیر اندیشی کی بنیاد پر مخلصانہ مشورے دینے کا اور کسی فرد یا جماعت کے محاسن و خدمات کے دلی اعتراف اور واجبی احترام کے ساتھ کسی فریضہ کی طرف بھی اس کو توجہ دلانے کا رواج بہت کم ہے —— بلکہ اس کے بجائے یا تو اپنوں کی طرف سے اندھا دھند قصائد خوانی اور پروپیگنڈا کے اصول پر صرف مناقب شماری ہوتی ہے جس میں صحیح غلط اور جھوٹ سچ کا لحاظ رکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، یا غیروں اور مخالفوں کی طرف سے معاندانہ تنقید اور نکتہ چینی ہوتی ہے جس کا مقصد اُس فرد یا جماعت کو گرانے، اُس کے اثر کو کم کرنے اور اُس کے خلاف فضا کو تیار کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور اسی لئے اس میں افترا و بہتان سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا —— بہرحال یہ اس وقت کی عام بیماری ہے جو وبا کی شکل اختیار کر چکی ہے اس لئے کوئی شخص اگر مخلصانہ طور پر بھی کسی کو اسکی کسی فرو گذاشت یا کسی فریضہ کی طرف توجہ دلانا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے امکان بھر پوری احتیاط سے کام لے، اگر اس سے احتیاط میں ذرا بھی کمی ہوئی تو اس کا بہت امکان ہے کہ اس کو بھی

وبائے عام کا مریض اور بدخواہ و معاند ہی سمجھ لیا جائے اور اس کے ساتھ اور انہی کے مخلصانہ مشوروں کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو اس زمانہ میں مخالف افراد یا پارٹیوں کے ساتھ یا اُنکے اعتراضات کے ساتھ کیا جاتا ہے ـــــ اسوقت اس سلسلہ کے ایک تازہ تجربہ کا ذکر کرنا ہے۔

چند مہینے ہوئے بعض اخباری اشتہارات سے "شیخ الہند جنتری" کا علم ہوا، اور ان اشتہارات ہی سے اس جنتری کی یہ خصوصیت بھی معلوم ہوئی کہ جمعیۃ العلماء کے چند اکابر کی اس میں تصویریں بھی ہیں۔ چونکہ اکثر بزرگانِ جمعیۃ کے متعلق راقم سطور کو ذاتی طور پر اس کا علم اور اندازہ تھا کہ وہ حضرات تصویر کشی کو جائز نہیں جانتے ہیں، اس لئے اس کا تو شبہ بھی نہیں ہوا کہ یہ تصویریں ان حضرات کی رضامندی سے شائع کی گئی ہوں گی بلکہ جنتری کے ناشر ہی کو میں نے اس کا ذمہ دار سمجھا ـــــ البتہ مجھے اس سے یہ خیال ضرور ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے اور جمعیۃ العلماء سے عقیدت و وابستگی رکھنے والے حلقہ کی دینی حس میں بھی شائد اب اتنا فرق آگیا ہے کہ جنتریوں کا کاروبار کرنے والوں کو اس طرح کی باتصویر جنتری کے اس حلقہ میں مقبول ہونے اور کثرت سے خریدے جانے کی اب اُمید ہے ـــــ اسے تاثر و احساس کی شدت کہئے یا مالیخولیا، مگر واقعہ یہی ہے کہ دین کے ضعف و غربت کے اس دور میں جب کبھی کسی پُرانے دیندار خاندان کے نوجوانوں میں یا کسی دینی درسگاہ کے طالب علموں میں یا کسی ممتاز دینی حلقہ سے تعلق رکھنے والوں میں دینی احساس اور دینی فکر کی کمی مجھے محسوس ہوتی ہے تو طبیعت اس سے بہت متفکر اور متاثر ہوتی ہے ـــــ بہرحال اسی تاثر کے ماتحت میں نے رجب کے "الفرقان" میں "اکابر جمعیۃ العلماء اور شیخ الہند جنتری" کے عنوان سے ایک مختصر نوٹ لکھا، جس کا مقصد اتنا ہی تھا کہ بزرگانِ جمعیت کو اس صورتِ حال کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ اگر وہ اس کو کسی فکر اور توجہ کے قابل سمجھیں تو توجہ فرمائیں۔ ناظرین کرام رجب کے پرچہ میں وہ نوٹ پڑھ چکے ہیں۔

لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے چونکہ اس زمانہ میں معاندانہ اعتراضات اور حاسدانہ نکتہ چینیوں ہی کا رواج عام ہے اور یہ اس دور کی وبائی بیماری ہے اسلئے غریب "الفرقان" کے اس نوٹ کو بھی بہت سے حضرات نے جمعیۃ پر اسی قسم کا ایک معاندانہ حملہ اور حاسدانہ اعتراض سمجھا ـــــ "اکابر" کے بعض اصاغر نے جو کچھ اس سلسلہ میں کہا، یا خطوط میں لکھا وہ تو نظر انداز کرنے ہی کے

قابل تھا، لیکن جمعیۃ العلماء کے ناظم اور میرے خاص محترم جناب مولانا محمد میاں صاحب نے اس نوٹ کے متعلق جو بیان "الجمعیۃ" میں شائع فرمایا اس کو پڑھ کر میں نے ضروری سمجھا کہ جو غلط فہمی مولانا موصوف کو ہوئی ہے یا ان کے اس بیان سے جو غلط فہمیاں بہت سوں کو ہوئی ہونگی اُن کے ازالہ کی کوشش کی جائے ــــ چنانچہ موصوف کی خدمت میں میں نے ایک مفصل عریضہ لکھا، اور درخواست کی کہ اس کو "الجمعیۃ" میں بھی شائع فرمادیا جائے تاکہ جن حضرات نے "الجمعیۃ" میں مولانا کا بیان پڑھا ہو ان کی نظر سے یہ عریضہ بھی گذر جائے، لیکن نہ معلوم اس کو قابلِ اشاعت نہیں سمجھا گیا یا کوئی اور وجہ ہوئی، بہر حال "الجمعیۃ" میں شائع نہیں ہوا ــــ پچھلے دنوں سہارنپور اور دہلی کے سفر کا اتفاق ہوا تو جمعیۃ کے حلقہ سے تعلق رکھنے والے بعض حضرات نے اس سلسلہ میں جو گفتگوئیں اس عاجز سے فرمائیں ان کے بعد اس خط کی اشاعت کی اور زیادہ ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اس اشاعت میں اس کو شائع کیا جارہا ہے ــــ الفرقان کے ذریعہ یہ خط اگرچہ "الجمعیۃ" کے سب قارئین تک تو نہ پہنچ سکے گا تاہم بہت سوں تک انشاء اللہ ضرور پہنچ جائے گا اور کم از کم ان ہی کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی یا کم ہو جائینگی۔ پھر چونکہ میرے اس خط کے بعض اجزاء کو سمجھنے کے لئے مولانا محمد میاں صاحب کا وہ بیان بھی سامنے ہونا ضروری ہے اس لئے وہ بھی ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

ان دونوں تحریروں کی اس طرح اشاعت کا مقصد صرف غلط فہمیوں کا ازالہ اور اصلاح ذات البین کی کوشش ہے خدانخواستہ کسی بحث وجدال کا دروازہ کھولنا مقصود نہیں ہے۔

محترمی مولانا محمد میاں صاحب نے اپنے بیان میں "الفرقان" کے متعلق جن خیر اندیشیوں اور نیک گمانیوں کا اظہار فرمایا ہے اس کے لئے میں خلوص دل سے ان کا شکر گذار ہوں، اور میری اخلاقی تربیت کی جو مجاہدانہ کوشش فرمائی ہے اُس کا بھی ممنون ہوں۔

ــــ ۱ ــــ

ناظم جمعیۃ العلماء مولانا محمد میاں صاحب کا بیان

"معترضین کو جواب"

ــــ پچھلے دنوں اجلاس لکھنؤ کے موقع پر ایک گریجوٹ نوجوان نے جو کچھ عرصہ سے ادارۂ الجمعیۃ سے

بحیثیت منصب ایڈیٹر وابستہ ہیں شیخ الہند جنتری شائع کی اور غالباً اس خیال سے کہ علماء سے نئے تعلق پیدا کرنے والے حضرات میں بہت سے نوجوان انکے ہم خیال و ہم مذاق ہوں گے، جنتری کے ایک ورق پر شیخ الاسلام مدظلہ العالی اور چند دوسرے ہندو مسلم زعماء کے فوٹو بھی شائع کر دیئے۔

ان کے ایک دوست نے بفرمائش یا بلا فرمائش اس جنتری پر تبصرہ بھی لکھ دیا، اور جبکہ جمعیۃ علماء کے جملہ ذمہ دار حضرات دہلی سے دور رہے اور جمعیۃ علماء ہند کا دفتر اجلاس عام جمعیۃ علماء ہند منعقدہ لکھنؤ کے موقع پر لکھنؤ بلایا گیا تھا۔ روزنامہ الجمعیۃ میں اس تبصرہ کو شائع بھی کر دیا ہے جیسے ہی یہ تبصرہ نظر سے گذرا حضرت مولٰنا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند نے ان دونوں صاحبان کو بلا کر سخت تنبیہ کی۔ مولٰنا موصوف کے نزدیک یہ جرم اس قابل تھا کہ ان دونوں صاحبان کا تعلق ادارۂ الجمعیۃ سے منقطع کر دیا جاتا، لیکن ان دونوں نوجوانوں نے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معذرت کی لہٰذا اس آخری سزا کو مناسب نہیں سمجھا گیا اور صرف آئندہ کے لئے فہمائش کر دی گئی اور جو کچھ اب تک ہو چکا تھا اسی کے متعلق احقر نے بحیثیت نگراں ایک معذرت تحریر کر کے دفتر الجمعیۃ میں اشاعت کے لئے بھیجدی، چنانچہ روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۲۳ اپریل ۴۹ء کے صفحہ ۵ پر "ضروری اعتذار" کے عنوان سے یہ معذرت شائع کی گئی۔ اعتذار میں تحریر ہے۔

"یہ تبصرہ تبصرہ نگار کے اپنے مذاق اور رجحان کے مطابق ہے، جماعت کے خیالات و عقائد سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ادارۂ تحریر کے کسی رکن کے ذاتی خیالات جمعیۃ علماء کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں لیکن ہم اس فرق کو نظر انداز کر کے اس حقیقت کے اس اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ جماعت کے مسلک کے خلاف روزنامہ الجمعیۃ میں اس کی اشاعت ناقابل برداشت ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے اکابر خصوصاً وہ حضرات جن کے فوٹو اس جنتری میں موجود ہیں بارہا اس سے بیزاری کا اعلان کر چکے ہیں اور جہاں بھی موقع ملتا ہی فوٹو گرافروں کو

سختی سے منع بھی کرتے ہیں لیکن تہذیب جدید کی ترقی کے دور میں منع کرنے کے باوجود فوٹو گرافر فوٹو لینے سے باز نہیں آتے لہٰذا ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس تصویر سے جماعت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس اعتذار کے بعد توقع تھی کہ اراکین جمعیۃ علماء ہند کے متعلق کوئی انصاف پسند بھی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوگا اور نہ جمعیۃ علماء ہند کے کسی رکن کو تصویر کشی اور فوٹو کے مسئلہ میں نشانۂ ملامت بنایا جائے گا، لیکن "الفرقان" بابت ماہ رجب کے صفحات میں ایک مضمون بعنوان "شیخ الہند جنتری اور اکابر جمعیۃ العلماء" نظر سے گزرا جسمیں جمعیۃ علماء کے خلاف پوری طرح زہر اگلا گیا ہے۔

مضمون کے مطالعہ سے مسرت بھی ہوئی اور صدمہ بھی ہوا، اگر احقر کا اعتذار مضمون نگار صاحب کے ملاحظہ سے مشرف نہ ہو سکا تھا تو مضمون نگار صاحب کیلئے یہ مشکل نہ تھا کہ احقر کو توجہ دلاتے اور جس طرح بہت سے مسائل پر زبانی یا تحریری گفتگو ہوتی رہتی ہے اس سلسلہ میں بھی دو حرف لکھ دیتے۔

اس بے التفاتی اور تحقیق و تفتیش سے بے اعتنائی کے باوجود مضمون نگار صاحب کا یہ جملہ کس درجہ غیر محتاط اور مغالطہ آمیز ہے، اگرچہ بعض کے متعلق یہ معلوم ہے کہ شریعت کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بالاتر ہو گئے ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد اور ان تمام مصائب کے بعد بھی جو گذشتہ سال آخر سال میں انڈین یونین کے مسلمانوں پر آئیں، اس میں خدا کے فضل سے جمعیۃ علماء ہند کے خدام ہی ہر موقع پر سینہ سپر ہو کر ان مصائب کا مقابلہ کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ ایسے رسالے موجود ہیں جو جمعیۃ علماء کے خلاف طرح طرح کے الزام تراش رہے ہیں اور بظاہر عام مسلمانوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے وہ اس صورت کو سہل و آسان سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ رسالہ "الفرقان" کا معیار جملہ اخبارات و رسائل سے بلند ہے اور ہم اس کو ایک بلند معیار رسالہ ہی دیکھنا چاہتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ یہ فقرہ "الفرقان" کی پیشانی پر ایک کلنگ ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس طرح

اپنے یقین کو غلط قرار دیکر باور کرلیں کہ جن بزرگوں کے فوٹو شائع کردیئے گئے ہیں اُن میں سے بعض دو تین جو بقول مضمون نگار شریعت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بالاتر ہوگئے ہیں۔

ہم نہ صرف ان بزرگوں کے بلکہ شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز سے تعلق رکھنے والے جمعیۃ علماء ہند کے جملہ اکابر میں سے ہر ایک کے اقوال اور اعمال پر نظر ڈال رہے ہیں مگر کسی صاحب کے متعلق بھی مضمون نگار صاحب کا الزام صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

مضمون نگار صاحب کا فرض تھا کہ دو ایسے بزرگوں کا نام پیش کردیتے اور شریعت کی ان باتوں کا بھی تذکرہ کردیتے جن سے یہ حضرات بالاتر ہوگئے ہیں تاکہ پڑھنے والے مغالطہ میں مبتلا نہ ہوں۔ اور یہ وہم نہ پیدا ہوتا کہ کسی خرابی کی اصلاح مقصود نہیں بلکہ جمعیۃ علماء کے برخلاف تمام مسلمانوں میں غلط فہمی پھیلانے کے لئے یہ مبہم فقرہ استعمال کیا گیا ہے۔

اگر مرضی کے خلاف کسی کے فوٹو کی اشاعت شریعت کے احکام سے بالاتری ہے تو جمعیۃ علماء ہند کے اکابر کی تحقیق غلط ہے۔

آج ہندوستان کا کون سا ممتاز بزرگ ہے جس کا فوٹو اخبارات میں شائع نہ ہوچکا ہو۔ اس فقرہ کے بعد مضمون نگار صاحب نے محض اس وہم کی بناء پر کہ فوٹو چھاپنے کی جرأت اس لئے ہوئی ہے کہ جمعیۃ علماء سے تعلق رکھنے والوں کا مذہبی احساس کمزور ہوگیا ہوگا۔

جو کچھ تحریر فرمایا ہے جس میں مداہنت، اجارہ سوء وغیرہ سب کچھ آگیا ہے وہ شائد ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ کی کوئی نئی تفسیر ہے جو حال ہی میں حضرت مضمون نگار صاحب پر منکشف ہوئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء ہند

— ۲ —

ناچیز مدیر "الفرقان" کا توضیحی خط

(از بندۂ ناچیز محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ)

بگرامی خدمت کرمی محترمی جناب مولانا محمد میاں صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ــــ خدا کرے مزاج بعافیت ہو!

کئی روز ہوئے ایک صاحب نے جناب کا وہ بیان دکھلایا جو الفرقان (ماہ رجب) کے ایک نوٹ سے متعلق گذشتہ ہفتہ الجمعیۃ کی کسی اشاعت میں شائع ہوا ہے، اُسے پڑھ کر چند باتیں عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو بے تکلف پیش خدمت ہیں۔

۱۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ "شیخ الہند جنتری" اور اس پر "الجمعیۃ" کے تبصرہ سے متعلق جس اعتذار کا حوالہ جناب نے اس بیان میں دیا ہے وہ میں نے ابتک بھی نہیں دیکھا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اعتذار اس مقصد سے غیر متعلق ہے جس کے لئے لکھنے والے نے الفرقان کا وہ نوٹ لکھا تھا ــــ (اور شائد یہ معلوم کر کے آپ کو اور تعجب ہو گا کہ مجھے تو ابتک بھی یہ معلوم نہ تھا کہ اس جنتری کے شائع کرنے والے الجمعیۃ کے ادارتی اسٹاف سے تعلق رکھنے والے کوئی صاحب ہیں اور یہ کہ "الجمعیۃ" میں اس جنتری پر کوئی تبصرہ بھی شائع ہوا ہے۔ مجھے اس کا علم تو آپکے اس بیان ہی سے ہوا ہے)۔

۲۔ بیشک کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جمعیۃ العلماء کے کسی بزرگ کی تصویر کہیں دیکھ کر ازراہِ نادانی یا ازراہِ عناد و شرارت اُن بزرگوں کو یا جمعیۃ العلماء کی پوری جماعت ہی کو اس کا ذمہ دار گردانتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ حضرات اپنی مرضی سے اپنی تصویریں کھنچواتے اور شائع کراتے ہیں لیکن اگر الفرقان کا وہ نوٹ جناب نے خود پڑھا ہو گا تو جناب کو معلوم ہو گا کہ اس میں یہ نادانی یا شرارت نہیں کیگئی ہے بلکہ اپنے ذاتی علم کی بنا پر صراحۃً اس میں اس کی نفی اور تردید کی گئی ہے اور صاف لکھا گیا ہے کہ تصویروں کی اشاعت کی ذمہ داری جنتری کے ناشر ہی پر ہے ــــ میں اس نوٹ کے ان فقروں کو پھر دہراتا ہوں۔

یہ لکھنے کے بعد کہ "الجمعیۃ اور بعض دوسرے اُردو اخباروں میں شیخ الہند نامی ایک جنتری کا اشتہار کچھ عرصہ سے شائع ہو رہا ہے جس کی خصوصیت اس اشتہار میں یہ بتلائی گئی ہے کہ اس میں جمعیۃ العلماء کے بزرگوں کی تصویریں ہیں اور خصوصاً حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی تصویر کی بڑی اہمیت

ظاہر کی گئی ہے" ــــــ ناچیز نے لکھا تھا کہ

"راقم سطور کو کم از کم مولٰنا ممدوح (یعنی حضرت مولٰنا مدنی مدظلہٗ) کے متعلق تو ذاتی طور پر معلوم ہی کہ موصوف تصویر اور اسکی اشاعت کو قطعاً ناجائز جانتے ہیں اور اس قسم کی حرکتوں سے سخت ناراض اور رنجیدہ ہوتے ہیں، اور خیال یہ ہی کہ مولٰنا ممدوح کے علاوہ جمعیۃ کے جن دوسرے اکابر کے فوٹو اس جنتری میں شائع کئے گئے ہیں غالباً ان میں سے اکثر اس بارہ میں حضرت مولٰنا سے مختلف رائے نہ رکھتے ہوں گے (اگرچہ بعض کے متعلق تو معلوم ہی کہ اب وہ شریعت کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بالاتر ہو گئے ہیں) بہرحال تصویروں کی اشاعت کی ذمہ داری تو جنتری کے ناشر ہی پر ہی"

(الفرقان ماہ رجب ؁)

اس عبارت سے ظاہر ہی کہ آپکے اعتذار کے علم میں آنے سے پہلے ہی میں اپنے ذاتی علم و اندازہ کی بنا پر اس کی نفی اور تردید کر چکا ہوں کہ جنتری میں اکابر جمعیۃ کی تصاویر کی اشاعت کی ذمہ داری خود ان اکابر پر یا جمعیۃ پر ہو بلکہ میں نے صرف ناشر ہی کو ذمہ دار قرار دیا ہی، لیکن جن لوگوں نے الفرقان کا وہ نوٹ خود نہیں پڑھا، وہ آپ کے بیان سے یہ سمجھتے ہیں کہ الفرقان نے خود ان بزرگوں کو یا جمعیۃ کو تصاویر کی اشاعت کا ذمہ دار قرار دینے کی عامیانہ یا سوقیانہ حرکت کی ہی ــــ آپنے تو ہرگز اس کا ارادہ نہ فرمایا ہو گا لیکن آپ خود بھی غور فرمائینگے تو اندازہ فرمائیں گے کہ یہ غلط فہمی آپکے بیان سے ہوتی ضرور ہی۔

۳۔ الفرقان کی مذکورۂ بالا عبارت میں بعض حضرات کے متعلق بین القوسین جو فقرہ ہی آپنے اپنے علم و اندازہ کی بناء پر اس کی واقعیت سے بڑی قوت کے ساتھ انکار فرمایا ہی۔ میرا خیال ہی کہ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا اور اس بارہ میں میرا کوئی ذاتی علم نہ ہوتا تو میں بھی اس کو ماننے کے لئے شائد آسانی سے تیار نہ ہوتا، لیکن

میرا معاملہ یہ ہے کہ اس بارہ میں میرا علم ذاتی اور بلا واسطہ ہے۔ آپ کے غصہ کو اپنے ایک مخلص دوست کا غصہ سمجھ کر اس سے ڈر تو سکتا ہوں اور رنجیدہ ہو سکتا ہوں لیکن جو بات یقین کے ساتھ علم میں ہے اس کو غلط سمجھ لینا شائد کسی کے بھی بس میں نہیں۔

ان صاحب کا نام ظاہر نہ کرنے میں نہ تو اُن کی رعایت مقصود ہے نہ اُن کے غصہ یا ناراضی کا خوف مانع ہے بلکہ ایک اصولی دینی مصلحت کا میرے نزدیک یہ تقاضہ ہے کہ نام ظاہر نہ کیا جائے[1]۔ انشاء اللہ عند الملاقات میں تفصیل سے اپنا نظریہ اس بارہ میں عرض کردوں گا، اس کے بعد بھی اگر جناب کی رائے نام ظاہر کر دینے ہی کی ہو تو میں مانع نہ ہوں گا۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اُس فقرہ کے مضمون کی واقعیت اور عدم واقعیت سے متعلق تھا لیکن اب مجھے اس احساس سے سخت افسوس اور ندامت ہے کہ اس فقرہ کی تعبیر میں طنز کا رنگ آگیا ہے جس کو میں خود غلط اور مقصدِ اصلاح کے لئے زہر سمجھتا ہوں، اللہ تعالیٰ میری اس غلطی کو معاف فرمائے اور مستقبل میں اس سے بچنے کی توفیق دے۔ کیا عرض کروں عمر بھر کی پڑی ہوئی عادتوں سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔

۴۔ الفرقان کے اس نوٹ میں جس چیز کی طرف بزرگانِ جمعیۃ کو خاص طور سے توجہ دلائی گئی تھی اور جس کی فکر کی خصوصیت سے استدعا کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ اس قسم کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ جمعیۃ العلماء سے عقیدت و وابستگی رکھنے والا جو

---

[1] میرا خیال یہ ہے کہ اگر کوئی صاحب جو عالم دین سمجھے جاتے ہوں اور اس حیثیت سے شہرت رکھتے ہوں، رواج اور فیشن میں آئی ہوئی کسی معصیت کو اگر وہ ہلکا سمجھتے ہوں تو جب تک وہ خود اپنی اس رائے کی تشہیر نہ کریں دوسروں کو بھی نہ چاہیے کہ وہ عوام کے علم میں اس چیز کو لائیں کہ فلاں مولانا صاحب اس فعل کو گناہ نہیں سمجھتے یا معمولی بات سمجھتے ہیں ورنہ معصیت پسندی کے اس زمانہ میں اس معصیت کے شوقین ان صاحب کے نام کو بھی اپنی ایک سند بنا لینگے — اپنے اس خیال کی بناء پر میں نے اُن صاحب کے نام کا اظہار مناسب نہیں سمجھا تھا۔ نعمانی غفرلہ

حلقہ ہی اس کی بھی دینی حس روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے یہاں تک کہ جنتریوں کا کاروبار کرنے والے لوگوں نے بھی اس کا اندازہ لگا لیا ہے کہ یہ حلقہ اس قسم کی مصور جنتری کو کثرت سے خریدے گا۔ جناب نے اس کو صرف "وہم" قرار دیا ہے، میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ خواہ مخواہ اس کو حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کروں اگر آپ حضرات اس بارہ میں مطمئن ہیں کہ حقیقت یہ نہیں ہے اور آپ کا یہ اطمینان برحق ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے بھی وہ اطمینان نصیب فرما دے کہ ذہن و قلب کی ہر وقت کی فکر اور پریشانی سے نجات ملے۔

اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ الفرقان کے اُس نوٹ میں جمعیتہ العلماء سے عقیدت و وابستگی رکھنے والے حلقہ ہی کی دینی حس کے ضعف و زوال کا ذکر کیا گیا تھا کیونکہ متعلقہ واقعہ کا تعلق اسی حلقہ سے تھا لیکن جن حضرات کی نظر سے الفرقان مسلسل گزرتا ہو گا وہ اس سے ناواقف نہ ہوں گے کہ اس نوٹ کے لکھنے والے کا احساس مسلمانوں کے تمام عام و خاص طبقوں کے متعلق کم و بیش یہی ہے کہ ان کی دینی حس میں اضمحلال و زوال کا عمل تیزی سے جاری ہے اور کسی طبقہ کا استثنا بھی اس سے مشکل ہے۔ الفرقان کی شائد کوئی اشاعت ایسی نہیں ہوتی جو اس افسوسناک صورت حال کے ذکر و فکر سے خالی جاتی ہو، اسی کی فکر اور اس کے لئے جدوجہد کی دعوت الفرقان کا خاص موضوع ہے۔

اس سلسلہ میں عمومی طور پر یا کسی خاص طبقہ کے متعلق جب کچھ لکھا جاتا ہے تو اس کا مقصد اعتراض و الزام نہیں ہوتا بلکہ اصلاح حال کی طرف توجہ دلانا اور اس کی فکر اور ضرورت کا احساس پیدا کرنا پیش نظر ہوتا ہے۔ یہ تو ہے اپنا مستقل اصول جس پر چلنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن بغیر کسی رسمی انکسار کے اعتراف ہے کہ نفس کے بُرے جذبات سے رہائی اب تک نصیب نہیں ہوئی ہے "وما اُبرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوٓء"—— اس لئے الفرقان کے اصلاحی اور دعوتی مضامین میں جب کبھی اللہ کے کسی بندہ کو الزام اور طعن و طنز کا رنگ نظر آئے اُن کا حق ہے کہ وہ ضرور تنبہ فرمائیں، میں اُن کو

اپنا محسن سمجھوں گا اور شکر گزار ہوں گا۔

حضرت عمرؓ پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں کتنا اچھا سبق دیا۔

"احب الناس الیّ من رفع عیوبی الیّ"

۵- الفرقان کے اس نوٹ کا آخری حصہ جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے کہ

"ہم سب کو سوچنا چاہئے کہ ہماری ہی کسی مسامحت یا مداہنت کا تو یہ نتیجہ نہیں ہے الخ"

—— آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس کا تعلق صرف حضرات جمعیۃ سے سمجھا ہے اور اس لئے آپ کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی ہے حالانکہ میں نے دانستہ طور پر یہاں سے خطاب کا رُخ بدلا ہے اور جمعیۃ کے حضرات سے خصوصی خطاب کے بجائے اپنے کو بھی شامل کر کے عام خطاب کیا ہے۔

میری مستقل رائے ہے کہ اُمت میں دینی حس کے اس زوال و انحطاط اور دین سے کم تعلقی کی ذمہ داری کچھ نہ کچھ ہم سب ہی پر ہے، اور اصلاح و احتساب اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو ہمہ گیر نظام اسلام نے قائم کیا تھا اور ہر زمانہ کے اہلِ دین پر جس کی خاص ذمہ داری تھی صدیوں سے اس کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے اور خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں اس کی طرف سے تغافل شائد ہمیشہ سے زیادہ بڑھ گیا ہے

خاصکر وہ معاصی اور مفاسد جن کو فیشن نے سندِ جواز دیدی ہے اور قوم کے مترفین نے جن کو اختیار کر لیا ہے اُن پر روک ٹوک نہ کرنے اور اُن کے مرتکبین سے بغض و ناراضی کا اظہار نہ کرنے میں ہمارا طرزِ عمل کچھ ویسا ہی ہوتا جا رہا ہے جو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی مشہور حدیث میں بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے اور قرآن پاک نے جس کو اُن کی ملعونیت کے اسباب میں سے ایک سبب قرار دیا ہے —— اور جیسا کہ میں نے عرض کیا میں اس کو اس زمانہ کی ایک عام بلا سمجھتا ہوں جس سے مختلف دینی حلقوں کے بعض خاص خاص افراد تو مستثنیٰ ہو سکتے ہیں لیکن میرے اندازہ میں کوئی طبقہ اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا اور "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" کے ماتحت ہر طبقہ

اور ہر جماعت کے اکابر اور ذی اثر حضرات کی خصوصی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے طبقہ کے عوام کی اصلاح و احتساب کی خاص فکر کریں ــــ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو اللہ کے جس بے لاگ قانون نے بنی اسرائیل جیسی عزیز و محترم قوم اور نبوت کی نسل کو خیر و برکت سے محروم کر دیا، وہ یہاں بھی اپنا منصفانہ عمل کرے گا۔

"سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا"

الغرض الفرقان کے نوٹ کے اس آخری حصہ میں میں نے اپنے اس خیال کے مطابق وہی عام بات کہی تھی جو میں الفاظ و عنوانات کے اختلاف کیساتھ الفرقان میں برابر کہتا رہتا ہوں (اور میرا خیال یہ ہے کہ اگر آپ بھی کسی وقت ٹھنڈے دل سے اس پر غور فرمائیں تو اس سے انکار اور اختلاف نہ کر سکیں گے) لیکن آپ نے اس کو خاص جمعیۃ العلماء کے حضرات سے متعلق سمجھ کر تکلیف محسوس فرمائی اور شائد اس تاثر کی حالت میں بعض وہ باتیں لکھ دیں جو سکون و سنجیدگی کی حالت میں شائد آپ نہ لکھتے۔ اللہ تعالیٰ ہماری لغزشوں کو معاف فرمائے اور حقائق بینی کی توفیق دے۔

خدا کرے کہ یہ توضیحات الفرقان کے اس نوٹ کا مقصد اور میری پوزیشن واضح کرنے میں مفید ہوں۔ والسلام - نیازمند :- محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

تصوف وسلوک

(از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی)

(۳)

مجاہدہ ذکر اس کا تھا کہ اشغال ومراقبات وغیرہ تصوف کے مقاصد نہیں تدابیر ہیں۔ یہی حال مجاہدات اور ترک تعلقات کا بھی ہے کہ وہ مقصود وما مورٌ اعمال وطاعات یا قرب ورضا کی راہ کی جد وجہد سعی وتدبیر کا نام ہیں، خود مقصود نہیں۔ مجاہدہ کی حقیقت نفس کی مخالفت کی مشق وعادت ہے کہ حق کی رضا وطاعت کے مقابلہ میں نفس کی جانی مالی اور جاہی خواہشات ومرغوبات کو مغلوب رکھا جا سکے جس کی قرآن نے جامع تعبیر "جہاد بالانفس والاموال" سے فرمائی ہے اور اسی مجاہدہ پر ہدایت کا قطعی وعدہ ہے "اَلَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا" اور حضرت جامع المجددین کے جامع الفاظ میں اس مجاہدہ کی تجدید وتحقیق یہ ہے کہ

> نفس کے مطالبات دو قسم کے ہیں حقوق[1] اور حظوظ[2]۔ حقوق وہ جن سے قوام بدن اور بقائے حیات ہے، اور حظوظ وہ جو ان سے زائد ہوں۔ پس مجاہدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "حقوق کو باقی رکھے اور حظوظ کو فانی کرے"۔

اس میں جس طرح ایک طرف افراط کی بے اعتدالی یہ ہے کہ ساری زندگی حظ نفس کی نذر کردی جاتی ہے، اُسی طرح تفریط کی بے احتیاطی یہ ہے کہ بہتوں نے مجاہدہ کا مطلب جوگیوں اشراقیوں ہی کی طرح یہ سمجھ رکھا ہے کہ حقوقِ نفس کو بھی فنا کر دیا جائے، بلکہ روحانی نجات نام اسی کا رکھ لیا ہے کہ اس مادی وجسمانی زندگی میں مادی وجسمانی حاجات سے نجات حاصل کرلی جائے۔

> آج کل صوفی بھی اکثر اس میں مبتلا ہیں کہ جس قدر نفس کی مخالفت ہوگی اُسی قدر زیادہ راضی ہوں گے۔ اگرچہ وہ مخالفت نفس شریعت کے خلاف بھی ہو۔ چنانچہ بعضوں کو خبط ہوتا ہے کہ اپنے اوپر گوشت حرام کر لیتے ہیں،

اسی طرح بعضے سرد پانی نہیں پیتے، بعضے چارپائی پر نہیں سوتے، اور بعضے جن کو دولتِ اسلام نصیب نہیں یہاں تک بڑھ گئے کہ اپنے اعضا تک سکھلا دیتے ہیں، میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ گرمی کے ایام میں چاروں طرف سے آگ جلا رکھی ہے اور بیچ میں خود بیٹھا ہے۔ یہ سب جہل کی باتیں ہیں۔

لیکن اس سے ان لوگوں پر شبہ نہ کیا جائے جنھوں نے نفس کی اصلاح کے لئے بڑے بڑے مجاہدے کئے ہیں۔ اوّل تو وہ حضرات حدِ اباحت سے تجاوز نہ کرتے تھے، پھر وہ بھی بطور علاج کرتے تھے، عبادت و ذریعۂ قرب نہیں سمجھتے تھے۔ جیسے کوئی شخص کسی مرض کی وجہ سے چند کھانے برائے چندے چھوڑ دے کہ وہ اس کو عبادت نہیں سمجھتا، بلکہ ذریعۂ حصولِ صحت سمجھتا ہے، اور اگر کوئی اس کو ثواب سمجھ کر کرے تو وہ یقیناً گنہگار ہوگا کہ اس نے قانونِ شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا، اور بدعت کے قبح کا یہی راز ہے، لیکن ان حضرات نے صرف بطور علاج کے ترک کیا، بخلاف جہلا کے کہ اس کو دین و عبادت اور ذریعۂ قرب سمجھ کر کرتے ہیں۔

بہرحال نفس کو راحت پہونچانا اور اس کے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے اسی لئے شریعتِ مطہرہ نے ہر چیز کی حد مقرر کر دی ہے۔ حضرت ابو ذرؓ صحابی رات کو بہت جاگتے تھے، حضرت سلمانؓ نے اُن کو روکا، آخر مقدمہ جنابِ نبوی میں گیا، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ سلمانؓ سچ کہتے ہیں۔ اور یہ ارشاد فرمایا "اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا الخ"

(الرفیق فی سواء الطریق ص۲۳ و ۲۴)

بلا ضرورت مشقت مجاہدہ نہیں

غرض مجاہدہ کے معنی نفس کو اس کے حقوق تک سے محروم کر کے خواہ مخواہ مصیبت میں ڈالنے کے بالکل نہیں، بلکہ جہاں تک ہو سکے

بلاضرورت نفس کو مشقت میں ڈالنے کے بجائے سہولت وراحت کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔

فرمایا۔ طریق میں مقصود حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک مشکل ایک سہل تو سہل کو کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ کچھ مجاہدہ بھی تو درکار ہے۔ فرمایا مجاہدہ سے مراد یہ تھوڑا ہی ہے کہ مشقت یا سختی میں پڑو۔ ایک کنواں یہاں مدرسہ میں ہے ایک جلال آباد میں، جو دو ڈھائی میل ہے، تو کیا آپ اس کو افضل سمجھیں گے کہ مثلاً وضو کیلئے پانی وہاں سے لایا کریں۔ مجاہدات وریاضات مقصود بالذات تھوڑا ہی ہیں، ہاں مقصود کے معین ہیں۔ اصل چیز تو مقصود تک پہنچ جانا ہے[1]۔

جس کے لئے ترک لذات بھی ضروری نہیں صرف تقلیل لذات کافی ہے۔

زہد کی حقیقت ایک اہلِ علم نے سوال کیا کہ زہد کی بڑی فضیلت ہے۔

فرمایا۔ زہد ترک لذات کا نام نہیں، محض تقلیل لذات کافی ہے یعنی لذات میں انہماک نہ ہو کہ رات دن اسی فکر میں رہے کہ یہ چیز پکنی چاہئے، وہ چیز منگانی چاہئے۔ کہیں کے چاول اچھے ہیں تو وہاں سے چاول آرہے ہیں۔ کہیں کی بالائی مشہور ہے تو کہہ رہے ہیں کہ بھائی وہاں سے بالائی لیتے آنا۔ نفیس نفیس کھانوں اور کپڑوں ہی کی فکر میں لگے رہنا، یہ البتہ زہد کے منافی ہے، ورنہ اگر بلا تکلف اور بلا اہتمام خاص کے لذات میسر آجائیں تو یہ حق تعالیٰ کی نعمت ہے شکر کرنا چاہئے۔

خاص مشہور مجاہدات اربعہ یہ ہیں۔ قلّتِ طعام[1]، قلّتِ منام[2]، قلّتِ کلام[3]، قلّتِ خلط مع الانام[4]، ان میں بھی اوّل تو مقصود تقلیل ہی ہے وہ بھی بشرط ضرورت اور بقدرِ ضرورت، ورنہ بہت کم کھانا بھی زہد نہیں نہ یہ مقصود ہے، کیونکہ ہمارے کم کھانے سے نعوذ باللہ کوئی خدا تعالیٰ کے خزانہ میں توفیر تھوڑا ہی ہو جائے گی۔ ہاں

---

[1] سوانح صـ۳۳۱

اتنا بھی نہ کھائے کہ پیٹ میں درد ہو جائے۔ ہمارے حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب کا مذاق تو یہ تھا کہ نفس کو خوب آرام سے رکھے لیکن اس سے کام بھی خوب لے۔ میرا تو یہ خیال ہے، کہ "مزدور خوش دل کند کار بیش"۔ جس دن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اچھی چیز پکی ہے اُس دن کام کرتے وقت یہ خوشی رہتی ہے کہ فارغ ہو کر اچھی چیز کھانے کو ملے گی۔ نفس کے واسطے کوئی ابھارنے والی چیز ضرور ہونی چاہئے۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی ہمیشہ ٹھنڈا پینا چاہئے کہ ہر بن مو سے الحمد للہ نکلے، ورنہ گرم پانی پی کر زبان تو الحمد للہ کہے گی دل شریک نہ ہوگا۔[1]

تقلیل سے بھی مراد حضرت کے ہاں شیخ کامل کی تعلیم کے موافق ان چار چیزوں میں محض توسط و اعتدال ہے کہ "نہ اس قدر کثرت کرے جس سے غفلت و قساوت و کاہلی پیدا ہو، نہ اس قدر قلت کہ جس سے صحت و قوت زائل ہو جائے۔"[2] بڑی دولت اس طریق میں قلب کی جمعیت و یکسوئی ہے اس لئے قلب کو تشویش و پریشانی سے بچانا بہت ضروری ہے جس کا ایک بڑا سبب خود اپنی بے عنوانیوں سے صحت کو خراب کر لینا بھی ہے۔

"اس لئے صحت کی بہت حفاظت کرے دماغ اور قلب کی تفریح و تقویت ہمیشہ غذائً و دواءً کرتا رہے۔ غذا میں نہ اتنی کمی کرے کہ ضعف و یبوست ہو جائے، نہ اس قدر افراط کہ ہضم میں فتور ہو جائے۔ ...... جب تک صادق رغبت نہ ہو کھانا نہ کھائے اور ایک آدھ لقمہ کی اشتہا باقی رہنے پر چھوڑ دے۔ ... اسی طرح سونے میں اعتدال رکھے، نہ بہت زیادہ سوئے کہ کسل ہو نہ بہت کمی کرے کہ یبوست ہو جائے۔"

اور خلط مع الانام میں، جس طرح لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا اور دوستی بڑھانا مضر ہے اسی طرح خواہ مخواہ دشمنی خریدنا بھی بُرا ہے، کہ

---

[1] اشرف السوانح ص۱۱۱ [2] تعلیم الدین ص۱۳۳

"دوست تو اس پر ہجوم کر کے اس کے وقت کو مشوش کریں گے اور دشمن ایذائیں پہنچا کر پریشانی میں ڈالیں گے ... البتہ اگر کوئی تشویش بلا اس کے اکتساب وارتکاب کے پیش آجائے، یا اس نے کسی شرعی ضرورت سے کام کیا، اس میں تشویش پیش آگئی مثلاً سود خوار سے ہدیہ لینے سے انکار کیا اور وہ دشمن ہو گیا، تو یہ مضر نہیں، نہ اس میں مضطر ہو، حق تعالیٰ پر نظر و توکل رکھے وہ مدد فرمائیں گے، اور اگر کچھ تکلیف ہی پہنچے تو حکمتِ الٰہیہ سمجھ کر راضی رہے، وہ اس کے لئے زیادہ موجب قرب ہے" (تعلیم الدین صہ ۱۹)

اسی سلسلہ میں ایک بات اور بھی یاد رکھنے کی ہے کہ

"مال کی حرص اور اس کے جمع کرنے کی فکر میں رہنا یا موجودہ ذخیرے کو اسراف کر کے اڑا ڈالنا دونوں کا انجام تشویش قلب ہے۔ حریص تو ہر وقت اسی دھن میں لگا رہے گا اور مسرف ذخیرہ ختم ہونے کے بعد آخر پریشانی میں مبتلا ہوگا یا پرائے مال پر نگاہ ڈالے گا" (تعلیم الدین صہ ۱)

غیر اختیاری مجاہدہ مجاہدہ کے باب میں ایک بڑے فائدہ کی بات یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ مجاہدہ صرف اس مخالفتِ نفس کا نام نہیں، جو قصد و اختیار سے یا صوفیانہ مروج طریقوں سے کی جائے بلکہ دنیا میں بلا ہمارے قصد و اختیار کے ہمارے نفس کے خلاف جو دن رات واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور ان سے ہم کو جو رنج و غم و اضطراب طبعاً لاحق ہوتا رہتا ہے، وہ سب سے بڑا مجاہدہ ہے۔

سالکان طریق نے حزن و غم کو اعلیٰ درجہ کا مجاہدہ قرار دیا ہے کہ اس سے نفس کو بہت شکستگی حاصل ہوتی ہے جو کہ آثار عبودیت سے ہے۔ ؎

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں صاحب الحزن یقطع من طریق اللہ تعالیٰ مالا یقطع من فقد حزنہ سنینا" یعنی حزن و غم والا اللہ تعالیٰ کی وہ راہ طے کر جاتا ہے جو اس سے محروم سالہا سال میں نہیں طے کر پاتا۔[1]

---

[1] قصد السبیل صہ ۱

مجاہدہ سے استیصال رذائل نہیں ہوتا

اسی طرح مجاہدہ و ریاضت کے متعلق یہ بھی بڑے پتہ کی بات ہی کہ اس سے یہ نہ اُمید رکھنا چاہیئے کہ نفس کی مخالفت کر کے رذائل نفس کی جڑ ہی کٹ جائے گی یا ان کا بالکلیہ ازالہ ہو جائے گا۔ محض ان کا رخ بدل جاتا ہی۔

"ریاضت سے اخلاق ذمیمہ کے اصول کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ انکی تہذیب ہو جاتی ہی جس کا حاصل یہ ہے کہ ان اصول کے آثار کا امالہ ہو جاتا ہی یعنی ان اخلاق کا مصرف بدل جاتا ہی۔ مثلاً کسی میں بخل و غضب موجود ہو تو ریاضت سے اس کی جڑ نہیں جاتی کہ سرے سے غضب اور بخل ہی نہ رہے بلکہ تہذیب اس طرح ہو جاتی ہی کہ پہلے مواقع خیر میں بخل اور نیک لوگوں پر غصہ کرتا تھا اب نامشروع جگہ بخل کرے گا اور مبغوضانِ الٰہی اور اپنے نفس پر غصہ کرے گا۔ اس طرح جو بُعد کے اسباب تھے وہ قرب کا سبب بن گئے اور اس سے اس اختلاف کا بھی فیصلہ ہو گیا کہ ریاضت سے تبدیل اخلاق ہو سکتی ہی یا نہیں۔ معلوم ہو گیا کہ تبدلِ اصول تو نہیں ہو سکتی جیسا کہ حدیث میں ہی "اذا سمعتم برجل زال عن جبلتہ فلا تصدقوہ" البتہ تبدیلِ آثار و مصارف ہو سکتی ہی اس لئے مجاہدہ و ریاضت کا حکم آیا۔"

نفس میلان و خواہش کے ازالہ کی خواہش ایسی ہی ہے جیسے کوئی اکل حرام سے بچنے کے لئے یہ خواہش کرے کہ اس کو سرے سے بھوک ہی نہ لگا کرے۔

"کسی نے خواہش نفسانی سے نجات پانے کا علاج پوچھا، تحریر فرمایا کہ اکل حرام غذا سے توبہ کرکے یہ دُعا کرانا کہ بھوک ہی سے نجات ہو جائے۔"

(سوانح دوم ص ۱۳۱)

ایک اور ضروری تنبیہ

یہ فرمائی گئی ہی کہ مجاہدہ و ریاضت کے اس حکم کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے پابند ہیں، بغیر اس کے کبھی کچھ عطا نہیں فرماتے، بلکہ یہ قید پابندی

صرف بندہ کے لئے ہی۔

"بے شک ریاضت و مجاہدہ کی بدولت روحانی حیات حاصل ہوتی ہی اور اس کی قید بندہ کے لئے ہی جس کو اسی کی کوشش کرنا چاہئے لیکن حق تعالیٰ اس کے مقید نہیں، وہ قادر ہیں کبھی ایسا بھی کر دیتے ہیں، کہ بدون مجاہدہ و ریاضت کے محض اپنے فضل سے دولتِ باطنی وحیاتِ روحانی عطا فرما دیتے ہیں وہ بے چون وچگوں ہیں، ان کے کاموں کی کیفیت و طریقہ کون متعین کر سکتا ہی کہ اسی طرح ہوتا ہی۔

اس مقام پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ کبھی پہلے ریاضت ہوتی ہی پھر وصول الی اللہ میسر ہوتا ہی۔ اس کو طریقِ سلوک کہتے ہیں۔ اور کبھی وصول الی اللہ پہلے ہو جاتا ہی پھر عبادت و ریاضت کا شوق ہو جاتا ہی اس کو طریقِ جذب کہتے ہیں کہ اوّل کسی کامل کی صحبت یا کسی بزرگ کی حکایت سننے سے یا بلا کسی ظاہری وجہ کے قلب میں ایک قسم کی کشش و کیفیت حق تعالیٰ کیساتھ پیدا ہو گئی پھر بتدریج سلوک کی تکمیل کرتا رہا"

تفصیلی سلوک و ریاضت کا مطلب یہ ہی کہ توبہ، صبر و شکر، خوف و رجا، زہد و توکل، توحید، محبت و شوق اخلاص و صدق وغیرہ کے مقامات کو ایک ایک کر کے مختلف ریاضات، مجاہدات سے حاصل کیا جائے۔ اور شہوت و غضب، حقد و حسد، بخل و حرص، عُجب و ریا، کبر و غرور، حُبِ دنیا، حبِ جاہ، آفات لسانی وغیرہ مختلف رذائل کو مختلف مجاہدات و معالجات سے دور کیا جائے۔ ظاہر ہی کہ یہ کتنا دور دراز اور دقت طلب راستہ ہی خصوصاً اس کم ہمتی و کم فرصتی کے زمانہ میں تو حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی یہ بڑی ہی اہم تجدید ہی کہ

"اس تفصیلی علاج میں ہر وقت تین سو ہانِ روح تیار ہیں۔ ماضی کی حسرت حال کے شبہات اور مستقبل کا خوف جب محققین مجددین و مجتہدین (و منہم الملہم مرشدی رحمۃ اللہ علیہ) نے دیکھا، بلکہ حق تعالیٰ نے الہاماً اُن کو دکھلایا کہ اس طریق سے بعض اوقات :۔ ع "تا تو بمن می رسی من بخدا می رسم" کا معاملہ

ہو جاتا ہے پھر اہل زمانہ کے قوتیں ضعیف، ہمتیں قاصر، تو ان سب امور پر نظر کر کے ایک دوسرا طریق تربیت اختیار فرمایا کہ ماضی و مستقبل سب حجاب عن الحق ہیں اور حق تعالیٰ نے اپنے مشاہدہ کے لئے پیدا کیا ہے نہ کہ ماضی و مستقبل کے مطالعہ کیلئے ولنعم ما قال رومی "ماضی و مستقبلت پردہ خداست" البتہ توبہ کی ضرورت سے ماضی پر اور عزم کی ضرورت سے مستقبل پر نظر ضروری تھی، لیکن ضروری کے لئے بقدر ضرورت اتنا کافی ہے کہ گذشتہ گناہوں سے موافق شرائط خوب توبہ کر کے پھر بار بار دل میں ان کا سبق نہ دہراتا رہے، اور مستقبل کیلئے اللہ پر بھروسہ کر کے اس کا قصد کرے کہ انشاء اللہ پھر یہ گناہ نہ کروں گا، اس کے بعد ہر وقت اس قصہ میں نہ لگا رہے۔

اس سے زیادہ دوسرا کام ہے جس کو حدیث میں ان لفظوں میں تعبیر فرمایا گیا ہے "راقب اللہ تجدہ تجاھک" (اللہ کا دھیان رکھو اس کو اپنے سامنے پاؤگے) بس اس کام میں لگ جانا چاہئے یعنی ذکر و فکر اور عمل کے وقت عمل میں کہ وہ بھی ذکر میں داخل ہے۔ خلاصہ یہ کہ قرب کو مقصود سمجھے اور جو طریق اس کے لئے مقرر ہے یعنی عقائد کی تصحیح کے بعد اعمال اختیاریہ کہ جس وقت کا جو عمل ہو، خواہ ظاہری مثل صلوٰۃ و زکوٰۃ، خواہ باطنی جیسے خوف و رجا، شکر و صبر وغیرہ بس اس میں مشغول رہے، اور جو بُعد کے اسباب ہیں یعنی ظاہری و باطنی معصیت اس سے مجتنب رہے، نہ اس کی ضرورت کہ اسباب قرب میں ملکہ پیدا کرنے کی فکر کرے، نہ اس کی حاجت کہ اسباب بعد کے مادہ کو منقطع کرے۔

بس امور اختیاریہ میں جس میں کوتاہی ہو جائے اس کو مضر و مہتم بالشان سمجھے، اور اس کی اصلاح کرے۔ اور امور غیر اختیاریہ کے وجود و عدم پر التفات بھی نہ کرے، اور اصلاح میں بھی زیادہ کاوش نہ کرے مثلاً اگر کسی ضروری عمل میں خلل ہو گیا اس کی قضا یا تلافی کرے، اگر کوئی امر منکر صادر ہو گیا اس سے استغفار کرے، اور پھر اپنے کام میں لگ جائے، اسی ایک بات کے پیچھے

نہ پڑ جائے کہ ہائے یہ کام مجھ سے کیوں ہوا یا یہ کام کیوں نہیں ہوا" یہ غلو و مبالغہ ہی جس سے کتاب وسنت میں منع فرمایا ہی "لا تغلوا فی دینکم" "من شاقّ شاق اللّٰہ علیہ" "سددوا وقاربوا واستقیموا" حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

سخت میگیرد جہاں بر مردمانِ سخت گیر

اور اسی غلو ومبالغہ کا اثر خصوصاً اس وقت کے قویٰ اور ہمتوں پر یہ ہوتا ہے کہ بہت جلد مایوسی اپنا رنگ لاتی اور سالک کو معطل کر دیتی ہی، اور کبھی جان پر کبھی ایمان پر اس کا اثر پہونچتا ہی۔ جان پر تو یہ کہ صحت خراب ہو جاتی ہی اور ایمان پر یہ کہ باوجود عمل وعلاج میں اتنی شدید کوشش کے جب وہ کامیابی نہیں میسر ہوتی جس کو ہم نے کامیابی فرض کر لیا ہی یعنی شفائے مطلق یا اسمیں تاخیر ہوتی ہی، تو حق تعالیٰ سے تنگی وشکایت پیدا ہو کر کراہیت وناراضی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہی کہ ہم کو اتنے دن مجاہدہ میں سر مارتے ہو گئے مگر والذین جاھدوا کے وعدے خدا جانے کہاں گئے۔

ایک اور مرض لگ جاتا ہی کہ اپنے عمل کو بالغ اور اپنی سعی کو بالغ سمجھ کر ہر وقت ثمرات کا منتظر رہتا ہی، پس اپنے عمل کا پلہ حق تعالیٰ کی عطا سے بڑھا ہوا سمجھتا ہی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ کبھی اپنے کو کامیاب نہیں سمجھتا، اس لئے ناشکری میں مبتلا رہتا ہی۔ اور اگر بزعم خود کامیاب بھی ہو گیا، اور پھر وہ کامیابی زائل ہو گئی کیونکہ ایسے انقلابات عمر بھر رہتے ہیں تو پھر وہی تنگی وپریشانی شروع ہو جاتی ہی۔ اس طرح یہ سلسلہ عمر بھر منقطع نہیں ہوتا اور خود اس کا نفس یا اس کو دیکھ کر دوسروں کا نفس کہتا ہی کہ اس راہ خدا سے خدا کی پناہ جسمیں بجز مصیبت کے راحت کا نام نہیں[1]۔

ان مفاسد وخطرات کی بنا پر نہایت تاکید کے ساتھ جابجا ہدایت فرمائی گئی ہی کہ اس غلو ومبالغہ اور ان تدقیقات وتعمقات میں ہرگز ہرگز نہ پڑے حتیٰ کہ

[1] اصول الوصول ص ۳۷ بحوالہ تسہیل لریاضت منقول عن الابتلا لاہل الصفا ص ۳۱ تا ص ۳۳

"اگر کوئی محمود وارد آوے تو نہ اس کو کمال سمجھے نہ اسکے بقا کی تمنا کرے، نہ اس کے فوت پر حسرت۔ اسی طرح اگر کوئی وسوسہ پیدا ہو اُس کے دفع میں بھی تندہی نہ کرے، بس ذکر کی طرف وہ بھی سرسری طور پر متوجہ ہو جائے کہ نہ دفع ہو نہ سہی، یعنی ذکر قرب کے قصد سے کرے نہ کہ وسوسہ دفع کرنے کے قصد سے۔ خلاصہ یہ کہ حق کی رضا کا طالب اور ناراضی سے ہارب رہے۔ یہ رضا و ناراضی منحصر ہے اوامر کے عمل اور نواہی کے اجتناب پر۔ عمل اگر فوت ہو تو قضا کرے اور نہی کا ارتکاب ہو تو استغفار کرے۔ نہ اپنے کو خواص میں سمجھے کہ عامیوں کی سی اپنی حالت سے گھبرائے، اور نہ دنیا میں ثمرات کا اور نہ آخرت میں مراتب عالیہ کا طالب رہے۔ بس اس کی دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اعمال کی توفیق اور آخرت میں جنت عطا فرمائیں اور دوزخ سے نجات بخشیں۔ بس ہو گیا مسنون سلوک۔"

ایک شبہ اب اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر محض وسوسہ یا معصیت کا محض میلان مضر نہیں ان پر عمل مضر ہے، تو اس کے لئے مجاہدہ کی کیا ضرورت؟۔

"جواب یہ ہے کہ واقعی اس کے لئے مجاہدہ فرض و واجب نہیں صرف یہ نفع ہے کہ معصیت کے میلان کا مقابلہ کرنے میں زیادہ تعب و تکلیف نہیں ہوتی۔ آسانی سے آدمی نفس پر غالب آجاتا ہے، اور غیر مجاہد دشواری سے۔ بس یہ فائدہ ہے مجاہدہ میں۔ یہ نہیں کہ سرے سے میلان جاتا رہتا ہو۔ اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ گھوڑا شائستہ ہو کر بھی کبھی کبھی شرارت و شوخی کرتا ہے، مگر بوجہ شائستگی کے جلد رام ہو جاتا ہے بخلاف غیر شائستہ کے کہ اس کے رام کرنے میں بہت مشکل لاحق ہوتی ہے"

تفصیلات بالا سے ان مجاہدات و ریاضات کی حقیقت و ضرورت ان کے مفاسد و خطرات سب پوری طرح واضح ہو گئے، جن کو بہت سے مسلمان نافہم صوفیہ نے بھی اشراقیوں اور جوگیوں کی طرح اور ان کے زیر اثر اسلامی تصوف کا بھی اصل مقصود بنا رکھا ہے۔

مجاہدہ کا اصل ثمرہ کیفیات نہیں! اب ذرا ان واردات و کیفیات، توجہ و تصرفات، کشف و کرامت مواجید و لذات کی بھی حیثیت و حقیقت غور سے سُن لیں، جنکو ان مجاہدات و ریاضات کے اصلی ثمرات قرار دے لیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح مجاہدات بذاتِ خود مقصود نہیں، اُسی طرح ان کے یہ ثمرات بھی نہ مقصود بالذات ہیں اور نہ ان کا مجاہدات پر مرتب ہونا لازم ہے۔ اور جس طرح مجاہدہ و ریاضت کی حیثیت تدبیر و علاج کی تھی، اسی طرح ان ثمرات کی حیثیت صحت کی ہے، کہ صحت سے بھی اصلی مقصود، مقاصدِ زندگی کی تکمیل یا نشاط و سہولت کے ساتھ تکمیل ہے جیسے مرچ کہ وہ غذا نہیں مگر غذا میں اس سے لذت پیدا ہو جاتی ہے۔

"فرمایا آج کل لوگ کیفیات کے پیچھے پڑے ہیں جو کہ غیر مقصود ہیں گو یہ کیفیات غیر مقصودہ لذیذ ہوتی ہیں جیسے مرچ کہ تقدیر میں غیر مقصود ہے، مگر لذیذ ہے۔ اور اب تو لوگ ان کیفیات ہی کو مقصود سمجھ کر گویا نری مرچوں کا ہی سالن کھاتے ہیں۔ بالکل ایسی مثال ہے، کہ اگر روپیہ کا سکہ خوبصورت نہ ہو، پھر بھی چونسٹھ ہی پیسے ملیں گے، اور سیسہ یا رانگہ کا ٹکڑا گو بہت چمکدار اور خوبصورت ہو مگر بازار میں نہ چلے گا۔ اسی طرح بازارِ آخرت میں کیفیات یا لذات جو حقیقت کے اعتبار سے سیسے یا رانگے کے ٹکڑے ہیں وہاں نہ چلیں گے۔"[1]

"واردات غیبیہ یا ذوق و شوق اصل ثمرہ نہیں، تربیت کا محض ایک ذریعہ ہے، وہ بھی بعض کے لئے غیبی طور پر اور دوسرا ذریعہ تربیت کا بلا مواجید کے صرف ہمت سے کام لینا ہے۔"[2]

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ۲ ص ۲۰
[2] اصول الاصول ص ۳۰

تصوف کی حقیقت دو جملوں میں

یہ واردات وکیفیات دراصل انفعالات ہیں" اور طریق میں افعال مقصود ہیں انفعالات نہیں[1]۔" حضرت علیہ الرحمہ نے ایک "مولوی صاحب" کو انھی دو جملوں میں تصوف کی حقیقت بتلادی تھی مگر انھوں نے قدر نہ کی، آخر مولوی صاحب تھے۔ جن لوگوں میں تاثر وانفعال زیادہ ہوتا ہے، قدرۃً ان میں کیفیات بھی زیادہ ہوتی ہیں یہاں تک کہ بعضوں میں یہ تاثر وانفعال محویت واستغراق تک پہنچ جاتا ہے، اور لوگ

"استغراق کو بڑی چیز سمجھتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم بے عقل و مدہوش نہ ہوئے تو کمال ہی کیا ہے۔ صاحبو! اللہ تعالیٰ کا نام ہوش بڑھانے کے لئے لیا جاتا ہے نہ کہ کھونے کے لئے۔ ...... خواجہ عبیداللہ احرار فرماتے ہیں کہ استغراق میں قرب نہیں بڑھتا، کیونکہ اس میں عمل نہیں ہوتا جو مدارِ قرب ہے[2]۔"

پھر ان کیفیات پر دھوکا ہو جاتا ہے روحانی کیفیات کا حالانکہ اکثر صورتوں میں وہ محض نفسانی کیفیات ہوتی ہیں۔ اور ان میں تمیز کاملین ہی کا کام ہے، بلکہ

"حقیقت میں جو ذی استعداد کامل ہیں ان پر نفسانی کیفیات طاری ہی نہیں ہوتیں، ہاں روحانی جن کا اثر رُح پر ہوتا ہے کاملین پر طاری ہوتی ہیں جن کا عوام کو پتہ بھی نہیں۔ اور ان دونوں میں فرق جیسے گڑ اور فیرینی کی شیرینی میں ہوتا ہے۔ چمار کسی کی بیگار میں گئے اس نے فیرینی کھلائی، تو ناک مار کر کھا تو لی، مگر چودھری کہتا ہے یہ تھوک سی کیا ہے، اس کو مٹھائی معلوم ہی نہیں ہوئی، اس نے کبھی فیرینی کی بو بھی نہ سونگھی تھی، اُسکے نزدیک تو مٹھائی بس گڑ تھا۔ تو واقعی جو سالکین کیفیات کے متمنی ہیں وہ دیہاتی گڑ خوار ہیں میں تو کہتا ہوں کام میں لگو، کیفیات کی ہوس چھوڑ دو۔ پھر دیکھئے کہ ایک دن وہ کیفیات نظر آئیں گی کہ لاعین رات ولا اذن سمعت ولاخطر علےٰ قلب بشر"...... غرض کیفیاتِ روحانیہ تو ضرور ہوتی ہیں، مگر کیفیاتِ نفسانیہ ضرور نہیں کسی کو ہوتی ہیں کسی کو نہیں[3]۔"

---

[1] الافاضات حصۂ اوّل صفحہ ۲۰۶ [2] وعظ دوا دالفیق۔ [3] ایضاً

اس میں یہ کیفیات بھی راستہ کی دلچسپیاں ہیں، جن کا نفع فقط اتنا ہی کہ سفر دراد لچسپی سے قطع ہوتا ہی۔ لیکن ساتھ ہی بڑا خطرہ بھی ہی کہ اکثر کم حوصلہ راستہ کی ان دلچسپیوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں" اور سبب اس غلطی کا یہ ہی کہ لوگ کیفیات کو مطلوب سمجھتے ہیں کہ اگر ہم خدا کے مقبول نہ ہوتے تو ہم پر یہ کیفیات کیوں طاری ہوتیں، حالانکہ یہ تو کفار پر بھی طاری ہوتی ہیں۔"

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جو مجتہدِ فن اور مجدّدِ وقت تھے، فرمایا کرتے تھے کہ انوار وکیفیات حجابِ نورانی ہیں، اور حجابِ نورانی حجابِ ظلماتی سے اشد ہی۔ سالک کو یہ سب حجابات پسِ پشت ڈالنا چاہئے، ان کی طرف ہرگز التفات نہ کرے، کیونکہ جس شخص کو بادشاہ سے ملنا ہی وہ نہ بھنگیوں کے مکان پر ٹھہرتا ہی نہ عطاروں کی دکان پر، سیدھا تختِ شاہی پر پہنچنا چاہتا ہی۔ حجابِ ظلماتی بھنگیوں کے مکانات ہیں اور حجابِ نورانی عطاروں کی دکانات، سالک کو کسی پر نہ ٹھہرنا چاہئے، آگے چلتے رہنا چاہئے، مقصود وراء الورا ہی۔ ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست
انچہ بروے میرسی بروے مایست [۱]

کشف وکرامت کی حقیقت احوال وکیفیات کے اس حال وحقیقت کے بعد کشف وکرامت تصرف وتوجہ کی بھی حقیقت معلوم کر لیجئے۔

"فرمایا کہ لوگ کشف کو بڑا کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کو قرب میں کچھ بھی دخل نہیں بعضوں کو کشف سے فطری مناسبت ہوتی ہی بعضوں کو نہیں جیسے بعضوں کی نظر پیدائشی طور پر دوربیں ہوتی ہی، بعضوں کی نزدیک بیں۔ مسجد کے سقاوہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ فرض کیجئے ایک شخص کی نظر صرف سقاوہ ہی تک پہونچتی ہی اور ایک کی باہر سڑک تک، تو کیا جس کی نظر سڑک تک

[۱] وعظ تقلیل الکلام صفحہ ۱۱

پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ مقرب ہوگا، یہ تو محض نظر کی ایک قسم ہے، اس کو قرب سے کیا علاقہ۔ بعضوں کو کشف سے فطرۃً مناسبت نہیں ہوتی لاکھ مجاہدہ وریاضت کریں عمر بھر کشف نہیں ہوتا۔ اصل چیز تو عبدیت ہے۔ واللہ اگر کسی کو لاکھ کشف ہوں اور پھر وہ اپنے وجدان کی طرف رجوع کرے تو محسوس کرے گا کہ ذرہ برابر ترقی نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے اگر وہ دو چار مرتبہ بھی سُبحانَ اللہ، سُبحانَ اللہ پڑھ کر اپنے وجدان کو دیکھے تو صاف محسوس ہوگا کہ کچھ نہ کچھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب بڑھ گیا، اہلِ ذوق جب چاہیں اس کا تجربہ کرلیں[1]۔"

کشف قرب وولایت کی دلیل کیا ہوتا، اس کے لئے تو مومن ہونا بھی شرط نہیں۔ مومن، کافر، ملحد، دہری، سب ہی کو ہوسکتا ہے جس طرح کچھ جسمانی غیر معمولی قوتیں مشق وورزش سے پیدا ہوجاتی یا بڑھ جاتی ہیں، اسی طرح مجاہدہ وریاضت سے نفس میں کچھ خاص قوت پیدا ہوجاتی یا بڑھ جاتی ہے جس سے آج کل کے علمائے نفسیات یا عملِ تنویم (ہپناٹزم) وغیرہ کے عامل خوب واقف ہیں۔

"غرض کشف کوئی بڑا کمال نہیں، اگر کافر بھی مجاہدہ وریاضت کرے تو اس کو بھی ہونے لگتا ہے، نیز مجانین کو بھی کشف ہوتا ہے۔ صاحبِ شرح اسباب نے لکھا ہے کہ مجنوں کو کشف ہوتا ہے۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک مجنونہ کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہیں ہوتا، لیکن اس کا مسہل ہوا تو مادہ کیساتھ ہی کشف بھی نکل گیا[2]۔"

اس لئے شریعت میں کشفی علوم کوئی حجت نہیں۔" اگر کوئی کشف قواعد شرعیہ کے موافق ہے تو قابلِ عمل ہوگا ورنہ واجب الترک ہے۔" (تعلیم الدین ص۱۰۲) کشف ہی کی طرح اور بھی کسی خارق یا خلافِ عادت امر کا کسی میں پایا جانا قرب وولایت کی دلیل یا لازمہ نہیں۔

---

[1] سوانح جلد دوم ص۸۵

[2] سوانح جلد دوم ص۸۵

"خوارق کا ہونا ولایت کے لئے ضروری نہیں بعض صحابہؓ سے
عمر بھر میں ایک خرق عادت بھی واقع نہیں ہوا، خوارق اکثر جوگیوں سے
واقع ہوتے ہیں۔ یہ ثمرہ ریاضت کا ہے۔ خرق عادت کا مرتبہ ذکر قلبی سے بھی
کم ہے۔ صاحبِ عوارف نے غیر اہلِ خوارق کو اہلِ خوارق سے افضل لکھا ہے
عارفین کی بڑی کرامت یہ ہے کہ شریعت پر مستقیم ہوں اور بڑا کشف یہ ہے
کہ طالبانِ حق کی استعداد معلوم کر کے اس کے موافق ان کی تربیت کریں۔
شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ بعضے اہلِ کرامت نے مرنے کے وقت تمنا کی کہ
کاش! ہم سے کرامتیں ظاہر نہ ہوتیں" (تعلیم الدین ص۱۰۱)

"بعض صاف گو حضرات کا فیصلہ ہے کہ "الکرامات حیض الرجال"
یعنی جیسے عورت حیض سے شرماتی ہے اور اس کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے
اسی طرح اہل اللہ اپنی کرامتوں سے شرماتے ہیں۔ بہت سے اہلِ کرامت
بزرگوں نے تمنا کی کہ کاش ہم سے کرامت کا صدور نہ ہوتا۔ وجہ یہ کہ
انھوں نے بقدر اپنی کرامت کے اپنے درجاتِ آخرت میں کمی محسوس کی۔
کیونکہ غیر اہلِ کرامت کو آخرت میں کرامت کا حصہ بھی عطا ہوگا۔ البتہ
ماذون حضرات مستثنیٰ ہیں[1]"

کرامت کے متعلق رسالہ کرامات امدادیہ میں مستقل بحث فرمائی ہے جس میں ارشاد ہے کہ
"کرامت اس امر کو کہتے ہیں کہ جو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کسی متبع
کامل سے صادر ہو، اور قانون عادت سے خارج ہو، اگر وہ امر خلاف عادت
نہیں، تو کرامت نہیں۔ اور جس سے وہ امر صادر ہوا ہے اگر وہ نبی کا اپنے کو
متبع نہیں کہتا وہ بھی کرامت نہیں جیسے جوگیوں ساحروں وغیرہ سے ایسے
امور سرزد ہو جاتے ہیں، اور اگر اتباع کا مدعی تو ہے مگر واقع میں متبع نہیں

---

[1] الافاضات حصہ ہفتم ص۲۹

خواہ اصول میں خلاف کرتا ہو جیسے اہلِ بدعت یا فروع میں جیسے فاسق فاجر اس سے بھی اگر ایسا امر صادر ہو وہ بھی کرامت نہیں استدراج ہے۔"

"بس کرامت وہ کہلائے گی جب ایسے فعل کا صدور مومن متبع کامل التقویٰ سے ہو۔ اب ہمارے زمانہ میں جس شخص سے کوئی عجیب فعل سرزد ہو جاتا ہے اس کو غوث، قطب قرار دیدیتے ہیں، خواہ اس کے عقائد و اعمال کیسے ہی ہوں۔ بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی کو ہوا میں اڑتا دیکھو یا پانی پر چلتا، مگر شریعت کا پابند نہ ہو تو اس کو بالکل ہیچ سمجھو۔"

"اور بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اپنی کرامت کا اخفا واجب ہے مگر جہاں ضرورت ہو، یا غیب سے اذن ہو، یا حالت اس قدر غالب ہو کہ قصد و اختیار باقی نہ رہے یا کسی طالبِ حق و مرید کے یقین کو قوی کرنا مقصود ہو، وہاں جائز ہے۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز"

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

ہماری یہ لمبی چوڑی انسانی بستی جس کو ہم دنیا کہتے ہیں، جنت سے نکلنے کے بعد آدمؑ کو اپنی اولاد کو بسانے اور آباد کرنے کو دی گئی تھی اور کہہ دیا گیا تھا کہ اس کو جنت اور جہنم بنانا تمہارے اختیار میں ہے اگر تم آدمیت اور بندگی کی شان سے رہو گے تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائیگی، اور حقیقی اور دائمی جنت کے لئے پل کا کام دیگی، لیکن اگر تم پر تمہارے دشمن (شیطان) کا داؤں چل گیا اور تم نے نفس کی خواہشات پر چلنا شروع کیا تو پھر یہ دنیا جہنم سے پہلے جہنم ہے جس میں اُس حقیقی جہنم کے عذاب کے سب نمونے دیکھنے میں آئیں گے۔

ولنذیقنّھم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر لعلھم یرجعون۔
(الم سجدہ۔ ع۔ ۲)

ہم ان کو ضرور تھوڑا سا عذاب بڑے عذاب سے ورے چکھائیں گے کہ شائد وہ پھر آئیں۔

قال اھبطا منھا جمیعا بعضکم لبعض عدو فاما یاتینکم منی ھدی فمن اتبع ھدای فلا یضل ولا یشقی ۵ ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا ونحشرہ یوم القیٰمۃ اعمی ۵
(طٰہٰ۔ ع۔ ۷)

فرمایا اترو یہاں سے دونوں ایک دوسرے کے دشمن رہو گے پھر کبھی تم کو میری طرف سے راہ کی خبر ملے تو جو میری بتائی ہوئی راہ پر چلے گا نہ وہ بھٹکے گا نہ تکلیف میں پڑیگا اور جسنے میری یاد سے منہ پھیرا اُسکی گزران تنگ ہوگی، اور اس کو ہم قیامت کے دن اندھا اٹھائینگے

کچھ عرصہ تک آدمؑ کی اولاد اس زمین پر آدمیوں کی طرح رہی اور اس زندگی میں بھی جنت کا لُطف اٹھایا، اور حقیقی اور دائمی جنت کیلئے جہاں اس دنیا کے برخلاف نہ غم و حسرت کا گزر ہے نہ کسی طرح کا

خوف و خطر، وہ تیاری کرتے رہے اور اس کے شوق میں جیتے اور مرتے رہے، رفتہ رفتہ آدمیت پر شیطنت غالب آئی، نفس کی خواہشات نے آدم کی اولاد کو اندھا بہرا کر دیا، قانونِ خداوندی کا رشتہ ہاتھوں سے چھوٹ گیا، خدائے واحد کی عبادت و اطاعت کے بجائے شیطان کی اطاعت اور نفس کی عبادت کا دستور شروع ہو گیا۔ ایک خدا کی عبادت، اطاعت اور محبت کے بجائے، عبادت اطاعت اور محبت کے ہزاروں مرکز بن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدمؑ کا یہ بنا بنایا گھر بگڑنے لگا، نئی نئی خرابیاں پیدا ہونے لگیں، اچھے خاصے آدم زاد آدم خور وحشی اور سانپ اور بچھو بن گئے۔ ایک ماں اور باپ کی اولاد ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو گئی اور بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا تھا اس کی اولاد نے مٹی، پتھر، لکڑی، درخت، پانی، جانور کو سجدہ کیا، اور نافرمانی و بداخلاقی کی انتہائی پستی میں گر کر آدمیت کو شرمندہ کیا۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم — ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر اندازہ پر

ثم رددناہ اسفل سافلین — (والتین) — بنایا، پھر اس کو نیچے سے نیچے پہونچا دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گلزار دنیا اچھی خاصی جہنم بن گئی اور خود انسان انسان کے لئے عذاب بن گیا جو اس جہنم کی آگ کو بھڑکانے کے لئے خود کافی تھا۔

وقودھا الناس والحجارۃ (البقرۃ ۳-۲) — جس کا آدمی اور پتھر ایندھن ہیں۔

ظلم کی ہر طرف گرم بازاری ہوئی، ہوا و ہوس کا دور ہوا، دیانت و شرافت کے اصول بالائے طاق ہو گئے، بے نظمی اور اخلاقی ابتری کا دور دورہ ہوا، امن اٹھ گیا، سکون و اطمینان رخصت ہوا، لوگ زندگی سے عاجز آگئے اور موت کی تمنا کرنے لگے، یہ لمبی چوڑی دنیا ایک جیلخانہ معلوم ہونے لگی، دم گھٹنے لگا اور سانس الجھنے لگی۔

حتی اذا ضاقت علیھم الارض بما — زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ان پر

رحبت وضاقت علیھم انفسھم۔ — تنگ ہو گئی، اور طبیعتیں بھنچنے لگیں۔

دنیا کے بنانے والے کو نسلِ آدمؑ کی یہ سرکشی اور بے راہ روی پسند نہ تھی۔

ان اللہ لا یرضی لعبادہ الکفر — اللہ اپنے بندوں کے کفر و نافرمانی پر راضی نہیں ہو سکتا

گھر کے مالک کو گھر کی یہ بربادی منظور نہ تھی۔

ویسعون فی الارض فساداً واللہ لا	زمین میں خرابی پھیلاتے پھرتے ہیں اور اللہ
یحب المفسدین۔	بگاڑ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس نے مفسدوں کو سمجھانے اور گھر کو دوبارہ سنوارنے کے لئے انھیں گھر والوں میں سے کچھ آدمی منتخب کئے جن کے دل میں اپنا یقین اور محبت اور گھر والوں کا تیاد رد پیدا کیا اور ان کو اپنے کلام و پیام سے مشرف اور نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا، ان کو گھر کے بنانے سنوارنے کا اصلی گر بتلادیا، اور وہ یہ کہ اس گھر کو گھر کے مالک کی مرضی کے مطابق چلایا جائے، اور جس نے یہ گھر دیا ہے اور ان کو اس میں آباد کیا ہے اس کو راضی کیا جائے۔

ھو انشاکم من الارض واستعمرکم	اس نے تم کو زمین سے بنایا اور اس میں
فیھا فاستغفروہ ثم توبوا الیہ ان ربی	بسایا، تو اس سے معافی چاہو اور اسکی
قریب مجیب ؕ	طرف آؤ، بیشک میرا رب نزدیک ہے
(سورۂ ھود-۶-۶)	اور قبول کرنے والا ہے۔

آخرت کا گھر اسی کے لئے ہے جو اس دنیا کے گھر میں تکبر اور فساد نہ مچائے۔

تلک الدار الآخرۃ نجعلھا للذین لا	پچھلا گھر ہم اسی کو عطا کرینگے جو زمین میں
یریدون علواً فی الارض ولا فساداً	سربلندی اور بگاڑ نہ چاہتے ہوں اور
والعاقبۃ للمتقین ؕ	ڈرنے اور احتیاط کرنے والوں ہی کا انجام
(القصص-۶-۹)	اچھا ہوتا ہے۔

ان اللہ کے بندوں نے اپنے اپنے وقت میں سب سے پہلے وہ بات کہی جو سب سے زیادہ سچی اور ضروری ہے اور جو گھر کے مالک کا سب سے پہلا پیغام اور پیغمبر کا سب سے پہلا کام ہونا چاہیئے، یعنی گھر کے مالک کیساتھ گھر کے رہنے والوں کا عبادت اور غلامی کا تعلق، اس کو اپنا معبود حاکم و مالک سمجھنا، یہ اس مالک کا پہلا حق، اور ان غلاموں کا پہلا فرض تھا، سب سے بڑا فساد اور سب سے بڑی گمراہی یہی تھی کہ اس کو برابر بھلایا جاتا رہا تھا، ہر خرابی کی جڑ یہ تھی کہ اس کو نظر انداز کیا جاتا رہا تھا، اسلئے ہر پیغمبر نے سب سے پہلے یہی کہا۔

یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ	اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو، تمھارا
غیرہ۔ (سورۂ ھود)	مالک معبود اس کے سوا کوئی نہیں۔

اس کے بعد انھوں نے ان بڑی بڑی خرابیوں کا ذکر کیا جنھوں نے ان کے وقت میں اس گھر کا نظام تہہ و بالا کر رکھا تھا، اور گھر کو گھر کے بسنے والوں کے لئے دوزخ بنا دیا تھا۔ کسی زمانہ میں خاندانی اونچ نیچ اور شرافت و رذالت کا تصور حد کو پہونچ گیا تھا، اور کم حیثیت و کم نسب لوگوں کو جانور سمجھا جانے لگا تھا۔ کسی زمانہ میں غفلت و سرکشی، ظلم و زیادتی، اپنی طاقت پر ناز اور قوت کا بیجا استعمال جنون کے درجہ کو پہونچ گیا تھا۔ کسی زمانہ میں فضول تعمیرات کے شوق اور نمود و نمائش نے وبا کی صورت اختیار کر لی تھی۔ کسی دور میں پوری کی پوری قوم اخلاقی گندگی اور بیحیائی میں مبتلا ہو گئی تھی۔ کبھی ناپ تول میں بے ایمانی کا عام رواج ہو گیا تھا۔ کبھی بعض انسان خدا بن کر بیٹھ گئے تھے اور انھوں نے ایک قوم کی قوم کو اپنی خواہشات کا بندہ بنا رکھا تھا۔ کبھی پوری قوم جو اللہ کے پیغام کی امین اور پیغمبروں کی اولاد تھی غلو، جہالت، تحریف، اور شدید بد اخلاقیوں اور بداعتقادیوں میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ان اللہ کے بندوں نے توحید کی دعوت کے بعد صاف صاف ان خرابیوں کا نام لیا اور ان پر چوٹ لگائی، جس سے اپنے اپنے وقت کی یہ بیمار مگر متکبر قومیں تلملا اٹھیں اور جنھوں نے اللہ کے گھر کو اپنے باپ کا گھر سمجھ رکھا تھا وہ اس پر جھنجلا گئے کہ ان کو اپنے گھر میں کچھ کرنے کا اختیار ہو اور کچھ کرنے کا اختیار نہ ہو، اور ان کو اپنی سلطنت میں آزادئ کامل حاصل نہ ہو۔ حضرت شعیبؑ سے جنھوں نے اپنی قوم کو غیر اللہ کی پرستش اور ناپ تول میں بد دیانتی کرنے سے روکا تھا، انکی قوم نے بگڑ کر پوچھا۔

قالوا یٰشعیب اصلوٰتک تامرک ان نترک ما یعبد آباءنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء۔	انھوں نے کہا کہ اے شعیبؑ کیا تمھاری نماز نے تم کو یہ سکھایا کہ جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے ان کو چھوڑ دیں اور اپنے مالوں میں ہم من مانی کارروائی نہ کریں۔

(سورۂ ہود-۶-۸)

اس طرح انکے اور انکی قوموں کے درمیان کشمکش شروع ہوئی، جب کبھی قوم نے نہ مانا اور اس کا ارادہ ہی کر لیا کہ چاہے اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے مگر وہ اپنا راستہ نہ چھوڑے گی، تو گھر کے مالک نے گھر کی خاطر ان مفسدوں کا قلع قمع کر دیا، اور اپنے گھر کو ان نالائقوں کے وجود سے پاک صاف کر کے اپنی ربوبیت کا اظہار فرمایا، جس کا تعلق ایک انسانی خاندان سے نہیں بلکہ پوری نسل آدم سے ہے، اس فاسد خون کے اخراج سے پورے جسم انسانیت کی حفاظت ہو گئی۔۔

فقطع دابر القوم الذین ظلموا ۱ | جن لوگوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی اُن کی
والحمد للہ رب العالمین ۵ | جڑ کاٹ دیگئی اور سب تعریف اور شکر اُسی اللہ
(الانعام - ۶ -) | کیلئے ہی جو سارے جہانوں کی پرورش کرنے والا ہے۔

پھر اُسنے اپنے گھر کو انھیں انسانوں سے دوبارہ آباد کیا اور رفتہ رفتہ گھر پھر بھر گیا۔ اس بھرے ہوئے گھر میں لوگوں نے پھر جب فساد کی باتیں کرنی شروع کیں تو اُنکے زمانہ کے پیغمبر نے ان کو سمجھایا کہ بڑی کوششوں سے اس گھر کی خرابیوں کو دور کیا گیا اور اس کو مفسدوں سے پاک کیا گیا ہی اب تم اس بنے بنائے گھر کو نہ بگاڑو۔

ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا۔ | زمین میں اسکی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔

لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ کچھ پرانی اور کچھ نئی خرابیاں پھر پیدا ہوگئیں، بت پرستی جو محض دماغی کاہلی کا نتیجہ ہے پھر اُبھر آئی، لاکھوں اور کہیں کہیں کروڑوں نئے معبود اور بت تراش لئے گئے۔ ظاہر و محسوسات پرستی کا دور دورہ ہوا، اور خدا کا خوف اور اس سے تعلق عملی زندگی سے بالکل خارج ہوگیا جن کو محض خیال کو جمانے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ دل ان ہی میں اٹک کر رہ گیا، اور خدا تک پہونچنے کا راستہ بالکل بند ہوگیا۔ حضرت ابراہیمؑ جو ایک بت تراش کے یہاں پیدا ہوئے تھے لیکن قلب سلیم کی دولت سے مالا مال تھے، ایسے ہی زمانہ میں پیدا ہوئے کہ ساری دنیا میں بتوں کا راج تھا، اور خدا رسی کی راہیں مسدود ہوچکی تھیں۔ لاکھوں انسان خدا کی معرفت و عبادت سے محروم چلے گئے اور لاکھوں کروڑوں انسان اب بھی اس دولت سے غافل تھے، یہی احساس تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ سے یہ الفاظ کہلائے[1]۔

رب انھن اضللن کثیرا من الناس۔ | میرے رب ان بتوں نے بہت سے لوگوں کی راہ ماری۔

اس بت پرستی اور خدا سے بے تعلقی نے وہ تمام روحانی اخلاقی اور اجتماعی امراض پیدا کر دیئے تھے جو اس کا لازمی نتیجہ ہیں، خواہشات نفس کا (جن کو بت پرستی نہ روک سکتی ہی نہ روکنے کا حق رکھتی ہی) بازار گرم تھا بے آئینی و بدنظمی کا (جو صرف خدائے واحد کے ایمان و خوف سے بند ہوسکتی ہی) ہر طرف دور دورہ تھا، دولت حکومت و طاقت بھی مستقل بت تھے جنکے پجاری شائد تعداد میں زیادہ اور وفاداری میں بڑھے ہوئے تھے۔

انسانیت کی اس عالمگیر بربادی کے دور میں حضرت ابراہیمؑ کو عالم انسانیت کی تعمیر نو کا کام سپرد ہوا، اور اسکی ابتدا اس طرح ہوئی کہ انھوں نے مکہ معظمہ میں توحید کا ایک مرکز، اور خالص اللہ کی عبادت کے لئے پہلا گھر تعمیر کیا، یہ دنیا کی تعمیر نو کا نشان اور اسکی نئی زندگی کا اعلان تھا، اس گھر کے پردہ میں دراصل دنیا کی

---

[1] افادہ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی۔

نئی تعمیر عمل میں آرہی تھی اور بنانے والا بناتے وقت کہہ رہا تھا۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم ○ ربنا واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتنا أمة مسلمة لك وارنا مناسكنا وتب علينا انك انت التواب الرحيم ○ ربنا وابعث فيهم رسولا منهم يتلو عليهم اٰيٰتك و يعلمهم الكتاب والحكمة ويزكيهم انك انت العزيز الحكيم ○

اے ہمارے پروردگار ہمارے اس عمل کو قبول فرما، اے ہمارے پروردگار ہم (باپ بیٹے) کو اپنا فرمانبردار رکھ، اور ہماری نسل سے ایک فرمانبردار قوم پیدا کر، اور ہمیں ہمارے طریق عبادت بتا، اور ہمارے حال پر رحم کیجیو، بیشک تو توجہ فرمانے والا مہربان ہے۔ اے پروردگار ان لوگوں میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجو جو انکو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں اور کتاب اور دانائی سکھایا کریں اور ان کو پاک صاف کیا کریں۔ بیشک تو غالب اور صاحب حکمت ہے۔

اسوقت سے دنیا کی تعمیر مستقل طور پر ابراہیمؑ اور انکی اولاد کے سپرد کی گئی، کہ جب دنیا کا گھر بگڑے اور انسانیت تاراج ہو، انکے خاندان اور انکے نام لیواؤں میں کوئی معمار اس گھر کو پھر بنادے۔ چنانچہ اپنے اپنے وقت میں دنیا کو اس خاندان سے برابر معمار ملتے رہے، اسحٰقؑ و اسمٰعیلؑ، یعقوبؑ و یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ و سلیمانؑ، یحییٰؑ و عیسیٰؑ اسی خاندان کے افراد اور اپنے اپنے وقت کے معمارِ انسانیت تھے۔

رفتہ رفتہ تخریبی طاقتوں نے اس دنیا کو اس طرح برباد کیا کہ وہ اتنے بڑے پیمانہ پر کبھی برباد نہیں ہوئی تھی اگر پہلے کبھی انسانیت بیمار تھی تو اب عالمِ نزع میں تھی، اگر کبھی انسانیت کا ایک گھرانہ تباہ ہوا تھا تو اب پورا خاندانِ انسانیت لقمۂ اجل بن رہا تھا، پہلے کہیں اندھیرا کہیں اجالا تھا اب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، خشکی اور تری ہر جگہ انسان کے اعمال و جرائم اور ہوسناکی کی نحوست پھیلی ہوئی تھی، اور فساد سے بر و بحر کا کوئی حصہ خالی نہ تھا۔

ظهر الفساد في البر والبحر بما كسبت أيدي الناس ○

لوگوں کی شامتِ اعمال سے فساد خشکی اور تری میں پھیل گیا۔

خدا کا گھر جو زندگی کا چشمہ اور عالمِ انسانیت کا قلب تھا بتوں سے آلودہ ہو رہا تھا، قریش جو توحید کے منادی اور اللہ کی عبادت کے امین تھے اب لات و عزیٰ اور ہبل کے پجاری تھے، ایرانی اور رومی انسانیت کا گھر ڈھا کر اپنے محل تعمیر کر رہے تھے اور اسمیں دادِ عیش دے رہے تھے، ہندوستان سخت ترین بت پرستی، نفس پرستی اور نسلی ناانصافی اور اونچ نیچ کا شکار تھا۔ اللہ کی زمین کو بالکل لاوارث سمجھ کر اور انسانوں کو بے والی و وارث جان کر طاقتوروں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ گھر کے مالک کا خیال دلوں سے نکل چکا تھا اور اس کا قانون دنیا سے

مٹ چکا تھا۔ پورے پورے ملک میں بعض اوقات ایک آدمی ایسا نہیں ملتا تھا جس کو خدا کے قانون کی سچی تلاش، اور آخرت کی فکر ہو۔ پورے پورے براعظم میں ایک انسان ایسا نہیں تھا جس کو دنیا کی اس ویرانی اور انسانیت کی اس بربادی کا درد ہو، اور جو اس فکر سے بے چین ہو۔

حضرت مسیحؑ کے بعد پانچ صدیاں اسی تاریکی و بے حسی میں گزر گئیں، اب معاملہ قوموں اور ملکوں کا نہ تھا، پوری نسل آدم کا تھا، پوری عالم انسانیت کا تھا۔ انسانیت کو معمار اعظم کی تلاش تھی جو دنیا کے اس خرابہ کو از سر نو آباد کرے، اور اسکے کھنڈر پر ایک ایسا عظیم الشان محل تعمیر کرے جسکے سایہ میں آدمؑ کا پورا کنبہ رہ سکے، بالآخر انسانیت کو ابراہیمؑ کے گھرانہ سے یہ معمار اعظم مل گیا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے جاہلیت کا ملبہ دور کیا، بت پرستی، اوہام ظلم و زیادتی، تعیش و نفس پرستی کو مٹایا اور نبوت کے چار ستونوں (عقیدۂ توحید، رسالت، معاد، اور خدا کی عبادت) پر زندگی کی نئی تعمیر کی۔ گھر کے مالک کی طرف سے اس گھر میں رہنے کے آئین بتلائے، بداخلاقیوں بے نظمیوں اور زیادتیوں کے خس و خاشاک کو دور کیا، چور دروازوں کو بند کیا، ان تمام رخنوں کو مسدود کیا جن سے نفس پرستی، ہوسناکی، خدا سے غفلت، گناہ کا رجحان ظلم کا میلان پیدا ہوتا ہے۔ اس گھر کے نظام کیلئے ضروری تھا کہ اسکو بے مالک کا نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ خدا کے یقین کو اور اسکے خوف کو رگ و ریشہ میں پیوست کر دیا۔ امن و سکون، و اعتدال کیلئے ضروری تھا کہ اس گھر کو منتہیٰ نہ سمجھا جائے، عقیدۂ آخرت کو دل و دماغ میں اُتار دیا۔

جن مفسدوں نے اس گھر کا انتظام اپنے ذمہ لے لیا تھا اور زبردستی اسکے متولی بن گئے تھے اور اس کو انھوں نے اپنی نفس پرستیوں اور زیادتیوں سے دوزخ کا نمونہ بنا رکھا تھا ان کو بے دخل کیا گیا، اور امانت دار فرض شناس اور خدا سے ڈرنے والے اور آخرت کا یقین رکھنے والے بندوں کو اس کا نظم و نسق حوالہ کیا گیا اور دیکھتے دیکھتے یہ گھر جنت کا نمونہ بن گیا ——— اللہ کا رسول جب دنیا سے جانے لگا تو اس گھر کی حفاظت کا کام اپنی امت کے سپرد کر گیا جو پیدا اسی لئے کی گئی تھی کہ لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرے، اللہ کے قانون کو دنیا میں جاری کرے، خدا کی مرضی کے کاموں کو رواج دے، برائیوں اور گناہوں کو روکے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کیگئی نیکی کا حکم
وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ ؕ	دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

وقتاً فوقتاً دنیا کا احتساب کرتی رہے، دنیا کی قوموں کو راستہ سے بھٹکنے اور اس بنے بنائے گھر کو برباد ہونے سے بچائے۔

اسی کے ساتھ آپ اس امت کو وہ بنیادیں بتا گئے جن پر دنیا کی ہر زمانہ میں نئی تعمیر ہو سکتی ہے، یہ ایمانی بنیادیں ہیں جن پر ہر پیغمبر نے اپنی اپنی امت کی تعمیر کی تھی! اور رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے پوری انسانیت کی تعمیر کی۔

صدیوں سے انسانیت کا یہ گھر انسانیت دشمن عناصر کے ہاتھوں برباد ہو رہا ہے، جو گھر کے ڈاکے باغی تھے وہ گھر کے منتظم بن بیٹھے ہیں، بھیڑیوں کو بکریوں کا رکھوالا بنا دیا گیا ہے، سب کا رزق کھا کر بھی جن کا پیٹ نہ بھرے اُن کو رزق کی تقسیم کا کام سپرد ہوا ہے، جو پورے گھر کو اس کے بسنے والوں سمیت اپنی ایک ادنیٰ خواہش اور اپنے دل کی حقیر فرمائش کے لئے رہن رکھنے، فروخت کر دینے اور تاراج کر دینے کیلئے تیار ہیں وہ اس گھر کے پاسبان مقرر ہوئے ہیں، جو اسکی بنیادوں پر تیشہ چلاتے رہتے ہیں وہ اسکی تعمیر کے مدعی ہیں۔

انسانیت کی عمارت بوسیدہ اور متزلزل ہے، اس میں جا بجا رخنے اور شگاف نظر آتے ہیں، چور دروازے بکثرت کھل گئے ہیں، بداخلاقیوں، زیادتیوں اور بے عنوانیوں نے گھر کے رہنے والوں کی عافیت تنگ کر رکھی ہے، نہ ان کو دن کو چین نصیب ہے نہ راتوں کو میٹھی نیند، پیٹ کی آگ اور دل کی پیاس نے سارے گھر کو قمارخانہ بنا دیا ہے جس میں ایک کی جیت اور سیکڑوں کی ہار ہے، زندگی سوداگری اور قمار بازی بن کر رہ گئی، اللہ کی پیدا کی ہوئی نعمتوں پر حکومتوں کی مہریں لگ گئیں اور عوام کی دولت چند خواص کی ہوسناکیوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئی۔ زندگی کی ڈوریاں چند آدمیوں کے ہاتھوں میں آگئی ہیں جو قوموں کو پتلیوں کی طرح نچاتے ہیں، اپنی جھوٹی عزت اور اپنے حقیر فائدہ کے لئے ملکوں کو ملکوں سے لڑاتے ہیں، جمہوریت کے لباس میں استبداد کا دیو ہے، قومیت و وطنیت کے نام سے آدم کشی اور غارت گری ہے، آئین کے ذریعہ سے نفس و خواہش کی تسکین ہے، سکون و اطمینان عنقا ہے اور اعتماد و محبت ناپید، دل افسردہ، پیٹ خالی، دماغ مفلوج اور ہاتھ پاؤں شل ہیں، انسانیت و انصاف سربازار رسوا، اور حیوانیت و مادیت پوری بہار پر سے

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

مغرب سے لیکر مشرق تک صرف تخریب کی دوڑ ہے اور انسانیت پر مشق ستم۔ نہ کہیں تعمیر کا ارادہ ہے نہ اس کا تجربہ، کسی کو اپنے گھر کی تعمیر سے فرصت نہیں کہ وہ تعمیر انسانیت کی طرف توجہ کرے، یورپ اس تخریب میں اپنے ساتھ کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ مشرق کو ہوس ہے کہ اس کو اس کا موقع (بقیہ ۴۸ پر)

جبری تعلیم کا نفاذ اور مسلمان

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہی، نمرود ہی
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہی

ہمارے صوبے میں جبری تعلیم کے نفاذ نے مسلمانوں کو بہت نازک صورتِ حال سے دوچار کردیا ہی۔ اگر معاملہ صرف ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، پوری انسانیت کا دین اور آفاق گیر نظریۂ حیات ہونے کی حیثیت سے اسلام نے ان عوامل کا پورا لحاظ رکھا ہی جن کے اثر سے زبانیں وجود میں آتی اور نشو و نما پاتی رہتی ہیں۔ کوئی فرد یا جماعت اگر ان مخصوص اصولوں پر یقین رکھتا اور انھیں عملاً اپنی زندگی پر نافذ کرتا ہو جن پر اسلام معاشرے کا نظام قائم کرنا چاہتا ہی تو پھر وہ یہ نہیں پوچھتا کہ تم بسنے والے کہاں کے ہو، کون زبان بولتے اور کس نسل سے تعلق رکھتے ہو؟۔

مگر باخبر حضرات جانتے ہیں کہ نصابِ تعلیم کے پس پشت ایک طرزِ فکر (IDIALOGY.) اور ایک نصب العین ہوا کرتا ہی جو زندگی اور خون کی طرح اس کی رگ رگ میں دوڑتا رہتا ہی، زیرِ بحث نصاب کے پس پشت بھی ایک ذہنیت اور مقصد ہی۔ اب سوال یہ ہی کہ کیا کوئی مسلمان جو اپنے دین سے واقف اور اس نصاب کے تضمنات (IMPLICATIONS) سے باخبر ہو، اپنی آیندہ نسل کو اس نصاب کے مطابق تعلیم دینے والی درسگاہوں کے سپرد کرنے پر اطمینانِ ضمیر کے ساتھ راضی ہو سکتا ہی؟ بہت غور کرنے کے بعد میرا جواب نفی میں ہی!۔

اگر موجودہ حکومت کم از کم رسوائے عالم برطانوی حکومت کے برابر بھی روادار ہوتی اور چھ سے گیارہ سال تک کی عمر کے بچوں کو دوسرے اداروں میں داخل ہونے پر پابندی نہ عائد کرتی تو معاملہ یہ نزاکت نہ اختیار کرتا۔ برطانوی عہد میں جامعہ ملیہ اور دوسری قومی درسگاہوں پر اس قسم کی کوئی

پابندی نہ تھی، البتہ اپنی تعلیمی پالیسی کی پاسداری میں نہ وہ ایسے ادارہ جات کی سرکاری حیثیت تسلیم کرتی تھی اور نہ ان کو مالی امداد دیتی تھی۔

بہت سی ہندی کتابیں جو پہلے سے رائج تھیں اُن کو دوبارہ مرتب کیا گیا ہے۔ بہت سی نئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان سب میں وہ پس بھر دیا گیا ہے جو ہمارے نونہالوں کے دل میں ایمان ویقین کے پودے کی جڑیں ہمیشہ کے لئے جلا کر خشک کر دے گا۔ مثال کے طور پر بالکل ابتدائی کتاب جس میں بچے کو حروف سے روشناس کرایا جائے گا۔ اسلامی عقائد پر پہلی کاری ضرب کا درجہ رکھتی ہے۔ ہم اسے موحد بنانا چاہتے ہیں اور ہماری تعلیم گاہیں پورا ہندو علم الاصنام، اس کے ذہن ودماغ میں پیوست کرکے اُسے پکا مشرک بنا کر رکھنے جائیں، اور شرک وہ چیز ہے کہ خود ہندوؤں میں فکر صالح رکھنے والوں کا یقین بھی اس پر سے اُٹھ چکا ہے۔

اصول تعلیم کا تقاضہ ہے کہ ابتدائی درجات میں بچوں کو انھیں چیزوں کے نام بتائے جائیں اور وہی الفاظ پڑھائے جائیں جن سے وہ اپنی روزانہ زندگی میں مانوس ہوں، پھر آخر (ल) سے لٹو کے بجائے لکشمی، اور (स) سے سارس یا سانپ کی جگہ سرسوتی، اور (ह) سے ہل کے مقام پر ہنومان کو لاکر بٹھا دینا کن جذبات اور کن عزائم کی غمازی کرتا ہے؟۔

میں اس پورے احترام کے ساتھ جس کی ایک حکومت اپنے ذمہ دار شہری کی جانب سے حقدار ہوتی ہے۔ وقت کے ارباب حل وعقد پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آنکھ بند کرکے جذبات کی رو میں یہ سرپٹ بھاگنے کا طریقہ ٹھیک نہیں۔ آپ اگر مخصوص نظریات وعقائد کے حامل ہیں انکی صحت پر سنجیدگی سے یقین رکھتے ہیں اور ان ہی کی تبلیغ وترویج میں اپنی قوم اور ملک کا بھلا جانتے ہیں تو ضرور اس کے لئے جدوجہد کیجئے لیکن یہ بات انسانیت وعقل کے قطعاً منافی ہے کہ وہ لوگ جو آپکے اصولوں کی صحت پر یقین نہیں رکھتے اُنھیں بھی آپ بجبر واکراہ ان کا پابند بنائیں اور انکے بچوں کے دماغ میں قانون کے حربہ کے ذریعہ وہ باتیں ٹھونسیں جن کو وہ کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے کردار واعمال نے بیشک آپکے دل میں اسلام سے ایسی نفرت پیدا کر دی ہے کہ بظاہر وہ جلد دور ہونے والی نہیں اس لئے یقیناً یہ چیز آپ کی آتش غضب کیلئے مزید ایندھن کا کام کرے گی کہ موجودہ نصاب سے بیزاری کی بنیاد وہی نام نہاد اسلام ہے جس کے نام پر پاکستان بنا جس کے

ہیبت ناک بازوؤں کے سایہ میں مغربی پنجاب اور نواکھالی کے مظلوم ہندوؤں کی زرخیز آبادیاں پھریں، اور جواب بھی اس حصہ ملک میں آپ کی بے قید عدائی کا تنہا حریف بننے سے باز نہیں آتا۔

مگر نہیں یہ آپ کی بقول، ہر اشخاص اور جماعتیں اصول کو اپناتی ہیں لیکن اس کا پیمانہ نہیں ہوتیں۔ اعتماد اور ہمت سے کام لیجئے۔ اسلام کو اپنے طور پر جانچئے اور پرکھئے۔ دھڑے بندی، فرقہ پرستی، غرض پرستی اور نسلی و قومی رقابت کی بنیاد پر جو مطالبہ کیا جائے اس کو ضرور رد کیجئے لیکن اسلامی اصولوں کی پاسداری میں آپ کی پالیسی سے جو اختلاف ہو اُس پر سنجیدگی سے غور کیجئے، ممکن ہے ابھی آپ اپنے فکر و استدلال کو اس کے مخالف نہ پائیں۔ ان اصولوں پر قائم ہونے والی درسگاہوں کی سرپرستی نہ کیجئے، لیکن ان میں ایک نسل پروان چڑھنے دیجئے، ایک دن آئے گا کہ اس کو آپ تمام انسانیت کے لئے رحمتِ عام پائیے گا۔

"الانصاف" الہ آباد

مورخہ ۱۳؍ اگست ۱۹۴۹ء

بے پردگی کی سند

سنا ہے کہ لائل پور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ کے دوران میں مستغاث علیہ کے وکیل نے مستغیثہ سے چہرہ کھولنے کا مطالبہ کیا، جب کہا گیا کہ ایسا مطالبہ ناجائز اور غیر اسلامی ہے تو وکیل نے کہا کہ جب بیگم لیاقت علی جیسی مقتدر ہستی بے پردہ رہتی اور بے پردگی ہی کی تلقین کرتی ہے تو مستغیثہ کو پردہ اٹھانے سے کیوں انکار ہے اس پر مستغیثہ کے وکیل نے کہا کسی بڑے سے بڑے آدمی کی غلط کاری بھی کسی غیر اسلامی حرکت کے جواز کی سند نہیں بن سکتی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ پچھلے دنوں فاطمہ جناح گرلز کالج کی پرنسپل نے بیگم لیاقت علی کو اپنی بے پردگی کی وجہ سے کالج کی طالبات کو خطاب کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

مندرجہ بالا واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں کس طرح اس وقت متضاد رجحانات کی کارفرمائی ہے ایک طرف پاکستان کا برسرِ اقتدار طبقہ ہے جو اپنی پوری کوشش اسلام کی جڑیں کاٹنے اور فحاشی و بے حیائی کی تبلیغ پر صرف کر رہا ہے ـــــ اور اسکے طرزِ عمل کو سند بنا کر عوام میں سے بھی بعض لوگ

"شاخِ ایمان" (حیا) کو کاٹنے پر آمادہ ہوگئے ہیں ---- اور دوسری طرف وہ کروڑوں مسلمان عوام ہیں جو لاکھ گنا ہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی اسلامی طرزِ معاشرت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں گویا خود رہبر رداں متاعِ کاروان کو لوٹنے کی فکر میں ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس کش مکش میں کامیابی عوام کو حاصل ہوتی ہے یا اربابِ اقتدار کو۔

"الانصاف" الہ آباد

مورخہ ۵ ستمبر ۴۹ء

(صفحہ ۲۴ کا بقیہ)

دیا جائے، اور جہاں اس کو مرقع ملا اس نے اپنے جوہر پوری طرح دکھائے۔

انسانیت ان تیشوں سے زار و نزار ہے، مریض عطائیوں کے ہاتھوں دم توڑ رہا ہے، عمارت جنبش میں ہے اور معمار خود اس عمارت کے ایک کونہ میں میٹھی نیند سو رہا ہے، گرتے ہوئے مکان کے در و دیوار سے صدا بلند ہے۔ ؎

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۰ نمبر (۱۲) بابت ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۱ھ

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھئے! الفرقان اور کتبخانہ الفرقان بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں
لہذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھئے
دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ (یو پی)

جلد (۱۶)	بابتہ ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۴۹ء	نمبر ۱۲

یہاں [ ] سُرخ نشان اِس بات کی علامت ہے کہ ہمارے حساب سے آپ کی مدّتِ خریداری اس شمارہ پر ختم ہو گئی ہے لہٰذا آئندہ کیلئے اپنا چندہ صہ روپئے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مشکور فرمایئے، اگر خدانخواستہ آپ کا ارادہ آئندہ رسالہ جاری رکھنے کا نہیں ہے تو ایک کارڈ سے مطلع فرمایئے ——— عدم اطلاع کی صورت میں اگلا پرچہ وی، پی حاضرِ خدمت ہوگا جس کو وصول کرنا آپ کا دینی اور اخلاقی فرض ہوگا۔

نوٹ:۔ چندہ بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری صحیح اور صاف لکھئے ——— نام اور پتہ صاف صاف اور خوشخط تحریر فرمایئے۔

نیازمند "منیجر"

تین ۳ "باتیں"

گذشتہ شمارہ میں یہ اطلاع دی جاچکی ہے کہ "الفرقان" کے صفحات میں اضافہ کرکے سالانہ چندہ میں ایک روپیہ کی زیادتی کردیگئی ہے یعنی اب الفرقان کا چندہ بجائے چار روپئے کے "پانچ روپئے" سالانہ ہے لہٰذا اس تبدیلی کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرلیا جائے، اس اشاعت میں دوبارہ یہ اعلان اسی غرض سے کیا جارہا ہے۔

اس اشاعت پر پاکستان میں بسنے والے بہت سے خریداروں کے چندہ کی میعاد ختم ہورہی ہے، جس کی اطلاع ہر ایسے خریدار کو سرخ نشان کے ذریعہ سے دیجارہی ہے اور نئے سال کیلئے زرِ چندہ بھیجنے کی درخواست بھی کیجارہی ہے، مگر اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تبادلۂ زر بند ہے اور گویا یہ حضرات ابھی چندہ بھیجنے سے معذور ہیں اسلئے گذارش ہے کہ اگر آپ اس سال بھی رسالہ جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں جیسا کہ ہمیں توقع ہے یا خدانخواستہ کسی وجہ سے اب خریداری منظور نہ ہو تو دونوں صورتوں میں ایک کارڈ کے ذریعہ سے اپنے اس ارادہ کی اطلاع دفتر کو دیدیں تاکہ آئندہ ماہ سے پرچہ بند کرنے یا بدستور جاری رکھنے کی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ پھر جن حضرات کا پرچہ جاری رہے وہ تبادلۂ زر کے کھلنے پر بلا تاخیر اپنے چندہ کی رقم روانہ فرمادیں اور دوبارہ یاددہانی کا انتظار نہ فرمائیں۔

ابھی تک پاکستان سے رسالہ یا کتابوں کی وی، پی کی فرمائشات آرہی ہیں اور پھر اُن میں جلدی کی تاکید بھی ہوتی ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان فرمائشات کی کیسے تعمیل کیجائے کیونکہ ہم پاکستان کو وی، پی نہیں بھیج سکتے۔ بہت سے حضرات کی فرمائشیں تبادلۂ زر کے تعطل سے پہلے ہی موصول ہوگئی تھیں مگر یکایک یہ مصیبت پیش آجانے سے کتابوں کے پیکٹ بندھے کے بندھے ہی رہ گئے اور آج تک اُسی طرح رکھے ہیں صرف اس رکاوٹ کے دُور ہونے کی دیر ہے لیکن اس سے پیشتر انتظار کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔

ناظم "الفرقان" لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

گذشتہ سال الفرقان کی توسیع اشاعت کے لئے ناظرین اور عام مسلمانوں سے جو اپیل کی گئی تھی وہ بحمد اللہ کامیاب اور نتیجہ خیز رہی، دین کی حمیت و محبت رکھنے والوں نے اس سلسلہ میں اپنے دینی احساس اور جذبہ کا جس طرح ثبوت دیا، اور ہمیں مختلف خطوط سے ان کی جد و جہد اور ان کے قلبی تاثر و تفکر کے جو واقعات معلوم ہوئے ان سے ہمیں ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی مستقبل کے متعلق مزید اطمینان پیدا ہوا، دینی دعوت کا خیر مقدم اور کسی دینی تحریک و دعوت یا ادارہ کی زندگی کے خطرہ کا احساس اور اس پر بے چینی یہی زندگی کی علامتیں ہیں یہ دعوت خواہ کتنی کمزور، اس کے داعی خواہ کیسے بے سر و سامان، اور ان کی مدد کے واقعات خواہ بہت زیادہ غیر معمولی نہ ہوں جو تاریخ میں نمایاں طریقہ پر درج کئے جائیں بہرحال بڑے دور رس نتائج رکھتے ہیں اور کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، ہم اس کو تائید غیبی سمجھتے ہیں اور ان واقعات سے ہندوستان کے اسلامی مستقبل کے لئے فال نیک لیتے ہیں۔ اصل چیز احساس ہے اگر مسلمانوں میں دینی احساس و حمیت کا سرمایہ موجود ہے تو ہر مشکل آسان اور ہر منزل قریب ہے دینی دعوتوں اور اسلامی اداروں کا تعطل اتنا سنگین واقعہ نہیں جتنا مسلمانوں کا عدم احساس اور ان واقعات کا عادی ہوتے جانا اور اس سب کے باوجود اپنے مشاغل اور زندگی کی دلچسپیوں میں منہمک رہنا ہے۔

اسلامی زندگی کے عروج کے زمانہ میں کسی اسلامی ادارہ کا تعطل اور کسی دینی دعوت کی ناکامی، ایسا تشویشناک واقعہ نہیں کہ اس وقت زمین میں نمو اور روئیدگی ہوتی ہے اور ہوا دین پرور

ہوتی ہے، لیکن انحطاط اور مجبوری و پابندی کے دور میں ایک دینی ادارہ کا تعطل اور کسی دینی کوشش کا التواء بڑی قابل فکر چیز ہے کہ زمین نئی چیزوں کے قبول کرنے کی استعداد نہیں رکھتی اور نمو کی صلاحیت سے محروم ہوجاتی ہے۔ اس وقت ہر ادارہ دین کی ایک قیمتی امانت ہے جس کی حفاظت تمام مسلمانوں کے ذمہ ہے یہاں تک کہ وہ ادارے جن سے کسی طرح بھی مسلمانوں کی زندگی طاقت اور شادابی حاصل کرتی ہے، اور جن کا تعطل مسلمانوں میں اضمحلال و ناامیدی اور احساسِ کمتری پیدا کرسکتا ہے قابلِ حفاظت ہوجاتے ہیں۔

بیدلی و پست ہمتی کے جو مخفی سے مخفی اسباب و محرکات کسی مُلک میں ہوسکتے ہیں اُن سب کا سدباب وقت کا نہایت اہم فریضہ ہوتا ہے، اس بارہ میں کوئی شخص کتنا ہی زیادہ ذکی الحس ہوجائے، قابلِ ملامت نہیں، کہ ؎

عشق است و ہزار بدگمانی

مسلمان کا مال اس لئے ہے کہ اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ اور ان سے پہلے اسلام کے بقاو ترقی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے کام آئے، جو دولت اس مقصد کے لئے منفید ہو رہی ہے وہ اللہ کے نزدیک بڑی قیمتی ہے اور اس کا ذمہ ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے اس سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی ضمانت و حفاظت نہیں ہوسکتی۔ ہمیں کتاب و سنّت سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ مال کی حفاظت ہے، انفاق فی سبیل اللہ دولت کی ضمانت ہے، ہمیں یقین ہے کہ جس دولت سے اسلام کی تقویت ہو رہی ہو وہ تلف و برباد نہیں ہوسکتی۔

تخلیہ کنندگان کی جائداد اور دولت کے سلسلہ میں پچھلے دنوں جو واقعات پیش آئے ہیں وہ تاریخی عجائبات میں شمار ہونے کے قابل ہیں اور برسوں یادگار رہیں گے لیکن ایک لمحہ کیلئے ہم کو سوچنا چاہیئے کہ ان جائدادوں اور دولتوں میں جن کا پچاسواں حصہ دین کی دعوت و تحریکات کے فروغ کا ذریعہ ہوسکتا تھا، دینی دعوت و خدمت کا کیا حصہ تھا اور ان سے دین کی سربلندی و اشاعت کا کتنا کام ہو رہا تھا، اور ان میں اسلام کا کتنا حق سمجھا جا رہا تھا، دینی کاموں کی مشکلات اور مجبوریوں کا ہمیں کتنا درد اور احساس تھا، اس عرصہ میں جب ہم ان دولتوں سے متمتع ہو رہے تھے

اور وہ ہماری ضروریات بلکہ فضولیات سے بھی بہت زیادہ فاضل تھیں، دین کے کتنے کام رُکے پڑے تھے اور کتنے ادارے دم توڑ رہے تھے، دین کی دعوت و اشاعت کی کتنی تجاویز ملتوی پڑی تھیں، دین کی دعوت اور اسلام کے پیغام کی اشاعت کے لئے انگریزی ہندی کا کوئی اخبار و رسالہ اور دار الاشاعت نہ تھا، مسلمانوں کی اتنی بڑی قوم جس کی دولت کا کچھ اندازہ ضبطی کے واقعات سے ہوا اسلامی پریس سے محروم تھی، دین کے ترجمان اور نقیب اخبارات اور رسائل اپنی تعداد کی انتہائی کمی کے باوجود سخت مالی مشکلات میں مبتلا تھے، دینی مدارس بالکل ناکافی ہونے کے باوجود مفلس کے چراغ کی طرح ٹمٹما رہے تھے، اس سب کا ہمارے دل پر کیا اثر تھا اور ہماری دولت میں ان کا کیا حصہ تھا؟ ۔ پوری ہمدردی اور مظلومیت کے پورے اعتراف کے باوجود ہمیں اپنے نفس کے احتساب سے غافل نہیں ہونا چاہئے، اور جو لوگ ان واقعات سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں ان کو ضرور عبرت حاصل کرنا چاہئے۔

دین کے داعیوں اور خادموں کی تربیت و تعلیم کے شعبہ کے افتتاح کے لئے ہم نے جو اپیل شائع کی تھی اور اس کی اہمیت و ضرورت واضح کی تھی، تاسف بھی ہے اور تعجب بھی کہ اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی، اس وقت تک بار بار اس کا تذکرہ آنے کے باوجود نہ تو اس کے لئے مالی اسباب فراہم ہوئے نہ آدمی دستیاب ہوئے، اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ مسلمانوں میں ٹھوس تعمیری و تعلیمی کاموں کی ضرورت کے احساس کا کس قدر فقدان ہے، ہم اپنے اس یقین سے مجبور ہیں کہ ہندستان کے بدلتے ہوئے حالات میں دین کی سنجیدہ موثر اور مستحکم خدمت کے لئے یہ شعبہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کی پوری کارگاہ میں آدمی اصل طاقت ہے، جس مقصد و دعوت کے پاس آدمیوں کا خزانہ اور اپنے مطلب کے آدمی ڈھالنے کا کارخانہ ہے وہ جیتی جاگتی اور زندہ و توانا تحریک ہے، اس کے پاس اصل دولت و طاقت ہے، جس مقصد و دعوت کے پاس شاندار تاریخ ماضی ہے، موثر دلائل و براہین ہیں، اعلیٰ درجہ کا ادب ہے اور سب کچھ ہے لیکن آدمی نہیں، نہ آدمیوں کی تربیت و تیاری کا سامان ہے، وہ ایک ایسا درخت ہے جس کی جڑ اگر آج خشک نہیں ہے تو کل خشک ہو جائیگی اور پھر اس کو کسی مصنوعی طریقہ پر زندہ و شاداب نہیں رکھا جا سکے گا۔

دین کا کام ہر جگہ بڑی وسیع اور اعلیٰ صلاحیتوں کا طالب ہے، مقصد جتنا بلند اور وسیع ہو اور اس کے موانع جتنے کثیر ہوں اس کی ذمہ داری اتنی ہی نازک اور عظیم ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں بالخصوص دین کا کام بڑے اجتہاد، سلیقہ و حکمت جامعیت و توازنِ دماغی، اور روحانی و دماغی صلاحیتوں کا متقاضی ہے دین کے خادم سبزۂ خود رو نہیں ہیں، ان کے لئے علمی و عملی تربیت اور تجربہ و مطالعہ کی ضرورت ہے، اور اس کا شایانِ شان انتظام ہم مسلمانوں کے ذمہ ہے، اس کام میں تاخیر کی گنجائش نہیں، حالات تیز رفتاری کے ساتھ جا رہے ہیں ایک دن کی غفلت صدیوں کے لئے پیچھے ڈال دے گی۔ ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودہ ام صد سالہ راہم دور شد

اس سال سے بعض مخلصین کی اعانت سے اس شعبہ کا برائے نام افتتاح کر دیا گیا ہے، لیکن حالات و ضروریات سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔ ناظرین الفرقان اور انکے توسط سے اہلِ استطاعت مسلمانوں سے دوبارہ درخواست ہے کہ اس اہم کام کی طرف جلد توجہ فرمائیں۔

رسائل و جرائد کی زندگی میں ہر نئے سال کی ابتدا ایک امتحانی مرحلہ ہوتا ہے، مسلمانوں کے جذبات پہاڑی ندی کی طرح چڑھتے اترتے رہتے ہیں، ہر مرتبہ جذبات کو اُبھارنا نہ تو آسان ہے نہ خوشگوار کام، الفرقان کے لئے اس اشاعت سے یہ مرحلہ سامنے آگیا ہے جن دوستوں نے کسی دینی احساس اور حمیت پر اس کی خریداری منظور کی تھی یا دوستوں میں کوشش کی تھی، ان کے لئے یہ بنیاد اب بھی موجود ہے، اُمید ہے کہ وہ اپنے استقلال اور تھوڑے سے ایثار سے دین کی ایک دعوت کو باطمینان خدمت کا موقع دیں گے، اور رسالہ کی اشاعت کی ترقی و توسیع سے غفلت نہیں کریں گے اور اپنے کو اس فرض سے سبکدوش نہیں سمجھیں گے کہ ابھی اشاعت کیلئے خدمت و عمل کا بہت بڑا میدان پڑا ہوا ہے۔ ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ہندوستانی مسلمانوں کا دینی مستقبل

(۳)

اس سلسلہ کی دو قسطیں جمادی الاخریٰ اور شعبان کے شماروں میں شائع ہو چکی ہیں، پہلی قسط میں مسلمانانِ ہند کے مختلف طبقوں کی اُن دینی و ایمانی کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی تھی جو انگریزی دورِ حکومت کی پچھلی ایک صدی میں اُن میں پیدا ہوئیں، اور دوسری قسط میں اُن نئے حالات وواقعات اور امکانات کا ذکر کیا گیا تھا جو مستقبل میں اُن کی دینی حیثیت پر اثر انداز ہونے والے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ آج کی صحبت میں یہ عرض کرنا ہے کہ مسلمانوں میں جو افراد یا جو طبقے دین کا درد و فکر رکھتے ہیں، اور ایمان کی قدر و قیمت کچھ سمجھتے ہیں اور اس لئے چاہتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ ان کا اور ان کی نسلوں کا وہ تعلق اور وہ صحیح نسبت قائم رہے جس کا نام ایمان و اسلام ہے اور اس ملک میں رہنے والی وہ ہزاروں قومیں اور نسلیں اور لاکھوں خاندان جو صدیوں سے حضرت محمد عربی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی بیعت و غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے ہیں، اور اللہ کی رضا اور ابدی نجات و فلاح آپ کے لائے ہوئے دین پر چلنے میں منحصر سمجھتے ہیں۔ اُن کا یہ تعلق حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اور آپ کے لائے ہوئے دین اور آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کے بتلائے ہوئے قبلہ کیساتھ اسی طرح قائم رہے اور حالات کی ناموافقت سے ناموافق کوئی تبدیلی اور کوئی شیطانی سازش، اور کوئی کوشش ہماری زندگی کے اس دینی و ایمانی پہلو پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ تو ایسے سب افرادِ ملت سے عرض کرنا ہے کہ بظاہر اسباب ہندوستان میں اسکی ممکن صورت اب صرف یہی ہے کہ اللہ کے جو بندے اس کا سچا فکر اور درد رکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں اُن پر جو فرض عائد ہوتا ہے اس کو ادا کرنا چاہتے ہیں وہ اسلام کیساتھ رسمی اور موروثی تعلق

اور اس حقیقی ایمان و اسلام کے فرق کو سمجھتے ہوئے جس کی دعوت انبیاء علیہم السلام لے کر آیا کئے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کے تمام طبقوں میں حقیقی و شعوری ایمان اور دین پر استقامت کی صفت پیدا کرنے اور عام کرنے کی کوشش کو اپنی زندگی کا واحد مقصد قرار دے لیں اور اس مقدس مقصد کے لئے جیسی جدوجہد اہل ایمان کو کرنی چاہیئے، اپنے امکان بھر اس میں کمی نہ کریں۔ (وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبَاكُمْ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ)۔

انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کی تاریخ پر جن حضرات کی کچھ نظر ہے وہ اس حقیقت سے ضرور واقف ہونگے کہ اُن کی امتوں کے مختلف دور ہوتے ہیں۔ پہلا دور سخت آزمائشوں کا دور ہوتا ہے اس دور میں خوب سوچ سمجھ کر وہی سچے اور پکے لوگ ان کی دعوت قبول کرتے اور انکی جماعت میں آتے ہیں جنھیں دین و ایمان ہر دوسری چیز سے زیادہ پیارا ہوتا کہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہوجاتا ہے۔ وہ حالات کی ناموافقت اور فضا کی ناسازگاری اور مصائب و تکالیف کے یقین کے باوجود اس دین کو قبول کرتے ہیں اور اس پر قائم رہنے اور اس کی ہدایتوں پر چلنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی وہ ثابت قدم رہتے ہیں ـــــ پھر ان صادقین کی قربانی اور ثابت قدمی کامیابیوں کے دروازے کھول دیتی ہے اور حالات کی ناموافقت، موافقت سے، اور فضا کی ناسازگاری، سازگاری سے بدل جاتی ہے، اور امت کے لئے وہ دوسرا دور آجاتا ہے جبکہ پیغمبر کی دعوت اور اس کے پیش کئے ہوئے دین کو قبول کرنے اور اس پر چلنے والوں کو آزمائشوں سے کوئی سابقہ نہیں پڑتا بلکہ عیش و آرام اور اس دنیا کی ساری کامرانیاں اور اقبال مندیاں اس دور میں اس دین کے سایہ تلے آجاتی ہیں ـــــ یہ دور بظاہر اس امت کے عروج و اقبال کا دور ہوتا ہے لیکن در اصل زوال و انحطاط کی بنیاد اسی دور میں پڑجاتی ہے۔ امت میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوجاتی ہے جن کی وابستگی دین کے ساتھ اور دینی دعوت کے ساتھ اصلی ایمانی داخلی وابستگی نہیں ہوتی۔ اس دور میں امت کی حیثیت ایک خاص اصولی گروہ اور صاحب دعوت جماعت کی نہیں رہتی بلکہ اب وہ دنیا کی قوموں میں سے ایک ایسی قوم ہوجاتی ہے جس میں علم و عمل، افکار و خیالات، اخلاق و کردار

کے لحاظ سے طرح طرح کے آدمی ہوتے ہیں حتیٰ کہ اس دور میں بہت سے ایسے لوگ بھی اس امت میں
پیدا ہو جاتے ہیں جن کو اپنے دین کی بنیادوں سے بھی واقفیت نہیں ہوتی اور ان کا تعلق دین سے
اور دین کی دعوت لانے والے پیغمبر سے محض موروثی اور برائے نام ہوتا ہے اور چونکہ اس دور میں آزمائشوں
سے سابقہ نہیں پڑتا اس لئے ہر طرح کے رطب و یابس اور کھرے کھوٹے امت میں شامل رہتے ہیں۔
امتوں کے عروج و اطمینان کا یہ دور خواہ کتنا ہی لمبا ہو اس کے نتیجہ میں وہ تیسرا دور ضرور آتا ہے جبکہ
حالات اس امت کے لئے اور اس کے دین کے لئے پھر سے ناموافق ہو جاتے ہیں اور دین پر چلنے
اور قائم رہنے کے لئے عزم و ہمت اور جانی و مالی قربانیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

دعوتِ اسلام کا ابتدائی دور اس امت کے لئے پہلا دور تھا، پھر خلافتِ راشدہ ہی کے زمانہ
میں دوسرا دور شروع ہو گیا جو ایک ہزار سال سے زیادہ چلا، اور اب پچھلی صدی سے اسلامی دنیا کے
بہت بڑے حصے میں تیسرے دور کا آغاز ہے۔ جن ممالک میں اس دور کی خصوصیات زیادہ نمایاں
ہو چکی ہیں اُن میں ایک ہندوستان بھی ہے۔ یہاں کے حالات تیزی سے ایسے ہوتے جا رہے ہیں جن کو
دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں یہاں وہی اہل عزیمت سچے مومن و مسلم رہ سکیں گے جو دل کی پوری
سچائی کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیں گے کہ ہم کو ہر حال میں مومن و مسلم رہنا اور ایمان و اسلام کے ساتھ جینا اور مرنا ہے
چاہے ہم کو اور ہماری نسلوں کو حکومتی عہدے ملیں یا نہ ملیں، نوکریاں ملیں یا نہ ملیں، ٹھیکے اور تجارت کے
اچھے موقع ملیں یا نہ ملیں، اور ظاہر ہے کہ شعور و بصیرت کے ساتھ یہ عزم وہی لوگ کر سکتے ہیں اور وہی
اس کو نباہ سکتے ہیں جو دین کی حقیقت اور اس کی قدر و قیمت سمجھ کر اس پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور
ہر منفعت اور مصلحت کو اس کے لئے قربان کر سکتے ہوں —— اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی
اکثریت میں یہ چیز اس وقت موجود نہیں ہے۔ پس مستقبل میں یہاں کے مسلمانوں کے اسلام پر قائم رہنے کا
دار و مدار اور تمام تر انحصار بظاہر اسی پر ہے کہ حقیقی ایمانی روح، ضروری درجہ کی دینی واقفیت اور
عزیمت و استقامت کی صفت ان میں عام کرنے کی کوشش کی جائے —— اس کام کے لئے جو
طریقۂ کار ہمارے نزدیک صحیح ہے اور جس پر ہم کو پورا یقین ہے اس کی پوری تفصیل ایک مستقل رسالہ
"دعوت اصلاح و تبلیغ" میں اس سے پہلے لکھی جا چکی ہے، ناظرین کو یہاں ہم اس کا صرف حوالہ دینا
ہی کافی سمجھتے ہیں، البتہ چند اصولی باتیں یہاں بھی عرض کی جاتی ہیں۔

۱۔ اس کام کے کرنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جس مسلمان قوم میں ان کو کام کرنا ہو اس کے افراد کی بہت بڑی تعداد دین سے دوری اور بے تعلقی میں اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ وہ بیچارے دین کی بنیادوں سے بھی بے خبر ہیں اور انھوں نے زندگی کے کسی حصّے میں جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر اسلام کی راہ کو اختیار اور انتخاب نہیں کیا ہو بلکہ وہ صرف اس لئے مسلمان ہیں کہ اتفاق سے مسلمان خاندان اور مسلمان گھرانے میں پیدا ہو گئے ہیں، اگر خدانخواستہ وہ کسی غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے ہوتے تو ظاہر یہی ہو کہ اسی طرح وہ غیر مسلم ہوتے۔ بایں ہمہ یہ طبقہ بھی خارج از ملت نہیں ہو اس لئے انکو اپنا اسلامی بھائی سمجھ کر ہی ان میں کام کرنا ہوگا۔ یہ بیچارے غافل اور بے خبر ہیں خدانخواستہ کافر یا مرتد نہیں ہیں اور انکی اس غفلت و جہالت کی بہت کچھ ذمہ داری ہم پر بھی ہو۔

۲۔ اسی طرح بہت بڑی تعداد موجودہ مسلمان قوم میں ایسے لوگوں کی بھی ہو جن کو دین کی ضروری باتوں کا علم تو ہے لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی دین کے مطابق نہیں ہو مثلاً وہ جانتے ہیں کہ ہر مسلمان پر نماز فرض ہو مگر نہیں پڑھتے، جانتے ہیں کہ زکوٰۃ دین کا رکن ہو لیکن نہیں ادا کرتے، جانتے ہیں کہ رمضان کے روزے فرض ہیں لیکن نہیں رکھتے، جانتے ہیں کہ اسلام میں رشوت حرام ہو لیکن اُس سے پرہیز نہیں کرتے، جانتے ہیں کہ جھوٹ اور خصوصاً جھوٹی گواہی سخت ترین اور عظیم ترین گناہ ہو لیکن اس سے نہیں بچتے، جانتے ہیں کہ تمام فواحش کو اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا ہے لیکن ان کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، جانتے ہیں کہ ایمان سے محروم قوموں کے طور طریقوں پر چلنا یا ناخدا شناس حاکموں افسروں کو خوش کرنے کے لئے اللہ و رسولؐ کو ناراض کرنے والی یا دین کو نقصان پہنچانے والی باتیں کرنا سخت گناہ اور اپنے ایمان سے غداری ہو لیکن اپنی اغراض و خواہشات کے لئے وہ یہ سب کچھ کر لیتے ہیں — بہر حال موجودہ مسلمان قوم میں خاصکر پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے شہری مسلمانوں میں بہت بڑی تعداد کی حالت یہی ہو —
اس سے ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمانوں کی دینی حالت کی درستی کے لئے کسی عمومی تعلیمی یا اشاعتی اسکیم کے ذریعہ دینی احکام و مسائل کا ان کو صرف معلوم کرا دینا کافی نہیں ہو بلکہ اصلی ضرورت اسکی ہو کہ

ان کے دلوں میں اللہ و رسول کے احکام کی عظمت پیدا ہو اور دین پر چلنا اور ہر حال میں دین پر قائم رہنا
ان کی زندگی کا فیصلہ ہو، اور ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کے لئے دین کے احکام و مسائل کی صرف تعلیم یا
کسی طریقے سے ان کی عام اشاعت و تبلیغ کافی نہیں ہی، بلکہ اس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور انکے
نائبین کے دعوتی طور پر ایسی جدوجہد ضروری ہی جس میں زندگی کی لائن بدل دینے اور جذبات کا رُخ
پھیر دینے کی طاقت ہو اور جس میں کچھ بتلانے اور پہنچانے سے زیادہ ایمانی جذبات پیدا کرنے اور زندگی
کا نہج بدلنے کے لئے کوشش ہو۔

۳۔ مستقبل کے اُن ناسازگار حالات میں (جن کی تفصیل پہلی دو قسطوں میں کی جا چکی ہے)
ہم کو اور ہماری نسلوں کو پختگی کے ساتھ دین و ایمان پر قائم رہنے کے لئے دین کے ساتھ جس درجہ کی
محبت اور جیسی استقامت و عزیمت کی ضرورت ہی وہ ہمارے عوام و خواص میں جب ہی پیدا ہو سکتی ہی
جبکہ ان کی زندگی کو دعوتی زندگی بنا دیا جائے یعنی عام مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ رسول اللہ
(صلے اللہ علیہ وسلم) جو ہدایت اور جو طرزِ زندگی لائے ہیں اسی میں ہماری اور ساری دنیا کی نجات ہے
اور ہمارا فرض ہی بلکہ یہی ہمارے وجود کی غایت اور غرض ہی کہ خود اس پر چلیں اور اپنے دوسرے
بھائیوں کو اس پر چلانے کی کوشش کریں (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس) کسی نظریے، یا
عقیدے کی، یا کسی خاص عمل کی طرف دعوت اور اس کے عام کرنے کے لئے جدوجہد خود اس پر راسخ
اور پختہ ہونے کا بہترین ذریعہ ہی۔ صحابہ کرامؓ کو ایمان و اسلام کی پختگی میں بعد والوں پر جو امتیاز ہی
اس میں اس چیز کو بھی بہت بڑا دخل ہی کہ ان سب کی زندگی دعوت کی اور جدوجہد کی زندگی تھی۔
افسوس بعد کے مسلمان دعوت کی طاقت کو بالکل کھو بیٹھے۔

بہرحال مسلمانوں میں پھر سے دینی زندگی پیدا کرنے اور دین پر عزیمت و استقامت کی صفت
ان میں عام کرنے کے لئے یہ ضروری ہی کہ ان میں داعیانہ اسپرٹ پیدا کی جائے اور دین کی دعوت
اور جدوجہد کو ان کی زندگی کا ایسا جزو لازم بنا دیا جائے کہ مسلمان اور داعی و مبلغ مترادف
الفاظ ہو جائیں۔

---

۴ - اس مقصد کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ ضروری درجہ کی دینی تعلیم کا ایسا ہمہ گیر انتظام ہو کہ ہر شخص خواہ اس کی عمر کچھ ہو اور اس کے احوال و مشاغل کچھ ہوں وہ آسانی سے دین کی ضروری واقفیت حاصل کر سکے اور اس کو اس کے واسطے عمر کا کوئی مستقل حصّہ صرف نہ کرنا پڑے - اس عمومی تعلیم کا انتظام مساجد میں آسانی سے اور بغیر کسی بڑے صرفہ کے ہو سکتا ہے، یہ تعلیم حسب موقع کتابی بھی ہو سکتی ہے اور زبانی بھی -

---

۵ - یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور یہاں کا ہر کام تدابیر اور اسباب سے وابستہ ہے اسلئے ضرورت ہے کہ اس جد و جہد میں ایسے لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی زیادہ سے زیادہ فکر و کوشش کی جائے جن کو اللہ تعالیٰ نے فکر و عمل کی خاص صلاحیتیں دی ہیں اور جن کا اثر دوسروں پر بھی پڑ سکتا ہے۔ دنیا کی طرح دین کا کام بھی زیادہ تر ایسے ہی لوگوں سے چلتا ہے - رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عمر بن خطاب یا عمر بن ہشام (ابو جہل) کے متعلق خاص طور سے جو یہ دعا کی ہے کہ "اے اللہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو قبولِ حق کی توفیق دے کر اسلام کی مدد فرما" تو اس کا راز بھی یہی تھا۔

اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ کے جن سیدھے سادے بندوں میں فکر و عمل کی خاص صلاحیتیں بظاہر نظر نہ آئیں ان کو نظر انداز کیا جائے یا ان کو حقیر و بے کار سمجھا جائے ـــــ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کو بہت ناراض کرنے والی ہے دین کی راہ میں کسی کو بھی حقیر و بیکار سمجھنا صحیح نہیں، اس لئے کوشش تو ہر ایک پر کی جائے اور ہر آنے والے کی پوری قدر کی جائے کیا خبر اللہ کے یہاں کس کا کیا درجہ ہے ؎

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

بہر حال حقیر یا بے کار تو کسی کو بھی نہ سمجھا جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو خاص فکری یا عملی صلاحیتیں بخشی ہیں اُن کو اس کام میں لگانے اور ان کی خداداد صلاحیتوں سے دین کو فائدہ پہنچانے کی خصوصیت سے کوششیں کی جائیں۔

۶:۔ اس کام کا (یعنی احیاء دین و اصلاح امت کی جدوجہد کا) سب سے بڑا حق حضرات علماء پر ہے دین کی امانت کے وہی امین اور وہی وارثِ انبیاء ہیں اس لئے ان پر حق ہے کہ اپنی توجہات عالیہ زیادہ سے زیادہ اس کام کی طرف لگائیں، اس وقت کے خاص حالات میں یہی کام زیادہ اہم اور سب سے مقدم ہے اور اس کے سوا دینی کاموں کے جو سلسلے ہیں مستقبل میں ان کی بقا بھی اسی پر موقوف اور منحصر ہے۔ حالات کی رفتار اور وقت کی نزاکت سے جو حضرات واقف ہیں انھیں خود محسوس ہو گا کہ اس وقت دین کی پکار اور دین کا خاص مطالبہ اُن سے یہی ہے ——— نیز علماء ربانی کی رہنمائی اور پیشروی کے بغیر یہ دینی مہم انجام بھی نہیں پا سکتی ——— لیکن علماء سے یہاں ہماری مراد صرف وہی ہیں جنھوں نے اپنے کو اور اپنی صلاحیتوں کو عام اہل دنیا کی طرح ذاتی اغراض اور حرص مال وجاہ کے حوالہ نہیں کر دیا ہے ورنہ وہ دنیا طلب علماء جن کے قلوب تقوے سے اور حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی لائی ہوئی فکروں سے خالی ہیں، ان کا وجود تو دین کے لئے ایک مستقل مصیبت ہے۔ یہ لوگ جب اپنی اغراض اور اپنی سوچی ہوئی مصلحتوں کی خاطر کسی برائی کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو اس کو نیکی بنا ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس لئے دینی حقیقتوں میں تحریف کا باعث اکثر یہی لوگ بنتے ہیں۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) جا بجا اپنے مکتوبات میں جلے دل سے لکھتے ہیں کہ ——— "قرن سابق (اکبری دور) میں جو تحریفات و تلبیسات دین میں کی گئیں اور اسلام کو مسخ کرنے کی جو کوششیں ہوئیں ان کی بڑی ذمہ داری دنیا دار اور جاہ و مال کے پرستار عالموں ہی پر ہے"

اسی لئے حدیث نبوی میں ہے اَلَا اِنَّ خَیْرَ الْخَیْرِ خِیَارُ الْعُلَمَاءِ وَشَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ۔

۷۔ حضرات علماء کے علاوہ دوسرا طبقہ جس کو خاص اہمیت حاصل ہے اہلِ وجاہت اور اصحابِ دولت و ثروت کا ہے۔ قوم کے عوام ہمیشہ اسی طبقہ کا اتباع کیا کرتے ہیں، یہ اگر نیکی کی راہ پر آجائے تو پوری قوم کا نیک بننا آسان ہو جاتا ہے اور اگر یہ گمراہی پر جمے رہنے کا فیصلہ کر لے تو قوم کا ہدایت کی طرف آنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس دنیا میں کوئی بڑا کام مادی وسائل کے بغیر نہیں چلتا۔ خود رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو جہادی مہموں میں اور ضعفاء اسلام کی امداد و اعانت کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوتی تھی اور آپ اس کے لئے اپیلیں فرماتے تھے، ترغیبیں دیتے تھے،

جنت کی بشارتیں سناتے تھے، اور استطاعت رکھنے والے صحابہ کرامؓ جو پیش کر سکتے تھے پوری اولوالعزمی کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ غزوہ تبوک میں حضرت عثمانؓ کی دولت جس طرح کام آئی سب کو معلوم ہے۔ علیٰ ہذا دعوتِ اسلام کے ابتدائی دور میں حضرت خدیجہ اور حضرت ابوبکرؓ کی دولت سے اسلام کو جو مدد ملی اور جتنا کام چلا جاننے والوں سے وہ مخفی نہیں ہے۔ پس دین کا کام مادی وسائل اور سرمایہ سے آج بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ روپے پیسے سے کام کی مدد کرنے والے ہوں وہ ذاتی طور پر بھی عملاً کام میں شریک ہوں اور ضرورتوں کے موقعوں پر جو کچھ خرچ ہو حتی الوسع انہی کے ہاتھوں سے خرچ ہو، تاکہ شیطان کو بے اعتمادی کے وسوسے اور شکوک پیدا کرنے کا موقع نہ ملے —— بہرحال یہ خاص وقت ہے کہ مسلمانوں میں جن افراد اور جن طبقوں کو اللہ تعالیٰ نے وجاہت یا دولت کی نعمت دے رکھی ہے وہ دین کی طرف پیشقدمی کر کے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کی لائی ہوئی اصلی اسلامی زندگی خود اختیار کر کے لاکھوں کروڑوں پسماندہ و غریب نام کے مسلمانوں کے حقیقی مسلمان بن جانے اور اصلی اسلامی زندگی اختیار کر لینے کا اور مستقبل میں اُنکے اور اُن کی نسلوں کے دین پر قائم رہنے کا ذریعہ بنیں، نیز اس مہم کی مالی ضرورتوں کو پورا کریں۔ ایسے نازک وقت میں دین کے اس بنیادی کام پر کسی خوش نصیب کی دولت کا جو حصہ صرف ہو گا امید ہے کہ اس کا اجر دوسرے اوقات کے لحاظ سے انشاءاللہ سیکڑوں گنا زیادہ ملے گا، اور جو لوگ اس نازک دور میں بھی اپنی دولتوں کو سینت سینت کے رکھیں گے اور دین کے اِس بنیادی اور اساسی کام پر بھی خرچ نہیں کریں گے، سخت خطرہ ہے کہ کہیں اُن کی دولت اِس دنیا ہی میں اور ان کی زندگی ہی میں ان کے دشمنوں سے نہ چھنوادی جائے یا لٹیروں سے نہ لُٹوادی جائے۔

---

۸ — احیاءِ دین اور اصلاح امت کی اس جدوجہد کے ہر مرحلہ پر اسکی نہایت احتیاط کی جائے کہ کسی وقت بھی یہ جدوجہد، خالص مادی مسائل سے تعلق رکھنے والی قومی اور سیاسی تحریکات سے مشتبہ نہ ہو اور نہ اس طرح کی کسی قومی تحریک سے اس کا رشتہ جڑنے پائے —— اس بارہ میں عملی احتیاط کے علاوہ ذہنوں کو بھی بالکل صاف رکھا جائے۔

اگرچہ ہم کو یقین ہی بلکہ ہمارا ایمان ہی کہ اگر اللہ کے کرم سے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے کسی وقت اس دعوت کو قبول کرلیا اور ان کی زندگی اصلی معنی میں اسلامی زندگی ہو گئی یعنی ایمان، عمل صالح، تقویٰ اور مکارم اخلاق ان میں عام طور سے پیدا ہو گئے تو اس دنیا کی عزت و سر بلندی بھی انکو ضرور حاصل ہوگی اور ملک کی عام آبادی جو آج ان کے ساتھ معمولی رواداری برتنے پر بھی تیار نہیں ہے انشاء اللہ وہی اُن کے وجود کو ملک کے لئے برکت و رحمت سمجھنے لگے گی۔ لیکن خود ہمارا مطمح نظر اس دینی و اصلاحی جد و جہد سے اس کے سوا کچھ نہ ہونا چاہئے کہ مسلمان قوم میں وہ حقیقی ایمان و اسلامی زندگی آجائے جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے تاکہ بجائے غضب اور قہر کے ہم اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت کے مستحق ہو جائیں اور دین کیساتھ وہ زندہ تعلق اور وہ استقامت ہم میں اور ہماری قوم میں پیدا ہو جائے کہ ناسازگار حالات اور آزمائش کی سخت گھڑیوں میں بھی ہم اللہ کے دین پر قائم اور ملتِ محمدیؐ پر ثابت قدم رہیں۔

۹۔ گذشتہ دور میں ہمارا رویہ اور ہماری قومی پالیسی یہ رہی کہ یہاں کے دوسرے باشندوں سے حقوق و منافع کی حصہ رسدی تقسیم پر ہم لڑتے جھگڑتے رہے اور انہی معرکوں میں اپنی قومی طاقت کے مظاہرے کرتے رہے اور اپنے اسی طرز عمل سے اہل ملک کو بتلاتے رہے کہ گویا حقوق و منافع کے ان ہی مسئلوں کو ان کی طرح ہم بھی زندگی کے اصل مسائل سمجھتے ہیں اور اس بارہ میں دنیا کے عام انسانوں سے ہم کچھ بھی ممتاز نہیں ہیں۔ بہرحال قومی طور پر یہی ہمارے مسائل اور مشاغل رہے اور حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا جو پیام ہدایت اور جو دعوت لیکر ہمارے اسلاف عرب سے نکلے تھے اور جس کو انھوں نے انسانی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ بنایا تھا اس کو ہم نے یکسر چھوڑ دیا بلکہ خود بھی اس زندگی سے بہت کچھ ہٹ گئے اور اپنی اچھی خصوصیتیں چھوڑ کر وہ سب برائیاں ہم نے اختیار کرلیں جن کو دنیا سے مٹانے کا کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔ ایسی حالت میں یہاں کے دوسرے باشندوں کا برتاؤ اگر ہمارے ساتھ بُرا اور غیر منصفانہ ہو تو ان کے لئے تو اگرچہ یہ درست نہیں، لیکن ہم کو اس کے سوا توقع کرنے کا کیا حق ہی ـــــ اس لئے اپنی زندگی کے اس پہلو کی اصلاح و درستی کا ہمیں خاص طور سے اہتمام کرنا چاہئے کہ ملک کے غیر مسلم باشندوں کیساتھ ہمارا برتاؤ

اسلام کے مقرر کئے ہوئے اصول اخلاق احسان و انصاف اور خیر اندیشی کی بنیاد پر ہو، اور ان کے متعلق دوسرے تمام مسئلوں سے زیادہ فکر ہم کو اس کی ہو کہ اللہ کے ان بندوں کا رشتہ بھی اللہ کی ہدایت اور اس کے بھیجے ہوئے دین حق سے جڑ جائے اور یہ بیچارے بھی رحمۃ للعالمین سیدنا حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو پہچان لیں اور ان کی لائی ہوئی رحمتوں اور برکتوں میں ان کا بھی حصہ ہو جائے "وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ"

۱۰۔ آخری بات جو اس سلسلہ میں عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ احیاء دین اور اصلاح امت کے جس کار عظیم کی طرف اوپر کی سطروں میں دعوت دی گئی ہے موجودہ مادی ماحول میں بلاشبہ یہ بہت مشکل (بلکہ بعض حضرات کے خیال میں گویا ناممکنات میں سے ہے) ——— اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اگر ہماری طاقتوں اور صلاحیتوں پر ہی اس کام کا انحصار ہو تو سو میں ایک درجہ بھی اس کی امید نہیں کی جا سکتی، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ دراصل کرنے والی طاقت اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس کا یہ وعدہ ہے کہ اس کی راہ میں جب کوئی جد و جہد اخلاص کے ساتھ اور صحیح اصولوں پر کی جائے گی تو وہ اپنی خاص مدد سے اس کو کامیاب فرمائے گا اور انجام تک پہنچائے گا، اور بارہا دنیا میں اس کے اس وعدہ کی سچائی کا تجربہ ہوا ہے ——— انبیاء علیہم السلام کی خاص تعلیم اور سنت یہ ہے کہ اللہ کے بندے دین کی راہ میں کوشش تو اس طرح جان توڑ کے کریں کہ گویا نتیجہ کا دار مدار انکی کوششوں ہی پر ہے لیکن دل سے یقین رکھیں کہ جو کچھ ہوگا اللہ کی طاقت سے اور اسی کے ارادہ اور فیصلہ سے ہوگا، اس لئے نظر اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت ہی پر رکھیں، اور اپنی امکانی کوششیں کرتے ہوئے پورے الحاح اور ابتہال کیساتھ اس سے مدد مانگتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جس قدرت نے بارہا گمراہی اور مادہ پرستی کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں میں ہدایت کا نور چمکایا ہے اس کی وہ طاقت و قدرت نہ ختم ہوئی ہے اور نہ ضعیف پڑی ہے: پس کوئی وجہ نہیں کہ اللہ کے بندے وقت کی ناسازگاری اور مادہ پرستی کے فروغ کو دیکھ کر مایوس ہوں۔

احیاءِ دین اور اصلاحِ امت کی جدوجہد کے متعلق یہ چند متفرق اصولی باتیں یہاں عرض کر دی گئی ہیں، باقی اس کام کے طریقۂ کار کی پوری تفصیل "دعوتِ اصلاح و تبلیغ" نامی رسالہ میں ملاحظہ فرمائی جائے۔ "وحسبنا اللہ ونعم الوکیل"

(صـ۳۲ کا بقیہ)

کتابیں پڑھی تھیں، خالی کتاب خوانوں کی صحبت بھی اٹھائی تھی، فراغت کی سند بھی حاصل تھی، تصنیف و تالیف کا بھی کچھ دعوی تھا، عقل و فہم میں بھی ہمچشموں میں بُرا نہ خیال کیا جاتا تھا، لیکن حضرت علیہ الرحمہ کی خدمت میں چند ہی حاضریوں کے بعد معلوم ہو گیا کہ جس کو دین کی فہم و بصیرت کہنا چاہیئے اُسکے اعتبار سے آج تک خدا گواہ ہے کہ نرا احمق اور گنوار ہی تھا۔

"کتنا ہی بڑا عاقل ہو مگر عالم نہ ہو، اور نہ کسی محقق عالم کی صحبت میں رہا ہو، اُس کو کسی محقق کی صحبت میں چھ مہینے کیلئے بھیجدو، خدا کی قسم اس چھ مہینے میں وہ محقق ثابت کر دیگا اور اس عاقل کی زبان سے اقرار کرالے گا کہ میں احمق ہوں، اور اسوقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا۔ اگر اس سے زیادہ دلیل کو جی چاہے تجربہ کر لو کہ چھ مہینے کی رخصت لو پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھ لو، اُسوقت دیکھ لوگے کہ یہ شخص آئے گا تو اپنے کو عاقل کہتا ہوا، مگر جائے گا یہ کہتا ہوا کہ میں احمق ہوں، نہیں بلکہ پہلے احمق تھا، کیونکہ اب تو اس محقق کی برکت سے عقل آجائے گی"[1]

علمی و دینی یا باطنی تحقیق و بصیرت کا تو ذکر ہی کیا، روزمرہ کی ظاہری و معمولی باتوں میں جن چیزوں کو ہم تہذیب و کمال سمجھتے ہیں، حضرت علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے متعلق بھی قدم قدم پر اپنی حماقتوں کا ادراک ہوتا تھا! جونپور کے ایک شاعر حاضر ہوئے، جو عرفی تہذیب سے آراستہ تھے۔

"چند روز رہنے کے بعد جب واپس گئے تو ایک رسالہ لکھا، اُس میں یہ بھی لکھا تھا کہ عمر بھر جسے ہم تہذیب سمجھا کئے، وہاں (تھانہ بھون) جاکر معلوم ہوا کہ وہ تہذیب ہی نہ تھی۔ ایک دہلی کے طبیب چند روز رہ کر کہنے لگے کہ جن کو ہم اب تک کمالات سمجھتے تھے سارے نقائص نکلے، اور جنہیں ہم ہنر سمجھتے تھے وہ سب عیوب تھے"[1]

(باقی آئندہ)

---

[1] تشریعۃ تام وعظ صـ۳۹

تصوّف و سلوک

(از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی مدظلہ)

(۴)

توجہ و تصرف بھی نہ کوئی مقصود و مامور امر ہے نہ فی نفسہ کوئی کمال و قرب اور نہ ولایت و مقبولیت کی کوئی علامت، بلکہ نفس و خیال کی ایک قوت ہے جو خیال و توجہ میں یکسوئی کی مشق سے مقبول کیا مردود سے مردود شخص حاصل کر لے سکتا ہے۔ پرانے زمانہ کے سحر یا جادوگری اور آج کل کے مسمریزم اور عمل تنویم (ہپناٹزم) کا بڑا مدار یہی ہے، اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر کوئی اثر ڈالنے کا نام صوفیوں کی اصطلاح میں توجہ و تصرّف یا ہمت ہے۔ حضرت علیہ الرحمۃ نے ایک مستقل چھوٹا سا رسالہ عربی میں بنام (رسالۃ التعرف فی تحقیق التصرف) تحریر فرمادیا ہے، جس کا خلاصہ ''ایدناہ بروح القدس'' کی آیت سے استدلال فرماکر ایک قسم کی تائید قرار دیا ہے۔

"اور حقیقت اس تائید کی یہ ہے کہ خاص محمود و پسندیدہ کیفیات کو کسی دوسرے پر فائض یا طاری کیا جائے جس سے اس میں خاص آثار پیدا ہو جائیں یہ آثار مقاصد و اغراض کے اختلاف کی بناء پر مختلف قسم و رنگ کے ہوتے ہیں اور اس تائید کو اہلِ تصوف کی اصطلاح میں تصرّف، توجہ، ہمت اور جمع خواطر کہتے ہیں۔

اور یہ قوتِ تصرّف مشائخ میں اکثر مجاہدات و ریاضاتِ نفسانیہ سے پیدا ہوتی ہے جیسے کشتی لڑنے کی قوتِ جسمانی ریاضت یا ورزش سے پیدا ہوتی ہے۔ بعضوں میں فطرۃً بھی یہ قوت ہوتی ہے، مگر یہ صورت بہت ہی کم ہوتی ہے۔

اس قوت کا استعمال اگر کسی محمود یا اچھی غرض کیلئے ہو، جیساکہ مشائخ کا

معمول ہو تو اس غرض کے تحت اس تصرف کو بھی محمود سمجھا جائے گا، اور اگر مقصود مذموم یا بُرا ہو تو یہ تصرف بھی مذموم ہو گا۔

لیکن یہ قوت کوئی دینی کمال بہر حال نہیں، نہ مقبول و مقرب ہونے کی علامت ہے۔ ہر فاسق و فاجر بھی مشق سے اپنے اندر یہ قوت پیدا کر لے سکتا ہے بس جیسے ہاتھ پاؤں وغیرہ دوسری بدنی قوتوں کے استعمال کا حکم و حال ہے وہی اس کا بھی ہے۔[1]

نیز اس کے استعمال میں بعض دینی و دنیوی مضرتیں بھی ہیں خصوصاً اس زمانہ میں حضرت مجدد علیہ الرحمہ کا مشورہ اس کے ترک ہی کا ہے۔

"دنیوی مضرت تو اس میں یہ ہے کہ اس کے استعمال کی کثرت سے عامل کے دماغی و قلبی قویٰ ضعیف و مضمحل ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے امراض پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اور دینی مضرت یہ ہے کہ عوام اس کو ولایت و بزرگی کی علامت سمجھتے ہیں جو اعتقادی ضرر ہے، اور مریدوں کا ضرر یہ ہے کہ وہ اکثر اسی پر قناعت کر بیٹھتے ہیں، اور اصلاح کا اہتمام چھوڑ دیتے ہیں جو عملی ضرر ہے۔

انھیں مضرتوں کی وجہ سے محققین طریق نے اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے، سلف کے زمانہ میں یہ مضرتیں قویٰ کی مضبوطی، فطرت کی سلامتی اور خوش فہمی کے سبب موجود نہ تھیں۔[2]" (یا بہت کم تھیں)۔

اس کے علاوہ جو لوگ محض شیخ کی توجہ و تصرف پر قناعت کر لیتے ہیں تو اس تصرف سے جو کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں نہ تو ان کا کچھ نفع ہوتا ہے اور نہ ان کو بقا نصیب ہوتا ہے، اصلی نفع و بقا اپنی ہی محنت و مشقت کی چیزوں میں ہے۔

"یاد رکھو کہ پیر صرف رستہ بتلانے کے لئے ہیں کام کرنے کے لئے نہیں، کام تم کو خود کرنا چاہئے۔ کوئی شخص طبیب کے پاس جا کر اپنے امراض بیان کرے اور

---

[1] بوادر النوادر ص ۳۲۴　[2] ایضاً

جب وہ نسخہ تجویز کرے تو اس سے کہے کہ حکیم صاحب میری طرف سے آپ ہی پی لیں، تو ظاہر ہے کہ اس شخص کو ساری دنیا احمق کہے گی۔ بس یہی حالت طالبین توجہ کی ہے کہ مریض تو یہ مگر توجہ کریں بزرگ"

بزرگوں سے جو لوگ خالی دعا و توجہ چاہا کرتے ہیں، اس سلسلہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (رحمۃ اللہ) کی حضرت نے ایک بڑی ہی دلچسپ سبق آموز اور عارفانہ حکایت نقل فرمائی ہے، کہ

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (نور اللہ مرقدہٗ) جب بمبئی تشریف لے گئے تو ایک سوداگر نے عرض کیا کہ حضور دعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ مجھے حج نصیب کرے، فرمایا کہ ایک شرط سے دعا کروں گا کہ جس دن جہاز چلے اس دن مجھے اپنے اوپر پورا اختیار دے دو کہ میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہاز میں بٹھلا دوں، اور وہ تم کو لیکر روانہ ہو جائے، جبتک یہ نہ ہو صرف میری دعا سے کیا کام چل سکتا ہے۔

خیال کیجئے ابو طالب جو کہ رسولِ مقبول (صلے اللہ علیہ وسلم) کے حقیقی چچا ہیں اور بہت بڑے آپ کے محب کہ جب کہ تمام قریش نے مخالفت کی اور دشمن ہو گئے، اس موقع پر بھی ابو طالب نے ساتھ دیا، ساتھ ہی خود حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کو بھی ان سے بہت محبت تھی اور آپ نے بیحد کوشش ان کے مسلمان ہونے کی فرمائی، لیکن محض اس وجہ سے کہ انھوں نے خود ارادہ[1] نہیں کیا، حضور کی کوشش و محبت کچھ بھی ان کے کام نہ آئی[2]"

ایک اور دقیق و نافع بات

"اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو ہے، مگر بالکل غلط ہے، تمنا دوسری چیز ہے اور ارادہ دوسری چیز۔ ایک مرتبہ دو شخص حج کو جانے کا تذکرہ کر رہے تھے،

---

[1] ارادہ کی یہ اور آگے مثالوں سے جو تحقیق و توضیح فرمائی گئی ہے یہ وہی ہے جس پر کسی "ملّا" نے نہیں، عہدِ حاضر کے بہت بڑے نامور عالمِ نفسیات ولیم جیمس نے "ارادۂ ایمان" (Will to Believe) کے نام سے ایک کتاب لکھ ڈالی ہے۔

[2] الرفیق فی سواء الطریق صد ۵۳ ۔

ایک نے کہا بھائی ارادہ تو ہر مسلمان کا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل غلط ہے، اگر ارادہ ہر مسلمان کا ہوتا تو ضرور سب کے سب حج کر آتے، ہاں یوں کہئے کہ تمنا ہر مسلمان کی ہے سو نری تمنا سے کام نہیں چلتا، ارادہ کہتے ہیں سامان کے مہیا کرنے کو، مثلاً ایک شخص زراعت تو کرنا چاہتا ہے مگر اس کا سامان مہیا نہیں کرتا اور ایک شخص سامان بھی جمع کر رہا ہے تو پہلے کو متمنی دوسرے کو مرید کہیں گے۔ اسی طرح دو شخص جامع مسجد میں پہنچنا چاہتے ہیں مگر ایک اپنی جگہ بیٹھا تمنا ظاہر کئے جائے اور دوسرا چلنا شروع کر دے تو دوسرے کو مرید کہیں گے اور پہلے کو متمنی، جب ارادہ ہوتا ہے کام بھی ضرور پورا ہو جاتا ہے، اگر کسی وجہ سے خود قدرت نہیں ہوتی تو کوئی رہبر مل جاتا ہے جو معین ہو کر کام پورا کر دیتا ہے اسی لئے کہتے ہیں۔ السعی منی والا تمام من اللہ۔

بعض مرتبہ مرشد کی وجہ سے طالب کے قلب میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو خود محنت کرنے سے نہیں پیدا ہوتی، مگر صرف اس کیفیت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اگر خود کچھ نہ کیا جائے تو یہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آگ کے سامنے بیٹھنے سے بدن گرم ہو جاتا ہے لیکن گرمی باقی نہیں رہتی، جہاں سامنے سے ہٹ کر ہوا لگی کہ بدن میں ٹھنڈک پیدا ہو گئی، اسی طرح اس کیفیت میں بھی پیر سے جدا ہوتے ہی (یا توجہ کا اثر کم ہوتے ہی) کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اپنی کمائی کی قدر بھی خوب ہوتی ہے اور مفت کی چیز کی قدر نہیں ہوتی۔ مشہور ہے کہ ایک شخص ادھوڑی کا جوتا دوشالے سے جھاڑ رہا تھا لوگوں نے پوچھا یہ کیا! تو کہا دوشالہ تو میرے والد کی کمائی کا ہے اور جوتا میری کمائی کا۔ ؎

هر که او ارزاں خرد ارزاں دہد
گوہرے طفلے بقرصِ ناں دہد

اور جو لوگ اپنے بوتے پر کام کرتے ہیں اُن کی حالت ساری عمر یکساں رہتی ہے، البتہ ان میں شور غل اُچھل کود نہیں ہوتی اور نہ یہ مطلوب ہے[1]۔

چنانچہ بزرگی کا معیار لوگوں نے یہ تصرف بھی تراش رکھا ہے، کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کر دے، اٹھا کر زمین پر پٹک دے وہ بڑا بزرگ ہے، حالانکہ یہ بالکل لغو ہے اگر یہ بزرگی ہے تو حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کو تو ضرور اس کو برتنا چاہئے تھا، پھر کیا وجہ ہے کہ جب کفار نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو آپ اس کے منتظر ہے کہ یہ لوگ غافل ہو جائیں تو میں نکل جاؤں، کیوں نہ آپؐ نے ایک ہی نگاہ میں سب کو مدہوش کر دیا۔

بلکہ حضورؐ نے ایسے اوقات میں بھی جو کچھ کیا وہ اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ شانِ عبدیت کی دعا تھی نہ کوئی توجہ و تصرف، جیساکہ سراقہ کے مشہور واقعہ میں جو آپ کی تلاش و تعاقب میں چلا آرہا تھا۔

آپؐ نے اُس وقت میں بھی خدا تعالیٰ سے دُعا فرمائی (اَللّٰھُمَّ اکْفِنِی شَرَّہٗ) چنانچہ اس کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا۔ سراقہ نے کہا کہ غالباً آپؐ نے میرے لئے بد دعا کی، درخواست کرتا ہوں کہ آپ خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے اور وعدہ کرتا ہوں کہ قریش کو آپ کا پتہ نہ دوں گا چنانچہ آپؐ نے دُعا فرمائی اور اس کا گھوڑا زمین سے نکل آیا۔

صاحبو! بزرگی کا معیار یہ ہے کہ جتنی درویشی میں ترقی ہو جائے حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) سے مشابہت بڑھتی جائے کیونکہ ولایت مستفاد عن النبوت ہے۔ افسوس! کہ یہ لوگ علماء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اس لئے بہت سی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں[2]۔

---

[1] الرفیق فی سواء الطریق صـ۵۴ [2] ایضاً صـ۱۰

بیعت و ارادت

اب اس کے ساتھ بیعت و ارادت کی حقیقت و ضرورت بھی سُن لیں، جس میں افراط و تفریط یہ ہے کہ ایک طرف اس کو سرے سے بعضوں نے بدعت سمجھ رکھا ہے، اور دوسری طرف لوگوں نے صرف ایک رسم بنا رکھا ہے کہ بس دست بوسی و پا بوسی کر لی، باقی خود کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں، حالانکہ

"نری پیری و مریدی میں کچھ نہیں رکھا اصل کام خود چلنا ہے، اور کسی رہبر کا ہاتھ پکڑنا۔ اگرچہ (رسمی) مرید کسی سے بھی نہ ہو، یہ مطلب نہیں کہ سلسلہ میں داخل ہونے سے برکات کچھ نہیں لیکن اس کو اصل الاصول سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ آج کل پیری و مریدی کے متعلق وہ جہل پھیلا ہوا ہے کہ الامان و الحفیظ"[1]

بیعت کی اصلی حقیقت خود لفظ بیعت و ارادت اور مرید کی اصطلاح بلکہ لفظی معنی ہی سے واضح ہو جاتی ہے جیسا کہ اوپر ارادہ کی ماہیت میں حضرت نے واضح فرما دیا کہ ارادہ محض آرزو و تمنا کا نام نہیں، بلکہ مراد کو پورا کرنے کے لئے ضروری اسباب و وسائل کی بہم آوری میں لگ جانا، یا منزلِ مقصود کی طرف چل پڑنا ہے۔ پس مرید بھی اصطلاحاً وہ ہے جو اپنی دینی خصوصاً باطنی و قلبی اصلاح و درستی کو مراد و منزل بنا کر اس کے ضروری وسائل اختیار کرتا اور اس کی طرف چل پڑتا ہے۔ اور بیعت کے معنی ہیں اس منزلِ مقصود کیلئے کسی زیادہ واقف کار کو رہبر و رفیق بنا لینا اور اُسکے پیچھے یا ساتھ ساتھ چلنا تاکہ نہ صرف گمراہی کے خطرات سے حفاظت ہو بلکہ راستہ سہولت و راحت سے قطع ہو۔ بالفاظ دیگر اپنے سے زیادہ واقف و ماہر مصلح کے ہاتھ میں اپنے کو اس طرح سونپ دینا جس طرح بائع مشتری کے ہاتھ اپنی چیز سونپ دیتا ہے، یا جیسے مریض کسی حاذق و ماہر طبیب کے حوالہ اپنے کو کر دیتا اور دوا و پرہیز میں کاملاً اس کی تجاویز و ہدایات پر عمل کرتا ہے اور خالی اس گھمنڈ میں کہ خود کوئی شخص لکھا پڑھا بلکہ عالم و فاضل ہے، اور طب کی کتابوں کو پڑھ لیتا ہے یا باقاعدہ کسی اُستاد ہی سے پڑھ لیا ہے مگر مطب نہیں کیا، اگر وہ خود اپنی بیماریوں کا علاج محض کتابوں یا کتابی نسخوں سے کرنے لگے تو ہلاکت کے خطرات کو دعوت دینے کے سوا کیا ہے، باقاعدہ علاج و نسخہ نویسی کی لیاقت تو باقاعدہ

---

[1] الرفیق فی سواء الطریق - صـ

کسی طبیب کے مطب میں دو چار سال بیٹھ کر اور نسخہ نویسی کی مشق ہی سے حاصل ہو گی۔ حکیم کبیر الدین صاحب نے طب کی کتابوں کو باقاعدہ پڑھا ہی نہیں بلکہ طب کے مشہور و مستند مصنف ہیں لیکن خود فرماتے تھے کہ علاج کھانسی زکام کا بھی نہیں کر سکتا، اور بھی ایسے معلمین طب گذرے ہیں (جیسے حکیم عبدالعزیز مرحوم دریابادی) جو عمر بھر طب پڑھایا کئے اور استاذ الاساتذہ رہے مگر معالجہ کی مشق نہ تھی، نہ علاج کرتے تھے۔ ایک طب و طبیب پر کیا موقوف ہر عملی فن کا یہی حال ہے، کیا کوئی لوہار اور بڑھئی کا کام محض کتابیں پڑھ کر کر سکتا ہے، یا کھانا محض طباخی کی کوئی کتاب پڑھ کر پکا لے گا، بس وہی کچا پکا اُلٹا سیدھا وہ بھی بہت کچھ وقت اور سامان برباد کرنے کے بعد، پھر بھی خود درو ہونے کی خامی ہمیشہ باقی رہے گی۔

"کتبِ طب سے کوئی مریض اپنا معالجہ نہیں کر سکتا، حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے اور طبیب ان ہی سے علاج کرتا ہے مگر تم نہیں کر سکتے، اگر معمولی مرض کا علاج کر بھی لیا تو شدید امراض کا علاج تو کبھی نہیں کر سکتے۔ مجھے ہر سال برسات کے اخیر میں بخار آیا کرتا تھا اور حکیم صاحب ہر سال قریب قریب ایک ہی نسخہ لکھتے تھے، میں نے کہا لاؤ اس کو لکھ لیں جب بخار آیا کریگا اس کو استعمال کر لیا کریں گے، چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا مگر خاک نفع نہ ہوا، آخر کار حکیم صاحب کو بلایا، انھوں نے نسخہ لکھا اس کے پینے سے آرام ہوا، پھر تحقیق ہوا کہ اس سال صفرا کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں اب اگر میں یہ نسخہ بھی نقل کر لیتا کہ چلو اس میں صفرا و بلغم دونوں کی رعایت ہے تو یقیناً اس سے بھی اگلے سال نفع نہ ہوتا، کیونکہ اس کا مجھے اندازہ کیسے ہوتا کہ اس سال بلغم صفرا سے زیادہ ہے یا مساوی ہے یا کم۔ اس کا اندازہ تو طبیب ہی کر سکتا ہے، جو نبض کی حالت پہچانتا ہے اس لئے کتبِ طب سے معالجہ کرنا طبیب ہی کا کام ہے۔" (اشرف الجواب حصہ دوم ص ۱۸۶)

یہ بات دراصل بالکل موٹی اور معمولی ہے، پھر بھی اتنی تفہیم و تمثیل کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ پہلے تو پرانوں میں خشک تو ہب اور تر (یا رسمی) تصوّف کی بدولت یہ افراط و تفریط ہوئی کہ ایک نے بیعت و ارادت کو سرے سے حرام و بدعت قرار دے دیا، اور دوسرے نے بیعت کو وہ بھی

خالص اسی کی رسموں کو لازم و واجب سمجھ لیا، اور آج کل تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے کہ دینی اصلاح و درستی یا باطنی علاج و معالجہ الگ رہا اس کا تصور ہی سرے سے مفقود ہے، ظاہری دین اور دینی مسائل تک کیلئے باقاعدہ کسی تعلیم حتیٰ کہ براہِ راست ماخذ (کتاب و سنت) سے واقفیت تک کو ضروری نہیں جانتے، بس اُردو انگریزی میں قرآن و حدیث کے کچھ ترجمے یا اِدھر اُدھر کے اخباری مضامین پڑھ کر ہی دین کے مفتی ہی نہیں مجتہد و مجدد سب کچھ بن جاتے ہیں۔

کیا جہل مرکب ہے کہ وکیل بننے کیلئے تو گھر بیٹھ کر وکالت کی کتابیں پڑھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ لکچروں کی تکمیل و امتحان کے بعد بھی کسی سینیئر مشاق وکیل کے ساتھ کام کرنا اور تجربہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور وہ بڑا احمق ہوگا جو قانون کے کسی ایسے مشہور سے مشہور پروفیسر کے ہاتھ میں اپنا مقدمہ دیدے، جس نے نہ عدالت کی صورت کبھی دیکھی ہو نہ عدالتی کام کا عملی تجربہ رکھتا ہو۔ سائنس کی کتابوں کو خود پڑھ کر یا اُستاد کے محض لکچر سُن کر کوئی سائنسداں نہیں بن جاتا جبتک معمل (لیبوریٹری) میں امتیازات و مشاہدات نہ کرے۔

حالانکہ ان معاملات و مقدمات تجربات و مشاہدات کا تعلق اس دنیا اور عالمِ شہادت سے ہے، لیکن دینی مسائل جن کا رشتہ عالمِ غیب و آخرت کے مابعد الطبیعاتی مسائل سے جڑا ہوا ہے، ان کو ہر لیڈر، ہر ایڈیٹر، اور ہر پلیٹ فارم رخنہ مشق بنانے کا حق رکھتا اور ان پر مجددانہ و مجتہدانہ اظہارِ خیال فرماتا ہے۔

انتہا یہ کہ خود تصوف اور اسلامی تصوف پر ایسے ہی حضرات تنقید و تحقیق فرمانے لگے ہیں، اور سمندر پار سے اس تحقیق (ریسرچ) کی اسناد لاتے ہیں! ایک بڑے مشہور عالم و مصنف نے محض کتابی معلومات کے زور پر کسی جگہ تصوف پر ایسا ہی "عالمانہ" لیکچر دیا، تو مجمع میں کسی نے کیا خوب داد دی کہ حضرت اگر تصوف خالی کتابوں سے حاصل ہو جاتا، تو میں آ[illegible] کسی کو "صوفی" نہ جانتا۔

غرض ارادت و بیعت کا مطلب کمالِ دین یا دین کے مرتبہ احسان کی طلب میں نکل پڑنا، اور اپنے سے زیادہ کسی واقف کار رہبر کے پیچھے ہو لینا ہے، یا یوں کہو کہ اس مرتبہ دین کا تعلق چونکہ خصوصیت کے ساتھ قلب و باطن کی اصلاح اور اس کے امراض کے ازالہ سے ہے، اس لئے کسی شفیق و حاذق طبیب کے زیرِ علاج اپنے کو دیدینا۔

حضرت علیہ الرحمہ نے اس کو پیر و مرید یا شیخ و طالب کے مابین ایک ایسے معاہدہ سے تعبیر فرمایا ہے جس میں شیخ کی طرف سے اصلاح کا وعدہ ہوتا ہے اور طالب کی طرف سے اتباع کا۔ بیعت کی اس ماہیت کو جان لینے کے بعد ظاہر ہے کہ رسمی بیعت فرض و واجب بالکل نہیں، اس کا نفع صرف سلسلہ کی برکت کا حصول ہے، یا ایک نفسیاتی فائدہ۔ جیسا کہ ایک حیدرآبادی جامع حال و قال بزرگ (حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے کہ "مُرید کان دیدیتا ہے" یعنی پیر کی باتوں کو قدرۃً زیادہ توجہ سے سنتا اور مانتا ہے۔

ورنہ حضرت مجددؒ علیہ الرحمہ کے ہاں تو نفس اس رسمی بیعت کی جو حیثیت تھی اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے فرمایا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب کو سالہا سال کی تعلیم و تربیت کے بعد جب اجازت عطا فرمانا چاہا تو انھوں نے عرض کیا حضرت ابھی تو احقر کو مرید بھی نہیں فرمایا گیا! فرمایا، اچھا آؤ مرید بھی ہو جاؤ! اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو یاد بھی نہیں رہتا کہ کون مُرید ہے کون نہیں، بس میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ کام میں کون لگا ہے۔ بیعت کی درخواست کرنے والوں سے بالعموم ابتدا میں ایسے ہی جرحی سوالات فرماتے جن سے بیعت کی اصل غرض و غایت اُن پر کھل جائے ورنہ معمولاً لوگوں کے ذہن میں بیعت کی جو اغراض ہوتی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے، کہ

"بعضے صاحبِ کشف و کرامت بننا چاہتے ہیں، تو اس کا خود شیخ ہیں ہونا ضرور نہیں تو مرید اس کی کیا ہوس کرے۔ بعضے سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب بخشش کے ذمہ دار ہو جائیں گے۔ حالانکہ جب خود رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے حضرت فاطمہؓ تک کو فرمایا تھا یا فاطمہ انقذی نفسك من النار (فاطمہؓ اپنے کو دوزخ سے بچاؤ)، تو بھلا اور کون پیر کسی مرید کو بچا سکتا ہے، جبتک خود مرید ہی اسکی کوشش نہ کرے)۔

بعضے جانتے ہیں کہ پیر صاحب ایک ہی نظر میں کامل کر دینگے۔ اگر اس طرح کام بن جاتے تو صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو کچھ بھی نہ کرنا پڑتا کیونکہ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ کون کامل النظر ہوگا۔

کہیں بطور خرق عادت ایسا ہو بھی گیا، تو خوارق میں دوام ولزوم نہیں اس بھروسہ پر رہنا بڑی غلطی ہے۔

بعضے چاہتے ہیں کہ خوب جوش وخروش شورش ومستی پیدا ہو، گناہ آپ سے آپ چھوٹ جائیں، خواہش ہی مٹ جائے، نیک کاموں میں ارادہ ہی نہ کرنا پڑے، آپ سے آپ ہو جایا کریں، وساوس وخطرات سب فنا ہو جائیں بس ایک محویت کا عالم رہا کرے۔ یہ خیال پہلے خیالوں سے پاکیزہ سمجھا جاتا ہے، لیکن منشا اس کا بھی ناواقفی ہے۔ یہ امور منجملہ کیفیات واحوال کے ہیں جو اختیار سے خارج ہیں اور گو محمود ہوں مقصود نہیں، بلکہ ایسی خواہشوں میں نفس کا ایک خفی کید ہوتا ہے کہ وہ طالب ہے راحت ولذت وشہرت کا اور ان کیفیات میں یہ سب امور حاصل ہیں، ورنہ طالب رضا کو جو اصل مقصود ہے ان خواہشوں سے کیا علاقہ۔ سہ

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے

پھر ایسا شخص دو قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہوتا ہے، اگر یہ کیفیات حاصل ہو گئیں، تب تو بوجہ اس کے کہ یہ شخص اسی کو غایت سمجھتا تھا اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگتا ہے اور ان ہی پر قناعت کر کے تقویٰ وطاعات سے بے فکر ہو جاتا ہے، یا کم از کم طاعات کو حقیر ضرور سمجھنے لگتا ہے، اور اگر حاصل نہ ہوئیں تو ان کے غم میں مرنے لگتا ہے۔ اور جو غیر اختیاری امور کا طالب ہوگا ہمیشہ مبتلائے غم وپریشانی رہے گا۔

بعضے سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب کے عملیات بڑے مجرب ہیں، ضرورت کے وقت ان سے تعویذ گنڈے لے لیا کریں گے، یا پیر صاحب بڑے مقبول الدعوات ہیں معاملات ومقدمات وغیرہ میں اُن سے دُعا

کرا یا کریں گے، سب کام ہوجایا کریں گے، گویا ساری خدائی پیر صاحب کے قبضہ میں ہے، یا خود ہم ایسی ہی چیزیں سیکھ لیں گے۔ بلکہ ایسے لوگ تمامتر بزرگی کا خلاصہ ان ہی عملیات اور ان کے آثار کو سمجھتے ہیں جو محض دنیا کی طلب ہے اس لئے فاسد در فاسد ہے[1]۔"

حیدر آباد میں ایک بڑے عہدہ دار خاصے پڑھے لکھے نماز روزہ کے پابند ایک دن فرمانے لگے کہ اب کوئی بزرگ نہیں رہا۔ کیوں؟ اس لئے کہ دکن و ہندوستان سب جگہ کوشش کی، کوئی میرا تبادلہ فلاں جگہ سے بلدہ نہیں کرا پاتا۔

"بعضے یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر و شغل کرنے سے کچھ انوار نظر آیا کریں گے یا کچھ آوازیں سنائی دیں گی، یہ محض ہوس و نافہمی ہے، اول تو ذکر و شغل پر نہ ان آثار کا مرتب ہونا ضروری ہے اور نہ ذکر و شغل سے یہ مقصود ہے۔ دوسرے یہ انوار و اصوات وغیرہ بعض اوقات خود اس کے دماغ کا تصرف ہوتا ہے، عالم غیب کی اشیاء میں سے نہیں ہوتیں تیسرے بالفرض اسی عالم کی چیزیں منکشف ہوگئیں تو فائدہ کیا۔ کسی عالم کے منکشف ہوجانے سے قرب نہیں بڑھتا۔ قرب کے لئے تو طاعات بنائی گئی ہیں بعض اوقات شیاطین کو ملائکہ نظر آنے لگتے ہیں مگر وہ شیطان کے شیطان ہی رہتے ہیں۔ پھر مرنے کے بعد تو مومن کافر سب ہی کو اس عالم کے بہت سے حقائق کا انکشاف ہوجائے گا۔" (تو کیا اسی سے قرب مقصود سب کو حاصل ہوجائے گا)۔

غرض یہ چیزیں بیعت کی صحیح غرض کوئی بھی نہیں، اس لئے سب کو دل سے نکال کر سلوک کی اصلی غرض و مقصود "رضائے حق" کو سمجھے جس کا طریق احکام شرعیہ کو بجالانا اور ذکر پر مداومت کرنا (یعنی غفلت کو رفع کرنا ہے) اور پیری مریدی کا حاصل یہ ہے کہ

---

[1] قصد السبیل ہدایت چہارم۔

"شیخ وہی کی تعلیم کرتا ہے اور مرید کاربند ہوتا ہے، اگرچہ کوئی کیفیت معلوم نہ ہو، نہ اس کے زعم کے مطابق کوئی کمال حاصل ہو تب بھی آخرت میں اس کا ثمرہ جو کہ "رضا" ہے، ظاہر ہوگا۔ اور اس رضا سے دخول جنّت ولقاءِ حق اور دوزخ سے نجات میسر ہوگی۔ شیخ کی طرف سے اسی کی تلقین کا وعدہ اور مرید کی طرف سے اس کے اتباع کا عہد یہی حقیقت ہے پیری و مریدی کی۔"

"اور گو یہ تعلیم اور اس پر عمل بدون بیعتِ متعارفہ کے بھی ممکن ہے لیکن بیعت میں طبعًا یہ خاصہ ہے کہ شیخ کو توجہ زیادہ ہو جاتی ہے، اور مرید کو فرمانبرداری کا پاس زیادہ ہو جاتا ہے، اور یہی حکمت ہے شیخ کی تعین اور وحدت میں کہ جانبین کو خصوصیت بڑھ جاتی ہے، باقی ہاتھ میں ہاتھ لینا یا عورت کو کوئی کپڑا وغیرہ پکڑا دینا محض ایک مستحسن عادت ہے، اس معاہدہ کی تاکید کیلئے، نہ کہ نفس معاہدہ یا بیعت کا جز، اسی وجہ سے غائب کیلئے اس کی رسم نہیں، اور استحسان سنّت میں بھی وارد ہے۔ چنانچہ مردوں کے لئے ہاتھ میں ہاتھ دینا منقول ہے، اور کپڑا وغیرہ ہاتھ میں دینا یہ اخذِ ید کے قائم مقام ہے۔"[1]

باقی محض رسمی "اخذ ید" یا کسی پیر خصوصًا نام کے پیر کا نام کے لئے ہاتھ پکڑ لینا، اسکی نسبت ایک موقع پر نہایت جوش وقوت کے ساتھ ارشاد ہوا کہ

"اجی کس کی پیری و مریدی لئے پھرتے ہو، یہ تو پکھنڈے ہیں۔ بیعت کی صورت ضروری نہیں، اصل چیز بیعت کی رُوح یعنی اتباع ہے۔ غرض مرید ہونے کی ضرورت نہیں، پیر کے کہنے کے مطابق کام شروع کردو بس ہو گیا تعلق۔ واللہ وہی نفع ہوگا جو پیری مریدی میں ہوتا ہے۔

---

[1] قصد السبیل ہدایت چہارم۔

"اب لوگوں کا عجب حال ہے کہ کام بتاؤ تو نہ کریں، بس بیعت کا نام چاہتے ہیں۔ بیعت کی محض رسم ہی رسم رہ گئی ہے۔ چنانچہ جو پیر ایسے ہیں کہ مرید کرتے ہیں لیکن کام کچھ نہیں بتلاتے اُن سے لوگ بہت خوش ہیں اور میں مرید تو کرتا نہیں کام بتلاتا ہوں تو مجھ سے ناراض ہیں۔"

"یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ جو بھید ہیں فقیری کے، وہ جو اچھر ہیں پریم کے، وہ مریدوں ہی کو بتائے جاتے ہیں۔ مرید کرتے ہی پیر بس پریم کے دو اچھر بتادے گا اور ہم اللہ والے ہو جائیں گے۔ میاں خدا رسولؐ کا نام لو اور احکام بجالاؤ بس یہی اچھر ہیں، اصلاحِ نفس کے طریقے پیر سے پوچھو یہی بھید ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ کیا باطنی طریق بس یہی ہے تو ہم بآوازِ دُہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے۔ اور اس طریق میں کبھی بڑے بڑے حالات بھی پیش آئیں گے بڑی بڑی کیفیات بھی طاری ہونگی، مگر یہ مقصود نہیں۔"

"بھائی حالات تو سڑک کے پھولدار درخت ہیں، نظر آئے تو کیا نہ نظر آئے تو کیا، سڑک تو بہر حال قطع ہو گی، بس چلتے رہنا شرط ہے۔ اور بعضوں کو یہ درخت اور پھول عمر بھر نظر نہیں آتے۔ واللہ جن حالات کو آپ بڑا کمال سمجھتے ہیں، طریق میں بس ایسے ہیں جیسے سڑک پر دو طرفہ گلاب اور بیلے کے درخت لگے ہوں، اگر کبھی ہم نیچی نظر کر کے چلتے ہیں تو کیا راستہ قطع نہیں ہوتا، راستہ تو برابر قطع ہوتا ہے، چاہے درخت نظر پڑیں یا نہ پڑیں[1]۔"

"غرض نہ بغیر چلے کام چلتا ہے، نہ بغیر رفیق سیدھا راستہ ملتا ہے۔ اگر ایک نابینا کسی جگہ پہونچنا چاہے تو اوّل اُس کو خود چلنے کی ضرورت ہے، اگر چلے ہی نہیں، تو ہزار رفیق ملنے پر بھی رستہ قطع نہ ہوگا۔ البتہ چلنے کے بعد

---

[1] اشرف السوانح حصّہ دوم صفحہ ۱۶۱

بیر اور رفیق کی بھی ضرورت ہی - کیونکہ اگر رہبر نہ ہو تو ناآشنا راستہ میں ضرور کسی جگہ ٹھوکر کھا کر گرے گا - بے خطر منزل پر پہنچنے کی صورت یہی ہے کہ اپنے پیروں چلے اور رہبر کا ہاتھ پکڑے، بالکل ویسی ہی حالت اس رستہ کی بھی ہی کہ ارادہ کرنا اور کام شروع کر دینا اپنے پیروں چلنا ہے، اور کسی بزرگ کا دامن پکڑ لینا رہبر کا ہاتھ پکڑ لینا ہی "

صحبت و تعلق بیعت کی اصلی اور بڑی ضرورت یہی رفاقت یا پیر کی صحبت و تعلق ہی تاکہ راستہ کے خطرات یا اس کی ٹھوکروں سے حفاظت ہو - اور یہ ایسی موٹی بات ہی کہ دنیا کے کسی موٹے سے موٹے کام میں بھی اس کام کے ماہر و تجربہ کار کی صحبت و اعانت کے بغیر بصیرت پیدا نہیں ہوتی - کسی علم و فن کے معلومات اور چیز ہیں، اور بصیرت اور چیز - معلومات تو باغبانی اور کاشتکاری کی کتابیں پڑھ کر بھی ہم بہت کچھ حاصل کر لے سکتے ہیں، لیکن خالی ان کتابی معلومات کی بنا پر اگر ہم باغ لگانا اور کھیتی کرنا شروع کر دیں تو کیا قدم قدم پر ٹھوکریں نہ کھائیں گے - بخلاف اس کے اگر کچھ دن کسی تجربہ کار باغبان و کاشتکار کے ساتھ یا اس کی صحبت میں اس کام کو کرلیں تو اس کے نشیب و فراز کی ایسی بصیرت یا اندرونی بینائی حاصل ہو جاتی ہی، کہ اگر کوئی بالکل ہی نئی زمین دیدیجائے تو اس سے کام لینے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی۔

لیکن اس زمانہ میں لوگوں کو دین کے معاملات میں خصوصاً یہ بیماری وبا کی طرح لگ گئی ہی کہ رہروی ہی کے لئے نہیں بلکہ جہالت کی انتہا ہی کہ رہبری اور تجدید و اجتہاد تک کیلئے محض کتابی معلومات کی بنا پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہی کہ دینی صحبت سے محروم اچھے اچھے دینی علوم و معلومات والے ضال و مضل دونوں ہو رہے ہیں - احقر کی سمجھ میں ان حضرات کی حالت ایسے نومسلم کی سی ہوتی ہی جس کا اسلام تمامتر کتابی معلومات سے ماخوذ ہو - وہ نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ سب کے فرائض و سنن ارکان و شرائط محض کتابیں دیکھ دیکھ کر پورے کرتا ہو، جس کے مقابلہ میں ایک پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان گھرانے کا ان پڑھ بچہ گھر والوں کو دیکھ دیکھ کر زیادہ صحیح طور پر وضو نماز وغیرہ کے واجبات و مستحبات ادا کر سکے گا - غرض کوئی علم و فن ہو اس کے عملی ماہر کی صحبت کے بغیر اناڑی پن مشکل ہی سے نکلتا ہی۔

"بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل و مکمل ہوا ہے، اے بھائی موٹی بات ہے کہ بلا بڑھئی کے پاس بیٹھے کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا، حتیٰ کہ بسولا بھی بطور خود ہاتھ میں لیکر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جا سکے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا اندازہ بھی نہیں آتا۔ بلا خوش نویس کے پاس بیٹھے، اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہرگز خوش نویس نہیں ہو سکتا۔ غرض بدون کامل کی صحبت کے کوئی کامل نہیں بن سکتا۔ لہذا پیر کامل کی صحبت لازم ہے" (سوانح حصہ دوم ص۱۵۹)

اور ہمارے لئے تو صحبت کی حاجت و اہمیت کی سب سے بڑی دلیل "صحابیت" ہے، کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی فضیلت بھی اعلیٰ سے اعلیٰ محدثین و فقہا اور بڑے بڑے اولیاء و اقطاب پر مسلّم ہے، ظاہر ہے کہ اس فضیلت کا مدار نہ کتابوں پر ہے کہ اکثر صحابہ سرے سے امی تھے، نہ کثرت معلومات پر کہ ان کے مقابلہ میں بعد کے معمولی علماء کے بھی نفس معلومات اُن سے زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ اس فضیلت کا مدار محض حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی صحبت کہ جس سے اعلیٰ کیا، جس کے مساوی صحبت بھی بعد کے بڑے بڑے علماء و اولیاء کو اب نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور جن کو کچھ تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک دن کی صحبت سے جو کچھ نصیب ہوتا ہے وہ سالہا سال کی کتاب خوانی سے نصیب نہیں ہوتا، اور اس میں کچھ زیادہ مبالغہ نہیں، کہ "ساعتے با اولیا از صد سال طاعت بے ریا"

غرض صحبت کی اس ناگزیر ضرورت کی بناء پر قصد السبیل، تعلیم الدین وغیرہ میں جہاں جہاں بیعت و سلوک پر بحث و گفتگو فرمائی گئی ہے صحبت کی خاص طور سے تاکید ہے کہ "بیعت کے بعد اگر وقت و مہلت میسر ہو تو چندے پیر کی خدمت میں رہے، یا کبھی کبھی اپنے پیر کے پاس یا اور کوئی خوش عقیدہ متقی بزرگ موجود ہو اُس کے پاس بیٹھا کرے[1]"

اور اگر ذرا طویل صحبت میسر ہو جائے تو یہ بصیرت ایسی بڑھ جاتی ہے کہ واقعی اس کے قبل کی اپنی حالت بالکل احمقانہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس احمق راقم پر تو بالکل یہی گذری کہ تھوڑی بہت

(بقیہ ص۱ پر دیکھئے)

[1] الشریعۃ تمام و غناء ص۳۹

نبیؐ کا طریق دعوت و اصلاح

(سید ابوالحسن علی ندوی)

(مترجمہ مولوی محمد رابع ندوی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی کیفیت ایک ایسے مکان کی سی تھی جسکی بنیادیں ایک سخت زلزلے نے ہلا دی تھیں۔ اس کی ہر چیز بے محل اور بے قرینہ ہوگئی تھی، اس عمارت کا ساز و سامان زیر و زبر ہوگیا تھا۔ جو ٹوٹنے پھوٹنے سے بچ رہا تھا اس کی شکل بگڑ گئی تھی کہیں کی چیز کہیں پڑی تھی، کہیں سامان کا انبار لگ گیا تھا اور کہیں بالکل جھاڑو پھر گئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عالم کو ایک نبی کی نگاہ سے دیکھا تو آپ کو وہاں ایسا انسان نظر آیا جسکی نظر میں اپنی ہستی خود حقیر تھی۔ وہ درخت، پتھر اور پانی کی پرستش کرنے لگا تھا بلکہ وہ ہر بے بس چیز کو معبود بنا چکا تھا۔ آپ نے وہاں ایسا مسخ شدہ انسان دیکھا جو روزمرہ کی اور کھلی ہوئی حقیقتوں کے ادراک سے قاصر تھا۔ ایسا انسان جس کا فکری نظام مختل ہوچکا تھا اس کے جائے غلط کام کر رہے تھے، اسکے لیے علم نظری بدیہی اور بدیہی نظری بن گیا تھا۔ یقینی اور قطعی چیزوں میں اسکو شک ہونے لگا تھا اور مشکوک و مشتبہ چیزیں قطعیات و یقینیات بن گئی تھیں اس کا ذوق فاسد ہوگیا تھا۔ بدذائقہ چیزیں اس کو خوش ذائقہ اور خوش ذائقہ بدذائقہ معلوم ہونے لگیں تھیں اسکا احساس باطل ہوچکا تھا۔ دوست اور خیر خواہ کے ساتھ اس کی دشمنی اور دشمن اور بدخواہ کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔

آپ نے پھر معاشرے پر نظر ڈالی تو دنیا ہی کا مرقع نظر آیا، ہر چیز غلط شکل یا غلط جگہ پر نظر آئی۔ اس معاشرے میں بھیڑیے کو گلہ کی نگہبانی اور ظالم فریق کو فصل خصومات کا کام سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس سوسائٹی میں مجرم خوش قسمت اور بآرام تھا اور نیک سیرت زحمت و کلفت میں مبتلا تھے۔

اس معاشرے میں اخلاق کی پاکیزگی اور نیک چلنی سے بڑھ کر کوئی جرم اور حماقت اور بداخلاقی اور بداطواری سے بڑھ کر کوئی ہنر اور قابلیت کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔

آپ نے اس معاشرے میں ہلاکت آفریں اطوار دیکھے جو دنیا کو ہلاکت کے غار میں ڈھکیل رہے تھے آپ نے شراب نوشی کو بدمستی بداخلاقی کو جنون اور سود خواری کو، لوٹ کھسوٹ، مال کی محبت کو بوالہوسی اور جوع البقر کی حد تک پایا، سنگدلی اور بے رحمی اس حد کو پہونچ چکی تھی کہ لڑکیاں زندہ دفن کردی جاتی تھیں اور لڑکے بچپن میں قتل کردیے جاتے تھے بادشاہ ایسے جو اللہ کے مال کو ہاتھ کا میل اور اللہ کے بندوں کو خانہ زاد سمجھتے تھے، عالم و درویش ایسے جو خود خدا بن بیٹھے تھے لوگوں کا مال کھاتے اڑاتے اور خدا کے راستے سے خدا کے بندوں کو روکنے کے سوا ان کا کچھ مشغلہ نہ تھا۔

جو قابلیتیں انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے میسر ہوئی تھیں وہ بڑی بے دردی سے ضائع ہو رہی تھیں یا بے محل خرچ ہو رہی تھیں ان سے فائدہ اٹھایا نہیں گیا تھا اور نہ ان کو صحیح رخ پر لگایا گیا تھا۔ شجاعت اور بہادری نے ظلم زبردستی، فیاضی، دریا دلی نے اسراف اور فضول خرچی خودداری اور غیرت نے جاہلی حمیت، ذہانت و ذکاوت نے دھوکہ بازی اور حیلہ سازی کی شکل اختیار کرلی تھی، عقل کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ جرائم کے نئے نئے طریقے ایجاد کرے اور خواہشات کی تسکین کے لیے نئے نئے راستے پیدا کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد اور انسانی ذخیروں کو دیکھا وہ ایک ایسا خام مال تھا جس کو کوئی تجربہ کار کاریگر نصیب نہیں ہوا تھا جو اس سے تمدن کا صحیح ڈھانچہ تیار کرتا۔ یہ لکڑی کے تختے تھے جو پڑے پڑے گل رہے تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا جو ان کو جوڑ کر زندگی کا جہاز تیار کرلیتا۔

آپ نے قوموں کو دیکھا تو بھیڑوں کے چند گلے نظر آئے جن کا کوئی چرواہا نہ تھا، سیاست شتر بے مہار تھی، اور قوت ایک تلوار تھی جو ایک بدمست کے ہاتھ پڑ گئی تھی جس سے وہ خود اپنے کو اور دوسروں کو زخمی کر رہا تھا۔

اس خراب و ابتر زندگی کا ہر شعبہ مصلح کی پوری زندگی کا طالب تھا اور اس قابل تھا کہ وہ اس کی ساری توجہات کا مرکز بن جائے اور اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی فرصت نہ دے، اگر کوئی عام انسان ہوتا تو اس زندگی کے ایک ہی حصہ پر اپنی ساری کوششیں لگا دیتا اور پوری عمر کو

سوسائٹی کے صرف ایک مرض پر قربان کر دیتا لیکن انسان کی نفسیات کا معاملہ بہت پیچیدہ اور نازک ہے۔ اس میں بہت سے چور دروازے ہیں اور عجیب عجیب روزن ہیں۔ اس کی اصلی کمزوری اور مرض کی سرے کو پکڑ لینا آسان نہیں۔ جب انسان کا مزاج بگڑ جاتا ہو یا اس میں کجی پیدا ہو جاتی ہو تو اس کے صرف ایک عیب کو درست کرنا اور ایک ہی کمزوری کے پیچھے پڑ جانا کارآمد نہیں اور نہ کسی ایک ہی عادت کو سنوارنا سودمند ہے جب تک اس کا رخ شر سے پھیر کر خیر کی سمت اور خرابی سے ہٹا کر درستی کی جانب نہ کر دیا جائے اور زندگی میں بگاڑ کی جو جھاڑی اُگ آئی ہے اس کو نہ اکھاڑ پھینکا جائے اور اس کی زمین کو گھانس اور خودرو پودوں سے صاف نہ کر دیا جائے تاکہ نیکی اور خیر کی محبت اور اللہ عزوجل کے خوف کا پودا اس میں بٹھایا جا سکے۔

انسانی معاشرے کی ہر کمزوری اور ہر عیب پوری پوری زندگی کا مطالبہ کرتا ہے بعض اوقات پوری پوری جماعت کی زندگیاں اس کے مقابلے میں مصروف کار ہو جاتی ہیں اور بناؤ پیدا نہیں ہوتا اگر کسی ملک میں شراب کی لت پڑ گئی ہے اور زندگی کا فلسفہ ہی اس نے ناؤ نوش سمجھ لیا ہو تو اس سے منھ لگی شراب چھڑانی آسان نہیں ہے اسے نوشی کس بات کا نتیجہ ہے؟ ایک ایسی ذہنیت اور مزاج کا جو مزہ کا عاشق ہے چاہے وہ لذت زہر ملی ہوئی ہو بے خودی اور خود فراموشی کا طالب ہے چاہے ہزار گناہ سے خریدی جا سکتی ہو اس افتاد طبیعت اور اس ذہن کو تقریر و تحریر، شراب کے طبی نقصانات کی تفصیل اور سخت سخت قوانین جرمانوں سے روکا نہیں جا سکتا۔ امریکہ کا تجربہ اس بارے میں ہمارے سامنے ہے اس کو صرف عمیق نفسیاتی تبدیلی سے روکا جا سکتا ہے اس کے سوا اگر کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا تو جرائم دوسرے رنگ میں ظاہر ہوں گے اور اپنے لیے دوسرے راستے پیدا کر لیں گے۔

عرب کے ملک میں کام کا بہت وسیع میدان تھا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی قومی رہنما یا محب وطن قائد ہوتے اور ان کا طریقہ سیاسی اور ملکی رہنماؤں جیسا ہوتا تو آپ کے سامنے بہتر صورت یہ تھی کہ آپ عرب کو ایک وطن قرار دے کر عربی قبائل کا ایک اتحاد قائم کرتے اور عرب کی مضبوط طاقتوں سے ایک پختہ اور جنگجو بلاک بنا لیتے اور ایک عربی ریاست یا جمہوریہ کی بنیاد رکھتے جس کے آپ نہایت آسانی کے ساتھ صدر ہو سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ابوجہل

عتبہ وغیرہ آپ کے ساتھ پورا اشتراک عمل کرتے اور آپ کو عرب کی قیادت سونپ دیتے کیونکہ ان کو آپ کی صداقت امانت کا مشاہدہ تھا۔ انھوں نے آپ کو مکہ کے سب سے بڑے اختلافی مسئلہ میں حکم بنایا تھا۔ عتبہ نے قریش کا نمائندہ بن کر آپ کے سامنے عرب کی سرداری کی پیشکش کی تھی اور کہا تھا کہ اگر آپ قیادت چاہتے ہیں تو ہم کو ذرا اختلاف نہیں، آپ زندگی بھر ہمارے قائد رہیں گے۔ پھر اگر آپ کو یہ سیاسی مقام حاصل ہو جاتا تو آپ کے لیے ایرانی یا رومی سلطنت پر چڑھائی آسان تھی۔ آپ عرب شہسواروں کے ذریعہ ایران وروم کی سلطنت پر حملہ کر سکتے تھے اور عجمیوں کو مغلوب کر کے اور روم وفارس پر عرب کی فتح کا پھریرا اڑا سکتے تھے یہ کتنا دلکش خواب تھا اور عربی جذبۂ نخوت کی اس میں کیسی تسکین تھی۔ اور اگر آپ ان دونوں شہنشاہیوں سے بیک وقت برسرپیکار ہونا سیاسی دانش کے منافی سمجھتے تو یمن وحبشہ پر حملہ کر کے ان کو اپنی نوزائیدہ حکومت میں ملحق کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔

خود عرب میں اتنے اجتماعی، معاشی مسائل موجود تھے جو اعلیٰ سیاسی بصیرت، قومی تنظیم انتظامی قابلیت، اعلیٰ عزیمت کے برسوں سے منتظر تھے۔ ایک بلند پایہ قوی الارادہ رہنما عرب کی مقامی اصلاح وتنظیم کر کے اس کو دنیا کی بہت بڑی طاقت اور ایک باعظمت ملک بنا سکتا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے کہ ایک بگاڑ کو تبدیل کر کے دوسرا بگاڑ اس کی جگہ پر لائیں، اور ایک ناانصافی کو مٹا کر دوسری ناانصافی پیدا کر دیں۔ ایک چیز کو ایک جگہ ناجائز قرار دیں اور دوسری جگہ اس کو جائز قرار دیں ایک قوم کی خود غرضی کی مخالفت کریں اور دوسری قوم کی خود غرضی کی ہمت افزائی کریں۔ اور نہ آپ وطنی لیڈر اور نہ سیاسی قائد بن کر آئے تھے کہ ایک قوم کو اجاڑ کر دوسری قوم کو آباد کرتے۔ دوسری قوم کے زر وجواہر سے اپنی قوم کا دامن بھرتے اور لوگوں کو روم وفارس کی غلامی سے نکال کر آل عدنان اور اولاد قحطان کی غلامی میں داخل کرتے۔

آپ کا مقصد بعثت دنیا کو جنت کی بشارت اور عذاب آخرت کی وعید پہونچانا تھا آپ داعی الی اللہ اور سراج منیر بن کر آئے تھے کہ ساری دنیا کو روشن کریں۔ آپ مبعوث فرمائے گئے تھے کہ دنیا کو بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کریں اور تمام لوگوں کو مادی

زندگی کی کابُک کوٹھری سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعتوں میں پہونچا دیں اور مذاہب و ادیان کی ناانصافیوں اور زیادتیوں سے نجات دے کر اسلام کے انصاف سے متمتع ہونے کا موقع دیں آپ کا کام نیکی کی ترغیب دینا، بدی سے منع کرنا، صاف و پاک چیزوں کو حلال، گندی و ناپاک چیزوں کو حرام قرار دینا اور ان بندشوں اور بیڑیوں کو توڑنا تھا جو انسانوں نے اپنی نادانی سے یا مذاہب اور حکومتوں نے اپنی زبردستی سے لوگوں کے پاؤں میں ڈال رکھی تھیں۔

اسی لیے آپ کے مخاطب صرف ایک قوم یا ایک ملک کے باشندے نہ تھے، آپ کا خطاب تمام انسانوں اور پورے انسانی ضمیر سے تھا۔ عرب قوم اپنی حد سے بڑھی ہوئی پسماندگی اور اخلاقی پستی کی وجہ سے آپ کی دعوت کی دنیا میں سب سے زیادہ مستحق تھی کہ آپ کی مہم وہیں سے شروع ہو اور کارِ نبوت کا افتتاح بھی اسی قوم میں ہو۔ ام القریٰ (مرکز عالم مکہ) اور جزیرہ نمائے عرب اپنے جغرافیائی جائے وقوع سیاسی آزادی کی وجہ سے آپ کی جدوجہد کے لیے بہتر مرکز تھے اور عربی قوم اپنی نفسیاتی خصوصیات اخلاقی امتیازات کی وجہ سے آپ کے پیغام کے بہترین سفیر اور آپ کی دعوت کے موزوں ترین قاصد بن سکتی تھی۔

آپ ان تمام مصلحین میں سے نہ تھے جو اپنی قوم یا اپنے زمانے کی چند اجتماعی کمزوریوں یا اخلاقی خرابیوں کے مٹانے کے درپے ہوتے ہیں اور نتیجتاً وقتی طور پر ان عیوب کے ازالے میں کامیاب ہوتے ہیں یا اس دنیا سے ناکام[۵] ہار جاتے ہیں۔

---

۵ گاندھی جی نے اپنی سیاسی اور روحانی زندگی کی ابتدا سے دو زبردست اصولوں کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور ان دونوں پر اپنی وہ تمام طاقتیں: ذہنی و علمی صلاحیتیں اور وہ تمام وسائل صرف کر دیے جو اس زمانے میں کم لوگوں کو حاصل ہوں گے۔ پہلا اصول عدم تشدد تھا جس کی طرف انھوں نے ایک مستقل مذہب اور فلسفہ کی حیثیت سے دعوت دی۔ اور اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، مگر چوں کہ یہ طریقہ نفسیاتی تبدیلی اور دین کی بنیادی دعوت کے طریقے سے جدا تھا اس لیے ان کی دعوت نے وہ گہری تبدیلی اور وہ اثر پیدا نہیں کیا جو انبیا اپنی قوموں میں پیدا کر جاتے ہیں۔ انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے ہندستان کا وہ ہولناک فرقہ وارانہ فساد دیکھا جس میں ان کے اصول عدم تشدد کو بُری طرح پامال کیا گیا اور بربریت و تشدد کا بدترین مظاہرہ ہوا۔ یہ واقعات گاندھی جی کے لیے سخت دل شکن اور سوہان روح بنے۔ بالآخر ان کو خود تشدد کا شکار

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و اصلاح کا کام اس کے صحیح راستہ سے شروع کیا اور اس گھر میں وہ اس کے دروازہ سے داخل ہوئے آپ نے طبیعت انسانی کے قفل میں ٹھیک چابی لگائی یہ وہ قفل تھا جس کو کھولنے میں اپنے وقت کے تمام مصلحین ناکام رہے تھے۔ آپ نے لوگوں کو سب سے پہلے اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی اور معبودانِ باطل کے انکار کی تلقین فرمائی اور طاغوت (خدا کے سوا ہر ہستی جس کی عبادت و اطاعت مطلق کی جائے) کی نافرمانی کی ہدایت فرمائی لوگوں میں کھڑے ہو کر آپ نے بآوازِ بلند فرمایا یاایّھا النّاس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا لوگو! کہو کہ اللہ کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں کامیاب ہو گے۔

جاہل معاشرے نے اس دعوت اور اس کے مقاصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور اس میں اس کو کچھ پیچیدگی محسوس نہیں ہوئی جس وقت بھی آپ کی آواز سے سننے والوں کے کان کے پردے جنبش میں آئے وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ دعوت ایسا تیر ہے جو جاہلیت کے نشانہ پر بیٹھ جائیگا اور جگر کے پار ہو جائیگا خطرہ کے اس احساس سے جاہلیت کے کڑھاؤ میں اُبال پیدا ہوا جاہلیت کے سورما جاہلیت کے آخری معرکہ کیلئے میدان میں اُترآئے کیل کانٹے سے لیس ہو کر چڑھ دوڑے وانطلق الملاء منھم ان امشوا واصبروا علیٰ اٰلھتکم ان ھذا لشیئ یراد (اور ان کے ذمہ دار لوگ نکل پڑے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو یہ تو یقیناً کوئی سوچی سمجھی چیز معلوم معلوم ہوتی ہے) اس زندگی کے ہر رکن نے صاف محسوس کیا کہ جاہلی تہذیب کی عمارت متزلزل ہے اور پورا نظام زندگی خطرے میں ہے۔ اس موقع پر سختی دباؤ ظلم و زیادتی کے وہ لرزہ خیز واقعات پیش آئے جو تاریخ اسلام میں محفوظ ہیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت پر زد لگانے کے لیے بالکل صحیح جگہ کا انتخاب کیا اور آپ کا تیر نشانہ پر صحیح بیٹھا آپ نے جاہلیت کی شہ رگ پر وار کیا جس سے جاہلیت تلملا اٹھی اور سارا عرب جو جاہلیت کا شاید سب سے بڑا قلعہ تھا، لڑنے کے لیے آگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت پر پہاڑ کی طرح جمے

ہونا پڑا جس کے خلاف ساری عمر انھوں نے تلقین کی تھی، دوسرا اصول چھوت چھات کا ترک تھا۔ اس مہم میں کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی۔ یہ حقائق اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ انبیاء کرام کا طریقہ ہی صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ ہے اور وہی کامیابی کا راستہ ہے۔

رہے۔ مخالفت کے طوفان اٹھے، فتنہ کی آندھیاں آئیں اور نکل گئیں مگر آپ نے اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہ کی، آپ نے اپنے چچا سے صاف کہہ دیا (میرے چچا اگر میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے پر چاند بھی رکھ دیا جائے تو بھی میں اس کام کو چھوڑ نہیں سکتا یہاں تک کہ یا اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب کرے یا میں کام آجاؤں[1])

آپ مکہ میں تیرہ سال تک مقیم رہے۔ مسلسل توحید، رسالت، آخرت پر یقین کی دعوت پوری صراحت کے ساتھ دیتے رہے آپ نے ان کے لیے ذرا بھی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ نہ مخالفوں کی ادنیٰ رعایت کی، نہ وقت کی مصلحت کے لیے اپنی دعوت میں لوچ اور لچک گوارا کی، اسی دعوت کو ہر مرض کی دوا، اور ہر بند قفل کی کنجی سمجھا، اور ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کو اس کے بارہ میں ادنیٰ تذبذب بھی نہیں ہوا۔

قریش نے اس دعوت کے مقابلے میں گھٹنے ٹیک دیے اور جاہلیت کے جھنڈے کے نیچے آپ کے مقابلہ پر آگئے اور تمام ملک میں آپ کے خلاف آگ لگادی اور اسلام کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے۔ اب آپ پر ایمان لانا اسی شیر دل مرد کا کام تھا جو موت سے نہ ڈرتا ہو، جو اپنے عقیدہ اور یقین کے لیے آگ میں کودنے اور انگاروں پر لوٹنے کے لیے تیار ہو، جو دنیا کی تمام ترغیبات سے منھ موڑ چکا ہو اور ساری دنیا سے رشتہ توڑ چکا ہو۔ قریش کے چند جوان مرد آگے بڑھے یہ عجلت کا فیصلہ اور نوجوانی کا اقدام نہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال رہے ہیں، اور زندگی کے دروازے اپنے لیے بند کر رہے ہیں۔ کوئی دنیاوی ترغیب یا لالچ اسکی محرک نہ تھی کہ اس فیصلہ سے صرف خطرات کا دروازہ کھلتا تھا اور ہر طرح کے دنیاوی فوائد اور راحت کے دروازے بند ہوتے تھے اور صرف یقین کی ایک طاقت تھی اور آخرت کی لالچ تھی انھوں نے ایمان کی طرف بلانے والوں کو پکارتے سن پایا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ۔ یہ پکار سنتے ہی زمین ان پر تنگ ہوگئی طبیعتیں کھینچنے لگیں، راتوں کی نیند اڑ گئی، نرم بستر کانٹوں کی طرح چبھنے لگے۔ انھوں نے دیکھا اللہ، اور رسول پر ایمان لانا اور اپنے یقین کا ساتھ دینا ان کے

---

[1] البدایة والنہایة ج ۳ ص ۴۲

لیے ضروری ہوگیا ہو وہ دل و دماغ کے فیصلہ اور اپنے یقین کی مخالفت کر کے خوش نہیں رہ سکتے تھے۔ حقیقت ان پر ظاہر ہوچکی تھی، وہ اس حقیقت کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ حیوانی زندگی سے ان کا دل اُچاٹ ہوگیا تھا، وہ اس کو اس میں دوبارہ پھنسا نہیں سکتے تھے۔ ایک کانٹا تھا جو ان کے دل میں چبھ رہا تھا وہ اس کانٹے کو پال نہیں سکتے تھے، آخر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچنے اور اسلام لانے کا فیصلہ کرلیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے شہر کے محلہ میں تھے، چند گز کا فاصلہ! مگر قریش نے آپ کو اتنا دور کردیا تھا اور راستہ اتنا پُرخطر بنا دیا تھا کہ آپ تک پہونچنا ایک دور دراز اور نہایت خطرناک سفر تھا، شام و یمن کو تجارتی قافلہ لے جانا اور عرب کے رہزنوں سے بچ کر نکل جانا اتنا مشکل نہ تھا جتنا مکہ کے اندر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچنا اور آپ سے ملنا مشکل تھا۔ لیکن وہ آپ تک پہونچے، آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور اپنی زندگی آپ کے حوالے کردی ان کو زندگی کا خطرہ تھا اور آزمائشوں و مشکلات کا یقین تھا مگر انھوں نے قرآن کی یہ آیت سُنی تھی امرحسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لایفتنون ○ ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین (کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہو کہ وہ یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی۔ ہم نے تو ان سے پہلے لوگوں کو خوب آزمایا ہو، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ضرور جان لے گا جو سچے ہیں اور وہ جھوٹوں کو ضرور معلوم کرے گا۔) اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی سنا تھا کہ امرحسبتم ان تدخلوا الجنتہ و لما یاتکم مثل الذین خلو من قبلکم مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین اٰمنو معہ متی نصر اللہ الا ان نصر اللہ قریب (کیا تم نے سمجھ رکھا ہو کہ جنت میں یوں ہی داخل ہوجاؤ گے اور تم پر وہ حالات نہیں گزریں گے جو پہلے گذر چکے، ان کو مصیبت اور نقصانات سے سابقہ پڑا اور وہ ہلا کر رکھ دیے گئے۔ حتیٰ کہ رسول اور ان کے ساتھ کے ایمان لانے والے کہنے لگے کب مدد آئے گی، معلوم ہو کہ مدد بس قریب ہو) آخر وہی پیش آیا جس کی قریش سے توقع تھی، قریش نے اپنا ترکش ان بے بسوں پر خالی کردیا اور سب تیر آزمائے مگر ان کی پختگی اور یقین بڑھتا ہی گیا (اور کہنے لگے اسی کا تو ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا، اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس نے ان کے ایمان اور سپردگی میں اضافہ ہی کیا) ان آزمائشوں

اور ابتلاؤں سے ان کے عقیدہ میں مزید پختگی، ان کے یقین میں استحکام، ان کے دینی احساس میں ترقی اور ان کے ایمان میں لذت وحلاوت پیدا ہوئی، ان کی طبیعتوں میں نکھار پیدا ہوا، اور وہ اس بھٹی سے کھرا سونا بن کر نکلے۔

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قرآن کی روحانی غذا پہونچا رہے تھے اور ایمان کے ذریعہ ان کی تربیت فرما رہے تھے اور آپ ان کو طہارت بدنی خشوع قلبی خضوع جسمانی اور حاضر دماغی کے ساتھ دن میں پانچ بار رب العالمین کے حضور میں جھکاتے ان میں روز بروز روحانیت کی بلندی، قلب کی صفائی، اخلاقی ستھراپن مادی گرفت سے آزادی اور خواہشات کی اتباع سے چھٹکارا حاصل ہو رہا تھا اور مالک ارض وسما کا عشق اور شوق بڑھ رہا تھا۔ آپ ان کو تکلیف میں صبر اور درگزر اور ضبط نفس کی تلقین فرماتے تھے، لڑائی ان کے خمیر میں داخل تھی تلوار سے ان کا ازلی رشتہ تھا۔ وہ لوگ اس قوم سے تھے جس کی تاریخ بسوس و داحس وغبراء کی خونیں داستانوں سے پُر ہو یوم الفجار کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جنگجو سرشت انسانوں کو تھامے ہوئے تھے اور ان کی عربی نخوت کو ایمان کی طاقت سے دبائے ہوئے تھے۔ آپ ان سے کہتے (اپنے ہاتھوں کو روکے رہو اور نماز قائم کرو) وہ آپ کے حکم سے موم ہو گئے تھے، بغیر ادنیٰ بزدلی کے انھوں نے اپنے ہاتھوں کو روک لیا۔ وہ سب برداشت کر رہے تھے جو دنیا کی کسی قوم نے برداشت نہیں کیا تاریخ نے ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جس میں کسی مسلمان نے اپنے نفس کی طرف سے مدافعت کی ہو اور جوابی یا انتقامی کارروائی کی ہو۔ ضبط وتحمل کی یہ انتہائی مثال ہو جو ہمیں کسی جماعت کی تاریخ میں ملتی ہو۔

(صفحہ ۵ کا بقیہ) میری آنکھوں میں آنسو نکل آئے اور قدرت ایزدی کے آگے اپنے دلی شکریہ کی ترجمانی کرنے لگے کہ اس نے مجھے ایک زبردست فریب سے آگاہ کیا، اور اس ناپاک قفس میں پھنستے پھنستے بچ گیا۔ لفافہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور اپنے دل کے تاریک خانے میں ایک روشنی کو پاتا ہوا چل دیا، اور دور کہیں سے آواز آرہی تھی۔ ؎

اے ناداں چراغِ زندگی بجھ بجھ کے جلتا ہے | جو اوشِ زمانہ سے تیرا سینہ کیوں دہلتا ہے

(حیات نو۔ حیدر آباد)

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

(از جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی)

مشہور حدیث جو ابوداؤد، مسلم، ترمذی، نسائی، مسند احمد، بیہقی وغیرہ محدثین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ دجال کے فتنے سے جو محفوظ رہنا چاہتا ہو اس کو چاہئے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی یا خاتمہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، بعض روایتوں میں ابتدا یا خاتمہ کا ذکر نہیں ہے، بلکہ فرمایا گیا ہے کہ مطلقاً سورہ کہف کی دس آیتوں کی تلاوت پڑھنے والوں کو دجال کے فتنے میں مبتلا ہونے سے بچا لیتی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری، ابودرداء، ابن عمر، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم صحابیوں سے الفاظ کی کمی و بیشی کے ساتھ مندرجہ بالا کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے۔

اسی حدیث کی بنیاد پر سمجھا جاتا ہے کہ سورہ کہف کے مضامین کا دجال کے فتنے سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور ہے آیئے نبوت کے اسی اشارہ کی روشنی میں اس سورہ کے مشتملات پر غور کریں، مجھ سے پہلے بھی بعض بزرگوں اور عزیزوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے کچھ حرج نہیں کہ افادات سابقہ کے ساتھ جو کچھ اس وقت پیش کیا جا رہا ہے اس کا بھی مطالعہ کر لیا جائے ممکن ہے کہ قرآن کی اس خاص سورہ کے سمجھنے میں تھوڑی بہت مدد ان معروضات سے بھی مل جائے پہلے بطور مقدمہ کے چند تمہیدی باتیں سن لیجئے۔

"المسیح الدجال" کی شخصیت اور حقیقت سے بحث نہیں، یہ ایک مستقل جداگانہ مسئلہ ہے، یہاں مقصود صرف "وہ فتنہ" ہے جسے "المسیح الدجال" کی طرف پیغمبرانہ پیشین گوئیوں میں منسوب کیا گیا ہے۔

دجال کے متعلق آپ نے جو کچھ سنا ہوگا، یا کتابوں میں جن چیزوں کا انتساب اس کی طرف کیا گیا ہے سب کو پیش نظر رکھنے کے بعد کلی تعبیر ان کی یہی ہو سکتی ہے کہ بعض قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار اس کو بخشا جائے گا۔ مثلاً مسافت یعنی مکانی فاصلوں کو صفر کے درجہ تک گویا اس کے

زمانے میں پہونچا دیا جائے گا۔

اس کی تیز رفتاری کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہو کہ "جیسے بارش کو تیز آندھی اڑا لے جاتی ہو کچھ یہی صورت اس کی رفتار کی ہوگی [1]" صحیح مسلم کے الفاظ "کالغیث استدبرتہ الریح" کا مطلب یہی ہو اور یہ کہ کرۂ زمین کے ملکوں اور شہروں میں نہیں بلکہ ایشیا افریقہ یورپ و امریکہ وغیرہ کے ایک ایک گاؤں تک رسائی اس کی کل چالیس دن میں ہو جائے گی، نواس بن سمعان والی روایت کے الفاظ "لا یدع قریۃ الا ھبطھا فی اربعین لیلۃ" (مسلم) سے یہی سمجھ میں آتا ہے اور یہ حال تو اس کی تیز رفتاری کا ہوگا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف کنز العمال میں جو خطبہ منسوب کیا گیا ہے، اس میں آئندہ پیش آنے والے حوادث کے سلسلہ میں آپ نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہو کہ یہ بھی فرمایا تھا کہ

ینادی بصوت لہ یسمع بہ ما بین الخافقین (خلاصہ کنز العمال ج ۶ صہ ۶۵ برمسند احمد)	پکارے گا دجال ایک ایسی آواز سے جسے خافقین (مشرق و مغرب) کے درمیان رہنے والے سنیں گے۔

---

[1] آج لوگوں کے سامنے ہوائی جہاز کی شکل میں جو سواری آچکی ان کے لیے نبوت کی بیان کی ہوئی اس تشبیہ کے سمجھنے میں شاید کچھ دشواری نہ ہوگی، باقی اسی سلسلے میں دجال کے گدھے کا عام چرچا عوام میں جو پھیلا ہوا ہے، اس میں شک نہیں کہ عام شہرت اس گدھے کو ضرور حاصل ہو گئی ہے، لیکن صحاح کی کتابوں میں دجال کے متعلق حدیثوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے اس کو اس گدھے کے ذکر سے ہم خالی پاتے ہیں البتہ ابن عساکر وغیرہ کی ایسی کتابیں جن کی روایتوں کا معیار صحت بہت کچھ بحث طلب ہے، ان میں حمار کے لفظ سے دجال کی سواری کا ضرور ذکر کیا گیا ہے، مگر آگے جو تشریحی صفات اس حمار (گدھے) کے بیان کیے گئے ہیں مثلاً یہی کہ اس گدھے کے دونوں کانوں کے بیچ کا فاصلہ اسی ہاتھ ہوگا یعنی بہ باع ہوگا (حضرت علی کے خطبہ میں تو اس گدھے کے ایک ایک کان سے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ تیس تیس ہاتھ کے برابر ہوں گے، اور اس سے بھی عجیب تر اس کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ اس گدھے کی ایک ٹاپ کا فاصلہ دوسرے ٹاپ سے اتنا طویل ہوگا کہ عام حالات میں اس فاصلہ کو لوگ ایک دن اور ایک رات یعنی چوبیس گھنٹوں میں طے کر سکتے ہیں، الفاظ عربی کے یہ ہیں "ما بین حافر حمارہ الی الحافر الآخر مسیرۃ یوم ولیلۃ" (صہ ۶۳ خلاصہ کنز) ایسی صورت میں گدھے والی روایتوں کی صحت اگر تسلیم بھی کر لی جائے جب بھی "حمار" کے لفظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے دجال کے گدھے کی حقیقت یقیناً اس سے مختلف ہو، بہ ظاہر تفہیم کا یہ ایک تمثیلی طریقہ معلوم ہوتا ہے، ورنہ ہمارے سامنے جو گدھے ہیں ان میں یہ خصوصیتیں کہاں مل سکتی ہیں، آج ریل کی شکل ہو ہوائی جہازوں کی بنائی جاتی ہے اگر کسی گدھے کی شکل یا قالب ان ہی کو عطا کر دیا جائے تو کیا تعجب ہے ۱۲

جس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف "رفتار" بلکہ "آواز" کے سلسلہ میں بھی فاصلہ کا مسئلہ دجال کے زمانہ میں غیر اہم ہو کر رہ جائے گا - اسی کتاب میں مستدرک حاکم کے حوالہ سے عبد اللہ بن عمرو کی ایک روائت دجال ہی کے متعلق جو پائی جاتی ہے، اس میں بھی ہے کہ "دجال کی آواز کو مشرق و مغرب کے باشندے سنیں گے" (ص ۲۶۹ کنز)

اسی طرح روائتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ علاج و معالجہ کے طریقے ترقی کر کے اس حد تک پہونچ جائیں گے کہ الاکمہ (مادر زاد اندھوں) الابرص (کوڑھی) تک کو چنگا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی (کنز ج ۷ ص ۲۶۸)

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ سخرت لہ انہار الارض (یعنی زمین پر بہنے والے دریاؤں اور نہروں پر بھی اسکو قابو عطا کیا جائے گا) جس سے معلوم ہوا کہ میرابی کے ذرائع میں غیر معمولی ترقیاں رونما ہوں گی، اسی کے ہر ثمارها یعنی زمین کی پیداواروں پر اسکو قابو بخشا جائے گا، ظاہر ہے کہ میرابی کے ذرائع پر قابو یافتہ ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہے، اور یہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مون سونی - برساتی ہواؤں سے بھی کام لینے کی تدبیر اس پر منکشف ہو جائے گی، حدیث کے الفاظ ہیں کہ

يامر السماء فتمطر والارض فتنبت (ج ۷ ص ۳۸ کنز بر مسند)	بادل کو حکم دے گا تو برسنے لگے گا اور زمین کو حکم دے گا تو اگانے لگے گی۔

اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ نباتاتی پیداواروں کے سوا، زمین کے پیٹ کے معدنی ذخیروں کو بھی برآمد کرنے میں غیر معمولی کرشموں کا دجال اظہار کرے گا، حدیث کے الفاظ ہیں کہ

ويمر بالخربة فيقول لها اخرجي كنوزك فتتبعه كنوزها (ج ۷ ص ۳۸ کنز)	اجاڑ زمینوں پر گذرے گا اور کہے گا کہ نکال اپنے ذخیروں کو بس یہ ذخیرے اس کے پیچھے ہو لیں گے۔

اور ان ہی روائتوں میں دجال کی طرف جو یحیی الموتی (یعنی وہ مردے کو زندہ کرے گا) کے الفاظ منسوب کیے گئے ہیں ان سے تو ثابت ہوتا ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے کی بھی قدرت اس میں پیدا ہو جائے گی، یہ بھی ہے کہ مردے کو زندہ کر کے دکھائے گا بھی، صحاح میں ہے کہ ایک زندہ آدمی کو چیر کر رکھ دے گا، اور پھر دونوں ٹکڑوں کو جوڑ کر اسی کو زندہ کر دے گا، اور کچھ قصہ اسی نقطہ پر ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا، بلکہ روایتوں کے اس حصے پر غور کیجئے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ دجال لوگوں کو ایک کرشمہ یہ بھی دکھائے گا کہ "بعض خبیث روحیں یعنی شیاطین لوگوں کے سامنے نمودار ہو کر کہیں گے کہ ہمارا یہ نام ہے، اور تمہارے ہم مرے ہوئے باپ، یا مری ہوئی ماں، یا دوسرے عزیز ہیں" الفاظ روایت کے یہ ہیں کہ

ویبعث معہ الشیاطین علی صورۃ من قدمات من الاباء والامہات والاخوان والمعارف فیاتی احدھم الی ابیہ او اخیہ فیقول الست فلانا الست تعرفنی

(کنز ص۲۵)

اور اٹھائے جائیں گے دجال کے ساتھ بعض شیاطین ان لوگوں کی شکلوں میں جو مر چکے ہیں یعنی باپ ماں بھائی اور جانے پہچانے لوگ۔ پھر کوئی اپنے باپ یا بھائی کے پاس آئے گا، تب وہی پوچھے گا کہ میں فلاں آدمی کیا نہیں ہوں کیا تم مجھے نہیں پہچانتے،

بعض روایتوں کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہو کہ

دجال کے ساتھ کچھ شیاطین ہوں گے جو مردوں کی سی شکل بنا کر زندوں سے کہیں گے کہ مجھے تم پہچانتے ہو، میں تمہارا بھائی یا تمہارا باپ یا تمہارا فلاں رشتہ دار ہوں، کیا تم نہیں جانتے کہ ہم مر چکے ہیں" ص۲۴۱

الغرض اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ مردوں کے ساتھ زندوں کے تعلق پیدا کرانے کا دعویٰ بھی اسی طریقہ سے کیا جائے گا۔ جیسے سنا جاتا ہے کہ یورپ و امریکہ میں آج کل مردوں کو حاضر کرنے اور ان سے مکالمہ کے مواقع ان مردوں کے زندہ عزیزوں کے لیے اسپرچولیزم والوں کی طرف سے مہیا کیے جاتے ہیں۔ حضرت ابو سعید الخدری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے مسند احمد میں دجال ہی کے متعلق ایک طویل حدیث پائی جاتی ہے جس کا ایک جزء یہ بھی ہے

"دجال کسی دیہاتی سے کہے گا کہ تمہارے ماں، باپ کو زندہ کرکے میں کھڑا کر دوں تو تم مجھے اپنا رب مانو گے؟ دیہاتی کہے گا کہ اچھا ایسا کر کے دکھاؤ، تب دو خبیث روحیں اس دیہاتی کے سامنے اس کے ماں، باپ کی شکل اختیار کرکے نمایاں ہوں گی۔ اور دیہاتی سے کہیں گی کہ اے میرے بیٹے، تم دجال کا ساتھ دو، اور اس کی پیروی کرو یہی تمہارا رب ہے" صفحہ۲۰۲ (کنز العمال)

بہرحال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار جو دجال کو عطا کیا جائے گا۔ وہ یہی، یا اس قسم کی دوسری باتیں ہیں، جن کی تفصیل دجال کی متعلقہ حدیثوں میں پڑھی جا سکتی ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے دجالی کو دجال بنانے والا اس کا وہ طرز عمل ہوگا، جو اپنے اس غیر معمولی اقتدار کے استعمال میں وہ اختیار کرے گا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ قوانین قدرت پر غیر معمولی اقتدار بجائے خود ایسی چیز نہیں ہے جو آدمی کو دجال بنا دے، بلکہ پرانی تعلیم کے رو سے تو قدرت کے قوانین سے استفادہ نسل انسانی کے مقام خلافت کا اقتضا ہے آدم علیہ السلام کو اسماء کا جو علم بخشا گیا تھا اسی اجمالی علم کی یہ تفسیر ہے نا سوا اس کے کون نہیں جانتا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی اسی قسم کا غیر معمولی اقتدار بخشا گیا تھا علوی اجرام یا سفلی اجسام کی تسخیر کی مثالوں سے ان کی زندگی معمور نظر آتی ہے سمندر کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضرب سے پھٹ جانا، یا شق القمر کا معجزہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے، خود قرآن میں ذکر کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام لکہ وابرص کو چنگا بھی کرتے تھے بلکہ مردوں کو زندہ کر کے بھی دکھاتے تھے، بہر حال پیغمبروں کی زندگی میں اس قسم کی چیزوں کی کیا کمی ہے، مگر پیغمبروں کو یہی اقتدار جب بخشا گیا تو اپنے اس اقتدار سے جو کام وہ لیتے تھے، اس سے دنیا واقف ہے یعنی اقتدار بخشنے والے قادر و توانا کے شکر سے ان کے قلوب بھی معمور ہو جاتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی خدائے بخشندہ مہربان کی طرف کھینچتے تھے، تسخیری مظاہر کو حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے سامنے پاکر فرمایا کرتے کہ

هذا من فضل ربي ليبلوني أأشكر ام اكفر ومن شكر فانما يشكر لنفسه و من كفر فان ربي غني كريم (النمل)

یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے، مجھے وہ جانچتا ہے کہ میں اس کا گن گاتا ہوں یعنی شکر کرتا ہوں، یا ناشکری کرتا ہوں جو شکر کرتا ہے خود اپنے لئے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے اسے معلوم ہو کہ میرے رب کی ذات سب سے بے پروا اور عظمت والی ہے۔

لیکن بالکل اس کے برعکس جیسا کہ سب جانتے ہیں دجال اپنے اقتداری کرشموں کو اقتدار بخشنے والے خدا سے خود باغی بننے، اور دوسروں کو بھی خدا سے بے زار و باغی بنانے میں استعمال کرے گا، اس کی یہ خصوصیت اتنی نمایاں ہوگی کہ عوام و خواص ہر ایک بر بشرطیکہ مومن ہو حدیثوں میں آیا ہے کہ پہلی نظر میں اس کے مشن کا یہ امتیازی نصب العین خود بخود واضح ہو جائے گا۔ صحیح بخاری وغیرہ میں یہ مشہور روائت جو دجال ہی کے متعلق پائی جاتی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انه مكتوب بين عينيه ك، ف، ر، يقرءه كل مومن كاتب او غير كاتب.

دجال کی دونوں آنکھوں کے بیچ ک، ف، ر (کفر) لکھا ہوا ہوگا جسے ہر مومن پڑھ لے گا خواہ وہ کاتب ہو یا غیر کاتب

"کاتب" یعنی لکھنے پڑھنے والے لوگ اور "غیر کاتب" یعنی نوشت وخواند کا سلیقہ جن میں نہ ہو کسی سے بھی دجال کی یہ خصوصیت مخفی نہ رہے گی، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ کفر یعنی "ک، ف، ر" یہی دجالی تمدن و تہذیب کا امتیازی چھاپ ہوگا، ماحول ہی ایسا پیدا ہو جائے گا کہ دنیا بے ایمانی، الحاد، بے دینی کی شکار ہوتی چلی جائے گی، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ "دجال کے دیکھنے کا موقعہ جسے مل جائے، اس کو چاہئے کہ اس سے دور ہی دور رہے" اسی کے بعد یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ

فو اللّٰہ ان الرجل لیاتیہ وھو یحسب انہ مومن فیتبعہ مما یبعث بہ الشبہات (ابو داؤد وغیرہ)

تو اللہ کی قسم ہے کہ دجال کے پاس آدمی آئے گا، یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ مومن ہے مگر ملنے کے ساتھ ہی اس کا پیرو بن جائیگا جس کی وجہ وہ شبہے اور شکوک ہوں گے جو دجال سے ملنے کے ساتھ ہی پیدا ہو جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو اپنے خیالات سے متأثر کرنے کی غیر معمولی مہارت اس میں پائی جائیگی۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہو کہ مردوں سے آگے بڑھکر عورتوں کو بھی وہ متاثر کرے گا حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

آخر من یخرج الیہ النساء حتیٰ ان الرجل لیرجع الی امہ و ابنتہ واختہ وعمتہ فیو ثقھا رباطاً۔

دجال کے ساتھ آخر میں عورتیں بھی نکل پڑیں گی۔ حالت یہ ہو جائے گی کہ آدمی اپنی ماں، بہن، بیٹی پھوپھی کو اس اندیشے سے باندھے گا کہ کہیں دجال کے ساتھ نہ نکل پڑیں۔

بہرحال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار کا غلط بلکہ قطعی معکوس استعمال یہی وہ "فتنہ" ہے جس میں المسیح الدجال خود بھی مبتلا ہوگا، اور کوشش کرے گا کہ اس کی بھڑکائی ہوئی فتنے کی اس آگ میں دوسرے بھی جھونک دیے جائیں گے، باقی یہ مسئلہ کہ اپنی کرشمہ نمائیوں میں وہ کن ذرائع سے کام لے گا؟ ظاہر ہے کہ جب تک "المسیح الدجال" خود دنیا کے سامنے نہ آجائے، اس سوال کا صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا، کیا سحر وجادو یا اسی قسم کے غیر مادی ذرائع ہی اس کو قابو بخشا جائے گا، یا جیسا کہ حافظ ابن حزم محدث کا خیال ہے۔

انما ھو محیل یتحیل بحیل معروفة کل من عرفها عمل مثله	دجال حیلوں سے کام نکالے گا، ایسے حیلے جن کا علم جو بھی حاصل کرے گا وہی سب کچھ کرکے دکھا سکتا ہو جو دجال دکھائے گا
(الملل والنحل ج ۲ صفحہ ۱۰۹)	

جس کا حاصل یہ ہوا کہ ابن حزم کے نزدیک دجال "حیل" سے کام لے گا، جو "حیلہ" کے لفظ کی جمع ہو۔ عام طور پر میکانکی طریقوں کی تعبیر عربی زبان میں "حیل" کے لفظ سے کی جاتی ہو۔ مثلاً جر ثقیل کے طریقوں کا ذکر "حیل" کے ذیل میں کرتے ہیں۔ "علم الحیل" نام ہی اس علم کا ہو جس میں میکانیکی طریقوں سے چیزوں پر قابو حاصل کرنے کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں۔ اور یہی ابن حزم کا مقصود بھی ہو، انھوں نے دوسری جگہ "دجالی کرشموں" کا تذکرہ کرتے ہوئے بعض مثالوں سے "دجالی کرتبوں" کو سمجھانا چاہا ہو مثلاً لکھا ہو کہ اس کی نوعیت وہی ہوگی جیسے بعض لوگ مرغیوں کو ہڑتال کھلا کر دکھا دیتے ہیں کہ گویا مرغیاں مرگئیں، ان کی حس و حرکت غائب ہوگئی پھر ان ہی مرغیوں کے حلق میں زیتون کا تیل جب ٹپکاتے ہیں تو پھڑ پھڑا کر اٹھ بیٹھتی ہیں۔ بھڑوں کے متعلق بھی اپنا ذاتی تجربہ نقل کیا ہو کہ پانی میں ان کو ہم ڈال دیا کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب مرگئیں پھر ان ہی مردہ بھڑوں کو دھوپ میں لاکر تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیتے تو زندہ ہو جاتی تھیں۔ اسی سلسلے میں اپنے وطن (اندلس) کے ایک آدمی محمد محرق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہو کہ بند کمرے میں یہ تماشہ دکھاتا تھا کہ کوئی دوسرا بولنے والا اس کمرے میں موجود نہیں ہو۔ لیکن بولنے کی آواز اسی کمرے میں گونجتی تھی، حافظ کا بیان ہو کہ اس کمرے کی دیوار کے مخفی شگاف میں نلکی لگی ہوئی تھی جس سے لوگ ناواقف تھے۔ اسی نلکی کے دوسرے سرے پر کمرے سے باہر بات کرنے والا بات کرتا تھا مگر محرق باور کراتا تھا کہ کسی بولنے والے کے بغیر اس کے سامنے آوازیں آتی ہیں۔ (ملل والنحل ج ۱ صفحہ ۹۱)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حدیثوں میں بھی اس کی تصریح نہیں کی گئی ہو کہ "دجال" اس راہ میں کن ذرائع سے کام لے گا نہ اس کی تصریح پائی جاتی ہو کہ سحر و شعبدہ وغیرہ سے وہ کام لے گا اور نہ یہ بیان کیا گیا ہو کہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کرکے ان کو اپنے قابو میں لائے گا۔

اور یہ قصہ کچھ دجالی کرشموں ہی تک محدود نہیں ہو۔ قیامت سے پہلے آئندہ پیش آنے والے جن واقعات کا حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہو، سب ہی کے متعلق یہ مناسب ہو کہ دیکھنے سے پہلے خواہ مخواہ

اپنی طرف سے ان کے اسباب و علل کے متعلق فیصلہ نہ کر دیا جائے۔[ف]

پچھلے دنوں بعض لوگوں نے عجلت سے کام لے کر یورپ و امریکا کے موجودہ تمدن و تہذیب کو دجالی تمدن و تہذیب قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی جو کر دیا کہ "المسیح الدجال" جس کی حدیثوں میں پیشینگوئی کی گئی ہے وہ آ گیا اور اب مسلمانوں کو "دجال" کے انتظار کی زحمت نہ کھینچنی چاہیے اس میں شک نہیں کہ یہ فیصلہ بھی زود فکری اور زود بیانی کے عارضہ کا نتیجہ تھا اور اب بھی جن لوگوں کو اس خیال پر اگر اصرار ہے تو سمجھنا چاہیے کہ زود فکری کے مرض سے وہ شفایاب نہیں ہوئے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار پچھلی دو ڈھائی صدیوں میں یورپ و امریکا والوں کا مسلسل قائم ہوتا چلا جا رہا ہے اور اپنے اس اقتدار کو ان ممالک کے باشندے بھی ان ہی "دجالی اغراض" میں جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے استعمال کر رہے ہیں۔ "ک ف ر" یعنی کفر و الحاد یا خدا سے بے زاری یا انحراف موجودہ مغربی تہذیب کا ایسا عام چھاپ ہے، جسے ہر جاہل و عالم بشرطیکہ ایمان کی کوئی کرن اپنے اندر رکھتا ہو، جانتا اور پہچانتا ہے، خالق کی مرضی کے مطابق اس کے بندوں کے آگے زندگی کا جو نظام خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا ہے اس نظام زندگی سے پژمردگی اور افسردگی پیدا کرنے میں آج یورپ جن چالبازیوں

ف شاید روایتوں میں آتا ہے کہ یاجوج و ماجوج کے اچانک مرجانے اور ختم ہو جانے کے بعد جب زمین ان کی گندگیوں سے صاف ہو جائے گی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اہل ایمان کے ساتھ پہاڑ سے اُتر کر زمین پر آئیں گے تو بیان کیا گیا ہے کہ نشوونما کی قوت زمین کی اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ ایک ایک انار سے بڑی بڑی ٹولیاں سیر ہو جائیں گی، اور انار کا خول دانوں کے نکالنے کے بعد جو رہ جائے گا وہ اتنا بڑا ہوگا کہ یہی بڑی ٹولیاں اس کے سائے میں قیام کریں گی۔ ایک طرف اس خبر کو رکھیے اور دوسری طرف غور کیجیے ان تجربات پر جو جاپان میں ایٹم بم کے چلنے کے بعد کیے گئے، کہتے ہیں کہ جس علاقہ میں بم چلایا گیا تھا وہاں کی زمین میں جو چیزیں بعد کو بوئی گئیں تو اپنی مقدار میں حیرت انگیز طور پر دیکھا گیا کہ وہ بڑھی ہوئی ہیں۔ شلجم، مولی وغیرہ کی جو ضخامت اس سلسلے میں بیان کی گئی ہے، عام حالات میں اس کا باور کرنا مشکل ہے۔ خاکسار نے اپنے ایک مضمون میں "دخان مبین" یعنی قرآن میں جس کھلے ہوئے دھوئیں کا ذکر ہوا ہے فرمایا گیا ہے کہ لوگ خدا کے متعلق جب شک میں کھیلنے لگیں گے اور ان کے پاس "رسول مبین" کھلا ہوا رسول جو آیا تھا۔ اس پر معلّم اور مجنون ہونے کا اتہام لگائیں گے یعنی کہا گیا کہ دوسرے مذاہب کے علماء سے جا کر سیکھ کر بیان کرتا ہے یا اس کے دماغ میں فتور ہے۔ ان دونوں جرائم کی سزا میں دھمکی دی گئی ہے کہ تب کھلے ہوئے دھوئیں کا انتظار کیجیو، خاکسار نے عرض کیا تھا کہ یورپ ان جرائم کا مجرم بھی ہے

نے سے کام لے رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے نبوت کی وہ پیشین گوئی سمجھ میں آتی ہے کہ مومن دجال کے پاس جائے گا، لیکن جب واپس لوٹے گا تو طرح طرح کے شکوک و شبہات کی چنگاریاں اپنے اندر بھڑکتی ہوئی پائے گا، یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ مردوں سے متجاوز ہو کر عورتوں کو بھی فتنہ کی یہ آگ گھیرتی چلی جا رہی ہے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اسپرچولیزم کے شیطانی تجربات کے دعوے پیش کر کے اس معیار ہی کو یورپ والوں نے چاہا ہو کہ مشتبہ کر دیں، جس پر مذاہب و دیانات کے سلسلہ میں حق و باطل کو جانچا جاتا تھا، اگر واقعی یہ مان لیا جائے کہ جن مخفی روحوں سے مکالمہ کا ادعا اس طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے یہ شیاطین نہیں بلکہ گذشتہ مرے ہوئے لوگوں کی واقعی روحیں ہیں، تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ مرنے کے بعد والی زندگی کی بھلائی اور برائی خیر و شر کا تعلق ان امور سے نہیں ہے، جن کے ساتھ خیر و شر کے نتائج کو مذاہب والبشر قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ گو صاف صاف واضح لفظوں میں خدائی کا دعویٰ یورپ کی طرف سے ابھی دنیا کے سامنے نہیں رکھا گیا ہے، لیکن جس فکری رفتار کا لوگوں کو اس زمانے میں عادی بنا دیا گیا ہے، اس رفتار کا آخری نتیجہ یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ بجائے خدا کے سب سے آخری اقتداری قوت کائنات کی بنی نوع انسانی ہی کو تسلیم کر لیا جائے، مسئلہ ارتقاء جو مغربی طریقہ فکر کی تنہا مخصوص راہ ہے، وہی اسی نتیجہ تک خود بخود سوچنے والوں کو پہونچا دیتا ہے، بلکہ انسانوں میں بھی چونکہ آج ہر قسم کی طاقتوں اور قوتوں کا مرکز یورپ و امریکہ ہی بنا ہوا ہے، اس لیے "خدا" کے لفظ کا اطلاق خواہ مغربی تہذیب و تمدن کے نمائندوں پر نہ کیا جائے، لیکن خدا اگر اسی طاقت کا نام ہے جس کے اوپر کوئی طاقت نہیں ہے، تو آج ان دلوں کو چیر کر دیکھئے جو مغربی تمدن کے زیر اثر ہیں یہی عقیدہ اور احساس باہر نکل آئے گا کہ یورپ و امریکہ والوں سے بڑا کوئی نہیں ہے ان ہی پر سارے کمالات کی انتہا ہوتی ہے، جو کچھ اس تہذیب و تمدن کے متعلق لکھا پڑھا جاتا ہے اور جس قسم کی گفتگو یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ کے متعلق عوام و خواص کی مجلسوں میں کی جاتی ہے، رسالوں اخباروں سینماؤں اور تھیٹروں میں جو کچھ

اور اپ میں جن [illegible] سے [illegible] ہو، باب جن میں غور کیا جائے تو دخان یعنی دھواں مشترک نظر آئے گا، اور اسی پر نے

تو دھوئیں کو جس [illegible] دکھا دیا جس سے دنیا واقف ہے ۱۲

سنایا اور دکھایا جاتا ہے شعوری وغیر شعوری طور پر یہی اثر ان سے دماغوں اور دلوں میں جاگزیں
ہوتا چلا جا رہا ہے، کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر با ایں ہمہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کھلے
اور صاف لفظوں میں خدائی کا دعویٰ بھی ابھی نہیں کیا گیا ہے اور قوانین قدرت پر بھی ان کا اقتدار بلندی
کے اس نقطہ تک ابھی نہیں پہونچا ہے، جس پہ حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے۔ "المسیح الدجال"
کی نادرہ نمایاں ہو پہنچ جائیں گی! اس کی کوشش جیسا کہ سنا جاتا ہے
ان ممالک میں ہو رہی ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے کا راز بھی دریافت کر لیا جائے۔ ایسی خبریں بھی
کبھی کبھی آجاتی ہیں کہ بعض حیوانوں بلکہ شائد انسانوں کے متعلق احیاء موتیٰ (مردوں کو زندہ کرنے
کا عمل کامیاب ہو چکا ہے، یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ بادلوں پر بھی قریب ہے کہ قابو پا لیا جائے۔
مگر انصاف کی بات یہی ہے کہ صحیح کامیابی جیسی کہ چاہیے اس راہ میں مغرب کی جدید تہذیب اور
ارتقائی جینئی کوششوں کو ابھی نہیں ہوئی ہے، اور اس کے سوا بھی ایسے مختلف وجوہ واسباب
ہیں جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیے کہ نبوت کی پیشین گوئیوں میں جس "المسیح الدجال" کا ذکر
جن خصوصیتوں کے ساتھ کیا گیا ہے، اس کے خروج وظہور کا دعویٰ ابھی قبل از وقت ہے، ہاں!
اتنی بات صحیح ہے کہ مغرب کا جدید تمدن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "المسیح الدجال" کے خروج
کی زمین تیار کر رہا ہے کیوں کہ اپنی اقتداری قوتوں سے وہی کام یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ میں بھی
لیا جا رہا ہے، جس میں "المسیح الدجال" اپنی اقتداری قوتوں کو استعمال کرے گا، خدا بےزاری یا خدا کے
انکار کو ہر دل عزیز بنانے کی راہ یورپ صاف کر رہا ہے یا کر دکا ہے لیکن بجائے خدا کے خود اپنی
خدائی کے اعلان کی جرأت اس میں ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے، "المسیح الدجال" اسی قصے کی تکمیل
کر دے گا، کچھ بھی ہو، صحیح اور صاف جنچی تلی ہوئی بات جس میں خواہ مخواہ نبوت کے الفاظ میں
کھینچ تان اور رکیک تاویلوں کی ضرورت نہیں ہوتی، یہی ہے کہ "المسیح الدجال" کے خروج کا بھلا
تو قبل از وقت ہے، مگر "المسیح الدجال" جس فتنے میں دنیا کو مبتلا کرنے گا، اس فتنے کا ظہور کسی نہ کسی
رنگ میں مان لینا چاہیے کہ ہو چکا ہے دوسرے لفظوں میں چاہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ دجال آیا ہو یا نہ
آیا ہو لیکن "دجالیت" کی آگ یقیناً بھڑک چکی ہے، آخر حدیثوں ہی میں یہ بھی تو آیا ہے کہ
"المسیح الدجال" سے پہلے "دجاجلہ" کا ظہور ہوگا، بعض روایتوں میں ان کی تعداد تیس اور بعضوں میں

چھتیس تک بتائی گئی ہے۔ "دجال" سے پہلے ان "دجاجلہ" کی طرف "دجالیت" کا انتساب بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے، یہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "المسیح الدجال" جس فتنے کو پیدا کرے گا، کچھ اسی قسم کے فتنوں میں اس سے پہلے پیدا ہونے والے "دجاجلہ" دنیا کو مبتلا کریں گے۔

اسی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ "المسیح الدجال" کے زہر کا علاج جیسے بتایا گیا ہے کہ سورہ کہف کی آیتوں میں پوشیدہ ہے اسی طرح اگر چاہا جائے تو ہر "دجالی فتنے" کے زہر کا ازالہ بھی اسی سورہ کی آیتوں، اور جن معارف و مضامین پر یہ آیتیں مشتمل ہیں، ان میں تلاش کیا جائے۔ چونکہ موجودہ مغربی تہذیب و تمدن جس کے زیر اثر دنیا کی اکثریت آچکی ہے اور آتی چلی جارہی ہے دجالی جراثیم کا جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہے سرچشمہ بنی ہوئی ہے، تقریباً وہی فتنے جن کے ظہور کی خبر "المسیح الدجال" کے عہد میں دی گئی ہے، یورپ کی اس تہذیب و تمدن سے ابل رہے ہیں۔

اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر فقیر نے سورہ کہف کے مضامین اور مشتملات میں جب غور کیا تو بعض حیرت انگیز نتائج سامنے آئے۔ شاید دوسروں کو بھی اس سے کچھ فائدہ ہو ان کو قلم بند کر لیا گیا آج ان ہی کی اشاعت کی سعادت حاصل کی جاتی ہے، واللہ ولی الامر والتوفیق۔

مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں

ہندوستان کے قریباً بیس مشاہیر اہل علم و اصحاب قلم کے نہایت مفید اور قابل قدر مقالات کا یہ قابل مطالعہ مجموعہ ہے۔ ہر مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں بتلایا ہے کہ کن کن کتابوں کے مطالعہ نے اس کو متاثر اور اس کے دل و دماغ کو روشن کیا ہے۔

لکھنے والوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا ابو الحسن علی جیسے حضرات ہیں۔ ہر صاحب ذوق کو اس کی خریداری کا مشورہ دیا جا سکتا ہے قیمت مجلد عہ

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

اِنتخاب

ضمیر جب جاگتا ہے!

(معاصر "حیاتِ نو" کے شکریہ کے ساتھ)

آج میں کاغذ کا ایک لمبا لفافہ اپنے بائیں ہاتھ میں لئے کسی کے آستانہ کرم کی طرف جا رہا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ اس لفافہ میں کیا پنہاں تھا۔ یہ تو میرے دل سے پوچھا جائے، اس میں میری زندگی کے خزاں رسیدہ باغ میں بہار بن کر آنے والی اُمید محفوظ تھی۔ اس میں میری ساری اُمیدیں سمٹ کر آئی ہوئی تھیں۔ جب عالم خیال میں میرا غنچۂ اُمید کھلتا ہوا نظر آتا اور کامیابی کے تصور کی ایک کرن بھی خانۂ دل سے گذر جاتی تو بیچارہ دل حسرتوں کا گہوارہ فرطِ مسرت سے بلّیوں اچھلنے لگتا۔ آن واحد میں سرزمینِ تصوّر پر کامرانی کی عالیشان خوشنما عمارتیں تیار ہو جاتیں۔ اپنے شاندار مستقبل کے وسعت افزا، فردوس نما مناظر آنکھوں کے روبرو آجاتے۔ غرضکہ ۔۔۔ میں اسی کشمکش میں اپنی ملازمت کی درخواست لئے ہوئے جاتے جاتے یکایک رُک گیا، خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا، دل میں ایک دھڑکن سی پیدا ہونے لگی، قدم ڈگمگانے لگے، بمشکل آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور یکایک دروازہ پر رک گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کیلئے ہاتھ زنجیر تک گیا بھی نہ تھا کہ کسی نے دھیمی آواز لیکن تحکمانہ انداز میں کہا: "یہ یاد رہے کہ تو وعدہ خلافی کر رہا ہے" میں چونک پڑا، ہاتھ خود بخود رک گیا، میری متحیر نگاہیں ہٹ کر دیوار پر جم گئیں۔ پلٹ کر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا۔ وہم وگمان سمجھا، دل مضبوط کیا اور پھر دروازہ کھٹکھٹانے کیلئے ہاتھ بڑھایا، پھر وہی باوقار آواز آئی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، میرا دل دھڑکنے لگا اور سانس پھولنے لگی، چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور پھر ایک بار ہاتھ زنجیر کی طرف بڑھایا، لیکن نہ جانے کیوں خود بخود ہاتھ رک گیا، آخر تیسری دفعہ اپنی ناکام کوشش میں ایک حد تک کامیاب ہو گیا۔ ہاتھ زنجیر پر تھا، لیکن ابھی تک زنجیر کھٹکھٹانے کی جرأت نہ ہوئی تھی کہ پھر وہی پرزور غضبناک آواز آئی۔

"یاد رکھ! کہ تو وعدہ خلافی کر رہا ہے، اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا"

میں لرز گیا، ہاتھ نیچے ہو گیا، لیکن اس دفعہ مجھے پلٹ کر دیکھنے کی [illegible] تک نہیں ہوئی۔

پھر وہی آواز آئی "اے اپنے آقا اور اپنی حقیقت کو بھول جانے والے نادان انسان! ذرا اپنے کئے ہوئے وعدہ کو تو یاد رکھ۔ کیا تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں دنیا میں جا رہا ہوں تو محض اسلئے کہ خلق اللہ کی خدمت میں اپنے تن من دھن کو لٹا دوں۔ کیا تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں گہوارہ میں رہا ہوں تو لا الہ الا اللہ کیلئے، اور جنازہ میں جاؤں گا تو محمد رسول اللہ کیلئے۔ کیا تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ میرا نصب العین یہی ہوگا کہ اللہ کی راہ میں کچھ کر دکھاؤں گا۔ تو وعدہ فراموش ہے، تو عہد شکنی کر رہا ہے۔ او حقیقت فراموش انسان! ذرا اپنی حقیقت پر نظر ڈال لے۔ تو دنیا میں آیا ہے تو کسی کے احکام کی تعمیل کیلئے، اور بس، اس کے سوا تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تو آج کس کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، تو اپنے آپ کو ایک ایسے قفس میں پھنسا رہا ہے، ایک ایسے زنداں میں مقید کر رہا ہے کہ جہاں جاکر تیرا مقصدِ زندگی فوت ہو جائے گا، تیری ذہنیت پست اور محدود ہو کر رہ جائے گی تو اپنی زندگی کا نصب العین یہی سمجھ کر رہ جائے گا کہ کماؤں اور پیٹ بھر لوں۔ تیری خودداری خاک میں مل جائے گی۔ تیری زبان "جی ہاں" ہو کر رہ جائے گی۔ نادان! دولت میں کھیلنے والوں کی دنیا "جی ہاں" "جی حضور" اور "جی سرکار" سے مرکب ہے۔ وہاں "نہیں" کا گذر نہیں۔ تجھے اپنی حقیقت پر سوچنے کی ایک لمحہ کیلئے فرصت نہ ملے گی۔ تیرے دن رات اس مشغولیت میں کٹ جائیں گے۔ تیری عمر رواں پانی کی طرح بہہ جائے گی۔ مانا کہ تیری زندگی سکھ اور چین سے گذرنے لگی، مانا کہ عیش و عشرت تیرے قدم چومتے رہیں گے، لیکن یاد رکھ کہ تو اس دنیا میں آیا ہے تو اسلئے نہیں کہ عیش و عشرت کے گلستانوں کی سیر کرتا جائے، اس لئے نہیں کہ چین اور سکون کی راحت افزا وادیوں سے گذرتا جائے، اس لئے نہیں کہ بے فکری اور بدمستی کے عالم میں کھویا ہوا رہے، اس لئے بھی نہیں کہ خوشی اور مسرت کے حباب آسا وجود کے حاصل کرنے میں اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو قربان کرتا جائے۔ تف ہے تیری اس زندگی پر، تیری اس تنگ نظری، کج فہمی اور پست ہمتی پر۔ تو سمجھ بیٹھا ہے کہ دنیا میں آیا ہوں تو محض اس لئے کہ پوری طرح دنیا دار بن جاؤں جس میں رنج و الم کا عنصر نہ ہو۔ ارے نادان! طفیلی رنج و غم انسانی فطرت کی تکمیل کیلئے ضروری ہیں۔ کوئی نقش اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے رنگ میں خونِ جگر کی آمیزش نہ ہو۔ وہ بلبل ہی کیا جس نے کبھی فراق کا مزہ چکھا ہی نہیں، وہ نغمہ ہی کیا جس میں

نالہ کی چاشنی نہیں۔ غم کے داغوں سے سینے منور ہوتے ہیں اور آہوں کے صیقل سے دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے۔ جو گلچیں کانٹوں کی خلش سے بالکل ناواقف ہوں اور جن عاشقوں نے کبھی ہجر کی کلفت نہ سہی ہو وہ زندگی کی لذت سے محروم ہیں، اور زندگی کا راز اُنکی نظروں سے پوشیدہ ہے"

آواز رک گئی، میرے ہاتھ میں رعشہ پڑ گیا، تمام جسم پسینہ سے شرابور ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ پھر وہی آواز آئی "تیرے گھر میں کوئی بھوکا تو نہیں بیٹھا ہے جو تجھے پہلے اس کا پیٹ بھرنے کی فکر دامنگیر ہو۔ تیرے بال بچے فلاکت کی آگ میں تڑپ تو نہیں رہے ہیں جو اُنکی ناقابلِ برداشت حالت تجھے چند پیسوں کے عوض اپنے آپ کو فروخت کر دینے پر مجبور کر دے۔ انسانی زندگی کا مقصد کھانا پینا اور دولت جمع کرنا نہیں ہے، صرف اپنے بچوں کی فکر و پرداخت تو جانور بھی کرتے ہیں، اگر اسی کو انسانیت کا شرف سمجھا جائے تو انسانیت کی ہتک ہے، شرافت کی پیشانی پر زبردست داغ ہے، انسانیت کے جسم پر (برص) کوڑھ کا دھبہ ہے۔ دنیا کو اُن لوگوں سے کیا فائدہ جو صرف کھانا پینا اور اپنا جیون سکھی بنانا جانتے ہیں۔ جنھوں نے کبھی دکھی کے آنسو نہیں پونچھے کبھی ٹوٹے ہوئے دلوں کو نہیں جوڑا، بلکہ ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو دولت کیلئے اپنی خوشی نہیں سمجھتے، جن سے کسی دکھیا کا درد کم ہوا ہو، جنھوں نے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے بے سہارا یتیم بچوں اور بیواؤں کی مدد کی ہو جنھوں نے سب کچھ اپنا بھائی سمجھ کر ان کیلئے آرام و راحت کا سامان پیدا کیا ہو، جن کا دل اپنے جیسوں کی تکلیف اور درد سے پسیجتا ہو اور جو ملک و قوم اور دنیا بھر کی فلاح و بہبودی کیلئے دینار و قربانی سے دریغ نہ کریں۔ کیا تو اس بڑی موٹی صورت والے کو ایک کامیاب انسان سمجھتا ہے، کیا اس توندیل کو ایک بڑا آدمی تصور کرتا ہے؟ کیا تو اُسکے چہرہ پر یتیم بچوں اور بیواؤں کے دکھ درد کی پرچھائیاں نہیں دیکھتا؟ کیا تو اسے انسان کہتا ہے جو دوسروں کو مٹا کر خود قائم رہے، جو دوسروں کی عمارات ڈھا کر اپنی عمارت کھڑا کیا ہے۔ لوگوں کی حق تلفی کرنے اور ان کو بے دست و پا کرنے والا انسان حقیقت میں بڑا انسان ہے؟ دولت مند ہے؟ کیا وہ کبھی سکھی رہ سکتا ہے جسکی رگ رگ میں خود غرضی، مکاری، اور عیاری رواں ہے۔ جسکی شریانیں تعفن اور گندگی سے پُر ہیں، کیا تو خط و خال کی دلفریبی کو اسکے ضمیر کی صفائی سمجھتا ہے؟ ہر گز نہیں!! یہ ایک مکروہ شکل ہے جس پر حرص و طمع کی سیاہی لپٹی ہوئی ہے جسکے قہقہے کی آواز کئی مفلس انسانوں کی ہڈیوں کے چرچرانے سے مرکب ہے۔ جسکے گالوں کی سرخی اُسکے کاشتکاروں کی آرزوؤں کے خون سے مستعار ہے۔ تیرا زریں بچپن اور تیرا متحرک عہدِ جوانی جبکہ قوتِ عمل اپنی پوری معراج پر جلوہ افروز رہتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کی متغیر کرنے والی فریب زدہ فضاؤں میں گزر گیا۔ اب اس تنگ چار دیواری سے نکلنے کے بعد جبکہ تیری قوتِ عمل معطل ہو چکی ہے، تیری تندرستی خاک میں مل چکی ہے، تو پھر یہ چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو عمر بھر کیلئے دفتروں کی تاریک فضاؤں میں ٹھونس دے اور اپنی فطری آزادی کو چاندی کے چند ٹکڑوں پر بھینٹ چڑھا دے۔ اے خواہشِ زمانہ کے تھپیڑوں سے گھبرا کر عیشِ جہاں میں پناہ ڈھونڈنے والے نادان جوان! مانا کہ اس زمانہ میں روپیہ کمانا بھی ضروری ہے اور از حد ضروری ہے۔ لیکن پہلے اپنے کئے ہوئے وعدوں کو نصب العین قرار دے، اُنکو آگے رکھ اور دوسری ضروریات کو پورا کرنے میں کوشاں رہ! مت روپیہ کمانے کا ایسا ذریعہ استعمال نہ کر جسکی وجہ سے تیرا مقصدِ زندگی طاقِ نسیاں کا نقش و نگار بن کر رہ جائے۔ یہ سرکاری ملازمت وہی ذریعہ ہے جسمیں پھنس کر تو خود فراموش ہو جائے گا، اپنی حقیقت کو بھول جائے گا اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کئے بغیر

اس دنیا سے ناکام اُٹھ جائیگا، غربت آٹھوں پہر ڈسیگی، ہر طرف سے طمانچے غربت کے گالوں پر پڑتے رہیں گے لیکن تیرے دل کا درد سو چکا ہوگا کسک تیرے دل میں منجمد ہو جائیگی، تو رونا چاہے گا لیکن تیری آنکھوں میں آنسو نہیں رہیں گے۔ تو بلبلانا چاہے گا تجھ پر سکوت طاری ہوگا، تیری زندگی بےحس ہو چکی ہوگی، تیری زندگی کی ساری مسرتوں کو سرکار کی نہیں نے نچوڑ لیا ہوگا، تیری زندگی کے سینہ میں نا امیدیوں حسرتوں اور مایوسیوں کے داغ پڑ چکے ہونگے، تیری زندگی میں خوشیوں کا داخلہ ممنوع ہو جائیگا، تیری زندگی اُس پھیکے ہوئے سنگترے کی پھانک کی طرح ہو جائیگی جسمیں سے ساری مٹھاس چوس لی گئی ہو۔ لیکن تیری اس ذہنیت کا کیا علاج جو تیرے تنگ ماحول کی پیداوار ہے کہ تو یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ ملازمت کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ تجھے فکرِ معاش سے نجات حاصل ہو سکے۔ اس تنگ خیالی سے باز آ، لعنت بھیج اس ملازمت پر، آگ لگا اس درخواست کو، اللہ پہ توکل رکھ، اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں گامزن رہ، اپنے ارادوں کو راسخ بنا۔ کھانا پینا، مرنا یہ تو دنیا کا ذلیل سے ذلیل جانور بھی کر سکتا ہے اور تو تو دنیا میں انسان بن کر آیا ہے تو کم از کم انسانیت کی لاج رکھ لے، وقت کی نبض دیکھ، مومن کی زندگی سے جدوجہد کا سبق سیکھ جو یاس کا غلبہ اپنی زندگی پر آنے نہیں دیتا جو حالات کے ماتحت نہیں چلتا بلکہ اسکی ساری جدوجہد یہی ہوتی ہے کہ حالات کو اپنے ماتحت چلائے اسلئے کہ وہ انقلابی ہے اور انقلاب اس کا آئین ہے۔ وقت ہے کہ تو بھی خوابیدہ بختی کے خرمنوں میں آگ لگاتا ہوا زندگی کو گرما دے، انسانیت کے تشنہ لب کھیتوں کو آج تیرے جوان خون کی ضرورت ہے، تو انھیں اپنے خون سے سینچے گا تو یہ پھر ایک بار سرسبز ہونگے، لہلہا اٹھیں گے۔ انکی خاک سے فضاءِ عالم کو معطر کر دینے والے پھول پیدا ہونگے۔ زندگی کے پودے کی آبیاری دریا کے پانی سے نہیں بلکہ اُس خون سے ہوتی ہے جو شہیدوں کے سینے سے نکلتا ہے، ملت کی آبرو اُس پیالے سے چھلکتی ہے جسمیں خونِ شہید بھرا ہوا ہو، دنیا میں ایسا بھی زمانہ ہوا آیا ہے۔ جانثاروں سے لالہ زار کھڑے ہوئے، پستیاں بلندیوں میں منتقل ہو گئیں۔ جو نڈر ہو کر اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لیتے ہیں تو پھر کائنات کی کونسی طاقت ہے جو انھیں اُنکے مقصد سے باز رکھے۔ بھوک، پیاس، افلاس، سردی گرمی، خانماں بربادی اور موت، ان میں سے کوئی چیز انکو اُنکے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتی۔ کارزارِ حیات میں زندگی پر بازی لگانے والے ہی کامیاب زندگی کے مالک بنتے ہیں۔ تو بھی ہاں تو بھی اپنی زندگی کو رنگین اور پائدار بنانے کیلئے خطرات کا مقصد شوق استحصال کر، تو اگر مر جائیگا لیکن تیرا کام زندہ رہے گا اور یہی انسانیت کا انتہائی عروج ہے۔ یہ تو کھلی حقیقت ہے لیکن تیری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ گئے ہیں تو کوئی کیا کرے معلوم تو یوں ہوتا ہے کہ دنیا بھر کی سردمہری تجھ پر ہی پھٹ پڑی ہے۔ تو پوچھتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ذرا دیکھ کہ تو قفس میں بند ہے، تیرے پیروں میں غلامی کی ناپاک زنجیر ہے، اللہ کے باغیوں کی زنجیر، یہ تیرے اپنے نفس کی زنجیریں ہیں۔ غلامی کی زندگی ہی کیا، اس زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔ غلام کی موت کے خوف سے بھی زندگی حرام ہو جاتی ہے لیکن بندۂ آزاد کی موت سے اُس کو نئی زندگی ملتی ہے۔ انسانیت کی جبیں خون کے اُنھیں قطروں سے چمکتی ہے جو آزادی کے راہ میں بہائے جائیں۔ اگر مرد ہے تو اُٹھ، عملِ پیہم سے قفس کی آہنی زنجیروں کو توڑ دے، باہر نکل، اور پھر جہاں میں ایک بار یقین و عمل کی قوتوں کو جگا دے۔ پہلے تو اپنی زندگی کے ہر سانس کو حصولِ مقصد کیلئے وقف کر دے۔ تیرا کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا، مرنا جینا، سب کچھ اللہ کیلئے ہو، پھر دیکھ کہ تجھے کیا نہیں ملتا۔ یقین کی کشتی پر سوار ہو جا، یاس و ناکامی کے بھنور کی ہلاکت یا یاسوں کے خوف کو دل سے نکال کر پھینک دے۔ ؎

کانپتا ہے تیرا دل اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

سوچ اور اچھی طرح سوچ لے" ———— آواز بند ہو گئی، میں بُت بن کر رہ گیا، مجھے اتنی جرأت تک نہ ہوئی کہ تلاش کر سکوں کہ یہ آواز کس کی ہے۔ میرا دل اُس معنی خیز آتش صفت اثر سے خون ہو گیا، میرا ضمیر مجھ پر ملامت کرنے لگا۔ (بقیہ ص ۱۲ پر)